بے وطن
اشرف شاد

بے وطن

وزیر اعظم ادبی ایوارڈ حاصل کرنے
والا ۱۹۹۷ء کا بہترین ناول

اشرف شاد

دوست پبلی کیشنز ۔ اسلام آباد

ضابطہ

ISBN No: 969-496-102-5

نام کتاب	:	بے وطن
مصنف	:	اشرف شاد
موسم اشاعت	:	۱۹۹۹ء
سرورق	:	خالد رشید
مطبع	:	ورڈمیٹ
قیمت	:	400.00 روپے
مصنف کا پتہ	:	2-Brown Road, Broadmeadow NSW 2292 AUSTRALIA

دوست پبلی کیشنز 8اے، خیابان سہروردی، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد

مرحومہ امی جان

اور

ابا مرحوم کے نام

ناول میں شامل جملہ واقعات و کردار فرضی
ہیں اور کوئی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔

مصنف

ترتیب

ناول کے اہم کردار

سلیم: ناول کا مرکزی کردار جو انجنیئرنگ پڑھنے بے وطن ہوا تھا لیکن رشتوں کی شطرنج کھیلنے لگا۔

سائرہ: حیدر آباد دکن کی غریب لڑکی جسے بے وطنی نے امیر بنا دیا تھا۔

مسز چنائے: پاکستان کی جیکی اوناسیس جو وطن کی تلاش میں بے وطن ہوئی تھی۔

ظہور بیدل: شاعر ڈپلومیٹ جسے ایک بر سلیٹ کی نحوست نے باورچی بنا دیا تھا۔

چودھری انور: ملتان کا سادہ دل نوجوان جسے وطن کی مٹی بے وطنی میں بھی عزیز تھی۔

ایوان: آسٹریلوی لڑکی جو شیطان کی چیلی بن کر گلے لگاؤ تحریک چلا رہی تھی۔

نعیم: انقلاب کے خواب دیکھنے والا، بے وطنی نے جس کے خوابوں کی تعبیر چھین لی تھی۔

غزالہ: جس نے پہلی بار اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیا تھا

عاصمہ: جو شادی کر کے بھی تنہا رہ گئی تھی۔

اکرم بٹ: شکی مزاج امیر بڈھا جس کے لئے شادی بچت کا کاروبار تھی۔

علی: بحرین کا شیخ جسے نیلام میں بولی لگانے کا شوق تھا۔

اختر چنائے: برف سے پانی بنا کر لاکھوں کمانے والا فنکار۔

صدیقی صاحب: باضمیر بیوروکریٹ جن کی ایمانداری ایک مسئلہ بن گئی تھی۔

بشیر احمد: بے وطنی نے جسے زندگی گزارنے کا فن سکھا دیا تھا۔

لیزا: چرس کی شوقین جو پاکستان جا کر آزادی کا بت تراشنا چاہتی تھی۔

نوری: سیاستدانوں کے غنڈوں نے جسے جسم فروشی پر مجبور کر دیا تھا۔

قریشی: وزیروں کو گڑھے میں گرا کر باہر نکالنے کا ماہر بیوروکریٹ۔

اعوان: جو سلطانہ ڈاکو بن کر کڑھائی گوشت کی دکانیں لوٹنا چاہتا تھا۔

اینڈریو: جسے دنیا سے بھوک ختم کرنے والا جادوئی چراغ مل گیا تھا۔

بابرا: جو پیانو بجاتے ہوئے زندہ رہنا بھول گئی تھی۔

سعیدہ: بنگالی لڑکی جسے پاکستانیوں سے نفرت لیکن ایک پاکستانی سے محبت ہو گئی تھی۔

ملک آفتاب: جھوٹ کو سچ بنانا جس کا کاروبار تھا۔

اقبال: جو غیر قانونیوں کا وزیر اطلاعات بن گیا تھا۔

غلام شبیر: گوجرانوالہ کا نواب جو گھوڑوں کے بدلے انسانوں کی تجارت کرتا تھا۔

نبیلہ: جو بدن پر محبت کے پھول بنانے کی ماہر تھی۔

مہرانی: ملتان کا جاگیردار جو ووٹ لینے کا فن جانتا تھا۔

جادو: عورتوں کا دلال جو ایک بے گناہ کو سنگسار کرنا چاہتا تھا۔

پروین: وہ اپنا سیب اپنے ہاتھوں سے خریدنا چاہتی تھی۔

تھامس: جس نے محبت کی چوٹ دل پر نہیں سر پر کھائی تھی۔

پاکستانی سفیر: جسے اس کا ایک پیادہ مات دینا چاہتا تھا۔

سفیر کی بیوی: جسے اپنے کتے کی تصویر اخبار میں چھپوانی تھی۔

پروفیسر تھیو: جس کی بیماری نے سلیم کی منزل بدل دی تھی۔

سلطان: ملبورن کا ٹیکسی ڈرائیور جس کی محبت ایک دیو کی قید میں تھی۔

جارج پاپاڈوس: جس نے قبرص کی جنگ ایک بار پھر ہار دی تھی۔

منی: جس کے لئے اس کے بچوں کا باپ چونچیں مارنے والا کوا بن گیا تھا۔

انکے علاوہ: ڈیوڈ اور بابی (ایوان کے دوست)، پیٹر (شیطان کا چیلا)، جارجیا (بابرا کی بہن)، ظہیر، منظر، مشتاق (چودہری انور کے دوست) احمد اور علی (سلیم کے روم میٹ) نتاشا (جنسی بلی)، ناصر، حفیظ (بشیر احمد کے دوست)، جاوید (نبیلہ کا شوہر)، نسرین (جاوید کی بہن)، شیما (مزدوروں کی لیڈر)، فدا خان (پاکستانی ڈپلومیٹ)، رحیم پاشا (اکرم بٹ کا دوست)، عظیم پاشا، فہیم پاشا، جولی اور حنا (رحیم پاشا کے بیٹے اور بہوئیں)، عذرا اور روشن (سائرہ کی بہن)، زرین (غزالہ کی بیٹی)، کالو (ملتان کا بدمعاش)، خانزادہ (قبائلی رہنما)، علیم (پاکستانی صحافی)، مائک (برطانوی ڈپلومیٹ)، ستار (ظہور کا دوست)، سلیم، سائرہ، نعیم اور رفی کی مائیں...... اور بے شمار دوسرے کردار۔

اک شاد ہی نہیں جو وطن چھوڑ کر بکا
کتنے گھروں کا مال دکانوں تک آ گیا

مصنف کے بارے میں

اشرف شاد کی طبیعت میں جو ٹھہراؤ اور اطمینان ہے وہ ہمیشہ اس کی شناخت رہا ہے۔ اشرف کے دوست اسے مراد آباد کی آب و ہوا کا اثر قرار دیتے ہیں جہاں وہ ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ بہت سال گزرنے کے بعد شاید اس آب و ہوا کا اثر زائل ہو گیا ہے اور عمر کی نصف صدی طے کرتے ہی اس میں ایک عجیب سی بے قراری اور وہ عجلت آ گئی ہے جو اس کے مزاج کے خلاف رہی ہے۔ گزشتہ سال وہ نصاب کی اشاعت کے لئے آیا تھا تو بغل میں "بے وطن" کا کتابت شدہ مسودہ تھا اور شعری مجموعے کی جگہ اپنے پہلے ناول کے بارے میں زیادہ پرجوش دکھائی دیتا تھا۔ "بے وطن" شائع ہونے لگی تو وہ صرف "وزیراعظم" کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اور ابھی وزیراعظم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ وہ دوستوں کو فون کر کے "صدر محترم" اور "اقتدار مافیا" کے پلاٹ سنا رہا تھا۔

اشرف کو حسب نسب، ذات، فرقے اور قبیلے کے امتیازات کبھی پسند نہیں آئے اور یہی وجہ تھی کہ مرزا اشرف علی بیگ شاد نے بہت پہلے اپنے نام کے وہ حصے استعمال کرنے چھوڑ دیئے تھے جن سے ایسی کوئی شناخت ظاہر ہو سکتی تھی۔ لیکن اب کبھی کبھی آذربائیجان

کے مغل قبیلے "جواں شیر" کا تذکرہ کرنے لگا ہے جو احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں شامل ہو کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد تو ہندوستان پر حملہ کر کے وہیں کے ہو رہے تھے لیکن اشرف کے حملوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ہنگری، امریکہ، بحرین اور کویت پر کئی ناکام و کامیاب حملوں کے بعد وہ گزشتہ دس برسوں سے یاسمین، اپنی بیٹی سمن اور بیٹوں ارسلان اور سلمان کے ساتھ آسٹریلیا میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے، لیکن اس کے دوستوں کو یقین ہے کہ اس کی بے چین روح کسی نئی لشکر کشی کے لئے تڑپ رہی ہو گی۔

یہ بھی شاید جنگ کرنے کی اس کی قبائلی روایت تھی کہ قلم کو وہ تلوار سمجھ کر استعمال کرنے لگا، نتیجے میں خود اپنے بدن پر کئی زخم کھائے، طویل بیروزگاریاں گزاریں اور دو بار جیل بھی کاٹی۔ اس نے صحافت کے سفر کا آغاز ۱۹۶۶ء میں حریت سے کیا تھا۔ مشرق، الفتح اور اعلان (امن) سے وابستہ رہنے کے بعد اس نے ہفت روزہ معیار کے نام سے اپنا رسالہ نکالا جس کے بند ہونے اور اپنے خلاف متعدد مقدمات کی وجہ سے اس نے ۱۹۸۰ء میں جلاوطنی اختیار کی۔ قلم سے اس کا رشتہ پھر بھی نہیں ٹوٹا اور بحرین میں و یکلی گلف مرر اور کویت میں ڈیلی عرب ٹائمز کے لئے کام کرنے کے بعد اب سڈنی میں ایس بی ایس ریڈیو کی اردو سروس کا سربراہ ہے۔ ملک ملک کے اس سفر میں اس نے نصابی علم کے حصول کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہے۔ اردو کالج سے بی اے کر کے قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی۔ لیکن پھر بڈاپسٹ سے جرنلزم کا ڈپلومہ اور سڈنی سے سیاسیات میں ایم اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ناول نگاری کی تازہ مصروفیات کی وجہ سے ابھی تک نامکمل ہے۔

اشرف کی زندگی کی کہانی اس کی شریک زندگی یاسمین (ڈاکٹر کنیز فاطمہ شاد) کا تذکرہ کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ وہ بھی افسانے لکھا کرتی تھیں لیکن اب نیورو فزیالوجسٹ ہو کر سائنس دان کی حیثیت سے دنیا میں نام کما رہی ہے۔ وہ اشرف کے تخلیقی سفر میں اس کا سب سے بڑا سہارا ہیں۔ اشرف کے بارے میں یہ بات بھی ہمیشہ کہی جاتی ہے کہ اس نے زندگی میں دوستوں کے سوا کچھ نہیں کمایا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی رہائش کہیں بھی ہو، رہتا وہ آج بھی پاکستان میں ہے۔

جی این قریشی

پیش لفظ

کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان غلطیوں کو جو صرف چھپنے کے بعد نظر آتی ہیں' درست کرنے اور "تحریر کے حشو و زائد" نکالنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کے بعد کئی اور غلطیاں اچانک آنکھوں میں کھٹکنے لگیں گی۔ اس کے باوجود کوشش کی ہے کہ اگر کتاب کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہو تو طابع کو نئے سرے سے پلیٹیں نہ بنانی پڑیں۔

"بے وطن" کو جب ۱۹۹۷ء کے بہترین ناول کا وزیراعظم ادبی ایوارڈ ملا اور ابلاغ عامہ کے ذرائع نے اس کی تشہیر کی تو لوگوں کو ایک غیر معروف مصنف کے انعام یافتہ ناول کو دیکھنے کا تجسس ہوا لیکن کتاب دستیاب نہیں تھی۔ تقسیم اعزازات کی تقریب کے دوران لاہور' پنڈی اور پشاور کے دوستوں نے بھی یہی بتایا کہ انہیں کتابوں کی کسی دکان پر "بے وطن" دیکھنے کو نہیں ملی۔ میرا خیال ہے کہ کسی نئے مصنف کے پہلے ناول کو تاجران کتب کی توجہ حاصل کرنے میں جس مشکل کا سامنا کرنا

پڑتا ہے "بے وطن" بھی اس دشواری کا شکار رہی۔ پہلا ایڈیشن شائع بھی محدود تعداد میں ہوا تھا اور جو کتابیں کراچی والوں سے بچ گئیں وہ کراچی سے آگے جو سمندر ہے اس پار چلی گئیں۔ مجھے یقین ہے اب دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد کسی کو کتاب کی عدم دستیابی کی شکایت نہیں رہے گی۔

پاکستان آتا ہوں تو شاعر و ادیب دوستوں کا یہ گلہ بھی سننے کو ملتا ہے کہ پڑھنے کا رجحان ختم اور کتاب خریدنے والے ناپید ہو گئے ہیں۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ جس جنس کے خریدار نہ ہوں تو اسے فروخت کرنے والے بھی اپنی دکانیں بڑھا دیتے ہیں۔ لیکن بظاہر ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ناشران و تاجران کتب دھڑا دھڑ دیوالیہ ہو رہے ہوں۔ اس کے برعکس گزشتہ چند برسوں میں اشاعت گھروں کی تعداد میں اضافہ اور ان کے کاروبار کو وسعت ہوئی ہے میرا خیال ہے کہ پاکستان میں دوسرے تمام شعبوں کی طرح کتابی بازار بھی نظم کے فقدان کا شکار ہے۔ اکادمی ادبیات، مقتدرہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، انجمن ترقی اردو اور پاکستان بھر کی جامعات کے اشاعت گھر نجی اشاعت گھروں سے مل کر اس نظم کو قائم کرنے میں مدد دے سکتے ہیں اور کتاب گھروں اور مصنفوں کے درمیان ایک ایسا پل بن سکتے ہیں جس کا پبلشروں، کتب فروشوں اور مصنفوں تینوں کو فائدہ ہو۔

میں دوست پبلی کیشنز کے آصف محمود کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے نئے ناول "وزیراعظم" کے اشاعتی حقوق حاصل کرنے کے ساتھ "بے وطن" کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ذمے داری بھی قبول کی۔ بے وطن کو میرے دوست احمد شمسی نے جو میرے بڑے بھائی کی طرح تھے، شائع کیا تھا۔ وہ اچانک اور عین اس دن انتقال کر گئے جس دن میں "بے وطن" کیلئے ایوارڈ لینے پاکستان پہنچا تھا۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت تھے جنہوں نے ایک طرف آئینہ، زندگی اور بندش جیسی کامیاب فلمیں بنائیں تو دوسری طرف سری لنکا سے آنکھوں کے عطیے منگا کر ہزاروں بے نور آنکھوں میں چراغ روشن کرنے والے ادارے پاکستان آئی بینک سوسائٹی کو ایک مضبوط مالی اور انتظامی بنیاد فراہم کی۔ وہ صوابی جا کر سرحد میں غلاموں کو آزاد کرانے کی جدوجہد کو

بھی مالی اور اخلاقی معاونت دیتے رہے۔ انہوں نے میرے شعری مجموعے "نصاب" اور ناول "بے وطن" کو شائع کرنے کے لئے پبلشر کا لبادہ اوڑھا تھا۔ وہ حیات ہوتے تو بے وطن کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت پر مجھ سے زیادہ خوش ہوتے۔

میں اپنے دوستوں اور بھائیوں جی این قریشی، ارشاد راؤ، نقاش کاظمی اور شفقت بیگ کا بھی شکر گزار ہوں جن کی وجہ سے میں پاکستان سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی اپنی تخلیقات کو اشاعتی شکل میں منتقل کرنے کے کام میں کامیاب ہو سکا۔ تخلیق کے اس عمل نے وہ بہت سے شب و روز چرا لئے ہیں جو یاسمین، میری بیٹی سمن اور بیٹوں ارسلان اور سلمان کی امانت تھے۔ ان کی محبتیں اور میرے بزرگوں کی دعائیں اس سفر میں میرا سب سے بڑا سہارا ہیں۔

اشرف شاد

سڈنی، فروری ۱۹۹۹ء

تری کتاب میں شامل رہا تو ہوں لیکن
میں جس ورق پہ لکھا تھا، پھٹا ہوا نکلے

اشرف شاد کا "بے وطن"

کتاب وہی ہوتی ہے جسے پڑھ کر آپ کے علم میں اضافہ ہو اور آپ محسوس کریں کہ آپ نے کچھ حاصل کیا ہے۔ اشرف شاد کی "بے وطن" بھی ایسی ہی کتاب ہے جسے پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے علم میں اضافہ ہوا ہے۔ اشرف شاد تخلیق کا فن اور بات کرنے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ ان کے ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نہ صرف دلچسپ اور پرلطف ناول ہے بلکہ اس حیثیت سے یہ ایک بڑا ناول ہے کہ پڑھنے والوں میں اپنی جگہ بنائے گا اور انہیں متاثر کرے گا۔

شوکت صدیقی

ooo

اشرف شاد نے بہت حوصلے، بیباکی، شعور اور فنی گرفت کے ساتھ اپنے ناول "بے وطن" کا تانا بانا بنا ہے---- انہوں نے "بے وطن" میں ایک ناول کی تکمیل کی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں ایک اہم ناول نگار چھپا ہوا تھا جو اپنے تخلیقی کرب کے حوالے سے خود ہی ظاہر ہوا اور اپنی صلاحیتوں کو منوا لے گیا۔ بڑے کینوس کے ناول میں کئی کردار اور کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ایک چابکدست ناول نگار ان کہانیوں کو باہم

مربوط کر کے ایک وحدت تاثر میں بدل دیتا ہے۔ "بے وطن" میں یہی وحدت تاثر اہمیت رکھتی ہے۔ پروفیسر سحر انصاری

ooo

ہمارا تعلق اس نسل سے ہے جس کے ادبی مطالعہ کا آغاز طلسم ہوشربا، حق پیکر اور الف لیلیٰ ہزار داستان سے ہوتا، داستان امیر حمزہ سے گزرتا اور فسانہ عجائب سے دوچار ہوتا ہوا فسانہ آزاد تک پہنچا اور وہاں سے پھر علی پور کے ایلی سے واسطہ پڑا، آگ کا دریا بھی پار کیا اور خدا کی بستی سے بھی گزرے، تو ہم موٹے موٹے ناول پڑھنے کے آدمی ہیں۔ اس طرح کے ناول اگر پانچ ہزار صفحات کے بھی ہوں تو دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ "بے وطن" اتنا دلچسپ ناول ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم کرنا ضروری ہو جائے گا۔ عبیداللہ بیگ

ooo

اشرف شاد کسی جگہ نئے ناول نگار نظر نہیں آتے۔ وہ ایک پختہ ناول نگار نظر آتے ہیں۔ ان کی صناعی میں بہت مشاقی ہے۔ "بے وطن" کوئی تجربہ نہیں بلکہ بہت سے سکہ بند روایتی ناولوں کی تکنیک سے جدا ہے۔ یہ ہمارے دور کی بازگشت ہے۔ یہ ہمارے آج کا پس منظر اور پیش منظر ہے اور اس کے کردار ہمارے روز و شب کا حصہ ہیں۔ یہ ناول اپنے قاری کو کئی طرح سے آسودہ کرتا ہے۔ اسے کہانی کی لذت سے سرشار کرتا ہے اور فکر و نظر کی ترغیب دیتا ہے۔ شکیل عادل زادہ

ooo

پورے ناول میں بچی کہانیاں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور بہت خوبصورتی سے ان واقعات کو کہانی کی ضرورت بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں کوئی ہیرو نہیں۔ کوئی ہیروئن نہیں۔ سب کردار اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ یہ ناول ایک ایسا تجربہ ہے جس نے خود اپنی تکنیک وضع کی ہے۔ فردوس حیدر

آخری منظر

سڈنی ۱۹۹۷ء

سڈنی میں ایئرپورٹ کے پاس کوگرا میں واقع فلیٹ اتنا خاموش تھا کہ آٹھ لوگوں سے بھرا ہوا اس کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم خالی خالی اور تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ کمرے کے مکین اس طرح ساکت اور گنگ تھے جیسے تھیٹر میں پردہ اٹھنے کے بعد اسٹیج کے سارے کردار پہلے چند لمحوں کے لئے منجمد کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کمرے میں موجود کرداروں کے منجمد ہونے کا مرحلہ کچھ طویل ہو گیا تھا شاید اس لئے کہ یہ ڈرامے کا پہلا نہیں آخری منظر تھا۔ سب کردار اپنے اپنے حصے کی ذمہ داریاں نباہ کر اس آخری سین تک پہنچے تھے۔ مکالمے بھی سب بولے جا چکے تھے۔ اب تو سب کی سوچیں اپنے اپنے فیصلے کے اثرات کا بھاری پن محسوس کر کے ہانپ رہی تھیں۔ کچھ دن پہلے تک اس کمرے میں انہی لوگوں کی خوشیاں ہانپتیں اور قہقہوں کی شکل میں اپنی تھکن اتارا کرتی تھیں۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی کمرہ، وہی اس کے مکین۔ ان

مکینوں کے وہی مہمان۔ اور فرنیچر بھی ویسا کا ویسا ہی تھا۔ خود بدلا تھا نہ اس کی جگہ۔ اور اس فرنیچر کو اس کمرے میں سجانے والی بھی وہی تھی جو کتابوں کی الماری سے ٹکی ہوئی کھڑی سوچ رہی تھی کہ چند دنوں میں سب کچھ کتنا بدل گیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں ہمیشہ کی طرح ایک طویل سفر کی تھکن سے سوئی ہوئی لگتی تھیں۔

اس نے گردن موڑ کر الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھ کر اتنی زور سے پلکیں جھپکائیں جیسے کمپیوٹر کی طرح ایک ہی کمانڈ دے کر ساری کتابوں کے تمام مضمون اپنے دماغ میں سمیٹ لے گی۔ کاش وہ ایسا کرنے پر قادر ہوتی۔ وہ ایسا کر سکتی تو انہیں بھی پڑھ سکتی جو یہ کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ جن کی یہ کتابیں تھیں۔ وہ خود تو صرف کتابوں کی الماری خریدنے کی گنہگار تھی۔ یا اس میں رکھی ہوئی کتابوں پر چڑھی ہوئی گرد کبھی کبھی جھاڑ دیتی۔ یہ کتابیں اس فلیٹ میں ایک ایک کر کے رہنے کے لئے آنے والے مکین اپنے ہمراہ لے کر آئے تھے۔ اس کی اپنی صرف انسائیکلو پیڈیا کی وہ جلدیں تھیں جو پڑھی نہیں صرف سجائی جاتی ہیں اور جو ایک چرب زبان سیلزمین نے اسے قسطوں پر بیچ دی تھیں۔ وہ منع کر ہی نہیں سکی تھی۔ انکار کی قوت اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔

اس کے اصرار پر ایک دن کسی نے ہنس ہنس کر اس سے ان کتابوں کا تعارف کرایا تھا۔ مڑے مڑے کونوں اور بے جلد کی میلی کتابوں کا ڈھیر ڈائجسٹوں کا تھا۔ جاسوسی ڈائجسٹیں جن میں بڑی چٹخارے دار اساطیری کہانیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ان کہانیوں کے کردار انجانی دنیاؤں پر حکومت کرتے ہیں' اکیلے بڑی بڑی فوجوں پر حاوی ہوتے ہیں اور کسی کا بھی چہرہ دیکھ کر اس کے خیالات اخبار کی طرح پڑھ لیتے ہیں۔ جاسوسی کے ساتھ عورتوں کے لئے شائع ہونے والی ڈائجسٹیں بھی تھیں۔ جن میں سو سال پہلے کے ہندوستان کے مسلم سماج کا نقشہ ہوتا' ایک امیر لڑکی ہوتی جو اپنے ایک غریب لیکن بہت خوددار رشتے دار پر عاشق ہو کر طبقاتی سماج کے دکھ سہتی لیکن آخر میں شادی کر کے بچے پیدا کرنے کے کام میں مصروف ہو جاتی۔

انہی ڈائجسٹوں کے ساتھ چھوٹے سائز کی پتلی پتلی کتابیں جاسوسی کہانیاں لکھنے

والے ایک مصنف کی تھیں۔ ان کا ہیرو احمق نظر آنے والا ایک ایسا نوجوان تھا جو سیکریٹ سروس کا سربراہ تھا اور بڑے بڑے مجرموں کو گردن پکڑ کر جیل میں بند کرا چکا تھا۔ وہ ایسا رقص کرنے پر قادر تھا جسے شروع کر کے وہ تیزی سے برسائی جانے والی گولیوں سے اپنے جسم کو صاف بچا لے جاتا۔

ان کے علاوہ پاکٹ سیریز میں چھپے ہوئے منٹو' کرشن اور عصمت کے افسانے' فیض' فراز اور ساحر کے مجموعے' ایک سالخوردہ سی جلد بندھی کتاب غالب کا دیوان تھی۔ مولانا تھانوی کا بہشتی زیور اس کے ساتھ تھا جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ پرانے زمانے میں لڑکیوں کے جہیز میں شامل ہوتا تھا اور مسلمان لڑکیوں کو شادی کے امتحان سے گزرنے کے لئے تیار کرتا تھا۔ اسی کے نیچے شیلف میں رکھے ہوئے دینی موضوعات پر اسرار احمد کے چھ ویڈیو کیسٹ اور ان کے ساتھ ڈاکٹر طاہر القادری کے تبلیغی کتابچے تھے۔ ایک کونے میں ماؤ کے اقوال کی سرخ کتاب رکھی تھی' لیکن بالکل الگ تھلگ۔ اس کی بوسیدہ جلد انقلاب کے خوابوں کی طرح جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ ماؤ کے اقوال کے ساتھ چند انگریزی ناول لڈلم' فورستھ اور گرشن کے تھے۔ وہ انہیں پڑھ سکتی تھی لیکن اسے بین الاقوامی سازشوں اور جاسوسی کے گورکھ دھندوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو خواب دیکھنے والی تھی۔ اسے خواب دیکھنے اور ان میں گم رہنے میں مزا آتا تھا۔ خواب دیکھنے سے اس کے پاس اتنا وقت کبھی نہیں بچا کہ وہ ان کتابوں میں سر کھپاتی۔ اسے یہ حیرت ہو رہی تھی کہ جن کے ساتھ اتنے عرصے سے رہ رہی تھی وہ پڑھنے کا کتنا مختلف مزاج رکھتے تھے۔

اسے ان ساری کتابوں میں جاسوسی ڈائجسٹوں والے کردار پسند آئے تھے یا اچھل کود کر کے گولیوں سے بچ جانے والا احمق جاسوس' تعارف کرانے والے نے ان کرداروں اور ان کہانیوں کی کتنی ہنسی اڑائی تھی' لیکن جو حقیقت سے اور خود اس کی اپنی کہانی سے کتنے قریب تھے۔ احمق نے اچھل کود کی تربیت حاصل کی تھی' لیکن اس معاشرے اور اس طبقے میں جس میں وہ رہتی تھی زندگی ایک اچھل کود ہی تو تھی۔ کسی تربیت اور مشق کے بغیر مشکلوں اور مصیبتوں کی گولیوں کا سامنا کرنے اور ان

سے بچنے کی اچھل کود۔ ہر روز کئی کئی بار مرنے کے باوجود زندہ رہنے کی جستجو' ایک
ایسی اچھل کود جس میں ڈور کا آخری سرا دور تک نظر نہیں آتا۔ جاسوسی ڈائجسٹ کا
وہ کردار اس سے کتنا قریب تھا جو اکیلا فوجوں پر بھاری ہوتا۔ وہ خود پانچ فٹ چار انچ
لمبی اور پچپن کلو کی کمزور سی نظر آنے والی لڑکی تھی' لیکن اس نے المیوں کے کیسے
کیسے دیو پچھاڑے تھے۔ غموں اور دکھوں کے لشکر اس پر حملہ آور ہوتے رہے
لیکن اس نے ایک ایک کر کے سب کو چت کیا تھا' سب کی گردنیں مروڑ ڈالی تھیں۔
اور وہ کردار جو سب کے چہروں سے ان کے خیالات پڑھتا تھا۔ کتنی یکسانیت تھی خود
اس میں اور اس کردار میں۔ وہ اس کمرے میں موجود سب کے چہروں پر ان کی سوچیں
پڑھ سکتی تھی۔ سب کے چہرے اس کے لئے کمپیوٹر کی اس اسکرین کی طرح تھے جن
پر آتے جاتے خیالوں کی تحریریں روشن تھیں۔

اس نے اپنے ساتھ خاموش کھڑے ہوئے شخص کو دیکھا۔ سختی سے بھنچے ہوئے
ہونٹ اور کمرے کی محدود خلا میں کسی انجانے نقطے پر جمی ہوئی اس کی بھوری بھوری
سی آنکھیں اور چہرے پر عزم کی ایسی جھلکیاں جیسے وہ پوری دنیا فتح کئے بغیر چین سے
نہیں بیٹھے گا۔ اس نے سامنے ڈائننگ میز کی کرسی پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے اس شخص
کو دیکھا جسے ابھی ابھی سب نے فرد جرم سنائی تھی۔ لیکن جس کے چہرے پر ندامت
کی ایک شکن بھی نہیں تھی بلکہ پیشانی پر لکیروں نے ایک عجیب سی ضد تحریر کر رکھی
تھی۔ سخت خود غرضانہ سی ضد۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ اس کے لئے نفرت
محسوس نہ کر سکی۔

دو نشستی لیدر کے صوفے پر اپنی بچی کو سمیٹے ہوئے کانچ کی گڑیا جیسی ایک
عورت بیٹھی تھی' ٹوٹی ٹوٹی سی جو ایسا لگتا تھا بڑی محنت سے دوبارہ جوڑ کر بنائی گئی ہو۔
وہ اس طرح سنبھلی ہوئی چوکنی بیٹھی تھی کہ جیسے اٹھی تو ایک بار پھر ٹوٹ کر بکھر جائے
گی۔ اس کے چہرے پر ٹوٹ پھوٹ کے جوڑ بہت نمایاں تھے' لیکن ان سے زیادہ نمایاں
وہ معصومیت تھی جس پر ٹوٹ پھوٹ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ وہ بھی کرسی پر بیٹھے ہوئے
اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو سر جھکائے ڈائننگ ٹیبل کو اس طرح گھور رہا تھا کہ جسے

اس پر من و سلویٰ اترنے والا ہو۔ اس کی آنکھوں سے اس شخص کے لئے نفرت کی کوئی چنگاری نہیں نکلی' وہ تو یہ سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی وہ اپنے فیصلے پر قائم رہ سکے گی۔ اس نے اپنی زندگی کے بارے میں ایک بہت مشکل فیصلہ پہلی بار خود کیا تھا۔ کانچ کی گڑیا کا شیشہ حالات نے گرما کر بہت مضبوط کر دیا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل کی دوسری کرسیوں پر وہ دونوں بیٹھے تھے جن کے لئے اس کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ کچھ نہ تھے' لیکن سب کچھ تھے۔ ان دونوں کے چہروں پر بھی اداسی کا سایہ دراز تھا۔ جیسے کسی قیمتی شے کے کھو جانے کا ملال ہو۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے چہچہانے والی چڑیوں کی آوازیں کسی نے خاموش کر دی ہوں یا باغ کے پھولوں کی ساری خوشبو کوئی لے اڑا ہو۔ وہ سوچ رہے تھے کہ وہ جو اتنے دانا تھے' خود کو اتنا زمانہ شناس اور گرم و سرد سے آگاہ سمجھتے تھے وہ یہ سب کچھ بکھرنے سے کیوں نہ بچا سکے۔ اتنے مضبوط ہو کر بھی حالات کے دھارے پر بند کیوں نہ باندھ سکے۔

اور وہ جس پر ان سب کی نظریں بار بار آ کر رکتی تھیں سوچ رہا تھا کہ یہ سب اتنے خود غرض کیوں ہو گئے ہیں' یہ سب جن کے لئے اس نے کیا کیا نہ کیا اسے یکطرفہ فیصلہ سنا کر مصلوب کیوں کر رہے ہیں۔ کمرے میں موجود سب کے چہروں کا طواف کر کے اسے وہ بندھن یاد آئے جن میں وہ ان سب کے ساتھ سماج' قانون اور مذہب کے حوالوں سے بندھا ہوا تھا۔ لیکن اس نے تو ان رشتوں کی پوری طرح پاسداری کی تھی' ان پر آنچ نہیں آنے دی اور انہیں حالات سدھارنے کا ذریعہ بنایا تھا۔ پھر یہ سب اس کے خلاف محاذ بنائے کیوں جمع ہیں۔ ان سب سے تو اس کا کڑے وقتوں کا رشتہ ہے۔ ہم وطنی کا رشتہ...... بے وطنی کا رشتہ.......... اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گزشتہ چند برسوں کے واقعات کا سیلاب اس کی آنکھوں سے گزرنے لگا۔

یہ کیا ستم کہ میں جس زمیں پہ پاؤں رکھوں
اسی زمین کا محور ہٹا ہوا نکلے

1

سڈنی جنوری ۱۹۹۴ء

سڈنی میں پہلا روز سلیم کی یادداشت میں بڑے جلی حرفوں سے لکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے تو انگریزی کے آسٹریلوی لہجے نے اس کی انگریزی قابلیت کو چاروں خانے چت کر دیا تھا۔ پہلے ہی دن انگریزی بول بول کر اس کے جبڑے سوج گئے تھے۔ آسٹریلیا میں داخل ہونے کا ہر قانونی مرحلہ اس کے لئے دشواریاں لے کر آیا تھا۔ سب سے پہلے سپاٹ چہروں اور میکانکی انداز میں داخلے کی مہر لگانے والے تھکے تھکے سے امیگریشن افسروں میں اس کے سبز پاسپورٹ کا جلوہ دیکھتے ہی توانائی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ سوالات کی ایک لہر تھی جو ایک سے دوسرے اور پھر اس سے بڑے تیسرے افسر تک پہنچ کر بھی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ان کی رواں اور سلیم کی اٹکی ہوئی انگریزی نے کمیونیکیشن گیپ اور بڑھا دیا تھا۔ امیگریشن کو یقین کرنا تھا کہ سلیم واقعی

تعلیم حاصل کرنے اور اسے مکمل کر کے واپس جانے کے لئے آیا ہے یا اسٹوڈنٹس ویزا صرف آسٹریلیا میں داخل ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔

امیگریشن کے مرحلے سے کسی طرح نکلا تو کسٹمز کے سبز چینل کو بھی اس کے پاسپورٹ کا رنگ راس نہیں آیا۔ اس چینل سے گزرنے والوں میں وہ واحد مسافر تھا جسے کسٹمز والوں نے الگ لے جا کر اس کے سامان کی چھان پھٹک کے لئے منتخب کیا۔ اس کے سامان کے سارے بخئے ادھیڑ کر بھی وہ ہیروئن اور چرس برآمد نہیں کر سکے لیکن سلیم کی امی نے اپنے ہاتھوں سے اس کی پسند کا جو اچار بنایا تھا اس کی بوتل اور برنس روڈ والے فریسکو کی مٹھائی کا ڈبہ ان کی توجہ حاصل کر گیا۔ انہوں نے اسے وہ نوٹس دکھایا جو ایئرپورٹ کے ہر حصے پر چسپاں تھا کہ کھانے پینے کی یا کوئی بھی نباتیاتی چیز لے کر آنے پر پابندی ہے اور خلاف ورزی پر کئی ہزار ڈالر جرمانہ ہے۔

سلیم شاید کچھ اور دیر آم کے اچار اور فریسکو کی مٹھائی کے مزے چکھتا لیکن کسٹمز کی ایک افسر کی توجہ اس کے بازو پر بندھی لال، نیلی اور ہری پٹیوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ سخت گرمی کی وجہ سے سلیم نے کوٹ اتار دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ امام ضامن نمایاں ہو گئے تھے جو اس کی امی اور خالہ نے تمام تر احتجاج کے باوجود اس کے بازو پر باندھ دیئے تھے۔ اس کی خالہ امام ضامن کی تیاری میں خاص اہتمام کرتی تھیں۔ رنگین پٹیاں کاٹتیں اور کوشش کرتیں کہ اگر ایک سے زیادہ امام ضامن باندھے جائیں تو ان پٹیوں کے رنگ الگ الگ ہوں۔ سلیم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ امام ضامن میں بندھے ہوئے سوا روپے کی نیاز آسٹریلیا میں کس طرح دلا سکے گا، لیکن روایتیں، منطق کو نہیں جانتیں اس کی خالہ نے اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا تھا کہ تم جب اللہ کے حفظ و اُمان میں رہ کر ساتھ خیریت سے واپس آؤ گے تو نیاز ہم دلائیں گے۔

سلیم نے اپنی انگریزی کی پوری صلاحیت استعمال کر کے کسٹمز کی خاتون افسر کو، جس کی توجہ ان رنگین پٹیوں کی طرف گئی تھی، امام ضامن سے وابستہ روایت بتائی کہ اس سفر کے لئے اسے اس کے بزرگوں نے مسلمانوں کے ایک بڑے سینٹ کی ضمانت

میں دیا ہے اور اس پٹی میں جو سکے بندھے ہیں وہ اس کے ساتھ خیریت سے واپسی پر منت کی نیاز کے لئے استعمال کئے جائیں گے۔

کسٹمز افسر خاصی متاثر نظر آئی۔ نرم لہجے میں اس نے پوچھا۔

"کیا آپ اسے کھول کر اس میں بندھے ہوئے سکے ہمیں دکھا سکتے ہیں۔"

"سلیم نے جو چوبیس گھنٹے کے ہوائی سفر کے بعد امیگریشن اور کسٹمز کی سخت گیریوں کے نتیجے میں روہنسا ہو رہا تھا اپنی امی کی چالیس سالہ پرانی سنگر مشین پر سلے ہوئے امام ضامن کے بخئے ادھیڑ کر ایک روپے کا پرزہ اور چونی کسٹمز افسر کے ہاتھ پر رکھ دی۔ تعویذ کی شکل میں تہہ کئے گئے روپے کے نوٹ کو تو اس نے سلیم کو واپس کر دیا لیکن چونی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔"

"میری بیٹی غیر ملکی سکے جمع کرتی ہے' اس کے پاس پاکستان کا کوئی سکہ نہیں ہے' کیا آپ یہ سکہ مجھے دے سکتے ہیں۔" کسٹمز افسر نے بڑی لجاجت سے کہا۔ سلیم نے بڑی خوشی سے چونی کسٹمز افسر کے حوالے کی اور امام ضامن کی برکت سے اچار اور مٹھائی سمیت کسٹمز کا مرحلہ طے کر کے نکل آیا۔

سلیم کا آسٹریلیا آنا ایک اچانک ہونے والا واقعہ تھا جس میں سلیم کی مرضی کو دخل نہیں تھا۔ سلیم این ای ڈی کالج سے انجنیئرنگ کی ڈگری لے کر نکلا تھا اور ایک مقامی تعمیراتی کمپنی میں سول انجنیئر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ ایک دن اسے اپنے خالو کا جو وزارت تعلیم میں جوائنٹ سیکریٹری تھے' پیغام ملا کہ وہ فوراً اسلام آباد پہنچ کر ان سے ملے۔ سلیم ابھی دو مہینے پہلے ہی اسلام آباد سے آیا تھا' لیکن اسے معلوم تھا کہ خالو کی طرف سے یہ بلاوا کسی اشد ضرورت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دوسرے دن ہی وہ اسلام آباد پہنچ کر دفتر میں ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

"انجنیئرنگ میں ماسٹرز کا ایک دو سالہ اسکالر شپ ہے آسٹریلیا کے لئے۔ تم اگر چاہو تو اپنی کوالیفیکیشن بہتر کرنے کے لئے اسے حاصل کر سکتے ہو۔" ابتدائی سلام دعا کے بعد وہ سیدھے مطلب پر آ گئے۔ سلیم کے خالو اپنے فیصلے اسی طرح مگر مدہم لہجے

میں درخواست کرنے کے انداز میں سناتے تھے۔

سلیم کورس کی تفصیلات پڑھتا رہا۔ کورس اس کی پسند کا نہیں تھا۔ وہ سائٹ پر کام کرنے والا انجنیئر تھا جہاں چند ہی مہینوں میں کراچی کی سخت دھوپ نے اس کی کھلی ہوئی رنگت پکی کر دی تھی۔ اسے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر بابو گیری کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب تک عمارت کی بنیادوں میں اس کے بنانے والوں کا پسینہ نہیں گرے گا عمارت مضبوط نہیں بنے گی۔ وہ لوہے کا ہیٹ پہنے مزدوروں کے ساتھ خود بھی دھوپ اور لو کی سختیاں برداشت کرتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ جون جولائی کے مہینے میں زمین کھودنے والوں پر کیا گزرتی ہے۔ دوپہر کو جب دھوپ کی شدت زیادہ ہوتی تو سلیم ایک مزدور کی ڈیوٹی نیو کھودنے والے مزدوروں کی ترائی کرنے پر لگا دیتا۔ یہ مزدور پانی کے پائپ سے ہر تھوڑی دیر بعد کھدائی کرنے والے مزدوروں پر چھڑکاؤ کرتا رہتا۔ اپنے جسموں پر پانی کی یہ ترائی پہلے تو مزدوروں کو بھی عجیب سی لگی، لیکن جب اس سے کام کی شدت میں قدرے آرام کا احساس ہوا تو وہ بھی اس کے عادی ہو گئے۔ سلیم کے سینئر انجنیئر اس لئے خوش تھے کہ مزدور پہلے کے مقابلے میں دن بھر کے دوران زیادہ زمین کھودنے لگے تھے اور اس عرصے میں لو لگنے یا گرمی سے کسی مزدور کی بے ہوشی یا ڈی ہائیڈریشن کا کوئی کیس بھی نہیں ہوا تھا۔

سلیم این ای ڈی کے اپنے کئی سینئر ساتھیوں کو جانتا تھا جنہوں نے بی ای کرنے کے بعد ایم بی اے کیا، مارکیٹنگ کے کورس کئے کچھ ریسرچ کی طرف چلے گئے اور ان میں بیشتر اب انجنیئرنگ کی نوکر شاہی کا حصہ تھے جن کا زیادہ تر وقت میٹنگوں میں یا ٹینڈروں کی سیاست میں گزرتا تھا۔ وہ اپنے آرام دہ دفتروں میں بیٹھ کر پل، عمارتیں اور سڑکیں بناتے، دریاؤں پر بند باندھتے اور سرنگیں نکالتے، لیکن جن کے پسینے کی کوئی بوند اس کی بنیادوں میں شامل نہیں ہوتی۔ سلیم تو خالی زمین کے پیٹ کو چیر کر اس کے بطن سے عمارت کو نکلتے اور بڑا ہوتے دیکھنے کی لذت حاصل کرنا اور

اس میں لگی ہوئی ایک ایک اینٹ اور ماربل کے ایک ایک ٹکڑے سے ذاتی شناسائی چاہتا تھا۔

لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ صدیقی صاحب کی بات کو رد کرنا اس کے لئے بہت مشکل ہو گا۔ وہ اس کے صرف خالو ہی نہیں تھے بلکہ وہ ان کے ساتھ رشتوں کی کئی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ صدیقی صاحب نے اپنے پورے کیرئیر میں کبھی اقرباء پروری نہیں کی اور چند دل جلے رشتے داروں کے بقول سخت بے فیض آدمی تھے۔ سلیم نے ان کی اسی کمزوری کو نشانہ بنایا۔

"کئی اور امیدوار ہوں گے جو مجھ سے زیادہ اہل ہوں گے اور ریسرچ سے دلچسپی رکھتے ہوں گے۔ آپ کو پتہ ہے میں ریسرچ کا آدمی نہیں ہوں میں تو......"

صدیقی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے بولنے سے روک دیا۔

"مجھے معلوم ہے تم کیا ہو۔" صدیقی صاحب میز پر آگے کی طرف جھک آئے۔ ان کی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں نے بڑی مضبوطی سے ایک دوسرے کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ سلیم نے بہت مضبوط اعصاب والے صدیقی صاحب کو اس طرح مضطرب نہیں دیکھا تھا۔

"میں کوئی بے انصافی نہیں کر رہا۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں بے انصافی کر ہی نہیں سکتا۔ میں ایک بے انصافی روکنے کے لئے تمہیں یہ اسکالر شپ دے رہا ہوں۔" صدیقی صاحب کا لہجہ سخت اور فیصلہ کن ہو گیا۔ "میں ایک غلط کام کو ہونے سے روک دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں اسکالر شپ دے کر تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا بلکہ یہ اسکالر شپ لے کر تم مجھ پر احسان کرو گے اور مجھ پر نہیں اپنے ملک پر احسان کرو گے۔"

سلیم حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ صدیقی صاحب اب اپنی کرسی کی پشت سے ٹک گئے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بھی اسی طرح بندھی بندھی پشت پر چلی گئی

تھیں جن پر اب ان کا شفاف سر ٹکا ہوا تھا۔ نظریں سلیم کے چہرے سے ہٹ کر چھت سے لٹکے ہوئے سالخوردہ پنکھے پر جم گئی تھیں جن پر مکھیوں کے گو اور نوکر شاہی کے برسوں کے ناکارہ پن کی گرد جمی ہوئی تھی۔

اپنی نظروں کی سمت اور نشست کے انداز میں کوئی تبدیلی کئے بغیر صدیقی صاحب دھیمے انداز میں اس طرح بول رہے تھے جیسے سلیم سے نہیں خود اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔

2

اسلام آباد ۱۹۹۲ء

صدیقی صاحب کو صبح ہی صبح سیکریٹری نے دفتر میں آ کر ملنے کی درخواست کی تھی۔ صدیقی صاحب کو یقین تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہو گی کیونکہ سیکریٹری ان سے اشد ضرورت کے بغیر ملنے سے گریز کرتے تھے اور نوٹنگ یا فون کے ذریعے رابطے کو کافی سمجھتے تھے۔ انہیں یاد تھا کہ اسی طرح ایک دفعہ پہلے بھی ان کے سیکریٹری نے انہیں بلایا تھا اور اس کا نتیجہ کسی کے حق میں خوشگوار نہیں نکلا تھا۔ یہ شاید ۱۹۹۰ء کے موسم گرما کی بات تھی۔ عظیم الدین صدیقی پاکستانی نوکر شاہی کی اس نایاب نسل سے تعلق رکھتے تھے جو پاکستان کو ایک مثالی ریاست بنانے کے وعدوں کو بڑی سنجیدگی سے اپنے سینے سے لپٹائے پاکستان آئی تھی۔ لیکن اس مثالی ریاست میں گزرے ہوئے ان چالیس پینتالیس برسوں میں انہوں نے اپنی عمر اور کیرئیر کے ساتھ ساتھ اپنے اردگرد

صرف بے ایمانیوں، بدعنوانیوں اور بے انصافیوں کو فروغ پاتے دیکھا تھا۔ پھر بھی اپنے سینے میں جو شمع جلا کر آئے تھے۔ اسے انہوں نے بجھنے نہیں دیا تھا۔

ایمانداروں کی اس کمیاب نسل کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وقت نے اسے سخت اذیت پسند اور اذیت رساں بنا دیا تھا۔ ان کا اپنا کوئی کھیل نہیں تھا۔ لیکن وہ دوسروں کے کھیل خراب کر سکتے تھے۔ اور ایسا کرنے کا وہ کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے۔ پاکستان میں عملیت پسندی رواج پا چکی تھی اور لوگوں نے نوکر شاہی سے اپنے کام نکلوانے کے طریقے جان لئے تھے۔ لیکن صدیقی صاحب جیسے لوگ جنہیں کام کروانے کے ان طریقوں سے چڑ تھی، کاموں کے ہونے میں بڑی رکاوٹ تھے۔ وہ سوجے ہوئے انگوٹھے کی طرح الگ ہی نظر آتے تھے۔ سب ان سے الگ بچ کر گزرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن جہاں بھی موقع ملتا اپنی ٹانگ مار کر انہیں گرا دیتے اور اس کوشش میں اپنے انگوٹھے کی سوجن اور بڑھا لیتے۔ سب سے زیادہ مشہور واقعہ کمیونیکیشن منسٹری کے زمانے کا تھا۔

نئی نئی حکومت بدلی تھی۔ کمیونیکیشن کے وزیر حکمراں پارٹی کے بہت سینئر اور بڑے سخت گیر رہنماؤں میں سے تھے۔ ان لوگوں میں سے تھے جو نوکر شاہی کو ملک کے تمام مسائل کا ذمے دار سمجھتے تھے اور اس پر یقین رکھتے تھے کہ نوکر شاہی کی لگامیں کھینچ کر رکھنا عوامی حکومت کے اختیار کی دلیل اور جمہوری نظام کا ایک ضروری عمل ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح نوکر شاہی سیاست دانوں کو ملک کی ساری برائیوں کی جڑ سمجھتی اور یقین رکھتی تھی کہ اگر وزیروں کی راسیں ڈھیلی چھوڑ دی گئیں تو وہ پورے ملک کو بیچ کھائیں گے۔

کمیونیکیشن کے وزیر نے پارٹی کے ایک لیڈر کے کہنے پر اس کے ایک تاجر دوست کو کراچی پورٹ پر اسٹیویڈورنگ کا لائسنس دینے کا حکم جاری کر دیا تھا۔ یہ پورٹ پر جہازوں سے غلہ اتارنے اور چڑھانے کے کام کا لائسنس تھا جو انتظامی ضروریات کی وجہ سے اس کام کا پرانا تجربہ رکھنے والے صرف چند لوگوں کو دیا گیا تھا۔ نئے لائسنس کے اجراء پر مکمل پابندی تھی۔ پورٹ کے معاملات صدیقی صاحب کے

چارج میں تھے انہیں معلوم تھا کہ لائسنس کی کم از کم پندرہ لاکھ کی مارکیٹ ہے۔ انہوں نے کراچی پورٹ ٹرسٹ کے حکام کے مشورے سے دو صفحات پر مشتمل ایک نوٹ لکھا جس میں بڑی تفصیل سے یہ وجوہات بیان کی گئی تھیں کہ لائسنس کیوں نہیں دیا جا سکتا۔ وزیر صاحب نے ان کا نوٹ پڑھے بغیر اس پر اوپر سے نیچے تک کاٹ کا نشان لگایا اور آخر میں جملہ لکھا۔

Nonsense! Report Compliance (بکواس.... حکم کی تعمیل ہو) صدیقی صاحب کو ایسا لگا جیسے کسی نے انہیں سربازار ننگا کر دیا ہو۔ انہوں نے وزیر موصوف کے جملے کو انہیں کے انداز میں کاٹ کر نیچے یہ جملہ لکھ کر فائل واپس بھیج دی کہ وزیر صاحب کے ایک غلط اور غیر قانونی حکم کی تعمیل ممکن نہیں ہے۔ فائل وزیر صاحب تک پہنچنے سے پہلے سیکریٹری کمیونیکیشن کے پاس گئی جس نے صدیقی صاحب کو فوراً اپنے دفتر میں طلب کر لیا۔

سیکریٹری ایک بہت معاملہ فہم شخص تھا' اس نے کئی حکومتوں کو آتے اور جاتے دیکھا تھا۔ وہ اپنے وزیر کے ٹائپ کو بھی سمجھتا تھا اور صدیقی صاحب جیسے بچے کھچے چند ایماندار بیورو کریٹس کی اذیت پسند طبیعت سے بھی واقف تھا۔ اس نے انہیں سمجھایا کہ نئی نئی حکومت آئی ہے' آہستہ آہستہ وہ حکومت کرنے کے طریقے سمجھ جائیں گے تو ان کے انداز بھی بدل جائیں گے۔ انہوں نے صرف اتنا ہی کہا۔ "آپ جانتے ہیں میں نے اپنا لکھا ہوا نوٹ آج تک واپس نہیں لیا۔" سیکریٹری کو پتہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کس کے سامنے سر پھوڑ کر اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔

"آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔" سیکریٹری کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے نتیجے کی کبھی پرواہ نہیں کی۔" صدیقی صاحب یہ کہہ کر کرسی سے اٹھے اور سیکریٹری کے کمرے سے نکل آئے۔ سیکریٹری خاموشی سے انہیں جاتا دیکھتا رہا۔

سیکریٹری کو معلوم تھا کہ وزیر کی حکم عدولی کوئی ایسا جرم بھی نہیں تھی کہ ان کی نوکری ختم کرنے کا سبب بن جاتی۔ زیادہ سے زیادہ کسی بیکار سی منسٹری میں ان کا

تبادلہ ہو جاتا۔ لیکن صدیقی صاحب کو اس سے کبھی کوئی غرض نہیں تھی کہ ان کی پوسٹنگ کہاں ہوتی ہے فکر سیکریٹری کو اپنی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ وزیر کا عتاب سب سے پہلے اسی پر نازل ہو گا اور اسے بھی تبادلہ بھگتنا پڑے گا۔ لیکن کمیونیکیشن منسٹری میں بعض معاملات ایسے تھے جنہیں وہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا' جنہیں نمٹانے کے لئے اسے ابھی کم از کم چند مہینے اس منسٹری میں اور رہنا تھا۔ پھر صدیقی صاحب نے اپنے پاگل پن میں بھی نئی حکومت سے جو قبل از وقت جنگ شروع کر دی تھی وہ ہار دی گئی تو نوکر شاہی کے وقار کو دھچکا لگ سکتا تھا۔

بیورو کریٹس سیاستدانوں کا' حکومت میں آنے والے نئے وزیروں کا شکار آہستہ آہستہ اور بڑے ماہرانہ انداز میں کرتے تھے۔ وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے اپنے وزیروں کو روکنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ہانکا دے کر ان کی رفتار اور بڑھا دیتے اور پیچھے پیچھے خاموشی سے چلتے رہتے۔ جب یہ وزیر ایک ایک کر کے خود اپنے بنائے ہوئے گڑھوں میں گرنے لگتے اور پلٹ کر انہیں مدد کے لئے دیکھتے تو وہ ہاتھ بڑھا کر انہیں ان گڑھوں سے نکالتے اور انہیں اپنی اپنی کرسیوں پر سجا دیتے۔ انہیں بتاتے کہ وہ اپنا اپنا سیاسی کھیل کھیلتے رہیں حکومت انہیں کرنے دیں کیونکہ حکومت ایک پیشہ ورانہ کام ہے جو صرف انہی کو آتا ہے۔ لیکن اس نئی حکومت کے وزیروں نے اپنی دوڑ ابھی ابھی شروع کی تھی' چوہے بلی کے اس کھیل میں انہیں ابھی دور تک بھاگنا تھا۔ گڑھوں میں گرنے کا مقام ذرا فاصلے پر تھا۔

سیکریٹری کو پتہ تھا کہ بیورو کریٹ ہونے کے باوجود صدیقی صاحب نوکر شاہی کے اس نظام کا حصہ نہیں ہیں۔ وہ اس ان کہی حکمت عملی کو نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ وہ ایک ایسا تیر ہیں جو کمان سے نکل گیا تو پھر واپس نہیں آتا۔ سیکریٹری مواصلات نے تھوڑی دیر تک کچھ سوچا اور پھر جیب میں رکھی ہوئی پاکٹ ڈائری میں دیکھ کر اپنے سیاہ فون کی ڈائریکٹ لائن پر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دو فون کرنے کے بعد اس نے صدیقی صاحب کو ایک بار پھر دفتر بلایا اور اس پر اطمینان کی گہری سانس لی کہ صدیقی صاحب کوئی بحث کئے بغیر اثبات میں سر ہلا کر چلے گئے تھے۔ اس کے بعد اپنے

پی اے کو بلا کر اس نے ہدایات دیں۔

"یہ فائل منسٹر صاحب کو جانی ہے لیکن کل صبح سے پہلے ان کی میز تک نہ پہنچے اور دیکھو میرا بلڈ پریشر ہائی ہے میں ڈاکٹر ملک کو دکھانے جا رہا ہوں اگر انہوں نے بیڈ ریسٹ کی ہدایت دی تو پھر کل دن بھر کے لئے میں دستیاب نہیں ہوں گا یا شاید مری کے کاٹیج میں رہوں اور تمہیں معلوم ہے کہ وہاں فون نہیں ہے۔ منسٹر صاحب کے پی اے کو بھی سمجھا دینا کہ کسی اہم معاملے میں اگر انہیں میری ضرورت پڑے تو ایڈیشنل سیکریٹری کو بلوا لیں وہ اسے نمٹا دیں گے...... میں نقوی کو بریف کر کے جاؤں گا۔ اور دیکھو صدیقی صاحب دو دن کی چھٹی پر کراچی جا رہے ہیں' ان کے پی اے کو فون کر کے ان سے درخواست منگوا لینا وہ کہیں بھول نہ جائیں۔ تم ایک ہفتے پرانی تاریخ ڈال کر بیک ڈیٹ میں اس کی انٹری کر لینا۔"

دوسرے دن صبح دفتر میں جب منسٹر نے فائل پر صدیقی صاحب کا نوٹ پڑھا تو ایسا لگا جیسے سانڈ نے اچانک پلٹ کر اپنے سینگ اس کے سینے میں بھونک دیئے ہوں..... پوری وزارت اپنے بہت کم گو وزیر کی چنگھاڑ سے گونج رہی تھی۔ سیکریٹری صاحب وزیر کی تمام کوششوں کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکے تھے اس لئے ایڈیشنل سیکریٹری نقوی وزیر کے سامنے بیٹھا ان کے احکامات کی چنگھاڑ کو اپنے پیڈ پر درج کر رہا تھا۔

"قریشی صاحب کے آتے ہی کل آپ ان سے سیکریٹری کا چارج لے لیجئے۔ وہ اپنے ماتحتوں سے میرے احکامات کی تعمیل نہیں کرا سکتے' کمزور آدمی ہیں میں پرائم منسٹر سیکریٹریٹ کو فون کر رہا ہوں کہ انہیں او ایس ڈی بنا کر کسی کونے میں پڑی ہوئی ڈیسک پر بٹھا دیا جائے۔ وہاں ان کا بلڈ پریشر ٹھیک ہو جائے گا۔ اور صدیقی کو نوکری سے فوری طور پر معطل کرنے کا حکم جاری کر دیں۔"

"کس الزام کے تحت۔" نقوی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"حکم عدولی۔ بغیر اجازت کے دفتر سے غیر حاضری۔ اور میں نے اسٹیویڈورنگ کا جو لائسنس جاری کرنے کا حکم دیا ہے اس کے کاغذات کل تیار ہو کر پارٹی کو چلے

جانے چاہئیں۔ میں اب مزید تاخیر نہیں چاہتا۔" ایڈیشنل سیکریٹری منسٹر کے دفتر میں ایک بہت مصروف صبح گزار کر اپنے دفتر آیا تو اس کا پیڈ وزیر کے احکامات سے بھرا ہوا تھا۔ پی اے کو بلا کر اس نے ساری نوٹنگ کرائی اور یہ ہدایت بھی دی کہ کل صبح تک کاغذات مکمل ہو کر اس کی میز پر پہنچ جائیں۔

"سر اگر آپ کہیں تو آج شام ہی....." بہت فرمانبردار پی اے نے اپنے شرارتی لہجے کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں کل صبح تک۔" نقوی دراز سے اپنا موٹا کیوبن سگار نکال کر اس کے سرے کو کاٹنے لگا۔ پی اے کو معلوم تھا کہ یہ ڈس مس ہونے کا اشارہ ہے۔ اب تھوڑی ہی دیر میں کمرے میں سگار کا گہرا اور بدبودار دھواں پھیل جائے گا جس سے بچنے کے لئے وہ بڑی تیزی سے باہر نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا صاحب قریشی صاحب کی طرح پائپ کیوں نہیں پیتا جس کے دھویں کی میٹھی میٹھی خوشبو ناک میں بھر کر نک چڑھی مسز چنائے کی آنکھیں بھی نشیلی ہو جاتی ہیں۔

دوسرا دن پچھلی صبح کے مقابلے میں بہت سرد اور خاموش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وزارت مواصلات کے دفتر میں رات بھر برف پڑتی رہی ہے اور اب سب کی زبانوں اور ذہنوں پر جم گئی ہے۔ منسٹر کے پی اے نے خبردار کر دیا تھا کہ کسی کی میز پر آج کے مسلم یا فرنٹیئر پوسٹ کی کاپی نظر نہیں آنی چاہئے۔ اگر وزیر صاحب کی نظر پڑ گئی تو ان کی زبان پر جمی ہوئی برف تڑخنے لگے گی۔ اس نے قریشی کے پی اے کو فون کر کے بریف کر دیا تھا کہ صبح ہی صبح پرائم منسٹر ہاؤس سے فون آیا تھا لگتا ہے کہ بڑے بھائی کی ڈانٹ پڑی ہے، صبح سے بلیک کافی کے تین کپ بغیر شکر ڈالے پی چکے ہیں اور مستقل انگریزی میں بات کر رہے ہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد قریشی صاحب کو پوچھتے ہیں۔

نقوی کے پی اے نے قریشی کے پی اے کو فون کر کے بتایا کہ اس کے صاحب کی منسٹر صاحب کے پاس طلبی ہوئی تھی اور نقوی نے واپس آ کر کہا ہے کہ کل وزیر صاحب کے احکامات کے جو پیپر تیار ہوئے تھے ان پر کام نہ شروع کیا جائے اس لئے میں فارغ ہوں اور اب نیچے کینٹین میں بیٹھ کر چائے پیوں گا اور ذرا آرام سے

فرٹیلیزر پوسٹ والی خبر پڑھوں گا۔ سنا ہے وہ مسلم سے زیادہ چٹپٹی ہے۔
صدیقی صاحب کے پی اے نے قریشی کے پی اے کو وہ خبر سنائی جو قریشی کے پی اے کو بھی معلوم نہیں تھی۔ اس نے بتایا کہ شاید صدیقی صاحب ایجوکیشن منسٹری ٹرانسفر ہو کر جا رہے ہیں۔ قریشی کے پی اے کے لئے یہ بات گراں تھی کہ اس کے صاحب سے جونیئر درجے کے افسر کا پی اے اتنے اہم معاملے میں اس سے زیادہ باخبر تھا۔ اس نے حساب فوراً ہی برابر کر دیا۔
"اور تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا نیا صاحب کون ہو گا؟"
"نہیں۔" صدیقی صاحب کے پی اے نے حیرت زدہ آواز میں کہا۔
"سمجھو تمہارے مقدر کھلنے والے ہیں' عباسی پروموٹ ہو کر آ رہا ہے تم اس کی شہرت سے واقف ہو۔ کھانے اور کھلانے والا آدمی ہے۔"
صدیقی صاحب کے پی اے کو عباسی کی وجہ شہرت اچھی طرح معلوم تھی۔
"لیکن یہ ہوا کیسے؟" اس نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔
عباسی قریشی صاحب کی بیوی کے گاؤں کا ہے اور جب سے صاحب کمیونیکیشن کے سیکریٹری ہوئے ہیں ان کے گھر کی سبزی ترکاری وہی لاتا ہے۔ صاحب اسے پسند نہیں کرتے لیکن شاید بیوی کی ڈانٹیں سن کر یا اس کی خدمت سے متاثر ہو کر وہ اسے صدیقی صاحب کی جگہ لا رہے ہیں۔
صدیقی صاحب کے پی اے نے جب فون رکھا تو وہ دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عباسی صدیقی صاحب کی جگہ آ رہا ہے۔ عباسی نے آج صبح ہی اسے فون کر کے تمام ٹھیکیداروں کی فہرستیں اور نئے ٹھیکوں کی تفصیلات تیار کرنے کے لئے کہا تھا۔ عباسی ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو وقت ضائع کرنے پر یقین رکھتے ہوں۔ اسے معلوم تھا کہ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت اس لئے اسے جو کچھ بھی کرنا ہے بہت تیزی سے کرنا ہے۔ عباسی قریشی کے گھر کی سبزی ترکاری ہی نہیں لاتا تھا بلکہ راتوں میں بستر پر تنہا کروٹیں بدلنے والی اور شوہر کی توجہ سے محروم قریشی کی فربہ اندام بیوی کی کمر اور ٹانگیں بھی دباتا تھا۔ وہ جب اس کے پیٹ پر پڑے بلوں کو

سمیٹ کر اس کی رانوں کے تھلتھلاتے ہوئے گوشت میں چھپی ہوئی لذتوں کی گزرگاہ تلاش کرتا تو قریشی کی بیوی کو اپنے جسم میں آتش فشاں پھوٹتے اور لاوے چھٹتے ہوئے محسوس ہوتے۔ اس کا بس چلتا تو وہ عباسی کو جوائنٹ سیکریٹری نہیں ملک کا وزیراعظم بنوا دیتی۔ اور شاید بنوا بھی دیتی اگر اس کا نامور بیوروکریٹ اور کنگ میکر باپ زندہ ہوتا جس کی وجہ سے اس کا شوہر آج اس درجے پر پہنچا ہوا تھا۔

قریشی دس بجے سے پہلے دفتر نہیں پہنچ سکا۔ اپنے پی اے سے کل کی پوری رپورٹ لے کر وہ دس منٹ بعد ہی منسٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔

"مسٹر قریشی آپ کہاں غائب ہیں۔ آپ کی وزارت میں کتنا گند پھیلا ہوا ہے اور آپ فون تک پر دستیاب نہیں ہیں۔" منسٹر نے دیکھتے ہی فائرنگ شروع کی۔

"میں اخبار پڑھتے ہی ڈاکٹر کے مشورے کے خلاف مری سے سیدھا دفتر آ رہا ہوں۔ گھر بھی نہیں گیا۔ آپ کو معلوم ہے میرا بلڈ پریشر....."

"جی ہاں مجھے معلوم ہے۔" وزیر نے اس کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

"لیکن یہ مری کے کاٹیج میں فون کیوں نہیں ہے کمیونیکیشن منسٹری کے چپراسیوں کے ٹائلٹ تک میں فون لگے ہیں مری کی کاٹیج اس عیاشی سے کیوں محروم ہے۔"

"فون نہ ہو تو یکسوئی رہتی ہے' کوئی آرام میں مخل نہیں ہوتا۔ میں تو ویک اینڈ پر دفتر کا کام لے کر وہیں جاتا ہوں۔ گھر اور دفتر میں تو فون لگوانے والوں کے فون نہیں رکتے' میرا پی اے بتا رہا تھا کہ کل کوئی اپنے فون کے خراب ہونے کی شکایت کے لئے مجھے تلاش کر رہا تھا۔"

"وہ پرائم منسٹر کے ایڈوائزر تھے۔ آپ نہیں ملے تو انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔ بہرحال میں نے کاٹیج میں فون لگوانے کی ہدایت کر دی ہے۔ میں چاہتا ہوں میرے افسر مجھ سے صرف ایک فون کے فاصلے پر رہیں۔ ہفتے میں ساتوں دن' ۲۴ گھنٹے۔"

سیکریٹری کو عام افسروں میں اپنا شمار ہونا پسند نہیں آیا نہ ہی سیکریٹری کے درجے کے ایک آدمی کو وزیر کے حکم دینے کا یہ انداز۔ لیکن قریشی کو معلوم تھا کہ وڈیروں والی انا اپنی چوٹ سہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔

"آپ نے مسلم اور فرنٹیئر پوسٹ کی خبر پڑھی۔" منسٹراب براہ راست اصل معاملے کی طرف آ رہا تھا۔

"اخبار والے تو بکواس چھاپتے ہی رہتے ہیں who cares" قریشی نے بے اعتنائی دکھائی۔

"I care 'Prime Minister cares'" وزیر کی چنگھاڑ پر قریشی کو اپنا بلڈ پریشر واقعی بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ "آپ کو پتہ ہے کہ اسلام آباد میں ہر سفیر صبح کی ابتدا انہیں اخباروں کو پڑھ کر کرتا ہے۔ پرائم منسٹر بھی صبح کی پہلی کافی انہیں اخباروں کو پڑھتے ہوئے پیتے ہیں۔ دیکھئے دونوں اخباروں کے پہلے صفحے پر موٹی موٹی سرخیاں کیا کہہ رہی ہیں۔" وزیر نے اخبار میز پر قریشی کی طرف پھینکے۔

"میری وزارت مذاق بنی ہوئی ہو گی۔ وزیراعظم مجھے دو بار فون کر چکے ہیں۔ سخت ناراض ہیں۔" قریشی کو گڑھے میں گرے ہوئے وزیر کا ہاتھ مدد کے لئے رکھا ہوا نظر آیا۔

"وزیراعظم کا خیال ہے کہ آپ معاملات ٹھیک کر کے اس گند کو صاف کرنے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔"

قریشی کو اپنا قد بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ پرائم منسٹر اس کی صلاحیتوں سے اس حد تک باخبر ہیں۔

"سر آپ بتائیں کیا کرنا ہے۔ آپ جس طرح کہیں گے معاملات اسی طرح طے کر لئے جائیں گے۔"

قریشی اپنے وزیر کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے گڑھے سے کھینچنا نہیں ہے' بلکہ اس طرح نکالنا ہے کہ اس کے بدن پر ہلکی سی خراش بھی نہ آئے۔

"مسٹر قریشی یہ آپ کی اپنی وزارت کی گند ہے اسے صاف کر کے آپ مجھ پر احسان نہیں کریں گے۔ اسے صاف کرنا آپ کی ذمے داری ہے آپ کے ان بیورو کریٹس کی ذمے داری ہے جنہوں نے پنکھے کا رخ اس گند کی طرف کر کے اسے ہر

طرف بکھیر دیا ہے۔"

قریشی کو معلوم تھا کہ اتنے بڑے وڈیرے کی انا اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گی۔

"آپ کے اخبار کا یہ رپورٹر خیال ظاہر کرتا ہے کہ اس لائسنس کے دیئے جانے سے جو منافع ہو گا اس کا ایک حصہ مجھے بھی جائے گا! What a rubbish آپ کو معلوم ہے چند لاکھ روپے میرے لئے چند ٹکوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔"

"میں جانتا ہوں۔" قریشی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور یہ بے وقوف لکھتا ہے۔" منسٹر نے قریشی کے اثبات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "کہ میں اپنے دوستوں کو نواز رہا ہوں۔ تو کیا میرے دوستوں کو بزنس کرنے کا حق نہیں ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے مسٹر قریشی کیا میرے وزیر بننے کی وجہ سے میرے سارے بزنس مین دوست اپنا کاروبار بند کر کے حکومت سے زکوٰۃ لینے لگیں۔ اور پھر وہ میرا دوست بھی نہیں۔ میں ٹھیکیدار قسم کے لوگوں کو دوست نہیں بناتا میری پارٹی کے ایک اہم لیڈر کا دوست ہے۔ برے وقتوں میں پارٹی کی مدد کرتا رہا ہے۔"

"لیکن ان کی لائن آف بزنس الگ ہے شاید اس وجہ سے....."

"Bull Shit" قریشی کی بات کاٹتے ہوئے وزیر نے صبح سے بھرے ہوئے اپنے غصے کو نکالنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ "آپ کل تک ایگریکلچر کے سیکرٹری تھے۔ اس سے پہلے انفارمیشن منسٹری میں تھے اور آج کمیونیکیشن میں ہیں۔ مسٹر قریشی آپ کی وجہ مہارت کیا ہے۔ آپ کو اس پر اعتراض ہے کہ کل تک انگریزی فلمیں امپورٹ کرنے والا آج شپنگ کیوں کر رہا ہے جبکہ رسک پر وہ اپنا پیسہ لگا رہا ہے لیکن ایک بیوروکریٹ سرکاری خرچے پر اپنی حکمرانی کے علاقے بدلتا رہتا ہے۔ کسی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔"

قریشی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا' اور اگر ہوتا بھی تو وہ خاموش رہتا۔ اس کا اصول تھا کہ اپنے افسروں سے' خواہ وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں' بحث مت کرو۔

اس کی اتنی تیزی سے ہونے والی ترقی کا ایک راز اس کا یہ اصول بھی تھا۔

"اور یہ جو اخبار نے آپ کے اس جوائنٹ سیکریٹری کو جسے آپ بڑی عزت سے صاحب کہتے ہیں ہیرو بنایا ہے کہ ایک ایماندار بیورو کریٹ نے اپنی نوکری کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وزیر کو غلط کام کرنے سے روک دیا۔" منسٹر نے سلسلہ تکلم جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ایمانداری My foot یہ ایمانداری نہیں ایک بیماری ہے۔ اپنی بزدلی اور ناکامی کو باعزت بنانے کی بیماری۔ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کا انتقام جو ہر تیز دوڑنے والے کو گرا کر اپنی پیٹھ تھپکتے ہیں اور ایماندار ہونے کا تمغہ سینے پر لگائے اکڑے پھرتے ہیں۔"

قریشی اس پر بھی بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس طرح کے بے شمار تجزیئے اس سے پہلے بھی کئے گئے تھے اور وہ صدیقی صاحب اور ان جیسے چند دوسرے سرپھروں کے رویوں میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکے تھے۔

"آپ کو معلوم ہے ایماندار کون ہے۔" منسٹر کی تقریر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"ایماندار کراچی کی ایک نواحی بستی میں رہنے والا میری پارٹی کا وہ ورکر ہے' جسے فوجی حکومت نے مجلس شوریٰ کا رکن بنانے کی پیشکش کی لیکن اس نے بھوکا رہنے کو ترجیح دی اور پارٹی سے غداری نہیں کی۔ وہ برسوں جیلوں میں رہا اس کی بیوی اپنے بچوں کو بہلانے کے لئے دن بھر چولہے پر تربوز کے چھلکے ابالتی رہتی' لیکن کبھی شکایت نہیں کرتی۔ اس کا ایک بچہ علاج نہ ہونے کی وجہ سے مرگیا۔ لیکن اس نے پھر بھی اپنی وفاداری کا سودا نہیں کیا۔ قریشی صاحب ایمانداری اسے کہتے ہیں۔"

قریشی پوچھنا چاہتا تھا کہ لاکھوں کو ٹکے سمجھنے والے اپنی پارٹی کے اتنے وفادار کارکن کے خاندان کو بھوک سے کیوں نہ بچا سکے۔ اور اس کے مرتے ہوئے بچے کے علاج کے لئے مدد فراہم کیوں نہیں کر سکے۔ لیکن وہ افسروں سے بحث نہ کرنے کے اپنے اصول سے مجبور تھا۔ قریشی منسٹر کی پارٹی کے اس ورکر سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ اپنے جوان بیٹے کو منسٹری میں چپراسی بھرتی کرانے خاص طور پر کراچی سے

اسلام آباد آیا تھا۔ لیکن تمام کوششوں کے باوجود وزیر صاحب تک اس کی رسائی نہ ہو سکی تھی۔

"میں اگر اپنے اس ورکر کو منسٹری میں نوکری دوں تو آپ کے صدیقی صاحب جیسے ایماندار بیوروکریٹ اخباروں میں خبریں چھپوا دیں گے۔"

قریشی چاہتا تھا کہ وہ منسٹر کو بتائے کہ صدیقی صاحب نے ان کی پارٹی کے اس ایماندار ورکر کے بیٹے کو چپراسی کی بجائے اسی کے رہائشی علاقے کے ٹیلی فون ایکسچینج میں زیر تربیت ٹیکنیشن کی نوکری دے دی تھی۔ قریشی نے صدیقی صاحب کی سفارش پر خود اس لڑکے کی پوسٹنگ کنفرم کی تھی۔ لیکن منسٹر کو اس وقت یہ بتانا قریشی کے گیم پلان کو نقصان پہنچا سکتا تھا اس لئے وہ منسٹر کی اگلی ہدایات کا خاموشی سے منتظر تھا۔

"صدیقی کے خلاف انکوائری کرائیے۔ مجھے یقین ہے کہ اخبارات کی یہ خبر اس نے ہی لیک کی ہے۔ انکوائری تک اسے معطل رکھئے۔"

قریشی نے منسٹر کی ہدایت کو خاموشی سے سنا اور پھر بڑے نپے تلے انداز میں اس نے بولنا شروع کیا۔

"سر! اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں معاملات کو ٹھیک کروں تو آپ کو صبر سے کام لینا ہو گا۔"

وزیر کوئی جواب دیئے بغیر قریشی کو سوالیہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ قریشی نے اپنے سوچے سمجھے ہوئے خطاب کو جاری رکھا۔

"صدیقی صاحب کو معطل کر کے آپ اخبارات کو موقع دیں گے کہ وہ اپنے ہیرو کو شہید کے مرتبے پر فائز کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم صدیقی کو واپس آنے دیں اور......"

"قریشی صاحب صدیقی کے مسئلے پر کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ اسے جانا ہی پڑے گا۔" منسٹر نے قریشی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' اسے نکال دیں گے۔" قریشی نے پہلو بدلا۔

"میرا پی اے بتا رہا تھا کہ صدیقی صاحب نے دو ہفتوں کی چھٹی اور مانگی ہے۔

کراچی میں ان کا کوئی گھریلو معاملہ ہے۔ میں اس عرصے میں ان کے تبادلے کا کام مکمل کرلیتا ہوں۔ ایجوکیشن سیکریٹری سے بات کروں گا۔ وہ انہیں لینے پر تیار ہو جائیں گے۔"

"لیکن سرکاری اطلاعات افشا کرنے کے جرم کا کیا ہو گا۔ یہ ایک سنگین معاملہ ہے۔ اس نے آفیشل سیکریٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس معاملے کو وزارت داخلہ میں بھیجئے یا براہ راست ایف آئی اے کو دے دیجئے۔"

منسٹر نے آکسفورڈ میں سیکھے ہوئے انگریزی لہجے میں اپنا کلام جاری رکھا۔ لیکن قریشی کو صورتحال کی مناسبت سے اس وقت اردو ہی بولنی تھی۔ انگریزی بولنے میں تحکمانہ انداز غالب ہوتا ہے۔ یا انگریزی اس وقت ضروری ہوتی ہے جب دلائل کمزور پڑنے لگیں۔ نوکر شاہی کی اس دنیا میں اردو محکومیت کی زبان تھی اور قریشی کو وزیر کے سامنے مودبانہ انداز اختیار کرنے کے لئے اردو کو ذریعہ اظہار بنانا تھا۔ پھر قریشی اپنی انگریزی کو وزیر کے آکسفورڈ والے لہجے کے سامنے احساس کمتری میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"ڈاکومینٹس کونفیڈنشل نہیں تھے، آفیشل سیکرٹ ایکٹ اس پر لاگو کرنا مشکل ہو گا، میں نہیں سمجھتا ہوم یا ایف آئی اے والے کیس لینے پر تیار ہوں گے۔"

قریشی نے تمام تر ادب ملحوظ رکھتے ہوئے کہا۔ لیکن وزیر کی آنکھوں کی چنگاریاں ہونٹوں کے راستے اسی طرح کوند رہی تھیں۔

"قریشی صاحب پچھلی حکومت نے میرے خلاف آفیشل سیکریٹ ایکٹ کے کیس بنائے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیس ان ڈاکومنٹس کے ایک میگزین میں چھپنے پر بنے تھے جو میرے خلاف ایک اور کیس میں پراسیکیوشن نے عدالت میں جمع کرائے تھے۔ یہ وہ ڈاکومنٹس تھے جو عدالت کے چپراسیوں تک کے ہاتھوں سے ہو کر گزرے تھے۔ لیکن آپ کے فوجی صاحبوں کا خیال تھا کہ انہیں اخبار میں چھپوا کر میں نے سرکاری راز ظاہر کر دیئے ہیں۔ تین سال تک بند کمرے میں مقدمہ چلا اور ایک سال تک میں ضمانت بھی نہیں لے سکا۔ تو آپ کا صدیقی کیا قومی سطح کے لیڈروں سے

زیادہ بڑی چیز ہے؟"

قریشی نے سوچا کہ اب اس کی انگریزی بولنے کا وقت آ گیا ہے ورنہ بات طویل ہوتی جائے گی۔ اسے وزیر کے اس کیس کے بارے میں معلوم تھا۔ پوری جزئیات کے ساتھ معلوم تھا کیونکہ یہ کیس خود اس نے تیار کیا تھا۔ اس زمانے میں وزیر کی پارٹی کے اہم لیڈروں کے خلاف کیس بنانے کے لئے قریشی کی خدمات خاص طور پر وزارت داخلہ کے حوالے کی گئی تھیں۔ قریشی کو خوشی تھی کہ وزیر کو اس بات کی خبر نہیں ہے لیکن اب سیکریٹری اس لاحاصل بحث کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے بہت نپے تلے لہجے میں بغیر اٹکے ہوئے مگر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"مسٹر منسٹر۔ وہ کاغذات جن کے چھپنے پر آپ کے خلاف کیس بنا تھا ان پر خفیہ کی مہر لگی تھی۔ ہمارے کاغذات پر ایسا نہیں تھا۔ اس لئے آفیشل سیکریٹ کے کیس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ صدیقی صاحب کے خلاف ہم زیادہ سے زیادہ محکمہ جاتی کارروائی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی یہ ثابت کرنا مشکل ہو گا کہ خبر صدیقی صاحب نے اخباروں کو دی تھی۔"

قریشی کو معلوم تھا کہ صدیقی صاحب کے فرشتوں کو بھی یہ معلوم نہیں ہو گا کہ خبر کس نے اور کس طرح اخباروں کو پہنچائی ہے۔ تاہم اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"آپ کو پتہ ہے کہ جرنلسٹ کتنے ہی بکاؤ کیوں نہ ہوں اپنا ذریعہ کبھی نہیں بتائیں گے۔ پھر صدیقی صاحب کا سابقہ ریکارڈ بالکل بے داغ اور بہت اچھا ہے۔ محکمے میں ان کی عزت بھی بہت ہے۔ کوئی انہیں کتنا ہی ناپسند کرے انہیں سزاوار قرار دے کر اپنے ضمیر کے بوجھ میں اضافہ کرنا پسند نہیں کرے گا۔ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ صدیقی صاحب کی معطلی اخبارات کو ایک چٹپٹا فالو اپ فراہم کرے گی۔ اور وہ اخبار بھی جنہوں نے یہ خبر نہیں چھاپی اس دوڑ میں شریک ہو جائیں گے۔"

قریشی نے سانس لینے کیلئے توقف کیا اور سوچا کہ کاش اس وقت وہ اپنا پائپ سلگا سکتا۔ اسے یقین تھا کہ وزیر کو بھی تمباکو نوشی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو گی۔

وہ جانتا تھا کہ اس کا وزیر بھی پائپ پیتا ہے۔ لیکن دفتر میں نہیں صرف شام کو اپنی شراب نوشی کے دوران۔ قریشی کو یہ دیکھ کر بھی اطمینان ہوا کہ وزیر کی آنکھوں کی چنگاریاں اس وقت راکھ بنی ہوئی تھیں۔ اس نے قریشی کو درمیان میں ٹوکنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ قریشی کو یقین تھا کہ گڑھے میں گرا ہوا وزیر باہر نکلنے کے لئے اس کا ہاتھ تھامنے پر آمادہ ہو چکا ہے۔ قریشی نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"صدیقی صاحب، جیسا کہ آپ نے حکم دیا ہے، اس وزارت کی اب شکل بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں ان کی دو ہفتے کی چھٹی منظور کر رہا ہوں۔ انہیں کسی اور وزارت میں کھپانا مشکل ہے کیونکہ ان کے بہت اکھڑ رویئے کی وجہ سے کوئی انہیں لینے پر تیار نہیں ہوتا، لیکن ایجوکیشن سیکریٹری میرے ذاتی دوست ہیں وہ میرے کہنے پر صدیقی صاحب کو لے لیں گے۔ پھر ایجوکیشن میں ان ہی جیسے آدمی کی ضرورت ہے اسٹیبلشمنٹ والوں کو بھی اعتراض نہیں ہو گا۔ ان کی جگہ میں عباسی کو لے رہا ہوں۔ چلتا پھرتا آدمی ہے، ایک مہینے میں جب اس خبر کا شور دھیما ہو جائے گا وہ آپ کی خواہش کے مطابق اسٹیویڈورنگ کا لائسنس بھی جاری کر دے گا۔ اخبارات کو میں منسٹری کی طرف سے سرکاری طور پر آج کی خبر کی تردید بھجوا دیتا ہوں۔ بلکہ دونوں رپورٹروں کو خود بلا کر بریف کر دیتا ہوں۔"

قریشی کو اس وقت شدید حیرت ہوئی جبکہ وزیر نے کسی رد و قدح کے بغیر اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے کہا۔ "مسٹر قریشی میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ آپ کی وزارت کی گند ہے جسے صاف کرنا آپ کی ذمے داری ہے۔ آپ جو مناسب سمجھتے ہیں کیجئے صرف یہ خیال رکھئے کہ میری دی ہوئی گائڈ لائنز Violate نہ ہوں۔ اور آپ جو بھی کریں اس کی پہلے سے اطلاع مجھے ضرور ہونی چاہئے۔"

اب وزیر اردو بول رہا تھا اور قریشی کے روئیں روئیں میں تالیاں بج رہی تھیں۔ وزیر قریشی کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ گڑھے سے باہر نکل رہا تھا۔ قریشی کو معلوم تھا کہ پوری نوکر شاہی کل اس کی پیٹھ ٹھونکے گی۔ قریشی کی قسمت پر سب کو

افسوس تھا کہ نئی حکومت میں اسے وہ ببر شیر وزیر ملا تھا جس کی پیٹھ پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ قریشی کو دوسرے بیشتر وزیروں کے پس منظر کا علم تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج کی صورتحال میں اگر کوئی اور وزیر ہوتا تو وہ اب تک الٹا لیٹا ہوا قریشی کو اپنی کمر پر چڑھنے کی براہ راست دعوت دے چکا ہوتا۔ قریشی نے ببر شیر کو رام کر لیا تھا۔

دوسری طرف وزیر بھی خوش تھا کہ اس نے اپنی انا یا عزت پر کوئی حرف آئے بغیر اس سارے معاملے کو خوش اسلوبی سے نمٹا دیا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اس سارے معاملے کا آخری نتیجہ اس کے اپنے حق میں ہوا ہے۔ صدیقی اس دفتر میں اپنی شکل دکھانے دوبارہ نہیں آئے گا' ایک دو مہینے بعد سہی اس کی سفارش پر اسٹیویڈورنگ کا لائسنس بھی جاری ہو جائے گا۔ وزیر کو سب سے زیادہ اطمینان اس بات پر تھا کہ اب صدیقی کی جگہ عباسی جوائنٹ سیکریٹری ہو گا جو اس کے اور پارٹی کے مفادات کا پوری طرح خیال رکھے گا اور اسے اپنے کاموں کے لئے بار بار قریشی کا ذریعہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ عباسی بہت عملی آدمی تھا اور اس نے ترقی کے لئے صرف قریشی کا زینہ استعمال کرنے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ پارٹی کا ایک ذریعہ استعمال کر کے وزیر تک بھی رسائی حاصل کی تھی۔ وزیر مطمئن تھا کہ عباسی پارٹی کا آدمی ہے وزارت کے سسٹم میں داخل کرنے کے لئے اسے کچھ نہیں کرنا پڑا اور قریشی یہ کام خود اپنے طور پر انجام دے رہا تھا۔

قریشی نے جو بساط سجائی تھی اس کی خوبی یہی تھی کہ اس میں ہر کھلاڑی جیتا ہوا تھا۔ جہاں تک صدیقی صاحب کی بات تھی ہار جیت ان کا مسئلہ نہیں تھا۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کمیونیکیشن میں کام کرتے ہیں یا ایجوکیشن میں۔ صدیقی صاحب اس منڈی کا سرمایہ تھے جو کبھی نیچی اونچی نہیں ہوتی۔ شیئر مارکیٹ کا وہ اسٹاک تھے جس پر تیزی اور مندی کا اثر نہیں ہوتا۔ ان کے حصص کوئی خریدتا نہیں تھا اور جس نے خریدے ہوئے تھے وہ بیچنے پر تیار نہیں تھا۔

وزیر نے ایک بار پھر انگریزی کا سہارا لیا۔

"پریس کو آپ آج خود سنبھالئے۔ میرا پی آر او ایک بیوقوف آدمی ہے وہ اس

سطح پر پریس کو سنبھال نہیں سکے گا۔ آج صبح میں نے اسے بلا کر پوچھا کہ اسے پتہ ہے کہ منسٹری کے بارے میں مسلم اور فرنٹیئر پوسٹ میں کیا چھپا ہے۔ اس نے دونوں اخبارات پڑھے ہی نہیں تھے۔ میرے کہنے پر اس نے کہا کہ وہ اخبار گھر لے کر جائے گا اور پڑھ کر کل صبح مجھے سمری بھیجے گا۔ وہ اس بات پر زیادہ پرجوش تھا کہ نواب شاہ کے ایک مقامی اخبار کا رپورٹر میرا انٹرویو کرنے آیا ہے جس کا کرایہ مجھے یقین ہے کہ اس نے وزارت کے بجٹ سے دلوایا ہو گا۔ اس کا اصرار تھا کہ میں سارے کام چھوڑ کر اس انٹرویو کے لئے وقت نکالوں۔ وہ روز مجھ سے فون کنکشن کی دس پندرہ درخواستوں پر دستخط کرا کے لے جاتا ہے۔ میں تعلقات عامہ کے ان طریقوں سے بیزار آ گیا ہوں۔"

"میں آج ہی سیکریٹری انفارمیشن کو فون کر کے پی آر او تبدیل کرا دیتا ہوں۔" قریشی نے اپنی کارکردگی کی داد چاہی۔

"نہیں رہنے دیجئے' میں نے وزیر اطلاعات کو کہہ دیا ہے۔ میں اپنی پارٹی کے ایک انفارمیشن ایکسپرٹ کو منسٹری کا پی آر او ایڈوائزر بنا رہا ہوں۔ میرا پی اے آپ کو آج ہی اس کے پیپرز بھیج دے گا۔ آپ فوری طور پر اس کے آفس میں بیٹھنے کا بندوبست کریں۔"

"جی۔" قریشی اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"کوئی اور اہم معاملہ ہو تو ابھی نمٹا دیں' میں آئندہ چند روز کے لئے دستیاب نہیں ہوں۔ میں ایک دو روز کراچی میں رہوں گا جہاں سے مجھے اندرون سندھ جانا ہے۔"

وزیر نے اپنے اعصاب اور جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کرسی کی پشت پر اپنا سر ٹکا دیا تھا۔ قریشی کو اب یقین ہو گیا تھا کہ صدیقی والا معاملہ جس طرح اس نے چاہا تھا نمٹ گیا ہے اور وزیر بھی معاملے کے اس طرح طے ہونے پر مطمئن ہے۔

"آپٹک فائبر والے کنٹریکٹ کے پیپر تیار ہو گئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو جانے سے پہلے دیکھ لیں۔"

"میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں آپ اس کی قانونی حیثیت پر لاء منسٹری کی رائے لے لیں۔ میرا خیال ہے اس ٹھیکے کے لئے انٹرنیشنل ٹینڈرنگ کی ضرورت ہو گی۔"
قریشی کو اگر انٹرنیشنل ٹینڈرنگ کرانی ہوتی تو اسے وزیر کے سامنے بیٹھ کر گھگھیانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے حیرت تھی کہ چت ہو کر بھی وزیر اکڑا کھڑا تھا۔

"لاء والوں کو اعتراض نہیں ہے کیونکہ یہ "ہائی ٹیک" آئٹم ہے جس کی سپلائی سورس صرف ایک ہے۔ کنٹریکٹ میں ہم نے پہلے ہی یہ شرط رکھ دی ہے کہ ریٹ انٹرنیشنل مارکیٹ کے مقابلے میں بہتر ہو گا۔ ہم انٹرنیشنل ٹینڈرنگ میں گئے تو بہت وقت لگے گا۔ غیر ملکی کمپنیاں اپنی اپنی حکومتوں کے پریشر لے کر آئیں گی اور کمیونیکیشن سسٹم کو عالمی معیار تک لانے کا جو وعدہ آپ نے عوام سے کیا ہے اس میں کئی سالوں کی تاخیر ہو جائے گی۔"

وزیر نے جواب میں صرف ایک "ہوں" کی۔ قریشی جان گیا تھا کہ اسے ترپ کا آخری پتا اب پھینکنا ہی پڑے گا۔

"مسز چنائے کو میں نے دو بجے اپنی کمپنی کی طرف سے کنٹریکٹ پر دستخط کرنے کے لئے بلایا ہے۔ آپ اگر کنٹریکٹ کی شرائط میں مزید ضمانتیں شامل کرانا چاہیں تو میں انہیں آپ کے پاس لے آؤں گا۔ کمپنی کی طرف سے انہیں کنٹریکٹ میں ترمیم کرنے کے تمام اختیارات حاصل ہیں۔"

وزیر چند سیکنڈ کے توقف کے بعد کرسی کی پشت سے اب میز کی طرف جھک آیا تھا۔ قریشی کو ایک بار پھر آتش بازیاں چھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں کیونکہ اس نے وزیر کی مونچھوں کے نیچے ایک بے ساختہ مسکراہٹ کو جھانکتے دیکھ لیا تھا۔

"پرسوں رات ایک ڈنر میں مسز چنائے مجھے اپنے شوہر کے ساتھ ملی تھیں۔ مجھ سے بہت دیر اٹھارویں صدی کے یورپی مصوروں پر بات کرتی رہیں لیکن اس ٹھیکے کی بات نہیں ہوئی۔ آپ کو پتا ہے کہ میں دفتر کے معاملات پر دفتر سے باہر بات نہیں کرتا اور اچھا ہوا کہ انہوں نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ ایسا کیجئے کہ دو بجے تو

میں مصروف ہوں انہیں تین بجے میرے پاس بھیج دیجئے۔ اور کنٹریکٹ کے پیپرز مجھے آپ ابھی بھیج دیں میں انہیں ایک بار پھر دیکھ لیتا ہوں۔"

قریشی نے اپنی روکی ہوئی سانس کو آہستہ آہستہ اس طرح نکالا کہ وزیر اس کے اعصاب کا تناؤ کم ہوتے نہ دیکھ سکے۔ وزیر نے مسز چنائے کو بھیجنے کے لئے کہا تھا ساتھ لانے کے لئے نہیں۔ وزیر کو معلوم تھا کہ قریشی کو تین بجے پرائم منسٹر سیکریٹریٹ کی ایک میٹنگ میں جانا ہے اس لئے مسز چنائے اکیلی ہی آئے گی لیکن میٹنگ نہ بھی ہوتی تو قریشی کسی اور میٹنگ کے بہانے وزیر اور مسز چنائے کی میٹنگ میں مخل نہ ہوتا۔ اسے یقین تھا کہ کنٹریکٹ پر آج دستخط نہیں ہوں گے دو روز بعد ہوں گے۔ لیکن دستخط ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ مسز چنائے نے اسے ڈنر میں وزیر سے ملاقات کا احوال بتایا تھا اور کہا تھا۔ "تمہارا وزیر مجھے کھانے کے لئے بالکل تیار ہے۔" قریشی جانتا تھا کہ اس معاملے میں عورتوں کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اور مسز چنائے کی حس عام عورتوں کے مقابلے میں کئی گنا تیز تھی۔ قریشی نے اثبات میں سر ہلا کر جانے کے لئے اپنے کاغذات سمیٹنے شروع کر دیئے۔

"مری کے کاٹیج میں فون لگ جائے تو اس کا نمبر مجھے دیجئے گا۔ میں اسے ایک راز کی طرح صرف اپنی حد تک محدود رکھوں گا۔" وزیر نے پہلی بار کھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کبھی آپ بھی اس کاٹیج میں ایک شام گزاریں۔ مجھے یقین ہے وہاں کی فضا آپ کو پسند آئے گی۔"

قریشی نے وزیر کی مسکراہٹ کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

"اس کی جگہ مجھے پسند نہیں ہے۔ اور پھر میں پہاڑی نہیں میدانی علاقے کا آدمی ہوں۔ مجھے تو کراچی بیچ کی اپنی ہٹ زیادہ پسند ہے جس کے ٹیرس سے چاندنی رات اور بل کھاتے سمندروں کے ملاپ کو دیکھنا خوبصورت لگتا ہے۔ پہاڑی کاٹیج کے کمرے میں بند ہو کر آتش دان کی آگ کو گھورتے رہنے سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں۔"

وزیر نے قریشی کو دوبارہ اس کے مقام تک پہنچا دیا۔ قریشی کو کراچی میں ہاکس بے کی اس ہٹ کے بارے میں معلوم تھا جسے وزیر نے اپنی کہا تھا۔ یہ این ایس سی کے ایک سربراہ نے اس زمانے کے صدر جنرل یحیٰی خان کو خوش کرنے کے لئے بنوائی تھی جس میں فوج کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرنے والا یہ عیاش جنرل داد عیش دیتا تھا۔ وزیر نے یہ ہٹ اب صرف اپنے استعمال کے لئے مخصوص کر دی تھی اور این ایس سی کے سربراہ تک کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ خبر تھی کہ پرائم منسٹر بھی آرام کرنے اکثر وہیں جاتے ہیں۔

"آپ اپنے پائپ میں تمباکو کون سا استعمال کرتے ہیں۔"

اس اچانک سوال نے قریشی کو حیران کر دیا۔

"آئرن مور۔"

"یہ آئرن مور نوکر شاہی کا ٹریڈ مارک ہے یا بلیک لیبل کی طرح یہ بھی رتبے کی علامت ہے۔ آپ کے قبیلے کے ہر چھوٹے بڑے آدمی کے ہاتھ میں جو پائپ پیتا ہے آئرن مور کا پیلا ڈبہ دیکھتا ہوں۔ آپ نے کبھی یہ ٹرائی کیا ہے۔"

وزیر نے اپنی دراز سے تمباکو کی ایک پاؤچ نکال کر قریشی کی طرف بڑھائی۔ اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہا۔

"بور کم رف کا وہسکی فلیور مجھے بھی پسند ہے آپ بھی استعمال کیجئے۔ اس کی خوشبو ایسی ہے کہ تمباکو نوشی کے نفرت کرنے والے بھی مسحور ہو جاتے ہیں۔"

سردار نے اپنے کارندے کو اچھی کارکردگی پر انعام سے نواز دیا تھا بلکہ طبقاتی طور پر اس کا رتبہ بڑھا دیا تھا۔ قریشی نے بڑے فخر سے یہ تمغہ اٹھایا اور یہ سوچ کر اس کی گردن اکڑ گئی کہ اب وہ بھی وہی تمباکو پئے گا جو اس کا جاگیردار وزیر پیتا ہے۔

"تھینک یو۔"

قریشی نے کہا اور شاداں و کامراں منسٹر کے دفتر سے باہر نکل آیا۔

قریشی نے اپنے دفتر میں آتے ہی بڑی بیتابی سے پائپ سلگایا اور چائے کے لئے کہتا ہوا کرسی پر نیم دراز ہو کر دھوئیں کے مرغولے بکھیرتا رہا۔ وہ صرف تمباکو کا ہی

نہیں اپنی چلی ہوئی چالوں کی کامیابی کا مزا بھی لے رہا تھا۔ چائے پی کر اس نے وقت دیکھا تو بارہ بج چکے تھے۔ اپنی کامیابی پر خوش ہونے کا وقت نہیں رہا تھا۔ دو بجے سے پہلے پہلے اسے اپنے پھیلائے ہوئے جال کو سمیٹنا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے پاس وہ دونوں رپورٹر آنے والے تھے جنہیں اس نے خبر فراہم کی تھی اور جس کے چھپنے کے بعد ہی قریشی آسانی سے اپنا شکار کر سکا تھا۔ ان دونوں رپورٹروں سے قریشی کا پرانا تعلق تھا۔ وہ ان کے کسی کام کو نہیں روکتا تھا اور دونوں رپورٹر اس کی دی ہوئی خبر کو اس طرح چھاپتے کہ ان کے ایڈیٹر تک کو اس کی source (ذریعے) کا پتا نہیں چلتا۔

قریشی پی اے کو بلا کر بہت دیر تک نوٹنگ کراتا رہا' اس کے بعد اس نے ضروری کالیں کیں اور تمام معاملات نمٹا کر رپورٹروں کا انتظار کرنے لگا جو باہر بیٹھے پی اے سے گپیں مار کر خبریں سونگھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رپورٹر جب اس کے کمرے میں آئے تو چائے بسکٹ' معنی خیز مسکراہٹوں کے تبادلے اور ذاتی گفتگو کے بعد قریشی نے انہیں خبر کے بارے میں تازہ صورتحال سناتے ہوئے بتایا کہ اب انہیں اس خبر کی تردید چھاپنی ہے۔

"قریشی صاحب کل آپ نے ہمیں ایک خبر دی' ہم نے چھاپ دی' آج آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم یہ لکھیں کہ خبر غلط تھیں۔ ہماری نوکری اور Credibility کا بھی کچھ خیال کیجئے۔" مسلم کے رپورٹر نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔

"میں نہیں کہہ رہا کہ تم اپنی طرف سے لکھو کہ خبر غلط ہے۔ وزارت کے حوالے سے معمولی سی تردید چھاپ دو۔ سب کو پتہ ہے کہ ہر سچی خبر کی تردید ضرور چھپتی ہے۔" قریشی نے بے تکلفی کا انداز اختیار کر کے ماحول کو پہلے کی طرح پھر سازگار بنانا چاہا۔

"لیکن شاید میرا ایڈیٹر تردید چھاپنے پر تیار نہ ہو اور اگر شائع کی بھی تو نیچے مجھ سے نوٹ لکھوائے گا کہ میں اپنی خبر پر قائم ہوں۔" مسلم کا رپورٹر قریشی کو زچ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ فرنٹیئر پوسٹ کا رپورٹر اس طرح خاموش بیٹھا تھا جیسے اس سارے معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔

"تمہارا ایڈیٹر نئی حکومت کا پرانا وفادار ہے۔ اسے تردید چھاپنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ بلکہ خوش ہو گا اور خود کریڈٹ لینے کی کوشش کرے گا۔ کہو تو میں اسے فون کر دوں۔" قریشی نے اپنی پہنچ بتانے کی کوشش کی۔

"نہیں نہیں۔ بس تردید اپنی وزارت کی طرف سے ہمارے دفتروں کو بھجوا دیجئے، ہم شام کو دیکھ لیں گے، لیکن اسے صرف منسٹری کے پریس نوٹ کے طور پر چھاپیں گے۔" رپورٹر نے پسپائی اختیار کی۔

"اور کوئی فون وغیرہ کا مسئلہ تو نہیں ہے، کہیں لگوانا ہو تو بتائیں میں آپ کے یہاں بیٹھے بیٹھے ہی فون کی گھنٹی بجوا دیتا ہوں۔ درخواست آپ بعد میں بھجواتے رہیئے گا۔" قریشی نے پیشکش کی۔

"آپ کے پی آر او کے دفتر میں فون لگوانے والے ان صحافیوں کی قطار لگی ہے جن کے اخباروں کے نام بھی کسی نے نہیں سنے۔ اگر فون لگوانا ہوا تو ہم بھی اسی لائن میں لگ جائیں گے۔ آپ کے پی آر او کی عزت بھی بڑھ جائے گی۔" مسلم کے رپورٹر کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔

"بہت ناراض لگتے ہو، چلو تمہیں بیئر پلواتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے "بڈوائزر" کا کریٹ بھجوایا ہے۔ میں بیئر نہیں پیتا۔ اپنے ڈرائیور سے کہہ کر تمہاری گاڑی کے بوٹ میں رکھوا دیتا ہوں۔"

قریشی کے لئے رپورٹر کو خوش رکھنا ضروری تھا۔ اس وقت جب سارے کام اس کے پلان کے مطابق طے پا رہے تھے وہ کوئی نئی پیچیدگی نہیں چاہتا تھا۔

"بیئر میں بھی نہیں پیتا۔ میں تو......."

مسلم کے رپورٹر کو اپنی بات بیچ ہی میں روک دینی پڑی کیونکہ فرنٹیئر پوسٹ کے رپورٹر نے پہلی بار اپنی خاموشی توڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"بیئر کا کیس تو خیر آپ رکھوا دیجئے۔ لیکن یہ بتائیں کہ مری کے کاٹیج میں کب بلوا رہے ہیں۔ بڑا چرچا ہے اس کا۔ رات بی ایم کی تصویری نمائش کے Preview میں مسز چنائے ٹپسی ہو کر کاٹیج کے بار کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔"

"کتیا کہیں کی!" قریشی نے زیر لب گالی دی۔ کل مری کے کاٹیج میں اس کا بلڈ پریشر مسز چنائے ہی چیک کرتی رہی تھی۔ قریشی کو اس نے ڈنر میں وزیر سے ہونے والی اپنی ملاقات کی تفصیل بتا دی تھی اور یہ بھی کہ کنٹریکٹ پر دستخط کرانے وزیر کے پاس جانا ہی پڑے گا کیونکہ وزیر کی دوست مسز علی اپنے بیٹے کی گریجویشن میں شرکت کے بہانے فیس لفٹ کرانے امریکہ گئی ہوئی ہے اس لئے وزیر کی شامیں اور راتیں خالی ہیں۔ قریشی کو معلوم تھا کہ اس کے اور مسز چنائے کے نجی تعلقات کی عمر اب پوری ہو چکی ہے اور وہ اب وزیر تک پروموٹ ہونے والی ہے۔ قریشی کو خود بھی یہ تعلق ایک بوجھ لگنے لگا تھا۔ وہ ایک بہت محتاط آدمی تھا اور پہلی بار مسز چنائے جیسی ہائی پروفائل رکھنے والی عورت کی بدپرہیزی میں مبتلا ہوا تھا۔

مسز چنائے قریشی کے لئے کوئی جذباتی مسئلہ نہیں تھی کہ اسے تعلقات ختم ہونے کا دکھ ہوتا۔ وہ تو اسے ایک ٹھیکے کے سلسلے میں بونس کے طور پر ملی تھی۔ بونس جو اصل سے پہلے ایڈوانس کے طور پر اسے وصول ہو چکا تھا۔ آپٹک فائبر کا یہ ٹھیکہ اصل میں خود قریشی کی اپنی محنت کا نتیجہ تھا جس کے لئے اسے ایک سامنے کا آدمی' فرنٹ مین چاہئے تھا۔ اختر چنائے اس سلسلے میں موزوں ترین آدمی تھا جس کے پاس برٹش پاسپورٹ تھا اور جس نے غیر ممالک میں دو دو ڈالر والی کاغذی کمپنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انہی میں سے ایک کمپنی کے نام قریشی نے ٹھیکے کے کاغذات تیار کرائے تھے۔ غیر ملکی مینو فیکچرز مال براہ راست پاکستان بھیجتے لیکن تمام انوائسنگ اور بلنگ چنائے کی کمپنی کے ذریعے ہوتی۔ ٹھیکے میں جو ریٹ منظور کیا گیا تھا۔ مینو فیکچرز کی قیمت سے ایک ڈالر زیادہ تھا۔ یہ ایک ڈالر مال کی مقدار کے حساب سے کئی لاکھ ڈالر کا منافع دیتا۔ اس کام میں قریشی کے فرنٹ مین چنائے کو منافع کا صرف ایک چوتھائی ملنا تھا' لیکن یہ ۲۵ فیصد بھی کئی کروڑ کے لگ بھگ ہوتا۔ چنائے لالچی نہیں تھا۔ سال میں اس طرح ایک دو ٹھیکے کر کے مطمئن رہتا۔ اس کاروبار میں چنائے کا نہ انوسٹمنٹ تھا اور نہ کوئی کام۔ اگر انوسٹمنٹ تھا تو مسز چنائے کی شکل میں اور وہی سارا کام بھی کرتی تھی۔ کنٹریکٹ پر دستخطوں کی مشق پہلے اس کے بدن پر ہوتی پھر

کہیں کاغذ پر قلم کی نب روشنائی چھوڑتی۔

قریشی نے اطمینان کا گہرا سانس لیا کہ مسز چنائے سے اس کے تعلقات کا یہ بوجھ کل شام اس کے کندھے سے اتر گیا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اسے مری کے کاٹیج میں کپڑوں سے بے نیاز آتشدان کے سامنے کھڑی ہوئی مسز چنائے کا سراپا یاد آ گیا۔ چٹختی ہوئی لکڑیوں کی دہکتی ہوئی آگ اس کے بدن پر رنگوں کی قوس و قزح بکھیر رہی تھی۔ قریشی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

3

بحرین ۱۹۸۷ء

مسز چنائے بے حد جاذب نظر تھی اور بلا کی جنسی کشش رکھتی تھی۔ اس کے جسم اور لباس کی تراش خراش ایسی تھی کہ فیشن ماڈلز بھی دیکھ کر شرما جائیں۔ عمر کے بالکل صحیح موڑ پر تھی۔ ۱۸۔۲۰ سال کی کچی کلی اور نہ ۲۴۔۲۵ کی ایسی نیم تجربہ کار جو پکے پھلوں کی طرح ڈالی سے گرنے کو بیتاب نظر آئے۔ اور نہ میک اپ میں لدی ہوئی چہرے کی ڈھیلی کھال کو مسکراہٹ سے کھینچتی ہوئی ۴۰۔۴۵ سال کی پختہ کار اور وسطی عمر کے بحران Middle age crisis کو وجہ بنا کر ہر وقت فلرٹ کرنے کو تیار۔ ۳۰۔۳۲ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس نے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھ لئے تھے۔ اس لئے اپنی شخصیت پر سرد مزاجی کی برف چڑھائے رکھتی۔

اختر چنائے نے یہ نادر گہر موتیوں والے ملک بحرین میں پایا تھا۔ وہ گلف ایئر

میں ایئر ہوسٹس تھی اور کئی سال سے بحرین میں رہتی تھی جو گلف ایئر کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ اس کا نام رفیقہ بٹ تھا لیکن رفی کہلاتی تھی۔ مانچسٹر میں بس جانے والے ایک کشمیری نژاد پاکستانی باپ اور انگریز ماں کی ناکام شادی کے نتیجے میں اس نے جوانی کے ابتدائی سال کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول کر گزارے تھے۔ ۲۲۔۲۳ سال کی ہوئی تو گلف ایئر کے ہاتھ آ گئی جس کے بعد سے عربوں کے اس دیس میں آ کر خاموشی سے ایک دیوار پر ٹنگ گئی تھی۔ اسے جس بلڈنگ میں فلیٹ ملا تھا اس میں زیادہ تر ایئر ہوسٹسیں رہتی تھیں۔ ہر رات کسی نہ کسی کے فلیٹ میں دعوت ہوتی۔ شروع شروع میں وہ ہر پارٹی میں جاتی لیکن جب اونچی اونچی آوازوں میں اظہار محبت کرنے والے شیخوں میں اس کے ساتھ رقص کرنے پر چھینا جھپٹی ہونے لگی تو اپنے جسم کو چیتھڑے ہونے سے بچانے کے لئے اس نے ان دعوتوں میں جانا کم کر دیا۔ جاتی بھی تو دیوار سے ٹیک لگا کر شراب کی چسکیاں لیتی رہتی۔ اس کی شراب پینے کی عادت انہیں دعوتوں میں پختہ ہوئی تھی جہاں وہ رقص کی کمی شراب سے پوری کرتی۔

بحرین میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس نے عرب شیخوں سے تعلقات کا سلسلہ شروع کیا تو بحرین میں ایک نہ ختم ہونے والی قبائلی جنگ چھڑ جائے گی۔ اس کی مانگ ہی ایسی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ تنہا رہنا بھی بہت مشکل ہو گا اس لئے اس نے گلف ایئر کے ایک درمیانی عمر کے انگریز افسر سے تعلقات استوار کئے جس کی بیوی طلاق لے کر بچوں سمیت انگلینڈ چلی گئی تھی۔ ایک مستقل تعلق کو پروان چڑھتا دیکھ کر رفی کے طلب گاروں کی قطار چھٹنے لگی۔ رفی کا اپنے انگریز بوائے فرینڈ سے ضرورتوں کا یہ رشتہ اس وقت تک قائم رہا جب وہ اپنا کنٹریکٹ ختم کر کے واپس جانے لگا۔ اس نے بہت دوستانہ انداز میں رفی کو خدا حافظ کہا لیکن رسمی طور پر بھی ساتھ آنے کی دعوت نہیں دی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔ وہ خود بھی نروان کی تلاش میں چند سال سری لنکا میں گزارنا چاہتا تھا جس کے لئے اسے کوئی دم چھلا لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔

بوائے فرینڈ چھٹ جانے پر کئی لوگوں نے اس کی طرف بڑھنے کی پھر کوشش

کی۔ لیکن اس کی سرد مہری نے ان پر برف ڈال دی۔ فلائٹس سے واپس آنے کے بعد وقفے کے جو دن ملتے ان میں وہ اس ساحل کی ننگی ریت پر پڑی رہتی جو مغربی نسل کے لوگوں کے لئے مخصوص تھا اور جہاں مقامی لوگوں کا داخلہ منع تھا۔ وہ اس فلیٹ میں بہت کم وقت گزارتی جو عمارتوں کے اس سلسلے میں واقع تھا جہاں گلف ایئر کی تمام ایئر ہوسٹسوں کے فلیٹ تھے اور جن کے گرد ہر وقت دو سو سے لے کر ایک ہزار تک کے ماڈل کی مرسیڈیزیں اور پانچ اور سات سیریز کی بی ایم ڈبلیوز طواف کرتی رہتیں۔ ان میں سے کسی نہ کسی فلیٹ میں ہر ویک اینڈ پر وہ دعوتیں ہوتیں جن کی پورے بحرین میں شہرت تھی۔ جس رات وہاں دعوت ہوتی وہ اپنا فلیٹ مقفل کر کے اس شراب خانے میں چلی جاتی جہاں شاہی ساحل کی طرح مقامی لوگوں کا داخلہ محدود تھا۔ وہ اپنی نسل کے لوگوں سے آسانی کے ساتھ نمٹ سکتی تھی۔ کبھی کبھی ہارمونز کچھ زیادہ ہی زور مارتے تو کسی کے ساتھ رات گزارنے چلی جاتی۔ لیکن اس نے ایسے کسی بھی تعلق کو ایک رات سے زیادہ بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شراب خانے میں زیادہ تر مستقل رکن یا ان کے مہمان آتے تھے' وہ سب اس کی عادت جان گئے تھے اور جو بغیر ساتھیوں والے تھے وہ اپنے اوپر نظر عنایت ہونے کے منتظر رہتے۔ پب میں یہ ایک عام مذاق تھا کہ رنی جس دن رات گئے کوئی ساتھی لے کر پب سے نکلتی وہ بار ٹینڈر سے پوچھتے کہ وہ رنی کو کونسی جادوئی کاک ٹیل پلاتا ہے جو اس قدر سرد نظر آنے والی رنی کو اچانک گرم کر دیتی ہے۔

پچھلے چند دنوں سے شاید بار میں وہ جادوئی شراب ختم ہو گئی تھی۔ رنی کی پورے ہفتے کوئی فلائٹ نہیں تھی اور وہ اپنی ہر شام بار میں گزار رہی تھی لیکن لوگوں سے رسمی گفتگو کر کے اور شراب کا اپنا کوٹہ پورا کر کے اکیلی چلی جاتی۔ ایک رات تو اسے واقعی سہارے کی ضرورت تھی۔ شاید زیادہ پی گئی تھی' یا شراب میں اثر کچھ بڑھ گیا تھا۔ وہ جانے کے لئے اٹھی تو لڑکھڑا رہی تھی۔ کئی بازو اسے سنبھالنے کے لئے بڑھے لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر سب کو روک دیا اور بار ٹینڈر سے ٹیکسی منگوا کر اکیلی گھر چلی گئی۔ بار کے عملے سمیت بار آنے والے سب ہی رنی سے اپنائیت محسوس

کرنے لگے تھے۔ سب پریشان تھے کہ رفی آج کل پریشان ہے لیکن یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ان میں سے کسی کو اپنی پریشانی کے راز میں حصے دار نہیں بنائے گی۔ رفی کی پریشانی کسی کے سمجھ میں آنے والی تھی بھی نہیں۔ وہ عمر کے تیسویں سال کی اس سرحد سے نکل رہی تھی جو ایئر ہوسٹسوں کے ریٹائرمنٹ کے لئے ایک غیر تحریری قانون کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ نوکری سے نہیں نکالی جائے گی گراؤنڈ کر دی جائے گی۔ لیکن وہ اپنی بقیہ زندگی ایئرپورٹ پر مسافروں کے آگے پیچھے دوڑ کر یا اس چھوٹے سے جزیرے میں خود کو بوڑھا ہوتے دیکھ کر نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ اور گراؤنڈ کیا وہ تو ایئر ہوسٹس کی حیثیت سے بھی بیزار تھی۔ ان آٹھ برسوں میں اس نے دنیا اتنی دفعہ گھومی تھی کہ اسے اب کہیں جانے کے خیال سے خوف آتا تھا۔ اسے اب نئے آفاق کی تلاش تھی۔

اختر چنائے اپنے کسی بزنس کے سلسلے میں بحرین آیا ہوا تھا۔ اس کے ایک دوست نے اس بار کی خاص طور پر سفارش کی تھی جس کے کاؤنٹر پر وہ اکیلا کھڑا "شی واز" کی چسکیاں لے رہا تھا۔ لیکن وہ زیادہ دیر اکیلا رہنے والا نہیں تھا۔ وہ ایک انتہائی سدھا ہوا سماجی جانور تھا۔ اس نے برسوں نیوی میں رہ کر گھاٹ گھاٹ کے پانیوں کی گہرائی ناپی تھی۔ اس کی چرب زبانی اور گفتگو کے ذریعے کسی کو بھی مرعوب کرنے کی صلاحیت نیوی میں دور دور مشہور تھی۔ چنائے ساٹھ کے پیٹے میں تھا اور عمر کے مہ و سال نے اس کے سر پر ایک پورا چاند طلوع کر دیا تھا۔

مستقبل کی مسز چنائے جب بار میں داخل ہوئی تو چنائے اس کی تنہائی کو اپنی تنہائی میں شامل کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اختر چنائے کسی بھی اجنبی سے تعارف کر کے بے تکلف ہونے کے فن میں کمال کا درجہ رکھتا تھا۔ رفی اس کے پاس کاؤنٹر پر کھڑی اپنی باری کا انتظار کرنے لگی تو اس فن کا مظاہرہ اور آسان ہو گیا۔ رفی کی انگلیوں میں ابھی تک بے جلا سگریٹ دبا ہوا تھا جسے وہ سلگا نہیں سکی تھی۔ چنائے نے اپنا سنہری لائٹر کلک کر کے اس کے سامنے کیا تو اس سے شعلہ نہیں نکلا' ہونٹوں میں

سگریٹ دباتے ہوئے رفی نے چنائے کی طرف دیکھا تو سمجھی کہ نشے میں آئے ہوئے بڈھے کو نہیں معلوم کہ اس کی گیس ختم ہو چکی ہے۔ لیکن جب لائٹر والا ہاتھ اسی طرح بڑھے بڑھے اس کی طرف اور جھکا تو اس نے لائٹر میں ایک انگارہ سا دہکتے ہوئے دیکھا۔ اپنے سگریٹ کو سلگاتے ہوئے اپنے خیال پر شرمندہ ہو کر اس نے ایک بہت مترنم تھینک یو چنائے کی طرف پھینکا۔

"یہ لائٹر میرے ایک مرحوم دوست جاپان سے ایک واقعہ کے بعد لے کر آئے تھے۔ ہوا یوں تھا کہ ایک دن انہوں نے سگریٹ سلگانے کی کوشش میں میری مرحوم مونچھوں کو جلا دیا تھا۔ وہ نشے میں لائٹر کے بلند شعلے اور میری بڑھی ہوئی مونچھوں کے درمیان فاصلے کا اندازہ نہیں کر سکے تھے۔ جرمانے کے طور پر جاپان میں بڑی تلاش کے بعد وہ بغیر لو دینے والا یہ لائٹر لے کر آئے۔ میرے دوست کو تو شراب اور سگریٹ نے پی لیا' مونچھیں جل جانے کے بعد میں نے صاف کر دیں اور سگریٹ موت کے ڈر سے پینی چھوڑ دی ' لیکن ان تینوں کی یاد کے طور پر اس لائٹر کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہوں۔" چنائے کے پرانے دوستوں نے بھی اسے کبھی مونچھوں سمیت نہیں دیکھا تھا۔ اور یہ لائٹر بھی اس نے چند روز قبل بحرین آتے ہوئے دوبئی کی ڈیوٹی فری سے اپنے ایک مونچھوں والے دوست کے لئے خریدا تھا۔ رفی اس کی روانی اور بے تکلفی پر بے اختیار ہنس پڑی۔

"آئی ایم چنائے۔ اختر چنائے۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

"رفیقہ بٹ۔ فرینڈز کال می رفی۔" اس نے بڑھا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"یو آر آ پاکستانی! وہاٹ آ پلیزنٹ سرپرائز۔" چنائے کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔

"میں ایک چوتھائی پاکستانی ہوں۔ سات سال کی عمر تک میں اپنے پاکستانی باپ کے پاس تھی جس کے بعد مجھے میری انگریز ماں مقدمہ جیت کر اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس کے بعد سے میں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا' ہاں فلائٹوں پر پاکستان گئی ہوں' لیکن صرف کراچی تک' میں گلف ایئر میں ایئر ہوسٹس ہوں۔" رفی نے ذرا اداس لہجے میں بتایا۔

"تمہارا باپ یقیناً" کشمیری ہو گا۔ تمہاری ستواں ناک اور کھلی پیشانی پر مجھے کشمیر کا نقشہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ تمہارے لہجے کی مٹھاس بھی دریائے نیلم کے پانی کی طرح ہے۔ لیکن اس مٹھاس میں کتنا غم گھلا ہوا ہے۔ وہی جو دریائے نیلم کا پانی پینے والوں کے حالات میں گھلا ہوتا ہے۔ کتنی دکھ بھری کہانی ہے تمہاری۔ لیکن تم اپنے باپ سے کیوں نہیں ملیں۔ اب تو تم بڑی ہو تم نے اسے تلاش کیوں نہیں کیا۔" چنائے کے لہجے میں خلوص تھا۔

رنی کا دل چاہا کہ اس کے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ چنائے میں اسے اپنے باپ کی جھلکیاں نظر آئی تھیں۔ اس وقت نہ جانے کیوں اسے اپنا باپ بے تحاشا یاد آیا تھا۔ رنی نے اسے بہت تلاش کیا تھا۔ لیکن وہ بیوی کے چھوڑ جانے اور پھر بچی کے چھن جانے کے بعد ایسا ٹوٹا تھا کہ کسی کو کچھ بتائے بغیر غائب ہو گیا تھا۔ کسی کو اس کے بارے میں نہیں معلوم تھا کہ وہ مانچسٹر چھوڑ کر کہاں چلا گیا۔ اس کے کچھ جاننے والوں کا اندازہ تھا کہ وہ پاکستان واپس چلا گیا ہے۔ شاید اب تک کہیں مر کھپ گیا ہو' رنی نے یہ تلاش چھوڑ دی تھی' وہ اگر مل بھی جاتا تو باپ بیٹی کے پاس ایک دوسرے کو دینے کے لئے تھا بھی کیا۔ رنی ایک عملی لڑکی تھی اب جبکہ اس کی زندگی ایک ڈگر پر پہنچ کر ٹھہر گئی تھی وہ تھوڑی دیر کی جذباتی تسکین کے لئے زندگی میں نئی پیچیدگیاں پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن پھر بھی سوچتی کہ کاش ایک بار' صرف ایک بار اپنے باپ سے لپٹ کر اس کے سینے پر سر رکھ سکتی۔ باپ اس کے لئے بچپن کی ایک کھٹی مٹھی سی یاد تھا۔ کتنا مزا آتا تھا بچپن کی اس یاد کو تازہ کر کے اداس ہونے میں۔ تنہائی ہو اور ذہن پر اداسی کا ہکلا سا ملگجا کہر چھایا ہوا ہو تو پینے کا مزا دوبالا ہو جاتا تھا۔ اس عالم میں اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کو دیکھنے والے سگریٹ کے دھوئیں کی کارستانی سمجھتے تھے۔ آج پھر اس کا رو پڑنے کو جی چاہا۔ حالانکہ اس نے ابھی پہلا پیگ بھی آرڈر نہیں کیا تھا۔ اختر چنائے کے لہجے میں اپنائیت ہی ایسی تھی۔ چہرہ بھی ایسا کہ آدمی دیکھتے ہی اعتبار کر لے۔ اختر کے دوست کہتے تھے کہ اس کی کامیابی میں پچاس فیصد حصہ اس کے اسی دھوکہ دینے والے چہرے کا تھا۔

اختر چنائے رنی کے چہرے پر آتے جاتے رنگ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چہرہ شناسی کا ماہر تھا اور اسے معلوم تھا کہ رنی کے چہرے پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ ذرا سے چھیڑے جانے پر گنگا جمنا برس پڑے گی اور اس کی یہ پوری شام ایک اجنبی لڑکی کے آنسو پونچھنے میں گزر جائے گی۔ اسے حسین لڑکیوں کا رونا بالکل پسند نہیں تھا۔ اچھی خاصی صورت کتنی بدہیئت ہو جاتی تھی اور سب سے گندی چیز تھی موٹی ہوتی ہوئی لال لال ناک کو بار بار سڑپنا یا سکنا۔ وہ برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا' اس کا دن بھی اچھا نہیں گزرا تھا' عرب تاجروں نے اس کے انتہائی ذہانت سے تیار کئے ہوئے منصوبے میں ابھی تک کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اب وہ اپنی شام بھی برباد کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اتنی پرکشش عورت کا ساتھ چھوڑ کر چلے جانا کفران نعمت تھا لیکن چنائے کا خیال تھا کہ وہ موڈ بدلنے کی ایک اور کوشش کرے گا' اگر بادل اسی طرح چھائے رہے تو اپنے ہوٹل جا کر آج ذرا جلدی سو جائے گا۔

"بلاڈی میری۔" رنی نے پہلی بار متوجہ ہونے والے انتہائی مصروف بار ٹنڈر کو اپنی پہلی ڈرنک آرڈر کی۔

"اوہ نو نو..... نو بلاڈی میری۔ ڈرائی مارٹینی فار دی لیڈی اینڈ اے شی واز فار می۔" چنائے نے پھرتیلے بار ٹنڈر کو روکتے ہوئے کہا۔

بار ٹنڈر نے رنی کی طرف دیکھا اور اس کی خاموشی کو اثبات سمجھ کر ڈرنکس مکس کرنے لگا۔

"آئی ایم سوری۔ میں آپ کی پینے کی عادت تبدیل نہیں کرنا چاہتا لیکن میں شراب نوشی کے معاملے میں بہت دقیانوسی مذاق رکھتا ہوں۔ غلط وقت پر غلط قسم کی کاک ٹیل پینا یا غلط طرح سے مکس کر کے پیتے دیکھنا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اگر پینے والے میرے ساتھی ہوں تو میں انہیں ٹوکتا ضرور ہوں۔" چنائے نے رنی کا ردعمل دیکھنے کے لئے توقف کیا۔ وہ خاموش تھی لیکن مارٹینی کا جام اس نے منہ سے لگا لیا تھا۔ چنائے نے مطمئن ہو کر پھر بولنا شروع کیا۔

"بلاڈی میری شام کی آخری ڈرنک ہوتی ہے جو نشے کو ٹھہرانے کے لئے پی

جاتی ہے۔ ہمارا نشہ جام بہ جام پروان چڑھتا ہوا اس سطح تک پہنچتا ہے جب ہم سچ بولنا شروع کرتے ہیں۔ جس سے لڑنا ہوتا ہے لڑتے ہیں۔ جسے پیار کرنا ہوتا ہے اس سے پیار کا شدت سے اظہار کرتے ہیں۔ جس سے دشمنی ہوتی ہے اسے گالی دینے کی جرات حاصل کرتے ہیں۔ اپنی اپنی منافقتوں کے خول سے باہر نکل آتے ہیں۔ لیکن نشے کی اس سطح سے واپس اترنے کا سفر بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ بہت تکلیف دیتا ہے۔ "بلاڈی میری" اسی سفر کو آسان بنا دیتی ہے۔ واپسی کے اس سفر کے لئے پل کا کام کرتی ہے۔"

رفی نے شراب نوشی کے ان فلسفوں پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ وہ تو تنہائی دور کرنے یا سرور میں رہنے کے لئے پیتی تھی۔ لیکن چنائے کی باتوں میں اسے مزا آ رہا تھا۔

"شراب نوشی بھی خوش لباسی کے ذوق کی طرح ہے۔ اگر آپ وقت اور موقع کی مناسبت سے لباس کے انتخاب میں سلیقہ نہیں برتیں گے' بدذوقی کا مظاہرہ کریں گے تو آپ کا ظاہر بدصورت دکھائی دے گا۔ اسی طرح شراب نوشی میں سلیقہ نہیں برتا تو نشے میں خول توڑ کر باہر نکلنے والا سراپا بھی بہت بدشکل اور کراہیت آمیز نظر آئے گا۔"

رفی کو معلوم تھا کہ چنائے اسے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اسے جانتے ہوئے بھی مرعوب ہونے میں لطف آ رہا تھا۔ چنائے کا انداز بیان ہی ایسا تھا۔ چنائے کو اب یہ اطمینان تھا کہ رفی کی آنکھوں میں غم کے جو بادل آئے تھے وہ چھٹ گئے ہیں۔اس کے چہرے پر اب سکون ہی سکون تھا۔ یا پھر چنائے کی باتوں پر ابھرتی ہوئی مسکراہٹ جو چنائے کے علاوہ کسی کو بھی قتل کر سکتی تھی۔ چنائے کو اس لئے نہیں کہ وہ قتل ہونے کی جذباتی عمر سے گزر چکا تھا۔ وہ تو اسے شراب پینے کے فائدوں اور اسے سلیقے سے پینے کے طریقوں پر اپنا لیکچر ختم کر کے اب شراب نوشی کے اپنے قصے سنا رہا تھا۔ کیلیفورنیا میں "میرینا ڈلرے" پر واقع بار کے قصے جس کا بار ٹنڈر اس کے مطابق دنیا کی سب سے اچھی "مارگریٹا" بناتا تھا۔ یا امریکہ کے شراب

خانوں میں اسکاچ کو پیپسی میں ملا کر اسٹرا سے پینے والے بدذوق شرابیوں کے قصے۔
اس پاکستانی Closet Drinker دوست کے قصے جو اپنے گھر میں اکیلا بیٹھ کر شراب پیتا۔ وہ بھی اس طرح کہ بیئر کی ایک بوتل پانی میں ملا ملا کر گھنٹوں میں ختم کرتا اور پھر نشے میں آ کر سہمی ہوئی بیوی کو رات بھر سہگل کے گانے سناتا اور قے کر کے سو جاتا۔ رنی کبھی ہنستی اور کبھی مسکراہٹیں بکھیرتی مارٹینی کی چسکیاں لے کر ان قصوں کا مزا لے رہی تھی۔ یہ اس کا چوتھا پیگ تھا اور چنائے خوفزدہ ہو رہا تھا کہ کہیں نشہ میں لڑکھڑاتی عورت کو اٹھا کر گھر پہنچانے کا وہ کام نہ کرنا پڑے جس سے اسے سخت چڑ تھی۔ اس نے سوچا اب یہاں سے نکلنا چاہیے۔

"رنی اس بار میں شور اور سگریٹ کا دھواں بہت بڑھ گیا ہے' تھوڑی دیر باہر چل کر ٹہلتے ہیں۔" اس نے رنی کا جام ختم ہوتے ہی کہا۔

"یس مسٹر چنائے۔"

"نو مور مسٹر چنائے۔" چنائے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے میں عمر میں بڑا ہوں لیکن تمہارا بزرگ نہیں ہوں۔ جسٹ کال می اختر۔"

"ٹھیک ہے اختر چلتے ہیں لیکن باہر نکل کر آپ میرے مہمان ہوں گے۔ آج چاندنی رات ہے ویک اینڈ بھی ہے اور رات بھی باقی ہے۔ میں آپ کو دکھاتی ہوں کہ بحرین کی رات اپنے اندر کیا کیا جادو چھپائے ہوئے ہے۔"

ایک اجنبی بوڑھے کی قسمت پر رشک کرنے والوں کو حیران چھوڑ کر دونوں بار سے نکل آئے۔ چنائے نے خود کو مکمل طور پر رنی کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کا دعویٰ کتنا سچا ہے۔ لیکن رات جیسے جیسے گزرتی گئی چنائے جیسے جہاندیدہ آدمی کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ یہ اس کی زندگی کی چند اچھی راتوں میں سے ایک تھی۔ رات تھی بھی بہت خوبصورت۔ پورا چاند تھا۔ بالکل ایسا جیسے کسی نے پرکار رکھ کر بنایا ہو۔ رنی اپنی ٹوسیٹر کنورٹیبل بی ایم ڈبلیو میں اس سڑک پر رینگ رہی تھی جو سمندر کے ساتھ ساتھ دور تک چلی گئی تھی۔ گاڑی چلنے کی ہلکی سی آواز کے باوجود سمندر کی جھاگ اڑاتی لہروں کا شور کانوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ گاڑی کی چھت

کھلی تھی نم ہوا کے سرد جھونکے چہرے پر بہت خوشگوار سی ٹھنڈک چھوڑ رہے تھے۔ چنائے نے گاڑی چلاتی ہوئی رفی کو دیکھا جس کے شانوں تک کٹے ہوئے بال ہوا میں اڑتے پرندوں کے پروں سے مشابہ لگ رہے تھے۔ اس کی نظریں سامنے سڑک پر جمی تھیں لیکن چنائے کو لگا جیسے اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی دور اس افق کو گھور رہی ہوں جو اب تاریکی میں مستور تھا۔ لیکن چہرے پر اتنا سکون تھا جیسے کوئی فکر اسے چھو کر نہ گزری ہو۔ خوشی و غمی اور فکر و خیال کے سارے تاثر اس کی ان بہت گہری اور بھوری آنکھوں میں سمٹ آئے تھے جو اسے اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھیں۔

رفی نے ایک مقام پر کار روک دی۔ سڑک سے اترتے ہی ساحل تھا جو دور تک ویران نظر آتا تھا۔ چنائے نے اس کے کہنے پر اپنے جوتے موزے اتار کر گاڑی میں رہنے دیئے اور سلک کے سفید سوٹ کی پتلون کے پائنچے اوپر چڑھانے لگا۔ رفی خود بھی اپنی بہت چست جینز کے پائنچے اوپر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گاڑی سے اتر کر سڑک سے ساحل تک کی ریت تک پہنچتے ہوئے پتھریلی اترائی کا جو سفر تھا ننگے پیر اس کے عادی نہیں تھے۔ لیکن چنائے کو اتنی حسین معیت میں پتھروں کا یہ راستہ کسی کہکشاں کا سفر لگ رہا تھا۔ اس نے سڑک سے اترتے ہی رفی کو سنبھالنے کے لئے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اور اب وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چاندنی رات میں برف جیسی گیلی ریت پر چہل قدمی کرتے ہوئے سایوں کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ مقام جہاں تک لہریں آ کر پلٹ جاتیں اس کے اور ساحل کی سوکھی ریت کے درمیان گہرے سرمئی رنگ کی پٹی گزرگاہ کا کام دے رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی شوریدہ سر لہر کے جھاگ اس سرحد کو عبور کر کے ان کے پاؤں کو چوم جاتے تو رفی کو اپنے جسم میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوتی۔ ان کے پاؤں ٹھنڈے اور جذبے گرم ہونے لگتے۔ وہ پلٹ کر اپنے قدموں کے ان گہرے نشانوں کو دیکھتی جو پانی میں ڈوب کر ذرا سی دیر میں معدوم ہو جاتے۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنے گزرے ہوئے ہر کل کو پیچھے چھوڑے ہوئے قدموں کے نشان کی طرح پانی میں ڈبو کر فنا کر دیتی۔ اسے ماضی کو یاد

رکھنا پسند نہیں تھا لیکن انہیں بھولنا بس میں بھی نہیں تھا۔ ماضی کی یاد صرف تکلیف دیتی تھی۔ اچھے گزرے ہوئے لمحے کا یہ ملال کہ اتنی جلدی کیسے گزر گیا اور دکھ دینے والا لمحہ تو یادوں کو پہلے ہی لہولہان رکھتا تھا۔

چاندنی اور ساحل کی گیلی ریت سے اس کا یہ ساتھ آج بہت عرصے بعد ہوا تھا۔ چنائے کے ساتھ وہ خود کو بہت محفوظ خیال کر رہی تھی۔ اس نے جس طرح اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اس میں رومانیت یا کسی جنسی خواہش کی پیش رفت نہیں تھی۔ یہ ہاتھ اسے ایک ایسے سہارے کی طرح لگا جو لڑکھڑانے، گرنے، ڈوبنے یا موجوں کی زد سے بچانے کے لئے کسی پرانے ہمسفر نے تھام رکھا ہو۔ وہ دیر تک ساحل پر ٹہلتے رہے۔ اس دوران رفی کم بولی اور جو کچھ بھی بولی وہ گزرے ہوئے کل کا کوئی قصہ نہیں تھا بلکہ حالات سے اس کی موجودہ بے اطمینانی اور نئے آفاق کی تلاش اور امکانات کے تذکرے تھے۔ گفتگو کا بوجھ کچھ دیر تو چنائے سنبھالے رہا۔ لیکن پھر ماحول کی مقناطیسیت نے اپنے اندر جذب کر کے اسے بھی خاموش کر دیا۔ چنائے کی باتیں بہت دلچسپ تھیں جنہیں سن کر مزا آتا تھا لیکن رفی کو اس سے زیادہ لطف خاموش رہنے میں آ رہا تھا۔ سکوت کے اس عالم میں سمندر کا شور موسیقی بن کر ہولے ہولے اعصاب کا تناؤ کم کر رہا تھا اور اطراف میں پھیلی ہوئی چاندنی یادوں کے زخموں پر اپنے ہونٹ رکھ کر ان کا درد چوس رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم ساحل پر بہت دور تک نکل آئے تھے۔ یوں تو اس ساحل پر رات آ کر ٹھہر گئی تھی لیکن گھڑی کی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ رات بہت تیزی سے بیتی جا رہی ہے۔ انہوں نے الٹے قدموں واپسی کا سفر شروع کیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے چنائے اپنے ننگے پیروں سے ریت جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن رفی کو اس کی فکر نہیں تھی کہ پیروں پر سنی ہوئی گیلی ریت گاڑی میں کیچڑ بن کر چپک جائے گی۔ تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد ساحل کے ایک مقام پر رفی نے گاڑی روک لی اور چنائے کو اترنے کی دعوت دی۔ رفی نے آج کی رات کا جو ایجنڈا بنایا تھا یہ اس کا دوسرا مقام تھا۔

مرعوب کرنا صرف چنائے کو ہی نہیں آتا تھا، رفی بھی اس فن سے آشنا تھی،

فرق صرف یہ تھا کہ متاثر کرنے کے اس عمل میں رفی کے اپنے شوق کی تسکین کا سامان بہم تھا۔ وہ ایک بار پھر سڑک سے ساحل پر اترنے لگے۔ لیکن اس دفعہ ان کے ننگے پیروں کے تلووں کو پتھریلی اترائی کی چبھن نہیں سہنی پڑی' بلکہ یہاں اترنے کے لئے پتھروں کو کاٹ کر چار قدموں کا زینہ نکالا گیا تھا۔ ساحل کا یہ حصہ بالکل غیر آباد نہیں تھا۔ چھپروں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ تھا جن کے نیچے تیز برقی بلب لگے تھے جن سے ایک تھوڑے سے حصے میں چاندنی ماند ہو گئی تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بے رنگ لکڑی کی بینچیں اور ان کے درمیان ایک میز رکھی تھی' ایک طرف بنچوں پر چار مقامی باشندے اونچی آواز اور پرجوش انداز میں اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے لڑ رہے ہوں۔ لیکن رفی کو معلوم تھا کہ یہ روز مرہ کی گفتگو کا ایک عام انداز ہے۔ وہ اکثر سوچتی کہ رات میں بیویوں سے ان کا اظہار محبت پڑوس میں دور تک سنا جاتا ہو گا۔ وہ چھپر سے ذرا فاصلے پر ایک ایسی بنچ پر بیٹھ گئے جو برقی روشنی کی زد سے دور تھا اور جہاں چاندنی کا سایہ دراز تھا۔ رفی کو دیکھ کر چھپر کے نیچے واقع قہوہ خانے کا مالک دوڑا ہوا اس کی طرف آیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی اور اختر چنائے ان دونوں کی عربی اور انگریزی لہجے کی اردو سن کر محظوظ ہوتا رہا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ ٹوٹی پھوٹی سہی لیکن رفی کو اردو آتی تھی۔

احمد رفی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ یہاں بڑی پابندی سے آتی اور بعض اوقات تو کئی کئی گھنٹے یہاں گزار دیتی۔ ساحل کے اس مقام پر اکیلے آکر بیٹھنے میں اسے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ قہوہ خانے میں روز آنے والے مقامی باشندے اسے پہچان گئے تھے اور بنچ پر اکیلی لڑکی کو بیٹھا دیکھ کر اب انہیں کوئی تعجب نہیں ہوتا تھا۔ احمد نے چنائے سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ وہ جواباً" تھوڑی سی بھی گرمجوشی کا مظاہرہ کرتا تو بات معانقے تک جا پہنچتی۔ چنائے کو پیشوائی کا یہ انداز اچھا لگا۔ وہ مہمان نوازی کی ان اعلیٰ روایات کا عادی تھا جس میں میزبان چہرے پر مصنوعی مسکراہٹیں لئے گھومتے اور مہمان بدمزہ کھانوں کی تعریف میں زمین آسمان ایک کرتے۔ لیکن اسے اب تہذیب کے اس بناوٹی انداز سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ احمد کے

خوشی سے نکلے ہوئے دانتوں اور مصافحے کی گرمجوشی میں کوئی تصنع نہیں تھا' خلوص ہی خلوص تھا۔ ایک بہت معصوم سا سچا خلوص۔

رفی چنائے کو لے کر اس طرح بیٹھی تھی کہ دونوں کی پیٹھ ساحل کی طرف تھی۔ لیکن جب اس نے رفی کی نگاہوں کا تعاقب کر کے دیکھا تو ذرا دور ایک قدم آدم فینس کے پیچھے جہازوں کو رستہ دکھانے والے قمقموں کی قطاروں کے درمیان رن وے صاف نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے زمین پر ستاروں کی لکیریں کھینچ دی ہوں۔ ایک دیوہیکل طیارہ زمین کو چوم کر اپنی بل کھاتی کمر سیدھی کر کے ستاروں کی اس راہ گزر پر تیزی سے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ چنائے کو اتنے قریب سے جہاز کی لینڈنگ کا یہ منظر بہت اچھا لگا۔ رفی لینڈنگ اور ٹیک آف کے یہی مناظر دیکھنے یہاں آتی تھی۔ جہازوں کو اندر سے دیکھ کر وہ بیمار ہو گئی تھی۔ اسے ایئر ہوسٹس کا پیشہ نرسنگ کی طرح اور اڑتا ہوا جہاز اندر سے سرکاری اسپتال کا جنرل وارڈ لگتا تھا جس میں نشستوں پر نیم دراز مریضوں کو وہ اور اس کی ساتھی ایئر ہوسٹیس نرسوں کی طرح کمبل اڑھاتیں' کمر کے پیچھے تکئے رکھتیں' کھانوں کی ٹرے سجاتیں' پانی پلاتیں ان کے بچوں کا خیال رکھتیں اور ٹائلٹس میں ان کی چھوڑی ہوئی گندگی کو صاف کرتیں۔ وہ باہر بیٹھ کر جہازوں کے اڑنے اور اترنے کا منظر دیکھ کر اپنی وہ کوفت دور کرتی جو جہازوں کے اندر کام کر کر کے اس کے اندر بس گئی تھی۔

احمد نے میز پر قہوہ کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں اور کیتلی سجا دی۔ چنائے کو اس وقت حیرت ہوئی جب احمد نے تازہ چلم لگے دو حقے لا کر ان کے پاس رکھ دیئے۔ اور اس سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب رفی نے منہ میں لے کر حقہ گڑگڑانا شروع کیا۔ اسے پتلی اور لمبی انگلیوں میں دبے ہوئے سگریٹ کے کش لے کر دھواں اڑاتی ہوئی عورتیں اچھی لگتی تھیں۔ لیکن اس نے عورتوں کو کبھی سگار یا پائپ پیتے نہیں دیکھا تھا۔ اور حقہ.......... رفی کا حقہ پینا ایک عجیب منظر تھا جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکا۔ نہ ہی کوئی اچھی تشبیہہ سوجھ رہی تھی۔ بس کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے رفی کے داڑھی نکل آئی ہو۔ اس تصور سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یا جیسے جینز

اور شوخ گلابی رنگ کے بلاؤزر والی اس لڑکی نے نوابزادہ نصراللہ کی پھندنوں والی لال ٹوپی پہن لی ہو۔ اس خیال پر تو اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ ہنسی کی وجہ سن کر رفی بھی ہنس پڑی۔

"میں اپنا نشہ حقے سے stable کرتی ہوں۔" رفی نے شرارتی لہجے میں کہا اور اسے بھی حقہ پینے کی دعوت دی۔ چنائے نے حقہ کا اتنی زور سے کش لیا کہ بہت دیر تک کھانستا رہا۔ لیکن تمباکو کے پانی میں بھیگے ہوئے میٹھے میٹھے دھوئیں نے مزا بھی دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ بڑی روانی سے حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ احمد نے ان کی چلم تازہ کر دی۔ وہ دیر تک قہوہ پیتے اور حقہ گڑگڑاتے ہوئے جہازوں کے اڑنے اور اترنے کا منظر دیکھتے اور ان کی دم پر بنے ہوئے نشانوں سے ایئر لائنز کا نام بوجھنے کا کھیل کھیلتے رہے۔ رفی فلائٹوں کے دوران پیش آنے والے دلچسپ قصے سناتی رہی۔ وہ بتا رہی تھی کہ فلائٹ ختم ہونے کے بعد ذہنی اور جسمانی تھکن کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ایئر پورٹ سے ہوٹل تک کا سفر بھی کٹھن لگتا ہے۔ چنائے کو معلوم تھا۔ اس کے ایک پائلٹ دوست نے ایک دفعہ اسے بتایا تھا کہ فلائٹ کے بعد ہوٹل جا کر یہ خوف رہتا ہے کہ کوئی ایئر ہوسٹس رات کو سچ مچ کمرے کا دروازہ نہ کھٹکھٹا دے۔

حقوں کا تمباکو دوسری دفعہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ جہازوں کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی تھی اور لگتا تھا کہ احمد اپنے ساحلی قہوہ خانے کو بند کرنے والا ہے۔ اس نے کرائے پر دیئے جانے والے حقوں کو زنجیر پہنا کر تالہ بندی کا کام شروع کر دیا تھا۔ رفی اور چنائے اٹھ کھڑے ہوئے۔ احمد خدا حافظ کہنے ان کے پاس آیا لیکن اس نے رفی سے قہوے اور حقے کے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ دوسرے ملک سے آنے والا رفی کا مہمان اس کا بھی مہمان تھا اور مہمانوں کی خاطر کے پیسے نہیں لئے جاتے۔ اپنے اصرار پر احمد کی ناراضی بڑھتے دیکھی تو رفی بھی چپ ہو گئی۔ احمد سے رخصتی مصافحے میں اس دفعہ چنائے نے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ چنائے کو معلوم تھا کہ احمد کی مہمان نوازی کا بوجھ ہمیشہ اس کے کندھوں پر رہے گا۔ وہ اسے کبھی اتار نہ سکے گا۔

"چلیئے اب آپ کو میں مہذب دنیا میں واپس لئے چلتی ہوں۔" رفی نے گاڑی

کی طرف واپس چلتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"مہذب دنیا!" چنائے نے ایک گہرا سانس لے کر رفی کی طرف منہ کئے بغیر سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے مخاطب ہو۔

"مہذب دنیا ایک فریب ہے۔ سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ میں اسی جھوٹ اور فریب کا پروردہ ہوں مجھے معلوم ہے کہ مہذب دنیا کے انسان وہ بھیڑیئے ہیں جنہوں نے فرانسیسی اور اطالوی لیبلوں والے سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ سب کی آستینوں میں خنجر چھپے ہیں' سب ایک دوسرے کی گھات میں ہیں' موقع پاتے ہی قتل کرنے' چھرا گھونپنے کے لئے تیار۔ اور مہذب.......... مہذب احمد ہے جس نے پورے دن میں دس دینار نہیں کمائے لیکن ہمارے بل کے دس دینار اپنی مہمان نوازی کی روایت پر قربان کر دیئے۔"

رفی نے چاند کی روشنی میں چمکتے ہوئے چنائے کے چہرے کو دیکھا جس پر اسے پہلی بار افسردگی کا سایہ نظر آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ چہرے سے کوئی نقاب سی ہٹ گئی ہو۔ لیکن جب اس نے رفی کی طرف چہرہ کیا تو ہونٹوں پر ہمیشہ رہنے والی مسکراہٹ نے نقاب دوبارہ ڈال دی۔ وہ گاڑی تک پہنچ گئے۔ رفی نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو اس وقت بھی چنائے کا بیان جاری تھا۔

"لیکن ہم اس نام نہاد تہذیب کے کٹہرے میں بند ایسے جانور ہیں جو نکل کر بھاگ نہیں سکتے اور کبھی غلطی سے نکل جائیں تو دوبارہ اندر آ کر دروازہ خود ہی اور مضبوطی سے بند کر لیتے ہیں۔ اس لئے چلو اپنی اسی دنیا میں واپس چلتے ہیں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ آج کی رات کے لئے تمہارے پاس ابھی کتنے نسخے اور باقی ہیں۔ تم کہیں اور نہ بھی لے جاؤ تو اب تک کی گزاری ہوئی اس رات کو میں نہیں بھول سکوں گا۔" چنائے نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ رفی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور چنائے کو اپنا پروگرام بتایا۔

"اب ہم میرینا کلب جائیں گے۔ وہاں لا۔سٹر آرڈر کر کے بوٹ ریمپ کے ہلکورے لیتے ہوئے تختے پر پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھیں گے تاکہ پیروں کی ریت دھو کر

اور جوتے موزے پہن کر دوبارہ مہذب بنیں اور کھانا کھا سکیں۔ تھوڑی دیر اندر جا کر بار میں پیانو سنیں گے وہاں میں آپ کو مارگریٹا پلواؤں گی جسے پی کر آپ "میرینا ڈالرے" کے بار ٹنڈر کو بھول جائیں گے۔ اور میں وہ "بلاڈی میری" پیوں گی جسے پینے سے اب آپ مجھے نہ روک سکیں گے۔" چنائے جھینپتے ہوئے انداز میں ہنسنے لگا۔

"میرینا کلب سے ہم واپس شہر آئیں گے جہاں اراڈوس ہوٹل میں مصر کی ایک بیلی ڈانسر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ آپ اس کے کولھوں کی ہلنت دیکھئے گا' میں آئرش کافی پیوں گی۔ یہاں کے بار ٹنڈر جیسی آئرش کافی پوری گلف میں کوئی نہیں بناتا۔ بس اس کے بعد ہم قومی ترانہ گا کر اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں گے۔"

چنائے سچ مچ حیرت زدہ تھا۔ رفی نے جو پروگرام اسے بتایا تھا وہ اپنی تمام جزئیات کے ساتھ اسی طرح پورا ہوا تھا جیسے مہینوں کی محنت سے تیار کیا گیا ہو۔ اور کمال یہ تھا کہ ہر چیز چنائے کے ذوق معیار اور پسند کے مطابق تھی۔ لا بسٹر اور مارگریٹا سے لے کر مصری ڈانسر تک۔ بس وہ آئرش کافی پر زیادہ غور نہ کر سکا تھا کیونکہ اس کی توجہ مکمل طور پر بیلی ڈانسر کی طرف تھی لیکن ان کی ٹیبل پر آئرش کافی بنانے کا جو مظاہرہ ہوا تھا اس کی ایک جھلک اس نے دیکھی تھی اور متاثر ہوا تھا۔ رفی نے جب چنائے کو اس کے ہوٹل چھوڑا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ رفی کے لئے بھی آج کی رات جامع' مکمل اور ہمیشہ یاد رہنے والی رات تھی۔ اس نے اپنی پسند کی تمام چیزوں کو پہلی بار ایک رات میں پرو دیا تھا۔ رفی چنائے کی اس لئے بھی شکر گزار تھی کہ خدا حافظ کہتی ہوئی رفی کو اس نے اپنے کمرے میں آ کر کافی پینے کی دعوت نہیں دی تھی۔ مہذب دنیا کے مہذب لوگ ہم بستری کی دعوت اسی مہذب انداز میں دیتے تھے۔ چنائے اگر دعوت دیتا تو رفی انکار نہ کر سکتی۔ اس کے لئے چنائے کی عمر کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اس سے بڑی عمر کے لوگوں کے ساتھ رات بسر کر چکی تھی۔ لیکن آج کی بہت اچھی گزری ہوئی رات کا وہ اپنے گھر اور اپنے بستر میں تنہا لیٹ کر مزا لینا چاہتی تھی۔ اسے اپنے کمرے میں لے جانے کی کوشش نہ کر کے رفی کی نظروں میں چنائے نے اپنی قدر اور بڑھا لی تھی۔ اس نے سوچا کہ چنائے پورا مہذب نہیں بنا

ہے۔ ابھی اس میں زندگی کے اثرات باقی ہیں۔

دوسری طرف چنائے نے اس پر اطمینان کا سانس لیا تھا کہ رفی نے باقی رات ایک ساتھ گزارنے کو آج کے ایجنڈے میں شامل نہیں کیا تھا۔ نہ اسے اپنے گھر لے جانے یا اس کے کمرے میں آنے کی کوشش کی تھی۔ جنس اب چنائے کا مسئلہ نہیں رہی تھی۔ کثرت شراب نوشی نے اس کا یہ خانہ تنگ کر دیا تھا' وہ تو صرف خوبصورت عورتوں کے ساتھ رہ کر انہیں خوش ہوتا دیکھ کر خوش ہوتا۔ اس رات کی لذتوں کو یاد کر کے وہ بھی خوابوں کو اوڑھ کر سو گیا۔

چنائے کتنی ہی رات کو سوئے صبح جلدی اٹھتا تھا اور اپنی نیند دوپہر میں لنچ کے بعد سو کر پوری کرتا تھا۔ لیکن آج وہ نو سے پہلے نہیں اٹھ پایا تھا۔ ناشتہ اور اخبار اس نے کمرے میں منگا لیا تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا اور اس کی مصروفیات طے نہیں تھیں۔ اس نے سوچا تھا کہ ناشتے کے بعد وہ اپنے منصوبے کی نوک پلک ایک بار پھر درست کرے گا اور دوپہر کو ہوٹل کے سوئمنگ پول کے ساتھ لگے ہوئے "بار بی کیو" میں لنچ کر کے سو جائے گا۔ شام میں اگر رفی فارغ ہوئی تو اس کے ساتھ کچھ وقت گزارے گا ورنہ رات کو اراڈوس جا کر مصری رقاصہ کا بیلی ڈانس دیکھے گا۔ یہ رقاصہ اسے پسند آئی تھی۔ وہ عام مصری بیلی ڈانسروں کی طرح موٹاپے کی طرف مائل نہیں تھی بلکہ اس کے جسم کے صرف انہی حصوں پر زیادہ گوشت تھا جنہیں ہلانا اس کے پیشے کی ضرورت تھی۔

اس نے سوچا کہ رفی کو فون کر کے گزشتہ رات کی مہمان نوازی کا رسمی طور پر شکریہ ادا کرے لیکن ابھی صرف دس بجے تھے اور اسے اندازہ تھا کہ صبح چار بجے کے بعد سونے والی رفی بارہ ایک سے پہلے نہیں اٹھ پائے گی۔ اس نے کافی کا دوسرا کپ بنا کر اخبار کی پہلی سرخی پڑھنی شروع کی تھی کہ فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ اسے حیرت تھی کہ اس وقت اسے کون فون کر سکتا ہے۔

"شاید میں نے تمہیں سوتے سے اٹھایا ہے۔" رفی کی آواز میں نیند یا گزری

ہوئی رات کے خمار کے ہلکا سا اثر بھی نہیں تھا۔

"اوہ نہیں نہیں۔ میں تو ناشتہ بھی کر چکا ' میں تمہیں فون کرتا لیکن سوچا کہ تم ابھی سو رہی ہو گی۔" چنائے نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"میں صبح سویرے اٹھنے کی عادی ہوں۔ دراصل میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی' ایک بہت خوبصورت رات میرے ساتھ گزارنے پر۔ مجھے امید ہے تم بھی بور نہیں ہوئے ہو گے اور کچھ نہیں تو بیلی ڈانسر ضرور پسند آئی ہو گی۔" چنائے ہنسنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ رنی اس پر ایک بار پھر سبقت لے گئی ہے۔

"مصری رقاصہ اچھی تھی لیکن تم سے زیادہ نہیں۔ رات واقعی بہت شاندار تھی میں تمہیں خود فون کرنے والا تھا' شکریہ ادا کرنے' لیکن میرا خیال تھا تم ابھی اٹھی نہیں ہو گی۔" چنائے کا لہجہ خلوص سے بھرپور تھا۔

"آج شام تمہارا کیا پروگرام ہے۔" رنی نے اس کے شکریئے کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"مصری رقاصہ کا پروگرام دیکھیں گے۔ تمہیں رقاصہ نہ سہی' آرش کافی پسند ہے' تم وہ پیتی رہنا۔" چنائے نے ایک بار پھر ہنستے ہوئے کہا۔

"پھر تو تمہیں مایوسی ہو گی۔ آج رات اس کا شو نہیں ہے۔ آج تو ایک چنچل سی مقامی لڑکی گنے چنے چند مہمانوں کا دل گانوں سے بہلائے گی۔ مجھے معلوم ہے وہ تمہارے ذوق پر پوری نہیں اترے گی۔"

چنائے اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ طنز کر رہی ہے یا یہ محض سادہ سی حقیقت بیانی تھی۔ ویسے اسے مایوسی ضرور ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس مصری رقاصہ کو دوبارہ تھرکتا نہ دیکھ سکے گا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ بحرین میں کل اس کا آخری دن ہو گا۔ وہ اپنے منصوبے کی کامیابی کے بارے میں زیادہ پرامید نہیں تھا اور طے کر چکا تھا کہ اتمام حجت کے لئے وہ کل ان تاجروں کو دوبارہ فون کرے گا جن سے اس سلسلے میں اس نے رابطے کر رکھے تھے۔ اور اگر کوئی حوصلہ افزا بات نہیں ہوئی تو رات کی فلائٹ لے کر واپس کراچی چلا جائے گا۔ وہ ایسے کاروبار میں وقت اور پیسہ لگانے پر

یقین نہیں رکھتا تھا جس کی کامیابی کا کوئی امکان نہ ہو۔

اس کی سوچ نے جو وقفہ پیدا کیا تھا اسے توڑتی ہوئی رفی کی آواز پھر سنائی دی۔

"شو ہوتا بھی تو ہم وہاں نہ جاتے۔ ہم آج شام ڈنر پر مدعو ہیں۔"

"ہم؟" چنائے نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے اپنے ایک جاننے والے سے تمہارے بزنس Proposal کا تذکرہ کیا تھا وہ یہاں کا ایک بڑا شیخ ہے اس نے تمہارے منصوبے میں دلچسپی ظاہر کی ہے آج کی رات وہ فارغ ہے' ڈنر پر بلایا ہے۔ وہ آٹھ بجے گاڑی بھیجے گا اگر تمہیں چلنے پر اعتراض نہ ہو تو سوا آٹھ بجے تیار رہنا۔"

"میں تمہیں ہوٹل کی لابی میں ملوں گا۔" چنائے نے فون رکھا تو مسرت سے اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ یہ لڑکی تو اس کے لئے لاٹری کا جیتا ہوا ٹکٹ ثابت ہو رہی تھی۔ کل رات جب وہ ساحل پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے تو اس نے اپنے بحرین آنے کی وجہ بتاتے ہوئے پینے کے پانی کی فراہمی کے اس منصوبے کا تذکرہ کیا تھا جو وہ بحرین میں بیچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بحرین اور خلیج کی دوسری ریاستوں میں پینے کا پانی ایک مسئلہ تھا۔ سمندری پانی کو بڑے بڑے اور بہت مہنگے پلانٹس کے ذریعے گھریلو استعمال کے قابل بنایا جاتا تھا۔ چنائے کا منصوبہ یہ تھا کہ بحر شمالی سے برف کے بڑے بڑے تودے سمندر میں کھینچتے ہوئے لائے جائیں گے جو اپنی منزل پر پہنچ کر پینے کے پانی کی شکل میں تبدیل کئے جائیں گے اور لاکھوں گیلن پینے کا پانی فراہم کریں گے۔ اس منصوبے کے مطابق پانی حاصل کرنے کے اس طریقے پر سلینیشن پلانٹس کے مقابلے میں بہت کم لاگت آتی تھی۔ منصوبے کے قابل عمل ہونے کی رپورٹ بڑی ذہانت اور پیشہ ورانہ طریقے سے تیار کی گئی تھی۔ اس میں تمام تفصیلات تھیں کہ کس طاقت کے انجنوں والا جہاز کتنے بڑے برف کے تودے کو کھینچ سکتا ہے خلیج کے پانیوں تک پہنچنے میں اسے کتنا وقت لگے گا' جہازوں کے کرایوں پر کیا خرچ آئے گا۔ برف کے تودے کے پگھلنے کی کیا رفتار ہو گی۔ مہینوں کا سفر طے کر کے خلیج پہنچنے والے برف

کے تودے میں کتنا پانی بچے گا اور فی مکعب فٹ برف سے پگھلنے والے پانی کی مقدار کیا ہو گی۔ ان سب پر آنے والی لاگت اور پینے کا پانی حاصل کرنے کے دوسرے طریقوں پر آنے والی لاگت کا تقابلی جائزہ لیا گیا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس منصوبے پر آنے والی لاگت دوسرے طریقوں کے مقابلے میں کم از کم نصف اور بعض صورتوں میں اس سے بھی کم تھی۔ چنائے نے یہ بنی بنائی رپورٹ لندن میں ایک مینجمنٹ کنسلٹنسی گروپ سے پانچ ہزار ڈالر میں خریدی تھی۔

رفی نے اپنے منصوبے کو بیچنے کی کوشش میں ناکامی سے مایوس چنائے کو دلاسا دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ چند مقامی تاجروں کو جانتی ہے اور چنائے کو ان سے ملوانے کی کوشش کرے گی۔ لیکن چنائے کو یقین نہیں تھا کہ رسمی طور پر کیا ہوا یہ وعدہ اسے یاد رہا ہو گا۔ رفی کو نہ صرف یاد رہا بلکہ وہ اسے نباہنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

چنائے پونے آٹھ بجے سے ہوٹل کی لابی میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے گرے رنگ کی پتلون پر "پیئر کارڈن" کی سنہرے بٹن والی نیوی بلیو اسپورٹس جیکٹ پہنی تھی جس کی جیب میں گہرے سرخ رنگ کا رومال تھا اور اسی سے میچ کرتے ہوئے موزے اور بالی کے سیاہ جوتے پہنے تھے۔ اندر کھلے ہوئے کالر کی کریم کلر کی قمیض تھی۔ وہ اس عمر میں بھی خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ رفی جب ٹھیک سوا آٹھ بجے اسے لینے پہنچی تو وہ جینز اور بلاؤز پہن کر ننگے پاؤں ساحل پر ٹہلنے یا بینچ پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے والی لاپرواہ لڑکی نہیں لگ رہی تھی بلکہ بہت پروقار نظر آنے والی ایک انتہائی حسین خاتون تھی جس نے ہوٹل کی لابی میں داخل ہوتے ہی سب کی نگاہیں اپنی طرف کھینچ لی تھیں۔ اس نے سیاہ رنگ کا کاک ٹیل ڈریس پہنا تھا۔ ذرا نیچے تک کٹے ہوئے گلے نے سینے کے ابھاروں کے درمیان کی لائن کا تھوڑا سا حصہ اس طرح نمایاں کیا تھا کہ اسے دیکھ کر لابی میں بیٹھا ہوا ایک نوجوان اپنی سسکاری نہ روک سکا۔ پتلی سی کمر پر ڈریس بہت متناسب انداز میں چڑھا تھا نہ کوئی سلوٹ نمایاں تھی نہ کسا کسا نظر آتا تھا۔ کمر پر لباس کی اس تراش نے سینے اور کولہے کے خطوط بہت خوبصورت انداز میں ابھارے تھے اس طرح کہ معیوب نہ لگیں اور نیوڈ بنانے والے کسی مصور کو شاہکار

تخلیق کرنے کے لئے ماڈل کے کپڑے اتارنے کی ضرورت بھی نہ پڑے۔ بال بغیر مانگ نکالے پیچھے کی طرف کھینچ کر جوڑے کی شکل میں اٹھے ہوئے تھے۔ گلے میں بہت باریک سی زنجیر تھی جس میں ہلکے نیلگوں رنگ کا چھوٹا سا اوپل اور اس سے میچ کرتا ہوا باریک سا بریسلیٹ۔ اونچی ایڑی کے سیاہ جوتے اور ہاتھ میں نازک سا سنہرے رنگ کا پرس۔ ہونٹوں پر گہرے کتھئی رنگ کی لپ اسٹک تھی اور چہرے پر میک اپ میں بلش اون، استعمال نہیں کیا گیا تھا جس نے چہرے کو عجیب سی پراسراریت دے دی تھی۔ آنکھوں کی خوابیدگی نے یہ پراسراریت اور بڑھا دی تھی۔ اس کی لمبی لمبی پلکیں بند ہوتیں تو لگتا اندھیرے چھا گئے ہوں اور کھولتی تو آسمانوں کے دروازے کھلتے نظر آتے۔ چنائے کو اس کی بہت خوبصورت آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت رقص کرتی نظر آئی۔ وہ اسے کوئی نام نہیں دے سکا بس ایک انجانا سا خوف محسوس ہوا تھا۔

چنائے نے اپنا بازو پیش کیا جسے بڑے وقار کے ساتھ قبول کیا گیا اور دونوں باہر نکل کر گاڑی کی طرف بڑھے۔ ملباری ڈرائیور سیاہ رنگ کی مرسیڈیز ۱۰۰۰ کا دروازہ کھولے کھڑا تھا جو ان کے میزبان نے انہیں لینے کے لئے بھیجی تھی۔

میزبان کھلی ہوئی رنگت اور نکلتے ہوئے قد کا بہت شائستہ نظر آنے والا شخص ثابت ہوا جس کی عمر چالیس سے یقیناً کم ہو گی۔ وہ ساحل کے سامنے بنی ہوئی عمارت کی چودھویں منزل پر اپنے پینٹ ہاؤس میں ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ یہ تیرہویں منزل تھی، لیکن ۱۳ کے ہندسے کی نحوست سے بچنے کے لئے بارہویں فلور کے بعد کے فلور کو ۱۴ ویں فلور کا نام دے دیا گیا تھا۔ چنائے کا اندازہ درست تھا، رفی کو وہ تھوڑی دیر تک دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ بس ایک لمحہ تھا جس میں اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ یہ بالکل محسوس نہ ہونے والا لمحہ باریک بین چنائے کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا تھا۔ لیکن فوراً ہی سنبھل کر وہ دونوں سے بہت گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملاتا ہوا اک پرتکلف ڈرائنگ روم کے صوفوں میں دھنس گیا۔ رفی نے دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرانے کی رسم پوری کی۔ چنائے کو اس نے لندن کے ایک

پاکستانی نژاد بزنس مین کے طور پر متعارف کرایا تھا۔ جبکہ شیخ علی کے بارے میں جو کچھ جانتی تھی وہ بتاتی رہی۔ شیخ علی بحرین کے حکمران خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا بہت بڑا ٹریڈنگ ہاؤس تھا جس کے پاس امریکی کاروں اور جاپانی الیکٹرونکس کے کئی معروف برانڈز کی ایجنسیاں تھیں۔ ایک فائیور اسٹار ہوٹل کا سب سے بڑا شیئر ہولڈر تھا۔ ٹریول ایجنسی اور ایک شپنگ کمپنی تھی۔ تیل کی تجارت میں بھی اس کا کچھ دخل تھا۔ شہر کا ایک تجارتی کمپلیکس میں اس کے فیملی بزنس کا حصہ تھا اور چنائے کو یقین تھا کہ یہ عمارت جس کے پینٹ ہاؤس میں وہ اس وقت مہمان تھے اسی کی ملکیت ہو گی۔

شیخ علی بہت زیادہ دولت رکھنے والے عام عرب شیخوں سے مختلف ثابت ہوا۔ اس نے امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا اور اس سے پہلے آکسفورڈ میں اقتصادیات کے علاوہ تاریخ اور نفسیات پڑھی تھی۔ وہ بہت صاف اور شستہ انگریزی بول رہا تھا جس میں آکسفورڈ کے برطانوی یا بوسٹن کے امریکی لہجے کی چھاپ نہیں تھی۔ پینٹ ہاؤس کا کشادہ ڈرائنگ روم شیخ علی کی امارت کے ساتھ اس کے اعلیٰ ذوق کا آئینہ دار بھی نظر آتا تھا۔ اس کی سجاوٹ دیکھ کر رفی کو حیرت ہوئی۔ امیر عربوں کے گھروں کی سجاوٹ چیخ چیخ کر مکین کے امیر ہونے کا اعلان کرتی تھی۔ عربوں کو سنہرا رنگ استعمال کرنے کا بہت شوق تھا جو شاید سونے سے ان کی محبت کا اظہار تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ اپنے دیوانئے کی دیوار بھی سونے کی بناتے۔

رفی نے شیخ علی کو ہمیشہ عربوں کے روایتی لباس میں دیکھا تھا جس میں چہرے کے علاوہ سر اور جسم کی ہر چیز ڈھکی ہوتی تھی۔ آج پہلی بار اس نے اسے آدھی آستینوں کی اسمارٹ سی نیلی ٹی شرٹ اور بیج رنگ کی پتلون میں دیکھا۔ مصری اداکار عمر شریف جیسے گھنگھریالے بال، کشادہ پیشانی اور اس کے نیچے ذہانت بھری چمکتی ہوئی آنکھیں، ترشی ہوئی گھنی مونچھیں اور پیٹ بھی خوشحالی کے اظہار میں باہر کو نکلا ہوا نہیں تھا بلکہ اتنا ہموار تھا کہ اس کا چوڑا سینہ زیادہ نمایاں نظر آتا تھا۔ رفی نے سوچا شیخ علی صرف اپنے دولت کی وجہ سے نہیں اپنی شخصیت کی وجہ سے بھی لڑکیوں میں

مقبول رہا ہو گا۔

سیاہ اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہنے ایک پھرتیلی سی فلپائنی لڑکی ساقی گری کے کام پر مامور تھی۔ چنائے نے سوچا شراب پلانے والی کسی خوبصورت لڑکی کے لئے بار ٹنڈر کا لفظ کتنا کریہہ الصوت ہے۔ لیکن ساقی کہنا لطف دیتا تھا جس سے پتلی کمر کی شرابی آنکھوں والی نازک سی حسینہ کا تصور ابھرتا تھا جو ڈھیلا باریک لباس پہنے روایتی مینا سے جام بھر رہی ہو۔ رفی نے مارٹینی آرڈر کی تھی اور چنائے کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ چنائے اپنی شی واز پر قائم تھا جبکہ شیخ علی نے جانی بلیو منگوائی تھی۔ کمرے میں ہلکی ہلکی موسیقی بکھری ہوئی تھی۔ شاید موازرت کی کوئی سمفونی تھی۔ رفی کو یہ موسیقی کمرے میں خوشبو کی طرح پھیلی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس خوشبو سے وہ بہت مانوس تھی، وہ اس کی سب سے پسندیدہ خوشبو تھی جسے وہ کہیں سے خرید نہیں سکتی تھی، یہ خوشبو اچانک ہی اس کے اطراف میں پھیلے ہوئے ماحول پر چھا جاتی اور اسے لگتا کہ جیسے وہ بہت ہلکی ہو کر آہستہ آہستہ ہوا میں ہلکورے کھا رہی ہو۔ دنیا بھر میں اس نے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے پرفیوم یا عطریات کی کسی دکان پر ایسی خوشبو نہیں مل سکی تھی۔

چھت اور دیواروں کی لائٹس بند تھیں صرف کونوں میں رکھے ہوئے لیمپ روشن تھے جن پر چڑھے ہوئے شیڈز سے چھن کر نکلتی ہوئی نیلگوں سی روشنی نے ماحول کو سحر انگیز کر دیا تھا۔ شیخ علی اور چنائے اس وقت عالمی معیشت کے کسی پیچیدہ مسئلے میں الجھے ہوئے تھے جس سے رفی کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چنائے کو بھی دلچسپی نہیں تھی لیکن ابتدائی تعارف کے بعد ایک دوسرے کا قد ناپنے اور مرعوب کرنے کا جو کھیل ہوتا ہے اس میں دونوں نے اپنے اپنے سینگ پھنسائے ہوئے تھے۔ لیکن چنائے اس کھیل کا پرانا کھلاڑی تھا، اپنے تمام تجربوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ڈٹا ہوا تھا۔ چنائے ہر مسئلے کو بڑے فلسفیانہ انداز میں بیان کرتا۔ وہ لفظوں کو بہت ناپ تول کر استعمال کرتا اور اس کا انداز بہت دل موہ لینے والا ہوتا تھا۔ وہ سامنے والے کو متاثر کئے بغیر نہ چھوڑتا۔ شیخ علی بھی اس تاثر سے بچ نہ سکا تھا۔ لیکن چنائے کو پتہ تھا

کہ اسے اپنا بھرم قائم رکھنے کیلئے کتنی محنت کرنی پڑی ہے۔ چنائے اس گفتگو کو ختم کر کے ایک اچھی سی شام کا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شیخ علی اس کے منصوبے کے لئے موزوں آدمی نہیں ہے۔ رفی اگر اسے پہلے سے بتا دیتی کہ وہ اتنا بڑا بزنس مین ہے تو وہ اسے منع کر دیتا۔ چنائے کے منصوبے میں درمیانے درجے کے ایک ایسے تاجر کو دلچسپی ہو سکتی تھی جو لکھ پتی سے جلد از جلد کروڑ پتی بننے کے خواب دیکھ رہا ہو۔ شیخ علی تو ارب پتی تھا۔ ایک انتہائی کامیاب اور اونچے درجے کا بہت پڑھا لکھا اور ذہین بزنس مین جس کے لئے سمندروں میں برف گھسیٹنے کے منصوبے بچوں کا کھیل تھے۔ اس لئے دنیا کی معیشت کو اس کے حال پر چھوڑ کر وہ اب یہ گفتگو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گفتگو کو کوئی دلچسپ موڑ دیتا شیخ علی چنائے سے اس کے اس بزنس پروپوزل کے بارے میں پوچھنے لگا جس کا رفی نے تذکرہ کیا تھا اور جس کے لئے وہ چنائے کو اس سے ملانے لائی تھی۔ چنائے نے دو منٹ کے اندر اندر اسے اپنے منصوبے کا خاکہ بتایا اور وہ فائل اس کی طرف بڑھا دی جسے وہ شیخ علی کے لئے تیار کر کے لایا تھا لیکن اب دیتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ شیخ علی نے فائل لے کر دیکھے بغیر میز پر رکھ دی اور کہا کہ وہ صبح اپنے متعلقہ منیجر کو اسٹڈی کرنے کے لئے دے گا۔ چنائے نے اسے بتایا کہ وہ کل رات واپس جا رہا ہے' ہانگ کانگ میں اس کی اہم میٹنگ ہے' وہ ہانگ کانگ سے واپسی پر رابطہ کرے گا۔

"نہیں نہیں۔ آپ کو رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ میرے آدمی کل دوپہر تک آپ کے جانے سے پہلے آپ سے رابطہ کر لیں گے۔" شیخ علی نے بات ختم کرتے ہوئے اپنا گلاس ہاتھ میں اٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور رفی کو دیکھ کر مخاطب ہوا۔

"کاروبار اب بالکل بند' میرا وعدہ ہے کہ اب بزنس اور سیاست پر مزید کوئی گفتگو نہیں ہو گی۔ میرا خیال ہے مسٹر چنائے بھی متفق ہوں گے۔"

"بالکل درست۔ لیکن نو مور مسٹر چنائے۔ جسٹ کال می اختر۔" چنائے نے کہا اور رفی نے سوچا کہ ہر اجنبی سے ملتے وقت چنائے شاید اس جملے کو تکیہ کلام کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ فلپائنی ساقی ان کے لئے نئے جام بنا کر لے آئی تھی۔ چنائے

اس وقت جہاں بیٹھا تھا اس کی نزدیکی دیوار پر ٹنگا ہوا خطاطی کا ایک نمونہ دیکھ رہا تھا۔
"آپ کو آرٹ میں دلچسپی ہے۔" شیخ علی نے چنائے سے پوچھا۔
"کسے نہیں ہو گی' لیکن مجھے عصری عہد کے آرٹ سے زیادہ دلچسپی ہے جبکہ رنی مجھے کل بتا رہی تھیں کہ ان کی دلچسپی اولڈ ماسٹرز میں ہے۔ لیکن آپ تو مجھے خطاطی کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔" چنائے نے رنی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جو اب بھی خاموش تھی اور مارٹینی کی چسکیاں لے رہی تھی۔
"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ قدیم مصوروں میں میری دلچسپی کچھ زیادہ ہے۔ میرے پاس اٹھارویں اور انیسویں صدی کی بنی ہوئی دو ایسی تصویریں ہیں جو میرے ایجنٹس نے سوبی سے آکشن میں خریدی تھیں اور ان کی بہت بڑی قیمت لگائی تھی۔ وہ میرے گھر کی اسٹڈی میں لگی ہیں۔ پرانی تصویریوں میں ان کے عہد کا جو رعب اور دبدبہ رچا ہوتا ہے وہ اس اپارٹمنٹ کے ڈیکور سے میچ نہیں کرتا۔ اس کی دیواریں ان تصویروں کے لئے بہت چھوٹی اور پتلی ہیں۔ میرے پرانے گھر کی اونچی چھتیں رومن طرز کی ستونوں پر کھڑی ہیں' یہ تصویریں وہاں جا کر خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتیں۔ رنی آپ کو کسی دن اپنے گھر لے جا کر میں تصویروں کا اپنا کلکشن دکھاؤں گا۔"

چنائے جیسے زیرک آدمی سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں رہی تھی کہ علی چنائے سے مخاطب ہوتے وقت بھی کنکھیوں سے رنی کی طرف دیکھتا تھا جیسے اپنے ہر جملے کی اسی سے داد چاہتا ہو۔ چنائے کو یقین تھا کہ شیخ علی کے دل میں رنی کے لئے کوئی پرانی کسک ہے۔ رنی نے شاید اسے قریب آنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ رنی نے کل اسے بتایا تھا کہ اس نے مقامی شیخوں سے صرف رسمی تعلق رکھے تھے۔ ان کے ساتھ پارٹیوں میں رقص کرنے سے بھی گریز کیا تھا۔ چنائے نے اس وقت بھی دل میں سوچا تھا کہ رنی کے اس Hard to get کھیل نے اس کی قدر اور مانگ کتنی بڑھا دی ہو گی۔ چنائے کا یہ خیال صحیح بھی تھا اور غلط بھی۔ رنی نے خود کو مشکل سے ہاتھ آنے والی چڑیا اپنی مانگ اور قدر بڑھانے کے لئے نہیں بنایا تھا۔ بلکہ مقامی شیخوں سے رومانی

تعلق نہ رکھنے سے اس لئے بھی گریز کیا تھا کہ شیخ اپنی فتوحات میں اضافے کا طبل بجا کر اعلان کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ رنی کو ریس میں جیتا ہوا کپ بننا پسند نہیں تھا۔ لیکن چنائے کی یہ سوچ صحیح تھی کہ اس رویئے نے عرب شیخوں میں رنی کی قدر اور مانگ بہت بڑھا دی تھی۔ شیخ علی بھی اس کا پرانا بسمل تھا۔

رنی شیخ علی سے ان مصوروں کے بارے میں پوچھ رہی تھی جن کی تصویریں اس نے "سودبی" کے نیلام میں خریدی تھیں۔ ریمبراں، مشہور ڈچ پینٹر "وین گاغ" اور اسپینی آرٹسٹ "گویا" کا نام سن کر رنی بے حد متاثر ہوئی۔

"لگتا ہے آپ مظاہر پرست پینٹر پسند کرتے ہیں۔" چنائے نے بھی اولڈ ماسٹرز سے اپنی واقفیت کا اظہار کیا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔" شیخ علی نے چنائے کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس ایک تصویر مختلف طرح کے ایک قدیم مصری مصور الفیوم کی ہے جس کے وقت کا تعین کرنے پر اختلاف ہے۔ زیادہ تر ماہرین اسے دوسری صدی کا بنا ہوا شاہکار کہتے ہیں۔ اس تصویر کو خریدنے میں مجھے بڑی مشکل ہوئی تھی۔ لندن کا ایک مصری تاجر اس تصویر کی بولی دینے پر ڈٹ گیا تھا۔ میں شاید اسے لینے دیتا۔ لیکن وہ اس طرح بولی دے رہا تھا جیسے مجھے نیچے دکھانا چاہتا ہو اس لئے میرے لئے بھی تصویر کو حاصل کرنا عزت کا مسئلہ بن گیا۔ مصریوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہم خلیجی عربوں کو کم تہذیب یافتہ سمجھتے ہیں۔ میں نے اس بولی دینے والے مصری کی آنکھوں میں اپنے لئے تحقیر محسوس کی تھی، لیکن بعد میں وہ بہت شرمندہ تھا کیونکہ میں نے تصویر خرید کر اسے قاہرہ کے ایک میوزیم کو تحفے میں دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ پچھلے سال کی ہی بات ہے۔ تصویر ابھی کچھ عرصے اور میرے گھر میں ٹنگی رہے گی۔ اگلے سال اعلیٰ حضرت مصر جا رہے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے یہ تصویر میوزیم کو عنایت کریں گے۔"

چنائے دونوں کو مصوری کے سترہویں عہد میں چھوڑ کر اپنا گلاس لے کر اٹھا اور اس دیوار کی طرف جانے لگا جس پر ٹنگے ہوئے خطاطی کے نمونے کو وہ دیر سے دیکھ رہا تھا اور اب قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ شیخ علی اور رنی بھی اٹھ کر اس کے

ساتھ ہی آ کھڑے ہوئے۔

"سوری اختر۔ ہم آرٹ پر سیمینار کرنے لگے۔ یہ خیال نہیں رہا کہ آپ اس گفتگو سے بور ہو رہے ہیں۔"

"نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ میں خطاطی کا یہ نمونہ دیکھنا چاہتا تھا اس پر تاریکی ہے اس لئے دور سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ خط مجھے کچھ جانا پہچانا لگ رہا ہے۔" چنائے نے حقیقت بیان کر دی۔

"جی ہاں یہ آپ ہی کے ملک کا ایک آرٹسٹ ہے۔" شیخ علی نے یہ کہہ کر اس بلب کو روشن کر دیا جس کی روشنی صرف تصویر کا احاطہ کر رہی تھی۔ چنائے یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خطاطی کا یہ نمونہ صادقین کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔ دونوں جانب سے' ایک طرف سے سیدھا اور دوسری طرف سے الٹا نصر من اللہ فتح القریب اس طرح لکھا ہوا تھا کہ سیدھی اور الٹی دونوں تحریریں ایک دوسرے کا عکس نظر آتی تھیں۔ چنائے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس پر حیران تھا کہ دنیا میں مشہور اور بڑے بڑے عجائب گھروں میں سجے ہوئے پینٹروں کی لاکھوں ڈالر کی تصویریں رکھنے والا شیخ علی ایک غریب ملک کے فقیر منش آرٹسٹ کے نقش کو بھی اپنے عشرت کدے کی زینت بنائے ہوئے ہے۔

"میں نے یہ تصویر ڈیڑھ لاکھ ڈالر میں لی ہے۔" یہ کہہ کر شیخ علی نے چنائے کی حیرت اور بڑھا دی۔

"آٹھ دس سال پہلے یہاں خطاطی کی عالمی نمائش تھی۔ اعلیٰ حضرت نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ یاسر عرفات بھی اعلیٰ حضرت کے ساتھ اس نمائش میں آئے تھے۔ وہ جب پاکستان کے اسٹال پر پہنچے تو الجھے ہوئے لمبے بالوں اور استخوانی انگلیوں والے صادقین صاحب قرآنی آیات کی خطاطی کے اپنے نمونوں کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ یاسر عرفات کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک آئی اور انہوں نے دونوں ہاتھ قلموں سے بھری ہوئی ایک بوری میں ڈال کر دو مارکر برآمد کئے اور سامنے میز پر بچھے ہوئے ایک سفید کارڈ بورڈ پر دونوں ہاتھوں سے یہ نادر نمونہ تخلیق کیا۔ میں نے دو منٹ سے

بھی کم وقت میں نوک پلک سے درست ایک ساتھ سیدھا اور الٹا لکھا ہوا خطاطی کا نمونہ تخلیق ہوتے پہلی بار دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنی خطاطی یاسر عرفات کو پیش کی۔ وہ بھی دوسروں کی طرح تھوڑی دیر کے لئے حیران رہ گئے تھے۔ یہ صرف خطاطی نہیں تھی۔ دعا تھی۔ فتح حاصل کرنے کی دعا۔ لیکن یاسر عرفات کو اپنی تحریک کے لئے صرف دعا کی نہیں دولت کی بھی ضرورت تھی اس لئے اعلیٰ حضرت نے دیوان امیری میں پی ایل او کے جہاد فنڈز کے لئے اس کا نیلام کیا جس میں ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی بولی دے کر اسے میں نے خرید لیا۔"

چنائے نے سوچا شیخ علی کو شاید نیلام میں چیزیں خریدنے کا شوق ہے۔ بولی دے کر ملکیت حاصل کرنے میں دوسروں پر فتح پانے اور سبقت لے جانے کی جو لذت ہے وہ دکان پر قیمت چکا کر مال لینے میں نہیں ہے۔ شیخ علی نے ڈیڑھ لاکھ ڈالر اس تخلیق کے نہیں دیئے تھے بلکہ اعلیٰ حضرت کے سامنے دوسرے شخص کے مقابلے میں سرخروئی حاصل کرنے کی قیمت چکائی تھی۔ پھر بھی چنائے کو بہت اچھا لگا۔ اسے فخر کا احساس ہوا کہ اس کا تعلق بھی اس ملک سے ہے جس کے ایک آرٹسٹ کی تخلیق آرٹ کے قدر دان اور اتنے بڑے شیخ نے کتنے فخر سے اپنے گھر میں لٹکائی ہوئی ہے۔ اور آرٹسٹ بھی وہ جسے چنائے ذاتی طور پر جانتا تھا اسے معلوم تھا اور اس نے دیکھا بھی تھا کہ اس طرح کے شہ پارے تخلیق کر کے صادقین محفلوں میں اپنے چاہنے اور نہ چاہنے والوں میں مفت بانٹتا تھا۔

بے وطنی کے مرض میں مبتلا رفی کو بھی پاکستان سے اپنا بھولا ہوا تعلق اچانک بہت اچھا لگنے لگا۔

"علی آپ کو پتا ہے کہ میرا باپ بھی پاکستانی تھا۔ میری ماں انگریز تھی لیکن میرا نام بالکل پاکستانی ہے اور بحرین کے بازار میں میری اردو بہت مقبول ہے۔" رفی نے مسکراتے ہوئے شیخ علی کو بتایا۔

"میرا خیال ہے آج آرٹ بہت ہو گیا۔ آیئے اگر چاندنی دیکھنے کا شوق ہو تو باہر ٹیرس پر بیٹھتے ہیں۔ چاندنی اور سمندر کا اس سے اچھا امتزاج آپ کو اور کہیں سے

نظر نہیں آئے گا۔" شیخ علی نے ٹیرس کی طرف ان کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔

فلپائنی ساقی ان کے لئے نئے جام بنا کر پیچھے پیچھے آئی تھی۔ ٹیرس کیا تھا خلاء میں لٹکا ہوا ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ چاروں طرف بیلیں پھیلی اور پھولوں کے گملے سجے تھے۔ رات کی رانی، موتیا اور گلاب کی ملی جلی مہک مسحور کن تھی۔ موسیقی بھی بدل گئی تھی اور اب ہری بیلوں کے پیچھے چھپے اسپیکروں سے روی شنکر کے بجائے ہوئے ستار کی دھن بکھر رہی تھی۔ چاندنی کا نظارہ دلفریب تھا۔ چاند پگھل کر سمندر پر بکھر گیا تھا۔ شمال مغرب کی طرف بیچ پانی میں بنے ہوئے اس پل کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں جو بحرین کو سعودی عرب سے ملاتا تھا۔ شیخ علی نے دور افق پر جلتی ہوئی روشنیوں کے بارے میں بتایا کہ وہ سعودی عرب کے شہر الخبر کی ہیں۔ دائیں جانب ساحل پر دور چھوٹی چھوٹی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھ کر چنائے کو خیال گزرا کہ وہ احمد کا ساحلی قہوہ خانہ ہے کیونکہ اسی طرف سے ایک جہاز بھی اڑتا نظر آیا تھا۔ اس نے رفی کو اشارے سے دکھایا اور شیخ کو بتانے لگا۔

"کل کی تقریباً" آدھی رات میں نے رفی کی میزبانی میں اس ساحل پر چاندنی میں نہا کر گزاری۔ آپ کو رفی کے چہرے پر جو چاند چمکتے نظر آ رہے ہیں وہ اسی چاندنی رات کا عطیہ ہیں۔" رفی کے چہرے پر شرماہٹ دوڑ گئی۔ "اور وہ دور ساحل پر جو روشنی نظر آ رہی ہے وہ رفی کے پسندیدہ احمد کے قہوہ خانے کی ہے جہاں کل رفی نے مجھے حقہ پینا سکھایا۔" رفی کی شرماہٹ میں اب جھینپی جھینپی سی ہنسی بھی شامل ہو گئی تھی۔ "کل رات چاندنی رات میں ٹہلنے اور پھر حقہ گڑگڑا کر جہازوں کو چڑھتا اترتا دیکھنے میں واقعی بہت مزا آیا تھا۔ لیکن یہاں سے چاندنی رات اور سمندر کو دیکھنے کا لطف پھولوں کی مہک اور ستار کی دھن نے دوبالا کر دیا ہے۔" چنائے نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"علی، اختر نے آپ کو باقی رات کی کہانی نہیں سنائی۔ اراڈوس میں انہوں نے مجھے آئرش کافی میں الجھا دیا اور خود بیلی ڈانسر میں گم ہو گئے۔ لگتا ہے اس کے عشق میں مبتلا ہیں۔ آج بھی وہیں جانا چاہتے تھے۔ لیکن اس کا شو نہیں تھا، کل یہ واپس جا

رہے ہیں اس لئے سخت اداس ہیں کہ اسے اب دوبارہ نہ دیکھ سکیں گے۔" چنائے ہنسنے لگا۔ علی اور رفی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔

شیخ علی اچانک ان سے معذرت کر کے اٹھا اور دس منٹ بعد واپس آیا تو اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی دبا دبا سا ایسا جوش جیسے کوئی بچہ اپنے بڑوں کو اچانک حیران کر دینے والا ہو۔ واپس آ کر وہ بھی رفی اور چنائے کی گفتگو میں شریک ہو گیا۔ تینوں کافی دیر تک گفتگو میں محو رہے۔ موسیقی' مذہب' ستارہ شناسی سے لے کر ادب اور شاعری سب پر انہوں نے اپنا اپنا زور بیان صرف کیا۔ چنائے نے گھڑی دیکھی' رات کے دس بج چکے تھے' اس کا خیال تھا کہ وہ کسی بہانے جلدی چلا جائے گا۔ اس کا یہ احساس جانے کیوں بڑھ رہا تھا کہ اسے محض اخلاقا" برداشت کیا جا رہا ہے اور شیخ علی کی ساری توجہ رفی کی طرف ہے۔ رفی بھی شیخ علی سے خاصی متاثر نظر آتی تھی۔ چنائے چاہتا تھا کہ وہ بیچ سے نکل جائے تاکہ وہ دونوں آج کی رات کو اپنے منطقی انجام تک پہنچا سکیں۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ کھانا کھانے سے پہلے جانا سخت بدتمیزی اور میزبان کی توہین سمجھی جائے گی۔

ساقی گری کرنے والی لڑکی نے آ کر شیخ علی کے کان میں کچھ کہا' شیخ علی نے مسکرا کر سر ہلایا اور لڑکی کے چلے جانے کے بعد انہیں دعوت دینے لگا۔

"چلیں دیوانیہ میں بیٹھتے ہیں۔ وہاں تمباکو نوشی بھی کر سکیں گے۔ مجھے معلوم ہے رفی یہاں پودوں کے ڈر سے سگریٹ نہیں پی سکی ہیں۔"

شیخ علی کے پیچھے پیچھے دونوں داخل ہوئے تو تھوڑی دیر کے لئے سکتے میں رہ گئے۔ عربی انداز میں سجا ہوا دیوانیہ ڈرائنگ روم سے زیادہ کشادہ تھا۔ بیٹھنے کا فرشی انتظام تھا۔ موٹے دبیز قالین' ایسے کہ پیر دھنس جائیں۔ چاروں طرف نشستیں لگی تھیں جن پر بڑے سلیقے سے آرام دہ تکئے رکھے تھے۔ دیواروں پر ہاتھ کے بنے ہوئے کئی چھوٹے چھوٹے قدیم افغانی قالین لٹکے ہوئے تھے' خطاطی کے کئی نمونے یہاں بھی ٹنگے تھے' ایک طرف چیتے کی ایک ثابت کھال لٹکی ہوئی تھی جس کے دونوں طرف پرانے زمانے کی لمبی نالیوں والے دو پستول لگے تھے جو یقیناً" کسی اینٹیک شاپ سے

لئے گئے ہوں گے اور ان کی ایک طویل تاریخ ہو گی۔ شاید شیخ کے آباؤ اجداد نے کسی جنگ میں استعمال کئے ہوں۔ ستار بجنا بند ہو گیا تھا اور اب اک عربی دھن ماحول میں اپنا جادو جگا رہی تھی۔ لیکن چنائے اور رفی کے سکتے میں آنے کی وجہ دیوانئے کی سجاوٹ نہیں تھی۔ سامنے تین نشستوں کے ساتھ تین حقے رکھے تھے جن پر اپنے دانتوں کی نمائش کرتا ہوا احمد تازہ چلم لگا رہا تھا اور انہیں داخل ہوتا دیکھ کر ایک طرف کھڑی ہوئی اراڈوس والی مصری رقاصہ اپنی مسکراہٹ سے انہیں خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ چنائے ہکا بکا رہ گیا۔ اظہار ممنونیت میں اس نے شیخ علی کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ رفی بھی حیران ہو کر صرف یہی کہہ سکی۔

"آپ نے یہ سب کچھ کیسے کر لیا۔"

"اوہ کچھ نہیں۔" شیخ علی نے انکساری دکھائی۔ اس نے احمد کو پانچ سو دینار دیئے تھے جو وہ مہینے بھر میں کماتا تھا اور رقاصہ کو دو ہزار جو اسے ہوٹل میں پورے ہفتے کی پرفارمنس کے بعد ملتے تھے۔

لڑکی نے ان کے سامنے نئے ڈرنکس لا کر رکھ دیئے۔ احمد چلم تازہ کرنے کے لئے کمرے میں مستعد کھڑا تھا' موسیقی کی تال تیز ہونے لگی جس پر مصری رقاصہ نے اپنے کولہے تھرکانا شروع کر دیئے تھے۔ تینوں شراب کی چسکیاں لے کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے بیلی ڈانس کا کمال دیکھ رہے تھے۔ تقریباً" ایک گھنٹے تک مصری رقاصہ کے فن کا مظاہرہ جاری رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا کمال فن آج کس کے گھر کی رونق ہے اس لئے اس نے اپنا فن دکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی بلائے جانے کی وجہ کون ہے۔ اس نے علی اور رفی دونوں کو شرارتی نظروں سے چنائے کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اسے کل اراڈوس میں بھی دیکھ چکی تھی۔ اس لئے وہ زیادہ تر چنائے کے سامنے ہی اپنا انگ انگ تھرکاتی رہی۔ اور چنائے کا بھی یہ عالم تھا کہ جیسے بیٹھے بیٹھے وہیں اس کے قدموں پر اپنی جان نچھاور کر دے گا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ الف لیلیٰ کی داستان کے کسی حصے کا جیتا جاگتا کردار بن گیا ہو۔

موسیقی ختم ہوئی تو شیخ علی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی رنی اور چنائے بھی کھڑے ہو گئے۔ ایک گھنٹے تک مسلسل رقص کرنے کے بعد رقاصہ کے ماتھے پر پسینے کی نمی چمکتی نظر آ رہی تھی۔ دیوانئے سے باہر آئے تو علی نے کھانے کی میز تک ان کی رہنمائی کی۔ چنائے کی درخواست پر علی نے بیلی ڈانسر کو بھی کھانے میں شرکت کی دعوت دی۔ میز انواع و اقسام کے کھانوں سے بھری تھی جنہیں پیش کرنے پر ایک لبنانی شیف مامور تھا۔ فلپائنی لڑکی بہت مستعدی سے ان کے جام سرخ انگوری شراب سے بھرنے کے ساتھ کھانا لگانے میں شیف کی مدد کر رہی تھی۔ کھانے میں گفتگو کم رہی۔ شاید اس کی وجہ مصری رقاصہ کی موجودگی تھی جو بہت سکڑی ہوئی بیٹھی تھی اور بہت احتیاط سے سنبھل سنبھل کر کھا رہی تھی۔ کھانے کے بعد سب ڈرائنگ روم کی طرف آئے تو سگار سلگاتے ہوئے چنائے نے جانے کی اجازت چاہی۔ اس نے بتایا کہ کل اس کی کئی ملاقاتیں طے ہیں اور پھر شام کو ہانگ کانگ کی لمبی پرواز ہے اس لئے وہ اب جا کر آرام کرے گا۔ شیخ علی نے کہا کہ ڈرائیور اسے اور مصری رقاصہ کو چھوڑ آئے گا۔ رنی سے اس نے درخواست کی تھی کہ وہ کافی میں اس کا ساتھ دینے کے لئے رک جائے۔ رنی کو اس وقت کافی کی شدید خواہش تھی اس لئے اس نے رکنے میں کوئی پس و پیش نہیں کی۔

شیخ علی دونوں کو نیچے چھوڑ کر واپس آیا تو رنی اپنی کافی لے کر ٹیرس میں ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ میز پر علی کی کافی تیار رکھی تھی لیکن اسے ہاتھ لگائے بغیر وہ بھی ٹیرس میں رنی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ چاند اپنا نصف سفر طے کر کے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔ اور سمندر کی موجیں بے چین اور پر زور ہو کر زیادہ شور مچانے لگی تھیں۔ رنی کی نگاہیں سمندر میں دور کسی نامعلوم نقطے پر مرکوز تھیں جبکہ علی کی نظروں کا محور صرف وہی تھی۔ اس نے بڑے غیر محسوس انداز میں اس کے ہاتھ کو تھاما' رنی جیسے کسی خواب سے چونک پڑی' بہت نشیلی سی آنکھوں کو اٹھا کر اس نے شیخ علی کو دیکھا جس کے چہرے پر التجائیں ہی التجائیں تھیں۔ علی کو بھی رنی کی آنکھوں میں سپردگی کے ڈورے تیرتے دکھائی دیئے۔ اس نے رنی کی کمر کے گرد اپنا بازو حائل کیا تو

وہ علی کے سینے میں اس طرح سما گئی جیسے اس پناہ گاہ سے کبھی باہر نہیں نکلے گی۔ رفی کی کمر تھامے اور اسے سینے سے چپکائے بیڈ روم کی طرف لے جاتے ہوئے شیخ علی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سر پر ٹرافی اٹھائے تماشائیوں سے بھرے اسٹیڈیم میں بھاگا چلا جا رہا ہو۔ کمرے میں وائلن پر بہت اداس سی دھن چھڑی ہوئی تھی۔ ساقی گری کرنے والی لڑکی نے پہلی بار موقع کی مناسبت سے غلط موسیقی کا انتخاب کیا تھا۔

صبح جلدی اٹھنے والا چنائے آج گیارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھ سکا تھا۔ کمرے میں مصری رقاصہ کی خوشبو ابھی تک بسی ہوئی تھی۔ رات وہ یہیں اس کے پاس رہی تھی۔ اس نے چنائے کو بتایا تھا کہ وہ اراڈوس میں ہی رہتی ہے اور رات گئے اس وقت جانا وہاں کے عملے میں اس کی شہرت خراب کر سکتا ہے اس لئے وہ باقی رات اس کے کمرے میں گزار کر صبح چلی جائے گی۔ چنائے اعتراض نہ کر سکا تھا۔ ایسی نعمت کو ٹھکرانے کے لئے جواز ڈھونڈنا مشکل تھا۔ تھکی ہوئی رقاصہ چنائے کو جگانے کی کوشش کرتی ہوئی اس سے لپٹ کر سو گئی تھی۔ اور چنائے رات بھر خواب میں اس کا تھرکتا ہوا جسم دیکھتا رہا تھا۔ وہ صبح اٹھی تو چنائے ابھی بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے ہدایت کے مطابق اپنے حصے کا کام پورا کیا تھا اب صبح ہونے پر وہ آزاد تھی اس لئے چنائے کے اٹھنے کا انتظار کئے بغیر چلی گئی۔ چنائے نے بھی اسے غائب دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ کافی کے دو کپ پینے کے بعد اس کی سوچیں واضح ہوئیں تو گزری ہوئی رات کے مناظر بھی صاف نظر آنے لگے۔ اس نے فون اٹھایا تاکہ رفی سے پہلے اسے فون کر کے شکریہ ادا کر سکے۔ لیکن رفی گھر میں نہیں تھی۔ آنسرنگ مشین لگی تھی جس پر پیغام ریکارڈ کرا کے وہ تیار ہونے لگا۔ وہ لنچ کے لئے کمرے سے نکلنے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس کا خیال تھا رفی ہو گی لیکن استقبالیہ کا کلرک تھا جس نے بتایا کہ نیچے لابی میں اس کا ایک مہمان انتظار کر رہا ہے۔ چنائے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا ایسا میزبان کون تھا جس نے اس سے ملنے کے لئے ہوٹل آنے تک کی زحمت کی تھی۔

وہ نیچے اترا تو لابی میں بہت اسمارٹ سے گرے رنگ کے بزنس سوٹ میں ملبوس تیس بتیس سال کی عمر کا ایک اجنبی اس کا منتظر تھا۔ چنائے سے اپنا تعارف کراتے ہوئے اس نے ہاتھ ملایا۔

"میرا نام جارج پاپا ڈوس ہے اور میں شیخ علی کا خصوصی نائب ہوں۔ انہوں نے مجھے آپ کے پانی بنانے کے منصوبے پر بات چیت کے لئے بھیجا ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ آنے سے پہلے آپ کو فون نہ کر سکا لیکن شیخ علی نے بتایا تھا کہ آپ کی بین الاقوامی مصروفیات بہت زیادہ ہیں اور آپ کو آج شام ہی ہانگ کانگ روانہ ہونا ہے کسی اہم میٹنگ کے سلسلے میں۔ میں نے سوچا آپ کو دیکھتا چلوں کہ اگر فارغ ہوں تو ساتھ لنچ کریں گے اور پروجیکٹ پر بھی بات کریں گے۔" چنائے کو موقع دیئے بغیر بے تکان بولتے ہوئے اس نے کہا۔ وہ اگر نام نہ بھی بتاتا تو اس کے نقش و نگار اور بالوں کی اخروٹی رنگت سے چنائے نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ یونانی ہے۔ چنائے کو اس کا انداز استہزائیہ لگا۔ یا تو اس کے بات کرنے کا انداز ہی ایسا تھا اور یا پھر کسی وجہ سے اسے چنائے پسند نہیں آیا تھا۔

"نہیں نہیں میں لنچ پر بالکل فارغ ہوں۔ بلکہ لنچ کے لئے اپنے کمرے سے نکل ہی رہا تھا۔ آیئے ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں بزنس لنچ کے لئے بہت موزوں جگہ ہے۔ زیادہ رش بھی نہیں ہوتا ہم آرام سے گفتگو کر سکیں گے۔" چنائے نے ہوٹل کے بہت آرام دہ سے نیم تاریک ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں چنائے صاحب لنچ پر آپ میرے مہمان ہیں۔ لیکن یہاں نہیں کہیں اور چلیں گے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کے کھانے مجھے سخت ناپسند ہیں۔ آپ اتنا سفر کرتے ہیں مجھے یقین ہے آپ بھی ان کھانوں کی یکسانیت سے بور ہو گئے ہوں۔ ان ہوٹلوں میں سروس ہی سروس ہوتی ہے کھانا نہیں ہوتا۔ مجھے ان کے کھانوں میں جانے کیوں پلاسٹک کی بو آتی ہے۔ مجھے تو مصالحے دار انڈین کری پسند ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپ کو معظم الفردوس لے کر چلتا ہوں۔ پاکستانی ریسٹورنٹ ہے لیکن غیر پاکستانیوں میں زیادہ مقبول ہے۔" جارج نے ایک بار پھر تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔

چنائے کو اچانک ہی پاکستانی کھانے کی خواہش ہونے لگی۔ کراچی سے نکلے ہوئے اسے دس روز ہو گئے تھے۔ حالانکہ ایک دوست نے دوبئی کے دہلی ریسٹورنٹ میں نہاری کھانے کی پرزور سفارش کی تھی اور بتایا تھا کہ شاید واحد ریسٹورنٹ ہے جس کے آلو گوشت اور قورمے کے درمیان صرف آلوؤں کا ہی نہیں مزے کا بھی فرق ہوتا ہے لیکن چنائے جس طرح کے بین الاقوامی ہجوم میں گردش کرتا تھا اس میں رہ کر وہ نہاری کیا پاکستانی ہونا بھی بھول جاتا تھا۔ چنائے نے اثبات میں سر ہلایا اور جارج کے ساتھ قدم ملانے لگا جو اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی ہوٹل کے خارجی دروازے کی طرف چل دیا تھا۔ جارج کی سرخ رنگ کی پورش کار نے انہیں تین منٹ میں الفردوس پہنچا دیا۔ چنائے نے سوچا جارج کو تیز تیز بولنے کا ہی نہیں تیز گاڑیوں کا بھی شوق ہے۔ فردوس ایک بہت ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا ریسٹورنٹ ثابت ہوا۔ ہال یورپی یا امریکی گاہکوں سے بھرا ہوا تھا جن کے بارے میں چنائے کا خیال تھا کہ وہ ریسٹورنٹ کے سامنے بنے ہوئے شیرٹن اور ہلٹن میں ٹھہرنے والے سیلز مین ہوں گے۔ جارج چنائے کو لے کر اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"آرڈر آپ دیجئے گا۔ آپ خود پاکستانی ہیں اور آپ کے ساتھ میں پسندوں کے نام پر کوفتے کھا کر بیوقوف نہیں بن سکوں گا۔ لیکن اگلی دفعہ آپ جب ملیں گے تو آپ کو یونانی کھانا کھلواؤں گا۔ مجھے اپنے روایتی شیش کباب بہت پسند ہیں۔ آپ نے کبھی ٹرائی کئے ہیں مسٹر چنائے۔" کھڑکی کے پاس چار آدمیوں کے لئے سجی ایک میز پر چنائے کے سامنے بیٹھتے ہوئے جارج نے کہا۔

"نو مور مسٹر چنائے۔ کال می اختر۔" چنائے نے اپنا روایتی جملہ دہراتے ہوئے کہا۔ "مجھے شیش کباب پسند ہیں لیکن شیش کباب یونان کے نہیں ترکی کی روایت ہیں اور وہاں سے یونان پہنچے تھے۔" چنائے نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا۔

"اوہ میں بھول گیا تھا کہ آپ پاکستان والے ترکی کے بہت جذباتی حامیوں میں سے ہیں۔ لیکن میں آپ سے شیش کباب کی جائے پیدائش پر قبرص کی جنگ نہیں چھیڑوں گا۔" جارج نے ہنستے ہوئے کہا۔ چنائے بھی ہنسنے لگا۔ بیرے کو آرڈر چنائے نے

ہی دیا تھا۔ اس ہوٹل میں بار نہیں تھا اس لئے پینے کے لئے چنائے نے نمکین لسی اور جارج نے فریش لائم آرڈر کیا تھا۔ بیرے کے جاتے ہی جارج بہت سنجیدگی کے ساتھ چنائے کی طرف متوجہ ہوا۔

"کھانا آنے میں کم از کم بیس منٹ لیں گے' میرا خیال ہے ہم کام کی باتیں بھی شروع کر دیں۔" اس نے اپنے بریف کیس سے وہ فائل نکالتے ہوئے کہا جو رات چنائے نے شیخ علی کو دی تھی۔ اس نے فائل کھولی تو ہر صفحے پر حاشیوں میں لال رنگ سے نوٹنگ کی گئی تھی۔

"شیخ علی نے صبح مجھے یہ فائل دی تھی۔ میں نے اسٹڈی کی ہے اور متعلقہ شعبوں سے مشورہ بھی کیا ہے۔ ہمیں چند باتوں کی وضاحت درکار ہے۔ سب سے پہلے تو آپ نے بحرین پہنچنے تک کی مدت میں برف کے تودوں کے پگھلنے کی جو اوسط بتائی ہے وہ سمندروں میں برف پگھلنے کی اوسط کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے۔ مختلف سمندروں کے سرد اور گرم کرنٹ میں برف پگھلنے کی رفتار میں جو فرق ہو گا آپ کی رپورٹ میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ہے۔ مثلاً" اٹلانٹک میں درجہ حرارت انڈین اوشن کے مقابلے میں کم ہو گا جبکہ آپ کے برف کے تودے گرم کرنٹ والے انڈین اوشن کا طویل سفر کر کے بحر عرب اور پھر خلیج میں داخل ہوں گے۔ اس عرصے میں برف کے پگھلنے کی رفتار بہت تیز ہو گی۔ نمبر دو' آپ نے سمندری راستے کا کوئی نقشہ منسلک نہیں کیا ہے اور برف لانے والے راستوں کی تفصیلی وضاحت نہیں کی ہے جس سے درست طور پر یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے کہ برف کا یہ سفر کتنا وقت لے گا۔ آپ نے جس وقت کا اپنی رپورٹ میں تعین کیا ہے وہ اندازے پر مبنی ہے۔ نمبر تین' آپ نے یہ وضاحت نہیں کی کہ تودے کھینچ کر لانے والے جہاز اپنے اندر مال بھی لاد کر لائیں گے یا خالی سفر کریں گے' کیونکہ اگر وہ صرف برف کو کھینچتے ہوئے لائے تو جہاز رانی پر لاگت زیادہ آئے گی لیکن اگر راستے میں آنے والی بندرگاہوں سے وہ مال لادنے میں مصروف رہے تو انہیں منزل پر پہنچنے میں وقت لگے گا۔ آپ نے اس مد میں جو اعداد و شمار دیئے ہیں وہ کم از کم آٹھ دس سال پرانے نرخوں پر مبنی لگتے ہیں۔ نمبر

چار' آپ کے سارے اعداد و شمار برف کے تودوں کے بحرین کی بندرگاہ تک پہنچنے تک محدود ہیں۔ آپ کی رپورٹ میں کہیں تذکرہ نہیں ہے کہ بحرین پہنچ کر برف کے تودے کس طرح اور کہاں لے جائیں گے اور پانی کی فراہمی کس طرح ہو گی یا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ برف پانی بن کر از خود نلکوں میں دوڑنے لگے گا۔ نمبر پانچ آپ کی رپورٹ میں یہ بھی نہیں لکھا کہ بحرین میں اس پانی کی فروخت کس طرح ہو گی۔ یہ سارا کا سارا حکومت کو بیچا جائے گا جو بحرین میں پانی کی فراہمی کی ذمے دار ہے یا باٹلنگ کر کے اس کی ریٹیلنگ کی جائے گی اور نمبر چھ......"

جارج رک گیا کیونکہ بیرا کھانا لے کر آ گیا تھا اور میز پر لگا رہا تھا۔ چنائے کے ماتھے پر جارج کے ہر نکتے کے ساتھ پسینے کی ایک بوند نمودار ہو رہی تھی۔ جارج نے اس رپورٹ کی دھجیاں اڑا دی تھیں جو چنائے کے خیال کے مطابق بہت پیشہ ورانہ انداز میں اور بڑی مہارت سے تیار کی گئی تھی۔ اس نے جس انداز سے رپورٹ کا تیا پانچہ کیا تھا۔ اس سے لگتا تھا کہ مقصد صرف رپورٹ کے پرزے اڑانا نہیں ہے بلکہ چنائے کی اہانت بھی مقصود ہے۔ چنائے ابھی تک یہ اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ ایسا شیخ علی کی ایما پر ہو رہا ہے یا ایک یونانی اس سے قبرص کی ہاری ہوئی جنگ جیتنے کی کوشش میں ہے۔ وہ اس لنچ کا مقصد ابھی تک نہیں سمجھ پایا تھا۔ اگر شیخ علی نے اس کے منصوبے کو نہیں لینا تھا تو اس کا اسپیشل اسسٹنٹ فون پر کوئی تاویل دے کر اس کی اطلاع دے سکتا تھا یا زیر غور ہے کی لالی پاپ دے کر ٹہلا سکتا تھا۔ خود آ کر لنچ کھلا کر اسے اتنی تفصیل سے کیا ہوا اس رپورٹ کا تجزیہ سنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ چنائے کا خیال تھا کہ رات اس نے ایسی کوئی بات بھی نہیں کی جو شیخ علی کو ناراض کرنے کا سبب بنتی۔ رات بڑے خوشگوار انداز میں ختم ہوئی تھی۔ بلکہ شیخ نے اسے رات بھر کے لئے ایک حسین رقاصہ بھی بخش دی تھی۔ تو کیا رنی کی وجہ سے..... کیا رنی رات شیخ کو ٹھکرا کر چلی گئی جس کا بدلہ شیخ اپنے ایک نائب کے ذریعے اس سے لے رہا ہے۔ چنائے ابھی خاموش رہ کر جارج کو بات مکمل کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ بیرا کھانا میز پر لگا کر جا چکا تھا۔ جارج نے کھانا شروع ہونے سے پہلے آخری میزائل

پھینکا جو پہلے سے زیادہ زوردار تھا۔

"نمبر چھ یہ کہ تقریباً" نو دس سال پہلے انگلینڈ کی ایک کمپنی نے سعودی عرب میں بالکل ایسے ہی منصوبے میں ایک سعودی تاجر سے کئی ملین ڈالر کی سرمایہ کاری حاصل کی تھی لیکن پہلے شپمنٹ کے بعد ہی یہ منصوبہ ناکام اور برطانوی کمپنی اور سعودی سرمایہ غائب ہو گیا تھا۔ ایک جہاز برف کا جو تودہ لے کر چلا تھا وہ سعودی عرب پہنچتے پہنچتے برف کی ایک چھوٹی سی ڈلی بن کر رہ گیا تھا جس سے پانی کا ایک مٹکا بھرنا بھی مشکل تھا۔ اگر آپ کے علم میں ہے تو آپ کی رپورٹ میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ ہمیں یہ وضاحت چاہئے تھی کہ آپ کے منصوبے میں وہ کیا نئی بات ہے جو اس دفعہ تجربہ کامیاب ہو سکے گا۔"

چنائے کی پوری پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ اس نے لندن کی اس دھوکہ باز فرم کو دل میں کئی گالیاں دیں جس نے ناکام ہو جانے والے منصوبے کی وہ رپورٹ جو کوئی ردی میں بھی نہیں خریدتا اسے پانچ ہزار ڈالر میں بیچ دی تھی اور اس کے لئے سخت ہزیمت کا سامان کیا تھا۔ چنائے کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن جارج نے اس کا ارادہ بھانپ کر بولنے سے روک دیا۔

"پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا۔ بزنس کی باتیں اب کھانے کے بعد کریں گے۔ شیخ علی کہتے ہیں کہ کھانے کے دوران بزنس کی گفتگو سے ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔"

چنائے مسکرایا لیکن یہ مسکراہٹ بہت پھیکی سی تھی۔ اس نے روٹی کا پہلا نوالہ توڑا اور کھانا شروع کیا۔ بھوک مرچکی تھی لیکن تندور سے نکلے ہوئے گرم گرم نان اس کی کمزوری تھے جس کی مدد سے وہ کچھ نہ کچھ پیٹ میں اتارنے میں کامیاب ہوا۔ جارج تو کھانے پر اس طرح ٹوٹا تھا جیسے کئی وقتوں کا بھوکا ہو۔ وہ بے حد خوش نظر آتا تھا۔ میٹھے میں انہوں نے رس ملائی منگوائی تھی۔

"شیخ علی اس وقت کہاں ہوں گے۔" چنائے نے میٹھا ختم کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ آپ کی دوست رنی کے ساتھ ایک یاٹ پر مدعو ہیں اور بیچ سمندر میں تازہ شکار کی ہوئی مچھلی اور جھینگے تل کر کھا رہے ہوں گے۔ ان کی یاٹ شام تک

کنارے نہیں لگے گی اس لئے ان سے رابطہ ممکن نہیں ہے۔ آپ کی روانگی آج شام کو ہے اور شیخ علی اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے پرسوں سوئٹزر لینڈ جا رہے ہیں۔ ایک مہینے بعد واپس آئیں گے لیکن آپ کے اس منصوبے کے بارے میں انہوں نے احکامات اور اختیارات مجھے دے دیئے ہیں۔" جارج نے بریف کیس میں کاغذ تلاش کرتے ہوئے کہا اور مسکراتی نظروں سے چنائے کی طرف دیکھا۔

"رنی میری نہیں شیخ علی کی دوست ہیں۔ میری تو ان سے یہیں پرسوں بحرین میں ملاقات ہوئی تھی۔" چنائے نے تیز نظروں سے جارج کو گھورتے ہوئے کہا۔ جارج کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ شاید زیادہ بول گیا تھا۔ چنائے کو اب اندازہ ہو چلا تھا کہ جارج اس کے ساتھ کوئی اپنا ہی کھیل کھیل رہا ہے۔ شیخ علی کا اب تک ہونے والی گفتگو سے کوئی تعلق نہ ہو گا وہ تو رنی کے ساتھ ایک بہت اچھی رات گزارنے کے بعد اب اپنے دن کو رات بنا رہا ہو گا۔

"اس کاغذ پر وہ سارے نکات درج ہیں جو ابھی میں نے آپ کو تفصیل سے بتائے ہیں اور جن کی ہمیں وضاحتیں درکار ہیں۔" جارج نے چنائے کی طرف ٹائپ کیا ہوا ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا۔ چنائے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اس کا دماغ صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ ہماری کمپنی اور آپ کی کمپنی کے درمیان معاہدے کا ڈرافٹ ہے۔" جارج نے ٹائپ کیا ہوا ایک اور کاغذ چنائے کو دیتے ہوئے کہا۔ وہ چنائے کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔ "اس معاہدے کے تحت آپ آئندہ چار ہفتوں کے دوران ہمیں منصوبے کے قابل عمل ہونے کی ایک ضمنی رپورٹ دیں گے جس میں وہ ساری وضاحتیں ہوں گی جو میں نے بیان کی ہیں اور جس کے بعد ہم اس پر غور کر کے فیصلہ کریں گے کہ اس منصوبے کے لئے ہم سرمایہ کاری کریں گے یا نہیں۔" جارج نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا ہو رہے تھے جیسے وہ ایک کڑوا گھونٹ نگلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے اپنے کوٹ کی سینے والی دائیں جیب سے ایک لفافہ نکال کر چنائے کو دیتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔ "یہ ایک

لاکھ ڈالر کا چیک ہے جو ہم اس معاہدے کے تحت آپ کو ایڈوانس کر رہے ہیں۔ اگر آپ کی دوسری رپورٹ کے بعد ہم نے اس منصوبے پر سرمایہ کاری نہ کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ ایک لاکھ ڈالر ہم آپ سے واپس لینے کے مجاز نہیں ہوں گے۔ لیکن اگر یہ منصوبہ خرید لیا تو اس کی جو قیمت طے ہو گی اس میں سے ایک لاکھ ڈالر کاٹ لئے جائیں گے۔"

چنائے نے لفافے سے چیک نکال کر دیکھا۔ اس کی بھوک اچانک ہی کھل گئی تھی۔ چنائے نے چیک دیکھے بغیر سامنے میز پر رکھ دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ شیخ نے اپنے اس بہت ہوشیار بننے والے نائب کو ایک لاکھ ڈالر دینے کیلئے کہا ہو گا۔ منصوبے کو نہ تو اس نے پڑھا ہو گا اور نہ رفی کے ساتھ گزری ہوئی رات کے خمار میں مبتلا شیخ کے پاس اتنا وقت رہا ہو گا کہ وہ جارج سے اس موضوع پر کوئی تفصیلی بات کر سکے۔ اسے اس منصوبے میں کوئی دلچسپی نہیں ہو گی۔ اس کی سطح کے شخص کو اس میں دلچسپی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ ایک لاکھ ڈالر تو وہ رفی کے نام پر دے رہا تھا۔ لیکن یہ ایک لاکھ ڈالر شیخ کے اس وفادار نائب کو اپنی جیب سے جاتے ہوئے محسوس ہوئے ہوں گے۔ یہ ایک لاکھ ڈالر وہ دینے پر مجبور تھا لیکن اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا ثبوت دے کر، چنائے کو یہ احساس دلا کر کہ وہ شیخ کو ٹھگنے کی جعلسازی سے پوری طرح باخبر ہے۔

چنائے کا تجزیہ غلط نہیں تھا۔ منصوبے میں شیخ علی کو کوئی دلچسپی نہیں تھی اس نے ایک لاکھ ڈالر میں رفی کی شکل میں ایک چیمپینز ٹرانی خریدی تھی۔ ایک ناممکن الحصول لڑکی کو جیتا تھا۔ اس کے دوستوں اور ان سارے شیخوں میں اس کے اس کارنامے کی شہرت ہو گی۔ ایک لاکھ ڈالر میں یہ سودا بہت سستا تھا۔ وہ اس کے لئے اور زیادہ بھی خرچ کر سکتا تھا اور اس نے اس کی کوشش بھی کی تھی۔ اس نے صبح رفی کو بڑے سے جگمگاتے ہوئے ہیرے کی ایک انگوٹھی دی تھی۔ یہ انگوٹھی اس نے چھٹی کے دن جیولر کی دکان کو خاص طور پر کھلوا کر منگوائی تھی۔ رفی نے مسکرا کر وہ انگوٹھی اسے واپس کر دی تھی اور کہا تھا۔

"اگر یہ رات گزارنے کی قیمت ہے تو بہت کم ہے۔"

"نہیں نہیں۔" شیخ شرمندہ ہو گیا تھا۔ اتنی قیمتی انگوٹھی واپس کرنے والی وہ پہلی لڑکی تھی۔ "یہ ایک دوست کا دیا ہوا تحفہ ہے' تم اسے پہنو گی تو یہ تمہیں میرے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کی یاد دلائے گی۔ پھر تمہاری ان خوبصورت انگلیوں میں کتنا سجے گی۔ ہیرے اپنی قسمت پر فخر کرنے لگیں گے۔" شیخ علی نے اس کا ہاتھ تھام کر شاعری کرتے ہوئے کہا۔

"شیخ علی میں برائے فروخت نہیں ہوں۔ میں نے یہ انگوٹھی لے لی تو گزری ہوئی رات ایک خوبصورت یاد نہیں گناہ بن کر مجھ پر سوار رہے گی۔" رات کا جتنا لطف تمہیں آیا ہے۔ اتنا ہی مزا مجھے بھی ملا ہے۔ ہمارا حساب برابر ہے۔" رفی نے بہت سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

شیخ کچھ نہیں کہہ سکا تھا بس انگوٹھی کو سائڈ ٹیبل پر پھینک کر اس نے رفی کو اپنی بانہوں میں کھینچ لیا تھا۔

"تم ایک دوست کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہو گی۔ زندگی میں کبھی بھی اور کہیں بھی تمہیں میری ضرورت پڑے۔ میں تمہیں تیار ملوں گا۔" شیخ نے پورے خلوص کے ساتھ رفی سے کہا تھا۔ اس کے بعد اس نے چنائے کے منصوبے کے لئے ایک لاکھ ڈالر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنائے کو رفی لے کر آئی تھی وہ چاہتی تھی کہ شیخ چنائے کی مدد کرے۔ اور اب شیخ اس کی ان کہی سفارش کو بھی ٹال نہیں سکتا تھا۔ کئی لاکھ کی انگوٹھی کے بدلے ایک لاکھ کا منصوبہ برا سودا نہیں تھا۔ آج کا دن بھی اس نے رفی کے نام کر دیا تھا۔ اس کے بعد اسے یا رفی کو جانے کب وقت ملتا۔ کل سے اس کی طویل مصروفیات شروع ہو رہی تھیں اس لئے دفتر جانے کے بجائے دفتر اس نے گھر بلوا لیا تھا۔ جارج کو اس نے اہم معاملات پر ہدایات دی تھیں اور چنائے والی فائل اسے تھما کر اس بارے میں بھی احکامات دیئے تھے۔ جارج نے فائل کھول کر ایک نظر دیکھی اور شیخ علی سے اس بارے میں کچھ کہنا چاہا تھا لیکن شیخ علی نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا تھا۔ جارج یہ اشارہ سمجھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ برف سے پانی بنانے کے اس منصوبے کے بارے میں جارج ہی

نہیں بہت سے لوگ واقف تھے۔ یہ منصوبہ ماضی میں نئی نئی دولت حاصل کرنے والے شیخوں کو بیوقوف بنا کر پیسہ ٹھگنے کے واقعات میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا۔ جارج کو معلوم تھا کہ ایک لاکھ ڈالر چنائے کے پاس جانے سے نہیں روک سکتا لیکن وہ دودھ میں مینگنیاں ڈال سکتا تھا۔ چنائے کا قد کاٹ کر چھوٹا کر سکتا تھا۔ وہ اپنی کارکردگی سے بہت خوش تھا اور میٹھے کی پلیٹیں اٹھانے والے بیرے کو کافی لانے کا آرڈر کر رہا تھا۔ چنائے نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

کافی میں اپنے ہوٹل جا کر پیوں گا۔ میں ایک خاص بلینڈ کی کافی پیتا ہوں۔ وہ یہاں نہیں ہو گی۔ پھر آدھے گھنٹے میں میری ایک اہم ملاقات ہے اس لئے میں چلوں گا۔ آپ شیخ علی کا میری طرف سے شکریہ ادا کیجئے گا اور یہ چیک انہیں واپس کر دیجئے گا۔ میں اس طرح بزنس نہیں کرتا۔ شیخ علی سے میں ہانگ کانگ پہنچ کر فون پر بات بھی کر لوں گا۔" چنائے نے چیک والا لفافہ جارج کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"لیکن لیکن.... یہ ایگری منٹ ہے میرا خیال تھا...." بڑی روانی اور تیزی سے بولنے والا جارج اچانک ہی اپنا توازن کھو کر اٹکنے لگا۔

"آپ کا خیال کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں یکطرفہ طور پر تیار کئے گئے معاہدوں پر دستخط نہیں کرتا۔ مجھے اگر معاہدے پر دستخط کرنے ہوئے تو شیخ علی کے ساتھ کروں گا۔ یا اپنے میری ٹائم منیجر کو بھجوا دوں گا جو اس سیکشن کو ڈیل کرتا ہے وہ آپ کے ساتھ تفصیلات طے کرے گا۔ چنائے نے معاہدے کا ڈرافٹ جارج کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

پسینے کے قطرے اب جارج کے ماتھے پر چمکنے لگے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جب ایک لاکھ ڈالر کا چیک دیکھے گا تو اٹھا کر چلتا بنے گا۔ لیکن یہ پاکستانی تو مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ جارج یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ چنائے چیک نہیں لے گا۔ وہ اس خیال کی دہشت سے لرز گیا کہ چنائے نے اس ملاقات کی کہانی شیخ علی کو بتائی تو کیا ہو گا۔ شیخ علی اپنی ہدایات پر عمل نہ کرنے والوں کے ساتھ بہت بے رحمی سے پیش آتا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری بات بری لگی۔ یہ ایک ابتدائی معاہدہ ہے جس کا سادہ سا مسودہ میں نے تیار کرایا تھا تاکہ وقت بچ سکے۔ مجھے شیخ علی نے بتایا تھا کہ آپ شام ہی کو واپس جا رہے ہیں۔ پھر بھی اگر آپ کو کوئی اعتراض ہے تو میں اسے دوبارہ بنوا کر آپ کے ہوٹل لے آتا ہوں۔" جارج نے پیشکش کی۔

"مسٹر پاپا ڈوس مجھے نہیں معلوم آپ کے اس علاقے میں کام کرنے کے کیا طریقے ہیں لیکن میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں اس طرح بزنس نہیں کرتا۔ میں شیخ علی کی ذاتی طور پر عزت کرتا ہوں آپ کو انہوں نے بھیجا تھا اس لئے میں آپ کے ساتھ لنچ کر رہا ہوں اور اسی لئے میں نے آپ کی اتنی باتیں بھی سنی ہیں' لیکن بزنس کے معاملات میں صرف اپنی سطح کے لوگوں کے ساتھ نمٹاتا ہوں۔ میں بزنس کی شرائط طے کرنے کے لئے اپنے کسی ناتجربہ کار نائب کو شیخ علی کے پاس نہیں بھیجوں گا۔ آپ میرے لئے صرف شیخ علی کے میسنجر ہیں۔ انہوں نے آپ کے ذریعے مجھے یہ اعتراضات بھجوائے ہیں' وہ کاغذ میں نے رکھ لیا ہے۔ اس کا جواب میں انہیں کل ہانگ کانگ سے فیکس کر دوں گا۔ آپ کے لنچ کا بہت شکریہ۔ آپ کبھی نیویارک آئیں تو میرے دفتر فون کیجئے گا۔ اگر میں وہاں ہوا تو آپ میری پسند کے یونانی ریسٹورنٹ کا کھانا کھائیے گا مجھے یقین ہے ایسا کھانا آپ کو یونان کے کسی ریسٹورنٹ میں بھی نہیں ملے گا۔ میرے اس کارڈ پر میرے نیویارک آفس کا نمبر بھی ہے۔" چنائے جارج کو اپنا کارڈ دیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

جارج کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ وہ چنائے کا قد کاٹنے آیا تھا لیکن وہ تو خود اسے بالشتیا بنا کر دیو قامت پہلوان کی طرح اکھاڑے سے باہر جا رہا تھا۔ جارج کو اپنی نوکری خطرے میں نظر آنے لگی۔ لیکن اپنی بیوقوفی پر پچھتاوے کا وقت نکل چکا تھا۔ اس نے اندازوں کی بہت غلطیاں کی تھیں۔ اسے شیخ علی کی ہدایت کے مطابق چنائے کو چیک دے کر چپ چاپ چلا آنا چاہئے تھا۔ لیکن وہ چنائے کو سبق پڑھانے کی کوشش میں مرتبے کا فرق بھول گیا تھا۔ اسے سمجھ لینا چاہئے تھا کہ شیخ علی چنائے سے بزنس نہیں کر رہا کسی وجہ سے اسے اپنے زیر احسان لانا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے بزنس کی

باریکیاں ڈال کر اس پورے معاملے کو خراب کر دیا تھا۔ شیخ علی اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اسے ہر قیمت پر اس بگڑے ہوئے شخص کو منانا تھا۔

"پلیز آپ تھوڑی دیر کے لئے رک جائیں۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ اس معاہدے کو آپ بھول جائیں۔ اس پر آپ کے دستخطوں کی ضرورت نہیں۔ یہ اعتراضات بھی شیخ علی کے نہیں تھے۔ بلکہ ہمارے ماہرین نے رپورٹ پڑھ کر کچھ وضاحتیں چاہی تھیں۔ آپ انہیں بھول جائیں البتہ یہ چیک رکھ سکتے ہیں شیخ علی اپنے چیک کی واپسی کو اچھا نہیں سمجھیں گے۔" جارج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ قبرص کی جنگ وہ ایک بار پھر ہار گیا تھا۔

"مجھے یقین تھا کہ اتنے بچکانہ اعتراضات شیخ علی کے نہیں ہو سکتے۔ آپ نے یہ رپورٹ اپنے اکاؤنٹنٹس کو دکھائی ہو گی۔ وہ صرف دو اور دو چار کی دنیا میں رہنے والے تنگ نظر لوگ ہوتے ہیں انہیں دنیا کی وسعتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ نہ وہ کسی خصوصی شعبے کے بارے میں کوئی مہارت رکھتے ہیں۔ چنائے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے جارج سے مخاطب ہوا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے کچھ سوچا اور پھر چند لمحے ٹھہر کر دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ کر جارج سے مخاطب ہوا۔"

"اور آپ کے اعتراضات" چنائے نے وضاحتوں والا کاغذ جارج کے سامنے پھینکا۔ "آپ یا آپ کے ماہرین سمجھتے ہیں کہ میری انتہائی پروفیشنل رپورٹ میں جھول تلاش کر کے وہ بہت دور کی کوڑی لائے ہیں۔ یہ وضاحتیں وہ لوگ مانگ سکتے ہیں جنہیں جہاز رانی اور اس طرح کے بزنس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ آپ کا پہلا اعتراض ٹھنڈے اور گرم سمندروں کے بارے میں ہے۔ چھٹی جماعت میں جغرافیہ پڑھنے والا بھی موسموں کے سرد اور گرم کرنٹ کے بارے میں جانتا ہے۔ رپورٹ میں جو اوسط دیئے گئے ہیں وہ رستے میں پڑنے والے تمام پانیوں کے مختلف ٹمپریچرز کا ہی اوسط ہیں۔ آپ کے ماہرین کو جہازوں کی گزرگاہ کا تفصیلی روٹ چاہئے۔ جہاز ان کھلے پانیوں میں سفر کرتے ہیں جہاں سڑکیں اور چوراہے نہیں ہوتے جہاز راں جن راستوں پر چلتے ہیں ان کے نقشے سمجھنے کے لئے آپ کے ماہرین کو کئی سال کی ٹریننگ درکار ہو گی۔ یہ جہاز

جن سمندروں اور بندرگاہوں سے ہو کر گزریں گے ان کے نام اس رپورٹ میں موجود ہیں۔ آپ نے وضاحت چاہی ہے کہ جہاز ان بندرگاہوں سے مال بھی اٹھائیں گے۔ آپ کے ماہرین نے شاید ٹگ بوٹس کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔ نہ انہوں نے رپورٹ غور سے پڑھی ہے جس میں ان بوٹس کی ساخت ان کے انجنوں کی طاقت اور رفتار سب کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ آپ کا اعتراض ہے کہ بحرین آکر برف پانی بنے گا اور کیسے بکے گا۔ تو ر-ٹیلنگ ہمارا کام نہیں ہے اس بحرینی کمپنی کا کام ہے جس سے ہمارا جوائنٹ وینچر ہو گا۔ اسٹوریج اور ر-ٹیلنگ کے لئے جو اسٹرکچر چاہیے وہ صرف مقامی کمپنی کے پاس ہو سکتا ہے اس لئے وہ ہمارا درد سر نہیں ہے۔" چنائے جارج کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

"اور آپ نے سعودی تجربے کی جو بات کی ہے آپ کا خیال ہے کہ ہم نے اس کی اسٹڈی نہیں کی اور ایک پٹا ہوا منصوبہ مارکیٹ میں لاکر بیچنے کی کوشش میں بیوقوف بن رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے اس منصوبے کے پیچھے کس کا ذہن تھا؟ دیوالیہ ہوتی ہوئی ایک چھوٹی سی جہاز راں کمپنی کے مالک کا۔ ان کا مقصد بزنس نہیں ایک شریف بزنس مین کو بیوقوف بنا کر مال لوٹنا تھا۔ اس کمپنی کا ایک ناکارہ جہاز بندرگاہوں کا سامان اٹھاتے ہوئے ایک برف کا تودہ بھی باندھ لایا تھا۔ یہ ایک آدھ ملین ڈالر کما کر بھاگ جانے والے چھوٹے لوگوں کا کام تھا آپ سمجھتے ہیں میں یہ ایک لاکھ ڈالر لے کر بھاگ جانے والا چور ہوں۔" چنائے نے بڑی حقارت سے چیک اٹھا کر میز پر پٹختے ہوئے کہا۔ "اس ایک لاکھ ڈالر میں تو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے میرے دفتروں کا ایک مہینے کا خرچ بھی نہیں چلتا۔"

چنائے کے دفتر واقعی ہر جگہ تھے۔ نیویارک' لندن' ہانگ کانگ اور کراچی میں۔ لیکن صرف کراچی میں اس کا ایک باقاعدہ دفتر تھا۔ بڑی خوبصورتی سے سجا ہوا جہاں ایک خوش شکل سیکریٹری اور ایک اکاؤنٹنٹ بھی بیٹھتا تھا' لیکن باقی جگہ دفتر صرف پتوں کی حد تک تھے۔ مرعوب کرنے والے یہ پتے' فون اور فیکس نمبر سمیت پچیس پچاس ڈالر ہفتے پر مل جاتے تھے۔ ایک ایک پتہ سینکڑوں بین الاقوامی کمپنیاں

استعمال کرتی تھیں۔ اسے برف لانے کے سعودی تجربے کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن اسے اندازہ تھا کہ جارج بھی تفصیل نہیں جانتا ہو گا۔ اس کا بلف کام کر رہا تھا۔

جارج سخت مرعوب ہو چکا تھا۔ اسے برف ڈھونے کا منصوبہ سچ مچ قابل عمل لگنے لگا۔ چنائے اب اسے ایک پاکستانی نہیں بین الاقوامی شخصیت نظر آنے لگا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کا بحرین چھوڑنے کا ارادہ ہوا تو وہ کوشش کرے گا کہ چنائے اسے اپنے نیویارک کے دفتر میں کوئی جگہ دے دے۔

"سر آپ یہ چیک لینے سے انکار نہ کریں۔ شیخ علی سے آپ کو بزنس کرنا ہے' چیک واپس ہوا تو وہ اسے توہین سمجھیں گے۔ آیئے آپ کو میں ہوٹل چھوڑ دوں آپ کو اپنی میٹنگ کے لئے دیر ہو رہی ہو گی۔" جارج نے بہت سعادت مندانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں آپ جائیں۔ میرے پاس ابھی پندرہ منٹ ہیں' میں پیدل چلنا پسند کروں گا' صرف دس منٹ کا راستہ ہے' میں باب البحرین سے ہو کر جاؤں گا وہ مجھے قدیم زمانوں کی یاد دلاتا ہے۔" چنائے نے چیک لینے کے بارے میں کچھ کہے یا اسے ہاتھ لگائے بغیر کہا۔

"ٹھیک ہے سر' میں چلتا ہوں مجھے شیخ علی تلاش کر رہے ہوں گے امید ہے کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہو گا۔" جارج نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"Not to worry" چنائے نے بیٹھے بیٹھے شان بے نیازی سے اپنا ہاتھ جارج کی طرف بڑھا دیا۔ ہاتھ ملا کر وہ بہت تیزی میں وہاں سے نکلا اسے ڈر تھا کہ چنائے کہیں چیک واپس کرنے اس کے پیچھے نہ دوڑا آئے۔ چنائے نے مسکرا کر چیک اپنی جیب میں رکھا' معاہدے اور وضاحتوں والے کاغذ پھاڑ کر میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں ڈالے اور بیرے کو بلا کر کافی کا آرڈر دینے لگا۔

رنی شام چھ بجے سے پہلے اپنے فلیٹ میں واپس نہ آ سکی تھی۔ یاٹ سے وہ

اور شیخ علی پینٹ ہاؤس واپس آئے تھے انہوں نے دو گھنٹے آرام کے بہانے پھر بیڈ روم میں گزارے تھے جس کے بعد رنی کو جانا تھا کیونکہ دوسرے دن صبح ہی صبح اس کی فلائٹ تھی۔ شیخ کو بھی اب اپنی حویلی میں واپس پہنچنا تھا۔ شیخ کی بیوی اس کی مصروفیات سے واقف تھی اور ان کی عادی ہو گئی تھی لیکن شیخ اپنی گھر اور باہر کی مصروفیات کے درمیان توازن خراب کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اس کی بیوی بھی اب یہ جان گئی تھی کہ حسن پرست شیخ کسی عارضی تعلق کو زندگی بھر کا ساتھ کبھی نہیں بنائے گا۔ وہ مطمئن تھی کہ اس کے بچوں کے نئے شراکت دار پیدا نہیں ہوں گے۔

رنی کی آنسرنگ مشین پر چنائے کے دو تین پیغامات ریکارڈ تھے۔ وہ رنی سے فوری اور ضروری رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ رنی چنائے کے منصوبے کے بارے میں بالکل بھول گئی تھی ورنہ وہ شیخ علی سے ضرور پوچھتی۔ شاید چنائے چاہتا ہو گا کہ وہ شیخ علی سے اس کی ایک بار پھر سفارش کر دے۔ رنی نے چنائے کو فون کرنا ہی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ چنائے آج رات واپس جا رہا ہے وہ اسے خدا حافظ کہنا چاہتی تھی۔ چنائے نے پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا اور ابتدائی رسمیات کے بعد اس سے فوری ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

"اختر میں سخت تھکی ہوئی ہوں۔ صبح پانچ بجے مجھے لندن کی سخت مشکل فلائٹ پر جانا ہے اس لئے میں تو ایک گرم باتھ لے کر سونے جا رہی ہوں۔ تمہاری فلائٹ کس وقت ہے؟" رنی نے معذرت چاہی۔

"گیارہ بجے' لیکن میں پیک کر چکا ہوں اور فارغ ہوں۔ مجھے صرف تمہارا آدھا گھنٹہ چاہیے ہم یہیں کافی شاپ میں بیٹھیں گے۔ تم سے ملاقات بے حد ضروری ہے۔" چنائے کے لہجے میں اسے دبا دبا سا جوش محسوس ہوا۔

"مسئلہ اگر شیخ علی کا ہے تو اس سے تمہارے منصوبے کے بارے میں پوچھ لوں گی۔ وہ سوئٹزر لینڈ جانے سے پہلے مجھے لندن فون کرے گا۔" رنی نے پیشکش کی۔

"نہیں نہیں شیخ علی کی بات نہیں ہے۔ رنی پلیز۔ صرف آدھا گھنٹہ" چنائے کے اتنے اصرار پر وہ انکار نہ کر سکی لیکن گاڑی چلانے کا موڈ نہیں تھا اس لئے ٹیکسی

سے چنائے کے ہوٹل چلی آئی جو اس کے گھر سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ ویسے بحرین میں کم جگہیں ایسی تھیں جو دس منٹ سے زیادہ کے فاصلے پر واقع تھیں۔ چنائے ہوٹل کے مرکزی دروازے پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں اندر جا کر کافی شاپ کے ایک دور افتادہ اور نیم تاریک کونے میں بیٹھ گئے۔

"دھوپ نے تمہارے سونے پر تانبے کی پرت چڑھا دی ہے۔" چنائے نے رفی کے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ "بہت اچھی لگ رہی ہو۔" رفی صرف مسکرا دی۔

"یہ بتاؤ کہ میری تھکن بڑھانے تم نے مجھے میرے بستر سے کیوں کھینچا ہے۔" رفی واقعی تھکی ہوئی تھی۔

"اس لئے۔" چنائے نے اس کی طرف ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ رفی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ لفافے میں ۴۵ ہزار ڈالر کا ایک چیک تھا جو رفی کے نام تھا۔ رفی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سوالیہ نشان بنی چنائے کو دیکھ رہی تھی۔

"میرا پانی بنانے کا منصوبہ شیخ علی نے ایک لاکھ ڈالر میں خریدا ہے۔ آج میں دن بھر ان لوگوں کو اس پروجیکٹ کی جزئیات سمجھاتا رہا ہوں۔ اس منصوبے پر میرے دس ہزار ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ پانچ ہزار ڈالر آمد و رفت کا خرچ اور پانچ ہزار اس رپورٹ کی تیاری پر۔ نوے ہزار کے منافع میں تم میری برابر کی شریک ہو۔ اس سودے میں تم میری پارٹنر تھیں اور اپنے پارٹنر سے میں ایک پیسے کی بھی بے ایمانی کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔ یہ ۴۵ ہزار ڈالر تمہارے ہیں۔ تم خرچ کئے ہوئے دس ہزار ڈالر کا حساب جب چاہے لے سکتی ہو۔" بات ختم کر کے چنائے نے آرڈر لینے کے لئے آنے والے بیرے کو کافی لانے کے لئے کہا۔

"اختر Please don't confuse me تم صرف پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ میرا حساب کتاب سے تمہارے بزنس کا کیا تعلق ہے۔ میں تمہاری پارٹنر کب اور کیسے بن گئی۔ مجھے خوشی ہے کہ شیخ علی نے تمہارا منصوبہ خرید لیا' لیکن اس سے مجھے کیا لینا۔" رفی سانس لئے بغیر بولے چلی گئی۔

"صرف تمہیں کو لینا ہے۔ یہ منصوبہ صرف تمہاری وجہ سے بکا ہے۔ میں...."
"میں نے تو علی سے صرف تمہارا تعارف کرایا تھا۔" رنی نے چنائے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ سمجھو یہ اسی تعارف کا منافع ہے۔ بزنس میں اپنا تعارف' رابطہ' یہی کلیدی چیزیں ہیں۔ صحیح آدمی کا صحیح آدمی سے تعارف۔ صحیح قسم کا رابطہ ان کے بغیر بزنس ایک انچ آگے نہیں کھسکتا۔ خاص طور پر میری طرح کا بزنس۔ تمہیں پتہ ہے میں ایک مہینے سے اس منصوبے کو بیچنے کی کوشش میں تھا۔ دوستوں نے رابطے بھی دیئے تھے' تعارف بھی کرائے تھے۔ لیکن یہ سب کمزور تعارف اور کمزور رابطے تھے۔ اہم بات یہ بھی ہوتی ہے کہ تعارف کون کراتا ہے۔ شیخ علی ایک صحیح رابطہ تھا۔ تعارف تم نے کرایا تھا۔ بارہ گھنٹے کے اندر اندر میرا منصوبہ بک گیا۔ تمہیں پتہ ہے میں آج رات واپس کیوں جا رہا ہوں۔ میری ہانگ کانگ میں کوئی میٹنگ نہیں ہے۔ بلکہ میں ہانگ کانگ جا بھی نہیں رہا۔ میں کراچی جا رہا ہوں۔ یہاں میرے سارے تعارف ناکام ہو گئے تھے۔ میں یہ سمجھ گیا تھا کہ میرا منصوبہ ناکام ہو گیا ہے' یہ اب نہیں بکے گا' میرے لئے اس پر مزید وقت ضائع کرنا بیکار تھا۔ کراچی میں میرے ایک دو معاملے چل رہے ہیں میں اب ان پر وقت لگاتا۔ یہ منصوبہ میرے لئے ردی کا ایک ایسا کاغذ بن گیا تھا جسے کوئی دو پیسے میں بھی نہیں خریدتا۔ تم نے اسے ایک لاکھ ڈالر کا بنا دیا۔ میرے دس ہزار ڈوب گئے تھے۔ تم نے نوے ہزار کا منافع دلوایا۔"

چنائے کی باتوں اور ۴۵ ہزار ڈالر کے سامنے پڑے ہوئے چیک نے مل کر رنی کو خاصا نرم کر دیا تھا۔

"لیکن پھر بھی یہ چیک۔ یہ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ یہ تمہارا بزنس ہے' تمہارا منافع ہے۔ میرا اس میں حصہ بانٹنا کچھ مناسب نہیں لگتا۔" رنی کا احتجاج آہستہ آہستہ کمزور پڑ رہا تھا۔

"چیک تو تمہیں لینا پڑے گا۔ یہ تمہارا ہے اور نہیں لوگی تو میں یہ منصوبہ شیخ علی کو فروخت نہیں کروں گا۔ اس کا چیک اسے واپس بھیج دوں گا اور چپ چاپ

کراچی چلا جاؤں گا۔"
رنی کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے۔ بیرا کافی لے کر آگیا تھا' اس نے کافی بنانی شروع کر دی چنائے نے سلسلہ کلام کا دوبارہ آغاز کیا۔
"لیکن میں نے تمہیں یہ چیک دینے نہیں بلایا تھا۔ چیک تو میں تمہیں ڈاک کے ذریعے بھی بھیج سکتا تھا تمہارے فلیٹ پر چھوڑ کر جا سکتا تھا۔ میں نے تمہیں ایک تجویز دینے کے لئے بلایا ہے۔ بزنس پروپوزل۔ میں چاہتا ہوں تم اپنی نوکری چھوڑ کر میری مستقل بزنس پارٹنر بن جاؤ اور میرے ساتھ کراچی چل کر رہو۔" رنی کے ہاتھ سے کافی کا کپ گرتے گرتے بچا۔ وہ حیران حیران نظروں سے چنائے کو دیکھنے لگی۔ اس نے کچھ بولنا چاہا تھا لیکن چنائے نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔
"پہلے میری پوری بات سن لو' پھر تم جو چاہو کہہ لینا۔ مجھے معلوم ہے تم اپنی موجودہ صورتحال سے زیادہ مطمئن نہیں ہو۔ تم نے خود بتایا تھا کہ تمہاری فلائنگ ختم ہونے والی ہے اور تم گراؤنڈ ہوسٹس بن کر نہیں رہنا چاہتیں۔ تم صحیح سوچتی ہو۔ یہ ملازمت ان لڑکیوں کے لئے ہے جو صرف خوبصورت ہیں اور کچھ نہیں۔ میں نے عورتوں میں خوبصورتی' ذہانت اور سمجھداری کا امتزاج بہت کم دیکھا ہے۔ خوبصورت لوگ عموماً" ذہین نہیں ہوتے۔ اکثر ذہین لوگ سمجھدار نہیں ہوتے۔ ہوشیار نہیں ہوتے۔ لیکن تم میں یہ تینوں چیزیں ہیں۔ تم میں ایک عجیب طرح کی بے خوفی ہے۔ یہ بے خوفی کم عورتوں میں ہوتی ہے۔ عورتوں کو اپنا سر ٹکانے کے لئے ہر وقت ایک کندھے کی ضرورت رہتی ہے۔ تھامنے کے لئے ایک ہاتھ درکار ہوتا ہے۔ تم اپنا سر اٹھا کر چلنے والی ایک بہت باوقار عورت ہو۔ لیکن تم اپنی منزل سے بے بہرہ ہو۔ تم سے اپنی سمت کا تعین نہیں ہو رہا۔ تنہا ہونے کی وجہ سے تم اپنے تحفظ کے بارے میں فکر مند ہو اس لئے فیصلہ کرنے سے ہچکچا رہی ہو۔ میں تمہیں اپنے بزنس میں ففٹی ففٹی کی شراکت دے رہا ہوں۔ ہم تمام قانونی ضابطے پورے کر کے باقاعدہ معاہدے پر دستخط کریں گے۔ میرا کوئی بہت بڑا بزنس نہیں ہے۔ میں سال میں اسی طرح کے تین چار منصوبے بیچتا ہوں' تمہارا ساتھ ہو گا تو ہم یہ چھوٹے چھوٹے منصوبے بیچنا چھوڑ

دیں گے صرف دو تین بڑے بڑے معاملے طے کریں گے۔ تم شہزادی کی طرح رہو گی۔ آزاد اور خود مختار۔ تمہیں ملک ملک گھومنے کے لئے جہازوں میں کھانوں کی ٹرے اور ڈرنکس کے لئے گلاس نہیں اٹھانے پڑیں گے۔"

چنائے نے کافی کا گھونٹ بھرنے کے لئے اپنی اتنی لمبی تقریر میں جو وقفہ لیا اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رفی نے پوچھا۔

"مجھے کرنا کیا پڑے گا' میں تو بزنس بالکل نہیں جانتی۔"

"پی.... آر....." چنائے نے دونوں حرفوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "صرف پی ..... آر...... پبلک ریلیشنگ .....! میرا کام کرنے کا انداز مختلف ہے۔ میں کام اس لئے کرتا ہوں کہ زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کے لئے کافی پیسے کما سکوں لیکن میں ایک پیسے سے دوسرا پیسہ کمانے کے لئے ہر وقت اس کے پیچھے نہیں دوڑتا۔ میں دن بھر کام کی چکی میں نہیں پستا۔ عملے کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں پر اپنا بلڈ پریشر نہیں بڑھاتا۔ میں ایسے ٹھیکے لیتا ہوں جن میں کام کم ہوتا ہے اور پیسے زیادہ۔ اور بعض دفعہ تو صرف پیسے ہوتے ہیں۔ کام نہیں ہوتا۔ کام ہوتا بھی ہے تو ذیلی ٹھیکے دے کر پورے کرا دیتا ہوں۔ اسی لئے آج بھی میرا معدہ السر سے محفوظ ہے اور دل پر بائی پاس کی ایک بھی مہر نہیں ہے۔ لیکن ان کاموں کے لئے رابطوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ رابطے پبلک ریلیشنز سے بنتے ہیں۔ میرا بزنس رابطوں کا کلچر کا حصہ ہے مثلاً" پانی بنانے کا ٹھیکہ دیکھو۔ تمہارے ایک رابطے نے نوے ہزار ڈالر کا منافع کمایا۔ میں اس منصوبے کی تکمیل میں حصہ داری لے کر شاید ایک ملین ڈالر کما لیتا' لیکن اپنی آزادی کھو بیٹھتا۔ میں اپنے بزنس کے لئے ذہن استعمال کرتا ہوں۔ باقاعدہ حکمت عملی تیار کرتا ہوں۔ شطرنج کی بساط بچھاتا ہوں۔ چالیں طے کرتا ہوں۔ میری بازی بہت کم مات ہوتی ہے۔" چنائے خاموش ہو کر اپنی کافی پینے لگا۔

"لیکن پانی بنانے کے اس منصوبے کو پورا کرنے میں تمہارا کوئی کردار نہیں ہو گا۔ کیا تمہاری کمپنی اس میں کوئی حصہ نہیں لے گی؟" رفی نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے یہ منصوبہ' اس کا آئیڈیا اور اسے چلانے کی تمام فنی اور

انتظامی تفصیلات شیخ علی کی کمپنی کو بیچ دی ہیں۔ ایک لاکھ ڈالر میں یہ سودا شیخ علی کے لئے سستا ہے۔ وہ اس منصوبے سے لاکھوں کما سکتا ہے۔ میرے پاس اس کے روز مرہ کے کاروبار میں الجھنے کا وقت نہیں ہے۔ میں یہ منصوبہ بیچ کر اب بالکل بری الذمہ ہوں۔" چنائے کو پتہ تھا کہ شیخ علی اس منصوبے کے بارے میں پوچھے گا بھی نہیں۔ نہ کبھی جارج کی ہمت ہو گی کہ وہ اسے یاد دلائے۔ رفی خاموشی سے چائے پی رہی تھی۔ چنائے بھی کافی پیتے ہوئے اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ رفی نے آخر بہت سوچ سوچ کر بولنا شروع کیا۔

"اختر تمہاری تجویز میرے لئے بہت پر کشش ہے۔ تمہیں میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں موجودہ صورتحال سے نکلنا چاہتی ہوں۔ لیکن میرے ذہن میں ایک دو اور چیزیں ہیں۔ میں شاید کسی آرٹ ڈیلر سے وابستہ ہو جاؤں یا پھر شاید لندن میں کوئی چھوٹی سی فیشن بوتیک کھول لوں۔ لیکن تمہاری یہ پیشکش اچانک اس طرح سامنے آئی ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ ایک ان دیکھی دنیا میں جانے کا فیصلہ آسانی سے نہیں ہو گا۔ لیکن میں اس پر سوچ ضرور سکتی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اور اسی لئے اپنی پیشکش تمہیں آج دینا چاہتا تھا تاکہ تم اپنی لندن کی فلائٹ سے واپس آؤ تو فیصلہ کر چکی ہو۔ تم لندن میں کتنے دن رہو گی۔"

"تین" رفی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں اگلی جمعرات کی شام آؤں گا۔ چاندنی رات تو نہیں ہو گی لیکن بیٹھ کر احمد کا حقہ پئیں گے اور جہازوں کو چڑھتا اترتا دیکھیں گے۔ پھر تم میرے ساتھ دو تین روز کے لئے کراچی چلنا' فیصلہ کرنے سے پہلے اس ان دیکھی دنیا میں بنے ہوئے میرے کام کو دیکھ لینا۔ تم نے میرے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ نہیں کیا تو ہم اس کے بعد بھی اچھے دوستوں کی طرح ملتے رہیں گے۔" چنائے نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے We have a date on thursday" رفی یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

چنائے اس کو باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ چنائے نے ۴۵ ہزار ڈالر کا جوا کھیلا تھا۔ اگر رفی نے اس کی بات مان لی تو وہ اس ۴۵ ہزار سے ۴۵ لاکھ کمائے گا۔ وہ جانتا

تھا کہ رفی کراچی کے سماجی حلقے میں کرنٹ کی طرح دوڑے گی۔ شیخ علی جیسا شخص اس کا بسمل ہو گیا تھا۔ کراچی کے سرکٹ میں تو شیخ علی کے پائے کا ایک بھی نہیں تھا۔

رفی لندن سے واپس آئی تو وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے آتے ہی ملازمت سے اپنا استعفیٰ دے دیا اور ایک مہینے کا جو نوٹس دینا تھا اس عرصے کی چھٹی لی لی۔ لیکن یہ چنائے کی پیشکش کی وجہ سے نہیں تھا۔ وہ نوکری چھوڑنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ چنائے کی پیشکش نے فیصلے کے عمل کو تیز کر دیا تھا۔ لیکن آرٹ ڈیلر کے ساتھ کام کرنے یا بوتیک کھولنے کے لئے لندن جانے سے پہلے وہ چنائے کو آزمانا چاہتی تھی۔ اس کا کوئی نقصان بھی نہیں تھا۔ اگر اسے معاملہ صحیح طرح چلتا نظر نہ آیا اور ماحول اچھا نہ لگا تو وہ چنائے کو خدا حافظ کر کے چلی جائے گی۔ چنائے ۴۵ ہزار ڈالر پہلے ہی دے چکا تھا۔ اس کے بینک نے بتایا تھا کہ چیک کیش ہو گیا ہے۔ لیکن اسے چنائے کی پیش کش قبول کرنے سے پہلے ایک ضمانت چاہیے تھی۔

چنائے نے جمعرات کو شام ٹھیک سات بجے اسے فون کر کے بحرین آنے کی اطلاع دی اور بتایا کہ وہ اس دفعہ بھی ریجنسی میں ٹھہرا ہوا ہے۔ رفی نے بتایا وہ اسی کے ہوٹل آ رہی ہے۔ چنائے ہوٹل کے باہر موجود تھا۔ اس کا خیال تھا وہ باہر ساحل پر جائیں گے لیکن رفی نے کہا وہ یہیں بار میں بیٹھیں گے جہاں زیادہ تر میزیں ابھی خالی تھیں۔ دونوں نے کاؤنٹر سے اپنے جام لئے اور خاموش بیٹھے شاید ایک دوسرے کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

"تمہارا لندن کا دورہ کیسا رہا۔" چنائے نے خاموشی توڑی۔

"ٹھیک تھا۔" رفی نے کہا اور تھوڑے سے وقفے کے بعد بولی۔ "آخر میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" چنائے کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لئے رک سی گئی۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔ میں تمہاری پارٹنر کی حیثیت سے نہیں تمہاری بیوی کی حیثیت سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"چنائے کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

وہ ایک آزاد پنچھی تھا اس نے کبھی شادی نہیں کی تھی اور اب تو وہ شادی کی عمر اور اس کی ضرورتوں سے آگے نکل چکا تھا۔ رفی اس سے یہ کیسی شرط منوانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کیوں اپنا اور اس کا مذاق بنوانا چاہتی تھی۔"

"ہم سچ مچ کی شادی نہیں کریں گے۔ پارٹنر رہیں گے لیکن یہ شادی صرف دکھانے کے لئے ہو گی۔ ایک تنہا اور کامیاب عورت سے شادی کرنے والوں کی قطار سے نمٹنے کا مجھ میں حوصلہ نہ ہو گا۔ تمہارا سائن بورڈ دیکھ کر یہ بھیڑ چھٹ جائے گی۔ میں اپنی مرضی کی دوستیاں بنانے کے لئے آزاد ہوں گی۔ ہم شادی کے کسی قانونی یا مذہبی بندھن میں نہیں جکڑے ہوں گے اس لئے ایک دوسرے کو چھوڑ کر جانے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہو گی۔" رفی نے بڑے سپاٹ مگر صاف لہجے میں چنائے سے اپنی شرط کی وضاحت کر دی۔

چنائے خاموشی سے بیٹھا سوچتا رہا۔ رفی کی اس شرط کے مثبت پہلو اس کے سامنے آ رہے تھے۔ رفی کی یہ بات صحیح تھی کہ بزنس کرنے والی ایک تنہا اور آزاد خیال عورت کے طلب گاروں کی فہرست بہت لمبی ہو گی۔ وہ اپنی سوسائٹی کو جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا وہاں عورت کو بستر تک لے جانے کے لئے پہلے شادی کا ہی جال پھینکا جاتا ہے۔ چنائے کی بیوی کی حیثیت سے متعارف ہو گی تو لوگ اچانک ہی نہیں جھپٹیں گے۔ ایک فاصلہ رکھیں گے۔ پہلے دور سے اسے ناپنے تولنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے رفی کو اپنے قدم جمانے اور ماحول کو سمجھنے کی مہلت مل جائے گی۔ پھر بیوی کی حیثیت سے رفی کو متعارف کرانا زیادہ آسان ہو گا۔ چنائے جاتے ہی اپنی شادی کا استقبالیہ دے گا۔ اس کے ذہن میں اس استقبالئے کے مدعوئین کی فہرست بننے لگی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس دعوت میں پرائم منسٹر کو بھی بلوانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ رفی کی پاکستان میں اس طرح ہونے والی "انٹری" کے فائدے ان گنت تھے جنہیں وہ اس وقت شمار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صرف ایک قباحت تھی۔ رفی کے اسکینڈل اسے مذاق کا موضوع بنایا کریں گے۔ لیکن اس خیال کو اس نے سر سے جھٹک دیا۔ اس طرح کی اخلاقیات اس کا اور اس سوسائٹی کا اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھے جس میں وہ گردش

کرتا تھا۔

"لیکن تم نے کبھی واقعی کسی سے شادی کرنا چاہی تو......" چنائے نے آخری ہاں کرنے سے پہلے ایک اور امکان کا جائزہ لینا چاہا۔

"میرا سچ مچ شادی کرنے اور بچے پیدا کر کے فیملی بڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے ماں باپ کو ٹوٹتے، بکھرتے اور ان کے نتیجے میں خود اپنے آپ کو کٹی پتنگ کی طرح ڈولتے دیکھا ہے۔ اس وراثت کو میں آگے نہیں بڑھاؤں گی۔ مجھے کسی سہارے یا تحفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی حفاظت میں خود کر سکتی ہوں۔ اپنے پاؤں پر میں خود کھڑی ہوں۔ جذباتی تعلق بھی ہنی مون گزرتے ہی بوجھ بن جاتے ہیں۔ ماں بننے کا کبھی شوق ہوا تو اپنی پسند کے ناک نقشے والے کسی بچے کو گود لے کر پال لوں گی۔ شادی کر کے زندگی بھر کے لئے کسی ایک شخص کی جنسی خواہشوں کا غلام بن کر رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔" رفی نے طویل تقریر کر ڈالی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے We have deal" چنائے نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں آج اور اسی وقت اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کرتا ہوں۔" رفی نے ہنستے ہوئے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔

ایک ہفتے بعد رفی مسز چنائے بن کر کراچی ایئر پورٹ پر اتر رہی تھی۔ چنائے نے سندھ کلب میں شادی کا جو استقبالیہ دیا تھا اس میں پاکستان کی ساری who is who جمع تھی۔ پرائم منسٹر بھی تھوڑی دیر کے لئے شرکت کرنے آئے تھے۔ دوسرے دن اخبارات میں چنائے کی شادی کے استقبالئے کی جو تصویریں شائع ہوئیں وہ رفی اور پرائم منسٹر کی تھیں جو ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بہت انہماک سے گفتگو میں مصروف تھے۔ تصویروں میں چنائے کا سایہ تک نہیں تھا۔

دی ہے جس نے زندگی اس سے کبھی
زندگی نے کیا دیا ہے پوچھنا

4

اسلام آباد ۱۹۹۳ء

ایجوکیشن سیکریٹری اعوان ان لوگوں میں سے تھے جو صدیقی صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ بہت احترام سے انہیں صدیقی صاحب کہتے۔ انہیں معلوم تھا کہ صاحب صدیقی کے نام کا حصہ بن چکا ہے چپڑاسی سے لے کر ہر درجے کے لوگ اور ان کے دوست بھی صاحب لگائے بغیر ان کا نام نہیں لیتے تھے۔ صدیقی صاحب کو آج صبح ہی صبح جب اعوان نے بلایا تو صدیقی صاحب کو دو سال پہلے کے کمیونیکیشن منسٹری کے واقعات یاد آ گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اخبار میں جو خبریں چھپی تھیں ان کا الزام انہی کے سر آیا ہو گا۔ لیکن وہ سیکریٹری کمیونیکیشن قریشی کے شکر گزار تھے جسے انہوں نے ایک بہت مشکل میں ڈال دیا تھا لیکن جس نے کوئی حرف آئے بغیر انہیں ایجوکیشن منسٹری میں ٹرانسفر کرا دیا تھا۔ ایجوکیشن منسٹری صدیقی صاحب کو پسند آئی تھی۔ یہاں

دوسری وزارتوں کی طرح ٹھیکوں کی گندی سیاست نہیں تھی۔ وہ یہاں خود کو زیادہ کار آمد محسوس کر رہے تھے اس لئے سیکریٹری کے بلاوے پر انہوں نے دعا کی معاملہ ایسا نہ ہو کہ ان کے اصولوں کو ایک بار پھر امتحان سے گزرنا پڑے اور نتیجے میں حکام انہیں ٹرانسفر کرنے کے لئے کوئی دوسری وزارت تلاش کرنے لگیں۔

سیکریٹری تعلیم نے ان کے آنے پر اپنے پی اے کو چائے بھجوانے کے لئے کہا۔ چپراسی جب پیالی ان کے سامنے رکھ رہا تھا تو انہیں اسلام آباد میں جنوری کے سرد موسم میں پیالی سے اٹھتی ہوئی چائے کی بھاپ اچھی لگی۔ لیکن ساتھ ہی ان کی تشویش بھی بڑھ گئی۔ صدیقی صاحب کو پتہ تھا کہ چائے جیسے تکلفات دفتر میں اکثر آفت کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

وہ اعوان کے ساتھ پہلے بھی کام کر چکے تھے۔ اعوان اس وقت وزارت صحت میں ایڈیشنل سیکریٹری اور صدیقی صاحب جوائنٹ سیکریٹری تھے۔ اس وقت دواؤں کے جنرک ناموں کی اسکیم شروع ہوئی تھی جس کا چارج اعوان کے پاس تھا۔ اعوان نے صدیقی صاحب سے بہت مدد لی تھی۔ صدیقی صاحب کو معلوم تھا کہ اعوان نے اس اسکیم کی تیاری اور اس کے مقاصد پر کتنی محنت کی تھی اور یہ بھی پتہ تھا کہ جب دوا ساز کمپنیوں کی انتہائی طاقتور لابی کے ہاتھوں مجبور ہو کر حکومت نے یہ اسکیم واپس لی تو اعوان نے احتجاجاً طویل رخصت لے لی تھی۔ اسے بڑی مشکل سے منا کر واپس لایا گیا تھا۔ اور معاوضے کے طور پر گریڈ بڑھا کر سیکریٹری بنا دیا گیا تھا۔ اعوان کو منانے اور ترقی دلانے میں اس کے دوست قریشی نے بہت مدد کی تھی۔

اعوان اور قریشی پرانے دوست تھے۔ دونوں کا تعلق گجرات سے تھا' دونوں نے لاہور کے ایچی سن کالج میں پڑھا تھا ساتھ سی ایس پی کا امتحان دیا تھا اور ساتھ ہی دونوں کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ قریشی نے نوکر شاہی خاندان کے ایک بڑے گھر میں شادی کی تھی کچھ اس وجہ سے اور کچھ جوڑ توڑ کرنے کی صلاحیت اور عملیت پسندی کی وجہ سے ترقی کی منازل جلد طے کی تھیں۔ اعوان ایک آدرش پرست "Idealist" تھا۔ وہ کچھ نہ کچھ کر دکھانے اور حالات سدھارنے کا جذبہ رکھتا تھا۔ ایک بڑے زمیندار

خاندان سے تھا لیکن اپنے دوسرے دولت مند دوستوں کی طرح مزید دولت کمانے کی ہوس میں مبتلا نہیں تھا۔ نہ ہی نوکر شاہی کے کام کرنے کے انداز دیکھ کر مایوس یا ایمانداری کی سنک میں مبتلا ہو کر تلخ ہوا تھا۔ وہ اس پر یقین رکھتا تھا کہ حالات بدلنا اختیار میں نہ ہو تب بھی حالات میں خود کو ڈھال کر کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اعوان نے صدیقی صاحب کو بھی سمجھایا تھا لیکن وہ تبدیل ہونے کی عمر سے گزر چکے تھے۔ صدیقی صاحب نے خود دیکھا تھا کہ بدتر حالات اور انتہائی قلیل بجٹ میں رہتے ہوئے اعوان نے وزارت تعلیم کو اعلیٰ کارکردگی کا کتنا نادر نمونہ بنا دیا تھا۔

چائے پیتے ہوئے صدیقی صاحب نے سوچا یقیناً" کوئی گھمبیر مسئلہ ہے۔ کوئی ایسا مسئلہ جسے کہنے میں اعوان کو تکلف یا ہچکچاہٹ کا سامنا ہے۔ ان کی پریشانی غلط نہیں تھی۔

"صدیقی صاحب آسٹریلیا کے لئے انجنیئرنگ کا جو اسکالر شپ آیا تھا اس کے لئے آپ نے کسی کو منتخب تو نہیں کیا۔" اعوان نے بات شروع کی۔

"جی نہیں۔" صدیقی صاحب کے جواب مختصر ہوتے تھے۔ وہ لفظوں کو بڑی کنجوسی سے استعمال کرتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی استعمال کرنا نہیں جانتے تھے۔

"وزارت تعلیم کا ایک بھتیجا آسٹریلیا جانا چاہتا ہے۔ ان کے پوچھنے پر میں نے انجنیئرنگ کے اس اسکالر شپ کے بارے میں انہیں بتایا تھا۔ انہوں نے یہ کاغذات بھجوائے ہیں، آپ انہیں منظوری کے لئے بھجوا دیجئے۔" اعوان نے صدیقی صاحب کی طرف ایک فائل بڑھاتے ہوئے کہا۔ صدیقی صاحب نے فائل کے اندر کاغذات دیکھے تو انہیں چائے کی مدارات کی وجہ معلوم ہو گئی۔

"اعوان صاحب یہ لڑکا اس اسکالر شپ کے لئے اہل نہیں ہے۔" صدیقی صاحب نے فائل بند کر کے اعوان کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" اس دفعہ اعوان نے اختصار سے کام لیا۔

"اس کے پاس بی ای کی ڈگری نہیں ہے۔ پولی ٹیکنیک سے کیا ہوا ایسوسی

ایٹ انجنیئرنگ کا ڈپلومہ ہے۔ انجنیئرنگ میں ماسٹرز کے دو سالہ کورس کے لئے بیچلر ڈگری ضروری ہے اس کی اہلیت کو قبول نہیں کیا جائے گا۔" صدیقی صاحب نے وجہ بتائی۔

"آپ نے شاید فائل میں لگے ہوئے کاغذات ٹھیک سے نہیں دیکھے۔ ڈپلومہ اس نے میٹرک نہیں انٹر سائنس کرنے کے بعد کیا ہے۔ ڈپلومے کے ساتھ اس کے پاس اسسٹنٹ انجنیئر کی حیثیت سے کام کرنے کا تین سالہ تجربہ بھی ہے' اس کا سرٹیفکیٹ بھی فائل میں ہے۔ آنرز کے اس کورس میں جس کا اسکالر شپ ہے کورس ورک شامل نہیں ہے' صرف ریسرچ مکمل کرنی ہے۔ آسٹریلوی یونیورسٹی کے لئے ڈپلومے کے ساتھ تین سالہ عملی تجربہ قابل قبول ہو گا۔ میں نے چیک کر لیا ہے۔ اسی فائل میں کراچی کے داؤد انجنیئرنگ کالج کا ایک خط بھی ہے جس میں ڈپلومہ اور عملی تجربے کے حامل اس لڑکے کو ماسٹرز کی سطح پر ریسرچ کا اہل قرار دیا گیا ہے۔" اعوان نے وزیر تعلیم کے بھتیجے کے کیس کو پوری طرح اور بڑی مضبوطی سے تیار کرایا تھا۔

"مسئلہ صرف یہ ہے کہ لڑکے نے ڈپلومہ پچھلے سال ۱۹۹۲ء میں کیا ہے اور اسسٹنٹ انجنیئر کی حیثیت سے تجربہ کا سرٹیفکیٹ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۳ء تک کے زمانے کا ہے۔ ڈپلومہ کرنے سے دو سال پہلے اسسٹنٹ انجنیئرنگ کی ملازمت کوئی نہیں دے گا۔ یہ سرٹیفکیٹ سچا بھی ہو تو جعلی مانا جائے گا۔" صدیقی صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے اعوان کو لاجواب کر دیا۔ وزیر تعلیم نے کاغذات تیار کرنے کی جلدی میں اس اہم نکتے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اعوان بھی اس کا خیال نہ کر سکا تھا۔ تھوڑی دیر وہ فائل کھولے اس کے کاغذات پلٹتا رہا اور صدیقی صاحب اپنی ٹھنڈی ہو جانے والی چائے کے آخری گھونٹ لیتے رہے۔

"مجھ کو اجازت ہے۔" صدیقی صاحب نے سوچا معاملہ ختم ہو گیا ہے۔

"صدیقی صاحب ۱۹۹۲ء کا سن تبدیل کر کے ۱۹۹۰ء کی تاریخ کا ڈپلوما نکلوا دیا جائے گا۔ میں وزیر تعلیم سے کہوں گا کہ وہ ٹیکنیکل بورڈ کے چیئرمین سے بات کر کے نئے ڈپلومے کا بندوبست کر دیں گے۔ آپ یہ کاغذات پروسیس کرنا شروع کریں۔"

اعوان نے فائل صدیقی صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ صدیقی صاحب کو یقین نہیں آیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے گنگ ہو گئے۔

"اعوان صاحب آپ یہ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔" انہوں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"جی ہاں میں یہ آپ سے کہہ رہا ہوں۔ آپ سے جو مجھے معلوم ہے بہت ایماندار ہیں کبھی کوئی غلط کام نہیں کرتے۔" اعوان کو غصہ آگیا۔ صدیقی صاحب کی بے وقت کی ایمانداری سے اب اسے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی کرسی کھسکا کر نشست سے اٹھا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی اس کھڑکی سے سامنے کھڑا ہو گیا جس سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دور زمین پر بادلوں کے گہرے غبار بھنور کی طرح گھومتے ہوئے قدیم روحوں کا مسکن نظر آ رہے تھے۔ پتوں پر رات بھر پڑنے والی شبنم ابھی سوکھی نہیں تھی اور پیڑ ان کے بوجھ سے جھکے اور سکڑے جاتے تھے۔ ماحول کی خنکی نے غصے پر قابو پانے میں اعوان کی مدد کی۔ اسی طرح کھڑے کھڑے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ مڑا اور صدیقی صاحب کی طرف دیکھا جو ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے اور بڑی دکھ بھری نظروں سے اعوان کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ کی ایمانداری کو میری بات سے دکھ پہنچا ہو گا۔ لیکن یہ دکھ آپ کو جھیلنا ہی پڑے گا۔ آپ نے زندگی اپنے اصولوں کے حصار میں رہ کر گزاری ہے۔ اس سے ذرا باہر نکل کر دیکھئے تو اتنے دکھ پھیلے ہوئے نظر آئیں گے کہ آپ اپنی ایمانداری کے جسم پر لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے کھرونچوں کو بھول جائیں گے۔ لیکن ہتھیار پھینک کر قلعہ بند ہو کر بیٹھنے سے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ قلعہ بندی آپ کو تحفظ نہیں دے گی دکھوں کی فوج فصیلوں سے کود کود کر آپ پر چڑھ دوڑے گی۔ آپ کے جسم پر جونک کی طرح چمٹ جائے گی۔ آپ کا جسم ہی نہیں آپ کی روح تک کو کھا جائے گی۔"

ایسا لگ رہا تھا کہ اعوان یونیورسٹی کے لیکچر روم میں کھڑا ہوا مسحور بیٹھے

شاگردوں کے سامنے تقریر کر رہا ہے۔
"کیا بے اصولی اور بے ایمانی ہی ان دکھوں کا مداوا ہے۔" صدیقی صاحب نے تلخ لہجے میں پوچھا۔
"نہیں ہے۔" اعوان نے اسی لہجے میں لیکن ذرا نرم اور سمجھانے والے انداز میں اپنی تقریر پھر شروع کی۔
"میں آپ کو بے ایمانی اور بے اصول ہونے کی تلقین نہیں کر رہا۔ کیا میں آپ کو بے ایمان لگتا ہوں۔ بے اصول لگتا ہوں؟ میں آپ سے یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ اپنی ایمانداری کے اصولوں کو اتنا بھاری پتھر نہ بنائیں کہ اسے تھوڑا سا ادھر ادھر کھسکا نہ سکیں۔ میں بڑے دکھوں کا مداوا ڈھونڈنے کے لئے ایک چھوٹی برائی کا دکھ جھیلنے کو برا سودا نہیں سمجھتا۔ آپ کا کیا خیال ہے میں یہ بے ایمانی وزیر تعلیم کو خوش کرنے کے لئے کرنا چاہتا ہوں؟ آپ کی طرح نوکری کی پرواہ مجھے بھی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی آمدنی کا انحصار صرف اسی ملازمت پر ہے مجھے کوئی ذریعہ معاش ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو وزیر تعلیم کو ذاتی طور پر زیر احسان لانا چاہتا ہوں۔ آپ دوسری شفٹ میں نئے اسکول کھولنے کی اسکیم سے با خبر ہیں۔ ہمارا وزیر ابھی تک اسے سنجیدگی سے لینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کی ترجیحات مختلف ہیں۔ الیکشن اور پھر اس کے بعد وزیر بننے کی جنگ جیتنے کے بعد اسے اقتدار کی سیاست سے اتنا وقت نہیں بچتا کہ وہ عوام کے مسائل کے بارے میں سوچ سکے یا وہ تقریریں یاد رکھ سکے جن میں اس نے اور اس کے لیڈروں نے غریبوں کے مسائل حل کرنے کے وعدے کئے تھے۔ نئے اسکول کھولنے کی اسکیم کے لئے جو بجٹ چاہئے وہ صرف وہی دلا سکا ہے۔ اس کا ایک ذاتی اور غلط کام کر کے میں اس پر اتنا حاوی ہو سکتا ہوں کہ اسے اس منصوبے کے لئے دھکے دے دے کر آگے پہنچا سکوں۔ مجھ میں اصرار کرنے کی قوت آ جائے گی اور بار بار انکار کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہو گا۔"
اعوان دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ساتھ کی تپائی پر رکھا ہوا گلاس اٹھا کر اس نے پیا اور صدیقی صاحب کی طرف دیکھا جو اس طرح خاموش تھے۔ ان کے چہرے پر

کوئی تاثر نہیں تھا۔ اعوان کو ایسا لگا کہ جیسے وہ کسی روبوٹ سے بات کر رہا ہو۔ اسے پھر غصہ آنے لگا۔ لیکن اس دفعہ اس نے بولنا شروع کیا تو اس کے لہجے میں اداسی کا ایک عجب سا تاثر گھلا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اب صدیقی صاحب سے نہیں اپنے آپ سے مخاطب ہو۔

"میں جب یونیورسٹی سے پڑھ کر نکلا تو مزید پڑھنے امریکہ جانا چاہتا تھا۔ میرے باپ نے تمام انتظامات مکمل کر دیئے تھے۔ مجھے ایم بی اے میں داخلہ بھی مل گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا پڑھوں گا ساتھ ہی دنیا گھوموں گا۔ شکاگو جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ جانے سے کچھ دن پہلے ایک قبائلی دوست نے مجھے اور قریشی کو دعوت میں پشاور بلایا۔ رات وہیں گزاری اور دوسرے دن دوپہر کو باڑہ جانے کا پروگرام بنا جو اسمگلنگ کے سامان اور کڑھائی گوشت کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ دیر تک بازار میں گھومنے کے بعد ہم کڑھائی گوشت کھانے گئے۔ دور تک ایک لائن سے بڑی بڑی کڑھائیاں اور توے لگے تھے جن کی پیچھے ان کے مالک بوے بڑے کرچھے لے کر گوشت اور چپلی کباب تل رہے تھے۔ ایسی ہی ایک کڑھائی کے ساتھ بچھی ہوئی ایک چارپائی پر ہم بھی بیٹھ گئے۔ ہمارے خوش خوراک میزبان نے تین کلو گوشت کا آرڈر دیا جسے کھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کڑھائی گوشت کے لئے باڑہ کی شہرت بلاوجہ نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ہڈیوں کا جو ڈھیر جمع ہو رہا تھا وہ میرے میزبان نے اٹھا کر پھینک دیا۔ ہمیں تعجب ہوا لیکن اس سے زیادہ حیرت ان کی پھینکی ہوئی ہڈیوں کا تعاقب کرتی ہوئی آنکھوں کو ہوئی۔ وہ منظر میری یادداشت سے چپک کر رہ گیا ہے۔ میری نفسیات کا حصہ بن گیا ہے۔ اس ایک منظر نے زندگی گزارنے کے میرے تمام منصوبے بدل کر رکھ دیئے تھے۔" اعوان اپنی گھومنے والی کرسی کی پشت پر ٹک کر نیم دراز ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سامنے خلا میں نظر نہ آنے والی کسی اسکرین پر کئی سال پرانا منظر چلتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

"ننگی اور میلی ٹانگوں والے بچوں کا ایک غول تھا جنہوں نے ملیشیا کی لمبی لمبی ڈھیلی قمیضیں پہنی ہوئی تھیں جن کے دامن آگے اور پیچھے دونوں طرف سے چیتھڑے

بن کر جھول رہے تھے۔ بال گندگی میں چپڑے ہوئے تھے چہرے پر میل نے کالی کالی لکیریں کھینچ دی تھیں' سب سے نمایاں ان کی آنکھیں تھیں عجب سی وحشت اور ویرانی لئے' بے چینی سے گھومتی ہوئی' سارے بچے تیزی سے ہڈیوں پر جھپٹتے اور اب ان کے میلے اور پیلے پیلے دانت اپنے اپنے حصے میں آئی ہوئی ہڈیوں پر باقی بچ جانے والے گوشت کے ذروں کو ادھیڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک بچے کو جو ہڈی ملی تھی اس پر شاید زیادہ گوشت لگا رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی دعوت کا پورا اہتمام کرنا چاہا اور مالک کی نظر بچا کر کڑھائی کے کنارے لگے ہوئے مصالحہ کو اچک کر اپنی انگلی پر لگایا اور چاٹ لیا۔ اس نے بجلی کی سی سرعت دکھائی تھی لیکن مالک نے اس سے زیادہ تیزی دکھا کر گرم گرم کرچھا گھمایا جس نے بچے کے جسم پر جو نشان چھوڑا ہو گا وہ غلامی کے داغ کی طرح آج بھی اس کے بدن پر چمکتا ہو گا۔ بچہ تلملا کر رہ گیا تھا۔ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن پھر بھی وہ زور زور سے ہنس رہا تھا۔ انگلی کے پورے برابر مصالحے کی لذت شاید اس کے منہ میں ابھی تک گھلی ہوئی تھی۔

"وہ اپنے ہاتھوں سے گر جانے والی ہڈی کو اٹھانے کے لئے جھکا ہی تھا کہ مالک کرچھا لئے اپنی گدی سے اتر کر اس کی طرف پھر جھپٹا۔ ایک انگلی مصالحے کے نقصان پر اس کے انتقام کی آگ ابھی بجھی نہیں تھی۔ بچہ ہڈی چھوڑ کر بھاگا اور مالک کی پہنچ سے دور محفوظ علاقے میں کھڑے ان دوسرے بچوں میں شامل ہو گیا جو ابھی تک اپنے اپنے حصوں میں آئی ہوئی ہڈیوں کو چوس رہے تھے۔ اس کی آنکھیں اب بھی بھیگی تھیں لیکن ہنسی غائب ہو گئی۔ وہ حسرت سے ہڈی کو دیکھ رہا تھا جسے وہ اٹھا نہیں سکا تھا اور جسے اب کسی طرف سے ٹہل کر آتا ہوا آوارہ کتا سونگھ رہا تھا۔ مالک کتے کی موجودگی سے بے نیاز گوشت کا نیا آرڈر تیار کرنے لگا تھا۔ بچوں کا غول بھی اب کڑھائی گوشت کی دوسری دکانوں کی طرف چل دیا تھا لیکن وہ بچہ اب بھی پلٹ پلٹ کر کتے کے منہ میں دبی ہوئی اپنی ہڈی کو دیکھ رہا تھا جس پر شاید گوشت کے کچھ ریشے لگے رہ گئے تھے۔"

اعوان کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ صدیقی صاحب بھی اعوان کی اس

منظر کشی سے متاثر نظر آتے تھے۔ کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے بالکل سناٹا چھا گیا۔ لگتا تھا وقت پیچھے کی طرف چلا گیا ہے۔ اعوان نے خاموشی کے اس سحر کو توڑا۔

"میرے احساسات گنگ ہو گئے تھے۔ قریشی بھی متاثر تھا ہمارے میزبان پر کوئی اثر نہیں تھا۔ اس لئے اس طرح کے منظر روز کا معمول تھے۔ لیکن ہمیں دیکھ کر وہ بھی چپ سا تھا۔ ممکن ہے شرمندہ ہو رہا ہو۔ اس زمانے میں شام کو وہسکی پینا میرا روز کا مشغلہ تھا۔ میں پشاور واپس پہنچ کر شراب پر ٹوٹ پڑا اور پوری شام پیتا اور روتا رہا۔ مجھے چپ کرانے کے لئے سب نے اس نظام کے دفاع میں تاویلیں دیں جس میں بڑے ہونے والے بچے ایک انگلی مصالحے کے لئے گرم لوہے سے داغے جاتے تھے۔ سب نے اپنی اپنی ندامت کے اظہار میں بہت زور صرف کیا لیکن پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ میں رات گئے اس وقت تک پیتا رہا جب تک میرے جسمانی نظام نے ہتھیار نہیں ڈال دیئے۔ نتیجے میں رات کا باقی حصہ الٹیاں کرنے میں گزارا جسم سے رقیق مادہ کا ایک ایک قطرہ نکل گیا تو ایمبولینس میں ڈال کر مجھے اسپتال لے جایا گیا۔ کئی دن اسپتال رہ کر گھر واپس آیا تو میری ماں نے میرے پشاور والے دوست کے ذریعے سات بکروں کا صدقہ دے کر ان کا گوشت غریب بچوں کے خاندانوں میں تقسیم کرایا اور مطمئن ہو گئی کہ اس نے میرے گناہ کا بوجھ کم کر دیا ہے۔ میرے باپ کو فخر تھا کہ ان کا بیٹا اتنا درد مند دل رکھتا ہے۔ پوری برادری میں اس واقعے کے بعد میں ہیرو بن گیا تھا کہ غریبوں کی حالت دیکھ کر میں اپنی جان دینے پر تل گیا تھا۔ کچھ عرصے تک میرے علاقے کے فقیروں کی بن آئی تھی۔ ہر شخص خیرات دے کر اپنے دردمند ہونے کا اظہار کر رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر کڑھتا تھا کہ ہم نے اپنی سہولت کے لئے خیرات دینے اور لینے والا یہ کیسا معاشرہ تشکیل دیا ہے۔ خیرات غربت اور اس کے مسئلے کو حل نہیں کرتی۔ کر ہی نہیں سکتی۔ ہم خیرات دے کر دوسروں کی نہیں اپنی مدد کرتے ہیں۔ اپنے گناہ کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہم کتنے دریا دل اور غریبوں کے کیسے رکھوالے ہیں۔ اس طرح ہم خود اپنے آپ سے اپنے انسان ہونے کی سند حاصل کرتے ہیں اور پھر مطمئن ہو کر اپنا اپنا طبقاتی کردار ادا

کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنے باپ کو جب بتایا کہ میں اب امریکہ نہیں جا رہا بلکہ چاہتا ہوں کہ مجھے امریکہ بھیجنے پر آپ جو زر کثیر صرف کر رہے ہیں اس سے چند غریب بچوں کی تعلیم کا بندوبست کر دیں تو میرے باپ کو حیرت ہوئی انہوں نے موت کی دہلیز سے واپس آنے والے اپنے بیٹے کو تسلی دینے کے لئے ہاں تو کی لیکن مجھے معلوم تھا کہ ان کی اس ہاں میں کچھ جوش نہیں تھا۔

"میں نے تین دن اسپتال میں رہ کر بہت سوچ و بچار کی تھی۔ امریکہ جانا مجھے ایک بے کار ورزش نظر آیا۔ ایم بی اے کر کے میں دولت کمانے کے نئے طریقے سیکھ کر آؤں گا اور اس مشین کا پرزہ بن جاؤں گا جو پیسہ اور اس سے مزید پیسہ بناتی ہے۔ پیسہ بناتے بناتے مر جاؤں گا اور پھر میری دوسری نسل پیسہ کمانے میں لگ جائے گی۔ وہ پیسہ جو ایک حد سے گزرنے کے بعد صرف اکاؤنٹس کی کتابوں میں جمع ہوتا اور بڑھتا رہتا ہے کسی کے کام نہیں آتا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں جو کرنا چاہتا ہوں وہ کیسے کروں۔ سوچا کسی انقلابی گروپ میں شامل ہو جاؤں لیکن قریشی کو جب میرا ارادہ معلوم ہوا تو اس نے سختی سے روک دیا۔ اس نے بتایا کہ یہ راستہ صرف مایوسی کی منزل تک کا سفر ہے۔ قریشی نے میری سوچوں کو متوازن کرنے میں میری بہت مدد کی۔ اس کے کہنے پر میں اس کے ساتھ سول سروس کے امتحان میں بیٹھ گیا۔ قریشی کا خیال تھا کہ کچھ کرنے کا عملی طریقہ یہی ہے کہ کچھ کرنے کا اختیار حاصل کیا جائے۔ قریشی سے میں نے سروس میں آنے کے بعد بھی بہت کچھ سیکھا' قریشی ایک عملی آدمی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ اپنی عملیت کو اپنے لئے استعمال کرتا ہے۔ میں اس سے سیکھی ہوئی عملیت کو اپنے گرد پھیلے ہوئے دکھوں کا مداوا تلاش کرنے میں صرف کرتا ہوں۔"

اعوان نے رک کر ایک گہری سانس لی اور پی اے کو فون کر کے مزید چائے بھجوانے کے لئے کہا۔ پی اے کو معلوم تھا کہ صاحب اہم میٹنگ میں ہے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میٹنگ کے دوران اس کے صاحب کو کسی طرح کی مداخلت پسند نہیں تھی۔ کسی فون یا کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اعوان نے بھی شاید آج فیصلہ کیا ہوا تھا کہ وہ صدیقی صاحب کی ایمانداری کو اس کے مقام تک پہنچائے بغیر نہیں رہے

گا۔ اس نے اپنے سلسلہ کلام کو دوبارہ جوڑا۔

"صدیقی صاحب میں آج بھی اس بچے کو نہیں بھولا ہوں جو ایک انگلی مصالحے کی خاطر چوٹ کھا کر چوسی ہوئی ہڈی سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ میں اس ایک بچے کے آنسو پونچھنے کے لئے چھوٹی چھوٹی مصلحتوں، چھوٹے چھوٹے سمجھوتوں اور چھوٹی چھوٹی برائیوں کو برا نہیں سمجھتا۔ اگر پرانا زمانہ ہوتا تو میں سلطانہ ڈاکو بن کر کڑھائی گوشت کی دکانوں کو لوٹ کر گوشت سے لدی ہوئی ہڈیوں کو غریب بچوں میں بانٹتا اور ان کی پانچوں انگلیوں کو مصالحے سے بھر دیتا۔ لیکن میں آج کے دور کا بزدل سلطانہ ڈاکو ہوں اور بہت بزدلی کے ساتھ اپنی یہ جنگ لڑ رہا ہوں۔"

چائے آ گئی تھی چپراسی بھاپ اڑاتی گرم گرم چائے کی پیالیاں ان کے سامنے رکھ کر چلا گیا لیکن خاموشی اسی طرح قائم تھی۔ اعوان کو صدیقی صاحب کے ردعمل کا انتظار تھا۔ وہ چائے سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ بھاپ جن کی شکل میں ڈھل کر اس سے پوچھ بیٹھے۔ "کیا حکم ہے آقا" لیکن اس کی جگہ اسے صدیقی صاحب کی بہت سرد سی آواز سنائی دی۔

"اعوان صاحب دردمندی کے لئے ترقی پسند ہونا ضروری نہیں ہے۔ مجھ جیسا قدامت پسند مذہبی شخص بھی بھوک اور افلاس پر کڑھ سکتا ہے۔ انہیں دور کرنے کے لئے اپنی سی کر گزرنے کی سعی کر سکتا ہوں۔ لیکن وزیر تعلیم کے بھتیجے کے اسکالر شپ کے لئے میں پھر بھی کچھ نہیں کر سکوں گا۔ یہ بقول آپ کے کوئی چھوٹی برائی یا چھوٹے سے جھوٹ کا معاملہ نہیں ہے۔ ایک مکمل جعلسازی ہے۔ آپ میرے افسر ہیں بااختیار ہیں، اسکالر شپ منظور کرنے کا اختیار مجھ سے لے کر کسی اور کو دے سکتے ہیں، خود اپنے ہاتھوں سے یہ کام کر سکتے ہیں لیکن میں اس جعلسازی میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اپنے سامنے اسے ہوتا دیکھ سکتا ہوں۔" صدیقی صاحب نے اپنی بات مکمل کر کے چائے کی پیالی پھر اٹھا لی۔ بالکل اسی طرح جیسے روزانہ کے معمول کے مطابق ایک فائل نمٹا کر ایک لمحاتی وقفہ لینا چاہا ہو۔

اعوان نے بڑی بیچارگی کے ساتھ صدیقی صاحب کو دیکھا۔ صدیقی صاحب کی

ہٹ دھرمی بجٹ منظور کرانے کے لئے اس کی بنائی ہوئی حکمت عملی کو نقصان پہنچا رہی تھی۔ اس نے عاجزانہ انداز اختیار کر کے اپنی بات منوانے کی ایک اور کوشش کی۔

"صدیقی صاحب یہ جعلسازی نہیں ہے۔ ڈپلوما اس لڑکے نے اپنی محنت سے پڑھ کر حاصل کیا ہے۔ صرف اس کا سن تبدیل کرنا ہے۔ یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ اسکالر شپ کی آخری تاریخ ایک ہفتے بعد ہے۔ آپ کے پاس درخواستیں مانگنے کے لئے اشتہار دینے کا وقت نہیں ہے۔ یونیورسٹیاں بھی بند ہیں وہاں سے کسی کے امیدوار بن کر آنے کا امکان نہیں ہے۔ اسکالر شپ ضائع چلا جائے گا۔ کوئی اور موزوں اور اہل امیدوار ہوتا تو میں آپ سے خود نہیں کہتا۔ ایک چھوٹی سی برائی نظر انداز کرنے سے ہماری ان کوششوں و فائدہ پہنچ سکتا ہے جو ہم نئے اسکول کھولنے کے لئے کر رہے ہیں۔"

صدیقی صاحب اپنی چائے ختم کر چکے تھے اور اعوان کی بات بڑے غور سے سن رہے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اب اختصار سے کام لینے سے بات نہیں بنے گی۔ اعوان نے آج اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھا ہے' بڑے پرزور انداز میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے اب انہیں بھی اپنے دل ہی دل میں گھٹ جانے والی سوچوں کو حق گویائی دینا پڑے گا۔ انہوں نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"اعوان صاحب میں بڑی اچھائی کے لئے چھوٹی برائی اور بڑے سچ کے لئے چھوٹے جھوٹ کے فلسفے پر یقین نہیں رکھتا۔ جھوٹ جھوٹ ہوتا ہے۔ برائی برائی ہوتی ہے ان کے لئے چھوٹے بڑے ہونے کا پیمانہ ہم نے اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق تیار کر لیا ہے۔ زہر چمچہ بھر ہو یا چٹکی بھر اس کا نتیجہ ایک ہوتا ہے۔ دراصل بڑی اچھائی کے لئے چھوٹی برائی کے اسی فلسفے نے ہمارے یہاں برائی کو ایک قابل قدر بنا دیا ہے ہمیں برائیاں برتنے کا عادی بنا دیا ہے۔ میں محفلوں میں یہ سن کر بہت صبر آزما مرحلوں سے گزرتا ہوں کہ پولیس والا ہزار روپے مہینہ کماتا ہے بیچارہ چالان پھاڑ کر پیسے نہ لے تو اپنے کنبے کو دو وقت کی روٹی کہاں سے کھلائے گا۔ کلرک فائل

آگے بڑھانے کے پیسے نہ لے تو پندرہ سو روپے میں اپنے پانچ بچوں کو کس طرح پالے گا۔ ایک صاحب تو کئی ہزار روپے کمانے والے ایک افسر کی رشوت خوری کو یہ کہہ کر جائز قرار دے رہے تھے کہ اس کا پڑوسی جو گلف میں کام کرتا ہے۔ اس کے پاس نئی گاڑی، دو دروازوں والا فرج، فریزر، ۲۶ انچ کا کلر ٹی وی، وی سی آر، مائیکرو ویو سب کچھ ہے، اسے یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لئے رشوت لینی ہی پڑے گی، نہیں لے گا تو اس کے بچے احساس محرومی اور احساس کمتری کا شکار ہو جائیں گے۔ ایک بڑے محترم صحافی پلاٹ لینے کے لئے وزیروں کے جوتے پالش کرنے کو یہ کہہ کر درست قرار دے رہے تھے کہ صحافیوں کے بھی پیٹ لگا ہوتا ہے۔" صدیقی صاحب کچھ دیر رکے لیکن اعوان کو ہمہ تن گوش دیکھ کر انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"میرے ایک دوست ہیں بہت سینئر صحافی ہیں۔ پرانی قدروں پر اب بھی یقین رکھتے ہیں اس لئے ابھی تک میرے گھر کے پاس ہی ایک سرکاری کوارٹر کرائے پر لے کر رہتے ہیں۔ لیکن موجودہ وزیراعظم اور ان کی پارٹی کے اس وقت سے حامی ہیں جب وہ اپوزیشن میں تھی۔ وزیراعظم کبھی کبھی اپنے خاص صحافی دوستوں کو مشاورت کے لئے بلاتے ہیں تو وہ بھی ان میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ مجھے بہت اداس ہو کر بتا رہے تھے کہ بدعنوانیوں کی روز نئی نئی کہانیاں سننے کے بعد ان کا خیال تھا کہ وزیراعظم کو یہ خبر نہیں ہو گی کہ ان کے نام پر لوٹ مار کرنے والے سیاسی طور پر انہیں کتنا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ انہوں نے ایک ملاقات میں وزیراعظم سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ وزیراعظم نے ان کی بات بہت صبر کے ساتھ سنی لیکن کچھ نہیں بولے۔ سب لوگ جانے لگے تو وزیراعظم انہیں الگ لے گئے اور بتایا کہ یہ بدعنوانی نہیں ہے پارٹی کے لئے انتخابی فنڈ جمع کرنے کا طریقہ ہے۔ وزیراعظم میرے دوست کو پارٹی کا ہمدرد جانتے ہوئے یہ سمجھا رہے تھے کہ عوام کی خدمت اور غربت دور کرنے کے لئے ان کا برسر اقتدار رہنا کتنا ضروری ہے۔ برسر اقتدار رہنے کے لئے انتخابات جیتنا ضروری ہے اور انتخابات جیتنے کے لئے فنڈز کا ہونا ضروری ہے۔"

اعوان دل میں مسکرایا۔ اسے پارٹی فنڈز جمع کرنے کی ان کہانیوں کا اچھی طرح

علم تھا۔ صدیقی صاحب مجلسی آدمی نہیں تھے' زیادہ دوستیاں نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کے لئے یہ کہانی بہت انوکھی تھی۔ لیکن اعوان نے صدیقی صاحب کو ٹوکا نہیں۔ اس نے انہیں پہلی بار اتنا بولتے سنا تھا' وہ چاہتا تھا کہ آج صدیقی صاحب کی بھڑاس نکل جائے۔ صدیقی صاحب خاموشی کا ایک چھوٹا سا وقفہ لے کر دوبارہ گویا ہوئے۔

"چھوٹی برائی کے فلسفے کو نہ ماننے کا مسئلہ پرانی قدروں پر ڈٹے رہنے کی ہٹ دھرمی یا نئے اور پرانے اصولوں کی فلسفیانہ لڑائی نہیں ہے۔ ایک بڑی برائی کو روکنے کی جنگ ہے کیونکہ چھوٹی برائی چھوٹی نہیں رہتی بہت تیزی سے پھیل کر بڑی ہوتی ہے۔ وزیر تعلیم کے بھتیجے کو کاغذات کی جعلسازی کے ذریعے اسکالر شپ دلوا کر آسٹریلیا بھجوانے کو آپ چھوٹی بات سمجھتے ہیں لیکن یہ بات چھوٹی نہیں رہے گی۔ وہ ایک اعلیٰ یونیورسٹی میں ماسٹرز کی سطح کی ریسرچ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ چھ مہینے میں یونیورسٹی سے بھاگ کر یا تو پیسہ کمانے کے لئے ٹیکسی چلانے لگے گا یا واپس آکر اپنے وزیر چچا سے امریکہ جانے کی فرمائش کرے گا۔ یونیورسٹی کے انجنیئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں وہ اپنے نہیں ایک نالائق پاکستانی کے نام سے پہچانا جائے گا۔ آئندہ کسی اسکالرشپ کے لئے پاکستان کا نام تجویز ہوا تو اسے منظور کرنے میں تذبذب سے کام لیا جائے گا۔ شرائط زیادہ سخت کر دی جائیں گی۔"

صدیقی صاحب کے دلائل وزنی تھے۔ اعوان کا خیال تھا کہ آج وہ صدیقی صاحب کو قائل کر کے بھیجے گا لیکن انہوں نے تو خود اسے لاجواب کر دیا تھا پھر بھی وہ ایک اور کوشش کر کے دیکھنا چاہتے تھے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں وزیر تعلیم کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر انہوں نے ضد کی تو پھر میرے پاس کوئی چارہ نہیں رہے گا۔" اعوان نے بحث ختم کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں لیکن اس بحث میں آپ کو ایک اہم بات بتانا بھول گیا تھا یہ اسکالر شپ آج کے بعد شاید دستیاب بھی نہیں رہے گی۔ میرے پاس ایک بہت اہل امیدوار کی درخواست موجود ہے اور اب میرا خیال ہے کہ وہ پروسیس کر کے میں آج ہی آپ

کے پاس بھیج دوں۔" صدیقی صاحب کے اس انکشاف نے اعوان کو حیران کر دیا۔
"لیکن میں نے جب آپ سے پوچھا تھا تو آپ نے بتایا تھا سلیکشن ابھی نہیں ہوا ہے۔ اگر آپ کسی امیدوار کے لئے فیصلہ کر چکے تھے تو اتنی طویل بحث کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" اعوان نے کچھ جھنجلاتے ہوئے کہا۔
"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ سلیکشن ابھی تک اس لئے نہیں ہوا کہ مجھے آپ سے منظوری لینی تھی۔ میرا خیال تھا کوئی بہتر امیدوار ہو گا تو اس درخواست کو واپس کر دوں گا، کیونکہ یہ درخواست میرے اپنے بھانجے کی ہے۔" صدیقی صاحب نے بہت دھیمے لہجے میں کہا، اس طرح جیسے کوئی بڑا جھوٹ نگلنے کی کوشش کر رہے ہوں۔
"آپ کے بھانجے کی؟" اعوان کو یقین نہیں تھا اسے معلوم تھا کہ صدیقی صاحب کے رشتے دار کام کے معاملے میں ان کے سائے سے بھی دور بھاگتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ صدیقی صاحب کام کروا نہیں صرف رکوا سکتے ہیں۔ صدیقی صاحب کے کیرئیر پر اقربا پروری جیسی چیز کا ہلکا سا دھبہ بھی نہیں تھا۔
"جی ہاں۔ اس نے فرسٹ کلاس میں بی ای کیا تھا۔ ایک بڑی کنسٹرکشن فرم کے ساتھ سال بھر سے کام بھی کر رہا ہے۔ اس کے افسروں نے اس کی تعریف میں بہت اچھے سرٹیفکیٹ دیئے ہیں۔ میں نے اس کی درخواست صرف اس لئے قبول کر لی تھی کہ اگر اسکالر شپ مشتہر کر کے درخواستیں منگوائی جاتیں جس کا کہ وقت نہیں تھا، تب بھی میرے بھانجے کا کیس شاید سب سے مضبوط ہو گا۔ لیکن آپ کی منظوری کے بغیر میں اسے منتخب کرنے کے لئے اس لئے تیار نہیں ہوں کہ وہ میرا رشتے دار ہے۔" صدیقی صاحب کے لہجے میں چھپی ہوئی معذرت اعوان محسوس کر سکتا تھا۔
"صدیقی صاحب اگر آپ مجھے پہلے بتا دیتے تو میں وزیر والی فائل آپ کو دکھاتا بھی نہیں۔ آپ نے اب تک اپنے یا اپنے کسی عزیز کے لئے کچھ نہیں کیا۔ پہلی بار آپ اپنے بھانجے کے لئے کچھ کر رہے ہیں جو میرٹ پر بھی پورا اترتا ہے۔ آپ اپنے بھانجے کی درخواست پروسیس کر لیں۔ میری منظوری آپ کو حاصل ہے۔ رسمی دستخط آپ جب چاہیں مجھ سے لے لیجئے گا۔ وزیر تعلیم سے میں نمٹ لوں گا۔" اعوان

نے صدیقی صاحب کو یقین دلایا۔ وہ خوش تھا کہ ایک چھوٹی برائی کا دھبہ لگوانے کے بعد صدیقی صاحب ہمیشہ کی طرح بے داغ نہیں رہیں گے۔ ان کے بھانجے کو اسکالر شپ دلوانے کے لئے اگر اسے اپنی نوکری بھی داؤ پر لگانی پڑی تو وہ گریز نہیں کرے گا۔ ایک انتہائی جذباتی اعوان کو اس کے خوابوں میں ڈوبا چھوڑ کر صدیقی صاحب شکریہ ادا کر کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

صدیقی صاحب سلیم کو اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے دہرے عذاب کا شکار تھے۔ وہ ایک اچھے مقصد کے لئے سہی، پہلی بار اپنے ضمیر پر اقربا پروری کے الزام کا بوجھ محسوس کر رہے تھے جبکہ دوسری طرف ان کا بھانجا شکر گزار ہونے کے بجائے انہیں غیر جانبداری اور انجنیئرنگ کے سبق سکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن سلیم اب سمجھ گیا تھا کہ صدیقی صاحب نے اس کے گلے میں ہار کیوں ڈالا۔

"میں یہ درخواست بھر کر اور تمام ضروری پیپرز مکمل کر کے آپ کو کل ہی ٹی سی ایس سے بھجوا دوں گا۔" سلیم نے مزید جرح کئے بغیر ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ مزید بحث کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مسئلہ صرف صدیقی صاحب کا نہیں تھا۔ وزیر تعلیم کا بھانجا آسٹریلیا جا کر وہاں کی یونیورسٹی میں پاکستان کی تحقیر کا سبب بن سکتا تھا۔ یہ صدیقی صاحب کی طرح ان کے بھانجے کو بھی گوارا نہیں تھا۔

سلیم اگلے دو مہینوں کے اندر اندر سڈنی روانہ ہو گیا تھا۔

اعوان کو وزیر کے بھتیجے کے مسئلے پر کوئی مشکل نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ وزیر نے خود ہی فائل واپس منگا لی تھی کیونکہ وزیر کے بھتیجے کی ماں اپنے بیٹے کو اتنی دور آسٹریلیا بھیجنے پر تیار نہیں تھی۔ وزیر تعلیم کو نئے اسکول کی اسکیم وزیراعظم کو پیش کرنے کا وقت نہیں ملا تھا لیکن اعوان نے قریشی کے ذریعے پرنسپل سیکریٹری کو اس کی ایک کاپی بھجوائی تھی۔ پرنسپل سیکریٹری نے وزیر تعلیم کو بتا کر اسے کابینہ کے اجلاس کے ایجنڈے پر رکھ دیا تھا۔ اس کے تین مہینے کے اندر اندر نئے اسکول کھولنے کی

اسکیم کا آغاز ہو گیا تھا۔ اعوان، صدیقی صاحب اور دوسرے افسروں نے مل کر دن رات محنت کی تھی اور وقت سے پہلے اسکول کے افتتاح کی تقریب منعقد کرائی تھی۔ وزیراعظم نے فیتہ کاٹا تھا اور اس موقع پر جمع ہونے والے کئی ہزار کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے وزیر تعلیم کو اتنی اچھی اسکیم شروع کرنے پر خراج تحسین پیش کیا تھا اور اپنی حکومت کے اس کارنامے پر خود داد وصول کی تھی۔

نئے اسکول کی افتتاحی تقریب کے ایک ہفتے بعد ہی سیکریٹری تعلیم اعوان کو ٹرانسفر کر کے آزاد کشمیر بھیج دیا گیا تھا۔ وزیر تعلیم نے وزیراعظم کو قائل کیا تھا کہ نئے اسکولوں کی اسکیم تو پٹڑی پر آ چکی ہے اسے کوئی بھی چلا لے گا لیکن اعوان جیسے باصلاحیت افسر کو اب کسی اور اہم مشن کی تکمیل پر لگایا جائے۔ کشمیر میں معاملات تیز ہو رہے تھے وہاں جانے کو تمام افسر کالا پانی سمجھتے تھے، وزیراعظم نے اعوان کے نام قرعہ فال نکال دیا۔ اعوان کے ٹرانسفر ہونے کے دو ہفتوں کے اندر ہی نئے سیکریٹری نے صدیقی صاحب کا تبادلہ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن میں کر دیا جہاں سے ان کی خدمات حکومت بلوچستان کے سپرد کر دی گئیں۔ ان کے ریٹائرمنٹ میں ایک سال باقی تھا۔ انہیں یہ متبادل دیا گیا کہ وہ ریٹائرمنٹ تک کے اس عرصے کی پوری تنخواہ کے ساتھ رخصت لے لیں۔ صدیقی صاحب کو معلوم تھا کہ انہیں باعزت طریقے سے نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ بھی لڑتے لڑتے تھک گئے تھے۔ اسلام آباد میں وہ اور ان کی بیوی تنہائی محسوس کرنے لگے تھے۔ پچھلے سال ان کی بیٹی بیاہ کر کراچی گئی تھی۔ ان کا بیٹا بھی تعلیم کی وجہ سے کراچی میں خالہ کے پاس رہتا تھا۔ ان کی بیوی کے لئے اسلام آباد میں ایک ایک پل بھاری تھا۔ صدیقی صاحب ریٹائرمنٹ اور اس وقت تک کے عرصے کی رخصت قبول کر کے اسلام آباد کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر کراچی چلے گئے۔

یہ کھیل زندگی کے سفر کا عجیب ہے
پاؤں لہو میں تر، کبھی پتھر لہو میں تر

5

سڈنی ۱۹۹۴ء

سلیم امیگریشن اور کسٹمز کے مرحلوں سے نکل آیا تھا اور اب ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل کر اپنے سوٹ کیس اور ایک بیگ کے ساتھ حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس دیس میں دو کٹھن سال کس طرح گزارے گا۔ کراچی ایئرپورٹ پر الوداع کہنے کے لئے آئے ہوئے اداس چہرے اور بھیگی آنکھیں ابھی تک اس کے دل میں تیر بن کر اٹکی ہوئی تھیں۔ لیکن یہ بعد کی پریشانیاں تھیں اس وقت اس کی پریشانی کچھ اور تھی۔ وہ اس شخص کا انتظار کر رہا تھا جو اسے لینے کے لئے آنے والا تھا۔ سلیم کا اپنا کوئی جاننے والا سڈنی میں نہیں تھا ایک دوست نے اس کے لئے اپنے کسی جاننے والے سے بات کی تھی جس نے اس بات پر اپنی آمادگی ظاہر کی تھی کہ سلیم کو ایئرپورٹ سے اپنے گھر لے آئے گا جہاں وہ اس وقت تک رہ سکتا ہے جب تک وہ

خود اپنا انتظام نہ کر لے۔ سلیم آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف ۵ فٹ ۸ انچ کے چھریرے بدن، گندمی رنگ، مانگ نکلے ہوئے سیاہ گھنے بالوں والے ایک تیس بتیس سال کے نوجوان کو تلاش کر رہا تھا۔ سلیم کو تشویش یہ تھی کہ وہ کہیں آ کر نہ چلا گیا ہو۔ فلائٹ تو وقت پر آئی تھی لیکن سلیم کو امیگریشن اور کسٹمز میں کافی وقت لگا تھا۔ وہ باہر نکلنے والا اس فلائٹ کا آخری مسافر تھا۔ پھر بھی سلیم تقریباً" ایک گھنٹے ایئر پورٹ کی عمارت کے باہر جما رہا۔ اس گھنٹے میں اس نے پہلی بار سڈنی کا کثیر القومی چہرہ دیکھا۔ ہر رنگ اور نسل کے لوگ سامان سے بھری ٹرالیاں یا پہیئے لگے سوٹ کیس کھینچتے ہوئے استقبال کے لئے آنے والوں سے لپٹتے انہیں چومتے، ہونٹوں پر مسکراہٹیں اور آنکھوں میں خوشیوں کے دیپ سجائے گاڑیوں میں بیٹھ بیٹھ کر ہوا ہو رہے تھے۔ جو اکیلے تھے انہیں معلوم تھا انہیں لینے کوئی نہیں آئے گا۔ وہ زیادہ تیزی میں آتے اور سیدھے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جاتے جہاں ان کے انتظار میں ٹیکسیوں کی ایک لمبی قطار لگی تھی۔ یہ مناظر دیکھ کر سلیم کو تنہائی کا احساس اور شدید ہو رہا تھا۔

سلیم کو اب یقین ہو گیا تھا کہ بشیر احمد کو یا تو اس کا ٹیلی گرام نہیں ملا یا وہ انتظار کر کے جا چکا ہے۔ اس کے دوست نے سلیم کو بشیر احمد کا فون نمبر اور پتہ دیا تھا۔ سلیم دوبارہ ایئر پورٹ کی عمارت میں داخل ہوا تا کہ فون کر کے اپنے متوقع میزبان سے رابطہ کر سکے۔ سکے ڈال کر اس نے بہت احتیاط سے نمبر دبائے۔ لیکن دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز تھی۔ اس نے فون بند نہیں کیا بلکہ بہت صبر سے اس عورت کی آواز سنتا رہا جو ایک چھوٹی سی beep کے بعد پھر شروع ہو گئی تھی۔ یہ ریکارڈنگ تھی اور پیغام صاف تھا کہ فون اب سروس میں نہیں منقطع ہو چکا ہے۔ سلیم کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جگمگانے لگے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کی سوچیں معلق ہو گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کہاں جائے۔ جمعہ کا دن تھا، ہفتہ اتوار یونیورسٹی بھی بند ہو گی اس لئے ایک نہیں کم از کم تین راتوں کا مسئلہ تھا۔ تھوڑی دیر وہ اس ریسیور کو گھورتا رہا جو اس نے ابھی تک ہک پر واپس نہیں رکھا تھا۔ شاید اسے توقع تھی کہ بشیر احمد اپنا ہاتھ ہلاتا ہوا ریسیور سے کود کر باہر آ جائے گا۔

مایوس ہو کر اس نے ریسیور ہک پر لٹکایا اور اٹیچی کھینچتا ہوا آہستہ آہستہ قدموں سے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ اس کے پاس ابھی ترپ کا ایک پتا اور باقی تھا۔ اس کے پاس بشیر کا پتہ تھا۔ اگر وہ اس پتے تک پہنچ جائے تو بشیر نہ ملا تب بھی وہ اس کے دروازے پر بیٹھ کر انتظار کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے ٹیکسی اسٹینڈ کا رخ کیا۔ سلیم ٹیکسی کی طرف بڑھا تو ڈرائیور نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا سامان ڈکی میں رکھا۔ سلیم اس کے ساتھ ہی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل پڑی تو ڈرائیور نے منزل کا پتہ پوچھا۔ ڈرائیور اسے شکل و صورت اور انگریزی کے بہت سادہ سے لہجے کی وجہ سے اپنی طرف کا لگتا تھا۔ سلیم نے پتے کا کاغذ اس کی طرف بڑھایا تو ڈرائیور چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"آپ انڈیا سے ہیں یا پاکستان سے۔"

"پاکستان سے۔" سلیم نے بڑی تیزی سے جواب دیا۔

"اس پتے پر آپ رہتے ہیں یا پہلی بار آسٹریلیا آئے ہیں۔" ڈرائیور اب اس سے اردو بولنے لگا تھا۔

"میں پڑھنے کے لئے آیا ہوں۔ پہلی بار آیا ہوں۔ میرے ایک دوست نے لینے کے لئے آنا تھا۔ لیکن میں دیر سے باہر نکلا تو وہ شاید مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔ اس کا فون بھی کٹا ہوا ہے یہ اس کے گھر کا پتہ ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کسی کو نہیں جانتا۔" سلیم نے جلدی جلدی اسے اپنی زندگی کی کہانی سنا دی۔

"میرا نام چودہری انور ہے۔ میں بھی پاکستان کا ہوں۔ ملتان کے قریب کا آپ تو یقیناً" کراچی کے ہوں گے۔" ڈرائیور نے اثبات میں سلیم کے ہلتے ہوئے سر کو دیکھے بغیر ہی یقین کر لیا تھا۔ آپ کو جہاں جانا ہے وہ کیبرا میٹا کا علاقہ ہے۔ اور وہاں کا کرایہ پچاس ساٹھ ڈالر ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے آپ کا دوست اب وہاں نہ رہتا ہو۔" ڈرائیور کی بات سن کر سلیم کو اپنی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"وہ میرا دوست نہیں ہے۔ دوست کا دوست ہے۔ لیکن پچاس ڈالر تو بہت ہوں گے۔"

سلیم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس نے حساب لگایا تھا کہ پچاس ساٹھ ڈالر میں تو اس کے دو ہفتوں کے کھانے پینے کا خرچ چل سکتا تھا۔

"جی ہاں۔ اسی لئے میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ آپ پڑھنے کے لئے آئے ہیں یا نوکری کے لئے۔" چودھری انور نے پوچھا۔

"پڑھنے کے لئے۔ میں انجنیئر ہوں اور اسکالر شپ پر ماسٹرز کرنے آیا ہوں۔" سلیم نے بتایا۔

"دیکھئے کیبرا میٹا جانے کے لئے سب سے آسان ذریعہ ٹرین ہے۔ آپ صرف ڈھائی ڈالر میں وہاں پہنچ سکتے ہیں۔" ٹیکسی اب اس جنکشن پر پہنچ گئی تھی جہاں سے کیبرا میٹا جانے کے لئے بائیں طرف اور شہر کے لئے دائیں طرف مڑنا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ مجھے ٹرین اسٹیشن پر پہنچا دیں۔ میں ٹرین پکڑ کر پوچھتا پوچھتا چلا جاؤں گا۔"

ٹیکسی شہر کی طرف دوڑنے لگی۔ رستے بھر دونوں ایک دوسرے سے اپنا ابتدائی تعارف کراتے رہے۔ ساتھ ہی سلیم گزرتے ہوئے شہر کو دیکھ کر سڈنی سے اپنا ابتدائی تعارف حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی تک اسے کوئی ایسا منظر نظر نہیں آیا تھا جو اسے سڈنی کے بارے میں کوئی خاص تاثر قائم کرنے میں مدد دیتا۔ منصوبہ بندی سے بنے ہوئے کسی بھی شہر کی طرح ہر طرف سیمنٹ پھیلا ہوا تھا۔ سیمنٹ کی سڑک، سیمنٹ کی دو طرفہ فٹ پاتھیں۔ مکانوں کی قطاریں جن میں کسی کسی سے سبزہ جھانکتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہر تھوڑے فاصلے پر دکانوں، ریستورانوں یا دفاتر کا سلسلہ۔ بہت قاعدے سے چلتا ہوا ٹریفک لیکن سلیم کو حیرت تھی کہ اسے ابھی تک کوئی پولیس والا نظر نہیں آیا تھا۔ نہ سڑک پر نہ کسی ٹریفک چوراہے پر۔ ایئرپورٹ پر بھی جہاں اس نے باہر کھڑے ہو کر اتنے گھنٹے گزارے تھے، اسے کوئی وردی والا نظر نہیں آیا تھا۔ ہر چیز کسی خودکار نظام کی طرح چل رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور سلیم کو بتا رہا تھا کہ یہ راستہ شہر کی تجارتی مرکز کی طرف جاتا ہے جہاں اونچی اونچی عمارتوں کا ایک جنگل ہے۔ ٹریفک جام، فٹ پاتھ پر چلنے والوں کا رش، خریداروں کا ہجوم، بہت بے صبری

سے بھاگتے ہوئے لوگ جیسے ان کے رکتے ہی دنیا کی گردش تھم جائے گی۔ اس لئے وہ اس حصے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے سینٹرل ریلوے اسٹیشن پر اتار دے گا جہاں سے اسے کیبرا میٹا کی ٹرین مل جائے گی۔

سینٹرل اسٹیشن کی منزل آنے سے کچھ دیر پہلے چودہری انور نے کچھ سوچا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے خدشات سے سلیم کو آگاہ کر دے، لیکن ساتھ ہی وہ سوچ رہا تھا کہ اسے خدشات ہی نہیں ان کا حل بھی بتانا ہو گا۔ اسے معلوم تھا کہ سڈنی آنے والے اپنے اس ہم وطن اجنبی کو اس وقت اتار کر چلا گیا تو یہ بے ٹھکانہ نوجوان کیبرا میٹا میں بھٹکتا ہوا کسی دشواری میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر اپنی سوچوں سے بحث کر کے انور نے فیصلہ کیا کہ اسے سلیم کو اپنے خدشات سے آگاہ کر دینا چاہیے۔

"کیبرا میٹا کا علاقہ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ آپ بالکل نئے ہیں۔ آپ کر ہر قدم پر اپنے اگلے قدم کے بارے میں پوچھنا پڑے گا۔ کیبرامیٹا میں منشیات کے عادی گروہ آپ جیسے انجانے لوگوں کی تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔ آپ ان سے بچ کر اپنے پتے پر پہنچ بھی گئے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کا دوست وہاں نہیں ہو گا۔ یہاں بل نہ دینے پر فون اتنی جلدی نہیں کٹتے۔ اسی صورت میں کٹتے ہیں جب آپ وہاں سے کہیں اور جا چکے ہوں۔ کیبرا میٹا میں آپ بالکل بے یار و مددگار ہوں گے۔"

"میں کسی ہوٹل میں چلا جاؤں گا۔" سلیم نے مسئلے کا حل نکالا۔

"میں آپ کو کیبرا میٹا کے ہوٹل میں ٹھہرنے کا مشورہ بھی نہیں دوں گا۔ آپ کو ہوٹل میں رکنا ہے تو یہاں کوئی سستا ہوٹل تلاش کر لیں کیبرا میٹا تک کی دوڑ لگانا بے سود ہے۔ پچاس ڈالر میں آپ کو ایک مناسب کمرہ مل جائے گا۔ پھر ایک ہی رات کی تو بات ہے۔" چوہدری انور نے سلیم کو سمجھایا۔

"ایک نہیں تین راتوں کی بات ہے۔ میری یونیورسٹی پیر کو کھلے گی۔ اور پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ یونیورسٹی کھلتے ہی وہاں میری رہائش کا انتظام ہو جائے۔ میرا بجٹ ایسا نہیں ہے کہ میں اتنی دیر ہوٹل میں ٹھہر سکوں۔" سلیم نے اپنی تشویش بتائی۔

چودہری انور کو اندازہ تھا کہ اسکالر شپ پر آنے والے کتنے تنگ بجٹ میں زندگی

گزارتے ہیں۔ وہ اسے اپنے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا تھا کیونکہ وہ خود عارضی طور پر ایک چینی فیملی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اسے آخر ایک حل سوجھ ہی گیا۔

"آپ کو میں سرے ہلز کی مسجد میں اتار دیتا ہوں۔ یہاں سامنے کی ایک گلی میں واقع پاکستانیوں کی مسجد ہے۔ پیش امام کو میں جانتا ہوں' آپ کچھ دن وہاں رہ سکتے ہیں' اتوار کو میں چھٹی کرتا ہوں اس دن دوپہر کو آکر آپ کو کیبرا میٹا لے جاؤں گا۔ آپ اپنے دوست کو بھی تلاش کر لیجئے گا۔ وہ نہیں ملا تب بھی آپ اس وقت تک مسجد میں رہ سکتے ہیں جب تک یونیورسٹی والے آپ کے لئے ہوسٹل کا بندوبست نہ کر دیں۔"

سلیم نے صرف خاموشی سے سر ہلا دیا۔ موجودہ حالات میں اس کے مسائل کا اس سے بہتر حل ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ خوب زور زور سے روئے۔ بے وطنی کے پہلے چند گھنٹے ہی اس کے لئے عذاب ثابت ہوئے تھے۔ ہر قدم پر ایک نئی مشکل ایک نئی رکاوٹ جس کا اختتام اب ایک مسجد میں ہو رہا تھا جہاں وہ ایک بے سہارا بے یار و مددگار اور بے گھر مسافر کی طرح رہے گا۔ فاتحہ کے لئے آیا ہوا کھانا کھائے گا اور جہاں نماز پڑھنے کے لئے آنے والے نمازی اسے دیکھ کر ترس کھایا کریں گے۔ اس کی ماں کو اگر معلوم ہو گیا تو اس کا کلیجہ کٹ جائے گا۔ وہ امیر لوگ تو نہیں تھے لیکن سلیم اپنے ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھا جنہوں نے اسے پھولوں کی طرح پالا تھا۔ دو سال پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا جس کے بعد اپنی ماں کے لئے وہ ایک بار پھر سے بچہ بن گیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ سڈنی میں اس کا یہ استقبال ہوا ہے تو وہ اس کی فوری واپسی پر اصرار کرے گی ایک دن یہاں نہیں رہنے دے گی۔

سلیم کو ایک ہفتے تک مسجد میں رہنا پڑا۔ لیکن ایک ہی دن میں وہاں رہنے کے بارے میں اس کا یہ نفسیاتی مسئلہ ختم ہو گیا تھا کہ سڈنی کی اس مسجد میں رہنا کوئی فقیرانہ کام ہے۔ پردیس کی یہ مسجد نئے آنے والے غیر ملکی مسلمانوں کے لئے جن کے

پاس رہنے کا فوری انتظام نہیں تھا پناہ حاصل کرنے کا ایک ایسا ذریعہ تھی جس میں انا مجروح ہونے یا سماجی رتبہ گھٹنے کا احساس تک نہیں تھا۔ سلیم مسجد میں رہنے کے تکلیف دہ احساس کو جھٹکنے میں اس لئے بھی کامیاب ہو سکا تھا کہ اس کی سی صورتحال کے دو اور لڑکے یہاں رہ رہے تھے۔ مسجد میں رہنا یہاں مستقل آنے والوں سے تعلقات پیدا کرنے کا ذریعہ بھی تھا۔ دن میں تو کم لوگ مسجد آتے تھے لیکن مغرب اور عشاء کی نمازوں میں تعداد زیادہ ہوتی۔ ایک مستقل گروپ مغرب کے بعد عشاء تک پیش امام کے ساتھ بیٹھ کر مختلف مسائل پر بات چیت کرتا تھا۔ سلیم کو کسی نے بتایا یہ تبلیغی جماعت والے تھے جو جماعتیں تشکیل دے کر آسٹریلیا کے مختلف علاقوں میں تبلیغ کرنے جاتے تھے۔ ان میں سے فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ایک وکیل تھے۔ ایک پتلے دبلے لیکن لمبے قد والے ہزارہ کے تھے جن کی گراسری کی دکان تھی۔ گھنی سیاہ داڑھی والا ایک نوجوان بنگلہ دیش سے آیا ہوا ڈاکٹر تھا جو آسٹریلیا میں میڈیکل پریکٹس کرنے کے لئے امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

آسٹریلیا میں سب سے خوشحال پاکستانی طبقہ ڈاکٹروں کا تھا ان میں سے کئی بڑی پابندی سے عشاء کی نماز پڑھنے آتے۔ بہت ملنسار خوش اخلاقی سے پیش آنے والے لوگ۔ لیکن مدد کرنے کے لئے آگے بڑھنے کا فرض ان لوگوں نے اپنے سر لیا ہوا تھا جو ایک معاشی جنگ جیتنے کے لئے گھربار اور کنبوں کو چھوڑ کر یہاں آئے ہوئے تھے وہ دن دن بھر فیکٹریوں میں کام کرتے یا رات رات بھر ٹیکسیاں چلاتے اور ایک فلیٹ میں تین تین چار چار مل کر رہتے۔ مسجد کے آس پاس کے علاقے میں اس طرح کے کئی لوگ تھے جن میں سے منظر اور ظہیر نامی لڑکوں کو سلیم اچھی طرح جان گیا تھا۔ اتوار کی رات وہ سلیم کو اپنے فلیٹ لے گئے تھے جسے وہ ڈیرہ کہتے۔ یہاں آس پاس رہنے والے ان کے اور دوست بھی جمع تھے اجتماعی کھانے کے بعد وہ رات گئے تک المونیم کے الٹے تسلے پر سنگت کرتے اور اونچی آوازوں میں پنجابی گیت الاپتے رہے۔ سلیم کو ان میں سے کسی کی آنکھ میں ماضی کے دکھوں کی راکھ نظر نہیں آئی۔ کسی کے چہرے پر پیچھے چھوڑے ہوئے اپنے پیاروں کی جدائی کے احساس کا سایہ نظر نہیں آیا۔ وہ

صرف اس وقت گزارے جانے والے لمحے کی خوشیوں میں مگن تھے۔ ان کی آنکھوں' چہروں اور جسم کی ہر جنبش میں بے تحاشا توانائی تھی۔ کبھی نہ تھکنے والا جوش و خروش۔ بے فکروں کی اس محفل میں صرف سلیم فکرمند تھا۔ جو یہ سوچ رہا تھا کہ شور سے تنگ آئے ہوئے پڑوسیوں کی شکایت پر پولیس کب آتی ہے۔

چودھری انور اس دعوت میں سلیم کے ساتھ شریک تھا۔ چودھری ان لڑکوں میں سے بیشتر کو جانتا تھا اور لے ملانے میں ان سب کا شریک تھا۔ اپنے وعدے کے مطابق وہ دوپہر کو سلیم کے پاس آیا تھا اور اسے کیبرا میٹا لے کر گیا تھا۔ انور کا یقین بالکل درست تھا' اس پتے پر بشیر احمد نہیں رہتا تھا بلکہ کوئی نہیں رہتا تھا وہ دیر تک گھنٹی بجاتے رہے۔ پڑوس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایشیائی شکل کی ایک چینی یا ویت نامی عورت باہر نکل کر آئی۔ اسے انگریزی نہیں آتی تھی۔ انہوں نے برابر کے فلیٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھنا چاہا تو وہ بڑی تیزی سے دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔ دونوں بوڑھی عورت کے اس ردعمل پر حیران ہوتے ہوئے عمارت سے باہر نکل آئے۔ چودھری انور نے سلیم سے وعدہ کیا کہ وہ بشیر احمد کے بارے میں پتہ لگائے گا۔ لیکن سلیم کو اب بشیر احمد میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس نے بشیر کو دیکھا تھا نہ وہ اسے جانتا تھا۔ اسے تو صرف پہلے چند دنوں کے لئے بشیر احمد کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت اب مسجد میں رہ کر پوری ہو گئی تھی۔ سلیم نے سوچا یہ اس کے لئے بہتر ہی ہوا تھا۔ چودھری انور کی شکل میں وہ کوئی فرشتہ تھا جس نے اسے کیبرا میٹا جیسے علاقے میں بھٹکنے یا کسی انجانے شخص کے ساتھ رہنے سے بچا لیا تھا اور ایک پاکیزہ ماحول میں اس کے ابتدائی مشکل دنوں کا انتظام کر دیا تھا۔

سلیم کو سڈنی آئے ہوئے چھ مہینے ہو گئے تھے اور وہ ابتدائی دنوں کی مہم جوئیوں سے فارغ ہو کر یونیورسٹی کے ماحول میں پوری طرح رچ بس گیا تھا۔ رچ بس جانے میں اسے دشواری اس لئے بھی پیش نہیں آتی تھی کہ سماجی اور ثقافتی طور پر اس نے خود کو الگ تھلگ رکھا تھا اور تمام توجہ اپنی ریسرچ پر مرکوز کر دی تھی۔ وہ شام

گئے تک تجربوں اور کتابوں میں غرق رہتا۔ اس نے تہیہ کیا تھا کہ دو سال سے پہلے اپنی ریسرچ مکمل کر کے واپس چلاجائے گا۔ اس کی رہائش یونیورسٹی سے دس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ یہ جگہ حاصل کرنے میں یونیورسٹی اس کی زیادہ مدد نہیں کر سکی تھی۔

یونیورسٹی کے ہوسٹل مہنگے اور اس کا بجٹ محدود تھا۔ کسی کے ساتھ مل کر رہنے کے لئے یونیورسٹی بھر میں جو نوٹس لگے ہوئے تھے وہ زیادہ تر آسٹریلوی یا یورپی نژاد لڑکوں کے تھے جن کے ساتھ رہنے کی سلیم میں ہمت نہیں تھی۔ ایک فلیٹ اسے پسند بھی آیا۔ ایک صاف ستھرا چھوٹا سا علیحدہ کمرہ چالیس ڈالر ہفتے میں مل رہا تھا۔ یونیورسٹی کے بالکل سامنے کی عمارت کے ایک فلیٹ میں تھا۔ لیکن اس کی مکین سنہرے بالوں والی ایک بہت خوبصورت سی لڑکی تھی جو انگریزی ادب میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ اس کی شرائط زیادہ مشکل نہیں تھیں۔ ایک شرط یہ تھی کہ وہ پیر سے جمعہ تک کام کے پانچ دنوں میں اپنی کسی گرل فرینڈ کو نہیں لا سکتا صرف ویک اینڈ پر بلا سکتا ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ اس کا اپنا بوائے فرینڈ بھی جو سڈنی سے باہر رہتا ہے ویک اینڈ آ کر اس کے ساتھ گزارتا ہے۔ لڑکی اپنی بلی کو گود میں سلیم کو فلیٹ دکھانے کے دوران مستقل بولے جا رہی تھی۔ اس نے یہ بھی پیش کش کی کہ ویک اینڈ پر سلیم اور اس کی گرل فرینڈ اگر مصالحے دار کھانا پکائیں تو وائن وہ لے آئے گی۔ موم بتیوں کی روشنی میں ڈنر کریں گے۔ یا دوپہر کو بیئر پی کر باربی کیو کریں گے۔ اس طرح باہر جا کر پیسہ خرچ کئے بغیر وہ اپنے گھر میں جشن منائیں گے۔ اس معصوم سی لڑکی نے فرض کر لیا تھا کہ سارے سماج اس کی اپنی معاشرتی قدروں والے سماج ہیں جن میں گرل فرینڈ بوائے فرینڈ بیئر اور وائن زندگی کے لازمی جزو ہیں۔

سلیم اسے یہ بتا کر حیرت زدہ یا اس کے سامنے خود کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے نہ وہ شراب کا عادی ہے۔ لڑکی نے اپنا نام ”ایوان“ بتایا تھا۔ وہ کافی بنانے جا رہی تھی اور یہ فرض کر کے سلیم بھی کافی پیئے گا اس سے پوچھنے لگی کہ وہ کافی کس طرح پیتا ہے ”وہائٹ ود ٹو شوگر“ کہتے ہوئے سلیم بھی منع نہیں کر سکا۔ کافی کا پاٹ پہلے ہی گرم تھا وہ دودھ چینی ڈال کر فوراً ہی لے

آئی۔ اس تمام عرصے میں بلی اس کی گود میں رہی تھی۔ کافی پیتے ہوئے وہ مستقل باتیں کرتی رہی۔ زیادہ تر اپنے بوائے فرینڈ کی جو میوزیشن تھا اور سڈنی سے باہر کی ایک ساحلی تفریح گاہ پر واقع ہوٹل کے بار میں پیانو بجاتا تھا۔ باتوں کے دوران وہ بار بار ہنس پڑتی تو اس کے چھوٹے سے دہانے کی قید سے باہر نکل کر چمکتے ہوئے موتیوں جیسے دانت اور گالوں میں پڑتے ہوئے خفیف سے گڑھے بہت اچھے لگتے۔ سلیم کو یہ عجیب سا احساس بھی ہوا کہ "ایوان" اور بلی کی آنکھیں ایک سی تھیں۔ رنگ تو بالکل ایک سا تھا۔ ہلکا ہلکا سبز رنگ جو شاید جذبوں کی شدت یا روشنی کے زاویئے بدلنے سے نیلگوں لگنے لگتا تھا۔ لیکن بلی کی آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔ سلیم کو گھورتی ہوئی یہ آنکھیں اپنے جسم پر پیوست محسوس ہوئیں۔ ان آنکھوں پر ایک موٹا اور شفاف سا شیشہ چڑھا ہوا نظر آتا تھا جیسے اس نے موٹے موٹے شیشوں والے کنٹیکٹ لینس لگائے ہوئے ہوں۔ جبکہ ایوان کی آنکھوں پر ہلکے سے پردے کی طرح خوابوں کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ایوان کی گفتگو کا مرکز اس کا بوائے فرینڈ ڈیوڈ تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ تعلیم مکمل کرتے ہی دونوں شادی کر کے ایک طویل ہنی مون پر یورپ چلے جائیں گے۔ اور شاید وہیں کہیں رہ بھی جائیں۔

سلیم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اسے بتائے کہ وہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔ اس کے پاس منع کرنے کا کوئی معقول جواز نہیں تھا۔ اسے ایوان پسند آئی تھی۔ معصوم اور سادہ دل جس کی زندگی پر شاید غم کا کوئی سایہ نہیں پڑا تھا۔ دوسروں کو اپنی طرح صاف دل اور سچا سمجھنے والی۔ لیکن سلیم کو بلی اور ایوان کی سبز آنکھوں کی جوڑی سے ایک خوف سا محسوس ہوا۔ ایک لڑکی کے ساتھ رہنا اس کے لئے ایک ناقابل قیاس عمل تھا۔ وہ کس کس کو سمجھائے گا۔ پھر ویک اینڈ پر ہفتے بھر کی جدائی کا حساب چکاتا ہوا وصل کی کیفیتوں میں مبتلا یہ جوڑا اس کی توجہ کو بار بار بھٹکائے گا۔ سلیم ایوان اور اس کے بوائے فرینڈ ڈیوڈ سے زیادہ ان کی بلی سے خوف زدہ تھا۔ بلی کی آنکھوں میں اسے کینہ توزی کی جھلک نظر آئی تھی۔ ایوان نے اسے بتایا تھا کہ اس بلی کو چھ مہینے پہلے اس کا بوائے فرینڈ کہیں سے لایا تھا۔ اس وقت وہ

صرف ایک مہینے کی تھی۔ ایوان نے اسے ہنس کر بتایا کہ ویک اینڈ پر جب ڈیوڈ آتا ہے تو پھر یہ اس سے چپک جاتی ہے۔ ایوان کے پاس پھٹکتی بھی نہیں ہے۔ سلیم کافی ختم کر چکا تھا۔ وہ ایوان سے یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ اسے ابھی ایک اور فلیٹ دیکھنے جانا ہے' اس نے اگر ایوان کا فلیٹ لینے کا فیصلہ کیا تو وہ اسے فون کرے گا' اگر اسے کل تک فون نہیں ملا تو وہ پھر سمجھ لے کہ اس نے دوسرا کمرہ لے لیا ہے۔ سلیم کو ایسا لگا جیسے ایوان کو معلوم ہے کہ وہ فون نہیں کرے گا۔ وہ جلدی سے خدا حافظ کہہ کر نکل آیا۔

سلیم کو ایک ہفتے کی تگ و دو کے بعد یونیورسٹی کے نزدیک کوجی کے علاقے میں رہنے کی جگہ مل گئی تھی۔ یہ جگہ بھی اسے ایک مسجد کے توسط سے مل سکی تھی۔ غیرملکی طلبہ کی مدد کے لئے یونیورسٹی کا جو ڈیپارٹمنٹ تھا اس نے سلیم کو اس کے علاقے سے تعلق رکھنے والی سوسائٹیوں کے پتے دیئے تھے۔ یونیورسٹی کی پاکستان سوسائٹی کے صدر کا جو نمبر دیا گیا تھا اس پر کئی بار فون کئے لیکن رابطہ نہ ہوسکا۔ ایک نمبر اسلامی سوسائٹی کا تھا اس پر ملنے والے نے اسے نماز کے وقت یونیورسٹی کی مسجد آنے کے لئے کہا۔

سلیم مغرب کی نماز یونیورسٹی کی مسجد میں ادا کرنے گیا تو وہاں احمد بھی نماز میں شریک تھا جس کے پاس رہنے کی جگہ تھی۔ احمد اپنے ساتھ سلیم کو فلیٹ دکھانے لے گیا اور ساتھ ہی اس نے وہاں کا بجٹ اور رہنے کی شرائط بتائیں۔ کھانا مشترکہ طور پر تینوں باری باری پکائیں گے۔ برتن دھونے اور فلیٹ صاف کرنے کی بھی باری تھی۔ صابن' ٹوتھ پیسٹ اور صفائی کے سامان سمیت کھانا پکانے کا تمام سامان مشترکہ طور پر خریدا جاتا تھا۔ فون کے لئے صرف مقامی کالوں کا کنکشن لیا گیا تھا' فلیٹ کا کرایہ ۱۲۰ ڈالر تھا یعنی چالس ڈالر فی کس' گراسری' بجلی اور فون کا خرچ بانٹنے کے بعد تیس سے چالیس ڈالر فی کس کا اوسط آتا تھا۔ سلیم کے لئے حساب کتاب بالکل صحیح تھا۔ اس کا بجٹ سو ڈالر ہفتے کا تھا۔ اس کے رہنے اور کھانے پینے کے تمام اخراجات کے بعد بھی اس کے پاس دوسرے خرچوں کے لئے بیس تیس ڈالر بچ جاتے۔ سلیم کو ہر چیز ٹھیک اور اپنی ضرورت اور بجٹ کے مطابق لگی۔ احمد کے ہاں کہنے پر وہ دوسرے ہی روز

سرے ہلز سے اپنا سامان لے کر فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔

سلیم کی زندگی چند ہی دنوں میں اپنے ڈھب پر آ گئی۔ اپنے رہنے کا یہ انتظام اسے اس لئے بھی اچھا لگا تھا کہ اسے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے نوکری کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ نوکری کرنے میں اسے کوئی عار نہیں تھا' وہ محنت کرنے کا عادی تھا۔ نوکری ملنا کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔ سرے ہلز میں تبلیغی جماعت والے خان صاحب نے جن کی گراسری کی دکان تھی اسے پیش کش کی تھی کہ وہ اسے ہفتے میں چند گھنٹے کا کام دے سکتے ہیں۔ ایسی ہی پیش کش وکالت کرنے والے مولانا نے بھی کی تھی جو اسے اپنے استقبالیہ کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔ وہ ری سپشن پر کسی نامحرم لڑکی کو رکھنے کے قائل نہیں تھے اور کہتے تھے کہ لڑکیوں کی مسکراہٹ دکھا کر کاروبار کرنے کو وہ حرام سمجھتے ہیں اس لئے ان کے دفتر میں ری سپشن پر اکثر داڑھی والے لڑکے دکھائی دیتے تھے جن کا تعلق ان کی تبلیغی جماعت سے ہوتا تھا اس میں دونوں کا فائدہ تھا۔ وکیل کو کم پیسوں میں زیادہ محنت کرنے والے کارکن مل جاتے' ان کی آخرت بھی سنورتی رہتی اور ساتھ ہی لڑکوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ نکل آتا جو پڑھائی جاری رکھنے کے لئے بہت ضروری تھا۔ سلیم نوکریاں کرنے کے بجائے تمام وقت اپنے ریسرچ پر لگا کر کم از کم چھ مہینے بچا سکتا تھا۔ پھر ایک دفعہ کمائی شروع کرنے کے بعد ڈالروں کی لالچ ایک نہ ختم ہونے والا چکر شروع کر سکتی تھی۔

اس سلسلے میں سلیم کا تیسرا فلیٹ میٹ علی ایک بالکل مختلف شخص تھا۔ وہ بھوت کی طرح نوکری اور یونیورسٹی دونوں سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ پڑھائی اور نوکری کی ۲۴ گھنٹے جاری رہنے والی مشقت میں گرفتار تھا۔ رات کے نو سے صبح تین بجے تک جز وقتی طور پر ٹیکسی چلاتا تھا۔ صرف چار گھنٹے سو کر اٹھتا تو فجر کی نماز پڑھتا اور فلیٹ میں اپنے حصہ کا کام نمٹا کر یونیورسٹی چلا جاتا۔ علی اسٹرکچرل انجنیئرنگ میں ماسٹرز کر رہا تھا۔ سلیم کو اپنی ریسرچ میں اس سے گفتگو کر کے بہت مدد مل سکتی تھی۔ لیکن علی کے پاس تو سونے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ ویک اینڈ پر وہ قرآن پڑھانے کے ٹیوشن کرتا تھا'

صبح نکلتا تو شام کو واپس آتا۔ اسے ہفتے بھر کے دوران بیچ میں جو بھی وقت ملتا وہ اونگھنے یا سونے میں گزار دیتا۔ اس سے تھوڑی بہت گفتگو صرف اس وقت ہوتی جب وہ اپنی باری والے دن کھانا پکاتا یا برتن دھو رہا ہوتا۔

احمد جکارتہ کی ایک یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کا لیکچرار تھا اور ڈاکٹریٹ مکمل کر کے واپس جا کر اس یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو جاتا۔ وہ ظہور اسلام سے قبل یہودی اور عیسائی مذاہب کی چپقلش کے بعض پہلوؤں کی تحقیق کر رہا تھا۔ اس کا سپروائزر ایک آزاد خیال یہودی تھا جس کے ساتھ احمد کو کام کرنے میں دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ صرف اس لئے نہیں کہ وہ یہودی تھا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ مذاہب کے بارے میں اس کا رویہ بہت بے باک تھا۔ وہ مذاہب پر عقیدوں کے حوالے سے نہیں فلسفیانہ نقطہ نظر سے بحث کرنا چاہتا تھا۔ احمد کے لئے مذہب نسلی شناخت کا ذریعہ یا جدی روایتیں نباہنے کا عمل اور آنکھ بند کر کے یقین کرنے کا معاملہ تھا۔ اپنے اپنے نقطہ نظر کے اعتبار سے دونوں کے درمیان میلوں کا فاصلہ تھا اور کوئی بھی اپنی جگہ سے ایک انچ کھسکنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

سلیم اپنے سپروائزر کے معاملے میں بہت خوش قسمت تھا۔ دوستوں کی طرح سلوک کرنے والا اس کا سپروائزر سوئڈش آسٹریلین تھا۔ سلیم نے شروع ہی سے محنت کر کے صرف اسے نہیں بلکہ اپنے پورے ڈیپارٹمنٹ کو متاثر کیا تھا۔ سلیم نے ایک تھرماس اور لنچ بکس پر سرمایہ کاری کی تھی جو اس کے بہت کام آئی تھی۔ تھرماس میں چائے بھر کر اور دوپہر کو کھانے کے لئے لبنانی روٹی اور سالن لنچ بکس میں ڈال کر وہ صبح ہی صبح یونیورسٹی آ جاتا اور رات کو کم از کم آٹھ بجے تک یونیورسٹی میں رہتا۔ ہفتے میں چھ دن اس کا یہی معمول تھا صرف اتوار کو وہ گھر پر رہتا۔ اس نے گھر کی صفائی کے لئے اپنا یہی دن مقرر کیا تھا۔ سلیم صبح ہی صبح اٹھ کر صفائی سے فارغ ہو جاتا۔ ناشتہ کرتے ہوئے دس سے گیارہ بجے تک ایف ایم پر آسٹریلیا بھر کے لئے نشر ہونے والا ایس بی ایس ریڈیو کا اردو پروگرام سنتا۔ پاکستان کی خبریں سن کر دیر تک کڑھتا رہتا اور پھر لانڈری کر کے کھانا پکانے میں لگ جاتا۔

کھانا کھا کر سلیم کوجی کے ساحل کی طرف نکل جاتا۔

سلیم کو پہلا ثقافتی صدمہ اسی ساحل پر پہنچا تھا۔ یہ صدمہ اس لئے بھی شدید تھا کہ اس نے آسٹریلیا آ کر مسجد میں آنکھ کھولی تھی۔ ایئرپورٹ سے سیدھا مسجد پہنچا دیا گیا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی پوری طرح آنکھیں کھول نہیں پایا تھا کہ وہاں بھی مسجد اور پھر اس کے ذریعے شرع کے سخت پابند دو مسلمانوں کے ساتھ ایک اور اسلامی ماحول میں منتقل ہو گیا تھا۔ آسٹریلیا میں ابھی تک وہ صرف اسلام کا چہرہ ہی دیکھ سکا تھا' صحیح آسٹریلوی ثقافت کی جھلکیاں اسے پہلی بار ساحل پر دیکھنے کو ملیں۔

ساحل بڑی عمدگی سے بنایا گیا تھا۔ اس کا قدرتی کٹاؤ بہت خوبصورت تھا پھر نصف دائرے کی شکل میں ٹائلوں سے بنائی ہوئی سیڑھیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ساحل پر دائیں جانب کا حصہ سرفنگ کے لئے مخصوص تھا۔ بے شمار بچے اور نوجوان انڈے کی شکل کے لمبے رنگ برنگ کے تختے اپنے سینے کے ساتھ لپٹائے سمندر کی لہروں پر سواری کرنے کا کھیل کھیل رہے تھے۔ سلیم کافی دیر تک تختے سے لپٹے ان جوانوں کو اونچی اونچی لہروں کے ساتھ اوپر ہوتا اور اترتا دیکھتا رہا۔ وہ ان کی مہارت اور بے خوفی پر حیران تھا۔ ساحل کے انتہائی بائیں جانب کچھ بڑے اپنے بچوں کے ساتھ پتنگیں اڑا رہے تھے بہت لمبی دموں والی بڑی بڑی پلاسٹک کی بنی ہوئی پتنگیں جو سلیم نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھیں۔ لیکن سب سے زیادہ حیران کن منظر ساحل کے درمیانی حصے میں تھا۔ یہاں عورتیں اور مرد سمندر میں نہانے کے بعد ریت پر چادر پھیلائے سیدھے یا الٹے لیٹے تھے' کچھ کتابیں پڑھ رہے تھے اور کچھ نے شاید آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔ عورتیں برائے نام رنگ برنگے سوئمنگ کاسٹیوم پہنے ہوئے تھیں۔ سلیم کی آنکھیں ان رنگوں کا جائزہ لیتی ہوئی اچانک ایک جگہ رک گئیں۔ اس جسم پر کوئی رنگ نہیں تھا۔ اس کے سنہرے بال سر کے نیچے تکیہ بنے ہوئے ہاتھوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا اور اس کے بعد کچھ نہیں تھا۔ سلیم کی نگاہیں تھوڑی دیر کے لئے وہیں اٹکی رہ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہیں کوئی اسے دیکھتے ہوئے دیکھ تو نہیں رہا۔ اس نے سامنے

نظریں اٹھائیں تو پانی میں سے ایک لڑکی ہنستی ہوئی باہر نکل رہی تھی۔اس کے جسم کے بالائی حصہ پر بھی کچھ نہیں تھا۔ وہ بھی ریت پر بچھی ہوئی ایک چادر پر بیٹھ کر تولیہ سے اپنا جسم خشک کرنے لگی۔ سلیم نے ذرا غور کیا تو اسے چادروں پر لیٹے ایسے کئی جسم نظر آئے جو انگیا کی کسی چھوٹی دھجی سے بھی محروم تھے۔ لیکن ابھار وہی سب سے اچھا تھا جو اس نے سب سے پہلے دیکھا تھا۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے بڑی مہارت کے ساتھ بہت خوشنما ریت کے دو ٹیلے ساتھ ساتھ بنا دیئے ہوں۔ جسموں کے اس کھیت میں اس نے دوبارہ نظر دوڑائی تو وہ اب الٹی ہو کر لیٹ گئی تھی۔ لیکن سلیم کو مایوسی نہیں ہوئی۔ اس کی کمر کے نیچے کی گولائیوں کے ابھار بھی کسی بت تراش کی مہارت کا کمال لگتے تھے۔ سلیم کا دماغ سن ہو گیا۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ یہ مناظر ساری محنت برباد کرنے تل گئے۔ واپس جاتے ہوئے اس نے پلٹ کر ایک بار پھر ساحل کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ سیدھی ہو گئی ہو! سلیم رات بھر خوابوں میں مصر کے اہراموں پر چڑھتا اور اترتا رہا۔

دوسرے دن یونیورسٹی میں اس نے اپنے سپروائزر سے اس بات پر حیرت ظاہر کی کہ ایک فیملی بیچ پر سینہ کھلی حسینائیں کس بے باکی سے غسل آفتابی کر رہی تھیں۔ سلیم نے یورپ کے نیوڈ بیچز یعنی عریاں ساحلوں کے بارے میں پڑھا تھا لیکن وہ عام ساحلوں سے الگ تھلگ ہوتے تھے اس کا خیال تھا کہ اس حمام میں سب کا ننگا ہونا ضروری ہوتا ہو گا۔ سلیم کا بوڑھا سپروائزر بہت ہنسا۔ سلیم اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ کس بات پر ہنسا تھا۔ پروفیسر نے بتایا کہ سوئمنگ کاسٹیوم کی وجہ سے جسم کے وہ حصے جو کپڑوں کی زد میں ہوتے ہیں سفید رہ جاتے ہیں اور جسم کی عریانی پر بدنما داغ کی طرح نظر آتے ہیں۔ لڑکیاں سمندر میں نہانے کے بعد اپنے حسن کی سب سے نمایاں خوبی پر پڑے ہوئے یہ سفید دھبے اور پشت پر انگیا کی ڈوری سے بنی سفید لکیر کو دھوپ دے کر باقی جسم کے رنگ سے ملاتی ہیں۔ سلیم صرف یہ سوچ کر رہ گیا کہ عام لڑکیوں کو اپنا جسم مکمل عریاں کر کے دکھانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہوگی۔ اس کے لئے تو وصل کا لمحہ گہرے اندھیرے میں نظر نہ آنے والے سایوں کے ایک دوسرے میں

ضم ہونے کا نام تھا۔ اسے حیرت تھی کہ ایسے میں جسم کے داغ دھبے دیکھنے کا مقام کب آتا تھا۔

ساحل پر سلیم نے جو منظر دیکھے تھے اس کے بعد اسے یونیورسٹی میں سرعام بوس و کنار کرتے ہوئے لڑکے لڑکیاں اور گرمیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چھوٹی چھوٹی نیکر اور مختصر سے باریک بلاؤز یا ٹی شرٹ پہنی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی۔ لیکن یونیورسٹی اسے ایک طلسم کدہ نظر آتی۔ ہر شخص ہنستا اور کھلکھلاتا ہوا جیسے کوئی غم انہیں چھو کر گزرا ہی نہ ہو۔ سیاسی' نظریاتی یا مذہبی اختلافات لائبریری کے ساتھ والے ورانڈے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھی ہوئی میزوں تک محدود تھے۔ ان میزوں پر بینر لگے ہوتے لٹریچر رکھا ہوتا اور ورکرز اپنی اپنی تنظیم کے پمفلٹ بانٹتے یا کسی مہم کے سلسلے میں دستخط کراتے ہوئے کسی رک جانے والے طالب علم کو اپنے دلائل دے رہے ہوتے۔ سوشلسٹ انٹرنیشنل' سوشلسٹ ورکرز' گرین لیفٹ' بائبل سوسائٹی' بھائی سوسائٹی' ایشیا کمبائنڈ' ہر طرح کی انجمنوں نے اپنے اپنے دن مقرر کئے ہوئے تھے۔ لائبریری کے مرکزی دروازے کے سامنے ایک بڑا سا لان تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا پلیٹ فارم بنا تھا جس پر طلبہ کا کوئی نہ کوئی آرکسٹرا ایک سے دو بجے تک کے لنچ کے وقفے میں اپنی آواز اور دھنوں کا کمال دکھا رہا ہوتا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ لان میں ایک دوسرے کی گود میں لیٹے یا تنہا بیٹھے اپنا سینڈوچ کھاتے ہوئے لڑکے لڑکیاں بہت انہماک سے موسیقی کے اس شور کو اپنے اندر جذب کرتے اور پھر دو بجتے ہی اپنے اپنے بھاری بیگ اٹھا کر کلاسوں یا لائبریری کی طرف بھاگ جاتے۔ کچھ بے فکر وہیں بیٹھے یا لیٹے رہتے یا کیمپس کے کسی کیفے میں جا کر تاش کھیلنے والوں کے ہجوم میں شامل ہو جاتے۔

تاش کی ایسی ہی میز پر ایک دن سلیم کو ایوان بھی ملی تھی۔ سلیم گھر سے لایا ہوا اپنا لنچ کھا کر پانی پینے ایک کیفے میں گھسا تھا کہ اس نے ایک میز کے گرد تاش کھیلنے والوں کے ساتھ ایوان کو بھی بیٹھے دیکھا۔ وہ کھیل نہیں رہی تھی لیکن کھیلنے والے

ایک لڑکے کو شہ دے رہی تھی۔ بالوں کی لمبی لمبی لٹیں، بے ترتیب سی داڑھی، دائیں کان میں ایک چھوٹی سی بالی، اور پھٹی ہوئی جینز پر چمڑے کی جیکٹ پہنے ہوئے یہ لڑکا اپنی شکل اور حلیے سے میوزیشن لگ رہا تھا۔ ایوان کی ساری توجہ تاش کے پتوں پر تھی اور اس کی آنکھوں اور حرکات میں جواریوں جیسا جوش تھا۔ ریس میں پیسہ لگانے والے ان جواریوں جیسا جن کا گھوڑا اول آنے کے لئے اپنے ساتھ دوڑنے والے گھوڑے سے آگے نکلنے کے لئے کوشاں ہو۔ ایوان کی گرمجوشی میں کچھ ایسی معصومیت تھی کہ اگر اسے مطلوبہ نتائج نہ ملے تو وہ اسی وقت ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ سلیم نے سوچا کہ اگر کبھی اسے جذباتی صدمے سے دو چار ہونا پڑا تو وہ زندہ کیسے رہ سکے گی۔ سلیم کو یہ جاننے کے لئے زیادہ عرصہ نہیں لگا۔

تاش کے پتے نئے بازی کے لئے پھینٹے جانے لگے تھے، ایوان نے نظریں اٹھا کر پانی پیتے ہوئے سلیم کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو اتنی زور سے "ہائے" کہی کہ سب چونک کر ایوان کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے سلیم کو دیکھنے لگے۔ ایوان اپنی کرسی چھوڑ کر سلیم کے پاس آئی اور لپک کر اس کے گال کا بوسہ لے کر بڑی تیزی سے اس کا احوال پوچھنے لگی۔ سلیم جو پہلے ہی اتنی توجہ حاصل ہونے پر جھینپا ہوا تھا اپنے گالوں پر ایوان کے بوسے کا دہکتا ہوا انگارہ پا کر سرخ ہو گیا۔ ایوان نے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو محسوس کیا تو اس کی زبان کی ریل گاڑی چھٹ پڑی۔

"تم واقعی بہت شرمیلے ہو، کتنے سرخ ہو گئے ہو۔ بھئی ہم فلیٹ میٹ نہ سہی دوست تو رہ سکتے ہیں۔ ویسے مجھے معلوم تھا کہ تم فون نہیں کرو گے۔ تم میری بلی سے ڈر گئے تھے۔" ایوان نے قہقہہ لگایا۔ سلیم بھی کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

"مجھے ایک دوست کے پاس جگہ مل گئی تھی وہ بھی اکیلا تھا میں نے سوچا تمہیں اب کیوں تنگ کروں۔" سلیم نے عذر پیش کیا۔

"آؤ تمہیں کافی پلواؤں۔" ایوان نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں شکریہ میرے پاس چائے ہے۔" سلیم نے بیگ سے اپنا تھرماس نکالتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں کی کافی پیو گے تو صبح کی بنی ہوئی باسی چائے کو بھول جاؤ گے۔ یہ ا۔سمس Esmes کیفے ہے۔ بے فکروں کی جنت۔ یہاں کی کافی بھی دوسرے تمام کیفوں سے مہنگی ہے پھر بھی سب گھوم پھر کر یہیں آتے ہیں۔ اپنی اپنی کلاسوں اور لائبریریوں سے فارغ ہو کر یہیں جمع رہتے ہیں۔ یہیں تاش کھیلتے ہیں لنچ کرتے ہیں' اپنا اسائن منٹ لکھتے ہیں' کتابیں پڑھ کر نوٹس بناتے ہیں' ڈیٹس کرتے ہیں' میں نے اپنا تھیس کا دوسرا چیپٹر یہیں لکھنا شروع کیا تھا۔ پہلا اس لئے نہیں لکھا کہ وہ ابھی تک لکھا ہی نہیں۔ میرا سپروائزر کہتا ہے کہ پہلا چیپٹر آخر میں لکھنا چاہیے۔" سلیم حیران تھا کہ ایوان تیزی سے بولتی ہوئی کتنی آسانی سے ایک سے دوسری بات کا موڑ کاٹتی ہے۔ کافی کے لئے وہ ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو گئے۔

"لیکن وہ تمہارا دوست۔" سلیم نے تاش کھیلتے ہوئے اس لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کے پاس سے اٹھ کر ایوان اس کے پاس آئی تھی۔

"بابی؟ اسے تو پتہ بھی نہیں چلا کہ میں اب اس کے پیچھے نہیں بیٹھی ہوں۔ یہ تاش چیز ہی ایسی ہے۔ سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ میں نہیں کھیلتی صرف تاش کھیلتے ہوئے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر مزا لیتی ہوں۔ بابی اور اس کی گرل فرینڈ آج کل ذرا کھنچے کھنچے ہیں۔ بابی سوشلسٹ انٹرنیشنل والوں کے ساتھ ہے اور ٹراٹسکی کو خدا مانتا ہے۔ اس کی گرل فرینڈ گرین لیفٹ میں شامل ہے جو ہرے بھرے پیڑوں کو اپنا دیوتا سمجھتے ہیں۔ سڑک نکالنے کے لئے پیڑ کاٹنے کے خلاف احتجاج میں شامل ہو کر پچھلے دنوں گرفتاری بھی دے چکی ہے۔ اس کے اور بابی کے گروپوں میں سخت جھگڑا ہے۔ دونوں جب بھی بحث شروع کرتے ہیں وہ آخر میں جھگڑے پر ختم ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی گرل فرینڈ اسائن منٹ کرنے لائبریری چلی جاتی ہے اور بابی یہاں بیٹھا تاش کھیلتا رہتا ہے۔ لیکن شام کو دونوں ساتھ گھر جاتے ہیں کیونکہ ایک ہی فلیٹ میں ساتھ رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ دو تین دن میں جھگڑا بھول کر یہیں ایک دوسرے کی گود میں بیٹھے تاش کھیل رہے ہوں گے۔"

ایوان بے تکان بولے چلی جا رہی تھی۔ کافی کے لئے ان کی باری آ گئی تھی

اس لئے مجبوراً" اسے اپنی توجہ کاؤنٹر پر سرو کرنے والی عورت کی طرف کرنی پڑی۔ سلیم کی کافی کے پیسے بھی ایوان نے دیئے۔ سلیم نے دینے کی کوشش کی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہاں اپنے اپنے پیسے دینے کے ڈچ نظام کی بڑی سختی کے ساتھ پیروی ہوتی ہے۔ لیکن ایوان نہیں مانی۔ دونوں اپنی کافی لئے پورے کیفے میں گھومے۔ کوئی میز خالی نہیں تھی اس لئے بہت سے دوسرے لڑکے لڑکیوں کی طرح وہ بھی دیوار سے ٹیک لگا کر نیچے لکڑی کے چکنے فرش پر بیٹھ گئے۔ سلیم نے اس سے پہلے بھی ایک دفعہ اسلام آباد میں "کپاچینو" کافی پی تھی لیکن آج اس کا مزا ہی کچھ اور تھا۔ پیالی سے دو انچ اوپر اٹھا ہوا دودھ کا بالائی جیسا جھاگ جس پر چاکلیٹ کے چھینٹے پڑے تھے شکل اور مزے دونوں میں اچھا لگا۔ لیکن بے فکروں کی طرح زمین پر پاؤں پھیلا کر بیٹھے ہوئے ایک حسین لڑکی کے ساتھ کافی پینا شکل اور مزے سے زیادہ اچھا اور مزیدار لگ رہا تھا۔ ایوان نے اپنی بات وہیں سے پھر شروع کر دی تھی جہاں سے چھوڑی تھی۔

"میں کسی بھی گروپ میں شامل نہیں ہوں اور ہر گروپ میں شامل ہوں۔ جو بھی کوئی اچھا کام کرے اس میں شریک ہو جاتی ہوں۔ سوشلسٹ انٹرنیشنل والوں نے گلف وار کے خلاف احتجاجی ریلی کی تھی۔ بابی کے ساتھ میں بھی اس میں شامل تھی۔ ہم امریکی قونصل خانے کے سامنے ہائیڈ پارک میں آدھی رات تک موم بتیاں جلائے امن کے گیت گاتے اور امریکہ کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ بابی کی گرل فرینڈ کے ساتھ میں درختوں کی کٹائی رکوانے کے لئے ایک جنگل میں دو دن تک کیمپ لگائے رہی۔ ایک دفعہ تو میں "گے اور لزبین" (ہم جنس پرست مرد اور عورتوں) کے حقوق کے لئے کئے گئے مظاہرے میں بھی شریک ہوئی تھی۔ ان بے چاروں کے ساتھ اس معاشرے میں بہت امتیازی سلوک ہوتا ہے۔ میں اس بات پر ان کی پوری طرح حامی ہوں کہ کسی کی جنسی ترجیحات میں دخل دینے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔"

سلیم کے لئے ان سب باتوں کو ہضم کرنا مشکل تھا۔ وہ ان پر زیادہ توجہ بھی نہیں دے رہا تھا۔ کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھی ایوان کے جسم سے پھوٹتی ہوئی خوشبو

اس کے نتھنوں تک پہنچ کر مسحور کیے دے رہی تھی۔
"تمہاری گرل فرینڈ کہاں ہے؟" اس اچانک سوال نے سلیم کا توازن ایک دم گڑبڑ کر دیا۔
"میری۔ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔ میرے پاس دراصل اس طرح کی دوستیوں کا وقت ہی نہیں ہے۔ میں تو اپنی ریسرچ ختم کر کے جلد از جلد پاکستان واپس جانا چاہتا ہوں۔" سلیم نے شرمندہ ہوئے بغیر حقیقت بیان کر ڈالی۔
"لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ پڑھائی سے کبھی کبھی وقفہ' قربت کا کوئی رشتہ' دل و دماغ اور بدن کی کوئی کھڑکی' کوئی روشن دان تو کھلا ہونا چاہئے۔ صرف پڑھائی تمہارے دماغ میں سوجن بن کر دکھنے لگے گی اور جسم میں جذبے گھٹ کر سڑ جائیں گے۔" ایوان ایک دم ماہر نفسیات بن گئی۔
"میں ابھی تک تو ٹھیک ہوں۔ لیکن کبھی ضرورت پڑی تو تمہاری خدمات حاصل کروں گا۔" سلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ ہر اتوار کو وہ کوجی بیچ پر قدرت کے صناعی کے نمونے دیکھتا ہے اور لمبے لمبے سانس لے کر اپنی گھٹن سمندر میں ڈبو دیتا ہے۔
"میں اتنے اسمارٹ آدمی کو اس طرح ضائع نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری شخصیت بہت پر کشش ہے مجھے یقین ہے تم پر بہت لڑکیاں مرتی ہوں گی۔" سلیم کی سمجھ میں نہیں آیا وہ ایوان کی اس بات کا کیا جواب دے۔ سلیم خاصا خوش شکل تھا۔ نکلتا ہوا قد' کھلا ہوا رنگ' گھنے سیاہ بال' چوڑی پیشانی' بھنویں گھنی اور ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر اس کے ایک قیافہ شناس دوست نے کہا تھا کہ ایسے لوگ بھروسے کے قابل نہیں ہوتے۔ مونچھیں بھی بھنوؤں کی طرح گھنی اور بے ترتیب تھیں' چہرے پر پھیلی سنجیدگی سے وہ بہت گھمبیر نظر آتا لیکن ہونٹوں پر ہنسی کھلتے ہی اس کی سنجیدگی پگھل جاتی۔
اسے زندگی نے یہ مواقع کبھی نہیں دیئے تھے کہ وہ اپنے اوپر مرنے والی لڑکیوں کی تعداد گن سکتا یا اسے اپنے پر کشش ہونے کا پیمانہ بنا کر فخر کر سکتا۔ وہ اب

ایوان کو کیا بتاتا کہ وہ تو پہلے ہی ضائع ہو چکا ہے۔

"میں تمہیں اپنی نئی فلیٹ میٹ سے ملواؤں گی۔" ایوان نے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع کر کے اسے چونکا دیا۔ "میں تمہیں بتانا بھول گئی کہ تم جب میرا فلیٹ دیکھ کر گئے تھے اس کے بعد ہی میرے بوائے فرینڈ نے نتاشا کے لئے فون کیا تھا۔ وہ نیو کیسل کے اسی شہر میں رہتی تھی جہاں ڈیوڈ کام کرتا ہے لیکن اب نوکری کی تلاش میں سڈنی آگئی ہے۔ ڈیوڈ کی سفارش پر میں نے اسے کمرہ دے دیا ہے۔ بہت سوئٹ اور بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ تم دیکھو گے تو دیکھتے رہ جاؤ گے۔ تمہیں پتہ ہے کوئی عورت کسی دوسری عورت کے حسن کی تعریف نہیں کرتی خاص طور پر ایسی عورت کی جسے وہ جانتی ہو اور جس سے اس کا تعلق بھی ہو۔ لیکن نتاشا واقعی ایسی ہے کہ تعریف کی جائے۔ تمہاری قسمت اچھی ہے کہ اس کا آج کل کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ میں تمہیں اس سے ملواؤں گی ڈیوڈ اگلے ہفتے آئے گا تو ہم چاروں مل کر ڈنر پر جائیں گے۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں ضرور پسند کرے گی۔" ایوان نے اپنے طور پر دونوں کی جوڑی ملا دی اور اپنی کافی ختم کر کے پیالی زمین پر رکھ دی۔ سلیم ایک ایک گھونٹ کافی کا مزا لے رہا تھا۔ سلیم کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر ایوان کی ریل گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔

"بابی نے نتاشا کو دیکھ کر مجھ سے مذاق میں کہا تھا وہ نیو کیسل میں رہنے والی ڈیوڈ کی دوسری محبوبہ ہے اور اب تمہاری چھٹی کرنے سڈنی آ گئی ہے۔ لیکن ڈیوڈ ایسا نہیں ہے۔ وہ بے وفائی نہیں کر سکتا۔ پتہ ہے وہ اس ویک اینڈ پر آئے گا تو ہفتے بھر یہیں رہے گا۔ اگلے ہفتے جب کرسمس کی چھٹیاں شروع ہوں گی تو ہم مل کر ملبورن جائیں گے۔ مجھے ابھی بہت سی شاپنگ کرنی ہے۔ بہت سارے تحفے خریدنے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں لیکن میرے سات بہن بھائی ہیں۔"

"وہ کیسے۔" سلیم نے حیرت ظاہر کی وہ بہت دیر سے انتظار کر رہا تھا کہ ایوان کی ریل گاڑی کسی اسٹیشن پر رکے تو وہ بھی کچھ بولے۔

"وہ ایسے کہ میری ماں نے میرے باپ سے پہلے ایک اور شادی کی تھی اس سے جو میری نصف بہن ہے وہ وہیں ملبورن میں رہتی ہے اور ایک اسکول میں پڑھاتی ہے۔ میری ماں نے میرے باپ سے طلاق کے بعد جس سے شادی کی اس کے پہلے سے ایک بیٹا تھا اور اب میری ماں سے اس کی دو بیٹیاں ہیں۔ میرے باپ نے جو دوسری شادی کی اس سے ان کا ایک بیٹا ہوا ہے جبکہ میرے باپ کی نئی بیوی سے ایک بیٹی اور ایک بیٹا پہلے سے ہیں۔" سلیم کو رشتوں کی یہ داستان سن کر چکر آ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا ایوان اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں جاتی ہوں۔ مجھے اپنے سپروائزر سے ملنا ہے۔ نتاشا کل میرے ساتھ یونیورسٹی آ رہی ہے۔ تم ایک بجے یہیں اسمیس میں ملنا ساتھ کافی پئیں گے، میں نتاشا سے تمہارا تعارف بھی کرواؤں گی۔" یہ کہتے ہی جس تیزی سے آئی تھی جس تیزی سے وہ بول رہی تھی اس سے زیادہ تیزی سے اپنا بھاری بیگ کندھے پر لٹکا کر کیفے سے نکل گئی۔

سلیم اسمیس سے یہ سوچ کر اٹھا تھا کہ وہ کل ہی نہیں بلکہ کبھی بھی اس گلی سے نہیں گزرے گا۔ اس کے پاس ایوان اور نتاشا جیسے مقامات پر رک کر سستانے کے لئے وقت نہیں تھا آوارگی کے لئے اتوار کو کوجی کے ساحل پر گھومنے کی عیاشی کافی تھی۔

اس کے باوجود ایک بجے کے قریب اس کے قدم خودبخود اسمیس کافی شاپ کی طرف اٹھ گئے۔ اس کے اندر بہت بحث ہوئی تھی لیکن نہ جانے والی ہر وزنی دلیل کو اس نے کوئی نہ کوئی جواب دلیل دے کر قائل کر دیا تھا۔ وہ ایک بجنے سے پانچ منٹ پہلے ہی اسمیس کیفے پہنچ گیا۔ ایوان اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ ایک میز پر جہاں تاش کھیلے جا رہے تھے وہاں نہ تو بابی تھا اور نہ ہی اردگرد بیٹھنے والوں میں ایوان تھی۔ سلیم آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا باہر آیا تو اسے ایوان ایک لڑکی کے ساتھ نظر آئی۔ وہ یقیناً" نتاشا تھی کیونکہ وہ واقعی ایسی ہی حسین تھی جیسا ایوان نے بیان کیا تھا۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے پلک جھپکنا بھول سکتا تھا۔ لیکن سلیم کو پھر

بھی ایوان زیادہ اچھی لگی۔ قد اور حسن میں وہ نتاشا سے دبتی ہوئی تھی لیکن اس کے حسن میں جو معصومیت اور سادگی تھی اس نے سلیم کی نظر میں اسے نتاشا سے زیادہ پرکشش بنا دیا تھا۔ ایوان اسے ایسی لگی تھی جسے بکھرنے سے بچانے کے لئے کوئی بھی بانہوں میں سمیٹنے کو تیار ہو۔ جبکہ اس کے مقابلے میں نتاشا کا حسن ایک چیلنج کی طرح تھا۔ جسے دیکھ کر رال تو سب کی ٹپکتی ہو لیکن اس کے قریب جانے کی ہمت ہر ایک میں نہ ہو۔ نتاشا کا بدن بھرا بھرا تھا' بہت رسیلے سے ہونٹ جن پر دہکتے ہوئے گلابوں کو لپ اسٹک کی ضرورت نہیں تھی۔ ماتھے اور شانے پر بکھرے ہوئے زردی مائل سنہرے بالوں کی لٹیں گالوں کو چھو کر سینے کو چوم رہی تھیں۔ جینز نئے فیشن کی تھی۔ افقی خط کی شکل میں بیچ ران سے ادھڑی ہوئی۔ چیز کلاتھ کا سلکی سا ڈھیلا بلاؤز جس کے اندر کالے رنگ کی انگیا سینے کے ابھاروں کو ابلنے سے بمشکل روکے ہوئے تھی۔ سلیم کو یقین تھا کہ اس کے ابھار بالکل اس لڑکی جیسے ہوں گے جسے اس نے ایک اتوار کوجی بیچ پر غسل آفتابی کرتے دیکھا تھا۔ اونچے اوپر کو اٹھے سیدھا آسمان کو دیکھتے ہوئے۔ ریت کے دو ہموار ٹیلوں جیسے۔ سلیم اس خیال پر شرمندہ ہوا کہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کپڑے اتار کر اندر سے بدن ٹٹولنے کی گندی عادت میں مبتلا ہو رہا تھا۔

ایوان نے قریب آتے ہی کل کی طرح اس کے گال پر بوسہ ثبت کیا۔ لیکن سلیم کل کی طرح بالکل سرخ نہیں ہوا۔ بس گلابی ہو کر رہ گیا۔

"یہ نتاشا ہے میری نئی فلیٹ میٹ اور نتاشا یہ سالیم ہے۔" ایوان نے تعارف کرایا۔ سلیم کو کوئی ایسا آسٹریلوی نہیں ملا تھا جو اس کا بہت آسان سا نام صحیح طرح پکار سکتا۔ اس نے شروع میں تصحیح کی کوشش کی تھی لیکن پھر سلیم کے سالیم ہونے پر قانع ہو گیا تھا۔

"آپ بھی پڑھتی ہیں۔" سلیم کو معلوم تھا کہ وہ نہیں پڑھتی ہو گی کیونکہ اس کے کندھے پر وہ بڑا سا بھاری بیگ نہیں تھا جو یونیورسٹی میں پڑھنے والوں کے جسم کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ پھر بھی پوچھنے میں کیا حرج تھا۔

"نہیں میں ایک ریسرچ کمپنی میں ڈیٹا انٹری کا کام کرتی تھی۔ اب سڈنی میں

بھی ایسا ہی کوئی کام ڈھونڈ رہی ہوں۔" نتاشا کی آواز میں بھی ایوان جیسی نرمی یا تیزی نہیں تھی۔ کھرکھراتی ہوئی آواز تھی۔ لہجہ مشرقی یورپ سے آنے والے نئے نئے باشندوں جیسا تھا۔

"نتاشا ابھی دو تین سال پہلے ہی آسٹریلیا آئی ہے۔ یہ یوگو سلاویہ کی ہے۔" ایوان نے اپنی ریل گاڑی شروع کی ہی تھی کہ نتاشا نے اسے ٹوک دیا۔

"یوگو سلاویہ کی نہیں کروئشیا کی۔" یوگو سلاویہ کے ٹوٹنے کے بعد جو ریاستیں آزاد ہوئی تھیں وہ اپنی شناخت کے معاملے میں بہت جذباتی تھیں۔ کافی کی قطار کل کی طرح طویل نہیں تھی۔ آج جمعہ کا دن تھا اس لئے ویک اینڈ شروع کرنے کے لئے سب کو بھاگنے کی جلدی تھی نتاشا نے ہاٹ چاکلیٹ لی تھی اور اس کے پیسے خود دیئے تھے جبکہ ایوان نے آج بھی سلیم کے تمام تر احتجاج کے باوجود اس کی کافی کے پیسے ادا کئے تھے۔ انہیں ایک میز بھی خالی مل گئی۔ گفتگو حسب معمول ایوان کر رہی تھی۔ وہ شاپنگ کرنے جانے والی تھی اس لئے بتا رہی تھی کہ وہ کس کس کے لئے کیا کیا خریدے گی۔ نتاشا صرف سن رہی تھی لیکن اس کی ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی آنکھوں سے سلیم سمجھ گیا کہ وہ ذہنی طور پر یہاں نہیں تھی۔ اس نے سلیم کو ایک بار بھی نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ سلیم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی کشش کی آزمائش کے پہلے ہی امتحان میں ناکام ہو گیا ہے۔ ویسے سلیم نے اس پر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ خوفزدہ تھا کہ ایوان اپنے منصوبے کے مطابق نتاشا سے اس کی جوڑی لگانے میں کامیاب ہو گئی تو وہ کس طرح جان چھڑائے گا۔

"مجھے کسی سے ملنا ہے' میں اب جاؤں گی۔" نتاشا گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ڈیوڈ آ گیا ہو گا اسے ہائے کر کے میں بھی شاپنگ پر جاؤں گی۔ اس دفعہ میں ڈیوڈ کو ایسا تحفہ دوں گی کہ وہ حیران رہ جائے گا۔ تم مجھے اپنا فون نمبر دے دو' ویک اینڈ پر ڈنر کا پروگرام بنا تو میں تمہیں فون کروں گی۔" یہ کہتی ہوئی ایوان بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ سلیم اپنا فون نمبر دے کر دونوں کو جاتا ہوا دیکھتا اور اپنی ٹھنڈی ہو جانے والی

کافی پیتا رہا۔

سلیم کو دوبارہ پڑھائی کے موڈ میں آنے کے لئے ایک دو گھنٹے لگے تھے' ضائع ہوئے اس وقت کی کمی پوری کرنے کے لئے وہ رات کو دس بجے تک یونیورسٹی میں کام کرتا رہا۔ جب رات گئے گھر پہنچا تو اپنی کتابوں میں سر کھپاتے ہوئے احمد نے اسے بتایا کہ اس کے لئے ایوان نامی کسی لڑکی کا دو تین بار فون آ چکا ہے اس نے فوری فون کرنے کے لئے کہا ہے۔ سلیم کو احمد کے لہجے میں شبہات چھپے نظر آئے۔ سلیم کو معلوم تھا کہ ایوان نے کل ڈنر کا پروگرام بنا لیا ہو گا لیکن وہ ایک بار پھر ایوان اور نتاشا کے چکروں میں نہ پڑنے کا خود سے وعدہ کر چکا تھا۔ اس نے اگر ایوان کو فون کر دیا تو وہ پھر نہ نہیں سنے گی۔ اس لئے عافیت اسی میں تھی کہ اسے فون کرنے سے گریز کیا جائے۔ سلیم کو کل منظر اور ظہیر نے بلایا تھا اور چودھری انور نے کہا تھا کہ وہ اتوار کسی ساحلی تفریح گاہ پر گزاریں گے۔ سلیم ہفتے کو صبح ہی صبح یونیورسٹی چلا گیا۔ پروگرام کے مطابق ڈیرے پر ایک ہنگامہ پرور رات اور اتوار کو "انٹرنس" کے بہت خوبصورت ساحل پر ایک بہت اچھا لیکن تھکا دینے والا دن گزارنے کے بعد وہ رات گئے واپس آیا تو احمد حسب معمول جاگ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ آج رات اس لڑکی کا پھر فون آیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ پیر کو سلیم اےسمیس میں اس سے ضرور ملے۔ سلیم نے سوچا وہ کل ایوان کو بتا دے گا کہ اسے نتاشا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اس کا جوڑا بنانے کی کوشش نہ کرے۔

پیر کو سلیم اےسمیس پہنچا تو ایوان تاش کھیلے جانے والی میز پر نہیں تھی۔ نہ ہی وہ سامنے کے کسی ستون یا دیوار سے ٹک کر بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ وہ اندر تک گیا تو اسے دائیں ہاتھ کے ایک دور افتادہ اور نیم تاریک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ وہ کتاب کے ورق الٹ پلٹ رہی تھی۔ سلیم کو اس کا چہرہ صاف طور پر دکھائی نہیں دیا۔ وہ نزدیک پہنچا تو ایوان نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ سلیم کو وہ پہلے جیسی ایوان نہیں لگی۔ شگفتہ شگفتہ سی ہر وقت مسکرانے والی ایوان بالکل اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔ اس کے بال ایسے تھے جیسے کئی دن سے کنگھی کر کے

سلجھائے نہ گئے ہوں۔ چہرہ ایسا جیسے ہفتوں سے دھلا نہ ہو۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں شاید کثرت گریہ سے سوجی ہوئی تھیں۔ "کیا ہوا ایوان۔" سلیم نے فرش پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ کوئی جواب دیئے بغیر اس نے اپنے دونوں ہاتھ سلیم کی گردن میں ڈال کر سر کندھے پر ٹکا دیا اور اس طرح جی چھوڑ کر روئی کہ سلیم کے لئے سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ سلیم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے بس اس کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ اس کونے میں جو اکا دکا لڑکے لڑکیاں بیٹھے تھے انہوں نے ایک دفعہ نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ سلیم کو اطمینان ہوا ورنہ اس نے سوچا تھا کہ ان کے گرد بھیڑ اکٹھی ہو جائے گی۔ ایوان کافی دیر تک روتی رہی۔ جب اس کا دریا اتر گیا اور سسکیاں ہلکی ہوئیں تو سلیم نے اس سے کہا وہ کافی لے کر آتا ہے۔ ایوان نے اپنا سر اٹھایا اور اپنی سوجی سوجی آنکھوں کو جن میں ابھی تک آنسو بھرے ہوئے تھے اپنے گھٹنوں پر رکھی کلائیوں پر ٹکا دیا۔ سلیم اس کے لئے کافی لینے اٹھ گیا۔

کافی لے کر پہنچا تو ایوان اپنی حالت پر قابو پا چکی تھی۔ گرم سیال کے ایک دو گھونٹ نے اسے اور سہارا دیا اور وہ سلیم کو سوال کرنے کا موقع دینے سے پہلے ہی بول پڑی۔

"ڈیوڈ بے وفا نکلا۔" جملہ چیخ کی طرح نکلا تھا اس نے رونے کے لئے ایک دفعہ پھر ہونٹ سکیڑے لیکن پھر سنبھل گئی۔ اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو اس کے انداز میں ہمیشہ والی تیزی نہیں تھی بلکہ وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر اور سنبھل سنبھل کر بول رہی تھی۔

"جمعہ کے دن میں تمہارے پاس سے اٹھ کر گھر گئی تو ڈیوڈ آیا ہوا تھا۔ میں اسے آرام کرتا چھوڑ کر شاپنگ کے لئے نکل کھڑی ہوئی۔ نتاشا بھی میرے ساتھ ہی نکلی تھی۔ اسے کہیں کسی سے ملنا تھا۔ میں ایسٹ گارڈن کے شاپنگ سینٹر پہنچی تو بیگ میں میرا پرس نہیں تھا۔ وہ میں نے شاید کتابوں والے بڑے بیگ میں ڈال دیا تھا۔ واپس گھر پہنچی تو میرے بیڈ روم میں ڈیوڈ اور نتاشا میرے بستر پر ایک دوسرے کی بانہوں میں لپٹے ہوئے ننگے پڑے تھے۔ وہ ایک دوسرے میں اتنے مگن تھے کہ انہیں

میرے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ میں پہلے تو سکتے میں رہ گئی پھر میرے ہاتھ میں جو آیا میں نے ان پر کھینچ مارا۔ وہ دیر تک بڑی ڈھٹائی سے اسی طرح پٹتے رہے پھر ڈیوڈ نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر مجھے مزید توڑ پھوڑ سے باز رکھا۔ دونوں کو اپنے کیئے پر ندامت نہیں تھی۔ میں شاید ڈیوڈ کو یہ سوچ کر معاف کر دیتی کہ وہ نتاشا جیسی جنسی بلی کے ساتھ خود کو تنہا پا کر پھسل گیا ہو گا یا شاید بہت دنوں سے بوائے فرینڈ سے محروم نتاشا نے اپنی تسکین کے لئے اسے پھسلا لیا ہو گا۔ لیکن ڈیوڈ نے مجھے یہ بتا کر بالکل ہی توڑ دیا کہ نتاشا سے اس کے تعلقات کئی مہینوں سے تھے۔ پچھلے دو مہینوں سے وہ نیو کیسل میں ساتھ ایک ہی فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ اور نتاشا سڈنی آئی اسی لئے تھی کہ ڈیوڈ بھی اپنی نوکری چھوڑ کر سڈنی آ رہا تھا۔ ڈیوڈ نے مجھے بتایا کہ کرسمس کے بعد وہ مجھے خود بتانے والا تھا لیکن اچھا ہوا کہ مجھے اس طرح معلوم ہو گیا۔ میں کرسی کے کونے پر ٹکی ہوئی حیرت سے یہ سب کچھ سنتی ہوئی اسے تکتی رہی۔ نتاشا اپنا سامان پیک کر کے پہلے ہی تیار کھڑی تھی' ڈیوڈ نے بھی بیگ میں اپنا سامان ڈالا اور نتاشا کے ساتھ میرے فلیٹ اور میری زندگی سے نکل کر چلا گیا۔" ایوان نے وقفہ لیا اور کافی کے گھونٹ لینے لگی۔ سلیم بڑی خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے ایوان نے تازہ دم ہو کر پھر بولنا شروع کیا۔

"وہ دونوں تو چلے گئے' لیکن اپنے ساتھ میری مسکراہٹ' میری روح' جینے کی لگن سب کچھ ساتھ لے گئے۔ میں رونا چاہتی تھی لیکن رو نہیں سکتی تھی۔ مجھے رونے کے لئے شاید کسی شانے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس رات مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں کتنی اکیلی ہوں۔ میں نے سوچنا شروع کیا تو کوئی ایسا دوست نظر نہیں آیا جسے سہارے کے لئے بلا سکتی۔ بابی تھا لیکن وہ اپنی گرل فرینڈ سے لڑ کر اس کا فلیٹ چھوڑ گیا ہے اور کچھ دنوں کے لئے اپنے کسی دوست کے پاس کینبرا گیا ہوا ہے۔ اس کی گرل فرینڈ میری اچھی دوست تھی لیکن مجھے معلوم ہے بابی سے ترک تعلق کے بعد وہ خود جذباتی بحران سے گزر رہی ہو گی۔ دوسرے جاننے والے بس ایسے ہیں جو سہارا کیا دیتے الٹا مذاق اڑاتے۔ تم پر دو ملاقاتوں میں ہی اعتبار کرنے کو دل چاہنے لگا

تھا۔ میں تمہیں فون کرتی رہی لیکن تم نہیں ملے۔ پھر میں نے اپنی بہن کو ملبورن فون کیا اس نے مجھے دلاسا دیا تو میں فون پر پہلی بار بلک بلک کر روئی مجھے ایسا لگا جیسے وہ فون پر نہیں مجھے گود میں لئے بیٹھی ہو۔ رات گئے کسی طرح میں سو گئی لیکن صبح میری بہن پہلی فلائٹ سے سڈنی آ گئی۔ اسے ڈر تھا کہ میں کہیں اپنی جان نہ لے لوں۔ میں نے سوچا تھا لیکن ڈیوڈ جیسے گھٹیا آدمی کے لئے جان دینا مجھے زندگی کی توہین محسوس ہوا۔ ڈیوڈ سے پہلے بھی میرے دو بوائے فرینڈ رہے ہیں لیکن ان سے میرا جذباتی رشتہ اتنا گہرا نہیں ہوا تھا' نہ ہی ان کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کے منصوبے بنائے تھے۔ اس لئے ان کا ساتھ چھوٹا تو اتنی تکلیف بھی نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ ساتھ اس طرح چھوٹا بھی نہیں تھا۔ ایک سڈنی چھوڑ کر چلا گیا تھا اور دوسرا اپنی پڑھائی میں اس طرح مصروف ہو گیا تھا کہ اسے مجھ سے ملنے کی فرصت نہیں رہی تھی۔ لیکن ڈیوڈ کے ساتھ تو شادی کر کے دنیا گھومنے' موسیقی کی دنیاؤں میں تہلکہ مچانے کے جانے کیسے کیسے منصوبے بنائے تھے۔ اور وہ میرے گھر میں میرے ہی بستر پر ایک لڑکی کے ساتھ داد عیش دے رہا تھا۔ دو ہفتے بعد کرسمس پر میں بڑے فخر سے اسے اپنے ماں باپ سے ملانے والی تھی۔ اب کس منہ سے ان کے پاس کرسمس منانے جاؤں گی۔ بابی مجھ سے ہمیشہ مذاق کرتا تھا کہ کسی اطالوی کا' خاص طور پر اطالوی موسیقار کا بھروسہ نہ کرنا' وہ لڑکیوں کو جوتوں کی طرح بدلتے ہیں۔''

ایوان سلیم کو دیکھے بغیر اپنی ساری بھڑاس نکالے جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سلیم سے نہیں اپنے آپ سے گفتگو کر رہی ہے۔ سلیم گنگ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سارے معاملے میں وہ کیا کہے اور کیا بولے۔ اس طرح کے تعلقات اور ان میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس کا رونا بند ہو گیا تھا ورنہ سلیم کو روتی ہوئی کسی لڑکی کو اور خاص طور پر ایوان جیسی لڑکی کو چپ کرانے کا بھی کوئی سابقہ تجربہ نہیں تھا۔ سلیم کچھ نہ کچھ کہنے کے لئے لفظ تلاش کر رہا تھا کہ ایوان اپنا چہرہ سلیم کی طرف کر کے پھر بولنے لگی۔

''میری بہن چلی گئی تو گھر مجھے کھانے کو دوڑنے لگا۔ تمہیں پھر فون کیا کہ

تھوڑی دیر تمہارے ساتھ گزاروں گی لیکن تم نہیں ملے۔ اتوار کی شام کو یونیورسٹی بھی سنسان پڑی ہوتی ہے۔ پڑوس کے رٹز سینما میں ایک کامیڈی فلم لگی وہ دیکھنے چلی گئی لیکن فلم میں بھی ہنسنے کے بجائے رونا آتا رہا۔ میں شام کو جلدی گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ جانے کیوں گھر جاتے ہی وہ منظر میری نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ بیڈ روم سے مجھے گھن آتی ہے۔ میری بہن نے دو روز رہ کر گھر بالکل ٹھیک کر دیا تھا۔ بیڈ روم کے فرنیچر کی جگہیں بھی بدل دی تھیں لیکن پھر بھی میں باہر صوفے پر سوتی ہوں۔ پلیز تم آج شام کو ضرور ملنا۔ مجھے یہ سب کچھ بھلانے کے لئے ایک دوست کی مدد کی ضرورت ہے۔" سلیم نے کچھ کہے بغیر صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایوان کی حالت دیکھ کر وہ منع نہیں کر سکتا تھا۔

"میں دو چار روز میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔ آنسوؤں کا آخری اسٹاک شاید تمہارے لئے بچا رہ گیا تھا۔ اس لئے ڈرو مت میں رو کر تمہیں تماشا نہیں بناؤں گی۔ اس موضوع پر بات بھی نہیں کروں گی۔ اس کتیا کے بچے کا نام تک نہیں لوں گی۔ بس ہم یونیورسٹی سے فارغ ہو کر شام کو پڑھائی سے تھوڑا سا وقفہ لیں گے گھومیں گے۔ باتیں کریں گے تم نئے نئے آسٹریلیا آئے ہو۔ میں تمہیں یہاں کے کلچر' یہاں کی تاریخ' یہاں کے لوگوں کے بارے میں بتاؤں گی۔ تم مجھے اپنی دنیا کے قصے سنانا۔ تمہاری دنیا کے بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ دو چار روز میں ٹھیک ہو کر تمہیں آزاد کر دوں گی۔" سلیم کو پہلی بار اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آتی نظر آئی۔

"تم کرسمس کی چھٹیوں پر کب جاؤ گی۔" سلیم اب پوری گفتگو میں شاید دوسرا جملہ بولا تھا۔

"اگلے ہفتے کے بعد۔ لیکن میں اب ملبورن نہیں جا رہی۔ میری بہن میرے ماں باپ کو سمجھا دے گی۔ میں اور میری بہن یہ کرسمس خاموشی سے گولڈ کوسٹ پر گزاریں گے اور وہیں نیو ایئر بھی منائیں گے۔" ایوان یہ کہہ کر اٹھ گئی اور سلیم سے شام سات بجے ملنے کا وعدہ لے کر ا ـ ٹیمپس سے باہر نکل گئی۔ سلیم ہمیشہ کی طرح اپنی

ٹھنڈی کافی کے آخری گھونٹ پیتے ہوئے اسے آہستہ آہستہ قدموں سے جاتے دیکھتا رہا۔

اس ہفتے سلیم کی ہر شام ایوان کے نام ہو گئی تھی۔ سات بجے وہ اسمیس کیفے کے باہر انتظار کرتی ہوئی ایوان سے ملتا جس کے بعد دونوں یونیورسٹی سے نکل کر آوارہ گردی کرتے اور رات گئے تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ ایک شام ایوان نے اعلان کیا کہ وہ اب بالکل صحت مند ہو گئی ہے۔ اس کے دل پر پڑی ہوئی ساری خراشیں بھر گئی ہیں۔ اس نے بہت ہنستے ہوئے سلیم کو بتایا۔

"کل کے بعد تم آزاد ہو گے۔ تمہیں میری نرسنگ کرنے کی مزید کوئی ضرورت نہیں ہے کل ہم کہیں نہیں جائیں گے بلکہ میں اپنی صحت یابی کا جشن مناؤں گی جس کے مہمان خصوصی تم ہو گے۔ یہ جشن میرے گھر پر ہو گا۔ میں خود کھانا پکاؤں گی، تم آٹھ بجے تک میرے فلیٹ پہنچ جانا۔ لیکن اپنی پسند پہلے سے بتا دو' بیف' چکن یا سی فوڈ۔"

"سی فوڈ۔" سلیم نے فوراً" جواب دیا۔ ایوان نے مشکل خود آسان کر دی تھی ورنہ اسے حلال گوشت کا پیچیدہ مسئلہ چھیڑنا پڑتا۔

سلیم آٹھ بجے ایوان کے فلیٹ پہنچا تو وہ کھانے کی تیاری اور اس کے اہتمام سے فارغ ہو کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ سلیم بیج کلر کی پتلون پر گہرے براؤن رنگ کی جیکٹ اور اس کے نیچے ہلکے نیلے رنگ کی باریک قمیض پہنے ہوئے بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ لیکن غضب ایوان ڈھا رہی تھی۔ اپنی جذباتی صحت یابی کے جشن کو اس نے بہت سنجیدگی سے لیا تھا اور کھانے کے علاوہ اپنے اوپر بھی خاصا وقت صرف کیا تھا۔ سلیم نے اس کو اب تک یونیورسٹی میں بہت لاپرواہی سے کپڑے پہنے دیکھا تھا۔ میک اپ تو وہ کرتی ہی نہیں تھی۔ بال یا تو بے ترتیب اور الجھے ہوئے ہوتے یا انہیں کھینچ کر لاسٹک سے باندھتی اور پونی ٹیل بنا دیتی۔ جینز یا ڈھیلے گھیر والی اسکرٹ اور اس کے اوپر ڈھیلا سا کوئی بلاؤز یا قمیض پہنے رہتی۔ لیکن آج لگتا تھا اس نے ہیئر ڈریسر سے بال بنوائے تھے۔ برابر ترشے ہوئے' گہرے سنہرے اور چمکدار سمندر کی

موجوں کی طرح بل کھاتے ہوئے بالکل ایسے جیسے ٹی وی پر شیمپو کے اشتہار والی لڑکیوں کے نظر آتے تھے۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ تھا۔ گلابی لپ اسٹک نے ہونٹوں کو اور نمایاں کر دیا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی پیروں تک پہنچی ہوئی میکسی پہنے ہوئی تھی۔ سلیم کا استقبال اس نے اس کے گال پر اپنا روایتی بوسہ دے کر کیا تھا۔ سلیم اکیلا ہوتے ہوئے بھی اس طرح سرخ ہو گیا جیسے پہلی بار ا-سمیس کیفے میں اس کا اچانک بوسہ پا کر ہوا تھا۔ ایوان کے دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ میں کچن اور لاؤنج روم ایک ساتھ تھے اس میں شیشے کی چھوٹی سی گول ڈائننگ میز بھی پڑی تھی۔ میز پر دو افراد کے کھانے کے لئے کراکری اور کٹلری بڑے قرینے سے رکھی گئی تھی۔ سرخ رنگ کی ایک لمبی سی موم بتی کینڈل اسٹینڈ پر کھڑی تھی لیکن ابھی جلی نہیں تھی۔ بہت پتلے سے ایک گلدان میں گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول سجا تھا جسے دیکھ کر سلیم نے سوچا اسے خالی ہاتھ نہیں آنا چاہئے تھا۔ کم از کم پھول لانے چاہئیں تھے۔

لاؤنج روم کے ایک طرف صرف ایک تین سیٹوں والا صوفہ رکھا تھا جو ضرورت پڑنے پر سونے کے کام بھی آ سکتا تھا۔ کافی ٹیبل شیشے کی تھی اور اس پر برف سے بھرے برتن میں ایک بوتل دھنسی ہوئی تھی جو یقیناً شراب ہو گی۔ ساتھ میں خاص شکل کے دو گلاس تھے وہ بھی اسے یقین تھا کہ شراب پینے کے لئے ہوں گے۔ ایوان نے بوتل برف سے نکالی اور سلیم کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

"ایوان تمہیں پتہ ہے میں شراب نہیں پیتا ہوں۔" سلیم نے فوراً دفاعی انداز اختیار کیا۔

"لیکن یہ شراب نہیں ہے، شیمپین ہے۔ شیمپین کے بغیر کوئی جشن، جشن نہیں ہوتا۔ اس شیمپین میں الکحل کی مقدار بہت کم ہے، مزے میں بھی کڑوی نہیں ہے، میری خاطر تھوڑی سی چکھ لینا، میں زیادہ پینے کے لئے اصرار نہیں کروں گی۔" ایوان نے اسے تسلی دی سلیم نے کالج کے زمانے میں ایک دفعہ بیئر پی تھی۔ پی تو تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ لوگ اتنی کڑوی اور بدمزہ چیز کیوں پیتے ہیں۔ صرف ایک گلاس پر اکتفا کیا تھا اس لئے نشے کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکی تھی کہ اسے اپنے

سوال کا جواب مل سکتا۔ شیمپین چکھنا کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے حامی نہیں بھری اور خاموش رہا۔ ایوان نے بڑے ماہرانہ انداز میں بوتل کے کارک پر لگے ہوئے تاروں کو کھول کر اسے آہستہ آہستہ بوتل سے آزاد کیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے بوتل پکڑ کر سامنے کی طرف ترچھی کی۔ کاک خود ہی کھسکتا اور ایک چھوٹے سے دھماکے کی آواز نکالتا ہوا سامنے کی دیوار سے گولی کی طرح ٹکرایا' بوتل سے نکلتے ہوئے جھاگ بوتل کے گلے لگ رہے تھے۔ اس نے دونوں گلاس بھر کر ایک سلیم کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

میری صحت کا یہ جام تمہارے نام ہے۔ تم نے میری زندگی کے بہت کمزور لمحوں میں جس طرح ساتھ دیا ہے اسے میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ چیئرز!" ایوان نے گلاس سلیم کے گلاس سے ٹکرا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ڈرتے اور جھجکتے ہوئے سلیم نے بھی ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ سوڈے کی طرح تیز' کچھ تلخ' کچھ کھٹی سی' یہ شیمپین مزے میں بری نہیں تھی۔ کم از کم بیئر سے بہت بہتر تھی۔

اس نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ ایوان بھی اپنا گلاس لئے اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

"میوزک سنو گے؟" خاموشی کو توڑتے ہوئے ایوان نے کہا۔ سلیم نے صرف سر ہلا دیا۔ ماحول کی مقناطیسیت اس پر اثر کر رہی تھی۔

"تمہیں باربرا اسٹرائیسنڈ کو سنواتی ہوں۔ مجھے ریپ میوزک پسند ہے لیکن آج نہیں۔ آج تو صرف ہلکے پھلکے رومانی گیت سنیں گے۔" ایوان نے شاید میوزک پہلے سے لگا کر رکھی ہوئی تھی۔ وال یونٹ میں ٹی وی کے اوپر شیلف میں رکھے ہوئے آڈیو سسٹم پر اس نے سی ڈی پلیئر کا بٹن آن کر دیا۔ اسپیکروں سے نکلتی ہوئی باربرا اسٹرائیسنڈ کی بہت جاندار آواز ماحول کے سحر میں اضافہ کرنے لگی۔

میں اکثر سوچتی ہوں کہ میں نے تمہیں کیوں چنا تھا
میں نے اپنی محبت کی مالا
تمہارے گلے میں کیوں ڈال دی تھی

تم میں آخر وہ کیا ہے
جو مجھے بھا گیا تھا
کیا وہ دل ہے
جس میں نیکیوں کا سمندر موجزن ہے
یا تمہاری نرم خوئی
جس نے جلتے دیوں کی طرح
مجھے روشنی میں مقید کیا ہے

میں اکثر سوچتی ہوں
میں نے اپنی چاہت کی مالا
تمہارے گلے میں کیوں ڈال دی تھی
تم مجھے کیا دے سکے ہو
بس اک محبت
وہ بے بہا محبت جس نے مجھے
زندہ رہنے کا مقصد دیا ہے

میں اکثر سوچتی ہوں
میں نے انجانے میں کل محبت کی مالا
تمہارے گلے میں کیوں ڈال دی تھی
مگر جانتی ہوں اگر آج بھی
دل لٹانے کا اختیار آگیا
تو اک بار پھر اپنا دل
تمہارے قدموں میں لا کر ڈال دوں گی
میں پھر سے تمہیں کو چنوں گی

باربرا اسٹرائیسنڈ کی آواز نے پورے کمرے کو بھر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا ہر طرف

محبت ہی محبت بکھر گئی ہو۔ ماحول کے سحر کا اثر تھا کہ سلیم بے جانے بوجھے شیمپین کے کئی گھونٹ لے چکا تھا۔ وہ اس وقت چونکا جب ایوان نے اس کا خالی ہو جانے والا گلاس دوبارہ بھر دیا۔ کہیں سے ایوان کی بلی بھی آ کر وہیں بیٹھ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا باربرا اسٹرائیسنڈ کو وہ بھی بہت غور سے سن رہی ہے۔ گانا ختم ہوا تو ایوان چونکی اور بلی کو اٹھا کر برابر کے کمرے میں چھوڑ آئی۔ اسے شاید اندازہ تھا کہ سلیم بلی کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا۔ ایوان کھانا لگانے لگی تو اس نے کھانے کی میز پر رکھی ہوئی موم بتی جلا کر ایک چھوٹی لائٹ کے علاوہ تمام لائٹیں بجھا دیں۔ کھانے میں چھوٹے چھوٹے تلے ہوئے جھینگے اور آگ پر بھنی ہوئی ایک سالم مچھلی تھی۔ سلیم کے لئے ماحول کو اس قدر رومانی بنا کر کھانے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس کے لئے تو کھانا تیز روشنی میں بہت سا مصالحے دار گوشت بہت سی روٹی یا چاول کھا کر پیٹ سہلانے اور بہت سا پانی پینے کا نام تھا۔ کھانا ختم کر کے انہوں نے میٹھے میں آئسکریم کے ساتھ تازہ لیچیاں کھائیں اور دونوں مل کر میز صاف کرنے کے بعد دوبارہ صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ ایوان کے اصرار پر سلیم نے اپنے گلاس میں بچی ہوئی شیمپین کا ایک گھونٹ اور لیا تھا۔ ایوان نے لائٹیں بند رہنے دی تھیں۔ کھانے کی میز پر موم بتی کی لو ابھی تک ٹمٹما رہی تھی۔ باربرا اسٹرائیسنڈ کی آواز بھی کمرے میں اسی طرح گونج رہی تھی صرف گیت بدل گیا تھا۔

اس نے مجھ کو چھو لیا
مجھ کو جانے کیا ہوا
میرے ہاتھ کے ساتھ
رکھا ہوا اس کا ہاتھ
بڑھتے بڑھتے جب مجھے چھو گیا
میرے بدن میں بجلیاں سی بھر گیا
اس نے مجھ کو چھو لیا
مجھ کو بس ایسا لگا

ہر دیا روشن ہوا
اس نے مجھ کو چھو لیا
اس نے مجھ کو چھو لیا

ایوان نے سلیم کی طرف مسکرا کر دیکھا جس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ ایوان نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر جو صوفے کی پشت پر رکھا ہوا تھا رکھ دیا۔ سلیم اس گیت کی مکمل تفسیر بن گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ کر شیمپین کا گلاس اٹھا لیا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ سلیم کو ایسا لگا جیسے حلق سے معدے تک ایک تلوار سی کھنچ گئی ہو۔ گیت کے بولوں میں ایوان کی بے ساختہ ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

وہ جانتا تھا
کہ میں جانتی ہوں
وہ مسکرا دیا
اس نے مجھ کو چھو لیا
مجھ کو بس ایسا لگا
ساری دنیا رقص میں ہے، وجد میں ہے
میں بھی اس کا لمس بن کر رہ گئی
اس نے مجھ کو چھو لیا، اس نے مجھ کو چھو لیا
اب جو بھی تھا بس
وہ اس کا لمس تھا
وہی حقیقت وہی خدا تھا
اس نے مجھ کو چھو لیا تھا
اس نے مجھ کو چھو لیا تھا

ایوان نے کھڑے ہو کر سلیم کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے۔ وہ اس سے رقص کی

فرمائش کر رہی تھی۔

"مجھے تو رقص نہیں آتا۔ میں نے کبھی نہیں کیا۔" سلیم گڑبڑا گیا۔

"میں سکھاؤں گی۔ یہ کوئی مشکل رقص نہیں ہے۔ آہستہ لے کی موسیقی پر ہولے ہولے تھرکنا موسیقی کی آہستہ دھنوں پر تیرنا تمہیں بہت اچھا لگے گا۔" ایوان نے ہاتھ پکڑ کر سلیم کو اٹھا لیا۔ سلیم کسی سحر زدہ شخص کی طرح اس کی طرف کھنچ آیا۔ ایوان نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا اور خود اپنے دونوں ہاتھ سلیم کے شانے پر رکھ کر ہلکورے لینے لگی۔ اس نے اپنا سر سلیم کے سینے پر ٹکا دیا تھا۔ سلیم نے اپنی ہر جنبش کو ایوان کی جنبشوں کے تابع کر دیا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے یہ شام کسی قدرتی نظام کے تحت خودکار طریقے سے ایک کے بعد دوسرے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ گیت بھی ایک کے بعد دوسرے بدلتے رہے لیکن لے سب کی ایک تھی۔ ہولے ہولے ابھرتی اور پھر ایک دم اعصاب پر طاری ہو کر انہیں سہلاتی ہوئی۔ سلیم کے اعصاب پہلے تو تنے رہے۔ جسم کا ہر پٹھا اکڑا رہا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس نے بھی خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ شیمپین کا جو سیال اس کے اندر گیا تھا وہ کچھ ماحول کا جادو' کچھ موسیقی کا سحر اور ان سب سے بڑھ کر اس کے بدن میں گھلتا ہوا ایوان کا لمس' سلیم سرور اور لذتوں کی وادیوں میں اس طرح اترتا جا رہا تھا جیسے اب واپس نہیں آئے گا۔ ایوان سلیم کے جسم کے ساتھ ایسے چپک گئی تھی جیسے اس کے وجود کا حصہ بن گئی ہو۔ ایوان کی کمر اور کولھوں کے گرد سلیم کے ہاتھوں کی گرفت اور سخت ہو گئی۔

ایوان سلیم کے سینے پر سر ٹکا کر سو گئی۔ کم از کم سلیم کو تو ایسا ہی لگا۔ جب اس نے چہرہ اٹھا کر سلیم کو دیکھا تو اس کی ادھ کھلی آنکھیں کئی جاگی ہوئی راتوں کی غنودگی سے بوجھل نظر آتی تھیں۔ آنکھوں کی طرح اس کے ہونٹ بھی ادھ کھلے تھے۔ نصف دائرہ بناتے ہوئے' رس ٹپکاتے اور دعوت دیتے ہوئے جو کسی مقناطیس کی طرح سلیم کے ہونٹوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ سلیم کے ہونٹ صرف ایک بوسہ چرا کر بھاگ جانے کے لئے ایوان کے ہونٹوں پر جھکے تھے لیکن وہ اس طرح پکڑے گئے جیسے

اب کبھی رہائی نہ پا سکیں گے۔ ایوان اسی طرح سلیم کے ہونٹوں اور بدن سے چپکی ہوئی بیڈ روم کی طرف رہنمائی کرنے لگی۔ بیڈ روم میں بستر کے سائڈ کی میز پر رکھے ہوئے لیمپ سے نکلتی ہوئی ہلکی ہلکی نیلی روشنی ماحول کو خوابیدہ بنا رہی تھی۔

ایوان نے بیڈ روم میں آتے ہی اپنی میکسی کی زپ کھولی اور دونوں شانوں کو جھٹکا دے کر میکسی اپنے قدموں پر گرا دی۔ ایوان نے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس نے آج کی رات کے ہر مرحلے کی مکمل تیاری کی تھی۔ جشن کا پورا اہتمام کیا تھا۔ سلیم اس کے جسم کے خطوط اتنی نزدیک سے دیکھ کر بالکل ہی کھو گیا تھا۔ ہلکی نیلگوں روشنی نے جسم پر نیلا سا جو سایہ ڈال دیا تھا اس سے وہ رنگین رسالے میں چھپی ہوئی کوئی تصویر لگنے لگی تھی۔ سلیم نے سوچا ایوان ضرور پورے جسم کا غسل آفتابی کرتی ہے، اس کے جسم پر انگیا کی سفید لکیر نہیں تھی۔ اس کا پروفیسر صحیح کہتا تھا۔ جسم پر سفید دھاری ہوتی تو کتنی بدنما لگتی۔ سلیم ٹرانس میں آیا ہوا ایک ایسا مفعول بن گیا تھا جو اس کی ہر جنبش کی پیروی کر رہا تھا۔ لیکن اس کے بدن میں اندر ہی اندر کپکپی بھی طاری تھی جس پر اس نے بہت مشکل سے قابو پایا ہوا تھا۔ اسے ڈر تھا کہیں اس کے دانت نہ بجنے لگیں بس ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ دل بے اختیار یہ چاہتا تھا کہ ایوان کو اس طرح بھینچے کہ اس کی ہڈیاں تک سنسنا اٹھیں۔ وہ اس سے الگ ہونے کا سوچ بھی نہ سکے۔ لیکن پھر اچانک خوف کی ایک لہر دوڑ جاتی اور یہ بزدلانہ خیال سر اٹھاتا کہ وہ بھاگ جائے اور پیچھے پلٹ کر بھی نہ دیکھے۔ تذبذب کی اس کیفیت نے اس کے جسم کا سارا اختیار ایوان کے ہاتھ میں دے دیا تھا جس کے لئے اس شام کا منطقی انجام ہم بستری کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بڑی سرعت سے سلیم کی جیکٹ اتار کر اس کی قمیض کے بٹن کھولنے لگی۔

سلیم کپڑوں سے نجات پا کر دیر تک اس سے لپٹا کھڑا رہا۔ ایک ٹھنڈی سی آگ اس کے پورے بدن میں سرایت کر گئی تھی۔ ایوان میں اب ضبط کا یارا بالکل نہیں رہا تھا۔ وہ سلیم کو بستر پے لے جا کر اسے چادر کی طرح اوڑھ کر چت لیٹ گئی ایوان کے بدن پر کمبل کی طرح پڑے ہوئے سلیم کو بھی اب کوئی جھجک نہیں رہی

تھی۔ سلیم کو اس پوزیشن میں چند لمحے ہی گزرے ہوں گے بلکہ اس پوزیشن کا وہ ابھی پوری طرح فائدہ بھی نہیں اٹھا پایا تھا کہ اچانک ایوان کے بدن سے اچھل کر وہ بستر سے باہر آگرا۔ بالکل اسی طرح جیسے بجلی کے جھٹکے نے اچھال پھینکا ہو۔ اسے لگا جیسے کمر کے نیچے کولہوں کے دونوں حصوں کے گوشت پر آگ کی لکیریں کھنچ گئی ہوں۔ ایوان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا۔ اضطراری طور پر وہ بھی کود کر بستر سے باہر آ گئی۔ خوں خوں کرتی ہوئی اس کی بلی ایک بار پھر سلیم پر چھلانگ لگانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ایوان کی سمجھ میں آگیا کہ کیا ہوا تھا۔ بلی کو ایوان کے بستر کا نیا حصے دار پسند نہیں آیا تھا۔ وہ ڈیوڈ کی وفادار تھی اور اس پر اس نے ایوان پر صرف ڈیوڈ کے جسم کو ہی دراز دیکھا تھا۔ وہ کسی اور کو اس مقام پر سوار دیکھ کر حملہ آور ہو گئی تھی۔ بلی اور ایوان چند لمحوں تک ایک دوسرے کو گول گول آنکھوں سے گھورتے رہے۔ سلیم اگر حواس میں ہوتا تو دیکھتا کہ دونوں کی آنکھیں آج بھی ایک سی لگ رہی تھیں۔ بلی کی آنکھوں کے گرد سرخ سا ہالہ تھا اور ایوان کی آنکھوں میں بھی سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ اس کی خواہشیں ناتمام رہ گئی تھیں اس لئے وہ بلی سے زیادہ بپھری ہوئی تھی۔ بلی اگر انسان ہوتی تو ایوان اس کا خون کر دیتی۔ بلی اب ہار مان کر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ ایوان اسے اٹھا کر اسی طرح کپڑے پہنے بغیر فلیٹ کا دروازہ کھول کر سڑک پر گئی اور بلی کو باہر پھینک آئی۔

اندر کمرے میں آئی تو سلیم اسی طرح بدحواس کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اس کی قمیض اور پتلون تھی جنہیں وہ کپکپاتے ہاتھوں سے پہننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایوان نے کپڑے اس کے ہاتھ سے لئے اور بستر پر الٹا لٹا کر اس کے کولہے کے گوشت پر پڑے ہوئے ان زخموں کو دیکھنے لگی جو بلی کے ناخنوں نے ڈالے تھے۔ زخم گہرے نہیں تھے، ہلکے ہلکے کھرونچے تھے جن پر خون چھلکا ہوا تھا۔ ایوان نے تولیہ سے صاف کر کے زہر مارنے کے لئے اپنے پرفیوم کی بوتل زخموں پر الٹ دی۔ سلیم کو ایسا لگا جیسے زخموں پر تیزاب ڈال دیا ہو۔ ایوان اگر پورا بوجھ ڈال کر اس کی کمر نہ دبائے رکھتی تو وہ بے آب مچھلی کی طرح زمین پر پڑا تڑپ رہا ہوتا۔

جلن میں کمی آئی تو سلیم اٹھ کر کپڑے پہننے لگا۔ ایوان نے منع کیا اور بستر میں لیٹنے اور آرام کرنے کو کہا لیکن سلیم اس کمرے سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ باہر کے کمرے میں صوفے پر بیٹھنے لگا۔ لیکن اس کی بیٹھک کے تازہ زخموں نے اسے بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ کروٹ کے بل صوفے پر لیٹ گیا۔ ایوان صوفے سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگی۔ سلیم نے ایوان سے درخواست کی کہ وہ جا کر سو جائے اور اسے اکیلا چھوڑ دے۔ ایوان بحث کئے بغیر اپنے اس کمرے میں چلی گئی جہاں اس نے صرف ایک ہفتے کے وقفے سے لگاتار دو حادثے دیکھے تھے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس وقت سلیم کی ذہنی کیفیت صرف تنہائی چاہتی ہے۔

سلیم گھر جانا چاہتا تھا لیکن اسے ابھی تک یہ خوف تھا کہ بلی فلیٹ کے باہر کھڑی ہو گی اور اسے دیکھتے ہی پھر جھپٹ پڑے گی۔ لیکن رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اسے اگر یہاں سے نکلنا تھا تو ابھی نکلنا تھا، زیادہ دیر ہو گئی تو رات یہیں گزار کر صبح پھر ایوان کا سامنا کرنا پڑتا۔ فی الوقت اس میں ایوان کو دوبارہ دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ ہمت کر کے وہ اٹھا اور یہ دیکھے بغیر کہ ایوان سو گئی یا ابھی تک جاگ رہی ہے بہت آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ بلی کے اچانک حملے کے لئے بھی پوری طرح چوکنا تھا۔ لیکن بلی اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ بس ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا اسے گھر تک پیدل ہی جانا تھا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہ فٹ پاتھ پر چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ آتی ہوئی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس میں اسے سڑک کے کنارے بلی کی خون میں لت پت لاش پڑی نظر آئی۔ کوئی تیز آنے والی گاڑی گھر بدر کی جانے والی بلی کو کچل کر چلی گئی تھی۔ سلیم کے حلق سے ایک بے ساختہ سی چیخ نکل کر سنسان سڑک پر دور تک گونج گئی۔ وہ فٹ پاتھ پر اس طرح بھاگتا چلا گیا جیسے خون میں ڈوبی ہوئی بلی اس کے تعاقب میں دوڑی آ رہی ہو۔

وہ دور تھا تو میرا ہر اک پل اداس تھا
وہ میرے پاس آیا تو میں خود سے ڈر گیا

6

سڈنی ۱۹۹۵ء

اس واقعہ کو خاصہ وقت گزر گیا تھا۔ کرسمس آ کر چلی گئی۔ یونیورسٹی بھی چھٹیوں کے بعد کھل کر اپنے پورے شباب پر آ گئی تھی۔ لیکن سلیم ایوان کے گھر گزاری ہوئی وہ رات بڑی مشکل سے بھول سکا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی جب وہ اپنے کولہے پر ہاتھ پھیرتا تو اسے ایسا لگتا جیسے انگلیاں خون میں چپچپا گئی ہوں۔ اس رات وہ کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ گیا تھا گھر کے دونوں مکین بے خبر سو رہے تھے۔ وہ بھی بستر میں دبک کر دیر تک کپکپاتا رہا۔ آنکھیں بند کرتا تو ڈراؤنے خواب دبوچ لیتے۔ کبھی کوئی چیتا اس پر چڑھا اس کے کولہوں کا گوشت کھا رہا ہوتا اور کبھی آگ میں گھری ہوئی ایوان کو بچانے کی کوشش اسے آگ کے انگاروں پر بٹھا دیتی۔ رات بھر ایسے ہی خوابوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے وہ سو گیا تھا۔ صبح اٹھا تو اس کا بدن بخار سے تپ رہا

تھا۔ احمد اور علی اپنے اپنے کاموں کو جا چکے تھے۔ اگر نہیں بھی گئے ہوتے تو وہ انہیں کچھ نہیں بتاتا۔ لیکن اسے مدد کی سخت ضرورت تھی۔ اسے خوف تھا کہ بلی کے ناخنوں نے جو زخم دیئے تھے ان کا زہر جسم میں پھیل کر اسے مفلوج نہ کر دے۔ مدد کے لئے اس وقت وہ صرف ایک ہی شخص کو بلا سکتا تھا۔ اس نے چودہری انور کو فون کیا جو صبح تین بجے تک ٹیکسی چلا کر چار بجے آ کر سویا تھا۔ لیکن چودہری انور کا کمال یہی تھا کہ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اسے کس وقت اور کس غرض سے بلایا جا رہا ہے' اسے تو صرف یہ معلوم تھا کہ ایک دوست نے مدد کے لئے بلایا ہے اور اسے جانا ہے۔ چودہری انور اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا جس نے اس کے کولھوں کے زخموں کے لئے مرہم دیا تھا بخار کم کرنے کی دوا دی تھی اور احتیاطا" ایک انجکشن بھی لگا دیا تھا۔ سلیم ایک ہفتے تک یونیورسٹی نہیں جا سکا۔ سب کو اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ رات گھر آتے ہوئے پھسل کر گر پڑا تھا جس سے کولہے کی ہڈی زخمی ہو گئی تھی۔ کسی نے زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صرف علی نے جس سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی اسے ایک دن سمجھایا تھا۔

"برادر اس زمین پر شیطان عورت کی صورت میں رہتا ہے۔ یہاں کی عورت کے قریب جاؤ گے تو شیطانی چکر میں پھنس جاؤ گے۔ دور رہو گے تو سکھی رہو گے۔" سلیم صرف اس کی شکل دیکھتا رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ علی کس علم کی بنیاد پر یہ کہہ رہا تھا۔ شاید احمد نے ایوان کے آنے والی فون کالوں اور پچھلے پورے ہفتے رات کو اس کے مسلسل دیر سے آنے کو دو اور دو چار کی طرح جمع کیا ہو' اور اس کی بیماری کو اپنے طور پر معنی پہنا کر علی کو کچھ بتایا ہو۔

اگلے ہفتے جب سلیم یونیورسٹی گیا تو وہ یونیورسٹی بند ہونے سے پہلے کا آخری ہفتہ تھا۔ اسے یہ معلوم کر کے سخت مایوسی ہوئی کہ اس کا سپروائزر پروفیسر تھیو ایک ہفتہ پہلے ہی چھٹی کر کے سوئڈن جا چکا ہے۔ تھیو تیس سال پہلے سوئڈن آنے والی ایک آسٹریلوی سیاح کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے ساتھ کھنچتا ہوا آسٹریلیا چلا آیا تھا۔ اس کی محبت چھ ماہ بعد ہی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی لیکن تھیو آسٹریلیا کے عشق

میں گرفتار ہو کر یہاں سے واپس نہیں گیا۔ انجنیئر وہ پہلے سے تھا۔ پی ایچ ڈی کرنے یونیورسٹی آیا تو یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اپنی ریٹائرمنٹ سے دو تین سال پہلے اب وہ مکمل پروفیسر بھی ہو گیا تھا۔ سفید داڑھی اور گول شیشوں کی تاروں کی عینک والا منحنی تھیو انجنیئرنگ کے بجائے تاریخ یا فلسفے کا پروفیسر لگتا تھا۔ آسٹریلیا میں اپنے پہلے عشق کی ناکامی کے بعد اس نے شادی نہیں کی تھی' اس کا سارا خاندان سوئڈن میں تھا اس لئے ہر سال کرسمس پر دو مہینے سوئڈن میں گزار کر آتا تھا۔ اس نے سلیم کو بتایا تھا کہ ریٹائر ہو کر آسٹریلیا میں لاوارث مرنے کے بجائے اپنی باقی زندگی سوئڈن میں گزارے گا۔

چھٹیوں کا زمانہ بہت سکون سے گزرا۔ یونیورسٹی میں عموماً" ہو کا عالم رہتا صرف وہی لوگ آتے جو ریسرچ میں مصروف تھے۔ وہ سب اپنے اپنے کمروں' تجربہ گاہوں یا لائبریریوں تک محدود رہتے۔ زیادہ تر کیفے بند تھے۔ اس لئے پورا کیمپس اپنی روایتی رونق سے محروم تھا۔ کرسمس اور نئے سال کے درمیانی ہفتے میں تو سب کچھ بند تھا' یہ وقت سلیم نے گھر پر رہ کر پڑھتے ہوئے یا کبھی کبھی چودہری انور کے ساتھ شہر گھومنے یا کسی رات کو منظر اور ظہیر کے ڈیرے پر گپیں مارتے ہوئے گزارا تھا۔ چودہری انور نے بتایا تھا کہ اگلے ہفتے سے وہ بھی چینی خاندان سے الگ ہو کر منظر اور ظہیر کے ڈیرے پر منتقل ہو رہا ہے۔ منظر اور ظہیر چار کمروں کے ایک بڑے مکان میں رہتے تھے۔ ان کے ساتھ چار اور لڑکے بھی تھے جن میں ایک پاکستان واپس جا رہا تھا۔ چودہری انور اسی کی خالی کی ہوئی جگہ لینے والا تھا۔

یونیورسٹی کے دوبارہ معمول پر آتے آتے فروری آ گئی۔ سلیم کے پاس کرنے کے لئے کچھ زیادہ نہیں تھا۔ وہ بے چینی سے پروفیسر تھیو کا منتظر تھا جو ابھی تک سوئڈن سے واپس نہیں آیا تھا۔ اس نے اسمیس کیفے کی طرف سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے ایوان کے نظر آنے کے امکانات نہیں تھے۔ لیکن ایک دن اس کی نئی بنگلہ دیشی دوست نے اسمیس جا کر کافی پینے پر اصرار کیا۔ سلیم دل میں لاحول کا ورد

کرتے ہوئے کیفے گیا' وہ کافی لینے کے لئے قطار میں کھڑے تھے لیکن سلیم کی آنکھیں بے چینی سے ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں' کافی لے کر جب وہ میز کی تلاش میں چکر لگا رہے تھے تو سلیم کو اطمینان ہو گیا کہ ایوان اس وقت کیفے میں نہیں ہے۔ وہ باہر پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے کیفے سے نکل ہی رہے تھے کہ اسے ایوان بابی کے ساتھ آتی نظر آئی۔ سلیم نے سوچا کہ ایوان علی کے کہنے کے مطابق شیطان تو کبھی نہیں ہو سکتی ورنہ اتنے لاحول پڑھے جانے کے باوجود اس طرح کھنچی ہوئی نہ آتی۔ ایوان اسے دیکھتے ہی تیر کی طرح اس کی طرف آئی اور ہمیشہ کی طرح اس کے گال پر بوسہ دے کر تیزی سے اس کی خیریت پوچھنے لگی۔ سلیم کی دوست اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ سلیم حسب معمول سرخ ہو گیا تھا۔

"یہ ایوان ہے' میری ایک پرانی دوست اور یہ سعیدہ ہے۔ میرے ساتھ ہی انجنیئرنگ میں پڑھتی ہے۔" اس نے جلدی سے تعارف کرایا۔

"تمہاری گرل فرینڈ بہت خوبصورت ہے۔" ایوان نے جلدی سے سعیدہ کے گال پر بھی بوسہ دے دیا۔ سعیدہ کے سانولے رنگ پر بھی شفق لہرانے لگی۔

"نہیں یہ گرل فرینڈ نہیں' صرف دوست ہے۔" سلیم نے جلدی سے وضاحت کی۔ انگریزی ڈکشنری میں گرل فرینڈ کا مطلب "دوست عورت" نہیں بلکہ محبوبہ ہوتا تھا۔

"تمہیں پتا ہے میرا نیا بوائے فرینڈ کون ہے؟ ...... بابی!" سلیم کو حیرت نہیں ہوئی۔ بابی اس وقت اس میز کے ہجوم میں شامل ہو گیا تھا جہاں بڑے جوش و خروش سے تاش کھیلی جا رہی تھی۔ ایوان سب سے بے پرواہ باتوں کی ٹرین دوڑا رہی تھی۔ اس کے لہجے میں ایک بار پھر وہی جوش و خروش تھا جو کبھی ڈیوڈ کے تذکرے کے لئے مخصوص تھا۔

"میں کرسمس گزار کر واپس آئی تو بابی مجھے تلاش کر رہا تھا' اسے ڈیوڈ اور نتاشا کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے پہلے سے اندازہ تھا لیکن وہ مجھے بتا کر میرا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بابی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میری محبت

ہمیشہ سے اس کے دل میں چھپی تھی۔ اور اس کی اپنی گرل فرینڈ سے لڑائی کی ایک وجہ میں بھی تھی کیونکہ وہ اس سے ہمیشہ میری باتیں کرتا رہتا تھا جس سے وہ ناراض ہوتی تھی۔ بابی اب فلیٹ میں میرے ساتھ ہی منتقل ہو گیا ہے۔ میں آج کل باقاعدگی سے اس کے سوشلسٹ انٹرنیشنل کے جلسوں میں جاتی ہوں اور ہفتے میں ایک دن ان کا اخبار بھی بیچتی ہوں۔ ایک دن بابی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں اپنے پاکستانی دوست کو بھی کبھی میٹنگ میں لے کر آؤں۔ تم آؤ نا' ہم ہر منگل کو ایک بجے کامرس کی بلڈنگ میں ملتے ہیں۔" ایوان نے امید بھری نظروں سے سلیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"منگل کو میری کلاس ہوتی ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا۔" سلیم نے ایوان کو بہلایا۔

"میں کافی لے کر آتی ہوں۔" ایوان نے جاتے ہوئے کہا لیکن پھر جاتے جاتے ٹھہر گئی اور سعیدہ کی طرف مڑ کر پوچھنے لگی۔

"تمہارے گھر میں بلی ہے؟" ایوان کی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ لیکن اس نے سلیم کی طرف بالکل نہیں دیکھا تھا۔

"نہیں...... کیوں؟" سعیدہ نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میرے پاس بھی نہیں ہے۔ میں نے سوچا شاید...... اچھا میں کافی لے کر آتی ہوں۔" ایوان بات کو بیچ میں ہی چھوڑ کر تیزی سے کیفے کے اندر چلی گئی۔ سلیم کو معلوم تھا کہ کافی لینے والوں کی قطار لمبی ہے اور جب تک وہ کافی لے کر آئے گی وہ اپنی کافی ختم کر کے چلے جائیں گے۔ لیکن ایوان قطار میں آگے کھڑے ہوئے ایک لڑکے سے بات کرتی ہوئی اس کے ذریعے کافی لے کر فوراً ہی واپس آ گئی اور انہی کے ساتھ کرسی لے کر بیٹھ گئی۔ آتے ہی اس کی باتوں کی ریل گاڑی پھر چل پڑی تھی۔

سعیدہ اپنی کافی ختم کر کے اٹھ گئی تھی۔ سلیم بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور ایوان کو خدا حافظ کہہ کر سعیدہ کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ ایوان اپنی پیالی اٹھا کر اس میز پر چلی گئی جہاں بابی تماشائی نہیں رہا تھا بلکہ کھیلنے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔

ڈیپارٹمنٹ واپس جاتے ہوئے اس نے سعیدہ کو ایوان کے بارے میں وضاحت دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کسی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سلیم کو بھی زیادہ ہکلانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ویسے بھی سعیدہ سے اس کی دوستی کی نوعیت ایسی نہیں تھی کہ اسے وضاحتیں دینے کی ضرورت پڑتی۔ دونوں ایک ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ وقفوں کے دوران دونوں اپنی اپنی چائے کا تھرماس اور لنچ بکس لے کر باہر لان میں بیٹھ کر اپنے اپنے کئے جانے والے کام کی باتیں کرتے۔ سعیدہ کا یہ آخری سیشن تھا اس نے اپنی تھیسس بھی جمع کرا دی تھی۔ نتیجہ آنے کے بعد اسے بنگلہ دیش واپس چلے جانا تھا۔ اس کے پاس اس سال کے آخر کا وقت تھا۔ اسکالر شپ بھی باقی تھی اور ویزا بھی، کیونکہ اس نے اپنا کام وقت سے کئی مہینے پہلے مکمل کر لیا تھا لیکن سلیم کو اس نے بتایا تھا کہ اس کے پاس رکنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ وہ باقی بچے ہوئے یہ مہینے اپنی بہن کے پاس لندن میں گزارنا چاہتی تھی۔

سعیدہ سلیم کی ہم عمر تھی۔ ۲۷-۲۶ سال کی یا شاید ایک دو سال اور زیادہ کی۔ ذہنی اور جذباتی طور پر بہت پختہ تھی لیکن چہرے سے بہت کچی کچی سی لگتی تھی۔ نقش و نگار خالص بنگلہ دیشیوں جیسے تھے۔ رنگ بھی سانولا تھا لیکن آنکھیں بڑی بڑی اور نشیلی تھیں جن سے اس کے چہرے کی کشش بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کے بال تھے۔ بہت گھنے جو ایک لمبی اور موٹی سی چوٹی میں گندھے رہتے۔ سلیم نے اس کے بالوں کی تعریف کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کسی کی مدد کے بغیر چوٹی کیسے باندھتی ہے۔ سعیدہ نے ہنستے ہوئے اسے بتایا تھا کہ اسی لئے وہ شام کو اپنے بال دھوتی ہے کیونکہ انہیں خشک کرنے اور سلجھانے میں گھنٹوں لگتے ہیں۔ سلیم صرف یہ سوچ کر رہ گیا کہ اس کے کھلے ہوئے بال خشک ہو کر اس کے شانوں اور کمر پر لہراتے ہوئے کتنے خوبصورت لگتے ہوں گے۔

سعیدہ سے سلیم کی دوستی بہت عجیب طریقے سے ہوئی تھی۔ وہ اسے شروع ہی سے اپنے ڈپارٹمنٹ میں دیکھتا تھا۔ اس کے سپروائزر نے بھی ایک بنگلہ دیشی لڑکی کا تذکرہ کیا تھا جس کی ریسرچ نے بین الاقوامی سیاست کو انجنیئرنگ کا موضوع بنا دیا تھا۔

سلیم کو اس کا موضوع واقعی بہت دلچسپ لگا تھا۔ [illegible] کام کر رہی تھی۔ اس کی تھیسس ایسے ملکوں کے بارے میں تھی جو اندرونی طور پر خلفشار اور بدامنی کاشکار تھے اس نے تحقیق کی تھی کہ ایسے ملکوں میں تعمیراتی کام کو کس طرح منظم کیا جائے۔ اس نے ایک امریکی انجنیئر کے اس کام کو آگے بڑھایا تھا جو ایلسلواڈور میں خانہ جنگی کے دوران تعمیراتی کام مکمل کرنے میں کامیاب ہوا تھا اور جس نے امریکہ واپس آکر اسی موضوع پر کئی سیمینار دیئے تھے۔ اور ایک اہم مقالہ بھی لکھا تھا۔ سلیم سعیدہ سے اس موضوع پر تفصیل سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ پاکستان اور خاص طور پر کراچی کے حالات میں اس کے لئے یہ ایک بہت متعلقہ موضوع تھا۔ وہ اس کی تھیسس لے کر پڑھنا اور اس کی اجازت سے ایک کاپی لے کر رکھنا چاہتا تھا۔ پھر وہ اس کے اپنے خطے کی تھی۔ سلیم کو اپنے ڈپارٹمنٹ میں ابھی تک اپنے علاقے کی وہی نظر آئی تھی، زیادہ تر غیر ملکی ایران، چین، انڈونیشیا اور ملائشیا کے تھے۔ لیکن سلیم اس وقت سخت حیرت زدہ رہ گیا جب ایک دن کاریڈور سے گزرتے ہوئے اس کی ہیلو کے جواب میں وہ اسے جواب دیئے بغیر بہت روکھے انداز میں گھورتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے بعد سلیم کو وہ اکثر نظر آئی لیکن سلیم کو پیش رفت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ اس کی ناراضی کی وجہ کیا تھی۔

عید کے بعد جو پہلا ہفتہ تھا اس دن یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ نے ایک پارک میں دوپہر کو عید ملن باربی کیو کیا تھا۔ احمد اس کے انتظام کرنے والوں میں شامل تھا۔ اس لئے وہ سلیم کو پتہ دے کر چلا گیا تھا۔ سلیم یونیورسٹی گیا تو کسی وجہ سے دیر تک ڈپارٹمنٹ سے نہیں نکل سکا۔ ڈھائی بجے نکلا تو پارک کا راستہ تلاش کرتے ہوئے بھٹک گیا۔ کافی دیر پیدل چل کر پوچھتا پوچھتا ایک پارک تک پہنچا تو یہ وہ پارک نہیں تھا جہاں باربی کیو تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ کاغذ پر بنے ہوئے راستے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے سعیدہ نظر آئی۔ وہ بنگلہ دیشی لڑکی جس نے اس کے ہیلو کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بھی شاید راستہ بھٹک کر غلط پارک تک آگئی تھی۔ سلیم انجانا بن کر کاغذ پر پتہ پڑھتا رہا لیکن اسے اس وقت ایک بار پھر حیرت ہوئی جب لڑکی مسکراتی

ہوئی اس کی طرف آئی اور اسے عید کی مبارکباد دینے لگی۔ جواب میں سلیم صرف عید مبارک کہہ کر اسے تکنے لگا۔

"میرا خیال ہے باربی کیو دوسرے علاقے کے پارک میں ہے، مجھے تھوڑا تھوڑا اندازہ ہے۔ پندرہ منٹ کا پیدل راستہ ہو گا، آپ چاہیں تو میرے ساتھ چلیں۔" سعیدہ اس سے بہت صاف اردو بول رہی تھی۔

"جی ہاں چلئے، دیکھ لیتے ہیں۔" سلیم نے سعیدہ کی رہنمائی میں چلتے ہوئے کہا۔

"آپ کی اردو بہت اچھی ہے۔" سلیم نے کچھ رستہ خاموش چلنے کے بعد سلسلہ تکلم کا آغاز کیا۔

"میرے نانا اردو کے عالم تھے۔ جب ہم اور آپ ایک تھے وہ پاکستان کی ایک کابینہ میں وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ میری امی بھی اردو سے بہت محبت رکھتی ہیں۔ کسی زمانے میں اردو میں شاعری بھی کرتی تھیں۔ ہمارے گھر میں بنگلہ سے زیادہ اردو بولی جاتی تھی۔ لیکن جب بنگلہ دیش بنا تو میری ماں سیاست میں آ گئیں۔ اس وقت شروع شروع میں اردو بولنا برا سمجھا جاتا تھا پھر بھی وہ گھر میں چھپ کر مجھے اردو سکھاتی تھیں۔ اس لئے میری اردو اتنی اچھی نہیں ہو سکی۔ لیکن میری بڑی بہن کی اردو بہت اچھی ہے۔ وہ لندن میں رہتی ہے اور سب اسے پاکستانی سمجھتے ہیں۔" سعیدہ نے چلتے چلتے اپنی اردو دانی کے پیچھے چھپی ہوئی پوری کہانی بیان کر دی۔ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے وہ دوسرے پارک پہنچ گئے۔ جگہ تو صحیح تھی لیکن عید ملن کی دکان بڑھ چکی تھی۔ صرف دو لڑکے بچا کچا سامان لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے سلیم کو بتایا کہ باربی کیو ایک گھنٹہ پہلے تین بجے ہی ختم ہو گیا تھا۔

سلیم صبح کا ناشتہ کئے ہوئے تھا اور سخت بھوکا تھا۔ یہی کیفیت شاید سعیدہ کی تھی۔

"رینڈوک میں ایک چھوٹا سا ویت نامی ریسٹورنٹ ہے، چار ڈالر میں جتنا پلیٹ میں بھر سکتے ہیں لے کر کھا سکتے ہیں۔ میں تو وہیں جاؤں گی۔ چاہیں تو آپ بھی ساتھ چلیں۔" سعیدہ کی تجویز پر سلیم اس کے ساتھ ایک بار پھر چل دیا۔

رینڈوک کا علاقہ کوجی کے پاس تھا' اس نے سوچا چار ڈالر میں عید کا لنچ مہنگا نہیں ہے' کھا کر گھر پہنچنے میں زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی۔ ساڑھے چار بجے لنچ اور ڈنر کے درمیان کا ایسا وقت تھا کہ ریسٹورنٹ میں یہی دو کھانے والے تھے۔ چار چار ڈالر دے کر انہوں نے اپنی اپنی پلیٹیں بھری تھیں اور ایک کونے کی میز پر بیٹھ گئے تھے۔ کھانا کھا کر ایک ایک ڈالر چائے پر اور خرچ کیا۔ جسے پیتے ہوئے سلیم نے سعیدہ سے وہ سوال کیا جس نے اسے الجھن میں ڈالا ہوا تھا۔

"یونیورسٹی میں میرے سلام کا آپ نے اتنا برا کیوں مانا تھا؟" سعیدہ شاید اس سوال کے لئے تیار تھی۔

"اس دن شاید میرا دن بہت خراب گزرا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ سے بدتمیزی کر بیٹھی تھی۔ پلیز مجھے معاف کر دیجئے گا۔" سعیدہ نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جواب دیا۔

"نہیں معافی کی کوئی بات نہیں۔ مجھے الجھن تھی۔ اور آج یہ الجھن ہے کہ آپ اب مجھ سے اتنی اچھی طرح کیوں پیش آ رہی ہیں۔" سلیم نے اسے صاف صاف بتایا۔ سعیدہ خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو۔ سلیم اپنی چائے ختم کر چکا تھا۔ وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ سعیدہ ایک بار پھر مخاطب ہوئی۔

"میں نے آپ کے سلام کا جواب اس لئے نہیں دیا تھا کہ مجھے معلوم تھا آپ پاکستانی ہیں۔ میں پاکستانیوں سے نفرت کرتی ہوئی پروان چڑھی ہوں۔ میں صرف چار سال کی تھی جب پاکستانی فوجیوں نے میرے باپ' میرے ماموں اور میرے چودہ سالہ بھائی کو ہلاک کر کے ایک گڑھے میں دبا دیا تھا۔ میری ماں مجھے اور میری بہن کو لئے گھر گھر چھپتی پھرتی تھی۔ آپ نے مجھے جس دن ہیلو کہا تھا وہ میرے باپ کی برسی کا دن تھا۔ آپ کا ہیلو مجھے سینے میں چھرے کی طرح لگا تھا۔"

"لیکن آج..... آج تو......" سلیم نے بات کاٹنے کی کوشش کی۔ لیکن سعیدہ نے اپنی بات جاری رکھی۔

"شام جوں جوں ڈھلی، میرا غصہ بھی دھیما ہو گیا تھا۔ مجھے پھر یہ بھی یاد آیا کہ ہمیں آخر وقت تک جس نے پناہ دی وہ بھی پاکستانی تھے۔ انہیں ہم زیادہ جانتے بھی نہیں تھے، لیکن انہوں نے ہم پر آنچ نہیں آنے دی۔ بہت عزت دار لوگ تھے اس لئے کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے گھر پر نظر ڈالتا۔ حالات تبدیل ہو رہے تھے کسی وقت بھی خطرہ تھا کہ بھارت مشرقی پاکستان فتح کر لے گا اس لئے ان کے گھر والے بھی پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگے تھے لیکن گھر کے بزرگ ہمیں قسمت کے سہارے اکیلا چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اپنے پورے کنبے کو انہوں نے پاکستان بھیج دیا اور خود ہماری حفاظت کے لئے رکے رہے۔ اور اب تک وہ وہیں ہیں۔"

"وہیں ہیں؟" سلیم نے حیرت سے پوچھا۔

"جنگ کے آخری دنوں میں واپس جانے کے لئے راستے بند ہو گئے تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو بنگلہ دیش بن گیا اور ہم اپنے گھر واپس آ گئے لیکن ہمیں دوسری زندگی دینے والے ان بزرگ کو ان کے گھر سے نکال کر ایک کیمپ میں محصور کر دیا گیا تھا۔ وہ آج ڈھاکہ کے پاس ان کیمپوں میں رہتے ہیں جن میں خود کو پاکستانی کہنے والے لاکھوں بہاری آباد ہیں۔"

"تو گویا میرے پاکستانی ہونے کا قصور آج ان بزرگ کی وجہ سے معاف کر دیا گیا۔" سلیم نے ذرا طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ بزرگ کی یاد نے میرے غصے کو دھیما تو کر دیا لیکن نفرت ختم نہیں کی تھی۔ میں اس یاد کے ساتھ پروان چڑھی تھی کہ میرے باپ اور میرے اکلوتے بھائی کو پاکستانیوں نے مار دیا تھا اس کی وجہ سے میرے لئے ہر پاکستانی کا چہرہ قاتل تھا۔ لیکن اس روز شام کو ٹی وی بنگلہ دیش میں آئے ہوئے سیلاب کی تباہ کاریاں دکھا رہا تھا۔ نو سو یا ہزار کے قریب لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ اتنے بڑے المیہ کو ٹی وی پر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر میں اپنے المیہ کی پرانی یادوں کو بھول گئی۔ میں نے سوچا اس سیلاب میں جس جس کے باپ بھائی یا ماموں ہلاک ہوئے وہ اپنی نفرتوں کا مرکز کسے بنائیں۔ میں نے تو پاکستانیوں کو ہدف بنا کر اپنی نفرتوں کی ایک سمت متعین کر دی تھی لیکن ان

دیکھے خداؤں نے قتل کا جو بازار گرم کیا ہے اس پر کس سے نفرت کی جائے۔ قدرت کے ان مظاہر سے جن کا ماحولیات کے نام پر ہم دنیا بھر میں بچاؤ کرتے پھر رہے ہیں یا ان آسمانوں سے جہاں سے زندگی اور موت کی ڈوریاں ہلتی ہیں۔ سوچیں متوازن ہونے لگیں تو میں نے یہ بھی سوچا کہ پاکستانی بھی تو قتل ہوئے تھے۔ وہ بھی بنگالیوں کے خلاف نفرت کا یہی زہر اگلتے ہوں گے۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی اس نفرت کو میں کتنے پانیوں کو عبور کرتی ہوئی یہاں تک لے آئی ہوں۔" سعیدہ خاموش ہو کر دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پانی کے خالی گلاس سے کھیلنے لگی۔ اس کی نگاہیں بھی اسی گلاس میں اٹکی ہوئی تھیں۔ سلیم نے سوچا شاید یہ نفرتوں سے خالی ہو جانے والا گلاس ہے جسے وہ ابھی ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی۔ خاموشی کا طلسم اس دفعہ سلیم نے توڑا۔

تم نے جب میرے سلام کا جواب تک نہیں دیا تو میرا ذہن ان تاریخی حوالوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ میں اسے ذاتی پسند اور ناپسند کا مسئلہ سمجھ کر بس ایک الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس چھوٹی سی بات کے پیچھے ایک پوری تاریخ چھپی ہو گی۔" سلیم نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکال دی۔ سعیدہ جو گلاس میں پانی بھرنے لگی تھی، پانی کا ایک گھونٹ لے کر بولی۔

"پچھلی نسل کے وہ المئے جو وراثت کی صورت میں مجھ تک منتقل ہوئے آج تک اس لئے جوان ہیں کہ ایک نئی ابتداء کے لئے ہمیں خون کے دریا سے گزرنا پڑا تھا۔ تمہارے لئے تو صرف ایک دھڑا الگ کر دینے کا مسئلہ تھا۔ وہ تم نے جھٹک دیا۔ تمہارے جسم پر جو خراشیں آئی تھیں وہ فوراً ہی مندمل ہو گئیں۔ ہمارے بدن پر جو زخم آئے تھے وہ ابھی تک نہیں بھرے۔" سعیدہ نے ابھی اپنا گلاس خالی نہیں کیا تھا۔ لہجے میں بھی تھوڑی سی تلخی گھل گئی تھی۔

"ایسا نہیں ہے۔ خراشیں ہماری بھی بہت گہری رہی ہوں گی۔ ہمارے نوے ہزار فوجی جنگی قیدی بنا لئے گئے تھے۔ بے شمار لوگ لٹ کر اور گھربار اجاڑ کر آئے، کراچی میں ان سے جو بستیاں آباد ہوئیں وہ غربت کے تازہ اشتہاروں کی طرح تھیں۔

اور آج بھی اسی طرح ہیں۔ ہزاروں آج بھی تمہارے ملک کے کیمپوں میں بے وطنی کی زندگی گزار رہے ہیں تم کو تو ایک کلین سلیٹ ملی تھی۔ ایک نیا ملک جسے تم اپنی مرضی سے جس طرح چاہو بناؤ۔ چلاؤ' ٹھیک ہے تمہیں خون کے دریا سے گزرنا پڑا تھا۔ لیکن آزادی حاصل کرنے والوں کو خون کے دریا میں تیرنا پڑتا ہے۔ یہ قربانیاں المیہ بن کر نفرتیں نہیں اگاتیں۔ چراغ بن کر راستہ دکھاتی ہیں۔ مسئلہ تو ہمارا رہا ہو گا۔ ہماری پیٹھ پر تاریخ کا بوجھ تھا' کندھوں پر ندامتیں سوار تھیں اور جنگ میں ہونے والی شکست نے سر جھکا دیا تھا۔ ہماری سیاسی تاریخ کا ہر کردار مشکوک ہو گیا تھا۔ ہر ایک نے دوسرے پر انگلی اٹھائی ہوئی تھی۔ الزام لگانے والی انگلیوں کے اس ہجوم میں تلاش کرنا مشکل تھا کہ کون غدار ہے اور کون محب وطن۔ کون صحیح ہے اور کون غلط ہے۔ تمہاری آزادی ہمارے لئے ایک بڑا المیہ بن کر رہ گئی تھی۔" سلیم کو نہیں معلوم کہ وہ کس طرح اتنی روانی سے بول سکا تھا۔ بس ایک رو تھی جو اسے بہائے لے جا رہی تھی۔

"ممکن ہے آپ کا المیہ زیادہ بڑا المیہ ہو۔ لیکن بقول آپ کے یہ المیہ نفرتیں بن کر آپ کی نسل تک نہیں پہنچا یہ معجزہ کیسے ہوا؟" سعیدہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"ہم شاید موٹی کھال والے لوگ ہیں۔ بھول جانا جانتے ہیں۔ ہماری کمر بھی بہت مضبوط ہے جس پر ہم تاریخ کا بوجھ لادے جا رہے ہیں۔ پھر بھی تن کر کھڑے ہیں۔ کاندھوں سے ہم نے پرانی ندامتیں جھٹک دی ہیں تاکہ نئی ندامتوں کو جگہ دے سکیں۔ سر بھی ہم نے اٹھا لیا ہے۔ بلکہ زیادہ اونچا اٹھا لیا ہے۔" سلیم نے سوچا کاش وہ سعیدہ کے سوال کا اس سے بہتر جواب دے سکتا۔

"آپ کو بنگلہ دیش یا بنگلہ دیشیوں سے کوئی نفرت محسوس نہیں ہوتی؟" اس دفعہ سعیدہ کے لہجے میں طنز نہیں سچ مچ حیرت تھی۔

"ہمارے پاس آپ سے نفرت کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ہمارے بیوپاریوں نے بہت سی نفرتیں تیار کر کے قطار میں کھڑی کر رکھی تھیں۔" ہمیں ان سب کو موقع دینا تھا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ میری ملک کے عوام کو آپ کے دیس اور

اس کے باسیوں سے نفرت محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارے نفرت کے تاجروں کو اس نفرت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نفرتوں کی منڈی میں آپ کی نفرت کی کوئی مانگ ہی نہیں تھی۔" سلیم کے لہجے میں ایک بار پھر روانی آ گئی۔

"مجھے آپ کی بات سمجھ میں آئی بھی اور نہیں بھی آئی۔ میرا خیال ہے کہ مسئلہ معاشی بھی ہے۔ بلکہ معاشی ہی ہے۔ آپ نے نفرتوں کے جن بیوپاریوں کا تذکرہ کیا ہے ان کا مسئلہ بھی معاشی ہے اور ان کی دکان پر جانے والا بھی روٹی کے مسئلے سے دو چار ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ میں کنسٹرکشن مینجمنٹ میں ماسٹر کر رہی ہوں بلکہ تقریباً کر چکی ہوں۔ میری ریسرچ کا جو موضوع تھا وہ انجنیئرنگ کے عام معاملات سے کافی ہٹ کر تھا۔"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے پروفیسر تھیو نے مجھے بتایا تھا اور اسی لئے میں نے آپ کو سلام کرنے کی گستاخی کی تھی کہ میں آپ کی تھیسس کی تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔" سلیم نے سعیدہ کو درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ بار بار یاد دلا کر شرمندہ نہ کریں۔ میری تھیسس ایک خیالی گاؤں پر مبنی تھی جس میں ایک بہت بڑی عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ اس گاؤں میں دو قبیلے آباد ہیں اور اسی گاؤں کے لوگ تعمیر میں حصہ لے سکتے ہیں لیکن دونوں قبیلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ اس عمارت کی تعمیر میں پہلا انتظامی ماڈل یہ تھا کہ جو جس کام کا اہل ہے اپنے قبیلے کی شناخت سے قطع نظر وہ اس کام پر مامور ہے۔ لیکن دونوں قبیلوں کے لوگ آپس میں لڑ کر کام کا جو وقت ضائع کرتے ہیں اس کے نتیجے میں وہ عمارت جس کی تعمیر میں ایک سال لگنا چاہئے تھا تین سال میں تعمیر ہوتی ہے۔ دوسرا ماڈل یہ تھا کہ تعمیراتی کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور دو مختلف حصوں پر دونوں قبیلوں کے کارکنوں کو الگ الگ مامور کیا جائے۔ اس ماڈل کے بارے میں ماہرین کی اکثریت کا خیال تھا کہ دونوں قبیلے چھپ چھپ کر ایک دوسرے کے کام کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم نے اس رائے کو شامل کر کے جب حساب لگایا تو عمارت کی تعمیر پر دو سال کا وقت لگا لیکن جو عمارت بنی وہ معیار کے مطابق نہیں

تھی۔ دونوں قبیلوں میں مہارت کے اعتبار سے کارکنوں کی تعداد میں یکسانیت نہیں تھی، مختلف طرح کے کام کرنے والوں کے معیار کی سطح بھی مختلف تھی۔ اس طرح ایک ہی ڈیزائن پر تعمیر ہونے والی ایک عمارت کے دونوں حصے الگ الگ نظر آتے تھے۔ تعمیر کا یہ معیار قابل قبول نہیں تھا۔ ہم نے تیسرا ماڈل آزمایا۔ آپ کا کیا خیال ہے، تیسرا ماڈل کیا ہو گا۔" سعیدہ نے سلیم کی طرف چیلنج پھینکا۔

"خلیجی ملکوں والا۔ باہر سے لیبر اور ماہرین بلوانے کا۔" سلیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جی ہاں۔ تعمیر کے لئے ہم نے ساری ورک فورس باہر سے منگوائی۔ لیکن اس گاؤں کے دونوں قبیلوں کا سب سے بڑا ذریعہ آمدنی یہی تعمیراتی پروجیکٹ تھا۔ ایک سال تک جاری رہنے والی مستقل آمدنی دونوں قبیلوں کو ترقی دے سکتی تھی۔ خوشحالی لا سکتی تھی۔ ہم نے کئی ماہرین سے ایک بار پھر معلوم کیا کہ قبیلے والوں کا ردعمل کیا ہو گا ان کی رائے پر مبنی جو خاکہ بنا وہ یہ تھا کہ قبیلے کے پڑھے لکھے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے احتجاجی مظاہرے کریں گے۔ انتہا پسند باہر جنگلوں میں جا چھپیں گے اور غیر ملکی کارکنوں کو ہراساں کرنے کے لئے حملوں اور سبوتاژ کرنے کی کارروائی کریں گے۔ سب ماہرین اس پر متفق تھے کہ دونوں قبیلے اپنی آپس کی لڑائی بھول کر یہ لڑائی مشترکہ طور پر لڑیں گے۔ ہم نے پھر بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں کے تعاون سے احتجاج اور حملوں کے باوجود عمارت مکمل کرا لی۔ تعمیر ہونے میں ڈیڑھ سال لگا، لیکن لاگت ڈھائی گنا زیادہ آئی تھی۔ تعمیراتی کمپنی جس کو ٹھیکہ ملا تھا اس کے لئے یہ ایک گھاٹے کا سودا تھا۔ اس کے علاوہ ماہرین کا خیال تھا کہ یہ عمارت گاؤں میں ہمیشہ نفرت کی علامت بنی رہے گی۔ جس نے یہ عمارت بنوائی تھی اس کے لئے بھی اس پروجیکٹ سے وہ فائدے حاصل کرنا آسان نہیں ہو گا جس کے لئے اس نے عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اس طرح یہ ماڈل بھی ناکام رہا۔ اب ہمیں اس تعمیراتی پروجیکٹ کے انتظام کا ایک ایسا ماڈل بنانا تھا کہ عمارت ایک سال میں بنے، بجٹ کے اندر رہتے ہوئے بنے اور جس کی تعمیر کے لئے دونوں قبیلوں کے تعلق رکھنے والے

کارکنوں کو ہی استعمال کیا جائے۔ کوئی آئیڈیا؟" سعیدہ نے ایک بار پھر سلیم کو آزمانا چاہا۔

"جی ہاں ایک ماڈل میرے ذہن میں ہے۔ لیکن آپ میرا امتحان نہ لیں یہ بتائیں آپ نے کیا کیا۔" سلیم نے اس کا چیلنج واپس کر دیا۔

"ہم پہلے ماڈل پر واپس چلے گئے۔ ہر ایک کو اس کے قبیلے کی شناخت سے قطع نظر اس کی اہلیت کے مطابق کام پر مامور کرنے والے ماڈل پر۔ لیکن ہم نے کام کی شرائط تبدیل کر دیں۔ سب سے نئے کنٹریکٹ پر دستخط کرائے۔ سب نے خوش ہو کر ان معاہدوں پر دستخط کئے کیونکہ اس میں ہم نے ان کی تنخواہیں بڑھا دی تھیں۔ انہیں نو کی جگہ دس ڈالر گھنٹے کا ریٹ دیا تھا۔ لیکن شرط یہ تھی کہ جھگڑوں کی وجہ سے جو وقت ضائع ہو گا اس کے پیسے نہیں دیئے جا سکیں گے۔"

"تو کیا جھگڑے ختم ہو گئے تھے۔" سلیم نے پوچھا۔

"نہیں جھگڑے ہوتے رہے لیکن دیر تک نہیں چلے' جھگڑا کرنے والوں کو انہیں کے قبیلے والے سمجھا بجھا کر واپس لے آتے کوئی بھی اپنی آمدنی کے ایک بھی گھنٹے سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جس عرصے میں کام بند ہوا تھا اس کی کسر دیر تک کام کر کے پوری کر دی گئی۔ ہمارے منظر نامے میں ایک بڑا جھگڑا بھی تھا۔ وہ کام پر نہیں تھا۔ قبائل کسی پرانی بات پر مشتعل ہو کر ایک دوسرے سے لڑ پڑے تھے۔ خون خرابا بھی ہوا تھا۔ ہم نے پروجیکٹ بند کر دیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ اس جھگڑے کی باز گشت کام پر بھی جاری رہے گی۔ دونوں قبائل جھگڑا بھول کر اس مطالبے میں شریک ہو گئے کہ پروجیکٹ پر کام فوراً کھول دیا جائے۔ ہم نے پروجیکٹ کو کچھ دنوں تک اور بند رکھا اور پھر کھولا تو انہوں نے اس جذبے سے لڑے بغیر کام شروع کر دیا جیسے کام کھلوا کر انہوں نے کوئی فتح حاصل کر لی ہو۔ یہ نئی قسم کی فتح تھی جو کسی ایک قبیلے نے دوسرے پر حاصل نہیں کی تھی بلکہ جس میں دونوں شریک تھے۔"

"اس سارے منظر نامے میں آپ نے قبائلی سرداروں کا کیا کردار رکھا۔" سلیم نے ایک بار پھر ٹوکا۔

"دلچسپ بات یہی تھی کہ اس ماڈل میں ہم نے اپنے ماہرین کے مشورے پر سرداروں کو اس طرح استعمال کیا تھا کہ اپنے اپنے قبیلے پر سردار کی حیثیت سے ان کی فضیلت بھی قائم رہے اور ان کے معاشی مسائل بھی طے کر دیئے جائیں۔ مشاورتی کونسل بنا دی گئی تھی۔ یہ کونسل کمپنی کو افرادی قوت کے معاملوں پر مشورے دیتی تھی اور پروجیکٹ پر ہونے کے جھگڑوں میں ثالثی کا کردار بھی ادا کرتی تھی۔ اس کام کے لئے انہیں اتنا معاوضہ دیا جاتا تھا جو سردار کی حیثیت سے ان کے معیار زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کافی ہوتا۔ نتائج حیرت انگیز تھے۔ ہم نے اپنی یہ خیالی عمارت گیارہ مہینوں میں مکمل کر لی تھی۔ ایک مہینے کی بچت سے ہمارے اضافی اخراجات پورے ہو گئے تھے۔ اس طرح عمارت بجٹ میں رہتے ہوئے بنی تھی۔"

"آپ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کا کیا ہوا۔ وہ تو پھر قبیلوں پر حکمرانی کرنے لگی ہو گی۔" سلیم نے مذاق کیا۔

"نہیں۔ یہ پروجیکٹ ایک بین الاقوامی امدادی ادارے نے بنوایا تھا' خیالی تعمیر مکمل کرنے کے بعد یہ عمارت اس ادارے کے حوالے کر کے ہماری تصوراتی ایسٹ انڈیا کمپنی شاید ایک دوسرے تعمیراتی منصوبے پر کام کرنے چلی گئی۔" سعیدہ نے بھی اسی خوش مذاقی سے جواب دیا۔

"لیکن عمارت کی تعمیر کے بعد ان قبیلوں کا کیا ہوا۔ عمارت کی تعمیر کے بعد کیا وہ پھر لڑائی میں مصروف ہو گئے ہوں گے۔" سلیم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہم نے اس پر کام نہیں کیا۔ ہم تو انجنیئر لوگ تھے' اپنا تعمیراتی منصوبہ مکمل کرنے کے اس کٹھن کام کا منظر نامہ ہم نے بہت کامیابی سے بنا دیا تھا۔ یہ اب تاریخ دانوں اور سماجی علوم کے ماہرین کا کام ہے کہ وہ ان قبائل کے مستقبل کا تعین کریں۔ ویسے میں اندازہ کر سکتی ہوں اور میں اس پر اکثر سوچتی بھی رہی ہوں۔ میرا منظر نامہ یہ ہے کہ عمارت نے قبیلوں کے درمیان نفرت کو کم کیا۔ عمارت دونوں قبیلوں کی مشترکہ کوششوں سے بنی تھی اس لئے ان کے اتحاد کی علامت بن گئی۔ یہ عمارت علاقے کے لوگوں کو ایک مستقل ذریعہ آمدنی فراہم کرنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ آس پاس کے

علاقوں کے تاجروں اور بین الاقوامی کمپنیوں نے اس میں اپنے اپنے دفاتر کھولے ایک فلور پر گارمنٹس بنانے والی فیکٹری کھل گئی۔ بیسمنٹ میں پرنٹنگ اور پیکنگ کا یونٹ لگ گیا۔ دونوں قبیلوں کے لوگ اپنی اپنی اہلیت اور مہارت کے اعتبار سے ان دفاتر اور فیکٹریوں میں کام کرنے لگے۔ پہلی بار عورتیں بھی گارمنٹس فیکٹری میں جا کر کام کرنے لگیں۔ اور اس معاشی دوڑ میں اپنے مردوں کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ پڑوس کے علاقوں کے قبائل سے تعلق رکھنے والے بھی بڑی تعداد میں کام کی تلاش میں یہاں آنے اور آباد ہونے لگے۔ بستی پھیلتی چلی گئی۔ قبائلی شناخت آہستہ آہستہ دھندلانے لگی۔ آپس میں رشتے داریاں اور دوستیاں جنم لینے لگیں۔ سرداروں کی نئی نسل بھی پڑھ لکھ کر آئی تھی۔ وہ زیادہ روشن خیال تھی اس نے قبائلی دشمنیوں کو اپنی سرداری قائم رکھنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اس نے منافع کمانے کی دوڑ میں شریک ان سرمایہ داروں سے ناطہ جوڑا جن کا کوئی مذہب کوئی قبیلہ نہیں ہوتا' جن کی کوئی قومی یا نسلی شناخت نہیں ہوتی۔ قبائلی بھی ایک نئی معاشی ڈور میں بندھ گئے تھے۔ قبائلی شناخت طبقاتی شناخت میں بدل گئی تو آپس کی پرانی لڑائیاں اور فساد بھی ختم ہو گئے۔ اب مسائل بھی نئے تھے اور لڑائیاں اور ان کی نوعیت بھی نئی تھی۔

اپنی خیالی جنت کو بیان کر کے سعیدہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اور سلیم سوچ رہا تھا کہ اگر اس کے پاس وقت ہوا تو وہ بھی اپنے ماڈل کی بنیاد پر ایک منظر نامہ لکھے گا لیکن اس کے ماڈل میں چار قبائل ہوں گے جو باہر سے آئے ہوئے ایک قبیلے کے لوگوں کے ساتھ مل کر عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ دیکھے گا کہ عمارت کتنی دیر میں کتنی لاگت سے اور کیسی بنتی ہے۔ اپنی خیالی عمارت کے دھندلے دھندلے نقوش اس کی نظروں میں واضح ہونے لگے۔"

چھ بج چکے تھے اور ڈنر کے لئے آنے والوں سے ریسٹورنٹ بھرنے لگا تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی عورت جو یقیناً" مالک رہی ہو گی دو گھنٹوں سے بیٹھے ہوئے ان گاہکوں کو اب بار بار گھورنے لگی تھی۔ دونوں اپنی اپنی خیالی جنت اپنے سینوں میں چھپائے گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

سلیم اور سعیدہ باقاعدگی سے ملنے لگے تھے۔ سلیم کو اکثر علی کی بات یاد آتی کہ اس دیس میں شیطان عورتوں کی صورت میں رہتا ہے۔ لیکن اسے یقین تھا کہ علی کی مراد آسٹریلوی دیس کی عورت سے تھی۔ سعیدہ تو ہم مذہب اور ایک طرح سے ہم وطن تھی۔ وہ یقیناً" ایوان کی طرح شیطان کا روپ نہیں ہو گی۔

مارچ کا مہینہ جاتے جاتے پت جھڑ کا تحفہ دے گیا تھا۔ آسٹریلیا میں اپریل خزاں کا مہینہ ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی فضا میں بھی پیڑوں سے جدا ہونے والی خشک پتے ہوا کی سواری کرنے لگے تھے۔ ایک شام سعیدہ اسے اسٹمپس لے کر آئی اور کافی لا کر میز پر بیٹھتے ہوئے سلیم کو بتایا کہ اس کی تھیسس قبول ہو گئی ہے' اور وہ اپنی سیٹ بک کرانے کے لئے ٹریول ایجنٹ کے پاس جا رہی ہے۔ لیکن سعیدہ نے یہ خبر سناتے ہوئے کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سلیم کو حیرت تھی کیونکہ اسے یاد تھا کہ پہلے واپس جانے کا تذکرہ کرتے ہی اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتی تھیں۔ آج اس کے لہجے پر شاید خزاں کے موسم کا اثر تھا۔ دوسرے دن اس نے سلیم کو بتایا کہ وہ اگلے ہفتے واپس چلی جائے گی اس کی سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔ سلیم نے مسکرا کر خوشی کا اظہار کیا' لیکن سینے میں اداسی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ سلیم نے سوچا اسے الوداعی ڈنر دینا چاہئے۔ لیکن کسی ریسٹورنٹ لے کر جانا سلیم کی بساط سے باہر تھا۔ احمد اور علی کی موجودگی میں کسی لڑکی کو کھانے کے لئے گھر بلانا بھی ممکن نہ تھا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سعیدہ نے تجویز پیش کر دی۔

"میری فلائٹ ہفتہ کو دوپہر میں ہے' کیا خیال ہے جمعہ کی رات کو ہم الوداعی کھانا ساتھ کھائیں۔"

"ٹھیک ہے۔" سلیم کو بھی ایک حل سوجھ گیا۔ "لیکن دعوت میری طرف سے ہو گی۔ کھانا پکا کر میں لاؤں گا۔ گھر تمہارا ہو گا۔ تم چاہو تو فلیٹ میں اپنے ساتھ والی لڑکیوں کو بھی دعوت دے سکتی ہو۔" سلیم کو معلوم تھا کہ سعیدہ دو آسٹریلوی لڑکیوں کے ساتھ مل کر رہتی ہے۔

"میں کہہ دوں گی۔ لیکن پکاؤ گے کیا۔" سعیدہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"خاص تمہاری پسند کی چیز۔ مچھلی کا سالن اور ابلے ہوئے چاول۔" سلیم کو ایسا لگا جیسے سعیدہ کے منہ میں پانی آنے لگا ہو۔

"جمعہ کو سلیم یونیورسٹی نہیں گیا صبح ہی اٹھ کر فش مارکیٹ سے مچھلی خرید کر لایا تھا۔ پکانے میں زیادہ وقت نہیں لگا لیکن کاٹنے اور صاف کرنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ چودھری انور سے اس نے ایک رات پہلے ہی کہہ دیا تھا اس نے اپنی ٹیکسی میں سلیم کو اس کی دو ہانڈیوں سمیت سعیدہ کے گھر اتار دیا۔ سلیم نے اسے سعیدہ سے ملوایا اور کھانے کے لئے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ یہ کہہ کر فوراً ہی چلا گیا کہ جمعہ کی رات اس کے کام کی بہت مصروف رات ہے۔ سعیدہ کے ساتھ رہنے والی دونوں لڑکیاں بھی نہیں تھیں شاید وہ اپنی شریک فلیٹ کو تنہائی فراہم کرنے کے لئے کہیں چلی گئی تھیں۔

وہ لاؤنج میں بیٹھ گئے جہاں بہت سادہ فرنیچر رکھا تھا۔ معمولی سا صوفہ، ایک عام سی کافی ٹیبل، سائڈ کی چھوٹی میز پر ایک چھوٹا سا ریڈیو رکھا تھا جس میں کیسٹ پلیئر بھی لگا ہوا تھا۔ سعیدہ نے بنگالی گیتوں کا کوئی کیسٹ لگایا ہوا تھا۔ سلیم سعیدہ کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے مبہوت ہو گیا۔ کپڑے تو اس نے ہمیشہ کی طرح سادہ سے پہنے ہوئے تھے لیکن اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ انتہائی گھنے اور لمبے بال گھٹاؤں کی طرح ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ سلیم نے سوچا ان زلفوں کے سائے کتنے خنک ہوں گے۔

"کھلے ہوئے بال تم پر واقعی بہت اچھے لگ رہے ہیں۔" وہ تعریف زبان پر بھی لے آیا۔ سعیدہ کی سانولی رنگت میں نارنجی رنگ گھلنے لگا۔

"مجھے چوٹی گوندھنے کا وقت نہیں مل سکا تھا۔ میری ماں کھلے ہوئے بالوں کو دیکھ کر ہمیشہ مذاق کرتی ہے کہ مجھ پر جن عاشق ہو جائیں گے۔" سعیدہ نے کچھ شرماتے کچھ جھینپتے ہوئے کہا۔

"اپنی ماں کو بتانا کہ آسٹریلیا میں جن نہیں ہوتے۔" سلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور جو ہوتے ہیں وہ بھی یہاں آ کر آدمی بن جاتے ہیں۔" سلیم سعیدہ کے

اس جملے پر صرف انجان بنا ہنستا رہا۔

سعیدہ اس کے لائے ہوئے کھانے کو گرم کرنے کچن کی طرف چلی گئی۔ کھانے کے دوران زیادہ تر خاموشی رہی۔ کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے سلیم نے پوچھا۔

"تم نے اپنی بہن کو آنے کی اطلاع دے دی۔"

"نہیں ابھی نہیں۔ میں نے سوچا تھا شاید کوئی رک جانے کو کہہ بیٹھے۔ اور مجھے سفر کا ارادہ ترک کرنا پڑے۔" سعیدہ نے مذاقاً" کہا۔ لیکن سلیم کو معلوم تھا کہ یہ مذاق کتنی سنجیدگی لئے ہوئے ہے۔ وہ سعیدہ سے نظریں چرانے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹک اٹک کر کچھ کہنے کی کوشش کرتا سعیدہ اسے بتانے لگی۔

"میں کل ایئر پورٹ سے فون کر کے اسے بتاؤں گی۔ اگر میں پہلے سے بتا دیتی تو وہ ایئر پورٹ پر میری بارات لے کر پہنچتی۔ وہ آج کل پورے لندن میں میرا رشتہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آسٹریلیا میں کسی کو پسند کر لوں۔ لیکن میں یہاں رشتہ تلاش کرنے نہیں پڑھنے آئی تھی اس لئے میری بہن نے اب اس کام کا بیڑہ خود اٹھا لیا ہے۔" سعیدہ کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں خاموشی ہو گئی۔ بنگلہ گیتوں کا کیسٹ پہلے ہی ختم ہو کر بند ہو چکا تھا۔

"یہ چھوٹا سا تحفہ تمہیں ہماری دوستی کی یاد دلاتا رہے گا۔" سلیم نے کوٹ کی جیب سے احمد فراز کی گائی جانے والی غزلوں کی کیسٹ نکال کر سعیدہ کو دیتے ہوئے کہا۔ یہ اس کا پسندیدہ کیسٹ تھا جو وہ پاکستان سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔

"یہ ہمارے سب سے مقبول شاعر کی غزلیں ہیں۔ تم اپنی امی کو ضرور سنانا' وہ شعر کہتی رہی ہیں انہیں یہ غزلیں بہت پسند آئیں گی۔"

"یہ تحفہ میرے لئے ہے یا میری ماں کے لئے۔" سعیدہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یہ تمہارے لئے ہی ہے۔ اسے لگا کر دیکھو ایک ایک مصرعہ تمہارے

دل میں اتر جائے گا۔" سلیم نے ذرا دھیمے اور اداس لہجے میں کہا۔ سعیدہ نے خاموشی سے کیسٹ کو کیسٹ پلیئر پر لگا دیا۔ غلام علی کی آواز ماحول کو افسردہ کرنے لگی۔

پھر اسی رہگذار پر شاید
ہم کبھی مل سکیں مگر شاید
جن کے ہم منتظر رہے ان کو
مل گئے اور ہمسفر شاید
جان پہچان سے بھی کیا ہو گا
پھر بھی اے دوست غور کر شاید
زندگی پھر بہار لائے گی
یاد یاران بے خبر شاید
جو بھی بچھڑے وہ کب ملے ہیں فراز
پھر بھی تو انتظار کر شاید

سعیدہ نے دوسری غزل شروع ہونے سے پہلے ہی کیسٹ بند کر کے نکال دیا۔ وہ شاید تھوڑی دیر کے لئے اس غزل کا تاثر قائم رکھنا چاہتی تھی۔ چند لمحوں کے لئے وہ اسی طرح خاموش بیٹھے غزل کے چھوڑے ہوئے تاثر کو جذب کرتے رہے۔ رات کے دس بج چکے تھے سلیم خدا حافظ کہنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس الوداعی ملاقات کو کوئی جذباتی موڑ دیئے بغیر جانا چاہتا تھا۔

"دنیا بہت چھوٹی ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے ہم پھر ملیں۔" سلیم نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"شاید!" سعیدہ صرف یہی کہہ سکی۔ وہ اس کے ساتھ باہر تک آئی تھی۔ "دل سے ساری نفرتیں ضرور نکال پھینکنا۔" سلیم نے آخری خدا حافظ کہنے سے پہلے کہا۔ سعیدہ نے سوچا کہ نفرتیں تو وہ کب کی بھول گئی۔ اب تو اسے محبتوں کو بھلانے کی

آزمائش درپیش تھی۔ لیکن وہ صرف خدا حافظ کہہ سکی اور دیر تک دروازے میں کھڑی ہاتھوں میں خالی دیگچیاں لٹکا کر جاتے ہوئے سلیم کو دیکھتی رہی۔

سلیم سعیدہ کے جانے کے بعد کئی دن تک بہت اداس رہا تھا۔ وہ اس کی موجودہ زندگی میں ایک خلا سا چھوڑ گئی تھی۔ یونیورسٹی میں کوئی اور ایسا نہیں تھا جس کے ساتھ وہ پڑھائی سے لے کر دنیا بھر کے تمام معاملوں پر اتنی بے تکلفی سے باتیں کر سکتا۔ اس کا سپروائزر پروفیسر تھیو ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اس لئے پڑھائی کا دباؤ بھی کم تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی ٹھنڈی ہوائیں اور تیز بارشیں معمول بن گئی تھیں۔ اکثر وہ یونیورسٹی کے ورانڈے میں پڑی ہوئی کسی بنچ پر تنہا بیٹھا بارش کی گرتی ہوئی بوندوں کو گھورتا رہتا۔ سعیدہ کے جانے کے تقریباً دو ماہ بعد اسے سعیدہ کا خط ملا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ لندن میں رہنے والے ایک بنگلہ دیشی ڈاکٹر سے اس کی شادی ہو گئی ہے اور ایک مہینہ یورپ گھومنے کے بعد اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی مستقلاً بنگلہ دیش جا کر آباد ہو رہا ہے۔ اس نے شوہر کے ساتھ اپنی تصویر بھی بھیجی تھی۔ وہ ساڑھی میں ملبوس گہرا میک اپ اور بھاری زیور پہنے ہوئے ایک بھرپور عورت لگ رہی تھی۔ اس نے بال کٹوا دیئے تھے صرف شانوں تک کے بال رہ گئے تھے اپنے ہونٹوں پر وہی اداس سی مسکراہٹ تھی لیکن سلیم کو لگا کہ یہ وہ سعیدہ نہیں تھی جسے وہ جانتا تھا۔ کھلے ہوئے گھنے اور لمبے بالوں میں سے چاند کی طرح جھانکتا ہوا سعیدہ کا سانولا سا چہرہ سلیم کی آنکھوں میں آکر ٹھہر گیا۔

آسٹریلیا میں گزرنے والا پت جھڑ کا پہلا موسم سلیم کو خزاں رسیدہ کرنے لگا تھا۔ اپریل کا مہینہ اس کے لئے کئی بری خبریں لے کر آیا۔ اپریل کا آخر آ رہا تھا لیکن پروفیسر تھیو کی ابھی تک کوئی خبر نہیں تھی۔ ایک دن اسے ڈپارٹمنٹ کی سیکریٹری نے بتایا کہ وہ پروفیسر وہائٹ سے رابطہ کرے کوئی ضروری معاملہ ہے۔ پروفیسر وہائٹ سول انجنیئرنگ کا ہیڈ تھا' اس سے ملا تو اس نے سلیم کو وہ خبر سنائی جسے سننے کے لئے وہ تیار

نہیں تھا۔ خبر تھی پروفیسر تھیو کی کہ وہ فی الحال واپس نہیں آئے گا اور شاید کبھی واپس نہ آئے۔ پروفیسر وہائٹ نے بتایا کہ تھیو کو لگاتار دو ہارٹ اٹیک ہوئے ہیں۔ اگلے ہفتے اس کا بائی پاس کا آپریشن ہے وہ اس سال نہیں آئے گا۔ اگلے سال شاید آئے بھی تو ہمیشہ کو واپس جانے کے لئے۔ انجنیئرنگ کے سربراہ نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ اس کے لئے ایک نیا سپروائزر تلاش کر رہے ہیں لیکن اس میں شاید کچھ وقت لگے گا۔ اس وقت تک وہ اپنے طور پر کام کرتا رہے۔ سلیم اپنی جلدی واپسی کے منصوبوں کا ماتم کرتا ہوا پروفیسر وہائٹ کے کمرے سے نکل آیا۔ سلیم کو پتہ تھا کہ اس کے لئے نیا سپروائزر تلاش کرنا آسان نہیں ہو گا۔ لیکن پروفیسر وہائٹ نے وعدہ کیا تھا اس لئے فی الحال سلیم نے خود کو کچھ عرصے کے لئے پروفیسر وہائٹ اور مقدر کے حوالے کر دیا۔

ایک شام اسے پریشان کرنے والی ایک اور خبر ملی۔ چودہری انور گرفتار کر لیا گیا تھا۔

چودہری انور کے لئے جیل بہت برا تجربہ نہیں تھی۔ اسے دکھ صرف اس بات کا تھا کہ جیل پہنچوانے کی وجہ اس کے اپنے ملک والے بنے تھے بلکہ چودہری انور تو مفت میں مارا گیا تھا۔ رات وہ اتفاقاً ہی ہاتھ آیا تھا۔ منگل کی رات تھی کام کم تھا اس لئے وہ ٹیکسی جلدی بند کر کے گھر آگیا تھا۔ ظہیر اور ایک دوسرا شخص مشتاق جو فیکٹری میں کام کرتا تھا سو رہے تھے کہ امیگریشن نے پولیس والوں کے ساتھ گھر پر چھاپہ مارا۔ وہ اقبال نامی اس لڑکے کی تلاش میں آئے تھے جس نے حال ہی میں ان کے ساتھ آکر رہنا شروع کیا تھا۔ اقبال کے بارے میں کسی نے شکایت کی تھی کہ وہ آسٹریلیا میں غیر قانونی طور پر رہتا اور کام کرتا ہے۔ چودہری انور کو معلوم تھا کہ اقبال کا حال ہی میں کسی پاکستانی سے جھگڑا ہوا تھا اور یقیناً اسی کی شکایت پر امیگریشن والے پولیس کو لے کر آئے تھے۔ اقبال تو نہیں تھا لیکن تینوں کے کاغذات دیکھنے کے بعد وہ چودہری انور اور مشتاق کو پکڑ کر لے گئے کیونکہ دونوں کے ویزے کئی مہینے پہلے ختم ہو چکے تھے۔ ظہیر کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ قانونی طور پر آسٹریلیا آیا تھا اور اسے اس کے ڈاکٹر چچا نے اسپانسر کیا تھا۔ اب تو دو سال مکمل ہونے پر وہ آسٹریلیا کا شہری بھی بننے

والا تھا۔

چودہری انور کے ساتھ گرفتار ہونے والا مشتاق بہت کم گو تھا اور جیل میں بھی اپنے آپ میں گم الگ تھلگ رہتا تھا۔ اس کی رہائی کے لئے اس فیکٹری کا مالک کوشش کر رہا تھا جس میں وہ کام کرتا تھا۔ اس نے مشتاق کے لئے ایک بڑا وکیل کیا تھا جس نے ضمانت کی درخواست داخل کر دی تھی۔ مشتاق مشینوں کا بہت اچھا کاریگر تھا جب سے اس نے فیکٹری کا کام سنبھالا تھا کسی مشین کو بند نہیں ہونے دیا تھا۔ فیکٹری کا مالک اسے ہر قیمت پر فیکٹری واپس لانا چاہتا تھا۔

جیل میں چودہری انور کی ایک اور پاکستانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی اپنے کسی پاکستانی بھائی کی شکایت پر غیر قانونی ہونے کے جرم میں پکڑا گیا تھا۔ ۴۵۔۵۰ سال کی پختہ عمر کا آدمی لگتا تھا۔ بڑا سا چہرہ' موٹے نقوش' بھاری جبڑا' بہت گھنے اور کھچڑی بال' آنکھوں پر پلاسٹک کے موٹے فریم کا چشمہ جس سے وہ پروفیسر نما ہو گیا تھا۔ گفتگو کا انداز بھی ایسا ہی تھا۔ مقرروں جیسا خطیبانہ لیکن بہت بے تکلفی لئے ہوئے۔ لفظ اس کی زبان پر اس طرح دوڑے آتے تھے جیسے اس کے حکم کے منتظر ہوں۔ آواز بھاری اور گرجدار تھی' پرانے زمانے کے ریڈیو کے اناؤنسروں جیسی۔ چودہری انور اس سے مل کر بہت متاثر ہوا تھا۔ لیکن اسے اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ جیل کی یہ ملاقات ہمیشہ قائم رہنے والی ایک پائیدار دوستی میں بدل جائے گی۔ بہت شاعرانہ قسم کا نام تھا۔ ظہور بیدل۔ اپنے نام کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"میرا آبائی نام خاصا طویل تھا ۔ نام میں بیدل کے تخلص کا دم چھلا بھی لگ گیا۔ یونیورسٹی پہنچا تو ترقی پسندی کا بھوت سوار ہوا۔ ذات پات قبیلے اور فرقے کی شناخت سے چھٹکارا پانے کے لئے نام کا صرف پہلا اور آخری حصہ لے کر بیچ کے حصے حذف کر دیئے۔" ظہور کو شاید ہر بات اسی طرح تفصیل سے بیان کرنے کی عادت تھی۔

"لیکن نام سے ذات پات یا قبیلے کی شناخت ظاہر ہونے میں کیا حرج ہے۔" چودھری انور نے حیرت ظاہر کی۔

"نام گاڑیوں کی نمبر پلیٹ کی طرح ہوتے ہیں نمبروں سے گاڑیوں کی انفرادی شناخت ظاہر ہوتی ہے ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس ملک کی بنی ہوئی ہے کس کمپنی نے بنائی ہے اور ماڈل کون سا ہے۔ ہمارے نام بھی اسی لئے ہیں کہ کسی ہجوم میں پکارا جائے تو فوراً" پلٹ کر دیکھ لیں۔ لیکن ایک آدمی کو پکارنے کے لئے اس کے پورے قبیلے کو آواز دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا تو خیال ہے چودہری آپ بھی صرف انور ہو جائیے۔ چودہریوں کا زمانہ گزر گیا ہے۔" ظہور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے نام سے چودہری نکل گیا تو لگے گا میں ننگا ہو گیا ہوں۔" چودہری انور نے ہنستے ہوئے کہا۔ ظہور بھی ہنسنے لگا۔

ظہور ایک مہینے سے جیل میں تھا۔ اس کی دس ہزار ڈالر کی ضمانت منظور ہو چکی تھی اس لئے چودہری انور حیران تھا کہ وہ رہا کیوں نہیں ہوتا۔ ظہور نے اسے صرف اتنا بتایا تھا کہ اس نے امیگریشن میں درخواست دی ہوئی ہے اور جواب کا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے کسی وکیل کی مدد نہیں لی تھی اور اپنا کیس خود تیار کیا تھا۔ چودہری انور زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اس نے دیکھا تھا کہ ظہور بڑی روانی سے انگریزی لکھتا تھا۔ چودہری انور کو اس کا ذاتی تجربہ بھی ہوا تھا۔ ظہیر جب اس کے لئے وکیل کو لے کر آیا تو اس نے تجویز دی تھی کہ چودہری انور فوراً" ریفیوجی اسٹیٹس حاصل کرنے کے لئے اپنا کیس داخل کر دے۔ اس نے کیس داخل نہیں کیا تو اس کے خلاف ملک سے نکالنے کی کارروائی ہو گی اور ایک ہفتے میں اسے جہاز میں سوار کر کے پاکستان بھجوا دیا جائے گا۔ چودہری انور اس خیال سے بھی لرز گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اسے پاکستان بھیج دیا گیا تو اس کے ساتھ کیا ہو گا۔ وکیل نے چودہری انور کو بتایا تھا کہ اگر اس کا ریفیوجی کا کیس داخل کر لیا گیا تو اسے اس وقت تک نہیں نکالا جا سکے گا جب تک کیس کا فیصلہ نہ ہو۔ اس میں کم از کم دو سال لگ جائیں گے۔ فیصلہ خلاف ہوا تب بھی اپیل کی جا سکے گی۔ ایک سے دو سال اس میں بھی گزر جائیں گے۔ اس عرصے میں وہ اپنا متبادل انتظام کر سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی درخواست منظور ہو جائے اور اسے مستقل رہنے کی اجازت دے دی جائے۔

ظہور نے چودہری انور کے وکیل کی بات سے اتفاق کیا لیکن ریفیوجی کی درخواست ڈالنے کی بنیاد سے اختلاف کیا تھا۔ وکیل نے چودہری انور سے کہا تھا کہ وہ مذہبی یا سیاسی بنیادوں پر سیاسی پناہ کا کیس داخل کرے۔ لیکن ظہور نے جسے چودہری انور اپنی پوری کہانی سنا چکا تھا مشورہ دیا تھا کہ اس کے پاس سیاسی اور مذہبی بنیاد پر پناہ حاصل کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ امیگریشن کے پاس ایسے کیس روز داخل ہوتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں بہت تجربہ کار ہو گئے ہیں' وہ چودہری انور کی ابتدائی درخواست ہی رد کر دیں گے اور وہ چند مہینوں کے اندر پھر اسی مقام پر کھڑا ہو گا جہاں آج ہے۔ ظہور نے اسے سمجھایا تھا کہ اس کے ساتھ جو گزری ہے اسی کو وہ اپنے کیس کی بنیاد بنائے۔ اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور اپنے سچ کو ثابت کرنے کے لئے اس کے پاس بے شمار شواہد بھی ہوں گے۔ پھر اس کی صورتحال جان کر امیگریشن والے اس کی درخواست کو فوراً" رد کرنے سے ہچکچائیں گے۔ اس کا کیس اپنی نوعیت کا ایک نیا کیس ہو گا۔ ظہور نے چودہری انور کے کیس کا پورا ڈرافٹ تیار کیا تھا جسے دیکھ کر وکیل بھی مرعوب ہوا تھا اور ظہور کی بنائی ہوئی بنیاد پر کیس فائل کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ چودہری انور کے لئے ساری بھاگ دوڑ ظہیر کر رہا تھا۔ سلیم ان معاملات سے واقفیت نہیں رکھتا تھا لیکن وہ ظہیر کے ساتھ چودہری انور سے ملنے ضرور آتا اور اسے ہر طرح کی تسلی دینے کی کوشش کرتا تھا۔

چودہری انور کی درخواست فائل ہونے کے بعد جب اس کا انٹرویو ہوا تو اس کی درخواست پر ظہور کو ہی اس کا انگریزی کا ترجمان مقرر کیا گیا۔ چودہری انور نے جس انداز میں اپنی کہانی سنائی اور جس طرح تمام تر جذبوں کے ساتھ انگریزی میں ڈھل کر ظہور نے اسے بیان کیا اس سے انٹرویو لینے والی امیگریشن کی افسر بہت متاثر ہوئی۔ اس نے چودہری انور کو یقین دلایا کہ اس کے خلاف ملک سے نکالنے کی کارروائی اس وقت تک نہیں ہو گی جب تک اس کی درخواست کی مکمل تحقیق کے بعد امیگریشن کسی نتیجے پر نہ پہنچے۔ امیگریشن افسر نے یہ بھی بتایا کہ اس کی ضمانت کی درخواست کی مخالفت نہیں کی جائے گی۔ چودہری انور بہت خوش تھا۔ اسے خوشی اس

لئے بھی تھی کہ چند دنوں کی جیل نے اس کے معاملات کو پٹڑی پر ڈال دیا تھا' اب چند سالوں تک وہ بے فکری سے رہ سکتا تھا۔ لیکن اس روز اسے ظہور کچھ پریشان لگا۔ چودہری انور کے پوچھنے پر اس نے مسکراتے ہوئے بتایا کچھ نہیں صرف اسے چند دن جیل میں اور گزارنے پڑیں گے۔ لیکن چودہری انور نے بہت اصرار کیا تو اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"میں ایک ریسٹورنٹ میں شیف کا کام کرتا ہوں۔ اچھے پیسے ملتے ہیں اور مالک بھی مجھ سے بہت خوش تھا۔ اس نے میری مدد بھی بہت کی۔ میں نے پکڑے جانے کے بعد شیف کی پیشہ ورانہ مہارت کی بنیاد پر مستقل رہ جانے کے لئے درخواست دائر کر دی تھی۔ میرے ریسٹورنٹ کے مالک نے اس کی حمایت میں خط دیئے' سرٹیفکیٹ دیئے اس بات کی تصدیق کی کہ میرے بغیر ریسٹورنٹ کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے اور مجھے مستقل ملازم رکھنے کی ضمانت بھی دی۔ آج کل آسٹریلیا میں شیف کی کمی ایک مسئلہ ہے اور امیگریشن والے اس سے واقف ہیں' اس لئے میرا کیس بہت مضبوط ہے' میری ضمانت بھی منظور ہو گئی' لیکن دس ہزار ڈالر کی ضمانت داخل کرانے میں ریسٹورنٹ کے مالک نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ میں نے بھی ضمانت جمع کرانے کے لئے اس سے اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ خود میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ بلکہ بالکل بھی نہیں ہیں۔ جو کچھ جمع کئے تھے گرفتاری سے ایک ہفتہ پہلے میں نے گھر بھیج دیئے۔ میری بیٹی کی شادی ہے۔ میں خوش ہوں کہ گرفتاری سے پہلے پیسے بھیج چکا تھا۔ ورنہ ہمیشہ کی طرح خود غرضی میں مبتلا ہو کر بیٹی کی شادی بھول جاتا اور اپنی ضمانت جمع کرا دیتا۔ میں نے درخواست دی تھی کہ میرے پاس نقد پیسے نہیں ہیں مجھے شخصی ضمانت پر چھوڑ دیا جائے میں ہر ہفتے ان کے دفتر یا تھانے میں جا کر حاضری دینے کو تیار ہوں۔ آج اس درخواست کا جواب آیا ہے۔"

"درخواست منظور نہیں ہوئی۔" چودہری انور نے پوچھا۔

"ہوئی بھی اور نہیں بھی۔ شخصی ضمانت تو انہوں نے نہیں مانی۔ ازراہ عنایت ضمانت کی رقم دس سے کم کر کے پانچ ہزار کر دی ہے۔" ظہور نے بتایا۔

"تو اب آپ کیا کریں گے۔" چوہدری انور کی تشویش بڑھ رہی تھی۔

"میں ایک بار پھر اپیل کروں گا۔ اور اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک تنگ آ کر مجھے یہاں سے نکال نہ دیا جائے۔ میرے یہاں رہنے سے ان کا بجٹ خراب ہو رہا ہے۔ انہیں پتہ ہے میں کھاتا بہت ہوں۔ مسلم فوڈ کی فرمائش نے انہیں اور بھی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ وہ بہت جلد مجھ سے نجات حاصل کر لیں گے۔ پھر یہاں رہنے میں مسئلہ کیا ہے۔ آرام ہی آرام ہے زندگی میں باقاعدگی آ گئی ہے۔ پڑھنے اور فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں دوبارہ شاعری شروع کر دوں۔" ظہور نے بے فکری کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کی بیٹی کی شادی کب ہے۔" چودہری انور نے پوچھا۔

"کل!" ظہور نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"پاکستان میں آپ کے گھر والوں کو معلوم ہے کہ آپ جیل میں ہیں۔" چودہری انور نے مزید پوچھا۔

"نہیں۔" ظہور نے ہنستے ہوئے کہا۔ "گھر والے مجھ سے رابطہ نہیں رکھتے۔ میں نے ان سے بہت زیادتیاں کی تھیں، وہ آج تک مجھے معاف نہیں کر سکے۔ میں ڈالروں سے ان کی کھوئی ہوئی محبت خریدنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن ان کے زخم بہت گہرے ہیں۔ اتنی آسانی سے نہیں بھریں گے۔ بہت دلچسپ کہانیاں ہیں چودہری صاحب یہاں سے نکل کر کبھی باہر کی دنیا میں بیٹھیں گے تو آپ کو سنائیں گے۔" چودہری انور کو یقین تھا کہ ظہور کی شخصیت کی طرح اس کی کہانیاں بھی گہرائیاں لئے ہوں گی۔

دوسرے دن جب ظہور جیل سے رہا ہونے لگا تو چوہدری انور سے گلے مل کر رو پڑا۔ چودہری کو ایسا لگا جیسے کوئی پتھر تڑخ گیا ہو۔

"آپ جاؤ اور فون کر کے اپنی بیٹی کو رخصت کرو۔" چودہری انور یہ کہہ کر

اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے معلوم تھا ظہیر اسے لینے باہر آیا ہوا ہو گا۔ ظہور کے پاس فی الحال رہنے کی جگہ نہیں تھی۔ ظہیر کا ڈیرہ آج کل خالی تھا وہ لڑکا جس کے لئے چھاپہ پڑا تھا غائب ہو گیا تھا۔ مشتاق اور چودہری انور جیل میں تھے۔ اس لئے ظہور کے لئے ڈیرے پر رہنے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ظہیر کل جب چودہری انور کے پاس آیا تھا تو چودہری نے اسے ظہور کی پانچ ہزار ڈالر کی ضمانت جمع کرنے کے لئے کہاتھا۔ ظہیر کو معلوم تھا کہ چودہری کے پاس صرف یہی پانچ ہزار ڈالر ہیں۔ خود ظہیر کے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔ وہ بچت پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ جو کماتا خرچ کرتا یا پاکستان بھیج دیتا۔ اس نے چودہری کو سمجھایا کہ وہ خود اپنی ضمانت کس طرح جمع کرائے گا۔ چودہری انور کو نہیں معلوم تھا۔ جب اس نے ظہیر کو بتایا کہ کل ظہور کی بیٹی کا بیاہ ہے اور اس دن اسے کم از کم جیل میں نہیں رہنا چاہئے تو ظہیر نے بھی جرح کرنی چھوڑ دی، بلکہ وہ بھی جذباتی ہو گیا۔ یہ اسی کی تجویز تھی کہ ظہور ڈیرے پر چل کر ان کے ساتھ رہے۔ دونوں کو پتا تھا کہ بیٹی اور بہن کے رشتوں کا قرض چکانے کے لئے دی جانے والی کوئی بھی قیمت زیادہ نہیں ہوتی۔ چوہدری انور کو تو ایسا لگا تھا کہ یہ ظہور کی بیٹی کی نہیں اس کی اپنی بہن کی شادی کا معاملہ تھا۔ اس کے لئے منہ بولے رشتے بھی سگے رشتوں کے برابر تھے۔ ایسے ہی ایک رشتے کی پاسداری کرتے ہوئے وہ بے وطن ہوا تھا۔ وہ وطن جس کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سڈنی میں جیل کی چہار دیواری عبور کر کے اس کی کھولی تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ یہ خوشبو اس کے لئے بہاروں میں گندھے ہوئے پھولوں کی مہک سے زیادہ معطر تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اڑ کر پاکستان پہنچ جاتا اور اپنے کھیت کی مٹی میں ہاتھ سان کر آگ اگلتے سورج کو حقارت سے دیکھتا اور پسینے کے قطرے اس پر کھینچ مارتا۔ چودہری کے دل کا درد جاگ اٹھا۔ گزرے ہوئے دنوں کی یاد سائبان بن کر اس کے سر پر تن گئی۔

ہمراہ لے گئے ہیں محافظ سمیٹ کر
بھوکے کسی کسان کا جتنا اناج تھا

7

ملتان ۔ ۱۹۹۲ء

انور فیصل آباد کے چودھریوں کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ چودھری دلاور جدی پشتی کسان تھا اور فیصل آباد میں جب اس کی زمین کو سوکھا کھا گیا تو اس نے سب کچھ بیچ کر مظفر گڑھ کے پاس محمود کوٹ میں مہرانیوں سے ۲۲ ایکڑ زمین خرید لی اور وہیں بس گیا تھا۔ چودھری انور اس وقت صرف ۱۶ سال کا تھا۔ چار سال چھوٹا اس کا ایک بھائی تھا۔ ماں بچپن ہی میں چل بسی تھی۔ یوں تو چودھری دلاور بھی بے حد محنتی اور جفاکش تھا لیکن چودھری انور محنت کے معاملے میں اپنے باپ سے کئی ہاتھ آگے تھا۔ چودھری انور نے تھکنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے باپ نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں کو ضرور پڑھوائے گا۔ زمینوں پر رہتے ہوئے بچوں کو پڑھانا آسان نہیں تھا۔ نزدیک ترین اسکول آٹھ میل کے فاصلے پر تھا اور اس زمانے میں سواری کا کوئی انتظام نہیں

تھا۔ دور تک کھیتوں کے طویل سلسلے تھے جن پر سائیکل سواری بھی مشکل تھی۔ چودہری انور اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر گھر سے سڑک تک کا میلوں کا یہ فاصلہ پیدل چل کر طے کرتا۔ اسکول کے لئے وہ صبح ٦ بجے گھر سے نکلتا اور واپسی پر اسی طرح پیدل سفر کی تھکن کو بھول کر باپ کے ساتھ کھیتی باڑی کے کام میں جت جاتا اور رات گئے تک اپنا اسکول کا کام کرتا یا چھوٹے بھائی کے کام میں اس کی مدد کرتا۔ کھانا پکانے کے لئے انہوں نے کپاس چننے کا کام کرنے والی ایک عورت کو رکھ لیا تھا جو تین وقت کھانا پکانے آتی تھی اور معاوضہ میں صرف اپنا اور بچوں کا ایک وقت کا کھانا لیتی تھی۔

چودہری انور کو اپنا گھر آج بھی جب یاد آتا تو وہ سڈنی میں پھیلے ہوئے محلوں سے زیادہ اچھا لگتا۔ پکی اینٹوں سے بنا ہوا ایک بڑا سا کمرہ تھا جس پر ایسبسٹاس کی شیٹوں کی چھت تھی۔ کمرے کے باہر انہوں نے مٹی کی کچی دیوار کا احاطہ بنا دیا تھا۔ اس احاطے میں کمرے کے ساتھ ہی چولہا تھا جس پر ٹین کی نیچی سی چھت لگا دی گئی تھی۔ گرمیوں کی دوپہر میں جب کبھی چودہری انور کھانا پکانے والی عورت کو روٹیاں تھاپتے دیکھتا تو اسے بہت ترس آتا۔ سر پر رکھی ہوئی ٹین کی چھت شعلہ بنی ہوتی اور چولہے میں جلتی ہوئی سوکھی لکڑیاں آگ کی لپٹیں پھینک رہی ہوتیں۔ آگ برساتی ہوئی اس ٹین کی چھت کے سائے میں اس کے دو ننگ دھڑنگ بچے بھی مٹی میں لوٹ رہے ہوتے۔ چھوٹا شاید ایک سال کا اور بڑا تین سال کا ہوگا۔ عورت کی اپنی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن دھوپ' محنت اور ان سے بڑھ کر فاقوں اور غربت نے اس کے چہرے اور جسم کو عمر کا پیمانہ نہیں رہنے دیا تھا۔ چہرے پر جھائیاں پڑ گئی تھیں جسم نیچے سے پھیل گیا تھا۔ ہفتوں دھلے رہنے سے محروم بال دھوپ نے بے رنگ کر دیئے تھے۔ جسم کی طرح اس کے کپڑے بھی میلے اور پھٹے ہوئے ہوتے۔ چودہری انور کو معلوم تھا کہ اس کے تین بچے اور ہیں جنہیں وہ گھر چھوڑ کر آتی ہے۔ بڑا بیٹا جو شاید دس سال کا تھا' باپ کے ساتھ کھیتوں پر مزدوری کرنے جانے لگا تھا۔ اس کا شوہر اور بیٹا کھیت میں کام کر کے جو کچھ کماتے اس سے ان کا ایک وقت کا کھانا چل جاتا تھا

دوسرے وقت کی روٹی کے لئے وہ چودھری کے یہاں چولہا سلگاتی تھی۔

چودھری انور نے اس سے ایک دن پوچھا تھا کہ وہ بچے پیدا کرنا بند کیوں نہیں کرتی۔

"کیا کروں چھوٹے چودھری، اپنا بدن مجھ میں نچوڑے بغیر ان کے باپ کو نیند نہیں آتی۔" اس نے جلتے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو اسے اپنے پاس نہ آنے دے۔" چودھری انور نے مسئلے کا حل پیش کیا۔

"مجھ کو بھی تو راحت ملے ہے۔ ایسا لگے ہے جیسے دن بھرت کی تھکن بہہ کر نکل گئی ہو۔"

اس نے توے پر روٹی پلٹتے ہوئے کہا۔ چودھری انور کو ایسا لگا جیسے گرمی اور چولہے کی حدت سے تمتماتے ہوئے چہرے کی سرخی اور بڑھ گئی ہو۔ چودھری کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ لیکن اس نے یہ ضرور کیا کہ اسکول سے اپنی اگلی چھٹی کے دن ٹین پر بھوسے کی موٹی تہہ بچھا دی جس سے کم از کم اس کا سر آگ کی بارش سے محفوظ ہو گیا۔

چودھری دلاور کو اپنے بیٹے کے بارے میں صرف ایک پریشانی تھی اور وہ یہ کہ وہ بہت جلدی مشتعل ہو جاتا تھا۔ چودھری انور کی اس گرم مزاجی نے علاقے میں اپنی دھاک جما دی تھی۔ معاملہ پانی کا تھا۔ چودھری دلاور جانتا تھا کہ زمینداری میں پانی کے جھگڑے ایسے ہیں جن پر جھگڑے فساد اور قتل تک ہو چکے ہیں۔ وقت نے چودھری دلاور کو بہت کچھ سکھا دیا تھا اسی لئے پانی کے مسئلے پر اس نے پہلے سے پکا کام کرا لیا تھا۔ پٹواری سے اپنے پانی کے وقت کا کاغذ بنوا کر لایا تھا۔ اس کا پانی صبح پانچ بجے شروع ہوتا تھا اس نے انور کو کاغذ دے کر کہا تھا کہ وہ صبح جا کر پانچ بجے برابر کے زمینداروں کو کاغذ دکھا کر ان کا پانی بند کرا کے اپنا پانی لگا دے۔ برابر کی زمینیں علاقے کے سب سے بڑے جاگیردار مہرانی کی تھیں۔ چودھری انور پونے پانچ بجے پہنچ گیا تھا۔ اس نے انہیں کاغذ دکھا کر بتایا کہ پانچ بجے اس کی باری ہے مہرانی کے آدمی پانی لگانے

آنے والے سولہ سال کے بچے کو دیکھ کر ہنستے اور مذاق اڑاتے رہے۔ جب پانچ بج گئے اور انور نے پانی لینا چاہا تو انہوں نے اسے اس زور کا دھکا دیا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ اس نے اسکول جانے کے لئے جو یونیفارم پہنی ہوئی تھی وہ مٹی اور کیچڑ میں سن کر خراب ہو گئی تھی۔ چودہری انور اپنے گھر کی طرف واپس دوڑا۔ پیچھے سے آتی ہوئی مہرانی کے آدمیوں کے قہقہوں کی آوازیں اس کی رفتار کو اور تیز کر رہی تھیں۔ چودہری انور گھر آ کر اپنے باپ کے سرہانے ٹنگی ہوئی بندوق لینے آیا تھا جن سے چودہری دلاور کبھی کبھی سور کا شکار کرنے جاتا تھا۔ رات میں جنگلی جانوروں کے آنے کا ڈر رہتا تھا اس لئے وہ بھری بندوق سرہانے کی دیوار پر لٹکا کر رکھتا تھا۔ چودہری انور بندوق لے کر دوبارہ زیادہ تیزی سے اس طرف بھاگا جہاں سے مہرانی کے آدمیوں کے قہقہوں کی آوازیں اب بھی اس کے کانوں میں آ رہی تھیں۔ چودہری دلاور کھیتوں کی زرخیزی میں اضافے کے لئے گیا ہوا تھا۔ کھیتوں میں بیت الخلاء بنانے کا رواج نہیں تھا۔ لوگ صبح سویرے ملگجے اندھیرے میں کھلے کھیتوں میں کہیں بھی زمین کو اس کا قرض واپس کر کے گھر لوٹ آتے۔ چودہری دلاور بھی واپس لوٹ رہا تھا کہ اس نے انور کو بندوق ہاتھ میں لئے بند کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ لوٹا وہاں پھینک کر اس کے پیچھے لپکا۔ لیکن جب تک وہ پہنچتا چودہری انور مہرانی کے آدمیوں پر بندوق تان چکا تھا۔

چودہری دلاور سمجھ گیا کہ کیا ہوا ہو گا۔ مہرانی کے آدمیوں نے وقت پر پانی چھوڑنے سے انکار کر دیا ہو گا۔ جس پر انور ان سے لڑ پڑا ہو گا۔ چودہری دلاور نے سب سے پہلے انور سے بندوق چھین لی۔ اسے ڈر تھا کہ غصے میں پاگل ہو کر انور فائر نہ کر بیٹھے۔ مہرانی کے آدمیوں کے قہقہے بند ہو گئے تھے اور اب ان کی دھمکیاں جاری تھیں۔

"اپنے بیٹے کو لگام دے کر رکھ چودہری۔ لاش کے ٹکڑے کر کے نہر میں بہا دیں گے۔ یہ مہرانیوں کا علاقہ ہے۔ یہاں کا پانی ہم کھولتے اور بند کرتے ہیں۔ تیرا بیٹا کل دوبارہ آیا تو زمین میں گاڑ دیں گے۔"

چودہری دلاور کچھ بولا نہیں صرف اپنے بیٹے کو کھینچتا ہوا گھر کی طرف واپس لے گیا۔ پیچھے مہرانی کے آدمیوں کے قہقہے پھر شروع ہو گئے تھے۔

چودہری دلاور کو وقت نے بہت دھیما اور زمانہ شناس بنا دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت بات بڑھانے یا لڑائی لڑنے میں صرف نقصان ہی نقصان ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اسے دوسرے طریقے سے لڑنا پڑے گا۔ اس نے چودہری انور کو سمجھا بجھا کر اور ڈانٹ ڈپٹ کر اسکول بھجوا دیا اور سورج کی پہلی کرن پھوٹتے ہی تیار ہو کر خود محمود کوٹ کے تھانے کی طرف کوچ کیا۔ تھانیدار کو چودہری دلاور نے صبح کے واقعہ کی تفصیل بتائی، پانی کے وقت کا سرکاری کاغذ دکھایا اور مدد طلب کی۔

"میں کسی سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔ صبح پانچ بجے سے پانی پر میرا حق ہے آپ اپنے سپاہی بھیج کر ان کی نگرانی میں میرا پانی لگوائیں۔"

تھانیدار سمجھ دار تھا وہ جانتا تھا کہ فیصل آباد کے یہ چودہری باہر سے آئے ہوئے ہیں اور مقامی جاگیرداروں کے پاؤں چھونا ان کی روایت نہیں ہے۔ ساتھ ہی وہ مہرانیوں کے اثر و رسوخ کو بھی جانتا تھا۔ مہرانی کا ایک بیٹا صوبائی اور ایک قومی اسمبلی کا ممبر تھا، ان کی عزت بھی بہت تھی اور پہنچ بھی لمبی تھی۔

"چودہری اگر تمہیں مہرانی کے آدمیوں کے خلاف رپورٹ لکھوانی ہے تو میں منشی کو آواز دوں۔" تھانیدار نے ذرا توقف کے بعد پوچھا۔

"مجھے کسی کے خلاف رپورٹ نہیں لکھوانی نہ کوئی تھانہ کچہری کرنی ہے۔ مجھے وہ پانی چاہئے جس پر میرا قانونی حق ہے۔ آپ صرف دو سپاہی بھیج کر ان کی نگرانی میں میرا پانی لگوا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔" چودہری نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"میرے پاس نہ تو اتنے سپاہی ہیں اور نہ ان کا یہ کام ہے کہ وہ پانی لگوانے کے کام کی پہرے داری کریں۔ کل میں نے سپاہی بھیج بھی دیئے تو پرسوں کا کیا ہو گا۔ ہر مربع پر پانی کا جھگڑا ہے۔ میں کس کس کو سپاہی بھجواؤں گا۔" تھانیدار نے صاف صاف لہجے میں چودہری کو بتایا۔

"تو آپ مجھے میرا جائز حق دلوانے میں مدد نہیں کریں گے۔" چودہری نے اپنا

غصہ دباتے ہوئے کہا۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔ آپ کو پانی ملے گا لیکن پولیس کے پہرے میں نہیں۔ میں مہرانیوں سے بات کر کے اس معاملے کو طے کرا دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں اور گھر جائیں۔ لیکن بچوں سے بندوق کو بچا کر رکھیں یہ کوئی کھلونا نہیں۔ ویسے آپ کے پاس بندوق کا لائسنس ہے۔" تھانیدار نے ذرا پولیس والوں کا لہجہ اختیار کیا۔

چودہری دلاور نے اپنے کاغذوں میں سے بندوق کا لائسنس نکال کر تھانیدار کو دکھایا اس نے ایک نظر ڈال کر واپس کر دیا۔

"انسپکٹر صاحب میں نے اپنے بیٹے سے کل بندوق چھین لی تھی۔ لیکن میں فیصل آباد سے اپنی زمین چھوڑ کر یہاں کی بنجر زمین پر فاقے کرنے نہیں آیا۔ اگر آپ بھی مجھے میرا پانی نہیں دلا سکے تو پھر بندوق میرے ہاتھ میں ہو گی اور مجھ سے یہ بندوق چھیننے والا کوئی نہیں ہو گا۔" چودہری دلاور نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"دھمکیاں دو گے چودہری تو بدامنی کے اندیشے میں بند کرا دوں گا۔ ایک بندوق پر اتنا مت اکڑو۔ یہ مہرانیوں کا معاملہ ہے مذاق نہیں ہے۔ میری پیٹی اتر جائے گی اور تمہارا بھی پتہ نہیں چلے گا۔ میں نے تم سے کہا ہے کہ میں مہرانیوں سے بات کروں گا۔ وہ پڑھے لکھے سمجھدار لوگ ہیں اپنے کارندوں کو سمجھا دیں گے۔ پھر بھی تمہیں پانی نہ ملے تو جھگڑا کئے بغیر تھانے آ جانا۔" تھانیدار کو معلوم تھا چودہری دلاور دھمکی نہیں دے رہا تھا۔ اگر پانی نہ ملا تو وہ سچ مچ لڑ مرے گا۔ چودہری کے جاتے ہی اس نے بڑے مہرانی کا فون نمبر ملانا شروع کر دیا۔

رحمٰن مہرانی سیاست سے ریٹائر ہو کر اب اپنے گاؤں کی حویلی میں رہتا اور زمینوں کے معاملات کی نگرانی کرتا یا اسلام آباد کے بڑوں کو شکار کھلانے اور ان کی مہمانداری کرنے میں وقت گزارتا تھا۔ اس کے بیٹے اسلام آباد اور لاہور میں رہتے تھے۔ تین بیٹیاں تھیں وہ بھی شہروں میں بیاہی تھیں۔

کسی زمانے میں وہ بہت قہر برسانے والے جاگیرداروں میں سے رہا تھا۔ لیکن اب وقت بدل گیا تھا۔ یہ علاقہ اب صرف ان کی رعایا کا نہیں تھا۔ ضرورتوں نے

زمینوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکوانا شروع کیا تھا۔ ان بچی ہوئی زمینوں پر آباد ہونے والوں سے عزت کرانے کے لئے ان کی عزت کرنا بھی ضروری تھا۔ سیاسی ضرورتیں بھی اپنی جگہ تھیں۔ مسئلہ صرف عزت کرانے کا ہی نہیں تھا' ووٹ بھی لینے تھے' رحمٰن مہرانی نے اب تک اپنے علاقے کی سیٹیں باہر نہیں جانے دی تھیں۔ لیکن اب رعایا خاموشی سے ووٹوں پر انگوٹھا نہیں لگاتی تھی۔ وہ علاقے میں کام بھی کروانا چاہتی تھی۔ غریبوں کے اوقات تو نہیں بدلے تھے۔ غریب اسی طرح غریب اور امیر اسی طرح امیر بلکہ زیادہ امیر تھا۔ لیکن غریبوں کے محکومیت برتنے کا انداز بدل رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پیر پکڑنا چھوڑ رہے تھے بلکہ کبھی کبھی سر بھی اٹھانے لگے تھے۔ رحمٰن مہرانی کو بھی ان حقیقتوں کا اندازہ تھا۔ اس کے بیٹے باہر سے پڑھ کر آئے تھے اور شہروں میں زیادہ رہے تھے اس لئے وہ ان دیہات کی نبض اچھی طرح نہیں پہچان سکتے تھے جہاں سے وہ الیکشن جیت کر اسمبلی میں پہنچے تھا۔ رحمٰن مہرانی کو جب تھانیدار نے فون کر کے بتایا تو اس کا خون کھول اٹھا۔ اگر پرانا وقت ہوتا تو وہ کوڑے اٹھا کر اپنے ان کارندوں کی کمر ادھیڑ دیتا۔ یہ کارندے ان کی کمائی ہوئی نیک نامی کو برباد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

رحمٰن مہرانی نے صرف "ٹھیک ہے میں دیکھ لوں گا۔" کہہ کر فون رکھ دیا۔

گرمیوں کے موسم میں سورج کی مشقت بڑھ جاتی تھی۔ چھ بج چکے تھے لیکن ابھی تک اس کی چھٹی نہیں ہوئی تھی' دن بھر کی تھکن نے صرف اس کی حدت کم کر دی تھی۔ چودہری انور اپنے بھائی کو لئے ابھی اسکول سے واپس ہی آیا تھا کہ چودہری دلاور نے حیرت سے گھوڑے پر سوار ایک شخص کو اپنے گھروندے کی طرف آتے دیکھا۔ گھڑ سوار مہرانی کا کارندہ ثابت ہوا۔ اس نے بڑی عزت سے چودہری دلاور کو پیغام دیا کہ رحمٰن مہرانی نے اسے آنے کی دعوت دی ہے اور اس کی سواری کے لئے یہ گھوڑا بھیجا ہے۔ مہرانیوں کی حویلی محمود کوٹ سے اگلے گاؤں میں واقع تھی اور ان کے جاگیردارانہ جاہ و حشم کا لمبا چوڑا اشتہار تھی۔ چودہری دلاور حویلی کے اندر گیا تو

رحمٰن مہرانی باہر دالان میں سرکنڈے کی بنی ہوئی ایک چوڑی سی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ آس پاس ایسی ہی دو تین کرسیاں اور رکھی تھیں لیکن ان پر کوئی بیٹھا نہیں تھا۔ لوگ سرکنڈے ہی کے بنے ہوئے چھوٹے اسٹولوں یا زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جاگیرداری میں زمین سے اونچائی شاید رتبوں کی پیمائش کا ذریعہ ہوتی ہے۔ چودہری دلاور نے سلام کیا اور کارندے نے تعارف کرایا تو رحمٰن مہرانی نے چودہری کو اپنے پاس رکھی ہوئی کرسی پر ہی بٹھالیا۔

بیٹھنے کے ساتھ ہی چودہری دلاور کے اندر جتنا غصہ ابل رہا تھا وہ بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس دربار میں اس کرسی سے زیادہ بڑی عزت مل نہیں سکتی تھی۔

"چودہری صاحب آپ نے ہماری زمین خریدی اور اس پر آباد بھی ہو گئے۔ ہمیں آپ نے پتہ نہیں چلنے دیا ورنہ ہم آپ سے پہلے ملنے کی کوشش کرتے۔ اس علاقے میں آپ ہمارے مہمان ہیں۔ ہمیں آپ سے رابطہ کر کے پوچھنا چاہیے تھا کہ آپ کو کسی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے کارندوں نے اس سلسلے میں لاپرواہی برتی۔" رحمٰن مہرانی نے بہت نرم لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی نہیں غلطی میری ہے۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں آ کر پہلے آپ کے پاس حاضری دیتا۔ لیکن آپ کو پتا ہے میرا اکیلا ہاتھ ہے زمینوں کی تیاری میں ایسا لگا کہ ہر چیز بھول گیا۔" چودہری نے بھی معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کیا۔

اس کے بعد مہرانی چودہری سے فیصل آباد میں اس کی زمینداری کے تجربوں اور اس کے خاندانی حالات پوچھتا رہا لیکن اس نے صبح کے واقعے کا تذکرہ نہیں کیا۔ دس منٹ گزر گئے تو مہرانی کے کارندے نے اسے کوئی پیغام دیا جسے سن کر وہ اٹھنے لگا۔ چودہری نے بھی اٹھ کر سلام کر کے اجازت چاہی۔ لیکن مہرانی نے ہاتھ اٹھا کر چودہری کو روک لیا۔

"صبح کے واقعے کا مجھے افسوس ہے۔ آئندہ آپ کا پانی کوئی نہیں روکے گا۔ آپ کو کبھی پانی کا یا کسی بھی طرح کا کوئی مسئلہ ہو تو آپ میرے پاس آئیے گا۔ نہ آ سکیں تو اطلاع بھجوائیے گا۔ جو کچھ ہمارے اختیار میں ہو گا ہم آپ کے لئے کریں

گے۔" مہرانی نے بڑے پر خلوص لہجے میں کہا۔
"غلطی شاید میرے بیٹے کی بھی تھی۔ وہ ذرا گرم دماغ کا ہے۔ اسے بات اتنی آگے نہیں بڑھانی چاہیے تھی۔ میں اس کی طرف سے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"
چودہری وہ سارے مکالمے بھول گیا تھا جو وہ راستے بھر دل ہی دل میں یاد کر کے آیا تھا۔

رحمٰن مہرانی نے صرف سر ہلایا اور چودہری کو خدا حافظ کہہ کر حویلی کے اندر چلا گیا وہ جاتے جاتے چودہری دلاور کو اپنا مرید کر گیا تھا۔ اسے اتنے بڑے جاگیردار نے اپنے برابر کی کرسی پر ساتھ بٹھایا تھا ہر طرح کی یقین دہانی کرائی تھی۔ اسے مدد کی پیشکش کی تھی۔ چودہری دلاور کو اپنی اس عزت افزائی پر بڑا مان ہوا۔ اس نے سوچا وہ مہرانیوں کے لئے اب کچھ بھی کر سکتا ہے۔ چودہری اپنی زمینوں پر واپس پہنچا تو مکان کی چہار دیواری کے باہر چودہری انور بندوق ہاتھ میں لئے ٹہل رہا تھا۔ وہ کسی جنگی مورچے میں بیٹھے ہوئے سپاہی کی طرح چوکنا لگتا تھا۔ چودہری دلاور نے اس کے ہاتھ سے بندوق چھین کر پہلی بار اس کی کمر پر ایک دھپ رسید کی اور بندوق کو کبھی ہاتھ نہ لگانے کا حکم سنایا۔ اس نے بیٹے کو یہ بھی بتایا کہ پانی لگانے وہ صبح خود جائے گا۔ دوسری صبح اور اس کے بعد کی کسی بھی صبح چودہری کی زمینوں پر پانی کا کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ شروع کے دو چار دنوں بعد چوہدری انور بھی پانی لگانے جانے لگا تھا۔ پانچ بجتے ہی مہرانی کے کارندے بڑی سعادت مندی سے اپنا پانی بند کر کے اسے اپنا پانی لگانے دیتے۔ پانی لگانے کے اس واقعے کے بعد جہاں رحمٰن مہرانی کی معاملہ فہمی اور انصاف پسندی کا شہرہ ہوا تھا وہیں اس ۱۶ سالہ لڑکے کی جی داری کے بھی چرچے ہوئے تھے جس نے مہرانیوں کے آدمیوں پر بندوق تان لی تھی۔

آنے والے برسوں میں چودہری انور کی شہرت ایک ایسے نوجوان کی حیثیت سے بھی ہوئی جو کسی کی بھی مدد کے لئے ہر وقت سینہ سپر رہتا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی بستی میں تو وہ اس روز ہیرو بن گیا تھا جب اس نے ایک سخت بیمار

بچے کو اپنی کمر پر لاد کر میلوں کا سفر کر کے ڈاکٹر تک پہنچایا تھا۔ ڈاکٹر نے بچے کے ماں باپ کو جو چودھری انور کے پیچھے پیچھے بین کرتے ہوئے تمام راستے بھاگتے آئے تھے بتایا کہ اگر بچہ اور چند گھنٹوں تک علاج سے محروم رہتا تو زندہ نہیں بچتا۔ بچے کی ماں دیر تک چوہدری انور کے پیر سے لپٹ کر بلک بلک کر روتی رہی تھی۔ انور کا بس چلتا تو وہ ہر بستی کے ہر موڑ پر ایک دوا خانہ کھلوا دیتا۔ اسے معلوم تھا کہ کتنے بچے صرف اس لئے مرجاتے تھے کہ ڈاکٹر تک پہنچنا محال تھا۔ نزدیک ترین ڈاکٹر دس میل کے فاصلے پر تھا اور وہ بھی صرف معمولی مرض کا علاج کر سکتا تھا۔ اسپتال جانے کے لئے ۲۵ میل کا سفر کرنا پڑتا۔ لیکن سواری پکڑنے سڑک تک جانے کے لئے پیدل کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ سب سے زیادہ موتیں اس وقت ہوتیں جب دریا چڑھ کر آتا اور واپس جاتے ہوئے کھیتوں میں سانپوں کی فصل چھوڑ جاتا۔ سانپ کے کاٹے سے وہی خوش قسمت زندہ بچتے تھے جنہیں وقت پر طبی امداد پہنچ جاتی تھی۔

چودھری انور نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا اور باپ کے ساتھ کھیتی باڑی میں جت گیا۔ تعلیم حاصل کرنے کا کام انہوں نے چھوٹے پر چھوڑ دیا تھا' جسے ان کا خیال تھا کہ میٹرک کے بعد ملتان کے کالج میں بھیج کر وہیں ہاسٹل میں داخل کر دیں گے۔ چودھری انور نے کھیتی باڑی کے ساتھ آڑھت کا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے زمینداروں کو فصلیں بیچنے کوٹ ادو کی مارکیٹ لے جاتا اور اپنا کمیشن کاٹ کر زمینداروں کو ان کی فصلوں کی قیمت ادا کرتا۔ آڑھت کا یہ کاروبار بھروسے کا کاروبار تھا اور اسی لئے چودھری انور اس میں کامیاب تھا۔ زمینداروں کو پتہ تھا کہ چودھری انور ان سے بے ایمانی نہیں کرے گا اور ان کی زمین اور محنت نے مل کر جو فصل اگائی ہے انہیں اس کا معاوضہ مارکیٹ کے نرخ سے صحیح ملے گا۔

پچھلے چند برسوں میں علاقے میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ مہرانیوں نے الیکشن میں اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے ملتان سے کوٹ ادو اور لیہ جانے والی مرکزی شاہراہ تک کئی سڑکیں نکلوا دی تھیں۔ بجلی چودھری انور کے گاؤں محمود کوٹ تک پہنچ گئی تھی اور نزدیک کے دوسرے دیہات تک بجلی پہنچانے کے لئے کھمبے لگ

رہے تھے۔ علاقے میں کیئے جانے والے ان ترقیاتی کاموں نے مہرانیوں کو مقبول بنا دیا تھا اس لئے جب الیکشن ہوئے تو دونوں جوان مہرانی قومی اور صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ چودہری دلاور اور چودہری انور نے مہرانیوں کی انتخابی مہم میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ چودہری انور ہر انتخابی جلسے میں جاتا اور نعرے لگانے والے دستے کی قیادت کرتا تھا۔ دیہات سے ووٹروں کو پولنگ بوتھ تک پہنچانے کے لئے ٹرانسپورٹ کا بندوبست کرنا بھی چودہری انور کے سپرد تھا۔ بڑا مہرانی چودہری سے بہت خوش تھا۔ وہ حویلی کی ہر بڑی تقریب میں انہیں ضرور بلواتا تھا۔ ایک دفعہ تو اس نے چودہریوں کو اتنی عزت دی تھی کہ ان کی کھانے کی دعوت قبول کی تھی۔ اور خود چل کر ان کے مکان پر آیا تھا۔ الیکشن جیتنے کی خوشی میں اس نے چودہری انور کے مسلسل منع کرنے کے باوجود اسے ایک موٹر سائیکل تحفے میں دی تھی۔ چودہری دلاور نے انور کو بری طرح ڈانٹا تھا اور موٹر سائیکل کا تحفہ قبول کرنے پر مجبور کیا تھا۔ دلاور کے لئے مہرانیوں کا یہ تحفہ ایک بڑے اعزاز کے برابر تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے تمغے کی طرح اپنے گلے میں لٹکائے پھرتا۔

چودہری انور کو معلوم نہیں تھا کہ کبھی کبھی پان کھانے کا یہ شوق اتنا مہنگا پڑے گا کہ اسے بے وطن کرنے کی وجہ بن جائے گا۔ وہ جب بھی ملتان جاتا **گلگشت** کالونی کے بازار کے ایک ہوٹل میں دودھ پتی کی چائے پیتا جو پورے ملتان میں مشہور تھی۔ دوسرے ہوٹل والے جل کر کہتے تھے کہ ہوٹل کا مالک اس میں پوست کے ڈوڈے ملاتا ہے اسی لئے جو ایک بار پی لے اسے نشہ لگ جاتا ہے۔ ہوٹل کے برابر میں پان کی دکان تھی جہاں سے چودہری انور میٹھا پان کھانے کا شوق پورا کرتا۔ اس کی دکان پر بھی ہر وقت **جمگھٹا** لگا رہتا اور اس کے بارے میں بھی کسی نے یہ اڑا رکھی تھی کہ وہ پان میں کوکین کی سلائی پھیرتا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو چودہری انور جب بھی ملتان آتا تھوڑی دیر کے لئے ہوٹل اور پان والے کے پاس ضرور ٹھہرتا۔ اس کے ملتان آنے کی کوئی کاروباری وجہ نہیں تھی۔ کاروبار کے لئے تو وہ کوٹ ادو جاتا تھا اور ملتان کوٹ

ادو کی بالکل مخالف سمت میں تھا۔ ملتان اس گاؤں کے قریب تھا جہاں چودہری انور مہینے میں ایک بار مرغوں کی لڑائی دیکھنے جاتا تھا۔ مرغوں کی ریسلنگ دیکھنے اور ان پر شرط لگانے کی لت اسے حال ہی میں لگی تھی۔ اس کے باپ کو جب پتہ چلا تھا تو اس نے ڈانٹ ڈپٹ کی تھی لیکن انور نے بتایا تھا کہ وہ صرف تفریحی طور پر چھوٹی چھوٹی شرطیں لگاتا ہے۔ بات صحیح بھی تھی۔ چودہری انور جواری نہیں تھا' اسے تو کسی بھی طرح کی ریسلنگ دیکھنے میں مزا آتا تھا۔ اس میں عجب طرح کا جوش بھر جاتا۔

انور کو ریسلنگ دیکھنے کا شوق کوٹ ادو میں لگنے والی اونٹوں کی سالانہ منڈی میں لگا تھا۔ وہ بڑے چودہری اور چھوٹے بھائی کے ساتھ اونٹوں کے اس میلے میں گیا تھا اور وہاں اونٹوں کا رقص دیکھ کر بہت محظوظ ہوا تھا۔ میلے میں رنگ برنگی ڈوریوں میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں اور پاؤں میں گھنگھرو پہنے اپنی لمبی لمبی گردنیں ہلاتے اور ٹھمکتے ہوئے اونٹوں کا ناچ بہت دلکش تھا لیکن اس سے زیادہ مزا اونٹوں کی کشتی میں آیا تھا۔ چودہری انور کو اندازہ نہیں تھا کہ ایک دوسرے کی گردن سے گردن ملا کر زور کرتے اور ٹنگڑی مار کر گراتے اور داؤ لگاتے بظاہر ست نظر آنے والے اونٹ اتنے پھرتیلے اور ذہین ہو سکتے ہیں۔ چودہری انور کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ اونٹوں کا میلہ سال میں ایک بار لگتا تھا جبکہ اسے ریسلنگ دیکھنے کا چسکا لگ گیا تھا۔ کوٹ ادو میں اس کا ایک آڑھتی دوست ایک شام اسے بٹیروں کی لڑائی دکھانے لے گیا تھا۔ بے شمار لوگ اپنے ہاتھ پر بٹیر بٹھائے اور ان کے دانے کا چھوٹا سا تھیلا لٹکائے ایک دوسرے کی پہلوان بٹیروں کو لڑا رہے تھے۔ بٹیروں کی ریسلنگ دیکھنے میں دلچسپ تھی لیکن اونٹوں کی کشتی دیکھنے کے بعد آدھے بالشت کی بٹیروں کو لڑتا دیکھ کر چودہری انور کو عجیب سا لگا۔ اس کے دوست نے اسے بتایا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد ملتان کے پاس ایک غیر معروف گاؤں میں مرغوں کی لڑائی ہوتی ہے وہ اسے ضرور پسند آئے گی۔ چودہری انور اگلے ہی جمعے کو اس دوست کے ساتھ مرغوں کی لڑائی دیکھنے چلا گیا تھا۔ اسے مرغوں کی لڑائی بہت سنسنی خیز تجربہ لگی۔ اس کے بعد سے ہی وہ مہینے میں ایک بار مرغوں کی لڑائی دیکھنے ضرور جاتا۔ جگہ نزدیک ہوتی تو وہ شاید ہر ہفتے جاتا' لیکن محمود کوٹ سے ملتان

جانا آسان نہیں تھا۔ وہ بہت تیز اسکوٹر چلاتا تب بھی اسے کئی گھنٹے لگتے۔ پھر اگر موسم سخت ہوتا تو چودھری انور جیسے سختیوں کے عادی شخص کو بھی مزا آجاتا۔

مرغوں کی ریسلنگ بھوتوں والی حویلی میں ہوتی تھی جو ملتان کے نواح میں ایک غیر آباد گاؤں میں واقع تھی۔ گاؤں کے غیر آباد ہونے کے بارے میں مختلف روایتیں تھیں لیکن حویلی کے بارے میں سب متفق تھے کہ وہ بھوتوں کا مسکن ہے جہاں رات میں بھوتوں کا دربار لگتا ہے اور چڑیلیں رقص کرتی ہیں۔ آس پاس کے گاؤں میں کئی لوگ قسمیں کھا کر اس بات کی عینی شہادت دینے کو تیار رہتے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے روشنیوں کے جھماکوں میں جھاڑو ہلاتی چڑیلوں کو ناچتے اور خود کو بے ہوش ہوتے دیکھا ہے۔ گاؤں کے ضعیف الاعتقاد لوگ بھوتوں کو خوش کرنے ہر جمعہ کو نماز کے بعد ایک مرغا حویلی میں لا کر ذبح کرتے۔ روایت یہ بھی تھی کہ دوسرے دن ذبح ہونے والے مرغے کے پر تک کا پتا نہیں چلتا۔ وہ شاید رات کو بھوتوں کی دعوت کا سامان بن جاتا تھا۔ لیکن گاؤں کے جیالے ایسے بھی تھے جو اعلانیہ کہتے تھے کہ نزدیکی گاؤں کے آوارہ چرسی لونڈے مرغ اٹھا کر لے جاتے اور بھون کر کھا جاتے ہیں۔

ایک زمانے میں مرغوں کی لڑائی ملتان شہر کے پاس آباد محلے میں ہوتی تھی۔ ہر ہفتے ہونے والے شور و غل، جوئے پر ہونے والی لڑائیوں اور بچوں پر خراب اثر پڑنے کے ڈر سے تنگ آ کر بستی کے لوگوں نے اس کے خلاف محاذ بنا لیا۔ پولیس میں شکایت کی سنوائی نہیں ہوئی کیونکہ مرغوں کی لڑائی پر جوا کھلانے والے پولیس والوں کو بھی حصہ کھلاتے تھے۔ لیکن جب کمشنر اور ڈپٹی کمشنر تک درخواستیں اور وفد جانے لگے اور اخباروں میں خبریں چھپنے لگیں تو پھر پولیس نے ایک جمعہ کو چھاپہ مار کر مرغوں کی ریسلنگ بند کرا دی۔ پولیس والوں کے مشورے پر جواری اپنی دکان اٹھا کر بھوتوں والی حویلی لے آئے تھے۔ حویلی کیا تھی بس کھنڈر تھا۔ نہ کوئی چھت تھی اور نہ کوئی دیوار سلامت تھی۔ لیکن دیواروں نے ٹوٹ کر جو نیچی منڈیریں بنا دی تھیں وہ ریسلنگ دیکھنے والے تماشائیوں کے بیٹھنے کے کام آتیں۔ ان منڈیروں کے احاطے جو

کسی زمانے میں حویلی کے کمرے رہے ہوں گے ریسلنگ کے لئے اکھاڑے کا کام کرتے تھے۔

مرغوں کی ریسلنگ کا یہ میدان کارزار ہر فریق کے لئے سودمند ثابت ہوا تھا۔ علاقے میں ہفتے وار تفریح کا ایک مقام طے پا گیا تھا۔ کھلی جگہ تھی اس لئے سینکڑوں لوگ بھی آتے تو سما سکتے تھے۔ بڑی تعداد تفریحاً" آتی تھی' وہ شرطیں نہیں بھی لگاتے تو مرغوں کی لڑائی کا تماشا دیکھتے' چھابڑی والوں سے چاٹ کھاتے' سگریٹ پی کر دھواں اڑاتے اور پان کھا کر پیک تھوکتے' دوستوں سے مجلسیں کرتے بھڑکیں لگاتے اور خوش خوش واپس آ جاتے۔ یہ سینما جانے سے زیادہ اچھی اور سستی تفریح تھی۔

آس پاس کے گاؤں والوں کو آمدنی کا ایک ذریعہ بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ حویلی کے ٹوٹے چبوتروں پر وہ کھانے پینے اور سگریٹ پان کی چھابڑیاں لگاتے اور شام تک سارا مال بیچ کر واپس آتے۔ لوگ زیادہ آنے لگے تھے اس لئے شرطیں زیادہ لگتیں جس سے جوا کھلانے والوں کی آمدنی اور پولیس کا بھتہ بھی بڑھ گیا تھا۔ ضعیف الاعتقاد لوگوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ مرغوں کی لڑائی کے دوران حویلی کی زمین پر جو خون گرتا ہے وہ بھوتوں کے خون کو ٹھنڈا رکھتا ہو گا۔ پھر گاؤں والوں کو ہر جمعے کے دن بھوتوں کو ایک مرغ ذبح کرنے کا جو ٹیکس دینا پڑتا تھا وہ بھی بند ہو گیا تھا۔ لڑائی کے دوران جو مرغ زیادہ زخمی ہو کر دوبارہ لڑائی کے قابل نہیں رہتا اسے ذبح کر کے بھوتوں کی بلی چڑھایا جاتا۔ یہ اس روز کا سب سے آخری جشن ہوتا۔

جب مرغوں کی تمام کشتیاں ختم ہو جاتیں تو جانے سے پہلے سب حویلی کے مرکزی اور سب سے بڑے کمرے میں جمع ہوتے۔ زخمی مرغ کو بڑی شان سے لایا جاتا اور سب سے قریبی گاؤں کی مسجد کا پیش امام اسے ذبح کر کے بلاؤں کو بھگانے والی دعائیں پڑھتا۔ اس تقریب کے لئے خاص طور پر بلائے جانے والے پیش امام کو معاوضے کے طور پر بیکار ہو جانے والا دوسرا زخمی مرغ پیش کیا جاتا جسے مولانا گھر لے جا کر حلال کرتے اور اپنی اور اپنے گھر والوں کی دعوت کا اہتمام کرتے۔ جس پہلوان مرغ کو قربان کیا جاتا تھا اس کا مالک فخر سے گردن اکڑائے پھرتا تھا اور مدتوں علاقے

کے لوگوں کو مرحوم مرغ کی سابقہ فتوحات کے قصے سناتا تھا۔

چودھری انور آج ریسلنگ سے جلدی واپس آ گیا تھا۔ وہ اپنے فیصلے پر بہت مطمئن تھا۔ آج اس نے پہلی بار بڑا جوا کھیلا تھا جس کے بعد اس نے طے کیا تھا کہ اب وہ مرغوں کی ریسلنگ دیکھنے کبھی نہیں آئے گا۔ چودھری انور کبھی دس بیس روپے سے زیادہ کی شرط نہیں لگاتا تھا۔ اور وہ بھی صرف اپنے جوش میں اضافہ کرنے کے لئے۔ پچھلی کئی دفعہ سے تغلق نامی مرغ کا بہت شہرہ تھا۔ لیکن چودھری انور کو اس سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی۔ اس نے ہر دفعہ تغلق سے لڑنے والے دوسرے مرغ پر پیسے لگائے تھے اور ہارا تھا۔ مسئلہ پیسے ہارنے کا نہیں تھا اسے بس ایسا لگتا تھا جیسے مغرور تغلق صرف اسی کو نیچے دکھانے کے لئے لڑ رہا ہو۔

آج جب مہینے بھر بعد چودھری انور بھوتوں والی حویلی پہنچا تو اس کے ایک جاننے والے نے بتایا کہ پچھلے ہفتوں میں تغلق نے تابڑ توڑ کامیابیاں حاصل کی ہیں' ہر چیمپئن مرغ کو ہرا دیا ہے اور اپنی گردن پر کوئی بڑا زخم بھی نہیں آنے دیا ہے۔ چودھری انور حویلی کے اس درمیانی حصے میں پہنچا جو مرغوں کی لڑائی کا سب سے بڑا اکھاڑہ تھا یہاں صرف چیمپئن مرغ لڑائے جاتے تھے۔ اور یہیں پر آخر میں ایک مرغ ذبح بھی کر دیا جاتا تھا۔ تغلق کا مالک اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا اپنے پہلوان کے جسم پر ہاتھ پھیر کر اسے گرما رہا تھا۔ اس کے مقابلے پر لڑنے کے لئے ایک نیا مرغ آیا تھا جس کا نام چنگیز خان تھا' لیکن اس کا دبلا پتلا مدقوق سا مالک اپنے مرغے کے نام کی الٹی تفسیر بنا زمین میں دھنسا بیٹھا تھا۔ لڑائی شروع ہونے میں تاخیر اس لئے تھی کہ چنگیز خان پر کوئی پیسے لگانے کو تیار نہیں تھا۔ سب کا خیال تھا کہ تغلق کے سامنے بہت تجربہ کار چیمپئن مرغے بھی نہیں ٹھہر سکتے تھے' پہلی لڑائی لڑنے والا چنگیز خان تو پانچ منٹ میں لہو لہان ہو کر چت ہو جائے گا۔ جوا کھلانے والوں نے ایک پر دو کا ریٹ دیا تھا اور جب کوئی شرط نہیں ملی تو ریٹ بڑھا کر ایک پر تین کر دیا تھا۔ چودھری انور کو بار بار پر پھلا کر بانگ دیتے ہوئے تغلق کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے وہ اسے ذاتی طور پر چیلنج دے رہا ہو۔ چودھری انور کو اپنے دماغ پر قابو نہیں رہا۔ اس کی جیب میں پانچ سو

روپے تھے وہ نکال کر اس نے چنگیز خان کے سر پر پھینک دیئے۔ تھوڑی دیر کے لئے پورے اکھاڑے میں خاموشی ہو گئی لیکن پھر اکھاڑے میں وہی کرنٹ دوڑنے لگا جو کوئی لڑائی شروع ہونے سے پہلے دوڑتا ہے۔ جوئے بازوں کے اشاروں پر ریفری نے لڑائی شروع کرنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ کچھ لوگوں نے دیکھا دیکھی بیس تیس روپے چنگیز خان پر لگا دیئے تھے، لیکن ان کا انداز سرپرستی کرنے والوں کا سا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ چنگیز خان کو ہارنا ہے لیکن وہ پانچ سو روپے لگانے والے کو حوصلہ دلانا چاہتے تھے۔

چودھری انور نے دل میں تہیہ کیا کہ اگر تغلق آج بھی جیت گیا تو وہ دوبارہ مرغوں کی لڑائی دیکھنے بھوتوں کی حویلی نہیں آئے گا۔ اسے مرغوں سے اپنی مونچھ نیچی کرانا پسند نہیں تھا۔ لڑائی جس طرح شروع ہوئی تھی اس سے چودھری انور کو یقین ہو چلا تھا کہ بھوتوں والی حویلی میں آج اس کا آخری دن ہے۔ لیکن اسے یہ خوشی بھی ہو رہی تھی کہ اس بہانے اس کی یہ لت چھوٹ جائے گی جس سے اس کا باپ خوش نہیں تھا۔ چودھری انور عموماً لڑائی کے دوران بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کرتا تھا۔ ہار جیت سے بے نیاز وہ اس مرغ کو حوصلہ دلانے کے لئے آوازیں لگاتا جس پر اس نے شرط لگائی ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ بالکل گنگ اور ساکت کھڑا یہ لڑائی دیکھ رہا تھا۔ نعرے لگانے اور حوصلہ بڑھانے کا کام دوسرے کر رہے تھے۔ تغلق نے شروع ہی سے اس جارحیت کا مظاہرہ کیا تھا جس کے لئے وہ مشہور تھا اور جس کی وجہ سے اس نے کسی دوسرے مرغ کو اپنے سامنے ٹکنے نہیں دیا تھا۔ چنگیز خان اس کے مقابلے میں ست تھا اور چودھری انور کو اپنے تجربوں کی وجہ سے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر بعد ہی تغلق کا جارحانہ انداز چنگیز خان کو میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دے گا۔ اب تک کی لڑائی میں چنگیز خان کا بس کمال یہ تھا کہ اس نے کوئی بڑا زخم نہیں کھایا تھا۔ اور تغلق کی حملہ کرتی ہوئی چونچ سے خود کو محفوظ رکھا تھا۔ بظاہر ست نظر آنے والا چنگیز خان تغلق کے تیز ہوتے ہوئے حملوں سے بچنے میں کمال کی پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ دس منٹ تک یہ لڑائی اسی طرح جاری رہی لیکن پھر اچانک چودھری انور کو ایسا لگا کہ

کسی نے چنگیز خان کے جسم میں چابی بھر دی ہو۔ اس نے اچھل اچھل کر تغلق پر بڑی تیزی سے کئی حملے کئے اور ایک حملے میں اپنی چونچ میں تغلق کی گردن کی کھال اس طرح پکڑ لی کہ تغلق کے لئے چھڑانا مشکل ہو گیا۔ چنگیز گردن کی بوٹی پکڑے تغلق کو کھینچے پھر رہا تھا اور تغلق بار بار اچھلنے کے باوجود چنگیز خان کی گرفت چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ بالآخر ایک زور کے جھٹکے سے اس نے اپنی گردن تو چھڑا لی لیکن خون کا ایک فوارہ بہہ نکلا۔ تغلق کے مالک نے ریفری سے فوراً ہی لڑائی میں وقفہ مانگ لیا۔ مرغوں کی لڑائی کے جو قواعد تھے ان کے مطابق مالک اپنے مرغے کی مرمت کے لئے بیس منٹ کا وقفہ لے سکتا تھا۔ فوراً ہی مرغوں کے ایک ڈاکٹر نے تغلق کی گردن کے زخم پر دوا لگا کر خون روکا اور زخم پر ٹانکے لگانے لگا۔ تغلق کے مالک کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے مرغ کا بہایا ہوا خون اس کی آنکھوں میں اتر آیا ہو۔ ادھر چودھری انور کا یہ حال تھا کہ وقفے کے باوجود حلق پھاڑ پھاڑ کر چنگیز خان کو بڑھاوے دے رہا تھا۔ وقفے تک تغلق کے مالک اور ڈاکٹر نے اپنے مرغے کو دوبارہ لڑنے کے قابل بنا دیا۔ تغلق ایک بار پھر اپنے پر پھلا پھلا کر اپنی زخمی گردن نچا رہا تھا۔ چنگیز خان مقابلے پر آیا تو تغلق کے حملوں میں پہلے سے زیادہ تیزی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی ہزیمت کا بدلہ چکائے بغیر نہیں رہے گا۔ لیکن وقفے کے بعد کی لڑائی زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکی۔ چنگیز خان مرغوں کی لڑائی کے تمام ماہرین کے اندازوں کے برعکس زیادہ ہوشیار ثابت ہوا تھا۔ اس نے تغلق کے حملے پہلے کی طرح پھر جھکائی دے دے کر بچا لئے تھے اور اب وہ اپنی چونچ سے تغلق کی آنکھ کو نشانہ بنا کر حملے کر رہا تھا۔ اسے جلد ہی کامیابی ہو گئی اور ایک بار تغلق کی آنکھ میں ٹھیک نشانے پر اس طرح چونچ ماری کہ تغلق کے ساتھ اس کے مالک کی بھی چیخ نکل گئی۔ تغلق نے ہتھیار ڈال دیئے' اس کی آنکھ پھوٹ گئی تھی جس سے خون آنسو کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس کے مالک کے منہ سے گالیوں کا فوارہ ابل رہا تھا۔ آنکھ پھوٹنے کے بعد مرغ لڑائی کے قابل نہیں رہتا تھا۔ چودھری انور کو یقین تھا کہ آج بھوتوں کی بلی چڑھنے کا اعزاز تغلق کو دیا جائے گا۔ اس کے مالک کا غصہ بھی بجا تھا۔ چودھری انور کو کسی نے بتایا تھا

کہ پچھلے ہفتے پچاس ہزار روپے میں تغلق کو خریدنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن مالک نے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کا پیٹ چیر کر ایک ہی دن میں سارے انڈے نکالنے کی کوشش کرنے والا بے وقوف نہیں ہے۔

چودھری انور کو ایک پر تین کے ریٹ سے پانچ سو پر ڈیڑھ ہزار روپے ملے۔ اس نے مزید ٹھہرنا بیکار سمجھ کر واپس ملتان شہر کا رخ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس لڑائی کے بعد اب کسی اور لڑائی میں اسے مزا نہیں آئے گا۔ ملتان جاتے ہوئے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب دوبارہ مرغوں کی لڑائی دیکھنے نہیں آئے گا۔ چودھری انور جانتا تھا کہ تغلق جیت جاتا تو وہ اپنا عہد بھول کر تغلق کو نیچا دکھانے شاید اگلے ہفتے پھر پہنچا ہوا ہوتا۔ آج وہ فتح مند ہو کر آیا تھا۔ لیکن کل پھر کسی ضد کا شکار ہو کر اپنی انا اور جیب دونوں کو خالی کر سکتا تھا۔ گلگشت کالونی کے بازار میں دودھ پتی کی چائے پیتے ہوئے اسے اپنے فیصلے پر بہت اطمینان ہوا اور اس نے ایک بار پھر اپنے عہد پر قائم رہنے کا عہد کیا۔

''چودھری تو آج مرغوں کی پہلوانی دیکھنے نہیں گیا' یا بھوتوں کے ڈر سے لوٹ آیا۔'' فارغ بیٹھے ہوئے پان والے نے انور کو دیکھ کر کہا۔ انور کو چائے اور پان والا اچھی طرح جاننے لگے تھے۔ علاقے کے بہت سے وہ لوگ بھی جو باقاعدگی سے بھوتوں کی حویلی جاتے تھے چودھری انور کو پہچانتے تھے۔

''آج ایک بھوت نے ترے چیمپئن تغلق کو چمٹ کر چت کر دیا تھا۔ اس کے بعد ٹھہرنے میں مزا نہیں آتا۔'' چودھری انور نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اوئے تغلق پٹ گیا۔ کمال ہے۔ اوئے جادو' سنا تو نے' تغلق مارا گیا۔'' پان والے نے چودھری انور کے پیچھے ابھی ابھی آ کر کھڑے ہوئے ایک شخص کو مخاطب کر کے کہا۔ پان والا' اور پان والا ہی کیا سارے بازار والے مشہور مرغوں کے حسب نسب اور ان کی مشہور لڑائیوں کا تمام احوال جانتے تھے۔ بھوتوں کی حویلی سے واپسی پر سب کا مقام گلگشت کالونی کے بازار کا یہی کونا ہوتا جہاں رات گئے تک اس روز کی کشتیوں پر ہونے والے تبصروں کی بازگشت گونجتی رہتی تھی۔

"چودہری سے ہماری بھی پہچان کرا دے رحمت دین۔" چودہری انور کے پیچھے کھڑے ہوئے جادو نامی شخص نے آنکھ مار کر پان والے سے کہا۔

"یہ محمود کوٹ کا چودہری ہے۔ چودہری یہ جادو ہے۔ جادو کہلاتا ہے اس کا جادو دیکھو گے تو بھوتوں کی حویلی بھول جاؤ گے۔" پان والے نے بھی آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ دونوں طرف سے ماری جانے والی آنکھوں کے درمیان کھڑا ہوا چودہری انور کچھ سمجھے بغیر ہنسنے لگا۔ چودہری اپنے پان کی گلوری پہلے ہی لے چکا تھا اور اب پان والا جادو کو پان لگا کر دے رہا تھا۔ اس عرصے میں دو تین گاہک اور آ گئے تھے اس لئے چودہری انور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ جادو بھی پان منہ میں دبا کر چودہری کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اسے دیکھ کر کوئی خوشگوار تاثر نہیں ابھرتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں' بہت نمایاں سی پھولی ہوئی ناک' موٹے موٹے ہونٹ جو شاید سگریٹ نوشی کی کثرت سے سیاہ ہو گئے تھے۔ رنگ گہرا سانولا' تیل میں بھیگے ہوئے بالوں کو مانگ نکال کر پھٹے کی شکل میں سنوارا گیا تھا۔ آسمانی رنگ کی شلوار قمیض جو یقیناً" کئی دنوں سے اس کے بدن سے نہیں اتری ہو گی۔ گلے میں لپٹا ہوا لال بنکیوں والا مفلر بھی میل سے کالا ہو رہا تھا۔ وہ سگریٹ کو مٹھی بنی ہوئی انگلیوں میں دبا کر گہرے کش لیتا ہوا دھواں اڑا رہا تھا۔

"چودہری ٹیم ہو تو چلو' تمہیں جنت کی سیر کراؤں۔" جادو نے کسی پیش بندی کے بغیر فوراً" ہی پیش کش کی۔

"ٹیم تو ہے' لیکن یہ جنت کون سی ہے۔ رحمت دین بھی تیرے جادو کی تعریف کر رہا تھا۔ یہ بتا کہ لے کے کہاں جائے گا۔" چودہری انور کو دلچسپی تو تھی' وہ بھوتوں کی حویلی چھوڑ کر دلچسپی کی کوئی نئی جگہ ڈھونڈنا بھی چاہتا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ جادو کا تماشا نہیں سمجھ پایا تھا۔

"دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔ تمہاری قسمت اچھی ہے۔ میرے پاس ایک ایک ہفتے کی بکنگ ہوتی ہے۔ لیکن آج کا دن خالی ہے۔ کوٹھے کی نہیں گھریلو چیز ہے۔ تمہیں گھر والی جیسا مزا دے گی۔ ایک بار بیٹھو گے تو بار بار پلٹ کر آؤ گے۔" جادو کا

انداز اب بالکل پیشہ ورانہ ہو گیا تھا۔ چودھری انور کی سمجھ میں آیا تو جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ مرغوں کی لڑائی سے واپسی پر کئی لوگ ممنوعہ علاقے میں داد عیش دینے جاتے تھے' ایک دو بار انہوں نے چودھری انور سے بھی کہا تھا لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ آج پہلی بار وہ اس طرح کی براہ راست پیش کش سے دو چار ہوا تھا۔ لیکن بزدلی آڑے آ رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔۔ میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔ تو کسی اور کو پھانسنے کی کوشش کر۔" چودھری نے جادو کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"اپنا گوشت لڑاؤ گے چودھری تو مرغے لڑانا بھول جاؤ گے۔ ایک بار چل کے دیکھو۔ مزا نہ آئے تو پیسے مت دینا۔" جادو کو پتہ تھا کہ شکار آہستہ آہستہ قابو آئے گا۔

"لیکن پیسے ہوں گے کتنے۔" چودھری انور نے سوچا پوچھنے میں کیا حرج ہے۔ اس کے جسم میں ان دیکھی جنت تک جانے کے امکان نے جو سنسنی پیدا کی تھی وہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"ایک بار بیٹھنے کے صرف پانچ سو دو بار بیٹھو گے تو سات سو۔ اس کے علاوہ پچاس روپے دودھ کے' اور پچاس روپے میرے ہوں گے' چائے پانی کے۔" جادو نے آسان سا حساب بتا دیا۔

"دودھ اور چائے پانی کے نہیں دوں گا۔ صرف پانچ سو دوں گا۔ تیری مرضی ہے تو چل ورنہ میں چلا اپنے گھر۔" چودھری بھی پکا کاروباری تھا' لین دین کرنا جانتا تھا۔

"میرے پچاس مت دینا۔ لیکن وہ دودھ کے پچاس ضرور لے گی۔ پانچ سو روپے ابھی دے دو' اس کے پچاس اسی کے ہاتھ پر رکھنا' بولو تو ٹیکسی روکوں۔" جادو نے سودا پکا کر دیا۔ چودھری نے بھی سوچا ساڑھے پانچ سو میں سودا برا نہیں ہے۔ اس کی جیب میں جیتے ہوئے کرارے نوٹ ابھی تک گرم تھے۔ پچاس روپے کی خاطر وہ اپنے کنوارے پن کو لٹانے کا یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔

"رہنے دو جادو۔ کوئی پہچان والا دیکھ لے گا تو عزت خراب ہو گی۔" چودہری اب بھی جھجک رہا تھا۔

"کوئی نہیں دیکھے گا' چودہری فکر مت کر۔ میں تجھے کوٹھے نہیں لے جا رہا۔ شریفوں کی بستی لے کر جاؤں گا۔ تو اس کے گھر ملاقاتی بن کر جائے گا۔ کوئی پہچان والا دیکھ بھی لے گا تو تیری عزت خراب نہیں ہو گی۔ چل پیسے نکال۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔" جادو اب تم سے تو پر آ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ چودہری ابھی اناڑی ہے۔ پہلی پہلی بار کا معاملہ ہے اس لئے گھبرا رہا ہے۔

"ٹیکسی کی ضرورت نہیں ہے میرے پاس موٹر سائیکل ہے' اسی پر چلیں گے۔" چودہری انور نے پانچ سو روپے جیب سے نکال کر جادو کو دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' میں سامنے کی دکان سے ہو کر دو منٹ میں آیا۔" جادو یہ کہہ کر اک دم ہوا ہو گیا۔ چودہری انور سوچنے لگا کہ جادو پانچ سو روپے لے کر بھاگ تو نہیں گیا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ رحمت دین پان والے کا جاننے والا ہے اس لئے صرف پانچ سو کے لئے ایسا دھوکہ نہیں کرے گا۔ چودہری انور کو بھی جانے سے پہلے تیاری کے لئے چند منٹ چاہئے تھے۔ برابر کے ہوٹل سے جا کر اس نے ایک گلاس دودھ لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور باہر آ کر جادو کا انتظار کرنے لگا۔ چودھری کو معلوم تھا کہ وہ آج کشتی دیکھنے نہیں خود ریسلنگ کرنے جا رہا ہے۔ اس لئے تیاری ضروری تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ پہلوان مرغوں کو ان کے مالک کس طرح کشتی سے پہلے بادام پستہ کھلا کر تیار کرتے تھے۔ چودہری بھی اپنی زندگی کی پہلی ریسلنگ میں شرکت کرنے جا رہا تھا۔ اس کا جسم بالکل تیار تھا صرف دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا اور جادو کے واپس آنے پر جب اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی تو ایسا لگا جیسے دل سینہ توڑ کر باہر نکل جائے گا۔

جادو کی شریفوں کی بستی نواب پور کا وہ علاقہ ثابت ہوا جہاں غریبوں کی آبادی تھی۔ دور تک کچے پکے مکانوں کا سلسلہ تھا' چھوٹی چھوٹی گلیاں' ہر نکڑ پر کوڑے کا ڈھیر' ہر گلی میں بہتا ہوا کیچڑ کا چھوٹا سا نالہ' تعفن نے چودہری کے جوش و خروش کو

آدھا ٹھنڈا کر دیا۔ وہ بڑی تیزی میں آیا تھا۔ جادو اس کو رستے بھر ٹوکتا رہا تھا کہ چودہری ذرا آرام سے۔ وہ عورت بھاگے گی نہیں۔ لیکن چودہری انور کی تو کنپٹیاں تک گرم ہو رہی تھیں۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ریسلنگ میں فتح مند ہونے کے خواب دیکھتا ہوا بس تیزی سے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ جادو کے اشارے پر اس نے ایک کچے مکان کے سامنے موٹر سائیکل روک دی۔ خشک نالے کے کنارے پر یہ کچی مٹی کی دیواروں کا بنا ہوا مکان تھا۔ کھلے ہوئے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ جادو کے کہنے پر وہ موٹر سائیکل کھینچتا ہوا دروازے کے اندر لے گیا۔ جادو نے تختے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ دروازہ ایسا تھا کہ کوئی بچہ بھی لات مارتا تو ٹوٹ جاتا۔

چودہری انور کو اندر کا نقشہ کچھ عجیب سا لگا۔ موٹر سائیکل اس نے بیچ صحن میں کھڑی کی تھی۔ دائیں طرف کچی دیواروں پر چٹائیاں ڈال کر ایک کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ بائیں طرف صحن میں ایک چھوٹے سے چھپر کے نیچے چولہا تھا جس کے سامنے ایک درمیانی عمر کی عورت بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔ چولہے میں سلگتی ہوئی لکڑیاں دھواں دے رہی تھیں جن پر رکھا ہوا توا روٹی پڑنے کے انتظار میں تھا۔ ساتھ ہی لکڑی کی ایک تپائی پر تین چار سال کا ایک بچہ بیٹھا زور زور سے رو رہا تھا اور آٹا گوندھتی عورت سے جو یقیناً" اس کی ماں تھی کھانا مانگ رہا تھا۔ چودہری انور نے سوچا رستے بھر وہ جس شہزادی کے خواب دیکھتا آیا ہے وہ یقیناً" اندر کمرے میں بیٹھی اس کی منتظر ہو گی۔ جادو اسے لے کر کمرے کی طرف ہی بڑھا تھا۔ لیکن کمرہ خالی تھا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے۔" چودہری نے حیرت ظاہر کی۔

"میں نے بتایا تھا نا کہ وہ گھریلو عورت ہے۔ اپنے بچے کو روٹی کھلانے کی تیاری کر رہی ہے۔ تو بیٹھ میں اسے ابھی بھیجتا ہوں۔" جادو چودہری کو حیران چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ چودہری انور کو ایسا لگا جیسے بڑھ بڑھ کر حملے کرنے کو بے تاب کوئی چیمپئن مرغ اچانک دبک کر بیٹھ گیا ہو۔ وہ کمرے کے دروازے میں باہر کا منظر دیکھنے لگا۔

عورت آٹا گوندھنا چھوڑ کر بڑی بے چارگی سے جادو کو دیکھ رہی تھی۔ بچے کی چیخ و پکار میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"دیکھتی کیا ہے اٹھ اور اندر جا۔ میرے پاس ٹیم کم ہے۔ شام کو تیرے لئے دوسرا خصم بھی ڈھونڈنا ہے۔" جادو عورت سے کہہ رہا تھا۔

"شیرا بیمار اور صبح سے بھوکا ہے۔ دن بھر ڈسپنسری کی لین میں لگ کر اس کی دوا لائی ہوں پہلے دو روٹی ڈال کر اسے دے دوں پھر تیرے یار کو بھی خوش کر دوں گی۔" عورت کے لہجے میں بے بسی اور غصہ دونوں شامل تھے۔

"وہ میرا نہیں تیرا یار ہے اور تیرے تندور میں روٹی لگانے آیا ہے۔ وہ بھی کئی سالوں سے بھوکا ہے دو منٹ سے زیادہ نہیں لگائے گا۔ جا اسے ٹھنڈا کر کے آ تیرے حرام کے پلے کو میں سنبھالتا ہوں۔" جادو نے شیرا کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ چھوٹا بچہ ڈر کے مارے رونا بھول گیا۔

"میرے بچے کا ہاتھ توڑے گا قصائی۔ چھوڑ اسے میں جاتی ہوں۔ تو نے اسے اب ہاتھ بھی لگایا تو کچا چبا جاؤں گی۔" عورت کی بے چارگی میں اب اس کے آنسو بھی شامل ہو گئے تھے۔ جادو ہنسنے لگا۔ شیرا کا ہاتھ اس نے چھوڑ دیا اور وہ سہم کر اپنی ماں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی ماں آٹے سے سنے ہوئے ہاتھ دھوتی اور آنکھیں پونچھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

چولہے میں آگ کی لپٹیں تیز ہو گئی تھیں اور ان پر رکھا ہوا توا جلنے لگا تھا۔ چودہری انور پیچھے ہٹ کر دروازے کے کواڑ کی آڑ میں ہو گیا۔ کمرے میں ایک طرف بان کا پلنگ تھا جس پر دری بچھی تھی اور سرہانے ایک گندا سا تکیہ رکھا تھا۔ دوسرے کونے میں زمین پر ایک گدا بچھا ہوا تھا۔ اس پر بھی دو تکئے اور ایک چادر رکھی تھی۔ انہیں کے ساتھ ایک ٹین کا صندوق تھا جس کا ڈھکنا ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اس پر ایک چھوٹا سا ٹوٹا ہوا شیشہ اور ایک کنگھا رکھا ہوا تھا جس کے دندانوں کی جڑوں میں کالے میل کے چھتے لگے تھے۔

عورت نے اندر آ کر کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ یہ دروازہ باہر کے دروازے کی طرح تختے کا نہیں مضبوط لکڑی کا تھا۔

"آؤ باؤ جی۔" اس نے ہونٹوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجا لی تھی اور چودہری

انور کو پہلی بار نظر بھر کر دیکھا تھا۔ دعوت کے اس انداز نے چودہری کو بالکل ہی گنگ کر دیا۔ وہ باہر کا منظر دیکھ کر پہلے ہی سن ہو چکا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ جنسی قوت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا ہو۔ جیسے اس کا یہ جذبہ اب کبھی بیدار نہیں ہو گا۔ "آؤ باؤ جی" کی آواز اس کے کانوں میں شور مچا رہی تھی۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھا اور پلنگ پر بیٹھی اس عورت کو دیکھ رہا تھا جس کا بھوک سے بلکتا ہوا بیمار بچہ باہر بیٹھا چولہے پر جلتے ہوئے خالی توے کو تک رہا تھا۔ چودہری انور کی جیب میں ابھی ایک ہزار روپے بچے تھے۔ اس نے وہ سارے پیسے نکال کر اس پلنگ پر ڈال دیئے جس پر وہ بیٹھی تھی اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ جادو اسے اتنی جلدی باہر آتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے اندازہ تھا کیا ہوا ہو گا اس لئے ہنسنے لگا تھا۔ چودہری انور اپنی موٹر سائیکل کھینچ کر گھر سے باہر نکالنے لگا تو اس کے پیچھے لپکا۔

"شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے چودہری۔ پہلی بار میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے اگلی دفعہ میں اندھے حکیم کی گولی لا کر دوں گا۔ عورت ہمیشہ کے لئے تیری غلام ہو جائے گی۔" چودہری انور کچھ سن نہیں رہا تھا۔ وہ تو یہاں سے بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔ اس نے باہر آ کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی تو جادو کی آواز ایک بار پھر سنائی دی "مجھے **گلگشت** کالونی اتار دینا چودہری" چودہری نے اتنی تیزی میں موٹر سائیکل اسٹارٹ کی کہ وہ گھوڑے کی طرح پہیئے پر کھڑی ہو گئی۔ چودہری انور طوفان کی طرح موٹر سائیکل چلاتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ رستے میں صرف ایک بار پیٹرول لینے رکا تھا۔ تمام راستے "آؤ باؤ جی" کی آواز اس کا پیچھا کرتی آئی تھی اور نظروں کے سامنے جلتے ہوئے توے کے سامنے بیٹھے ہوئے بچے کا چہرہ تھا جس کے گالوں پر خشک ہو جانے والے آنسوؤں کی لکیریں ثبت ہو گئیں تھیں۔

چودہری کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ یہ نہیں کہ اس نے غربت نہیں دیکھی تھی۔ وہ تو اس کے ہر طرف پھیلی ہوئی تھی زمینوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی بستیاں غربت کا اشتہار تھیں۔ لیکن اس نے انہیں ایک روٹی کے لئے محنت کی چکی میں پستے دیکھا تھا۔ انہیں تن پر لگی ہوئی کپڑے کی ایک ایک دھجی کے لئے ایک

ایک نوالے کے لئے اپنا جسم مٹی کرنا پڑتا تھا۔ ان کے جگر کے ٹکڑے ان کے سامنے علاج اور دوا سے محروم ہو کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے اور وہ انہیں جی بھر کے رو بھی نہیں پاتے۔ مٹی میں دبا کر آتے اور مٹی کھودنے کی مزدوری پر لگ جاتے۔ لیکن غربت کی یہ تصویر اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ پلنگ پر بیٹھی ہوئی عورت اور روٹی کے لئے بلکتا ہوا بچہ بار بار اس کی نظروں میں گھوم جاتے۔ "آؤ باؤ جی" کی آواز مستقل اس کے سر پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ اس نے اس عورت کے ساتھ جادو کا برتاؤ دیکھا تھا اور اب یہ سوچ سوچ کر اس کا خون کھول رہا تھا کہ اس نے وہیں اس کا ٹینٹوا کیوں نہیں دبا دیا تھا۔ چودہری خاموش بیٹھ کر کڑھنے والوں میں سے نہیں تھا۔ کل تو اس کے سر پر جنس کا بھوت سوار تھا' اس ساری صورت حال میں وہ الجھ کر رہ گیا تھا اور وہاں سے بھاگ جانے کے سوا کوئی اور حل نظر نہیں آیا تھا۔ لیکن اس نے دل میں پکا ارادہ کیا کہ وہ کل پھر ملتان جائے گا اور رحمت دین پان والے سے بات کرے گا۔ اسے یقیناً" صحیح کہانی معلوم ہوگی۔ یا جادو مل گیا تو گردن دبا کر اسی سے پوچھے گا۔ نہیں تو وہ اس عورت کے پاس چلا جائے گا۔ اور پوچھے گا کہ ایسی کیا مجبوری ہے کہ وہ جسم بیچے بغیر اپنے اور اپنے بچے کے لئے دو وقت کی روٹی نہیں کما سکتی۔ یہ فیصلہ کر کے ذہن کو اطمینان ہوا تو اسے نیند بھی آ گئی۔

فصل کٹ کر منڈیوں کو جا چکی تھی اس لئے زمینوں پر کوئی بڑا کام نہیں تھا۔ چودہری کو اس روز صرف کوٹ ادو جا کر مارکیٹ سے پیسے وصول کرنے تھے۔ صبح سویرے اٹھتے ہی وہ روانہ ہو گیا۔ مارکیٹ سے پیسہ اکٹھا کر کے واپس آتے آتے اسے دوپہر ہو گئی۔ کھانا اس نے کوٹ ادو میں ہی کھا لیا تھا اس لئے اس نے گھر میں پیسے رکھے اور منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر ملتان روانہ ہو گیا۔ یہ اچھا تھا کہ اس کا باپ گھر میں نہیں تھا' شاید کھیتوں پر نکلا ہوا تھا' ورنہ اس کے اس طرح طوفانی انداز میں آنے اور جانے کے بارے میں ضرور پوچھتا۔ ملتان پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ رحمت دین کی دکان پر خوب چہل پہل تھی۔ چودہری انور کو اندازہ ہو گیا کہ رحمت دین سے بات کرنا مشکل ہے۔ اس نے پان لیتے ہوئے جادو کے بارے میں پوچھا۔

"تجھ پر بھی جادو چڑھ گیا چودھری۔" پان والے نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "وہ ادھر ہی کہیں بازار میں گاہک پھانس رہا ہو گا۔ ابھی ابھی مجھ سے پان لے کر گیا ہے۔"

چودھری انور نے بازار میں نظر دوڑائی تو ذرا فاصلے پر جادو ایک پہلوان نما آدمی سے بات کرتا ہوا نظر آیا۔ چودھری کو اپنی طرف آتا دیکھ کر تیر کی طرح اس کے پاس آیا۔

"چودھری آج کیا پھر مردانگی آزمانے کا ارادہ ہے۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ دبا کر بہت معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"نہیں مجھے کل والی عورت کے بارے میں تجھ سے کچھ پوچھنا ہے۔" چودھری نے اس کی مسکراہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"اسے بھول جا چودھری۔ اس حرام کار کو بے وقت سرخ پٹی لگ گئی ہے۔ وہ ایک ہفتے کے لئے بیکار ہے۔ وہ تیرے کام کی ہے بھی نہیں' بالکل مٹی کا ڈھیر ہے۔ میرے پاس ایک اور لڑکی ہے وہ اپنے ہاتھوں سے تجھے تیار کرے گی اور تیرے ساتھ خود بھی مزا لے گی۔ اسی لئے وہ ایک دن میں ایک گاہک لیتی ہے۔ آج بک ہے تو کل رحمت دین کی دکان پر اسی ٹیم آ جا' تیری بھی باری لگوا دوں گا۔" یہ کہہ کر جادو جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے اس شخص کی طرف پلٹ گیا جس کا ایک ہاتھ مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور دوسرا مستقل شلوار کی رومالی میں گردش کر رہا تھا۔ جادو ایک رکشا رکوا کر اس میں اپنے گاہک کے ساتھ بیٹھ کر چلا گیا۔ چودھری انور نے سوچا میدان صاف ہے' وہ جا کر عورت سے براہ راست بات کرے گا۔ جادو نہیں ہو گا تو وہ بغیر ڈرے اپنی کہانی سنا دے گی۔

ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا اور دن کی سفیدی باقی تھی اس لئے چودھری انور کو نالے کے کنارے بنا ہوا مکان ڈھونڈنے میں مشکل نہیں ہوئی۔ موٹر سائیکل باہر دروازے پر کھڑی کر کے اس نے اس تختے نما دروازہ کو کھٹکھٹایا جسے آج کنڈی لگی ہوئی تھی۔ عورت دروازہ کھول کر تھوڑی دیر تک چودھری کو حیرت سے تکتی رہی۔

لیکن پھر ایک طرف ہو کر اسے اندر آنے کا راستہ دینے لگی۔ چودہری اندر گیا تو اس نے دروازے کو پھر کنڈی لگا دی اور کمرے کی طرف چلنے لگی۔ چودہری بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کمرے کو بند کر کے کل کی طرح اندر سے اس کی بھی کنڈی لگا دی۔ کمرے کے کونے میں پڑے ہوئے گدے پر اس کا شیرا بے خبر سو رہا تھا چودہری بان کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ عورت زمین پر بیٹھ کر اس کے جوتے اتارنے لگی۔ چودہری اپنے پاؤں کھینچ کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"یہ کیا کر رہی ہے؟" چودہری نے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کر باؤ جی! وہ بے خبر سوتا رہے گا۔" اس نے دوبارہ چودہری کو دھکیل کر پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ یہ بتا کہ وہ ٹھیک تو ہے۔" چودہری نے عورت سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ نہیں بھی ہے تو لوٹ پوٹ کر ہو جائے گا۔ کل اس کا بدن بہت تپتا تھا۔ بھوکا بھی بہت تھا اس لئے میں اپنا کام بھول گئی تھی۔ مجھے معلوم ہے تو پہلی پہلی بار اپنا شوق پورا کرنے آیا تھا یہاں کا ماحول دیکھ کر گھبرا گیا ہو گا۔ تو اچھا آدمی ہے۔ مجھ پر ترس کھا کر جو ہزار روپے دے گیا تھا اس کی وجہ سے میں نے بہانہ بنا کر جادو سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے۔ حرام خور ایسے ایسے مسٹنڈے تلاش کر کے لاتا ہے جو اپنی پہلوانی کا سارا زور میری ہڈیوں کو جھنجھوڑ کر نکالتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے تو ایسا نہیں ہو گا۔ اس پورے ہفتے تو جب چاہے آ کر اپنے ہزار روپے کا قرض واپس اتار لے۔ لیکن جادو کا خیال رکھ کر آنا۔ اس مردود نے دیکھ لیا تو میرا دھندا بند کر دے گا ساتھ میں تیری بھی جان کو آ جائے گا۔" وہ اسی طرح زمین پر بیٹھے بیٹھے کھسک کر چودہری کے پاس آ گئی اور اپنا ہاتھ اس کی ران پر رکھ کر سہلانے لگی۔ چودہری اس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"میں تیرے ساتھ منہ کالا کرنے نہیں آیا۔ نہ ہی تجھے ہزار روپے بدکاری کرنے کے لئے دیئے تھے۔ کل تیری اور تیرے بچے کی حالت دیکھ کر میں رات بھر سو

نہیں سکا۔ دن بھر بے چین رہا۔ تیری کہانی سننے آیا تھا کہ شاید تیری کوئی مدد کر سکوں۔ لیکن تو تو ایک نمبر کی گشتی ہے۔ عزت تیرے پاس سے گزری بھی نہیں ہے۔"
چودہری انور کو واقعی طیش آگیا تھا۔
"عزت غریبوں کے گھر نہیں سجتی باؤ۔ میری کہانی سننے تجھے اتنی دور آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی بھی غریب کو دیکھ لیتا تجھے میری کہانی معلوم ہو جاتی۔"
عورت نے بہت چوٹ کھائے ہوئے لیکن نڈھال سے لہجے میں کہا۔
"میں نے بہت غریب دیکھے ہیں۔ میرے چاروں طرف رہتے ہیں۔ میں خود بھی کوئی ساہوکار نہیں ہوں۔ لیکن میں نے کسی غریب کو پیٹ پالنے کے لئے شلوار اتارتے نہیں دیکھا۔ دن رات مزدوری کر کے پورا پورا کنبہ پالتے ہیں۔ روٹی نہیں ملتی تو سب مل کر فاقہ کرتے ہیں۔ تو نے تو صرف ایک ننھی سی جان کو پالنے کے لئے خود کو بھڑوں کے ہاتھوں گروی رکھ دیا ہے۔ کتیا کہیں کی۔ گشتی" چودہری انور جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے غصہ تھا کہ وہ جس کے لئے کل سے اپنا خون کھولاتا رہا تھا' جسے اس نے اپنی جیب کی ساری رقم دے دی تھی وہ اب بھی "آؤ باؤ جی" کی تفسیر بنی اس سے اپنے جسم کا سودا کر رہی تھی۔
"اس گشتی کی کہانی سن کر نہیں جاؤ گے باؤ؟" عورت کی آواز ایک آہ کی طرح نکلی تھی۔ ایک یخ بستہ سی آہ۔ چودہری انور کے قدم تھم گئے۔ اندھیرے کمرے میں اسے عورت کی آنکھوں میں آنسوؤں کی قندیلیں جلتی نظر آئیں۔
"آؤ بیٹھ جاؤ میں لالٹین جلا لاؤں۔" اس نے واپس پلٹتے ہوئے چودہری کو دیکھ کر کہا اور طاق پر رکھی ہوئی مٹی کے تیل کی لالٹین جلانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندھیرے کمرے میں لالٹین کی بیمار زرد روشنی پھیل گئی۔ گدے پر سوتے ہوئے شیرا پر مچھر بھنبھنانے لگے تھے۔ ان سے بچے کو بچانے کے لئے عورت نے وہیں کہیں پڑا ہوا اپنا دوپٹا اس کے جسم پر ڈال دیا اور چارپائی سے ذرا ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔
"میری کہانی انوکھی نہیں ہے۔ میرے ساتھ جو بیتی ہے وہ مجھ جیسی بہت عورتوں کے ساتھ بیتی ہے لیکن جو کچھ بھی بیتی ہے اس کی کہانی میں نے بہت دنوں

سے سنانی بند کر دی ہے۔ میں نے جب نیا نیا یہ دھندا شروع کیا تھا تو ہر نئے آنے والے کے پوچھنے پر انہیں بتا سناتی اور ان کی ہمدردی سمیٹتی۔ اس امید پر کہ شاید کوئی واقعی مرد نکلے اور میری مدد کو اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن وہ مجھے صرف امیدیں دلاتے' وعدے کرتے اور خواب دکھاتے رہے۔ میں ان کے لئے اپنے جسم کا ایک ایک انگ کھول دیتی۔ ایک تو مجھ سے یہ کہہ کر گیا کہ وہ کل مجھے لینے آئے گا اور میرے مسئلے حل کر کے مجھے میری دنیا میں واپس بسا دے گا۔ میں دوسرے دن اپنی پوٹلی باندھے اور شیرا کو بدن سے چپکائے اس کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ جادو ایک گاہک لے کر آیا لیکن میں نے منع کر دیا۔ اس نے میری چٹیا کھینچی' تھپڑ مارے لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں دن بھر اور رات بھر اسی طرح بیٹھی رہی لیکن اسے نہ آنا تھا۔ نہ آیا۔ اس دن کے بعد میں نے طے کر لیا کہ میں کسی کو اپنی کہانی نہیں سناؤں گی۔ میں ان کا کھیل سمجھ گئی تھی۔ وہ پیسے دے کر میرا جسم اور ہمدردیاں جتا کر میری چاہت خریدتے تھے۔ اس کے بعد میں بقول تیرے صرف گشتی بن گئی۔ میرے گاہک آتے میرے جسم پر اپنا حوصلہ نکالتے' لیکن ان پر اپنے جذبات کے دروازے میں نے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے۔ تو شاید ان سے مختلف ہے۔ تو نے میرا جسم خریدا لیکن اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا بلکہ ترس کھا کر ہزار روپے دے گیا جو میں مہینے بھر میں کماتی ہوں۔ اور اب بھی ان کے بدلے تجھے میرا جسم نہیں چاہئے۔ تجھے میری کہانی سنی ہے' وہ میں تجھے ضرور سناؤں گی۔ شاید اس طرح تیرا قرض اتر جائے۔ لیکن باؤ یہ وعدہ کر کہ کوئی وعدہ نہیں کرے گا۔ کہانی سن کر ہمدردی نہیں جتائے گا۔ امید نہیں دلائے گا۔"

چودہری انور کچھ بولا نہیں بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ لالٹین کی روشنی نے اس کے چہرے کی پیلاہٹ اور بڑھا دی تھی۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ تھا اگر چہرے پر خوشحالی کے گلاب کھلے ہوتے تو بہت خوبصورت لگتی۔ اب بھی خاصی قبول صورت تھی۔ عمر بھی تیس بتیس سے زیادہ کی نہیں ہو گی۔ سینہ بہت بھرا بھرا تھا۔ جادو نے اسے بلاوجہ قابو نہیں کیا تھا۔ عورت نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر چودہری انور کے جواب کا انتظار کیا لیکن اسے خاموش پا کر اپنی کہانی پھر سے شروع کر دی۔

"میرا نام نور جہاں تھا لیکن سب نوری بلاتے تھے۔ میرا گھر والا گاؤں جتوئی میں ایک زمیندار کے کھیت میں مزدوری کا کام کرتا تھا۔ میرے دو بیٹے ہیں بارہ اور چودہ سال کے۔ وہ دونوں بھی باپ کے ساتھ زمینوں پر کام کرتے تھے۔ میں فصل پر کپاس چننے کا کام کرتی اور باقی دنوں میں گھر بیٹھ کر ڈلیاں بنتی تھی۔ شیرا اس وقت صرف دو سال کا تھا۔ ہم سب محنت کر کے جو کچھ کماتے اس میں اچھی گزر بسر ہو سکتی تھی لیکن ہماری زندگی کو ایک قرضے کا گھن لگا ہوا تھا۔ میرے گھر والے کے باپ نے جب سوکھا پڑا تھا تو انگوٹھا لگا کر ایک سود خور پٹھان سے کچھ پیسے ادھار لئے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں نہیں چکا سکا تھا اس لئے اس کا پیسہ ہمارے کندھے پر سوار ہو گیا۔ ہم ہر مہینے کچھ نہ کچھ کر کے اس کا بیاج چکا دیتے لیکن اصل جو پہلے ہی بہت بڑھ گیا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمیں تو حساب بھی نہیں پتہ تھا۔ بس جب وہ پیسے لینے آتا تو جو کچھ ہوتا اسے دے دیتے۔ دو برس پہلے بڑے زور کی باڑھ آئی تھی۔ اس زمانے میں سانپوں نے جینا دشوار کر دیا تھا۔ ایک دن ایک زہریلا سانپ میرے گھر والے کو لڑ گیا۔ دور دور تک کوئی حکیم ڈاکٹر نہیں تھا۔ جب تک مدد پہنچتی میرا مرد ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ میری تو دنیا اجڑ گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔ کچھ دنوں بعد جب غم ہلکا ہوا تو نئے غموں نے آ دبوچا۔ زمیندار نے نظریں بدل لی تھیں کام کرنے والا نہیں رہا تو اس کے لئے ہمارا وجود بھی بیکار ہو گیا۔ میرے بچے جو اس وقت دس اور بارہ سال کے تھے باپ کے بغیر کام پر نہیں جا سکتے تھے۔ ایک پڑوسی کی صلاح پر میں سامان لپیٹ کر اپنے بچوں کو لئے ملتان آ گئی۔ میرے دونوں بچے بہت محنتی ہیں۔ انہیں قالین بنانے کے کارخانے میں نوکری مل گئی۔ کچھ ہی عرصے میں کام سیکھ کر اچھے پیسے کمانے لگے۔ اتنے پیسے تو میرا مرد بیٹوں کے ساتھ مل کر زمینوں سے نہیں کماتا تھا۔ میں بھی ڈلیاں بنانے کے کام پر لگ گئی۔ مجھے یہ بھی خوشی تھی کہ پٹھان سے جان چھوٹ گئی۔ میرا خیال تھا اسے پتہ نہیں چلے گا کہ ہم کہاں گئے۔ لیکن ایک شام وہ ہمارے دروازے پر موجود تھا۔ بہت جھک جھک ہوئی لیکن بعد میں اس کا بیاج چکانے کا چکر ایک بار پھر چل نکلا۔ پھر بھی اتنا بچ جاتا کہ ہم آرام سے دو وقت کھاتے اور

تھوڑا بہت کپڑا لتا بھی کر لیتے۔

"ایک دن میرے دونوں بیٹے منہ لٹکائے گھر آئے۔ ان کی نوکری چھوٹ گئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ قالین کے کارخانوں میں بچوں سے بیگار لینے کے خلاف شور مچا ہے۔ باہر کے ملکوں کے قالین کے آرڈر واپس لے لئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں انہیں وہ قالین نہیں چاہئے جنہیں بنانے میں چھوٹے بچوں کا ہاتھ لگا ہو۔ میری سمجھ میں بات نہیں آئی۔ میں سمجھی شاید کارخانے کے مالک نے بہانہ کر کے بچوں کو نکال دیا ہے۔ میں دوسرے دن بچوں کو لے کر کارخانے گئی تو وہاں سچ مچ کام بند تھا۔ قالین بنانے والی کھڈیاں خاموش کھڑی تھیں۔ کارخانے کا مالک پہلے ہی جلا بیٹھا تھا بولتا تھا اس کا لاکھوں کا نقصان ہو گیا ہے۔ مجھ سے کہنے لگا جا اپنے بچوں کو اسکول بھیج کر بابو بنا۔ میں نے کہا کھائیں گے کہاں سے بیاج کہاں سے دیں گے۔ کہنے لگا ولایت جا کر گوروں کو بتا۔ وہ تیرے بچوں کو خیرات دیں گے اسکول بھیجیں گے اور دوا دارو بھی دیں گے۔ وہ اپنا سارا غصہ مجھ پر نکالنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بچوں کا محنت کر کے پیسہ کمانا جرم کیوں بن گیا ہے۔ کام نہ کریں تو پھر وہ کیا کریں بھیک مانگیں یا بھوکے مریں۔

"وہ میرے ساتھ قالین کی ایک ایک فیکٹری میں گئے لیکن ہر جگہ ایک ہی کہانی تھی۔ ہر جگہ سے مایوس ہو کر وہ بھی میرے ساتھ ڈلیاں بنانے کے کام پر لگ گئے لیکن ہم تینوں کی دن بھر محنت کے بعد بھی ایک وقت روٹی کے پیسے مشکل سے نکلتے تھے۔ میرا شیرا ایک پیالی دودھ کو ترستا تھا۔ میری چھاتی کا دودھ کب کا خشک ہو گیا تھا پھر بھی سینے سے چپٹا چڑ چڑ کرتا رہتا اور جب اس کے منہ میں قطرہ بھی نہیں آتا تو بلک بلک کر روتا۔ روٹی کو لالے پڑے تھے اس لئے بیاج کہاں سے دیتے۔ دو مہینے لگاتار بیاج لئے بغیر واپس گیا تو وہ سودخور تیسرے مہینے اپنے ساتھ دو پٹھان اور لے کر آیا۔ میں نے رو پیٹ کر ان کے ہاتھ جوڑے انہیں اپنی مجبوری بتائی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ سمجھتے ہیں اس لئے آج اس مسئلے کو حل کرنے آئے ہیں۔ میں خوش ہو گئی لیکن جب انہوں نے مسئلے کا حل بتایا تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

میرا رونا پیٹنا اور بڑھ گیا۔ انہوں نے بتایا وہ میرے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر جائیں گے اور ان سے محنت کرا کے قرضے کا بیاج وصول کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہر مہینے آ کر مجھے میرے بچوں کی خیریت بتائیں گے اور اگر میں کچھ پیسے جمع کر سکوں تو وہ اصل کی رقم سے نکل جائے گی۔ انہوں نے بتایا قرضہ اترنے کی یہی ایک صورت ہے۔ انہوں نے پہلی بار مجھے حساب کتاب دکھایا۔ آٹھ ہزار سے کچھ اوپر کا قرضہ چڑھا ہوا تھا ان کا کہنا تھا کہ اس پر اب بیاج نہیں چڑھے گا۔ بیاج بچوں کی محنت چکائے گی۔ میں اگر ہر مہینے دو ڈھائی سو روپے چکا سکوں تو تین سال میں قرضہ اتر جائے گا اور میرے بچے مجھے واپس مل جائیں گے۔ بات عقل کی تھی۔ جو قرضہ دو نسلوں سے نہیں اترا تھا وہ تین سالوں میں اتر جاتا۔ لیکن مامتا عقل کو نہیں جانتی۔ میں ان کے پاؤں پڑ گئی۔ میں نے ان کی منت کی کہ میں عورت ذات اکیلی کیسے رہوں گی۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہم ہر مہینے تیرے پاس آتے رہیں گے' کوئی تیری عزت پر انگلی بھی اٹھائے تو ہمیں اشارہ کرنا ہم اس کا خون پی جائیں گے۔ وہ میری عزت کے تحفظ کی ضمانت دے رہے تھے۔ مجھے ان کی بات پر یقین تھا۔ وہ اپنے کام کے بہت پکے تھے لیکن انہوں نے میرے اکیلے ہونے کا کبھی فائدہ نہیں اٹھانا چاہا تھا۔ مجھ پر کبھی بری نظر نہیں ڈالی تھی۔ بلکہ کبھی نظر ڈالی ہی نہیں تھی ہمیشہ آنکھیں نیچی رکھ کر بات کرتے۔ گھر میں قدم تک نہیں رکھتے تھے۔ دروازے سے باہر کھڑے رہ کر بات کرتے اور چلے جاتے۔ وہ عورت کو ماں بہن سمجھنے والے لوگ تھے۔ مجھے ان کی بات پر یقین تھا لیکن اپنی مامتا سے بھی مجبور تھی۔ میں نے شور مچا کر سارے محلے کو جمع کر لیا۔ انہوں نے محلے والوں کو بھی وہی بات بتائی جو مجھے سمجھائی تھی۔ قرضے کا کاغذ بھی دکھایا۔ محلے والے ان تینوں کی کمر میں بندھے ہوئے پستولوں کو دیکھ چکے تھے اس لئے ان سے کیا کہتے الٹا مجھے سمجھانے لگے۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ یہاں بھی بچوں کی محنت بیاج چکانے کے کام آتی ہے' وہاں بھی محنت کر کے بیاج چکائیں گے پھر تین سال کے اندر اندر آ بھی ملیں گے۔ انہوں نے بھی بڑی آسانی سے فیصلہ سنا دیا کہ میں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو قصائیوں کے حوالے کر دوں۔ میں انہیں کیسے بتاتی جب میں رات کو ان کا

بدن دباتی ہوں تو ان کی دن بھر کی ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ رات رات بھر پنکھا جھل کر ان پر حملہ کرنے والے مچھروں کو بھگاتی ہوں۔ خون کی ایک بوند نہیں چوسنے دیتی۔ اپنے ہاتھ سے سوکھی روٹی کا نوالہ بھی دیتی ہوں تو ان کے چہرے پر خوشی پھوٹ پڑتی ہے۔ دونوں مل کر جب شیرا کو جھوٹے دیتے ہیں تو میرے صحن میں بھی ہنسی کی پھلواریاں چھوٹتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہماری ویران زندگی میں بھی بہار آ گئی ہو۔ مجھ سے بچھڑ کر تو وہ ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھی ترس جائیں گے۔ میرا شیرا پھر سے یتیم ہو جائے گا۔

"لیکن میری ایک بھی نہیں سنی گئی۔ وہ میرے دونوں لعل مجھ سے چھین کر صوابی لے گئے۔ محلے والوں نے صرف اتنا کیا تھا کہ ان سے ان کا نام اور پتہ لے کر مجھے دے دیا تھا۔ یہ پتہ آج بھی تعویذ کی طرح میرے سینے سے چمٹا ہوا ہے۔ چھ مہینے ہو گئے آج بھی بچھڑ کر جاتے ہوئے معصوموں کا چہرہ میری آنکھوں سے نہیں جاتا۔ چہرے سفید ہو گئے تھے۔ جیسے کسی نے ان کا خون چوس لیا ہو۔ آنکھیں بالکل ویران تھیں۔ ان بکروں کی طرح جنہیں ذبح کرنے کے لئے کھینچ کر لے جایا جا رہا ہو۔ جاتے ہوئے وہ بار بار پلٹ کر مجھے اور میرے پاس کھڑے ہوئے محلے والوں کو امید بھری نظروں سے دیکھتے، لیکن کوئی مرد کا بچہ ایسا نہیں تھا جو انہیں کھینچ کر دوبارہ میری گود میں ڈال دیتا۔ انہیں ذبح ہونے سے بچا لیتا۔"

نوری کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلہ بہہ نکلا وہ بری طرح رونے لگی۔ چودھری انور کا دل چاہا کہ وہ بھی رو پڑے لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور خاموشی سے بین کرتی ہوئی نوری کو دیکھتا رہا۔ رونے سے نوری کا جی ہلکا ہو گیا تو دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ کر اس نے اپنی داستان پھر سے شروع کر دی۔

"میرے پاس رونے کے لئے آنسو بھی نہیں بچے تھے۔ میں بالکل ویران ہو گئی تھی۔ ایسے میں جادو نے مجھے سہارا دینے کو ہاتھ بڑھایا۔ وہ بھی اسی محلے میں رہتا ہے اور سب کے ساتھ وہ بھی میرے بچوں کے بچھڑنے کا تماشا دیکھنے والوں میں شامل تھا۔ سب اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے لیکن وہ رکا رہا۔ میرا شیرا بھی بری طرح رو

رہا تھا لیکن مجھے بالکل ہوش نہیں تھا۔ بچے کا رو رو کر گلا خشک ہو گیا تھا اور اسے کھانسی کے پھندے لگنے لگے تھے۔ وہ شیرا کو گود میں لے کر بہلانے کے لئے باہر لے گیا اور اسے کھٹی میٹھی گولیاں دلا کر لایا جنہیں چوس کر شیرا اپنا رونا بھول گیا تھا۔ وہ میرے لئے بھی کہیں سے گرم چائے کا پیالہ لایا تھا۔ مجھے بہت دیر تک تسلیاں دیتا رہا اور شام کو پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ شام گئے آیا تو میرے کھانے کے لئے روٹی کباب لے کر آیا۔ میری بھوک تو کب کی مرچکی تھی لیکن کباب روٹی ہم غریبوں کے مقدر میں کم لکھی ہوتی ہے اس لئے کھانا شروع کیا تو کھاتی گئی۔ پیٹ کا جہنم بھرا تو جہنم بھرنے والا شیطان فرشتہ نظر آنے لگا۔ جادو دوسرے دن بھی موجود تھا اور اب ہر روز گھر میں آنے لگا تھا۔ مجھے بہن کہتا اور شیرا کو باہر لے جا کر کھٹی میٹھی گولیاں دلا کر لاتا اس لئے شیرا بھی اس سے بہت خوش رہتا تھا۔ میں اس وقت ایک ایسی بے سہارا بیل تھی جو قریب کی کسی بھی دیوار پر چڑھنے کے لئے تیار تھی۔ لیکن ہم غریبوں کے مقدر بہت سڑے ہوئے ہاتھوں نے لکھے ہوتے ہیں اس لئے دیوار تو ملی لیکن وہ کانٹوں کی بنی ہوئی نکلی۔

"کچھ عرصے آتے رہنے کے بعد جادو نے اپنی منہ بولی بہن کو شادی کا پیغام دے دیا۔ مجھے سمجھایا کہ اکیلی عورت کے پاس اسے آتا جاتا دیکھ کر محلے والے باتیں بنائیں گے۔ پھر مجھے ایک مستقل سہارے کی ضرورت ہے، چھوٹے بچے کے ساتھ میں اکیلی کب تک رہوں گی۔ اسے سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی میں یہ ساری باتیں اس سے بہتر جانتی تھی اس لئے میں نے فوراً ہاں کر دی۔ وہ بہت برے وقتوں میں میرا ساتھ دے رہا تھا میں اس پر اندھا بھروسہ کرنے لگی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ جلد ہی کسی مولوی کو بلا کر محلے والوں کی موجودگی میں مجھ سے نکاح پڑھوائے گا۔ ایک دن وہ رات کو دیر سے آیا۔ میں شیرا کو سلا کر پلنگ پر لیٹی خود بھی سونے کی کوشش کر رہی تھی اس نے شراب پی رکھی تھی اور مجھے گندے لطیفے سنا سنا کر زور زور سے ہنس رہا تھا۔ لطیفے ختم ہوئے تو وہ مجھے زبردستی لپٹا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ مجھے کسمساتا دیکھ کر اس نے سمجھایا کہ ہم آج نہیں تو کل شادی کرنے ہی والے ہیں تو پھر شرم کیسی۔ میں بھی

کب کی ترسی ہوئی تھی۔ اس کی باتوں میں آ گئی۔ اپنا مطلب نکال کر وہ تو سو گیا لیکن میں رات بھر جاگتی رہی۔ اس کے بعد وہ ہر رات آتا اور میرے ساتھ ہی سونے لگا۔ مجھے بھی اس کے جسم کی عادت ہونے لگی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ غلط ہے لیکن میں نے اسے اپنا شوہر تسلیم کر لیا تھا۔ میں روز اصرار کرتی کہ مولوی کو بلا کر دو بول پڑھوا لے۔ لیکن وہ ہر روز نیا بہانہ کرتا۔ کبھی کہتا وہ شادی کا جوڑا بنوا رہا ہے۔ کبھی کہتا زیور بننے دیئے ہیں۔ میں نے کہا مجھے جوڑا زیور نہیں چاہئیں تو کہنے لگا کہ وہ ماں کے آنے کا انتظار کر رہا ہے جو اس کے مطابق پنڈی سے باہر کسی گاؤں میں رہتی ہے اور وہاں سے چل پڑی ہے۔ میری آنکھوں پر بالکل پٹی بندھ گئی تھی مجھے اس کی ہر بات ہر بہانہ سچا لگتا۔

"ایک روز شام کو جادو اپنے ساتھ ایک خطرناک شکل کے آدمی کو لے کر آیا۔ آدمی کو باہر ہی چھوڑ کر وہ مجھے کمرے میں لے گیا اور میرے گھٹنے پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ اس کی عزت میرے ہاتھ میں ہے۔ صرف میں ہی اس کی عزت بچا سکتی ہوں۔ میں اسے اپنی عزت سمجھنے لگی تھی اور اس کی عزت بچانے کے لئے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ لیکن جب اس نے مجھے بتایا کہ مجھے کیا کرنا ہے تو میں سکتے میں آ کر اس کی شکل تکنے لگی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے ساتھ آنے والا اس شہر کا مشہور کالو بدمعاش ہے۔ جادو اس سے جوئے میں پیسے ہار گیا ہے اگر نہیں دیئے تو وہ اس کی ہڈی پسلی توڑ دے گا اس شہر میں نہیں رہنے دے گا۔ بڑی مشکل سے اس پر مانا ہے کہ میں اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار لوں تو وہ اس کے پیسے معاف کر دے گا۔ جادو نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اس کی ماں کل صبح ملتان پہنچ رہی ہے۔ وہ کل شام ہی مجھ سے نکاح پڑھوا لے گا۔ میں واقعی اندھی ہو گئی تھی۔ یہ بھی نہ سوچ سکی کہ کون بے غیرت شادی سے ایک دن پہلے اپنی عورت کو غیر مرد کے حوالے کرے گا۔ وہ مجھے یہ تسلی دیتا ہوا باہر چلا گیا کہ وہ بس تھوڑی دیر تیرے پاس بیٹھے گا' ہنسی مذاق کرے گا اور چلا جائے گا۔ کالو بدمعاش کو کمرے میں بھیج کر جادو شیرا کو کھٹی میٹھی گولیاں دلانے باہر لے گیا۔ کالو بدمعاش کا یہ ہنسی مذاق میری زندگی کا سب سے بڑا رونا بن گیا۔ میں

بے بس چڑیا کی طرح اس کی ہوس کا نشانہ بنتی رہی۔ اپنا زور نکال کر جاتے ہوئے یہ کہہ کر وہ مجھے پچاس روپے دیتا گیا کہ یہ تیرے دودھ کے پیسے ہیں۔ جادو بھی شیرا کو صحن میں چھوڑ کر اسی کے ساتھ باہر سے باہر چلا گیا۔

"مجھ سے دوسرے دن نکاح پڑھانے والا اگلے تین روز تک واپس نہیں آیا۔ اور جب آیا تو اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ شیرا صحن میں کھیل رہا تھا اور میں کمرے میں بیٹھی اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ اس روز مجھے اپنے بڑے بچے بے حد یاد آئے تھے۔ شیرا خوش خوش جادو کی گود میں چڑھ گیا۔ جادو اسے لئے ہوئے کمرے میں آیا۔ وہ مجھے ایک نئی کہانی سنانے لگا۔ کہنے لگا کالو بدمعاش کو میں بہت پسند آئی ہوں۔ اس نے اپنے ایک دوست کو بھیجا ہے۔ وہ بھی میرے پاس تھوڑی دیر بیٹھے گا' کہنے لگا میں نہیں مانی تو کالو اس کی ہڈی پسلی تڑوا دے گا۔ میری آنکھوں کی پٹی اب کھلنے لگی تھی۔ پہلی بار مجھے اس پر غصہ آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اور اس کی ہڈی پسلی جہنم میں جائے مرے یا جیئے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں اب اس کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔ یہ سن کر جادو نے پہلی بار مجھے اپنا اصلی چہرہ دکھایا۔ اس نے شیرا کے ٹینٹوے پر انگوٹھا رکھ کر دبایا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"ایک بار ٹانگیں اٹھا کر تو ہمیشہ کے لئے رنڈی ہو گئی ہے۔ میرے لائے ہوئے کسی آدمی کو منع کیا تو تیرے پلے کی گردن دبا کر لاش پچھلے نالے میں پھینک دوں گا۔"

"میرا بچہ دہشت سے سفید پڑ گیا تھا۔ ایسا سہا کہ حلق سے آواز بھی نہیں نکل سکی تھی۔ کھٹی میٹھی گولیاں کھلانے والا سخی داتا اچانک جلاد بن گیا تھا۔ میں شیرا کو لینے کے لئے جھپٹی تو اس نے مجھے دھکا دے کر پلنگ پر گرایا اور شیرا کو گود میں لئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ آنے والا کمرے میں آ کر میرے جسم سے کھیلتا رہا لیکن مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میرا دماغ تو اپنے بچے کی طرف تھا۔ میرا تیسرا بچہ بھی ایک قصائی کے پاس گروی رکھا ہوا تھا۔ یہ آدمی بھی جاتے جاتے مجھے دودھ کے پچاس روپے دیتا گیا۔ میں پاگلوں کی طرح دوڑ کر کمرے

سے نکلی تو جادو اپنے گاہک کے ساتھ گھر سے باہر جا رہا تھا اور شیرا خوش صحن میں کھیل رہا تھا۔ جادو نے اسے کھٹی میٹھی گولیاں دے کر ایک بار پھر بہلا لیا تھا۔ اس کے بعد جادو ہر روز میرے لئے ایک گاہک لانے لگا۔ ایک دن تو وہ ایک کے بعد دوسرا گاہک لایا تھا۔ اندر اس کا لایا ہوا گاہک میرے جسم سے کھیلتا اور باہر وہ شیرا کو اپنی گود میں یرغمال بنائے کھٹی میٹھی گولیاں کھلا رہا ہوتا۔ لیکن ہر گاہک مجھے دودھ کے پچاس روپے ضرور دے کر جاتا۔ مجھے مہینہ گزرنے کا اس وقت پتہ چلا جب پٹھان وعدے کے مطابق قرضے کی قسط لینے آیا۔ میں نے دودھ کے ملنے والے پیسے گنے تو میرے پاس ساڑھے پانچ سو روپے تھے۔ پچاس میں نے سودا لانے پر خرچ کئے تھے۔ میں نے حساب لگایا کہ اب تک گیارہ مختلف آدمی مجھے استعمال کر چکے تھے۔ میں نے پانچ سو روپے پٹھان کو دے دیئے۔ پٹھان نے پیسے لے کر حیرت سے نوٹوں کو دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ اس نے مجھے میرے بچوں کی خیریت دی اور اگلے مہینے پھر آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ مجھے یہ سوچ کر پہلی بار کچھ تسلی ہوئی کہ میری عزت کی قربانی سے کم از کم میرے بچوں کی رہائی کا سامان ہو رہا ہے۔ اگلے دن جادو نے بھی مجھے یہی سمجھایا۔ اس روز پہلی بار وہ گاہک کے ساتھ واپس نہیں گیا تھا اور رک کر میرا حال چال پوچھنے لگا تھا۔ میں خاموش رہی تو مجھے لیکچر دینے لگا کہ وہ یہ کام میری بھلائی کے لئے کر رہا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ میرے پاس پیسے کمانے کے لئے جسم بیچنے کے سوا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ اسی طرح میں اپنے بچوں کو سال بھر میں بیگار کیمپ سے واپس نکال سکوں گی۔ اس کا کہنا تھا کہ میرے پاس واپسی کا اب کوئی راستہ بھی نہیں ہے تو پھر میں خوش رہ کر یہ کام کیوں نہیں کرتی۔ اس کی باتیں شاید ٹھیک ہی تھیں مجھے بھی اب کچھ صبر آ گیا تھا۔ میں نے بھی اسے دو باتیں صاف صاف بتا دیں ایک تو وہ کبھی شیرا کو ہاتھ نہیں لگائے گا اور دوسرے کبھی میرے پاس آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ وہ کچھ نہیں بولا بس ڈھٹائی سے ہنستا ہوا چلا گیا تھا۔ لیکن اس نے میری دونوں باتوں کے خلاف پھر کبھی کچھ نہیں کیا۔ اس دن پہلی بار اس نے تیرے آنے پر شیرا کو پکڑا تھا۔ اسی لئے میرا دماغ گھوم گیا تھا۔" نوری کی کہانی ختم ہو رہی تھی۔ لالٹین کی بتی بھی

دھیمی ہو رہی تھی۔ شاید تیل ختم ہو گیا تھا۔ چودھری انور بہت دیر سے ایک بات پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ نوری کو بیچ میں روکنا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ رکی تو اس کا سوال بھی زبان پر آگیا۔

"وہ پٹھان جو تیری عزت کی ضمانت دے کر گئے تھے تو نے انہیں کیوں نہیں بتایا۔" وہ اس طرح خاموش بیٹھی رہی جیسے سوال کا جواب سوچ رہی ہو۔ پھر چہرہ اٹھائے بغیر پہلے کی طرح دھیمے اور اداس لہجے میں بولنے لگی۔

"میری عزت کا ضامن جب آیا تو اس وقت ایک درجن آدمی میری عزت اتار چکے تھے۔ وہ جادو کو مار بھی دیتے تو میری لوٹی ہوئی عزت دوبارہ نہیں جڑ سکتی تھی۔ پھر مجھے اسی محلے میں رہنا تھا۔ وہ ایک جادو کو مار جاتے اس کی جگہ کوئی دوسرا جادو لے لیتا۔ وہ میرے لئے کس کس کو اور کب تک مارتے۔ مجھے اپنی حالت پر صبر آگیا تھا لیکن ہر گاہک کو میں اپنی کتھا سناتی اور سوچتی شاید ان میں سے کوئی جیالا مجھے یہاں سے نکال کر لے جائے میرے بچوں سے مجھے ملا دے۔ لیکن وہ سب ایک ہی کام کے جیالے تھے۔ بس ایک تھا جو صاف اور سچا تھا۔ منافق نہیں تھا۔ میری کہانی سن کر اس نے مجھے صحیح صحیح بتا دیا کہ میں جادو کے جال سے نہیں نکل سکتی۔ اس نے نکلنے کی صرف دو صورتیں بتائیں۔ ایک تو یہ کہ میرا جسم استعمال کے قابل نہ رہے اور دوسری صورت یہ تھی کہ میں یہاں سے نکل کر کہیں بھاگ جاؤں۔ لیکن بھاگ کر کہاں جاتی۔ میرا تو کوئی اور ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ کام کرنے والے چار ہاتھ بھی چھن گئے تھے۔ اس لئے گاؤں بھی واپس نہ جا سکتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جادو عورتوں کا پیشہ ور دلال ہے اور اسی طرح عورتوں کو اپنے فریب سے جکڑتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جادو خود کچھ نہیں ہے صرف اپنے زور پر دھندا کرتا تو محلے والے کب کے مار پیٹ کر تھانے میں دے آتے۔ جادو کالو بدمعاش کا آدمی تھا جس کے جادو جیسے کئی اور دلے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ کالو بدمعاش کی شراب کی بھٹیاں تھیں اور جوئے کے اڈے بھی چلتے تھے۔ پورے علاقے میں اس کا رعب تھا۔ پولیس بھی اس سے بھتہ لیتی تھی اور اس لئے بھی ڈرتی تھی کہ وہ سیاست دانوں کا آدمی تھا۔ ان کے

کام آتا تھا اس لئے اس کا اثر بھی بہت تھا۔ جادو کو کالو بدمعاش کا آدمی سمجھ کر کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ یہ بھی اس آدمی ہی نے مجھے بتایا کہ جو عورت بھی نئی نئی پھنس کر دھندہ شروع کرتی ہے سب سے پہلے کالو خود اس کا ناڑہ کھولتا ہے اور دھندے میں برکت کے لئے اس کی فیس اپنی جیب سے دے کر بونی کراتا ہے۔ مجھے معلوم تھا۔ جادو کے چنگل میں آنے کے بعد سب سے پہلے میں اسی جلاد شکل کے آدمی کے نیچے مچھلی کی طرح تڑپی تھی لیکن حرامی نے یہ کہہ کر مجھے بالکل ساکت کر دیا تھا کہ اسے میرے ہلنے سے مزا آ رہا ہے۔" نوری نے خاموش ہو کر ماتھا اپنے گھٹنوں پر ٹکا دیا جس سے اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔

"تو فکر نہ کر' تیرے بچوں کو تجھ سے میں ملواؤں گا۔ کل مجھے اپنا حساب کتاب کرنے منڈی جانا ہے تو پرسوں میرا انتظار کرنا میں تجھے لے کر صوابی چلوں گا' تیرے بچے مل جائیں تو پھر پنڈی یا لاہور میں بس جانا۔ جادو تجھے ڈھونڈنے ملتان سے باہر نہیں نکلے گا۔" چودہری انور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"باؤ میں نے تجھ سے پہلے ہی بولا تھا مجھے امید دلا کر مت جا۔ کوئی وعدہ نہ کر۔ تو نے میری کہانی سن لی' بس اب تو جا' اس سے پہلے کہ جادو کو پتہ لگ جائے' وہ آ گیا تو قیامت اٹھا دے گا۔" نوری نے اپنا سر اٹھا کر چودہری کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تو انتظار مت کرنا لیکن تیار رہنا۔ میں آؤں گا ضرور۔" چودہری یہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا اسی وقت زور کی آواز سے باہر کا دروازہ ٹوٹتا ہوا سنائی دیا۔ نوری نے بتانے میں دیر کر دی تھی۔

چودہری انور اور نوری انہیں کمرے کے دروازے پر زور آزمانے کا موقع دیئے بغیر باہر نکل آئے۔ جادو باہر کے دروازے نما تختے کو لات مار کر توڑتا ہوا طوفان کی طرح اندر گھس آیا۔ شکل سے موالی لگنے والے دو چمچے اس کے ساتھ تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح دھاڑ رہا تھا۔

"حرام زادی مجھ سے اوپر اوپر ہی دھندہ کرنے لگی ہے۔ تیزاب ڈال کر تیرا جسم سڑا دوں گا۔ تیرے اس پلے کو بھی پٹھانوں کے ہاتھ بیچ دوں گا۔" وہ نوری کو

پکڑنے آگے بڑھا لیکن چودہری انور اس کے درمیان میں آگیا۔ نوری کو اس نے اپنے پیچھے کر لیا۔ نوری کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا اور وہ کانپنے لگی تھی۔ شیرا بھی شور کی آواز سے اٹھ گیا تھا اور اب سہا ہوا اپنی ماں کی ٹانگ سے لپٹا ہوا کھڑا تھا۔

"چوہدری تو بھی آج مرد ہو گیا ہے۔ تیرے مرغے کو بھی کاٹ کے پھینک دوں گا۔ زندگی بھر کے لئے عورت کو ترس جائے گا۔" جادو نے چودہری انور کو درمیان سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ چودہری انور کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے جادو کی گردن میں لپٹے ہوئے مفلر کے دونوں سرے پکڑ کر اس زور سے کھینچے کہ اس کا گلا گھٹنے لگا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے دونوں موالی اسے چھڑانے کے لئے اس کے دونوں بازوؤں سے لٹک گئے لیکن چودہری مضبوط کاٹھ کا بہت جاندار آدمی تھا۔ کھیتوں میں زور لگا کر بیل کو گرا دیتا تھا۔ اس وقت تو غصے نے اس کی طاقت کئی گنا بڑھا دی تھی۔ اس نے مفلر نہیں چھوڑا اور اسی طرح کھینچتا رہا۔ جادو کا چہرہ سرخ ہو گیا اور حلق سے خر خر کی آوازیں نکلنے لگیں۔ نوری اس کی کمر پر دوہتڑ مارتی ہوئی چیخ رہی تھی۔

"چھوڑ دے باؤ چھوڑ دے۔ کیوں کمینے کے خون سے ہاتھ رنگتا ہے۔ چھوڑ دے۔" چودہری انور کو بھی ہوش آگیا۔ اس نے زور کا دھکا دے کر جادو کو چھوڑ دیا۔ وہ زمین پر گر کر دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا سہلانے لگا۔ اس کے ساتھ آنے والے موالی اسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"چلا جا ورنہ سچ مچ خون کر دوں گا۔ اس گھر میں اب قدم بھی رکھا تو تیرے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دوں گا۔" چودہری انور کی آنکھوں سے اب بھی چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔

"تو آج زندہ نہیں بچے گا چودہری۔ مرد کا بچہ ہے تو ادھر ہی رہنا۔ میں ابھی آ کر تجھ سے اور اس رنڈی سے سمجھوں گا۔" جادو کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں اور اندر کو دھنس گئی تھیں۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ کی ڈبیا جیب سے نکالنے کی

کوشش کر رہا تھا۔ چودہری انور پھر اس کی طرف بڑھا لیکن نوری نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ جادو کے چمچے جادو کو کھینچ کر ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر لے جانے لگے تھے۔ ان کے جاتے ہی نوری بھی چودہری کو باہر کی طرف دھکا دینے لگی۔

"تو چلا جا وہ بدمعاشوں کو لے کر آئے گا۔ سب مل کر تیری تکا بوٹی کر دیں گے۔ تو انہیں نہیں جانتا۔ پولیس بھی کچھ نہیں کرے گی۔ ہمسائے سے کوئی مدد کو نہیں آئے گا۔"

"میں نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہیں۔ خالی ہاتھوں سے ان بھڑووں کی گردن مروڑ دوں گا۔ میں ان سے ڈر کر بھاگنے والا نہیں ہوں۔ اُس کے آنے کا انتظار کروں گا۔" چودہری انور کی آنکھوں کا خون ابھی اترا نہیں تھا۔

"نہیں باؤ نہیں۔ تیرے ہاتھوں یا ان کے ہاتھوں یہاں خون ہو گیا تو میں ہمیشہ کے لئے ماری جاؤں گی۔ پولیس والے میرے چیتھڑے اڑا دیں گے۔ میرے بچے ہمیشہ کے لئے ماں کو ترس جائیں گے۔ تو یہاں سے فوراً بھاگ جا۔" نوری اس کی منتیں کرنے لگی۔

"لیکن تیرا کیا ہو گا' جادو واپس آ کے تجھے مار ڈالے گا۔" چودہری انور نے خدشہ ظاہر کیا۔

"جان سے نہیں مارے گا۔ تھوڑی سی کوٹ لگائے گا۔ وہ میں سہہ لوں گی۔ میرے بدن کو عادت ہے۔ بس میری خاطر تو یہاں سے چلا جا۔" نوری نے شیرا کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ بچہ ابھی تک سہما ہوا تھا۔ اس نے رونے کی آواز تک نہیں نکالی تھی۔ چودہری انور تھوڑی دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر شاید نوری کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ باہر نکلنے کے لئے اس نے قدم اٹھائے ہی تھے کہ باہر سے آتی ہوئی بہت سی آوازیں سنائی دیں۔ لوگوں کا ایک غول گھر میں گھستا چلا آیا تھا کچھ نے ہاتھوں میں لالٹینیں اٹھائی ہوئی تھیں۔ جادو کے دونوں چمچے آگے آگے تھے خود جادو سب کے پیچھے تھا۔ دونوں بڑے جوش و خروش کے ساتھ بولتے ہوئے اندر آ رہے تھے۔

"دیکھو یہ منہ کالا کر کے اب بھاگنے کی تیاری کر رہا ہے۔ پکڑ لو۔ دونوں کو ننگا

کر کے تھانے لے چلو۔ شریفوں کے محلے میں حرام کاری کرتے ہیں۔ زنا کے کیس میں بند کروائیں گے۔" تین چار مضبوط لوگوں نے آگے بڑھ کر انہیں پکڑنا چاہا۔ ایک نے نوری کے سر سے دوپٹہ چھین لیا۔ اسے اپنے ننگے سر کی فکر نہیں تھی۔ وہ تو اپنے وہشت زدہ بچے کو سینے سے چمٹائے کھڑی تھی۔ چودھری انور ایک بار پھر ان کے اور نوری کے درمیان دیوار بننے لگا۔ ان میں سے ایک نے اس کا گریبان پکڑ کر کھینچا تو اس کی قمیض پھٹتی چلی گئی۔ چودھری نے ہاتھ پاؤں چلانے چاہے لیکن تین آدمی اس سے چمٹ گئے۔ ایک لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے شخص نے اپنے بازوؤں میں اس کی گردن جکڑ لی تھی اور دھمکیاں دے رہا تھا۔

"ہم تم دونوں کو ننگا کریں گے اور تمہارا جلوس تھانے تک لے جائیں گے۔ ہم حرام کاری کرنے والوں کے ساتھ یہی کرتے ہیں۔ حدود آرڈی نینس کے تحت تم دونوں کو پتھر مار مار کر ختم کر دیا جائے گا تو دوسروں کی عبرت کا سامان بن جاؤ گے۔" اس کی آواز کے ساتھ دوسرے بھی آواز ملا رہے تھے۔ "ننگا کرو اور تھانے لے چلو" جادو کے چمچے سب سے پیش پیش تھے۔ جادو بھی پیچھے سے بار بار تھانے چلو کا نعرہ لگا کر انہیں شہ دے رہا تھا۔ اس ہنگامے میں چودھری انور کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا جو مسلسل بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنے میں اچانک دروازے سے کسی نے آواز لگائی۔

"چاچا کریم بخش آ گیا۔" سب خاموش ہو گئے۔ لمبی داڑھی والا ایک شخص ہاتھ میں لالٹین لئے اندر آ گیا تھا۔ سب نے اسے راستہ دیا وہ چودھری اور نوری کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے۔ تم نے انہیں کیوں پکڑ رکھا ہے۔ کیا کیا ہے انہوں نے۔" چاچا کریم بخش نے ان لوگوں سے پوچھا جو چودھری انور کو جکڑے کھڑے تھے۔

"یہ زانی ہے۔ جادو، بالے اور چھیمے نے انہیں بدکاری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے اس نے جادو کو قتل کر کے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ ہم دونوں کو ننگا کر کے تھانے لے جائیں گے۔" چاچا کریم کانپ گیا۔ کہیں پرانی تاریخ پھر نہ دہرائی جائے۔ دو

سال پہلے بھی اسی محلے سے بدکاری کرنے والے ایک جوڑے کو ننگا کر کے دن کی روشنی میں جلوس بنا کر تھانے لے جایا گیا تھا۔ چاچا کریم بھی اس جلوس میں شامل تھا بلکہ پیش پیش تھا۔ پولیس نے دونوں کو گرفتار کر کے حدود آرڈی نینس میں مقدمہ درج کر لیا تھا۔ لیکن دوسرے دن ہی آدمی نے تھانے کی حوالات میں اپنے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔ عورت دیوانی ہو گئی تھی لیکن اب تک جیل میں بند تھی۔ چاچا کریم کو آج بھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ قتل اس کے ہاتھوں سے ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی مذہبی جنونیت کو کچھ قرار آ گیا تھا۔ محلے میں اس کا مدرسہ تھا اس لئے وہ بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو معاملے بھی اسی کے مشورے سے طے کئے جاتے تھے۔

"اس کی گردن چھوڑ دے شیدے' کیا مار ڈالے گا۔" پہلوان نما شیدے نے گردن چھوڑ دی لیکن اس کا ایک بازو مضبوطی سے پکڑے رہا۔

"تو کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔" چاچا کریم نے اپنی تفتیش شروع کی۔

"میں محمود کوٹ کا زمیندار ہوں چودہری انور۔ جادو اس عورت سے زبردستی پیشہ کراتا ہے۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تو یہ اپنے آدمی لے آیا اور اب مجھے اور اس عورت کو بے عزت کرنے کی بات کرتا ہے۔ اس عورت کے بچے پہلے ہی......"

"جھوٹا ہے' بکواس کرتا ہے' تھانے لے چلو۔" کی آوازوں میں چودہری انور کی آواز پھر دب گئی۔ چاچا کریم بخش نے پلٹ کر دیکھا تو سب چپ ہو گئے۔

"یہ سارے اسی محلے کے لوگ ہیں۔ جادو بھی محلے کا چھوکرا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ یہ بتا تیرا اس عورت سے کیا رشتہ ہے تو یہاں کیا لینے آیا تھا۔" چاچا کریم نے چودہری انور پر پھر جرح شروع کر دی۔

"میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں اس کی مدد کرنے آیا تھا۔ میں پرسوں اس کو صوابی لے جا کر اس کے بچے چھڑانے والا ہوں۔" چودہری انور کے جواب پر پھر آوازے لگنے شروع ہو گئے۔ لیکن چاچا کریم نے انہیں ایک بار پھر خاموش کر دیا۔

"تو یہ کہتا ہے کہ تیرا اس عورت سے کوئی ناجائز تعلق نہیں ہے۔ تو نے اس سے بدکاری نہیں کی ہے۔" چاچا نے پوچھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔" چوہدری انور کو چاچا کریم بخش کی شکل میں امید کی کرن نظر آئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ اس کا فیصلہ ابھی ہو جاتا ہے۔ شمسو! جا گھر سے قرآن شریف لے کر آ۔" چاچا کریم نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے ایک آدمی سے کہا جو شاید بالکل برابر کے گھر میں رہتا تھا۔ وہ دو منٹ میں قرآن شریف لے کر آ گیا۔ چاچا کریم نے قرآن چوم کر چودہری انور کی طرف بڑھا دیا۔

"اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کہ اس عورت کے ساتھ تیرا کوئی ناجائز تعلق ہے نہ تو نے اس کے ساتھ بدکاری کی ہے۔" چاچا نے انور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے رب کی اور اس قرآن کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اس عورت کے ساتھ کوئی ایسا کام نہیں کیا۔" چودہری نے قسم کھائی۔

"یہ بھی بتا کہ تیرا اس عورت سے کیا رشتہ ہے۔" چاچا کے اس سوال پر قرآن پر ہاتھ رکھے رکھے چودہری چند لمحے کچھ سوچتا رہا اور پھر جب بولا اس کے لہجے میں ایک نیا عزم تھا۔

"یہ میرے لئے بہن کی طرح ہے۔ سگی بہن کی طرح" چوہدری کا لہجہ ایسا تھا کہ قرآن پر اس کا ہاتھ نہ ہوتا تب بھی چاچا کریم بخش کو یقین آ جاتا۔ وہ سوچنے لگا کہ ان بے گناہوں کو محلے کے لفنگوں سے بچا کر اپنی اس غلطی کا کفارہ کرے گا جب نوجوان نے اپنا جرم ثابت ہونے سے پہلے ہی اپنی جان لے لی تھی۔

"اس نے جھوٹی قسم اٹھائی ہے۔ یہ جھوٹا ہے۔ ہم نے خود دیکھا ہے یہ اندر کمرے میں عورت کے ساتھ تھا۔" جادو کے ساتھ آنے والا چھیما احتجاج کر رہا تھا۔

"تو نے اپنی آنکھوں سے بدکاری ہوتے ہوئے دیکھی ہے۔" چاچا کریم نے چھیمے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں لیکن یہ اندھیرے کمرے میں اس عورت کے ساتھ کمرہ بند کر کے کیا

کر رہا تھا۔" چھیمے نے جرح کی۔
"نماز پڑھ رہا تھا۔" کسی نے پیچھے سے جملہ لگایا اور سب ہنس پڑے۔
"اوئے کافرو مذہب کو مذاق مت بناؤ۔" چاچا کریم نے غصے سے کہا اور پھر چھیمے کو سمجھانے لگا "تجھے پتہ ہے شرع کیا ہے۔ جب تک تم زنا ہوتے اس طرح نہ دیکھو جیسے سرمے دانی میں سلائی جاتی ہے' تمہاری شہادت مانی نہیں جائے گی۔ اس نے اب قرآن بھی اٹھا لیا ہے۔ اگر جھوٹا اٹھایا ہے تو اللہ اسے ایسی سزا دے گا جو ہم بھی نہیں دے سکتے۔ چلو اپنے اپنے گھر کو جاؤ۔" چاچا کریم نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ محلے والے اپنی اپنی لالٹینیں لئے باہر نکلنے لگے۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد شیدا بھی چودہری کا بازو چھوڑ کر باہر چل دیا۔ باہر کھڑا ہوا جادو اندر آنے لگا۔ اس کے دونوں چمچے اور چاچا کریم ابھی تک صحن میں تھے۔
"چاچا تیرا ایمان کمزور ہو گیا ہے۔ تو نے انہیں چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ لیکن میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔" چاچا کریم کو بڑی کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے جادو نے کہا اور پھر اپنے دونوں موالیوں سے مخاطب ہوا "جا چھیمے تو جا کے کالو بادشاہ کو خبر کر میں بالے کے ساتھ تھانے جا کر زنا کی رپٹ لکھواتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی جادو اور اس کے پیچھے بالا اور چھیما بھی باہر نکل گئے۔ چودہری انور اور نوری اپنی اپنی زبان میں چاچا کریم کا شکریہ ادا کرنے لگے تھے۔
"میرا شکریہ چھوڑ اور اپنی اس منہ بولی بہن کو لے کر یہاں سے نکل جا۔ جادو اور اس کے آدمی بہت کمینے ہیں۔ اب کے پولیس کو لے کر آئیں گے۔ زنا آرڈی نینس میں دھر لیا گیا تو ذلیل ہو گا اور جان سے بھی جائے گا۔" چاچا کریم نے چوہدری انور سے جلدی کرنے کو کہا چودہری نوری کا بازو پکڑ کر باہر نکلا۔ شیرا نوری کی چھاتی سے بری طرح چمٹا ہوا تھا۔ چودہری کو ڈر تھا کہیں جادو یا اس کے آدمی اس کی موٹر سائیکل اٹھا کر نہ لے گئے ہوں۔ جادو کو یقیناً" اس کی موٹر سائیکل باہر کھڑی دیکھ کر ہی پتہ چلا ہو گا۔ لیکن اس کی موٹر سائیکل باہر موجود تھی۔ جادو اور اس کے آدمی شاید جلدی میں آتے جاتے موٹر سائیکل کو نظر انداز کر گئے تھے۔ چودہری انور نوری کو پیچھے

کیریئر پر بٹھا کر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ چاچا کریم اپنی لالٹین لٹکائے گھر کی طرف واپس چل دیا۔ اس نے اپنے ایک گناہ کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔

چودھری انور رات گئے گھر پہنچا تو اس کا چھوٹا بھائی اور اس باپ مکان سے باہر ہی ٹہل رہے تھے۔ چودھری کو اس حالت میں اور بچے والی ایک عورت کے ساتھ دیکھ کر پریشان ہو گئے چودھری کبھی رات کو اتنی دیر سے واپس نہیں آیا تھا۔ چودھری دلاور کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا کسی بڑے معاملے میں پھنس گیا ہے۔ انور نے نوری کو اندر بھیج کر جب اپنے باپ کو مختصراً" کہانی سنائی تو چودھری دلاور کو اپنا اندازہ صحیح لگا۔

"تو اس چکر میں نہ پڑ پتر۔ صبح ہوتے ہی اس عورت کو پیسے دے دلا کر چلتا کر دے۔ سیانی عورت ہے اپنے معاملے خود نمٹائے گی۔ تو نہ اپنی مٹی خراب کر۔" دلاور نے اپنا غصہ دباتے ہوئے بیٹے کو سمجھایا۔

"میں نے قرآن اٹھا کر اسے بہن مانا ہے۔ میں اپنا وعدہ نباہوں گا۔ اسے کل صبح ہی صوابی لے جا کر بچوں سے اس کو ملواؤں گا۔ اس کے بعد تو جو کہے گا میں ویسا ہی کروں گا۔" چودھری انور نے بڑے پرعزم لہجے میں اپنے باپ سے کہا۔ باپ بیٹا ابھی بحث کر ہی رہے تھے کہ انہیں دور کچی سڑک پر جیپ آ کر رکتی دکھائی دی۔ دلاور اور انور اور آگے بڑھے تو دیکھا کہ وہ تھانیدار تھا اور اکیلا ہی ان کی طرف آ رہا تھا۔ یہ وہی تھانیدار تھا جس کے پاس کئی سال پہلے چودھری ایک دفعہ پانی کی شکایت لے کر گیا تھا۔ وہ اب چودھریوں کو اچھی طرح جاننے لگا تھا۔ اس نے آتے ہی چودھری انور کو مخاطب کیا۔

"لگتا ہے تو ملتان سے کوئی بڑا کارنامہ کر کے آیا ہے۔ نواب پور کے تھانیدار نے وائرلیس پر مجھے خبر دی ہے کہ تیرے اور اس عورت کے خلاف جسے تو بھگا کے لایا ہے حدود آرڈی نینس میں ایف آئی آر کٹی ہے۔ وہ تیری گرفتاری کے لئے صبح پولیس پارٹی بھیج رہا ہے۔ مجھے اطلاع دینے کو فون کیا تھا۔ بات کیا ہے چھوٹے چودھری تو تو ایسا نہیں تھا۔"

چودہری انور نے تھانیدار کو پورا قصہ سنایا۔ تھانیدار سن کر کچھ سوچنے لگا۔ لیکن جب بولا تو اس کے انداز میں بہت جلدی تھی۔

"چودہری تجھے اپنی اور اس عورت کی جان پیاری ہے تو یہاں سے ابھی بھاگ جا۔ ملک چھوڑ کر چلا جا ورنہ کسی ایسی جگہ چھپ جا جہاں کوئی تجھ تک نہ پہنچ سکے۔ حدود آرڈی نینس کے کیس میں تیرا بچنا مشکل ہے۔ تیرے خلاف چار گواہیاں ہیں اور بقول تیرے وہ سب کالو بدمعاش کے آدمی ہیں۔ میں اسے جانتا ہوں اس کے ڈر سے پورے محلے میں کوئی تیرے حق میں گواہی نہیں دے گا۔ اور یہ عورت تو خود اپنا اشتہار ہے۔ تم دونوں پولیس کے ہاتھ پڑ گئے تو بچو گے نہیں۔" تھانیدار کو چھوٹے چودہری کی کہانی پر پورا یقین تھا۔ لیکن وہ حقیقتوں کو بھی پہچانتا تھا۔

"میرا بیٹا بے گناہ ہے۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ میں اس کا کیس لڑوں گا اسے عدالت سے بری کراؤں گا۔" چودہری دلاور کو غصہ آگیا۔

"پاگل مت بن چودہری۔ تیری ساری زمینیں بک جائیں گی۔ تو خود گروی چڑھ جائے گا پھر بھی تیرا بیٹا موت کی سزا سے نہیں بچے گا۔ میری بات مان تو ابھی جا کے بڑے مہرانی کی مدد مانگ اور چھوٹے چودھری اور اس عورت کو یہاں سے بھگا دے۔" تھانیدار ایک بار پھر سمجھانے لگا۔

تھوڑی سی مزید بحث کے بعد بڑے اور چھوٹے دونوں چودہریوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ تھانیدار انہیں اپنی جیپ میں بٹھا کر مہرانی کی حویلی لے گیا۔ بڑے مہرانی کو معلوم تھا کہ بہت اہم معاملہ ہو گا کیونکہ انہیں سوتے سے اٹھایا گیا تھا۔ چودہریوں کے ساتھ اگر تھانیدار نہ ہوتا تو شاید مہرانی کے نوکر اسے اٹھانے کی جرات بھی نہ کرتے۔ بڑے مہرانی نے تمام کہانی سن کر تھانیدار کی بات سے اتفاق کیا کہ چودہری کے لئے بہتر یہی ہو گا کہ یہاں سے فوراً نکل جائے اور ملک سے باہر جانے کی کوشش کرے۔ اس نے ڈرائیور کو بلا کر پجارو نکالنے کے لئے کہا اور ضروری ہدایتیں دے کر چودہری انور کو بتایا کہ وہ اسے اسلام آباد لے جائے گا جہاں اس کا بیٹا اس کے معاملات سنبھال لے گا۔

"بڑے جاگیردار صاحب۔ آپ کا ہم پر یہ بڑا احسان ہے۔ ہم مر کر بھی اسے نہیں اتار سکیں گے۔ لیکن آپ ایک چھوٹا احسان مجھ پر اور کر دو۔ مجھے ایک دن کے واسطے صوابی جانے دو۔ میں نوری کے بچے خرکاروں سے چھڑوا کر اس کے حوالے کر دوں۔ میں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اسے بہن کہا ہے۔ اگر اپنی قسم نہیں نباہی تو پھر میں کہیں بھی چین سے نہیں رہوں گا۔" چودھری انور نے تشکر سے بھرے لہجے میں گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ گھی تیل خریدنے کا سودا نہیں ہے۔ تم ان خرکاروں کو نہیں جانتے۔ یہ تمہارا خون چوس لیں گے پھر بھی بچے نہیں دیں گے۔ میرا بیٹا اس علاقے کے کسی ممبر یا سینیٹر کو جانتا ہو گا۔ اس کا حوالہ لے کر جاؤ گے تو شاید تمہارا کام ہو جائے۔ ابھی تو تم یہاں سے نکل کر اسلام آباد پہنچنے کی فکر کرو۔ زیادہ دیر کرو گے تو شاید رستے ہی میں دھر لئے جاؤ۔" رحمٰن مہرانی کے لئے چودھری سیاسی طور پر قیمتی اثاثہ تھے اس لئے ان کی مدد اسے کرنی ہی تھی۔ لیکن اس معاملے میں کالو بدمعاش بھی ملوث تھا جو ملتان میں ان کے بڑے سیاسی مخالف کا آدمی تھا۔ علاقے کے سب لوگ چودھریوں کی مہرانی کے آدمی کے طور پر جانتے تھے۔ اگر کالو بدمعاش اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں ان کا آدمی زنا کیس میں پکڑا گیا اور وہ نہ بچا سکے تو ان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔

ڈرائیور پجارو نکال لایا تھا اور جانے کے لئے تیار تھا۔ چودھری دلاور واپس جانے لگا تو اس نے مہرانی کے گھٹنے پکڑ لئے۔

"آپ ہماری جان مانگ کر دیکھنا۔ ہم انکار نہیں کریں گے۔" اس نے بہت جذباتی لہجے میں کہا۔ بڑے مہرانی نے اس کی پیٹھ تھپک کر تسلی دی اور چودھری انور کو گلے لگا کر خدا حافظ کہا۔ دونوں تھانیدار کی جیپ میں بیٹھ کر اپنے گھر واپس آئے۔ باپ نے گھر میں رکھی ہوئی لاکھ روپے سے اوپر کی رقم بیٹے کے حوالے کی۔ تھانیدار نے موٹر سائیکل بھی گاڑی میں چڑھا دی تھی اور انور کو ہدایت کی کہ اسے اسلام آباد جاتے ہی ٹھکانے لگا دے۔ یہاں رہی تو اس کے یہاں آنے کا اشتہار بن جائے گی۔ تھانیدار نے دلاور کو بھی سمجھایا کہ پولیس پارٹی صبح جب چودھری انور کو گرفتار کرنے

آئے تو اس کے بارے میں اپنی مکمل بے خبری ظاہر کرے۔ باقی تھانیدار خود سنبھال لے گا۔ چودہری انور اپنے باپ اور چھوٹے بھائی سے بہت جذباتی خدا حافظ کہہ کر نوری اور اس کے بیٹے کو لے کر بڑے مہرانی کی پجارو میں اسلام آباد روانہ ہو گیا۔

چودہری انور کے دوسرے دن اسلام آباد پہنچنے سے قبل مہران مہرانی کو بڑا مہرانی فون پر صورت حال سمجھا چکا تھا۔ مہران مہرانی ان لوگوں میں سے تھا جو فوری ایکشن میں آ جاتے ہیں۔ اس نے قبائلی علاقے کے ایک بااثر خان سے جو سینیٹر تھا بات کی تھی جس نے صوابی میں غلاموں کو آزاد کرانے کی جدوجہد کرنے والی ایک مقامی تنظیم کے صدر کو فون کیا تھا جس نے کہا تھا کہ وہ صوابی پہنچنے پر چودہری انور کی پوری مدد کرے گا۔ آسٹریلیا کا ہائی کمشنر مہران کا دوست تھا جسے اس نے فون کر کے بتایا تھا کہ اس کا ایک زمیندار دوست کاشت کاری کے طریقوں کا جائزہ لینے آسٹریلیا جانا چاہتا ہے۔ ہائی کمشنر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ وزٹ ویزا جاری کروا دے گا۔ اسلام آباد پہنچتے ہی اپنے آدمی بھیج کر مہران نے چودہری انور کے پاسپورٹ بنوانے کی کارروائی شروع کر دی تھی اور رات گئے چودہری انور کو اپنی گاڑی میں نوری اور اس کے بچے کے ساتھ صوابی روانہ کر دیا تھا۔

بڑے مہرانی نے غلط نہیں کہا تھا۔ بچوں کو آزاد کرانا دکان سے سودا خریدنے کی طرح آسان نہیں تھا۔ بلکہ بہت سے مشکل کاموں سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ چودہری انور فجر کی نماز کے وقت صوابی پہنچ گیا تھا جہاں وعدے کے مطابق مسجد میں خانزادہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ خانزادہ علاقے میں بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے غلاموں کو آزادی دلانے کے لئے جو تحریک منظم کی تھی اس کا علاقے میں بہت اثر تھا۔ تحریک کے پاس لمبی فہرستیں تھیں جن میں غلامی کرنے والوں کے نام اور قرضے کی وہ رقوم لکھی ہوئی تھیں جن کے لئے وہ گروی رکھے ہوئے تھے۔ خانزادہ ملک بھر سے چندے جمع کرتا اور قرضے ادا کر کے غلاموں کو آزاد کراتا۔ ضرورت پڑتی تو جرگہ بلانے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ نوری کے بچوں کے پروانہ آزادی کے لئے بھی اسے جرگہ بلانا پڑا تھا جس میں پندرہ ہزار پر سودا ہوا تھا۔ جن

کے پاس نوری کے بچے تھے انہیں کہا گیا تھا کہ شام کو مغرب کی نماز کے بعد بچوں کو لے کر پیش ہوں۔ چودہری انور بچوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بچے ہڈیوں کا ڈھانچہ لگتے تھے۔ ان کے چہرے سپاٹ اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔ ان سے ملانے کے لئے جب نوری کو لایا گیا تو اس کے گریئے نے سخت دل پٹھانوں کو بھی ہلا دیا۔ ان کی حالت دیکھ کر وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی لیکن بچوں کی آنکھوں میں جذبے کو کوئی لہر نہیں اٹھی تھی۔ نوری انہیں گلے لگاتی اور چومتی رہی لیکن انہوں نے کوئی تاثر نہیں دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وقت نے انہیں روبوٹ بنا دیا ہو۔ سارے احساسات گنگ کر دیئے ہوں۔ ان کی کلائیوں پر سفید نشان واضح تھے جو یقیناً" ان کے ہاتھوں پر بنی ہوئی ہتھکڑیوں کے رہے ہوں گے۔ خانزادہ بھی جسے چودہری نے نوری کی پوری کہانی سنائی تھی متاثر لگتا تھا۔ سودخور پٹھان اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اس طرح کھڑا تھا جیسے اس سارے معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ نوری بچوں کو چھوڑ کر اس خان پر چڑھ دوڑی جو ہر مہینے اس سے پیسے لینے آتا تھا۔

وہ اس کے سینے پر دو ہتڑ مار مار کر ہذیانی انداز میں چیختی اور روتی رہی۔

"قصائی۔ تو تو میری عزت بچانے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔ لیکن جن کتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا تھا وہ میرا جسم نوچتے رہے۔ تو بھی ان میں شامل ہے۔ میرے جسم کی کمائی کا سود تو نے ہی کھایا ہے۔ اپنا جسم لٹا کر سب کچھ میں تجھے دیتی رہی۔ اپنی جان کے ان ٹکڑوں کے لئے جن کا تو نے کیا حشر کر دیا۔ ہڈی کر دیئے میرے بچے۔ مار ڈالے میرے بچے۔ تو کیسا غیرت والا ہے۔ کیسا پٹھان ہے۔"

خان اسی طرح کھڑا نوری سے اپنے سینے پر دو ہتڑ کھاتا رہا۔ لگتا تھا اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہو۔ چودہری انور نے نوری کو کھینچ کر اسے دوبارہ اس کے بچوں کے پاس کھڑا کر دیا۔ چھوٹا شیرا بھی ڈرتے ڈرتے اپنے بھائیوں کے پاس آ گیا تھا جسے دیکھ کر دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں پہچان کی چمک آئی تھی اور چہروں پر یادوں کے نقوش ابھرنے لگے تھے۔ پٹھان کو دیکھ کر چودہری انور بھی اپنا غصہ ضبط نہیں کر سکا۔

"بچے چھین کر تم نے اسے بالکل اجاڑ دیا۔ بدمعاشوں نے اسے رنڈی بنا دیا تم نے کبھی پوچھا بھی نہیں کہ وہ تمہیں ہر مہینے دینے کے لئے ہزاروں روپے کہاں سے لاتی ہے۔ بدمعاشوں نے اب میرے ساتھ اس پر زنا کا کیس ڈال دیا ہے' پکڑی گئی تو پھانسی چڑھا دی جائے گی یا سنگسار کر دی جائے گی۔ اس کے پاس اب رہنے کے لئے کوئی گھر ہے نہ چھپنے کی کوئی جگہ ہے۔ بتاؤ یہ کہاں جائے۔"

چودہری انور کی اس ساری گفتگو کو خان نے نظرانداز کر دیا۔ جیسے سنا ہی نہ ہو اور پلٹ کر اپنے دونوں ساتھیوں سے کچھ دیر پشتو میں بات کرتا رہا۔ خانزادہ نے نوری کو بچوں کے ساتھ ایک طرف بٹھا دیا تھا۔ خانزادہ کا ایک آدمی ان کے لئے کھانا لے آیا تھا۔ اور نوری اپنے ہاتھوں سے انہیں تندوری روٹی اور گوشت کے سالن کے نوالے بنا کر کھلا رہی تھی۔ انہیں کھانے کی عادت نہیں رہی تھی یا منہ کے ذائقے ختم ہو گئے تھے کہ ان کے منہ بہت آہستہ آہستہ اور احتیاط سے چل رہے تھے۔

خان اپنے دونوں آدمیوں سے بات کر کے اب خانزادہ کو الگ لے گیا تھا۔ وہ خانزادہ سے شاید نوری کی پوری کہانی سن رہا تھا۔ خانزادہ کی بات ختم ہوئی تو پھر خان نے بولنا شروع کیا۔ خانزادہ سر ہلاتا اور کہیں کہیں خود بھی بولتا رہا۔ ان کی مشاورت ختم ہوئی تو خان اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا اور خانزادہ چودہری انور کے پاس آ کر بتانے لگا۔

"خان نوری سے بہت شرمندہ اور سخت غصے میں ہے۔ اس کی غیرت کو بڑی چوٹ لگی ہے۔ اس نے بچوں کے لئے جو پیسے لئے تھے وہ واپس کر دیئے ہیں اور مجھ سے کہا ہے کہ ان پیسوں سے میں انہیں یہیں کہیں آباد کر دوں۔ یہ صوبہ بھی دوسرا ہے اور علاقہ بھی مختلف ہے۔ وہ پنجاب پولیس کی پہنچ سے دور رہے گی اور اگر کبھی کوئی خطرہ ہوا بھی تو خان کہتا ہے کہ وہ اسے اور اس کے بچوں کو علاقہ غیر میں لے جا کر رکھ لے گا' ان پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔ مجھے اس کی بات کا یقین ہے۔ میں اس کا ضامن ہوں بلکہ ذاتی طور پر اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ نوری اور اس کے بچے یہاں میری حفاظت میں رہیں گے۔"

چودھری انور نے خانزادہ کو ساتھ لے جا کر نوری کو بھی سمجھایا، نوری نے خانزادہ اور چودھری انور کے ہاتھ پکڑے اور ایک بار پھر بلک بلک کر رونے لگی اور جب چودھری انور جانے لگا تو میرا ویر کہہ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر اس طرح روئی کہ چودھری انور کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

چودھری انور نے اسلام آباد جا کر خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اسے یقین تھا کہ نوری اور اس کے بچے اب خانزادہ کی سرپرستی میں محفوظ رہیں گے۔ اس کے اپنے ملک چھوڑنے کے معاملات بڑی آسانی سے طے ہو گئے تھے۔ صوابی سے وہ دوسری صبح واپس اسلام آباد پہنچا تو اس کا پاسپورٹ تیار تھا۔ مہران مہرانی نے آسٹریلیا کے ہائی کمیشن لے جا کر اس کا چھ مہینے کا وزٹ ویزا بھی لگوا دیا۔ اسلام آباد سے تھائی ایئر کی براہ راست فلائٹ بنکاک کے ذریعے سڈنی چار روز بعد جانے والی تھی۔ مہران مہرانی کا خیال تھا کہ ملتان کی پولیس اتنی تیز نہیں ہے کہ وہ چار دنوں میں اسلام آباد سے اسے ڈھونڈ نکالے گی یا ایئرپورٹوں کی ناکہ بندی کر سکے گی۔

چودھری انور مہمان خانے میں پڑا آسٹریلیا کی ان دیکھی دنیا کے خواب دیکھ رہا تھا اور آسٹریلیا کے بارے میں وہ کتابچے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو ویزا دیتے ہوئے اسے آسٹریلین ہائی کمیشن نے دیئے تھے۔ لیکن دوسرے دن صبح مہران مہرانی جب بہ نفس نفیس خود اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ اچھل پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ مہرانی اپنی تمام اچھائیوں کے باوجود ابھی اتنے عوامی نہیں ہوئے تھے کہ خیریت معلوم کرنے صبح صبح اپنے ایک کم رتبہ مہمان کے کمرے میں آ پہنچتے۔ یقیناً" کوئی اہم بات ہو گی۔ مہران مہرانی اکیلا ہی آیا تھا اور خلاف معمول کوئی نوکر یا ملازم اس کے ہمراہ نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں اردو کا ایک کھلا ہوا اخبار تھا جو اس نے چودھری انور کی طرف بڑھا دیا اور اس کے اندر کے صفحے پر چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی سنگل کالم خبر کی طرف اشارہ کیا۔ خبر کے آخر تک پہنچتے پہنچتے چودھری انور کو ایسا لگا کہ پہلے گردن گردن تھا اب پورا ڈوب گیا ہے۔ خبر تھی۔

ملتان میں عورتوں کے دلال کا قتل

ملتان (اسٹاف رپورٹر) پولیس کو نواب پور کی بستی کے گندے نالے سے ایک لاش ملی ہے جس کا پورا جسم چھرے مار مار کر چھید دیا گیا تھا۔ مقتول کا نام جاوید خان بتایا گیا ہے جو جادو کے نام سے مشہور تھا اور محلے والوں کے مطابق عورتوں کی دلالی کا کام کرتا تھا۔ پولیس کو محمود کوٹ کے ایک نوجوان زمیندار چودہری انور پر شبہ ہے جس کا چند دن قبل جادو سے جھگڑا ہوا تھا اور جو جادو کے لئے جسم فروشی کرنے والی ایک عورت کو بھگا کر لے گیا تھا۔ چودہری کی تلاش میں، جو زنا کے کیس میں بھی مطلوب ہے، پولیس چھاپے مار رہی ہے۔

چودہری انور کو معلوم تھا کہ پٹھانوں نے نوری کی غیرت کی صرف قیمت ہی نہیں چکائی تھی بلکہ اس کی عزت خراب کرنے والے سے اس بات کا انتقام بھی لے لیا تھا کہ اس نے ان کی پناہ میں آئی ہوئی عورت کو لوٹا تھا۔ لیکن انجانے میں وہ چودہری انور کو قربانی پر چڑھا گئے تھے۔ چودہری انور نے کچھ بولنا چاہا لیکن مہرانی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"کچھ کہنا بے کار ہے۔ مجھے پتہ ہے تم بے گناہ ہو لیکن یہ ثابت ہونے سے پہلے ہی تم لٹکا دیئے جاؤ گے۔ میں نے بابا کو فون کیا تھا۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ تمہارے پاس انتظار کے لئے اب وقت نہیں ہے۔ میں نے ٹریول ایجنٹ سے بات کی ہے وہ شام کو ساڑھے تین بجے کی فلائٹ سے تمہیں سنگاپور کے لئے بٹھا دے گا۔ وہاں پاکستانیوں کو ایئرپورٹ پر ہی ویزا مل جاتا ہے۔ تم سڈنی کی فلائٹ ملنے تک وہاں رہ سکتے ہو۔"

آسٹریلیا پہنچنے کے چھ ماہ بعد چودہری انور کو نوری کا خط ملا جو اس نے خانزادہ سے لکھوا کر بھیجا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ بابا خانزادہ نے پندرہ ہزار روپے کی اس رقم سے جو پٹھانوں نے نوری کو واپس کر دی تھی، نوری کے بچوں کو کریانے کی چھوٹی سی

دکان کرا دی تھی۔ بچے تو محنتی تھے ہی نوری بھی مدد کرتی تھی۔ دکان چلنے لگی تھی۔ نوری نے بڑے فخر سے لکھا تھا کہ شیرا اسکول جانے لگا ہے اور اس کا اور اس کے دونوں بیٹوں کا یہ عزم ہے کہ وہ اسے خوب پڑھا کر وکیل بنائیں گے تا کہ وہ بھی بابا خانزادہ کی طرح غریبوں اور مظلوموں کی خدمت کر سکے۔ نوری نے بتایا تھا کہ اپنے بڑے بیٹے کی صحت بہتر ہوتے ہی اس نے اسے چودہری انور کے باپ چودہری دلاور کے پاس بھیج دیا تھا کہ وہ اب ہمیشہ کے لئے ان کے پاس رہے اور ان کی خدمت کرے۔ نوری کا کہنا تھا کہ اس کی وجہ سے بڑے چودہری نے اپنا بیٹا کھویا ہے اب اس کا بیٹا اس وقت تک ان کا خادم بن کر رہے گا جب تک چودہری انور انہیں واپس مل نہ جائے۔ چودہری دلاور نے بچے کو بڑے پیار سے دو دن اپنے پاس رکھا تھا اور پھر اسے اور اس کے بھائیوں کے لئے کپڑے کے جوڑے اور اس کی ماں کے لئے ایک اوڑھنی دے کر رخصت کیا تھا اور کہا تھا کہ ان کی خوشی اسی میں ہے کہ وہ اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کی خدمت کرے۔ نوری نے چودہری انور کے لئے بہت گریہ زاری کی تھی اور اپنا دل چیر کر رکھ دیا تھا۔ چودہری انور خط پڑھنے کے بعد دیر تک کاغذ کو تکتا رہا۔ سکون اور اطمینان کی لہر اس کے سینے میں دوڑ گئی تھی۔ اسے لگا اپنے ہاتھوں سے اس نے جو فصل بوئی تھی وہ کٹ کر اس کا کھلیان بھر گئی ہے۔ اس نے خط کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں بکھیر دیئے۔ وہ اپنے ماضی کے اس باب کو بھول جانا چاہتا تھا۔ اس کی نظریں اب صرف مستقبل پر تھیں۔

8

سڈنی ۱۹۹۵ء

چودھری انور کا مستقبل ایک بار پھر اس کے ماضی سے جڑ گیا تھا اور اسے
ظہور کی اس بات پر اسے یقین آنے لگا تھا کہ اس کے کل کا یہ ورق آسٹریلیا میں اس
کے آنے والے کل کی ایک بالکل نئی کتاب کھول دے گا۔ ظہور کی طرح اب اس
نے بھی اپنی رہائی کے لئے درخواست دی ہوئی تھی کہ اسے شخصی ضمانت پر رہا کر دیا
جائے۔ لیکن یہ امکان کم تھا کہ درخواست قبول ہو گی۔ ظہور سخت شرمندہ تھا کہ
چودھری انور نے اپنی جمع پونجی سے ضمانت دے کر اسے تو رہا کرا دیا تھا لیکن چودھری
خود جیل میں رہنے پر مجبور تھا۔ ظہور کو اس کے پرانے ریسٹورنٹ میں شیف کی نوکری
دوبارہ مل گئی تھی لیکن وہ نوکری پر جانے سے پہلے ہر صبح چودھری انور سے ملنے جیل
ضرور جاتا۔ کراچی میں اس کی بیٹی کی شادی ہو گئی تھی۔ ظہور نے کئی برسوں میں پہلی

بار فون پر دلہن بی اپنی بیٹی سے بات کی تھی اور اسے نئی زندگی شروع کرنے کی دعائیں دی تھیں۔ فون کے دوران اس کی بیٹی اور فون ختم ہونے کے بعد ظہور بلک بلک کر روئے تھے۔ لیکن ظہور کو ایسا لگا تھا جیسے اس کے کندھوں پر رکھا ہوا برسوں پرانا بوجھ اترنا شروع ہو گیا ہے۔

ظہیر چودہری انور کی ضمانت کے پیسے جمع کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ دوستوں سے مایوس ہونے کے بعد ظہیر کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا۔ ظہیر کو معلوم تھا کہ اس رستے پر چلنے میں ذلت اور ناک نیچی ہونے کا ڈر ہے۔ لیکن دوست کی خاطر وہ اس رستے پر ڈرے ڈرے قدموں سے چلتا ہوا اپنے چچا کی سرجری آ پہنچا تھا اور اب مریضوں کی قطار میں لگا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ آسٹریلیا میں ڈاکٹروں کی ڈسپنسری سرجری کہلاتی تھی۔ ری سپشن پر بیٹھی ہوئی عورت نے ظہیر کا "میڈی کیئر" کارڈ لے کر انوائس اور اس سے تفصیلات پوچھ کر ہسٹری کارڈ بنا دیا تھا۔ اپنی باری پر جب ظہیر اپنے چچا کے کمرے میں پہنچا تو اس کا چچا اسے دیکھ کر بھڑک اٹھا۔

"شہر کے سارے ڈاکٹر مر گئے ہیں جو تو مجھ سے علاج کرانے آیا ہے۔" ڈاکٹر ملک نے ظہیر کو سخت زہریلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ملک کی آواز بھی اس کے جسم کی طرح بھاری بھر کم تھی۔

"چاچا جی میں......" ظہیر نے گرمجوشی سے کئے جانے والے اس استقبال کے جواب میں بولنا شروع کیا ہی تھا کہ ڈاکٹر ملک کی آواز پھر گرجنے لگی۔

"میں تیرا چاچا واچا نہیں ہوں یہ رشتہ تیرے باپ نے دو سال پہلے ختم کر دیا تھا۔ تو جا کے اپنے ماما کو چاچا بنا جس کے چڑھانے پر تیرا باپ بھائی کا رشتہ بھول گیا ہے۔"

ظہیر کو معلوم تھا کہ فیصل آباد میں اس کے باپ اور چاچا کے درمیان زمینوں کا جھگڑا اب عدالت تک پہنچ گیا ہے۔

"چاچا کچھ بھی کہہ لو تم میرے چاچا رہو گے۔ رشتے اس طرح کہنے سے نہیں ٹوٹتے۔ میں تمہارا چھوٹا ہوں کل تھا اور کل بھی رہوں گا۔ تم چاہے مجھے جوتے مارو

مدد کے لئے تمہارے پاس ہی آؤں گا۔" ظہیر نے بہت سنبھل سنبھل کر دھیرے دھیرے بول کر ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

"مجھے یہ تقریریں مت سنا۔ میں تیرے یا تیرے باپ کی طرح نکما نہیں ہوں۔ باہر دس مریض لائن لگائے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ جلدی سے کام کی بات کر اور چلتا بن۔"

ڈاکٹر ملک کے غصے نے دھیما ہونا نہیں سیکھا تھا۔ ظہیر کا چہرہ اپنی ذلت سے سرخ ہو گیا۔ اسے نہیں معلوم اس نے کس طرح اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں رکھا۔ اس نے ایک بار پھر یہ سوچا کہ دو سال کا بھرا ہوا غصہ ہے شاید آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

"میرا ایک دوست ہے چودھری انور۔ وہ جیل میں ہے۔ اس کی پانچ ہزار ڈالر کی ضمانت منظور ہو گئی ہے لیکن اس کے پاس ضمانت دینے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ آپ کے لئے یہ چھوٹی سی بات ہے وہ بہت ایماندار اور محنتی لڑکا ہے بھاگے گا نہیں۔ اگر آپ چاہیں گے تو چھ مہینے کے اندر اندر ضمانت کے لئے دیئے جانے والے پانچ ہزار آپ کے پاس جمع کرا دے گا۔ میں اس کی ضمانت لیتا ہوں۔" ظہیر نے جلدی جلدی مسئلہ بیان کیا۔

"اور تیری ضمانت کون لے گا۔ تیرا باپ جو مجھ سے تھانہ کچہری کرتا ہے۔ تیرا کیا خیال ہے میں تجھے ایسا ہی بے وقوف لگتا ہوں جو تیرے مجرم دوستوں کو جیل سے چھڑانے کے لئے ان کی ضمانتیں بھرتا پھروں۔" ڈاکٹر ملک پھر غرایا۔

"وہ مجرم نہیں ہے۔ اس پر صرف ملک میں غیر قانونی طور پر رہنے اور کام کرنے کا الزام ہے۔ وہ ایک اچھا انسان ہے۔ اس نے اپنے پیسے دے کر ایک اور ضرورت مند کی ضمانت جمع کرا دی تھی۔ لیکن یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آپ نے اپنی آنکھوں پر صرف نفرت کی پٹی باندھ رکھی ہے۔ مجھ سے واقعی بڑی غلطی ہوئی ہے۔ آپ کے پاس آنے سے بہتر تھا بھیک مانگ لیتا۔ آئی ایم سوری۔" یہ کہہ کر ظہیر اٹھ کر جانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ تلخ ہو کر وہ کوئی جوابی

بدتمیزی کر بیٹھے، یہی بہتر ہے کہ یہاں سے فوراً نکل جائے۔ لیکن جاتے جاتے پیچھے سے آتی ہوئی ڈاکٹر ملک کی آواز اس پر ایک اور تازیانہ لگا گئی۔

"میرا وقت فالتو نہیں تھا۔ میڈی کیئر کے انوائس پر دستخط کر کے میرے وقت کی فیس دے کر جا۔" ظہیر نے واپس پلٹ کر انوائس پر دستخط کئے اور تیزی سے باہر نکلا چلا گیا۔

ظہیر اپنے ڈاکٹر چچا کے مطب سے نکلا تو اس کی طبیعت سخت مکدر تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ سات سمندر پار ہونے والے جھگڑے اتنی دور آ کر بھی رشتوں میں دراڑیں ڈال سکتے ہیں۔ ظہیر نے کل چودھری انور کو بھی بتایا تھا کہ وہ اپنے چچا سے کہہ کر اس کی ضمانت کا بندوبست کرا دے گا۔ اب وہ کس منہ سے اسے بتائے گا کہ اس کا چچا تو سخت کمینے پن پر اترا ہوا ہے۔ ظہیر نے جیل جا کر چودھری سے ملنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور ادھر ادھر گھومتا ہوا سینما سٹی پہنچا جہاں سینماؤں کے تینوں کمپلیکس میں بیس کے قریب مختلف فلمیں لگی ہوئی تھیں۔ فلموں کے سلسلے میں اس کا مزاج ابھی تک بچکانہ تھا۔ BATMAN کا ٹکٹ لے کر فلم دیکھتا اور بچوں کی طرح خوش ہوتا رہا۔ فلم دیکھ کر باہر نکلا تو اس کی کوفت بڑی حد تک دور ہو چکی تھی۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ اس نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ اسے معلوم تھا کہ گھر پر کوئی نہیں ہو گا۔ آج کل اس کے ساتھ صرف ظہور رہتا تھا جو ڈیوٹی پر گیا ہوا ہو گا۔ لیکن جب وہ گھر پہنچا تو گھر کے اندر سے آتی ہوئی آوازیں سن کر اور کھڑکیوں سے چھنکتی ہوئی روشنی دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ زیادہ حیرت فلیٹ کا دروازہ کھول کر اس وقت ہوئی جب اس نے سامنے ہی چودھری انور کو بیٹھے دیکھا۔ اس کے ساتھ ظہور بیدل اور سلیم بھی بیٹھے تھے اور تینوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ ظہیر نے اندر داخل ہوتا دیکھتے ہی چودھری انور اٹھا اور اس سے لپٹ پڑا۔

"بہت بہت شکریہ ظہیر بھائی۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے صبح اپنے چچا سے بات کی تھی۔ انہوں نے دوپہر ہی اپنا وکیل بھیج دیا جس نے ضمانت جمع کرا کے آدھے گھنٹے میں مجھے جیل سے رہا کروا دیا۔ کمال کے آدمی ہیں آپ کے چچا۔ ان کا وکیل مجھے

بتا رہا تھا کہ وہ ایسے غیر قانونی پاکستانیوں کا مفت علاج کرتے ہیں جن کے پاس میڈی کیئر کارڈ نہیں ہوتا۔ پہلے بھی جیل جانے والے کئی پاکستانیوں کی ضمانت کرا چکے ہیں۔ ابھی ایک پاکستانی حادثے میں ہلاک ہوا تھا جس کا آسٹریلیا میں کوئی نہیں تھا۔ اس کی میت انہوں نے اپنے خرچ پر سیالکوٹ بھجوائی تھی۔ وکیل بتا رہا تھا......"

چودھری انور ڈاکٹر ملک کی شان میں بے تکان قصیدے پڑھ رہا تھا۔ لیکن ظہیر کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے شرمندہ تھا کہ آج کے دن کا بیشتر حصہ اس نے اپنے چچا کی لعنت ملامت کر کے گزارا تھا۔ لیکن اس میں خود اس کا اتنا قصور نہیں تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اتنی کڑوی زبان رکھنے والا اس کا چچا اصل میں اتنا مہربان انسان ہو گا۔ چودھری انور کے خاموش ہونے پر ظہیر اپنے چچا کی تعریفوں کے جواب میں کچھ بولے بغیر سلیم سے اس کی خیریت اور یونیورسٹی میں اس کی ریسرچ کے بارے میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کا حال معلوم کرنے لگا۔

سلیم کی الجھنیں اپنی جگہ قائم تھیں، بلکہ اور الجھ رہی تھیں۔ لیکن اس کے دوست جن الجھنوں میں مبتلا تھے وہ اس کے لئے حیرت انگیز تھیں۔ غیر قانونی طور پر رہنے اور کام کرنے والوں کی یہ دنیا اس کے لئے بالکل نئی تھی اس میں رہنے والوں کے رہنے سہنے کے انداز، کام کرنے کے طریقے، گفتگو کے موضوعات، دوستیاں اور دشمنیاں سلیم کے لئے سب انوکھی باتیں تھیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو اسٹوڈنٹس ویزے پر آئے تھے لیکن انہوں نے کبھی یونیورسٹی کی شکل نہیں دیکھی تھی اور فیکٹریوں میں دن رات محنت کرنے پر لگ گئے تھے۔ کوئی پانی کے جہاز سے اتر کر اس انتہائی فراخدل شہر میں گم ہو گیا تھا۔ کچھ لڑکے کرکٹ کی جونیئر ٹیموں کے ساتھ آئے تھے اور پھر ٹیم سے کٹ کر یہیں غائب ہو گئے۔ چند ایسے بھی تھے جو کلچرل شو کرنے کے لئے آنے والوں کے ساتھ سازندے بن کر آئے تھے اور واپس نہیں گئے۔ کئی تعلقات کی بنیاد پر وزٹ یا بزنس ویزا لے کر آئے تھے اور یہیں رہ گئے تھے۔ سب پیسے کمانے اور کسی طرح مستقل شہریت حاصل کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔

سب کو اس بات کا یقین تھا کہ حکومت ایک دن غیر قانونیوں کے لئے عام معافی کا اعلان کرے گی جس کے نتیجے میں سب آسٹریلوی شہریت کا تاج پہنے گردن اکڑا کر پاکستان جائیں گے۔

غیر قانونی طور پر رہنے والوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ وہ ملک چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ مالی طور پر مستحکم ہونے اور جانے کی اشد ضرورت کے باوجود نہیں جا سکتے تھے۔ اس لئے جو کچا بھی پکا ہو جاتا سیدھا وطن کا رخ کرتا۔ غیر قانونیوں کی اس دنیا میں قانونی اور غیر قانونی طور پر رہنے والوں کے لئے کچے پکے کی اصطلاحیں استعمال ہوتی تھیں۔ ظہیر کے پاس آنے والے اس کے ایک دوست کی کہانی بڑی دلچسپ تھی۔ کوئی اور سناتا تو سلیم اسے افسانہ تراشی سمجھتا لیکن شاہد نے ظہیر کے گھر ایک روز خود اسے اور چودھری انور کو یہ کہانی سنائی تھی۔

دس گیارہ سال پہلے شاہد وزٹ ویزا لے کر آسٹریلیا آیا تھا۔ اس زمانے میں پاکستان میں آسٹریلیا کے ویزے کے لئے اتنی زیادہ سختی نہیں تھی۔ شاہد نے وزٹ ویزے کے لئے آسٹریلیا میں پاکستان اور آسٹریلیا کی کرکٹ سیریز دیکھنے کا بہانہ بنایا تھا۔ کیس مضبوط کرنے کے لئے خود کو شادی شدہ بھی ظاہر کیا تھا۔ تین مہینے کا ویزا ملا تھا جس کے بعد سے وہ غیر قانونی طور پر رہ رہا تھا اور ظہیر کے مطابق وہ سب سے سینئر سب سے زیادہ تجربہ کار اور شاید سب سے امیر غیر قانونی تھا۔ ان تمام سالوں میں مستقل شہریت حاصل کرنے کے لئے امیگریشن پر کئے جانے والے اس کے تمام حملے ناکام ثابت ہو گئے تھے۔ کئی سالوں تک وہ کئی وکیلوں کی آمدنی کا مستقل ذریعہ رہا تھا۔ وکیلوں کے مطابق پکا ہونے کا آخری طریقہ صرف شادی تھی۔

شاہد خوش شکل نوجوان تھا۔ اس نے ایک اطالوی عورت کو دام الفت میں پھنسا بھی لیا لیکن کئی مہنگے ڈنر کھلانے اور کئی خوشگوار راتیں گزارنے کے بعد اس نے شادی کی بات کی تو معلوم ہوا وہ عورت پہلے سے شادی شدہ ہے اور شوہر سے ناراضی کی وجہ سے الگ رہ رہی ہے۔ اس نے شاہد کو بتایا کہ وہ طلاق ہونے کے بعد ہی شادی کے بارے سوچ سکتی ہے۔ شاہد شاید انتظار بھی کر لیتا لیکن ایک دن وہ آئی اور

الوداعی بوسہ دے کر اور تعریف کے یہ پھول برسا کر چلی گئی کہ اس کے ساتھ گزری ہوئی حسین شامیں اسے ہمیشہ یاد رہیں گی۔ وہ اپنے بچھڑے ہوئے رشتہ داروں کے ساتھ وقت گزارنے اٹلی جا رہی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اگر اسے روم پسند آ گیا تو وہیں رہ جائے گی۔ شاہد کے پاس نائٹ کلبوں میں مارے مارے پھر کر شادی کے لئے لڑکی پھنسانے کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرنے کے بجائے وکیلوں کا سہارا لیا۔ اس کے وکیل نے پانچ ہزار ڈالر میں ایک لبنانی لڑکی کو کاغذی شادی کے لئے تیار کیا لیکن وہ ایڈوانس کے دو ہزار ڈالر لے کر بھاگ گئی ساتھ ہی وکیل کو یہ دھمکی بھی دے گئی کہ اگر اس نے اس کا پیچھا کیا تو وہ اس کی شکایت کر دے گی کہ وہ جعلی شادیاں کرانے کا کاروبار کرتا ہے۔ وکیل ڈر کر بیٹھ گیا اور شاہد نے بھی اپنے ڈالروں پر فاتحہ پڑھ لی۔ کچھ عرصے بعد وکیل نے پانچ ہزار ڈالر میں ایک اور لڑکی تلاش کر لی جو اس پر تیار تھی کہ شادی کی رسمی کارروائی کے بعد پیسے لے گی۔ فرانسیسی نژاد تھی اور اتنی فراخدل کہ وہ شاہد کے ساتھ رہنے کے لئے بھی تیار تھی۔ لیکن شاہد کو گلے میں گھنٹی نہیں باندھنی تھی۔ وہ کئی لڑکوں کے ساتھ مل کر رہتا تھا فرانسوا کو رکھنے کے لئے علیحدہ فلیٹ لے کر خرچ بڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا حالانکہ خود فرانسوا کو اس ہجوم میں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے شاہد سے اپنے کمیون میں رہنے کے تجربے بیان کئے تھے اور اشتراکی رہائش کے فائدوں پر ایک لیکچر بھی دیا تھا یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ گلے کا مستقل ہار نہیں بنے گی۔ جب کہے گا چلی جائے گی۔ لیکن شاہد جو زندگی کی پیچیدگیاں سلجھانے کی تگ و دو میں تھا نئی کی گتھیاں پیدا کرنے پر تیار نہیں تھا۔

شادی کا مرحلہ آیا تو یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ شاہد نے خود کو شادی شدہ ظاہر کیا تھا اس کے ویزے کا پرانا ریکارڈ سامنے آیا تو مشکل ہو جائے گی۔ آسٹریلیا میں کثیر الازدواج یعنی ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ شادیاں قابل سزا جرم تھا۔ شاہد کے ٹیلی فون کا خرچ پھر بڑھ گیا۔ لاہور میں اس کے پرانے دوستوں نے ایک بار پھر اس کا

ساتھ دیا اور فرضی بیوی سے اس کی فرضی طلاق کے کاغذات تیار کرا کے بھیج دیئے۔

طلاق کے کاغذات آتے ہی وکیل نے فرانسوا سے شاہد کی شادی کی کارروائی مکمل کی اور امیگریشن میں اس کے کاغذات داخل کر دیئے۔ امیگریشن والوں کا اصرار تھا کہ آسٹریلیا سے باہر جا کر کاغذات داخل کرے۔ لیکن شاہد کا وکیل بہت ہوشیار تھا۔ وہ مالٹا کا تھا اور امیگریشن کے محکمے میں کام بھی کر چکا تھا۔ اس نے یہ درخواست دے دی کہ فرانسوا حاملہ ہے جس کی وجہ سے اس وقت وہ جذباتی طور پر بہت نازک دور سے گزر رہی ہے۔ اس کی اور اس کے ہونے والے بچے کی صحت کے لئے اس کا شوہر کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ شاہد نے ایک ڈاکٹر سے فرانسوا کے حاملہ ہونے کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا تھا۔ امیگریشن والوں نے شاہد کے وکیل کی دلیل کو تسلیم کر کے اس کی امیگریشن کی درخواست قبول کر لی۔ وکیل اور شاہد دونوں نے اس بات پر اطمینان کا سانس لیا کہ انہوں نے فرانسوا کے حاملہ ہونے کی تصدیق کے لئے میڈیکل کرانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ ویسے فرانسوا نے شاہد کو یہ پیشکش کی تھی کہ وہ مزید پانچ ہزار ڈالر کے عوض سچ مچ حاملہ بننے پر تیار ہے۔ ان پانچ ہزار ڈالروں میں حمل گرانے کی قیمت بھی شامل تھی۔

شاہد کے یہ پانچ ہزار ڈالر تو بچ گئے لیکن کیس کا فیصلہ ہونے تک کے اگلے دو مہینوں کی ہر رات اسے اپنی کاغذی بیوی کے ایک کمرے کے فلیٹ میں گزارنی پڑی تھی۔ وکیل کا خیال تھا کہ امیگریشن والے یہ تصدیق کرنے کے لئے کہ میاں بیوی ایک ساتھ رہتے ہیں یا نہیں، کبھی بھی رات گئے ان کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے ہیں۔ فرانسوا سے طے ہوا تھا کہ جب تک وہ اس کے گھر رات گزارنے آئے گا اس کے فلیٹ کا کرایہ ادا کرے گا۔ شاہد کے لئے یہ سودا مہنگا ثابت نہیں ہوا۔ فرانسوا نے صوفے پر سکڑ کر اکیلے سونے کو منافقانہ، احمقانہ اور وقت کا بدترین زیاں قرار دیتے ہوئے شاہد کو اپنے بستر پر کھینچ لیا تھا۔

اس کی جنسیت کا خمیر فرانس سے اٹھا تھا جو وقت نے اور نشیلا کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف اپنا بدن کھول کر رکھ دیتی بلکہ شاہد کے بدن کی گرہیں بھی اس مہارت سے

کھولتی کہ وہ نت نئی جنتوں میں پرواز کرتا۔ فرانسوا کا شمار خوبصورت لڑکیوں میں نہیں تھا۔ پتلی دبلی تھی۔ سینے کی گولائیاں زیادہ نمایاں نہیں تھیں۔ کولھوں پر بھی گوشت کم تھا۔ لمبا چہرہ اس لئے اور نمایاں لگتا کہ اس نے اپنے بال مردانہ انداز میں کٹوائے ہوئے تھے۔ چھوٹی سی ناک میں چاندی کی بالی پہنے رہتی جو اس پر خوب بجتی تھی۔ لیکن اس کے نسبتاً سپاٹ سے بدن کی سپردگی میں بہت جوشیلا پن ہوتا۔ کبھی وحشت زدہ ہرنی کی طرح سرپٹ دوڑتی اور کبھی دریا کی موجوں کی طرح ہلکورے لینے لگتی ہے۔ شاہد کو اس کی ہر جنبش ازبر ہو گئی تھی۔ دو مہینوں کے اندر شاہد کی امیگریشن کا کام مکمل ہو گیا تو معاہدے کے مطابق فرانسوا اپنے پانچ ہزار ڈالر لے کر یورپ کی سیاحت پر فرانس روانہ ہو گئی۔ شاہد مستقل شہریت کا ٹھپہ لگتے ہی پاکستان دوڑا چلا گیا۔

شاہد کی ماں ایک سیدھی سادی عورت تھی جس کا خیال تھا کہ ولایت میں گوری میموں نے اسکے بیٹے کو اپنے جال میں پھنسا لیا ہے اور دس سال اسے پاکستان نہیں آنے دیا۔ ماں نے میموں سے بچانے کے لئے اس کے پاؤں میں مستقل بیڑیاں ڈالنے کا بندوبست کیا اور اپنی بہن کی بیٹی سے جو شاید اسی کے انتظار میں بن بیاہی بیٹھی تھی چٹ منگنی کر کے پٹ بیاہ کر دیا۔ شاہد منع ہی نہ کر سکا تھا۔ لڑکی بھی اچھی تھی۔ بی اے پاس تھی، خوش شکل تھی شاہد سے بچپن ہی سے مانوس رہی تھی۔ لاہور میں شاہد کے اگلے چند مہینے ہنی مون بن کر گزرے۔ چار مہینے گزر گئے تو اسے واپسی کا خیال آیا۔ اس دفعہ رخصت ہوتے ہوئے رونے والوں میں ایک بیوی کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ شاہد کاغذات تیار کر کے اسے بلوانے کا دلاسہ دے کر سڈنی آ گیا۔ وکیل کے پاس گیا تو اس نے یاد دلایا کہ تم آسٹریلیا میں پہلے ہی شادی شدہ ہو، طلاق ملے بغیر شادی کس طرح کر سکتے ہو۔ کر بھی چکے ہو تو اپنی پاکستانی بیوی کو بلوانے کے لئے اس کا کیس کس طرح فائل کر سکتے ہو۔ طلاق کے لئے فرانسوا کی تلاش شروع ہوئی۔ لیکن وہ تو کہیں گم ہو گئی تھی۔ شاید یورپ سے ہی واپس نہیں آئی تھی۔ آ بھی گئی ہو تو اس کا اتہ پتہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اپنی نوکری اور فلیٹ سب چھوڑ کر گئی تھی۔ شاہد پھر پریشان ہو گیا۔ فرانسوا اگر نہیں مل سکی تو وہ کیا کرے گا۔ کئی مہینے اسی طرح

گزر گئے شاہد نوکری کے بعد جو بھی وقت ملتا فرانسوا کی تلاش میں اس کے ان ٹھکانوں پر جاتا جو اسے معلوم تھے۔ پاکستان فون کرتا تو اس کی بیوی رو رو کر فون سر پر اٹھا لیتی۔ اس کی بیوی کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ شاہد آسٹریلیا میں کسی عورت کے ساتھ رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ اسے نہیں بلانا چاہتا۔ شاہد کی ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو حاملہ چھوڑ کر آیا تھا اور اب کسی بھی وقت اس کا بچہ ہونے والا تھا۔

شاہد کو دونوں اچھی خبریں ایک ساتھ ملیں۔ لاہور فون کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے بیٹی ہوئی ہے اور اسی روز شام میں فرانسوا اسے تلاش کرتی ہوئی خود اس کے گھر آ گئی۔ وہ ایک دن پہلے ہی یورپ سے لوٹی تھی۔ پیسے ختم ہو گئے تھے' رہنے کی جگہ بھی نہیں تھی وہ شاہد سے مدد مانگنے آئی تھی۔ اس رات وہ شاہد کے فلیٹ میں ہی رہی۔ لیکن شاہد اس کے سائے سے بھی دور رہا۔ وہ اب شادی شدہ اور ایک بیٹی کا باپ تھا۔ اب اس کی جنسی ضرورت اخلاقیات کے دائرے میں آ گئی تھی۔ صبح ہوتے ہی وہ اسے وکیل کے پاس لے گیا۔ فرانسوا کو جب معلوم ہوا کہ شاہد کو فوری طلاق چاہئے تو مدد کی درخواست مطالبہ بن گئی۔ دو ہزار ڈالر میں معاہدہ ہوا۔ لیکن اس دفعہ اسے پیسے ایڈوانس چاہئے تھے۔ شاہد کے لئے یہ سودا بھی مہنگا نہیں تھا۔ دو ہزار ڈالر میں ہمیشہ کے لئے بلیک میلنگ کے کسی بھی امکان سے آزاد ہو جاتا۔ طلاق کے کاغذات فورا" فائل ہو گئے۔ لیکن طلاق ہوتے ہوتے کئی مہینے لگ گئے۔ جس کے بعد اسے اپنی بیوی سے از سر نو شادی کرنی تھی۔ یہ مرحلہ بھی کسی طرح طے ہو گیا۔

لیکن شاہد کے معاملات اس کے بعد بھی نہیں سلجھے۔ نیا مسئلہ یہ تھا کہ اس کی بیٹی کو کس کھاتے میں ڈالا جائے۔ نکاح کے کاغذات جس تاریخ کو بنے تھے بچی اس وقت پیدا ہو کر چھ مہینے کی ہو چکی تھی۔ آسٹریلیا میں غیر شادی شدہ ماؤں کا عام رواج تھا لیکن امیگریشن والے یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پاکستان میں ایسا کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ شاہد کی بیوی کو تو نئی شادی کے بعد کیس فائل ہونے کے دو ماہ کے اندر ہی امیگریشن کا ٹھپہ لگ گیا تھا لیکن بچے کا مسئلہ بیچ میں اٹکا رہا جس کی وجہ سے اس کی بیوی ابھی تک لاہور میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ شاہد کے وکیل کی ذہانت ایک بار پھر

اس کے کام آئی۔ شاہد نے اپنی بیٹی کی ولدیت تبدیل کرا دی۔ اس کے دوستوں نے اس کی بہن اور بہنوئی کے نام نیا برتھ سرٹیفکیٹ نکلوا دیا۔ جس کے بعد شاہد نے اپنی بہن کی بیٹی کو گود لینے کی قانونی کارروائی مکمل کی پھر اس کی امیگریشن کی درخواست علیحدہ فائل کی جو رسمی کارروائی کے بعد منظور ہو گئی۔ لیکن اس سارے عمل میں مزید کئی مہینے لگ گئے۔ شاہد آج کل اپنی بیوی اور بیٹی کو آسٹریلیا لانے کے لئے پاکستان گیاہوا تھا۔ اس کی بیوی شادی کے تقریباً دو سال بعد اپنے شوہر کے پاس آسٹریلیا آنے کی جدوجہد میں کامیاب ہو رہی تھی۔

سلیم کو شاہد کا قصہ کسی افسانے کا پلاٹ معلوم ہوا تھا اس لئے بھی کہ اس نے پہلی بار ایسی کوئی داستان سنی تھی لیکن وہ بشیر احمد سے ملا تو اس کی کہانی شاہد سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوئی۔ یہ وہی بشیر احمد تھا جسے سڈنی میں اس کا پہلا میزبان ہونا تھا لیکن جو اسے ایئرپورٹ پر لینے نہیں آ سکا تھا۔ جس کی تلاش میں چودہری انور کے ساتھ سلیم کیبرامیٹا تک گیا تھا اور مایوس آیا تھا۔ بشیر ایک دن اچانک ہی یونیورسٹی میں مل گیا۔ سلیم اس دن اپنے ہیڈ آف اسکول سے مل کر بہت مایوس لوٹا تھا۔ اس کے لئے کوئی نیا سپروائزر تلاش نہیں کیا جا سکا تھا۔ پروفیسر وہائٹ نے اس سے چند ہفتے اور ٹھہرنے کے لئے کہا تھا اور دبے دبے لفظوں میں یہ بھی بتایا تھا کہ شاید سلیم کو اپنی ریسرچ کا موضوع ہی بدلنا پڑے۔ سلیم اس امکان سے ہی لرز گیا تھا۔ ریسرچ کا موضوع بدلنے کا مطلب تھا کہ اس کا پورا ایک سال ضائع ہو گیا۔ وہ تو دن رات لگ کر دو کی جگہ ڈیڑھ سال میں ماسٹرز مکمل کر کے واپس بھاگنا چاہتا تھا۔ نئے سرے سے ریسرچ شروع کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے دو سال اور گزارنے پڑتے۔ ایک تو اس کا اسکالر شپ صرف دو سال کا تھا پھر جنہیں وہ پاکستان چھوڑ کر آیا تھا ان کے صبر کا پیانہ پہلے ہی لبریز تھا۔ پاکستان سے آنے والے خط پڑھ کر ان کے ساتھ آنے والی تصویریں دیکھ کر گھٹائیں گھر گھر کر آتیں لیکن وہ زور زور سے پلکیں جھپکتا کبھی سر کو جھٹکتا اور سب کچھ بھلا دینے اور اپنے حالات پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرتا۔

اسے معلوم تھا کہ ڈیڑھ سال میں گھر واپس آنے کا وعدہ ایفا نہ کر سکے گا۔

آج بھی پروفیسر وہائٹ کے کمرے سے نکلا تو ذہن کی وہی کیفیت تھی اور سر جھٹکنے سے بھی برے خیالات کی رو ٹوٹ نہیں رہی تھی۔ وہ راؤنڈ ہاؤس کی طرف چلا آیا جہاں پوسٹروں کی نمائش لگی تھی۔ راؤنڈ ہاؤس کے کافی شاپ میں وہ چائے لے کر ایک ٹیبل پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک شخص آ کر اس سے مخاطب ہوا۔

"کیا آپ پاکستانی ہیں؟"

"جی ہاں۔" سلیم نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اگر اردو میں مخاطب نہیں ہوتا تو سلیم کو اسے پاکستانی سمجھنے میں دشواری ہوتی۔ اس کے خدوخال پاکستانیوں کی طرح تھے لیکن حلیہ اور وضع قطع آسٹریلوی' اطالوی جیسی تھی۔ کسی خاص چکنائی سے چپڑے ہوئے بغیر مانگ نکالے ہوئے سیدھے کس کر باندھے ہوئے بال۔ لمبی لٹوں کو پیچھے سے باندھ کر پونی ٹیل بنایا گیا تھا۔ الٹے کان میں بالی تھی۔ سیدھے کان میں ہوتی تو سلیم اسے "گے" یعنی ہم جنس پرست سمجھتا' اس کے ایک دوست نے یہی پہچان بتائی تھی۔ کالی جینز پر چمڑے کی کالی جیکٹ' اندر سفید رنگ کی ٹی شرٹ جس پر اوپیرا ہاؤس کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس طرح کی ٹی شرٹیں سڈنی آنے والے سیاحوں میں بہت مقبول تھیں۔ آنکھوں پر سیاہ رنگ کا چشمہ تھا جو اس نے راؤنڈ ہاؤس کے نیم تاریک کافی ہاؤس میں بھی نہیں اتارا تھا۔ کھلتا ہوا رنگ تھا لیکن چہرے پر تازگی نہیں تھی۔ وہ سلیم کے ساتھ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور اس نے وہ چشمہ جو سلیم کو اس کے چہرے کا حصہ لگا تھا اتار کر میز پر رکھ دیا۔ سلیم کو اس کی آنکھیں ویران نظر آئیں۔ آنکھوں کی یہ ویرانی اس کے چہرے کی بے حسی سے میل کھاتی تھی لیکن آواز زندگی سے بھرپور تھی۔

"میں بھی پاکستان سے ہوں۔ سیالکوٹ کا ہوں لیکن کراچی میں پلا بڑھا ہوں۔ اس لئے خود کو کراچی کا کہتا ہوں۔ آپ تو شکل سے ہی کراچی کے لگتے ہیں۔" وہ دوسرے ہی جملے میں بے تکلف ہونے لگا تھا سلیم کو "شکل ہی سے کراچی کا لگنے" سے سخت چڑ تھی۔ یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی کہ شکل سے کوئی کراچی کا کیسے لگ

سکتا ہے۔

"جی ہاں میں کراچی کا ہوں۔ لیکن آپ تو پاکستانی بھی نہیں لگتے۔" سلیم نے بدلہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا الٹا اثر ہوا اور اس نے ہنستے ہوئے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔

"میرے سارے دوست مجھے اٹالین سمجھتے ہیں۔ میں پاکستانی لگنا بھی نہیں چاہتا۔ میں ان سے ملتا بھی نہیں۔ یہاں رہنے والے پاکستانیوں کو ایک دوسرے پر غلاظت پھینکنے اور پیٹھ میں چھرا بھونکنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ ویسے آپ تو مجھے اسٹوڈنٹ لگتے ہیں۔" سلیم کو ایک بار پھر سمجھ میں نہیں آیا کہ اسٹوڈنٹ کیسے لگا جاتا ہے۔ شاید اسٹوڈنٹ لگنے یا نہ لگنے میں وہی فرق تھا جو اس میں اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس اطالوی نما پاکستانی میں تھا۔ پھر بھی اس نے اسے شک کا فائدہ دیا۔

"کیا آپ بھی یہاں پڑھ رہے ہیں۔" سلیم کے جواب پر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ اس کے سگریٹ پینے کا انداز بلیک اینڈ وہائٹ زمانے کی امریکی فلموں کے کسی ہیرو جیسا تھا۔ بڑی ادا سے سگریٹ کا دھواں اڑا کر اس نے کہا۔

"میں اپنے حصے کی پڑھائی کر چکا ہوں۔ پڑھنے سے مجھے اب کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پڑھائی نے مجھے کچھ دیا بھی نہیں ایک چھوٹی سی نوکری تک نہیں دی۔ میں نے جرنلزم میں ایم اے کیا تھا۔ مجھے کرائم رپورٹر بننے کا شوق تھا۔ لیکن پاکستان کے اخباروں میں کرائم رپورٹر بھرتی ہونے کے لئے کرمنل ریکارڈ اور بے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بڑی سفارشوں سے دواؤں کی ایک کمپنی میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ نوکری دینے والوں نے ڈگری دیکھی تک نہیں۔ آسٹریلیا میں بھی میں نے ڈگری والوں کو مارے مارے پھرتے دیکھا ہے۔ اس لئے پڑھنا میرے لئے صرف وقت ضائع کرنے کی بات ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔" وہ آپ نے اب تم پر آگیا تھا۔

"انجنیئرنگ میں ماسٹرز کر رہا ہوں۔"

"ماسٹرز کر کے کیا کرو گے۔"

"پاکستان جاؤں گا' اپنے ملک کی خدمت کروں گا۔" سلیم نے اپنی آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اپنی یہ آواز خود اسے بڑی کھوکھلی لگی۔ بشیر نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور سگریٹ کا کش لے کر دھوئیں کا ایک بڑا سا گولہ باہر پھینکا۔

"بھئیے' شروع شروع میں سب یہی کہتے ہیں۔ لیکن ماسٹرز کر کے تم بھی امیگریشن حاصل کرنے کے لئے دھکے کھاؤ گے۔ نہیں ملی تو پی ایچ ڈی کرنے لگو گے اور راتوں کو ٹیکسی چلاؤ گے۔ نہ نہ برا مت مانو۔" اس نے سلیم کے چہرے کو سرخ ہوتے ہوئے دیکھ کر ذرا نرم انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میں وہ بتا رہا ہوں جو میں یہاں تین سالوں سے ہوتا دیکھ رہا ہوں۔ تم شاید مختلف ہو۔ پھر بھی کبھی ضرورت پڑے تو مجھے فون کرنا تمہارے بہت کام آؤں گا۔ میرا نام بشیر احمد ہے اور یہ میرا فون نمبر ہے۔" بشیر جانے کے لئے کھڑا ہو کر کاغذ کے ایک پرزے پر فون نمبر لکھنے لگا۔ بشیر احمد کا نام سنتے ہی سلیم کی یادداشت میں ہلچل مچ گئی۔ اس کے نقوش بھی جانے پہچانے لگنے لگے۔ اسے اس کے دوست نے اس بشیر احمد کی تصویر دکھائی تھی جس کا سڈنی کے ایئرپورٹ پر اس نے دن بھر انتظار کیا تھا۔ پھر بھی اس نے تصدیق چاہی۔

"آپ نارتھ ناظم آباد کے ای بلاک میں رہنے والے سعید کو جانتے ہیں۔" سلیم نے اپنے جوش کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"سعید کو..... ہاں جانتا ہوں..... میں بھی ای بلاک میں اس سے دو گلی دور رہتا تھا۔ لیکن تم کیسے جانتے ہو۔" بشیر احمد نے جو کھڑا ہو گیا تھا اپنی حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرا نام سلیم ہے۔ میں پچھلے سال سڈنی آیا تھا سعید نے آپ سے میرے سلسلے میں بات کی تھی اور کہا تھا کہ آپ مجھے ایئرپورٹ پر لینے آئیں گے اور رہنے کا بندوبست کر دیں گے۔ لیکن میں ایئرپورٹ پر آپ کا انتظار ہی کرتا رہا۔ دوسرے دن آپ کے گھر کیبرا میٹا بھی گیا تھا۔ لیکن آپ نے شاید وہ فلیٹ چھوڑ دیا تھا۔" سلیم نے بشیر احمد کو یاد دلایا۔ بشیر دھب سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اوہ میرے خدا..... یہ تم ہو! اس روز میں بس آ نہیں سکا تھا۔ مجھے واقعی

بہت افسوس ہے۔ میرا وعدہ غلط نہیں تھا۔ میں ضرور آتا' لیکن میں اس زمانے میں ایک بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ مجھے میلبورن جانا پڑا تھا۔ مجھے اب تک اس کا افسوس ہے' سعید بھی کیا سوچتا ہو گا۔ اور تم...... تم بھی بہت پریشان ہوئے ہو گے۔" سلیم کو اس کے اظہار افسوس میں خلوص محسوس ہوا۔

"مجھے کچھ جاننے والے مل گئے تھے انہوں نے میرے رہنے کا انتظام کر دیا تھا۔ سعید کو خط لکھ ہی نہیں سکا۔ میں اسے شرمندہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔" سلیم نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔

"تمہاری کوئی کلاس تو نہیں ہے۔" بشیر اس سے پوچھنے لگا۔

"نہیں میں ریسرچ کرتا ہوں لیکن وہ بھی آج کل بیچ میں رک گئی ہے۔ بس اب یہاں سے گھر جاؤں گا۔" سلیم نے ٹھنڈی چائے کا آخری گھونٹ لے کر اپنا بیگ سمیٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں تمہیں اس طرح نہیں جانے دوں گا۔ آؤ اوپر چلتے ہیں۔ یہاں کا بار بہت اچھا ہے۔ بیئر پئیں گے اور گپ شپ کریں گے۔ میں بھی شام تک فارغ ہوں۔" سلیم نے کچھ کہنا چاہا لیکن بشیر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے' میں سمجھ گیا تم شراب نہیں پیتے۔ تم تلی ہوئی مچھلی اور چپس کھانا۔ بیئر میں پیئوں گا۔ میں تمہارا کھویا ہوا میزبان ہوں۔ اب اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔" بشیر نے کھڑے ہو کر چشمہ آنکھوں پر پھر چڑھا لیا تھا۔

"میں اپنے کام کے سلسلے میں اکثر یہاں آتا ہوں۔ میرے یہاں بہت سے گاہک ہیں۔ جب بھی آتا ہوں زیادہ وقت اسی بار میں گزارتا ہوں۔ مجھے بہت پسند ہے۔ دن میں پرسکون رہتا ہے۔ شام ہوتے ہی ایسا میلہ لگتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تم جمعہ کو شام میں یہاں آؤ' تمہیں کھڑے ہونے کی جگہ بھی مشکل سے ملے گی۔ بے شمار اکیلی لڑکیاں ڈولتی رہتی ہیں۔ رات کو لڑکی لئے بغیر باہر نہیں نکلو گے۔ لیکن تم مولوی آدمی ہو۔ یہ شکار گاہ تمہارے مطلب کی نہیں ہے۔" بشیر احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

سلیم کو بشیر احمد کی صاف گوئی پسند تو آ رہی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ اس پوری شام میں اسے بار بار بشیر احمد کے قہقہوں کی وجہ بننا پڑے گا۔

سلیم بشیر کے ساتھ گھسٹتا ہوا دوسری منزل پر واقع اس بار میں آیا جو خالی ہونے کی وجہ سے بہت کشادہ لگ رہا تھا۔ اکا دکا لوگ بیٹھے تھے۔ بار ٹنڈر بشیر سے واقف تھا اور اسے دیکھتے ہی اس نے "ہائے بیش" کی صدا لگائی تھی۔ بشیر نے اپنے لئے بیئر اور اس کے لئے کوک لی اور دونوں کونے میں پڑی ہوئی ایک میز پر آ کر بیٹھ گئے۔

"تم سعید کو کیسے جانتے ہو۔ کیا تم بھی نارتھ میں رہتے تھے۔" بشیر نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"نہیں میں تو سوسائٹی میں رہتا ہوں۔ سعید اور میں نے این ای ڈی سے ایک ساتھ انجنیئرنگ کی تھی۔" سلیم نے بشیر کو بتایا۔ بشیر صرف اوہ کر کے رہ گیا۔ بیئر کے ایک دو گھونٹ لینے کے بعد اس نے اپنی صاف گوئی سے سلیم کو ایک بار پھر حیران کر دیا۔

"سعید سے میری دوستی اس کی بہن کی وجہ سے ہوئی تھی۔ میں اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ میں اسے کالج جاتے ہوئے روز بس اسٹاپ پر دیکھتا تھا۔ بے حد خوبصورت تھی، لیکن نظر اٹھا کر نہیں دیکھتی تھی۔ اس کی گلی کے چکر لگانے کے لئے وجہ کی ضرورت تھی۔ میں نے سعید سے کسی طرح دوستی کر لی اور اس کے گھر جانے لگا۔ بالکل گڑیا جیسی لگتی تھی۔ تم نے تو دیکھا ہو گا۔ تم کتنے بھی مولوی ہو، مجھے یقین ہے اسے دیکھ کر تمہارا دل بھی ضرور دھڑکا ہو گا۔" بشیر نے سلیم کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں نے نہیں دیکھا۔ میرا دل اپنے دوستوں کی بہنوں کو دیکھ کر نہیں دھڑکتا۔ میں انہیں اپنی بہنیں سمجھتا ہوں، ان پر بری نگاہ نہیں ڈالتا۔" سلیم نے تلخ لہجے اور طنزیہ انداز میں کہا۔

"میں بھی نہیں ڈالتا۔" بشیر نے بڑے غصے سے اپنا گلاس زور سے میز پر پٹختے

ہوئے کا۔ "سعید میرا دوست بعد میں بنا تھا اور یہ بری نگاہ وہ میں نے آج تک کسی پر نہیں ڈالی۔ یہ بری نگاہ تم جیسے مولویوں کی ایجاد کردہ چیز ہے۔ کسی اچھی چیز کو پسند سے دیکھنے والی نظر بری نہیں اچھی ہوتی ہے۔ کسی کی خوبصورتی کو دیکھنا' اسے پسند کرنا' چاہنا' پیار کرنا یہ زندگی کی سب سے بڑی اچھائیاں ہیں۔ بری نگاہ۔ مائی فٹ۔" بشیر واقعی ناراض ہو گیا تھا۔ اس نے بیئر کا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کیا اور دوسرا لینے کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو نئے گلاس سے ایک گھونٹ لینے کے بعد اس کے غصے کا جھاگ بیئر میں تحلیل ہو گیا تھا۔

"اس عشق کا انجام کیا ہوا۔" سلیم نے اس کا موڈ بحال ہوتے دیکھ کر گفتگو کا سلسلہ پھر وہیں سے جوڑا جہاں سے چھوڑا تھا۔ نامکمل کہانی اسے الجھن میں ڈال دیتی تھی۔

"یہ میرا شاید سب سے کم عرصے جاری رہنے والا اور واحد یکطرفہ عشق تھا۔ کبھی اس سے نگاہ تک چار نہیں ہو سکی۔ سعید نے ایک بار مجھے باتوں باتوں میں بتایا تھا کہ اس کی بہن کی منگنی ہو چکی ہے' شادی ہونے والی ہے۔ تین چار مہینے بعد اس کا ڈاکٹر کزن آیا اور بیاہ کر سعودی عرب لے گیا اب تو اس کے کئی بچے ہو چکے ہیں۔ لیکن سعید بہت اچھا لڑکا تھا' اس سے میری دوستی قائم رہی۔ وہ واحد دوست تھا جو نارتھ ناظم آباد جیسے خطرناک ہو جانے والے علاقے سے رات ڈیڑھ بجے نکل کر مجھے چھوڑنے ایئرپورٹ آیا تھا۔" بشیر نے بیئر کا گھونٹ لینے کے لئے توقف کیا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "تم اپنی کہانی سناؤ سڈنی میں ایک سال تم نے کیسے گزارا۔ لیکن ٹھہرو پہلے میں تمہارے لئے لنچ لے کر آؤں۔"

بشیر سلیم کا احتجاج سنے بغیر اسنیک کے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ واپس آیا تو ایک پلیٹ میں بجی ہوئی تازہ تلی ہوئی مچھلی اور چپس کی پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھی۔ سلیم مچھلی کھاتا اور اسے سڈنی میں گزرنے والے شب و روز کے قصے سناتا رہا۔ اپنی کہانی کے دلچسپ حصے صاف گول کر گیا۔ ایوان اور بنگالی لڑکی کا ذکر تک نہیں کیا۔ اس عرصے میں بشیر بیئر کے گلاس خالی کرتا اور بھر کر لاتا رہا۔ اس کا یہ شاید چھٹا یا

ساتواں گلاس تھا لیکن بیئر کا نتیجہ اس کے بار بار ٹوائیلٹ جانے کے علاوہ کسی اور شکل میں ظاہر نہیں ہوا تھا۔ سلیم بھی مچھلی کھانے کے بعد کوک کے دوسرے راؤنڈ پر تھا۔ سلیم کی اپنی کہانی بہت رنگین نہیں تھی لیکن اسے یقین تھا کہ بشیر کی کہانی بہت دلچسپ، بلکہ سنسنی خیز ہو گی۔ بشیر بھی شائد کسی سنجیدہ سامع کو ترسا ہوا تھا اس لئے سلیم نے جب اس سے پوچھا کہ وہ آسٹریلیا کیسے آیا اور آ کر کیا کرتا رہا تو اس نے تھوڑا سا توقف کیا۔ بیئر کے دو تین گھونٹ لینے کے بعد جب کہانی شروع کی تو ختم ہونے تک اپنے گلاس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سلیم کا خیال غلط نہیں تھا۔ بشیر کی کہانی کافی دلچسپ ثابت ہوئی تھی۔

امریکی دواؤں کی کمپنی میں بشیر کو کلرکی کر کے اچھے پیسے مل جاتے تھے لیکن اس کی بے چین روح زندگی بھر کلرک رہنے پر قانع نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ کھلی فضاؤں میں اڑنے کے خواب دیکھتا تھا۔ سال بھر کلرکی کرتا رہا اور کچھ پیسے جمع ہو گئے تو ویزا خرید کر دوبئ چلا گیا۔ دوبئ میں درختوں پر لگے ہوئے پیسے توڑنے کی کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ کوئی ایسی نوکری نہیں ملی کہ جم کر کام کر سکتا۔ جو نوکریاں ملیں وہ ایسی تھیں جیسی وہ کراچی میں کر رہا تھا۔ اس لئے تھوڑی تھوڑی مدت کی دو تین نوکریاں کر کے اور جو کچھ پیسے بچے تھے وہ لٹا کر کراچی واپس چلا گیا اور کوشش کر کے دواؤں کی کمپنی میں پرانی نوکری دوبارہ حاصل کر لی۔ اسی زمانے میں اس کا ایک دوست آسٹریلیا سے آیا ہوا تھا۔ اس نے آسٹریلیا کی جنت کا ایسا نقشہ کھینچا اور اپنی کامیابیوں کے ایسے قصے سنائے کہ بشیر احمد نے آسٹریلیا کی محبت میں گرفتار ہو کر وہیں جانے اور بس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن آسٹریلیا کا ویزا لینا آسان نہیں تھا بلکہ امریکہ اور برطانیہ سے زیادہ مشکل تھا۔ ایک ایجنٹ پکڑا گیا تھا جو پیسے لے کر آسٹریلیا کے لئے اسٹوڈنٹس ویزا لگوانے کا کام کر رہا تھا۔ اس کے بعد سے سختی اور بڑھ گئی تھی۔

بشیر کا دماغ ان معاملوں میں بہت تیزی سے چلتا تھا۔ وہ ویزا لینے کی ترکیبیں سوچتا اور آسٹریلیا کے بارے میں لٹریچر پڑھتا رہا۔ ذہن میں جو ترکیب آئی وہ وقت

طلب تھی، لیکن بشیر کا خیال تھا کہ کامیاب ضرور ہو گی۔ اس نے یونیورسٹی میں جرنلزم کے اپنے پرانے پروفیسر سے آسٹریلین ہائی کمیشن کے نام ایک خط لیا جس میں بشیر احمد کو اس تحقیقی کتاب میں مدد دینے کے لئے کہا گیا تھا جو وہ آسٹریلیا کی آزادی صحافت کے بارے میں لکھ رہا تھا اور جس کا موضوع تھا Australian Model of a Free Press خط بھیجنے کے دو ہفتے بعد ہی یونیورسٹی سے اس کے پروفیسر نے فون کر کے بتایا کہ آسٹریلوی ہائی کمیشن نے مطلوبہ لٹریچر بھیج دیا ہے۔ بشیر نے وہ لٹریچر لینے کے لئے یونیورسٹی جانے کی زحمت بھی نہیں کی۔ آسٹریلوی ہائی کمیشن کے جس افسر نے یہ لٹریچر بھیجا تھا صرف اس کا نام پتہ فون پر معلوم کر کے اپنی طرف سے شکریئے کا ایک خط لکھ دیا۔ جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کے لیٹر پیڈ وہ پہلے ہی پروفیسر سے مانگ لایا تھا۔ شکریئے کا خط لکھنے کے دو ماہ بعد اس نے ایک اور خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ آسٹریلوی ہائی کمیشن نے جو لٹریچر بھیجا تھا اس نے آسٹریلوی پریس کے بارے میں کتاب مرتب کرنے میں اس کی بہت مدد کی ہے لیکن اسے تمام بڑے آسٹریلوی اخبارات کے کم از کم ہفتے بھر کے تازہ شمارے چاہئیں تاکہ ان کے مواد اور اسٹائل کا تجزیہ کتاب میں شامل کیا جا سکے۔ اس دفعہ جواب میں صرف خط آیا جس میں کہا گیا تھا کہ ہائی کمیشن میں تمام اخبارات کی تاریخ وار فائلیں موجود ہیں وہ اگر چاہے تو اسلام آباد آ کر ان اخباروں پر اپنا کام کر سکتا ہے۔ دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر اسلام آباد پہنچا تو ہائی کمیشن میں اسے ایک میز اور کرسی فراہم کر دی گئی جس پر بشیر احمد دن بھر اخبار میں غرق بیٹھا کاغذوں پر نوٹس لیتا رہتا۔ اس نے سچ مچ کے محقق کا روپ دھارا تھا۔ لمبے لمبے خشک اور لاپرواہی سے سنوارے ہوئے بال اور ناک پر ٹکی ہوئی آدھے شیشوں والی نزدیک سے پڑھنے کی عینک۔ دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ گفتگو کم کرتا اور جواب میں زیادہ تر مسکراتا رہتا جس کی وجہ سے اس کی شخصیت بڑا خوشگوار سا تاثر چھوڑتی۔ ہفتے کے آخری دن اس کی واپسی سے پہلے ہائی کمشنر نے چائے پر اس سے ملاقات کی۔ اس کی ریسرچ کے بارے میں پوچھا۔ بشیر احمد نے بتایا کہ وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔ اس کی تحقیق میں ابھی کئی جھول ہیں جو شاید آسٹریلوی صحافیوں سے براہ راست

گفتگو کیۓ بغیر پورے نہیں ہوں گے۔ ہائی کمشنر نے تجویز پیش کی کہ وہ خود آسٹریلیا جا کر اپنی تحقیق کی یہ کمزوری دور کرے۔ بشیر احمد نے اپنے اندرونی جوش کو ظاہر کیۓ بغیر کہا کہ وہ اپنی یونیورسٹی سے بات کرے گا۔ اگر وہ اس کے جانے کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار ہوۓ تو وہ ہائی کمشنر سے رابطہ قائم کرے گا۔ ہائی کمشنر نے اسے یقین دلایا کہ آسٹریلیا میں اس کی تحقیق کے لئے ضروری سہولتیں فراہم کرنے میں وہ اس کی مدد کریں گے۔

بشیر احمد اسلام آباد سے آسٹریلیا فتح کر کے واپس آیا تھا۔ ہائی کمشنر نے اس کی مشکل خود ہی آسان کر دی تھی اور اسے اپنے منصوبے کے ترکش کا آخری تیر استعمال نہیں کرنا پڑا تھا۔ کراچی آنے کے بعد بشیر احمد نے دو ہفتے اور انتظار کیا جس کے بعد اس نے ویزے کے فارم جو وہ اسلام آباد سے لے کر آیا تھا بھر کے بھیج دیۓ۔ ساتھ میں یونیورسٹی کے پروفیسر کی طرف سے ہائی کمشنر کے نام شکریہ کا ایک خط تھا جس میں بشیر کی ریسرچ میں تعاون کرنے کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ آسٹریلیا میں اسے مدد فراہم کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اس سارے معاملے میں بشیر کو پروفیسر کا اعتماد حاصل تھا جو بہرصورت ضروری تھا۔ ہائی کمیشن یونیورسٹی فون کر کے پروفیسر سے تصدیق چاہ سکتے تھے، تصدیق نہ ملنے کی صورت میں بشیر کے منصوبے کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن بشیر نے اپنا ایسا عکس ڈالا تھا کہ ہائی کمیشن نے اس کے بارے میں کسی بھی تصدیق کی زحمت نہیں کی۔ ایک ہفتے کے اندر ہی بشیر کے پاسپورٹ پر تین مہینے کا ویزا لگ کر آ گیا۔

بشیر احمد سڈنی پہنچ گیا لیکن آنے کے بعد سب کچھ اس طرح نہیں ہوا جس طرح اس نے سوچا تھا بلکہ آسٹریلیا آ کر اسے خاصی مایوسی ہوئی۔ آسٹریلیا سے نہیں ان لوگوں سے جنہوں نے آسٹریلیا میں اپنی کامیابیوں کے قصیدے پڑھے تھے۔ اس کا وہ دوست جس نے اسے آسٹریلیا آنے کی ترغیب دی اور بتایا تھا کہ اس نے کامیابی کے کیا کیا جھنڈے گاڑے ہیں، ایک ملائشی اور انڈین ریسٹورنٹ میں تندور پر کام کرتا تھا اور ریسٹورنٹ کے اوپر ایک فلیٹ میں ریسٹورنٹ کے دوسرے ملازموں کے ساتھ رہتا

تھا۔ وہ بشیر کو ایئر پورٹ پر لینے آیا تھا' گھر آتے آتے شام کے چار بن گئے تھے اس لئے بشیر کو فلیٹ میں چھوڑ کر وہ کام پر چلا گیا۔ بشیر دو کمرے کے اس فلیٹ میں تنہا آرام کرتا رہا۔ ریسٹورنٹ گیارہ بجے بند ہوتا تھا۔ بارہ بجے تک بشیر کا دوست اور فلیٹ میں رہنے والے اس کے تینوں ساتھی آ گئے۔ تینوں ہندوستانی تھے۔ ایک سکھ تھا۔ دو کیرالہ کے تھے۔ ان میں بارہ گھنٹے کی سخت محنت کے بعد رسمی تعارف سے زیادہ کچھ کہنے سننے کی توانائی باقی نہیں تھی۔ بشیر کے دوست نے چھوٹے سے لاؤنج میں ٹی وی کے ساتھ پڑے ہوئے ایک میلے سے صوفے پر چادر بچھا کر اور کشن رکھ کر بشیر کے سونے کا انتظام کر دیا۔ چاروں بستروں کے بھر جانے کے بعد پورے فلیٹ میں یہ صوفہ بیٹھنے یا لیٹنے کی واحد جگہ بچا تھا۔ بشیر چار طرف سے آتے ہوئے زوردار خراٹوں کے درمیان صوفے پر چت پڑا رہا۔ کروٹ بدلنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے دوست کو اس طرز رہائش میں جنت کا کونسا پہلو نظر آیا تھا۔ شاید جنت کے بارے میں اسے کوئی بہت گمراہ کن تصور دیا گیا تھا۔ بشیر کے لئے تو یہ بد سے بدتر کی طرف آنے کی صورت حال تھی۔ کراچی میں وہ اپنی بہن کے پاس رہتا تھا لیکن وہاں بھی اس کا الگ کمرہ تھا۔ کسی کو ساتھ رکھنے کا کبھی سوال ہی نہیں پیدا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے سوچتے رات گئے کسی وقت اسے بھی نیند آ گئی۔

سو کر اٹھا تو اس کا دوست تیار تھا۔ بشیر تیار ہوا تو اسے لے کر باہر نکلا۔ انہوں نے میکڈانلڈ میں ناشتہ کرنے کی عیاشی کی جس کے بعد اس کا دوست بشیر کو کرونولا کے ساحل پر گھماتا رہا جو اس کے ریسٹورنٹ اور رہائش گاہ کے بالکل سامنے تھا۔ اس کے دوست نے بشیر کو بتایا کہ نواب کے ڈیرے پر اس کے رہنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ کل صبح وہ اسے وہاں چھوڑ آئے گا۔ اس کے دوست نے بشیر کو پیشکش کی تھی کہ وہ چاہے تو اس کے ساتھ تندور کا کام سیکھنے پر لگ جائے کچھ عرصے بعد کسی نہ کسی ریسٹورنٹ میں اسے نوکری دلوا دی جائے گی۔ اس نے بڑے فخر سے بشیر کو بتایا تھا کہ اسے ساڑھے پانچ سو ڈالر ہفتہ تنخواہ ملتی ہے کھانا اور رہنا مفت ہے وہ بڑی مشکل سے ہفتے میں پچاس ڈالر خرچ کر پاتا ہے۔ پانچ سو ڈالر ہفتے کی بچت ہے۔ ہر

مہینے ایک ہفتے کی کمائی اپنے خاندان کے گزارے کے لئے پاکستان بھیجتا ہے باقی پیسے جمع کر رہا ہے۔ اگلے سال تک اپنا ریسٹورنٹ کھول لے گا۔ اس وقت تک اس کے بیوی بچے بھی سڈنی آ جائیں گے۔ شیف ہونے کی بنیاد پر امیگریشن وہ پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔

بشیر کے حالات اور منصوبے اس کے دوست سے بہت مختلف تھے۔ وہ نہ تو اپنے پیچھے کوئی قرض چھوڑ کر آیا تھا نہ اسے کوئی ذمہ داری نباہنی تھی اور نہ بیوی بچے پالنے تھے۔ وہ ایک اچھے ملک میں ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے بے وطن ہوا تھا۔ اس کا رشتہ اب اس نئے دیس کے ساتھ تھا' وہ نئے رنگ میں رنگ کر اپنی زندگی کو رہن سہن کا نیا لباس پہنانا چاہتا تھا۔

نواب کا ڈیرہ بشیر کے لئے ایک ڈراؤنا خواب ثابت ہوا۔ اس کا دوست بشیر کی رہائش کا مستقل بندوبست کر کے اسے نواب کے ڈیرے پر چھوڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی دوستی کا فرض ادا کر دیا تھا۔ بشیر خود بھی اس صوفے سے نجات چاہتا تھا جس پر لیٹ کر وہ تاروں کی جگہ چھت پر سیلن سے پڑے ہوئے دھبوں کو دو راتوں میں کئی بار گن چکا تھا۔ نواب کا ڈیرہ الیگزینڈریا کے علاقے میں واقع تین کمروں کا ایک پرانا مکان تھا۔ یہ فیکٹریوں اور بڑے بڑے گوداموں کا علاقہ تھا' اس لئے کام ڈھونڈنے میں آسانی رہتی تھی۔ نواب صاحب ایک پہلوان نما شخصیت تھے' بہت بھاری بھرکم جسم' بڑی بڑی مونچھیں' لنگی اور بنیان کے دیسی لباس میں رہتے تھے۔ ڈیرے کو بورڈنگ کے طرز پر چلاتے تھے۔ ہر کمرے میں دو بستر تھے۔ اس طرح ان کے کل چھ کرائے دار تھے۔ ان کا اپنا بستر ڈرائنگ روم میں ٹی وی کے پاس تھا۔ وہیں ایک طرف چھ کرسیوں والی لکڑی کی بے رنگ ڈائننگ ٹیبل بھی تھی۔ بشیر کو جو حساب کتاب بتایا گیا تھا وہ کچھ یوں تھا۔ پچاس ڈالر کرائے کے دس ڈالر بجلی فون کے۔ تیس ڈالر کھانے کے۔ کھانا صرف دو وقت کا۔ یعنی ناشتہ اور دوپہر یا رات میں کسی ایک وقت کا کھانا۔ سات آدمیوں کے رہنے کے باوجود مکان میں سخت خاموشی اور ماحول میں تناؤ رہتا۔ اول تو سب کبھی ایک ساتھ مکان میں ہوتے نہیں تھے۔ مختلف شفٹوں میں کام کرتے

تھے اور کام سے واپس آتے تو سونے اور آرام کرنے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ اگر وقت ہوتا بھی تو گھر سے باہر گھومنے نکل جاتے۔ مکان میں رہتے تو خود کو اپنے بستر کی دنیا تک محدود رکھتے۔

بشیر کے کمرے میں دوسرے بستر کا مکین ناصر تھا جو نواب صاحب کے گاؤں کا تھا اور انہیں کے ساتھ سڈنی آیا تھا۔ اس نے بشیر سے کہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ فیکٹری میں لے چلے گا اور سپروائزر سے ملوائے گا۔ امید ہے اسے کام مل جائے گا۔ بشیر فوری کام پر لگ جانا چاہتا تھا تاکہ کچھ پیسے جمع کر کے اپنے رہنے کا الگ بندوبست کرے۔ ناصر دوسرے دن صبح پانچ بجے کی شفٹ میں کام کر رہا تھا۔ وہ بشیر کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ بشیر کی قسمت کہ اسے اسی دن کام پر رکھ لیا گیا۔ اسے ایک مشین مین کے ساتھ مددگار کے طور پر کام کرنے کے لئے لگا دیا گیا تھا۔ بشیر سخت جسمانی محنت کا عادی نہیں تھا۔ اس نے ہمیشہ سیاست لڑائی تھی، منصوبے بنائے تھے، چکر چلائے تھے یا کلرک بن کر کرسیاں توڑی تھیں۔ بارہ گھنٹے بعد اس کے جسم کا ایک ایک خلیہ فریاد کر رہا تھا۔ کام ختم ہونے کے بعد اس نے سپروائزر سے کہا کہ وہ پڑھا لکھا دفتری کام کرنے والا آدمی ہے، اتنی سخت محنت نہیں کر سکے گا۔ سپروائزر نے اسے دوسرے دن نو بجے دفتر کھلنے کے وقت آنے کے لئے کہا اور وعدہ کیا کہ دفتر میں جگہ ہوئی تو اسے رکھوا دے گا۔

فیکٹری سے باہر نکل کر بشیر ناصر کو لے کر نزدیک کے ایک پب میں گھس گیا۔ جب سے آسٹریلیا آیا تھا، پہلی بار کسی قاعدے کے بار میں بیٹھ کر ٹھنڈی ڈرافٹ بیئر کے مزے لے رہا تھا۔ ناصر اورنج جوس پی کر اس کا ساتھ دیتا رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی زندگی کی کہانی سنائی۔ ناصر نے بتایا کہ وہ نواب کے ساتھ آسٹریلیا آیا تھا۔ کس طرح آیا تھا۔ یہ کہانی بھی بہت مزیدار تھی۔

ناصر کے مطابق نواب کا اصل نام غلام شبیر تھا اور وہ گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا۔ نواب بن کر آسٹریلیا آیا تھا اس لئے نواب صاحب کہلانے لگا۔ گوجرانوالہ کے پاس نواب کی کچھ زمینیں تھیں لیکن اس نے خود نہ تو کبھی کھیتی باڑی کی اور نہ کوئی

اور کام کیا۔ زمینوں کا پیسہ آتا تھا' بھینسیں پالی ہوئی تھیں ان کے دودھ کی کمائی بھی آ جاتی تھی' اولاد کوئی نہیں تھی اس لئے بے فکری کی زندگی گزار رہا تھا۔ جن کے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں ہوتا وہ جوانی میں پہلوانی اور ادھیڑ عمری میں سیاست کرنا شروع کرتے ہیں۔ پہلوانی کے بعد اسے بھی سیاست کا چسکا لگا۔ نواب زادہ نصراللہ کی پارٹی میں شامل ہو گیا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے سارے ممبر ایک تانگے میں سما جاتے ہیں۔ پیسے دے کر اخباروں میں بیان اور تصویریں چھپواتا۔ کچھ یار دوست اور حواری مزا لینے اس کے ساتھ لگ گئے تھے۔ الیکشن آیا تو قومی اسمبلی کا امیدوار بن گیا۔ نوابزادہ نصراللہ نے اس کی انتخابی مہم کے لئے علاقے میں جلسہ بھی کیا' انہیں سننے کافی لوگ جمع ہو گئے تھے جس سے نواب کو الیکشن جیتنے کی امید ہو گئی تھی۔ اسے سمجھا دیا گیا تھا کہ لوگ مسلم لیگ اور پیپلزپارٹی دونوں سے بیزار ہیں اس لئے نعرے کسی کے بھی لگائیں ووٹ اسی کو دیں گے۔ نواب اپنا انتخابی نشان حقہ لئے گاؤں گاؤں گھومتا رہا۔ اسے یہ بھی باور کرایا گیا تھا کہ الیکشن امیدوار نہیں پیسہ جیتتا ہے۔ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا میٹھا ہو گا۔ اس لئے زمینیں بکنی شروع ہوئیں۔ کچھ بیچ دیں' کچھ گروی رکھ دیں۔ سب کچھ الیکشن کی نذر ہو گیا۔ ہوش اس وقت آیا جب الیکشن کا نتیجہ آیا جس میں اس کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی۔ الیکشن کے دوران کارکنوں کی جو فوج جمع ہو گئی تھی وہ بھی تتربتر ہو گئی' آخر میں بھینسیں بچ گئی تھیں جن کے دودھ کی کمائی سے وہ اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سیاست میں زمینیں گنوانے کے بعد کچھ عقل آئی۔ لاہور کے ایک ریکروٹنگ ایجنٹ سے صلاح و مشورے کے بعد ایک دن اسلام آباد میں آسٹریلین ہائی کمیشن کے بزنس سیکشن میں پہنچ گیا اور انہیں بتایا کہ وہ گوجرانوالہ میں اپنی زمینوں پر گھوڑوں کی افزائش کا فارم کھول رہا ہے جس کے لئے وہ آسٹریلیا سے گھوڑے خریدنا چاہتا ہے۔ آسٹریلیا نے گوجرانوالہ کے پاس ایک ڈیری فارم بنانے میں فنی مدد فراہم کی تھی وہ اس علاقے کو جانتے تھے۔ نواب کو یہ ثابت کرنے میں بھی دشواری نہیں ہوئی کہ علاقے میں اس کی زمینیں ہیں۔ انتخابات کے دوران اخبارات میں اس کی خبریں اور تصویریں

چھپی تھیں وہ متاثر کن تھیں اور خود نواب کی شخصیت بھی بہت پراثر لگتی تھی۔ اپنے بھاری بھر کم ڈیل ڈول پر شیروانی اور پھندنوں والی وہ لال ترکی ٹوپی پہن کر ہائی کمیشن آتا جاتا جو اس نے نوابزادہ نصراللہ کی پارٹی میں شامل ہونے کے بعد ان کی تقلید میں پہننی شروع کی تھی اور الیکشن ہارنے کے بعد اتار کر پھینک دی تھی۔ ہاتھ میں چھڑی ہوتی' بڑی بڑی تاؤدار مونچھیں اسے نواب کی مکمل شبیہہ بنانے کے لئے کافی تھیں۔ ہائی کمیشن کے لوگ پوری طرح اس کے فریب میں آ گئے۔ اس نے انہیں اس پر رضامند کر لیا کہ وہ اپنے ساتھ بارہ سائیس بھی لے کر جائے گا جو گھوڑے خریدنے اور انہیں پاکستان لانے میں اس کی مدد کریں گے۔

نواب کو چار آدمی تو اپنے علاقے سے مل گئے۔ ان میں سے ایک ناصر بھی تھا۔ باقی آٹھ لاہور کے ایجنٹ کے ذریعے ملے۔ فی ویزا ڈیڑھ لاکھ روپے قیمت تھی۔ یہ بھی ضمانت تھی کہ نواب ان سب کو اپنے ساتھ لے کر آسٹریلیا جائے گا۔ اپنا اور سائیس کے طور پر اپنے بارہ آدمیوں کے ویزے لگوا کر نواب کے حلئے میں وہ سڈنی پہنچا اور امیگریشن والوں کو ہائی کمیشن کی طرف سے تیار کر کے دیئے گئے کاغذات دکھا کر بارہ کے بارہ آدمی باہر نکال لایا۔ لاہور کے ایجنٹ کے ذریعے جو آٹھ آدمی آئے تھے ان میں سے چھ کے اپنے رابطہ تھے اور انہیں لینے ان کے لوگ آئے ہوئے تھے اس لئے وہ تو ایئرپورٹ سے ہی چلے گئے۔ اس کے اپنے علاقے کے چاروں اور لاہور کے دو لڑکے جن کا کوئی جاننے والا نہیں تھا نواب کے ساتھ نتھی رہے۔

نواب کا پہلے خیال یہ تھا کہ وہ فوراً ہی واپس چلا جائے گا لیکن گوجرانوالہ جا کر پلنگ توڑنے اور بھینسوں کا دودھ بیچنے اور پینے سے بہتر تھا کہ وہ دو تین سال یہیں رہ کر خرکاری کرتا اور اتنے مزید پیسے جمع کر لیتا کہ واپس جا کر اپنی گروی رکھی ہوئی ساری زمینیں چھڑوا سکتا۔ اس کا یہ فیصلہ اس کے زیر سایہ رہنے والوں کے لئے عذاب بن گیا تھا۔ وہ رسی تڑوانا چاہتے تھے لیکن نواب نے دھمکی دی تھی کہ وہ امیگریشن میں فون کر کے انہیں پکڑوا دے گا۔ اسے سب کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ کہاں کام کرتے ہیں' دیوار پر جلی طور پر اس نے امیگریشن کا نمبر لکھ رکھا تھا۔ اس

لئے سب اپنے اپنے حال پر قانع تھے۔ صرف ایک لڑکے نے نواب سے آزادی حاصل کی تھی، لیکن اس نے بہت ہوشیاری سے کام کیا تھا۔ اپنا کوئی بندوبست کر کے ایک دن خاموشی سے غائب ہو گیا تھا۔ نواب اس کی فیکٹری بھی گیا' وہاں سے بھی وہ کام چھوڑ چکا تھا۔ نواب کے اس جاننے والے نے جس نے نواب کے آنے پر اس کی مدد کی تھی اور جس کی آس پاس کی فیکٹریوں میں واقفیت تھی حفیظ نامی اس لڑکے کے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کی تھی لیکن حفیظ کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ نواب کے ڈیرے میں رہنے والوں کو پتہ بھی ہوتا تو وہ نہیں بتاتے۔ نواب کے ساتھ سب مجبوراً" زندگی گزار رہے تھے۔ کسی کو اس سے ہمدردی نہیں تھی۔ سب نے نواب کو یقین دلایا کہ حفیظ میلبورن بھاگ گیا ہے۔ یا شاید ویسٹرن آسٹریلیا کی کانوں میں کام کرنے پرتھ چلا گیا ہے۔ یہ دو ہفتوں پرانا واقعہ تھا۔ بشیر کو حفیظ کا خالی کیا ہوا پلنگ ہی ملا تھا۔

بشیر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ نواب جو خود غیر قانونی طور پر رہ رہا ہے' وہ امیگریشن کو فون کرنے کی دھمکی کس طرح دے سکتا ہے۔ ناصر نے اسے بتایا تھا کہ نواب امیگریشن کو فون کر کے اس فیکٹری کا پتہ بتائے گا جہاں وہ کام کرتا ہے۔ نواب خود اپنے ڈیرے سے باہر نہیں نکلتا اور کوئی بھی لڑکا جوابی کارروائی کے طور پر ڈیرے پر امیگریشن کا چھاپہ نہیں پڑوا سکتا تھا کیونکہ اس طرح ڈیرے میں رہنے والے اس کے باقی ساتھی بھی دھر لئے جاتے۔ بشیر نے کہانی سن کر نواب کے ڈیرے میں بہت محتاط ہو کر رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ وہ کوشش کرے گا کہ نواب کا کم سے کم سامنا ہو تاکہ اسے اپنے صبر و تحمل کو آزمانے کا موقع نہ ملے۔ اس کی یہ حکمت عملی زیادہ دیر تک کامیاب ثابت نہ ہو سکی۔

بشیر کو دوسرے دن صبح نو سے پانچ والی سپلائی کلرک کی نوکری مل گئی تھی۔ اس کا کام فیکٹری میں آنے اور فیکٹری سے باہر جانے والے سامان کی چیکنگ اور ان کا اندراج کرنا تھا۔ بشیر کو انگریزی بولنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ وہ بہت اعتماد اور بڑے دبنگ لہجے میں بات کرتا تھا۔ جو کام کر رہا تھا اس کے لئے وہ بہت موزوں تھا۔ وہ سپلائی

لانے والے ٹرک ڈرائیوروں کو رعب میں رکھتا تھا۔ خود بشیر کو بھی جگہ اور کام پسند تھا۔ فیکٹری کے دفتر میں کام کرنے والی تین لڑکیاں تھیں جن سے فلرٹ کرنے کے امکانات تھے۔ لیکن اب تک اسے اپنا ہدف نہیں مل سکا تھا۔ تین میں سے مارتھا شادی شدہ تھی' دو کے بوائے فرینڈز تھے ایک کا بوائے فرینڈ فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اس لئے وہ بالکل خارج از امکان تھی۔ لفٹ دینے والی شادی شدہ مارتھا تھی جو ایک دن کام کے بعد بشیر کا ساتھ دینے شراب خانے بھی آ گئی تھی۔ لیکن بشیر شادی شدہ لڑکی پر اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دوسری لڑکی کی طرف راغب تھا اور منتظر تھا کہ اس کی اپنے بوائے فرینڈ سے دوستی ختم ہو تو جھپٹا مارے۔ وہ مارتھا سے وقتی تفریح کے لئے فلرٹ کر کے اس امکان کو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔

تین مہینے بڑے آرام سے گزر گئے۔ نواب سے بشیر کا سامنا بہت کم ہوتا۔ بشیر رات کو دس گیارہ سے پہلے گھر نہیں آتا تھا' آتے ہی سو جاتا اور صبح اٹھ کر ناشتہ کئے بغیر نکل جاتا۔ صرف اس دن نواب سے بات ہوتی جب وہ اسے ہفتے کا کرایہ دیتا تھا۔ ایسے ہی ایک دن اس کی نواب سے پہلی جھڑپ ہوئی۔ بشیر نے نواب کو بتایا کہ وہ اسے کھانے کے تیس ڈالر نہیں دے گا کیونکہ وہ گھر میں ناشتہ کرتا ہے نہ کھانا کھاتا ہے۔ نواب کے لئے یہ صرف تیس ڈالر کا نہیں اتھارٹی چیلنج کرنے کا مسئلہ تھا۔ اس نے بشیر کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ کھائے نہ کھائے اپنا کھانا کچرے میں پھینک دے یا کتوں کو کھلا دے تیس ڈالر اسے دینے ہی پڑیں گے۔

"میں نہیں دوں گا' تم میرے حصے کا کھانا مت پکانا۔" بشیر نے اسی ہٹ دھرمی سے کہا۔

"تو کس کھیت کی مولی ہے' تیرا تو باپ بھی دے گا۔" نواب نے' جس کی بد زبانی سے ڈیرے پر رہنے والے پرانے مکین اچھی طرح واقف تھے' اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ اپنے باپ تک پہنچنا بشیر کے صبر و تحمل کے تمام پیمانے لبریز کر گیا۔ اس نے نواب کو دیسی زبان کی وہ تمام گالیاں دے ڈالیں جن کے استعمال کا

آسٹریلیا آنے کے بعد اسے کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ اس سے پہلے کہ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ناصر درمیان میں آکر بشیر کو کھینچ کر کمرے میں لے گیا۔ دروازہ بند کر کے اس نے بشیر کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ تیس ڈالر کی خاطر وہ اپنے معاملات کو الجھانے کی کوشش کیوں کر رہا ہے۔ بشیر کو بھی عقل آ رہی تھی۔ یہاں سے جان چھڑانے کا طریقہ یہ نہیں تھا بلکہ اسے بڑی خاموشی سے یہ جگہ چھوڑنی تھی۔ دونوں باہر جانے کے لئے کمرے سے نکلے تو نواب اس طرح بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ پاکستان میں سیاست کرنے کے دوران اس کی کھال بہت موٹی ہو گئی تھی۔ اس طرح کی چھوٹی موٹی منہ زوریاں اس کی صحت پر کوئی اثر ڈالنے سے قاصر تھیں۔

بشیر کا نواب سے اگلا معرکہ ایک مہینے بعد ہوا۔ بشیر کام کے بعد باقی شام پب میں گزارتا تھا لیکن اس کا یہ شوق مہنگا ثابت ہو رہا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا پب میں آنے والی کسی لڑکی کو پھنسا لے گا اور اس کی شراب نوشی پر سرمایہ کاری کر کے شادی اور اس کے نتیجے میں آسٹریلیا کی شہریت کا منافع کمائے گا۔ لیکن ان تین مہینوں میں اس کی یہ تلاش کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ پب آنے والی زیادہ تر عورتیں نشے کی عادی تھیں اور ٹوٹے پھوٹے رشتے کی کسی نہ کسی ڈور میں بندھی ہوتی تھیں۔ لیزا ایک ایسی لڑکی تھی جو تنہا اور الگ تھلگ بیٹھی رہتی۔ بشیر نے اس سے پینگیں بڑھانی شروع کی تھیں لیکن وہ منشیات کے نشے کی عادی نکلی۔ بیئر کا گلاس سامنے رکھے ہوئے چرس کے سگریٹ پی کر دھواں اڑاتی رہتی۔ بشیر اپنے دیسی نشے کی اس خوشبو سے اچھی طرح واقف تھا۔ چرس کو زینہ بنا کر وہ لیزا سے تعلقات کی منزل تو سر کر گیا لیکن اس سے کام کی بات کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ یا تو چرس کے نشے میں ڈوب کر اپنے ماحول سے بے خبر ہو جاتی اور یا پھر نشے کی طلب میں سخت اکھڑی اکھڑی اور زندگی سے بیزار رہتی۔ اس کی آنکھوں میں چمک صرف اس وقت آتی جب بشیر اسے بتاتا کہ پاکستان کی چرس کتنی اچھی اور پاکستان میں کتنی سستی ملتی ہے۔ بشیر لیزا کو پاکستان سے چرس اور ہیروئن کی اسمگلنگ کی کہانیاں سناتا اور وہ نشے کی جس کیفیت

میں بھی ہوتی ان کہانیوں کو بڑی دلچسپی اور توجہ سے سنتی۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے ویک اینڈ پر ڈنر کے لئے مدعو کرتا وہ غائب ہو گئی۔ ایک شام اسے چرس فراہم کرنے والا اپنے ساتھ دو آدمیوں کو لے کر آیا تھا جو تھوڑی دیر لیزا سے بات کرتے رہے۔ لیزا بہت خوش اور پرجوش نظر آتی تھی۔ وہ ان دونوں کے ساتھ بار سے نکل کر چلی گئی اور پھر واپس نہیں آئی۔ بشیر اگلے کئی ہفتوں تک اس کے آنے کا منتظر رہا لیکن وہ دوبارہ اس بار میں نہیں آئی۔ بار ٹنڈر کا خیال تھا کہ وہ جن لوگوں کے ساتھ گئی ہے' اب واپس نہیں آئے گی' لیکن بشیر کے اصرار کے باوجود اس نے مزید وضاحت نہیں کی۔

پب میں دلچسپی کم ہونے اور خرچ بڑھنے لگا تو بشیر نے ناصر کو تجویز پیش کی کہ وہ پب میں پینے کے بجائے اسٹور سے بیئر خرید کر گھر لے جا کر پئے گا۔ خرچ بھی بچے گا اور بشیر رات کا وہ کھانا بھی گھر میں کھا سکے گا جس کے وہ نواب کو پیسے ادا کرتا ہے۔ ناصر نے منع کرنا چاہا لیکن بشیر نے اسے رضامند کر ہی لیا۔ بشیر کے دلائل وزنی تھے' اس نے ناصر کو سمجھایا کہ وہ اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے پئے گا۔ ناصر نے ہاں تو نہیں کی' لیکن اس کے منع کرنے میں شدت نہیں رہی۔ جمعہ کے روز اس نے ناصر کو بتایا کہ آج وہ بیئر خرید کر گھر لے جائے گا اس لئے ناصر بھی سیدھا گھر آ جائے۔ بشیر کام ختم کر کے بیئر کا کیس لیتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو اسے نواب نظر نہیں آیا۔ شاید وہ ہفتے بھر کا سودا لینے باہر گیا ہوا تھا۔ بشیر نے بیئر کا کیس اپنے کمرے میں رکھا اس میں سے کچھ بوتلیں نکال کر ریفریجریٹر میں جمائیں اور ایک بوتل لے کر نواب کے نہ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگا۔ ناصر گھر میں داخل ہوا تو بشیر نواب کے بستر پر نیم دراز بیئر کی بوتل ہاتھ میں لئے ٹی وی پر کارٹون شو سمپسن دیکھتا ہوا ہنس رہا تھا۔ ناصر کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ بشیر کو بستر سے اٹھنے کے لئے کہنے لگا۔ بشیر ہنستا ہوا اٹھ گیا اور ڈائننگ ٹیبل کے سیٹ کی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ نواب کی چھری کے نیچے بکری بن کر رہنے کے طعنے سنتا ہوا ناصر کپڑے بدلنے کمرے میں چلا گیا۔ اسی وقت نواب ہاتھوں میں سامان کے تھیلے اٹھائے

گھر میں داخل ہوا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا شاید کافی دور سے سامان اٹھائے ہوئے چلتا آ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھے بشیر کو نظر انداز کرتے ہوئے سامان کے تھیلے اس نے زمین پر رکھے اور باتھ روم میں گھس گیا۔ باہر آیا تو اپنی من پسند لنگی اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ بشیر سے پچھلی جھڑپ کے بعد وہ بھی کچھ محتاط ہو گیا تھا اس لئے اس نے بشیر پر زیادہ توجہ نہیں دی ورنہ اس کے ہاتھوں میں بیئر دیکھ کر ریفریجریٹر کھولنے سے پہلے ہی بھڑک اٹھتا۔ سامان رکھنے کے لئے ریفریجریٹر کھولا تو بیئر کی بوتلیں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ ناصر نواب کی چنگھاڑ سن کر کپڑے بدلنے کے بہانے اپنے کمرے میں ہی دبکا رہا۔

"اوئے یہ میری فرج کو گدھی کا موت رکھ کر کس نے پلیت کیا ہے؟" نواب نے چیختے ہوئے بشیر کی طرف دیکھا تو وہ گدھی کے موت والی اس بوتل کو منہ میں لگا کر آخری گھونٹ حلق میں اتار رہا تھا۔

"نواب صاحب یہ میری بوتلیں ہیں ٹھنڈی کرنے رکھی ہیں' میں انہیں ابھی نکال کر اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔" بشیر نے اٹھتے ہوئے بہت ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"کمرے میں نہیں' انہیں نکال کر ابھی کوڑے میں پھینک' یہ مسلمانوں کا گھر ہے' شراب خانہ نہیں ہے۔" نواب کا پارہ مسلسل اوپر کی طرف چڑھ رہا تھا۔

"شراب خانہ نہیں ہے' تو مسجد بھی نہیں ہے۔ تو یہاں بیٹھ کر کونسا روزہ نماز کرتا ہے۔ ویڈیو پر ننگی فلمیں دیکھتا ہے اور مسلمان بنتا ہے۔ میں کرایہ دیتا ہوں' اپنے کمرے میں جو چاہوں گا کروں گا۔" بشیر بھی اپنے اصلی رنگ میں آ گیا تھا۔

"ولد الحرام' نطفہ ناتحقیق' میں دیکھتا ہوں تو اس چھت کے نیچے گدھی کا پیشاب کیسے پئے گا۔" نواب غصے کی ابتدائی حالت میں گالیوں کو فارسی تراکیب سے بھاری بھرکم بنانے کا عادی تھا۔

"واجد علی خان کی ناجائز اولاد' زیادہ بکواس کی تو مونچھیں اکھاڑ کر چوتڑوں پر چپکا دوں گا۔" بشیر نے غصے کے دوران بھی اپنی حس مزاح قائم رکھی تھی۔ ناصر اور

مکان کے دو دوسرے مکین جو رات کو ڈیوٹی پر جانے سے پہلے اپنی نیندیں پوری کر رہے تھے گالیوں کے اس شور شرابے کو سن کر اپنے کمروں سے نکل آئے۔ لیکن بیچ بچاؤ کرنے کے لئے میدان میں اترنے کا وقت نکل گیا تھا۔ نواب فارسی اضافتیں بھول کر خالص گوجرانوالہ کی زبان بولتا ہوا بشیر پر جھپٹا۔ بشیر کو معلوم تھا کہ اگر وہ نواب کی گرفت میں آگیا تو اس کی ہڈیاں پلی جائیں گی اس لئے اس نے نواب کی لنگی کو نشانہ بنا کر ہاتھ مارا۔ نواب کے لئے یہ اس کی زندگی کا سب سے شرمناک منظر تھا۔ اس کی لنگی کھل کر نیچے جا پڑی تھی۔ نواب لنگی کے نیچے انڈرویئر پہننے کی حد تک ترقی یافتہ نہیں ہوا تھا اور اس کا بنیان اس کی توند تک کو ڈھکنے کے لئے ناکافی تھا۔ ننگے نواب کے حملے کا سارا جوش و خروش سکتے کی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ اپنے اپنے کمروں کے دروازے پر کھڑے ہوئے اس کے تین کرائے دار جنہیں وہ اپنے مزارعے سمجھتا تھا منہ کھولے کھڑے تھے۔ یا اپنی بے ساختہ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند سیکنڈ سے بھی کم مدت کا یہ وقفہ اس وقت ختم ہو گیا جب نواب زمین سے دھوتی اٹھا کر اپنے اوزار چھپاتا ہوا باتھ روم کی طرف بھاگا۔ باتھ روم میں اپنی شلوار چڑھا کر باہر نکلا اور کچن سے سبزی کاٹنے کی چھری لے کر بشیر پر جھپٹا۔ اتنا بھاری جسم رکھنے والے کی پھرتی حیرت انگیز تھی۔ بشیر نے اپنے ہاتھوں میں کرسی اٹھا لی تھی اس لئے نواب کی چھری کا وار کرسی نے سہہ لیا۔ اس عرصے میں سکتے میں کھڑے ہوئے تینوں تماش بینوں میں بھی حرکت پیدا ہو گئی تھی اور اس سے پہلے کہ نواب بشیر کی ڈھال بنی کرسی کو اپنے الٹے ہاتھ سے کھینچ کر بشیر کے جسم کا صحیح نشانہ لینے کی کوشش کرتا تینوں جا کر نواب سے لپٹ گئے اور اس سے چھری چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ نواب کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور ناصر کو معلوم تھا جب تک بشیر سامنے ہے نواب کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گا۔ اس لئے وہ بشیر کو دھکے دیتا ہوا گھر سے باہر نکال کر لے گیا۔ ناصر نے باہر جا کر بشیر کے ہاتھ جوڑ لئے کہ وہ اپنا سامان لے کر یہاں سے کہیں چلا جائے۔ ورنہ خون خرابہ ہوا تو وہ سب مارے جائیں گے۔ ناصر گھر کے اندر واپس آیا تو نواب اپنے بستر میں دھنسا اپنا سانس درست کر رہا تھا۔

"اس مادر زنا سے کہنا اس نے گھر میں قدم رکھا یا مجھے شکل دکھائی تو اس کا خون پی جاؤں گا۔ اس کا سامان اور بوتلیں بھی اس کے ساتھ باہر پھینک دو۔"

تینوں نے کمرے میں آخر بشیر کا سامان جمع کیا فرج میں رکھی ہوئی بیئر کی بوتلیں کارٹن میں واپس ڈالیں اور بشیر کو سامان سمیت ایک ٹیکسی میں بٹھا کر روانہ کر دیا۔

اپنی فیکٹری کے قریب ہی واقع ایک سستے سے موٹل میں کمرہ لے کر بشیر دوسرے دن فلیٹ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا وہ اس علاقے سے کہیں دور گھر لینا چاہتا تھا تاکہ نواب کا سایہ بھی نہ پڑ سکے کیرامیٹا میں اسے دو بیڈ رومز کا ایک فلیٹ دکھایا گیا جس کا کرایہ صرف ۱۳۵ ڈالر ہفتہ تھا۔ جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ یہاں مکانوں کے کرائے اور ان کی قیمتیں کم تھیں۔ ایجنٹ نے بتایا کہ وہ اگر سابقہ کرایہ دار سے فلیٹ میں موجود سامان خریدنا چاہے تو بہت سستے میں سودا ہو سکتا ہے۔ ہزار ڈالر میں سودا ہو گیا تھا۔ سودے میں ٹی وی' وی سی آر' ریفریجریٹر' دو بیڈ' لاؤنج روم کا صوفہ' ڈائننگ ٹیبل اور کتابوں کی ایک الماری شامل تھی۔ تمام سامان اچھی حالت میں تھا اس لئے سودا مہنگا نہیں تھا پیر کو قبضہ ملتے ہی بشیر موٹل کے چھوٹے اور بدبودار لیکن مہنگے کمرے سے اپنے فلیٹ منتقل ہو گیا۔

بشیر کا خیال تھا کہ نواب سے اس کا جھگڑا اس کے حق میں مفید ثابت ہوا ہے۔ اسے نسبتاً" مہذب طریقے سے رہنے کے لئے ایک صاف ستھرا فلیٹ میسر آگیا تھا جہاں وہ زندگی اپنی طرح سے گزارنے کے لئے آزاد تھا۔ دوسرے ہی ہفتے اسے دو کرائے دار بھی مل گئے۔ اس نے ان سے پچاس ڈالر ہفتہ لینا طے کیا تھا جس سے فلیٹ کے خرچ کا بوجھ اس کے کاندھے سے اتر گیا تھا۔ دونوں فیکٹریوں میں کام کرتے تھے اور خود اپنی دنیا میں مگن رہنے والے لوگ تھے اس لئے بشیر کو انہیں اپنے ساتھ رکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ خود اس نے نائٹ کلبوں کا چکر لگانا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بھی فلیٹ میں کم ہی نظر آتا۔ وہ جلد ہی کسی لڑکی سے ایسی دوستی کرنا چاہتا تھا جس کا نتیجہ شادی کی شکل میں نکل سکے لیکن اس کی تلاش بار آور ثابت

نہیں ہو رہی تھی۔ لڑکیاں بہت تھیں، لیکن ان کی اکثریت صرف رات گزارنے والی تھی وہ شادی کے جنجال میں پھنسنے کو تیار نہ تھیں۔ بشیر نے پھر بھی اپنی تلاش جاری رکھی تھی۔

نواب سے جھگڑے کے بعد اسے ڈیرہ چھوڑے ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ بشیر کی زندگی اپنے ڈھب پر آ گئی تھی۔ مالی حالت بھی بہتر ہونا شروع ہو گئی تھی، نواب کی طرف سے اطمینان تھا کہ اتنے دن گزرنے پر بشیر کو بھول چکا ہو گا لیکن اس بارے میں ناصر اتنا پر یقین نہیں تھا۔ اس نے بشیر کو بتایا تھا کہ نواب کو اب تک اس کی جگہ کوئی کرایہ دار نہیں ملا ہے۔ سو ڈالر ہفتے کے اس نقصان پر نواب سخت تلملایا ہوا ہے اور اب بھی اسے موٹی موٹی گالیاں بکتا ہے۔ ناصر کے انداز میں تشویش تھی لیکن اس نے اس کا برملا اظہار نہیں کیا۔

ناصر کی تشویش غلط نہیں تھی۔ بشیر ایک دن فیکٹری کے اسٹور میں آنے والا سامان چیک کر رہا تھا کہ دفتر میں کام کرنے والی اس کی شادی شدہ دوست مارتھا ہانپتی ہوئی اس کے پاس آئی اور بتایا کہ امیگریشن والے پولیس کو لے کر دفتر میں آئے ہیں اور اس کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ بشیر کے پاس شکریہ ادا کرنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ اظہار ممنونیت میں اس نے عورت کو لپٹا کر بوسہ لیا اور تیزی سے فیکٹری کے اس دروازے سے باہر نکلا چلا گیا جہاں سے مال لانے والے ٹرک آتے تھے۔ ایک گھنٹے تک گلیوں میں بھٹکنے کے بعد اس نے فیکٹری میں مارتھا کو فون کر کے حالات معلوم کئے۔ مارتھا نے بتایا کہ اس کے نہ ملنے پر منیجر نے امیگریشن والوں کو اس کے گھر کا پتہ دے دیا تھا جس کے بعد وہ چلے گئے تھے۔ مارتھا کو یقین تھا کہ وہ اس کے گھر گئے ہوں گے۔ بشیر نے سر پیٹ لیا۔ اسے گھر فون کر کے احتیاطاً اپنے دونوں کرائے داروں کو خبردار کر دینا چاہئے تھا۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ فیکٹری سے اس کے گھر کا راستہ زیادہ سے زیادہ ۴۵ منٹ کا تھا۔ اس نے پھر بھی فون کا نمبر گھمایا اور دوسری طرف سے سخت آسٹریلین لہجے کی ہیلو سنتے ہی بند کر دیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے دونوں ساتھی دھر لئے گئے ہوں گے۔ اسے اپنی غفلت پر شرمندگی تھی۔

وقت پر کی جانے والی اس کی فون کال اس کے دونوں کرایہ داروں کو بچا سکتی تھی۔

بشیر نے ایک بار پھر مارتھا کو فون کر کے ناصر کو پیغام بھجوایا کہ وہ کام ختم کر کے اس سے پب میں ملے۔ ناصر آیا تو بہت ڈرا ہوا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ بشیر ابھی تک کھلے عام اس پب میں کس طرح بیٹھا ہے۔ ناصر نے بتایا کہ نواب سخت تلملایا ہوا ہے کہ بشیر اس حملے سے کس طرح بچ نکلا۔ ناصر نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس کے فلیٹ سے دونوں لڑکے پکڑے گئے ہیں ساتھ ہی اس نے بشیر کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لئے اس علاقے کے آس پاس نہ آئے۔ اس نے بتایا کہ مارتھا نے یہ پیغام دیا ہے کہ وہ چاہے تو کچھ عرصے کے لئے ملبورن جا کر وہاں اس کے بھائی کے پاس رہ سکتا ہے۔

بشیر نواب سے بدلہ لئے بغیر کہیں جانے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے ناصر کو بتایا کہ وہ اور دوسرے کرائے دار کل ڈیرے سے چلے جائیں کیونکہ وہ صبح امیگریشن فون کر کے نواب کی شکایت کرنے والا ہے۔ ناصر کی سخت منت سماجت کے بعد بشیر اپنا ارادہ بدلنے پر تیار ہوا۔ ناصر نے اسے سمجھایا کہ ڈیرے سے وہ چلے بھی گئے اور صرف نواب گرفتار ہوا تب بھی وہ انتقام لینے ان کی فیکٹریوں کے پتے اور ان میں کام کرنے والوں کے نام بتائے گا اور اگر فیکٹریوں پر چھاپے پڑنے شروع ہو گئے تو دو چار نہیں غیر قانونی طور پر کام کرنے والے بہت سے دوسرے مارے جائیں گے۔ بشیر نے ناصر کی بات مان لی لیکن ساتھ ہی یہ ڈیوٹی بھی لگائی کہ اس پاکستانی وکیل کو جس کے ذریعے ناصر اپنا ریفیوجی کا کیس فائل کروا رہا تھا ان دونوں کی ضمانت کا بندوبست کرنے کے لئے تیار کرے جو بشیر کی وجہ سے مفت میں مارے گئے تھے۔ بشیر نے ناصر کو اپنے فلیٹ کی چابی بھی دی کہ وہ کرونولا میں شیف کا کام کرنے والے اس کے دوست کو پہنچا دے۔ بشیر کو جاننے والوں میں ایک وہی پکا تھا جو امیگریشن والوں کے خوف کے بغیر اس کے فلیٹ میں جا سکتا تھا اور کوئی بندوبست کر سکتا تھا۔

بشیر کوئی ایک مہینے تک ملبورن میں رہا۔ مارتھا کا بھائی نواحی علاقے کے ایک بڑے مکان میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ رہتا تھا۔ مکان میں الگ تھلگ بنا ہوا گیسٹ

روم تھا جو بشیر کو رہنے کے لئے دے دیا گیا تھا۔ بشیر کو کوشش کے باوجود ملبورن میں کوئی کام نہیں مل سکا۔ نہ ہی کوئی ایسی لڑکی مل سکی جو اس کے خوابوں کی تکمیل میں اس کی مددگار ہو سکتی۔ بشیر نے واپس سڈنی آتے ہی ناصر سے رابطہ قائم کیا جو بے چینی سے بشیر کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ناصر نے بتایا کہ حفیظ نے خفیہ طور پر ان سے رابطہ کیا ہے۔ حفیظ وہ لڑکا تھا جو نواب کے ساتھ آیا تھا لیکن اس کے چنگل سے بچ کر نکل گیا تھا اور جس کی جگہ بشیر کرایہ دار کے طور پر رہنے آیا تھا۔ ناصر کے مطابق حفیظ ملبورن یا پرتھ نہیں بھاگا بلکہ سڈنی سے ذرا دور پنرتھ جا کر وہاں کی ایک فیکٹری میں کام کرنے لگا تھا اور اب ترقی کر کے سپروائزر ہو گیا تھا۔ اس علاقے میں دور دور کسی پاکستانی کا وجود نہیں تھا اس لئے وہ بالکل محفوظ تھا۔ وہ ناصر کے پاس یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ اس کی فیکٹری میں نئی مشینیں لگنے کی وجہ سے نوکریاں نکلی تھیں۔ حفیظ کا خیال تھا کہ سب کے لئے نواب سے جان چھڑانے کا یہ بہترین موقع تھا۔ نواب انہیں پنرتھ میں تلاش نہیں کر سکے گا۔ نواب کا واحد مددگار بھی آج کل پاکستان گیا ہوا تھا۔ ناصر نے دوسرے چاروں ساتھیوں سے بات کی تھی وہ بھی تیار تھے اور ایک ایک کر کے فیکٹری میں نوکری کے لئے انٹرویو دے آئے تھے۔ حفیظ کو یقین تھا کہ ان سب کو نوکریاں مل جائیں گی۔ بشیر بھی ناصر سے حفیظ کا پتہ لے کر پنرتھ پہنچ گیا۔ اس نے اسی کام کے لئے درخواست دی جو وہ اس سے پہلے فیکٹری میں کر رہا تھا، فیکٹری آنے جانے والے سامان کی نگرانی اور اندراج کا کام۔ حفیظ نے منیجر سے اس کی بھی پرزور سفارش کی تھی۔ چند دنوں بعد حفیظ نے انہیں اطلاع دی کہ ان سب کی نوکریاں پکی ہو گئی ہیں۔ ناصر اور اس کے چاروں ساتھیوں نے جمعہ کو ڈیرہ خالی کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس روز نواب نماز پڑھنے مسجد جاتا تھا اور واپسی پر شہر کی سیر کرتا اور پھر ہفتے بھر کی خریداری کر کے واپس آتا تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سامان باندھ کر تیار تھے۔ نواب کے گھر سے نکلنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی سب اپنا سامان باہر لے کر نکل آئے اور دو ٹیکسیاں لے کر سینٹرل ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے جہاں سے انہیں پنرتھ کی ٹرین لینی تھی۔ بشیر اور حفیظ دونوں اسٹیشن پر ان کے منتظر تھے۔

پنرتھ پہنچتے ہی بشیر نے امیگریشن کو فون کر کے نواب کی پوری کہانی سنائی' ڈیرے کا پتہ بتایا اور یہ بھی کہ وہ ابھی گھر میں نہیں ہے شام کو واپس آئے گا۔ امیگریشن والوں نے جب کال کرنے والے کا نام اور فون نمبر معلوم کرنے پر اصرار کیا تو بشیر نے فون بند کر دیا۔

دوسرے دن سڈنی کے اخباروں کے صفحہ اول پر نوابی ڈریس میں نواب غلام شبیر کی تصویر چھپی تھی۔ شیروانی' ترکی ٹوپی' ہاتھ میں عصا اور بڑی بڑی تاؤ دے کر اوپر کو اٹھائی ہوئی مونچھیں۔ اس کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے پولیس والے کسی راجہ کے باوردی گارڈز دکھائی دے رہے تھے۔ خبر میں لکھا تھا کہ امیگریشن نے کسی نامعلوم شخص کی شکایت پر چھاپہ مار کر اس شخص کو گرفتار کیا ہے جو خود کو نواب اور پاکستان کا بڑا جاگیردار بتاتا ہے اور جس نے نواب کا پورا لباس پہنے بغیر پولیس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ خبر میں شکایت کی تفصیل درج تھی کہ نواب بن کر اس نے آسٹریلیا سے گھوڑے خریدنے کے بہانے بارہ آدمیوں کو سائیس ظاہر کر کے ان کے ویزے لگوائے اور اب سڈنی میں غلاموں کی طرح انہیں اپنے پاس رہنے پر مجبور کر کے بلیک میل کر رہا تھا۔ نواب نے امیگریشن کو جوابی بیان دیا تھا کہ وہ گھوڑے خریدنے آسٹریلیا آیا تھا لیکن اس کے ساتھ آنے والے سائیس اسے دھوکہ دے کر بھاگ گئے جس کی وجہ سے وہ گھوڑے نہیں خرید سکا اور آسٹریلیا سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے مقامی مدد بھی حاصل نہیں کر سکا۔ نواب نے امیگریشن سے کہا تھا کہ وہ اسے بارہ آدمیوں کو پاکستان سے آسٹریلیا لانے کے لئے مزید ویزے دے تاکہ وہ اس دفعہ صحیح سائیس بلوا کر گھوڑے خریدنے کا کام مکمل کر سکے۔

تین دن بعد اخبار کے اندر کے صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ آسٹریلیا سے گھوڑے خریدنے کے لئے آنے والے نواب کو اپنے ویزے کی مدت سے زیادہ عرصے تک ٹھہرنے کے جرم میں ملک سے نکال دیا گیا ہے۔ ملک سے نکلتے ہوئے نواب نے بیان دیا تھا کہ وہ اپنے خلاف آسٹریلیا کی حکومت کے اس برتاؤ پر بہت ناراض ہے اور اب وہ آسٹریلیا کبھی نہیں آئے گا بلکہ اپنے فارم کے لئے گھوڑے

کسی یورپی ملک سے خریدے گا۔ بشیر نے خبر پڑھ کر سوچا نواب بالکل ہی احمق نہیں تھا۔ اس نے ناصر اور اس کے کسی ساتھی کے بارے میں کچھ نہ بتا کر اپنی کھال بچائی تھی۔ وہ سب اس کے اپنے شہر کے لڑکے تھے اگر اس کی شکایت پر امیگریشن والے انہیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے تو ان کے خاندان والے نواب کو گوجرانوالہ میں رہنے نہیں دیتے۔ کچا چبا جاتے۔

نواب کا قصہ ختم ہونے کے بعد بشیر کچھ عرصے کے لئے کام کرنے پر جت گیا۔ لیکن جمعہ کو کام سے آتے ہی سڈنی چلا جاتا اور رات گئے تک کنگز کراس کے علاقے میں آوارہ گردی کرتا۔ کنگز کراس سڈنی کا وہ علاقہ تھا جہاں راتیں جاگتی تھیں پورا علاقہ نائٹ کلبوں، ہوٹلوں، شراب خانوں اور ننگے ناچ گھروں سے بھرا ہوا تھا۔ سیاحوں کے غول کے غول علاقے کی گلیوں میں گھومتے اور ڈالر لٹا کر اپنا شوق پورا کرتے۔ یہ علاقہ طوائفوں، منشیات فروشوں اور منشیات کے عادی مرد و عورتوں کی جنت اور دوزخ سب کچھ تھا۔ بشیر کو کنگز کراس کے شراب خانوں کی رونق بہت پسند تھی۔

جمعہ کی ایک ایسی ہی رات جب بلیز کارنر کی رونق اپنے عروج پر تھی بشیر کو لیزا نظر آئی وہ دروازے کے پاس بیئر کا گلاس ہاتھ میں لئے ہوئے ہمیشہ کی طرح اکیلی کھڑی تھی۔ بشیر رش میں سے راستہ بناتا ہوا اس کی طرف بڑھا لیکن لیزا کسی کے اشارے کا جواب دیتی ہوئی ٹائلٹس کی طرف چلی گئی۔ بشیر ٹائلٹ کے دروازے کے باہر جم گیا۔ وہ لیزا کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ لیزا جانے کیوں اسے آج بھی امید کی کرن بنی نظر آئی تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ لیزا کو یاد رہا ہو گا لیکن ٹائلٹ سے لیزا کے باہر نکلنے پر جب اس نے پرجوش ہائے کہی تو لیزا بھی "ہائے بیش" کہہ کر بہت گرمجوشی سے اس سے لپٹ پڑی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس لئے بات کرنا مشکل تھی۔ لیزا بشیر کا ہاتھ پکڑے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔ یہاں بھی بار کا کاؤنٹر تھا جس پر رش نہیں تھا۔ موسیقی کی آواز بھی مدہم تھی اور تاریک گوشوں میں پڑی ہوئی کئی میزیں خالی تھیں۔ دونوں کونے کی ایک میز پر جم گئے۔ لیزا نے چرس کا سگریٹ سلگاتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ غائب نہیں ہو گئی تھی بلکہ منشیات فروشوں کے نیٹ

ورک میں اسے بھی ایجنٹ کے طور پر قبول کر لیا گیا تھا اور وہ چرس کی پڑیاں بیچنے کا کام کرتی تھی۔ لیکن پچھلے دنوں علاقے کا ایک بڑا سپلائر پکڑا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا سپلائی نیٹ ورک ٹوٹ گیا جس کے نتیجے میں لیزا بھی بیکار ہو کر آج کل پیسے سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ لیزا نے بتایا کہ آج اس کا یہ پہلا سگریٹ ہے جو ابھی ابھی اس نے پانچ ڈالر میں خریدا ہے۔ بشیر کو معلوم تھا کہ لیزا کے لئے ایک سگریٹ اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح تھا۔ بشیر نے اسے بیس ڈالر دیئے کہ وہ مزید سگریٹ خریدے لیکن یہ معذرت بھی کہ وہ اس کے ساتھ شریک نہیں ہو سکے گا کیونکہ اسے پنرتھ جانا ہے۔ اس کی آخری ٹرین نکل گئی تو پھر وہ صبح تک کے لئے پھنس جائے گا۔

"تم میرے گھر چل کر سو سکتے ہو۔ میرے ساتھ آج کل کوئی نہیں ہے' میں اکیلی رہتی ہوں۔" لیزا کی دعوت نے اسے حیران کر دیا۔

"کیا واقعی۔" بشیر کو یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں واقعی!" لیزا نے کہا اور وہ بیس ڈالر لے کر چرس خریدنے چلی گئی۔ بشیر سے اس کی خوشی چھپ نہیں رہی تھی۔ اسے یقین ہو رہا تھا کہ لیزا اس کے امیگریشن کی لاٹری ثابت ہو گی۔ لیزا بیس ڈالر میں پانچ سگریٹ اور لے آئی۔ بشیر نے سگریٹوں کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ بیئر پیتا رہا اور پاکستان کے شمالی علاقوں کی ان پراسرار زمینوں کی کہانیاں سنا کر لیزا کو للچاتا رہا جہاں چرس بنتی اور کوڑیوں کے بھاؤ ملتی تھی۔

"بیش مجھے وہاں لے کے چلو۔ میں ان فضاؤں میں سانس لینا چاہتی ہوں جہاں پاپی اگتی ہے میں ان کھیتوں میں رات رات بھر ناچوں گی اور دن ہوتے ہی کسی چٹان پر آزادی کا مجسمہ بن کر کھڑی ہو جاؤں گی۔ تم میرے جسم پر چرس کا لیپ کر دینا پھر کوئی خطرناک آدمی مجھے گولی مار دے گا۔ میں اسی طرح چٹان کا حصہ بنی کھڑی رہ جاؤں گی۔ ہمیشہ کے لئے امر ہو جاؤں گی تم میری پوجا کرنا میرے گرد رباب بجاتے ہوئے رقص کرنا اور آزادی کے نغمے الاپنا۔ سچ مچ کی آزادی کے نغمے۔ بندشوں میں جکڑی اور زنجیروں میں بندھی ہوئی آزادی کے نہیں۔ سچ مچ کی آزادی کے نغمے۔ سچ مچ کی آزادی کے نغمے۔" آہستہ آہستہ لیزا کی آواز ڈوبنے لگی' اس کی آنکھیں بند ہو گئیں

اور وہ سچ مچ کی آزادی کے جھولے میں ٹنگی ہوئی جھولنے لگی۔ بشیر نے نظر اٹھا کر دیکھا تو لیزا سارے سگریٹ پی کر ختم کر چکی تھی۔ بشیر کو بھی نشہ چڑھنے لگا تھا۔ اس نے لیزا کو ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ نیچے وہی موسیقی کا شور اور رقص کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ بشیر لیزا کو کھینچ کر رقص کرنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ لیکن لیزا پر اس وقت آزادی کا بھوت سوار تھا وہ بشیر کو واپس کھینچنے لگی۔

"یہاں نہیں مجھے وہاں لے چلو جہاں آزادی اگتی ہے۔ جہاں آزادی کوڑیوں کے بھاؤ ملتی ہے۔ میں سچ مچ کی آزادی خریدوں گی۔ پانچ ڈالر میں ایک بیس ڈالر میں پانچ۔" لیزا اسی طرح بڑبڑاتی رہی۔ بشیر اسے لے کر باہر نکل آیا اور برابر کے ایک تھائی ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ اسے معلوم تھا کہ لیزا بھوکی ہو گی۔ چرس کے بعد بھوک کھل کے لگتی ہے خود اسے بھی بھوک لگی تھی۔ کھانا کھا کر لیزا کافی ٹھیک ہو گئی۔ صبح کے چار بج گئے تھے دونوں ٹیکسی پکڑ کر لیزا کے گھر آ گئے۔ ایک کمرے کا فلیٹ تھا جس میں ایک ہی بیڈ تھا۔ دونوں کپڑے اتار کر بستر پہ گر گئے لیکن چرس اور شراب نے دونوں کی جلد کو اتنا بے حس کر دیا تھا کہ بہت دیر کی ورزش کے بعد بھی اتصال کے ختم ہونے کی گھنٹیاں نہیں بج سکیں اور دونوں اسی طرح ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے سو گئے۔ آنکھ کھلی تو ان کی حسیات بھی جاگ گئی تھیں۔ رات ختم نہ ہو سکنے والے کام کو پورا کر کے وہ ایک بار پھر سو گئے' دوبارہ اٹھے تو دوپہر کے دو بجے تھے بھوک کے مارے دونوں کا برا حال تھا۔ نہا دھو کر ایک نزدیکی ریسٹورنٹ میں گئے کھانا کھانے کے دوران لیزا نے بشیر کو ایک بار پھر حیران کر دیا۔

"میں نے کل نشے میں نہیں کہا تھا۔ مجھے واقعی پاکستان جانا ہے اور مجھے تم پاکستان لے کر چلو گے۔ جو کہانیاں تم سناتے ہو میں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اپنا خرچ بھی میں خود برداشت کروں گی۔" لیزا کے لہجے میں بہت سنجیدگی تھی۔

"تمہیں مجھ سے شادی کرنی پڑے گی۔ شادی کے بغیر گئے تو شاید تمہیں چھوڑ دیں لیکن مجھے سنگسار کر دیں گے۔" بشیر نے مذاق میں ہنستے ہوئے کہا۔

"تو چلو کل ہی شادی کر لیتے ہیں۔ اتوار کو ہر چرچ میں عبادت ہوتی ہے' کوئی بھی پادری ہماری شادی کی رسم پوری کر دے گا۔" لیزا نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

"تم کیا واقعی سنجیدہ ہو۔" بشیر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بالکل اور قطعی سنجیدہ" لیزا نے اپنا بچا ہوا کھانا دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن کس چیز میں۔ شادی میں یا پاکستان جانے میں۔" بشیر نے وضاحت چاہی۔

"پاکستان جانے میں۔" لیزا نے سچائی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "شادی میرے لئے کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ میں کسی کے ساتھ شادی کے بغیر بھی رہ سکتی ہوں اور شادی کر کے اگر نہیں رہنا چاہوں تو مجھے کوئی زبردستی ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ میرے لئے شادی کاغذ کا ایک پرزہ ہے۔ اگر کسی کام کے لئے یہ پرزہ ضروری ہے تو اسے لینے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میرے لئے یہ ایسا ہے جیسے پاسپورٹ بنوانے' ویزا لگوانے یا بینک اکاؤنٹ کھلوانے کے لئے فارم بھرنا۔" لیزا نے کھانا ختم کر کے سگریٹ سلگا لی تھی۔

"لیکن شادی میرے لئے ایک اہم ضرورت ہے۔ میں کل شادی کر کے تمہیں پرسوں پاکستان نہیں لے جا سکتا۔ میں آسٹریلیا میں غیر قانونی طور پر رہتا ہوں' شادی کر کے مستقل شہریت کی درخواست دوں گا' کئی مہینے لگ سکتے ہیں۔" بشیر نے بھی اپنا سگریٹ سلگاتے ہوئے اسے صاف صاف بتا دیا۔

"میں انتظار کر لوں گی۔ اب اٹھو اور اس سے پہلے کہ دکانیں بند ہو جائیں میرے لئے انگوٹھی خریدو تاکہ کل صبح کسی پادری کے سامنے زندگی بھر ساتھ نباہنے کا عہد کر سکیں۔" لیزا نے بشیر کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

لیزا کے محلے میں واقع روسی چرچ کے پادری نے اگلی صبح بہت حیران ہو کر انتہائی سادہ طریقے سے ہونے والی اس شادی کی رسم انجام دی۔ ناصر اور حفیظ گواہ تھے۔ انہیں بشیر نے رات ہی فون کر کے صبح آنے کا بلاوا دے دیا تھا۔ شادی کے

اگلے روز پیر کو بشیر اپنی نوکری چھوڑ کر اور سامان لے کر لیزا کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ لیزا نے شادی سے پہلے ہی بشیر کو بتا دیا تھا کہ نوکری اسے چھوڑنا پڑے گی۔ وہ بے روزگاروں کو ملنے والے ہاؤسنگ کمیشن کے فلیٹ میں رہتی اور بے روزگاری الاؤنس وصول کرتی تھی۔ میاں بیوی میں سے کوئی بھی نوکری کر کے کماتا ہو تو بے روزگاری الاؤنس بند ہو جاتا اور فلیٹ کا کرایہ بھی بڑھ جاتا۔ اس نے بشیر کو سمجھایا تھا کہ اسے دن بھر اپنا جسم کوٹ کر محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بشیر کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے بھی ایسی ہی زندگی کے خواب دیکھے جس میں راتیں مدہوشی کے عالم میں حسینوں کے ساتھ رقص کرتے ہوئے اور دن آرام میں گزریں۔ ایسی زندگی کے خواب جس میں کام کا' محنت کا کوئی تصور نہ ہو۔ ناصر اور حفیظ نے بشیر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن بشیر لیزا کو شادی کی انگوٹھی پہناتے ہی ایک مختلف آدمی بن گیا تھا۔ اس نے پرتھ اور وہاں رہنے والے دوستوں کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہا اور لیزا کے گھر سامان رکھنے کے بعد مستقل شہریت کی درخواست دائر کرنے سیدھا امیگریشن کے دفتر پہنچ گیا۔

بشیر کو یہ بہت دیر سے معلوم ہوا کہ کنگز کراس کے نائٹ کلبوں کی زندگی صرف بے روزگاری الاؤنس کے ذریعے نہیں گزاری جا سکتی بلکہ اس کے لئے بہت کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس وقت تک اسے نئے طرز زندگی کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ وہ زندگی کے اس چلن کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔

بشیر کی الف لیلوی داستان سنتے سنتے شام ہو گئی۔ بشیر بھی گھڑی میں وقت دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اندھیرا ہونے کے باوجود آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا لیا تھا' سلیم نے بھی اپنا بیگ کندھے پر ڈالا۔ دونوں یونیورسٹی کے بار کی سیڑھیاں اتر کر یونیورسٹی کے مرکزی دروازے سے باہر نکل آئے۔ بشیر نے ایک بار پھر سلیم کو تسلی دی کہ کبھی بھی ضرورت پڑنے پر وہ اسے فون کرنے سے نہ ہچکچائے اور خدا حافظ کہہ کر ٹیکسی کو روکنے لگا۔ سلیم آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اپنے بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گیا۔

راہوں میں مصلحت کے کئی پیچ تھے مگر
دار و رسن کا راستہ سیدھا لگا مجھے

9

سڈنی ۱۹۹۵ء

پچھلے پورے ہفتے سے سڈنی کا موسم بہت بجھا بجھا سا تھا۔ بارش کی جھڑی لگی رہی تھی اور سخت سردی کی لہر آئی تھی۔ سڈنی والوں نے سخت بارش اور سردی کو صلواتیں سنا کر اپنا ویک اینڈ گھر میں بند ہو کر گزارا تھا۔ لیکن پیر کی صبح بڑا حسین موسم لے کر طلوع ہوئی۔ سورج پوری آب و تاب سے نکلا تھا۔ ہوائیں بھی تھمی ہوئی تھیں۔ سلیم دھوپ کھاتا ہوا بڑے خوشگوار موڈ میں یونیورسٹی پہنچا۔ ڈپارٹمنٹ کی سیکریٹری نے اسے دیکھتے ہی پیغام دیا کہ وہ دو بجے پروفیسر وہائٹ سے ملے' اہم معاملہ ہے۔ سلیم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اسے باہر کی طرح اندر کا موسم بھی خوشگوار لگنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے لئے نیا سپروائزر ڈھونڈ لیا گیا ہے اور پروفیسر وہائٹ نے اسے یہ خوشخبری سنانے کے لئے بلایا ہے۔ دو بجنے میں ابھی چار گھنٹے

باقی تھے، سلیم اپنی مسکراہٹیں اچھالتا ہوا پوری یونیورسٹی میں گھومتا رہا۔ اسٹیمس کیفے میں کافی پی کر وہاں تاش کھیلنے والوں کی میز پر بابی کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایوان سے اپنے گالوں پر بوسہ بھی لے آیا۔ ایوان کے بوسے سے اب سلیم کے چہرے پر شفق کے رنگ نہیں لہراتے تھے۔ نہ اسے دیکھ کر بلی اور اپنے کولہے کی خراشیں یاد آتی تھیں۔ ایوان اور بابی کی دوستی ابھی تک قائم تھی بس ان کے منصوبے بدل گئے تھے۔ امریکہ جانے کا ارادہ انہوں نے کئی سالوں کے لئے ترک کر دیا تھا۔ بابی کو یونیورسٹی میں ٹیوٹر کی مستقل نوکری اور جز وقتی طور پر پی ایچ ڈی کرنے کے لئے داخلہ بھی مل گیا تھا۔ ایوان اگلے سیشن میں اپنی ماسٹرز کی تھیسس جمع کرانے والی تھی جس کے بعد بابی کی طرح وہ بھی پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اسے بھی یونیورسٹی میں ٹیوٹر کی نوکری مل جائے گی۔ اس نے سلیم کو بتایا تھا کہ وہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد بھی اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھے گی۔ اس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر اس کے نام کے ساتھ جڑ کر بہت مضحکہ خیز لگے گا۔ اس کی پوری شخصیت کو بدل دے گا۔ ادب ہو یا فلسفے کا، ڈاکٹر کے نام کے ساتھ ہی دواؤں کی نفرت انگیز بو اس کے نتھنوں میں گھسنے لگتی تھی۔ ایوان کا یہی کمال تھا۔ وہ بہت دور انجانے مستقبل میں سیر کرنے پہنچ جاتی تھی۔ خوابوں کو سچ مچ سمجھ کر زندگی کا حصہ بنا لیتی اور وہ جب ٹوٹتے تو خود بھی بکھر جاتی۔

سلیم جب دو بجے پروفیسر وہائٹ سے ملنے پہنچا تو پروفیسر کافی دیر تک اس کے ذاتی احوال پوچھتا رہا۔ سلیم کو حیرت ہوئی کیونکہ پروفیسر وہائٹ بہت مصروف شخص تھا، وہ غیر ضروری باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس وقت جو بات اسے کہنی تھی وہ کرنے سے پہلے شاید خود کو تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلیم کا معدہ کروٹیں لینے لگا تھا۔ پروفیسر وہائٹ نے جب مطلب کی بات شروع کی تو سلیم کو ایسا لگا جیسے ایٹم بم بنانے کے لئے ہونے والے سارے دھماکے اسی کے سر میں گونج رہے ہوں۔ اسے پروفیسر کے لہجے کی شرمندگی کو محسوس کرنے کا ہوش نہیں تھا جو ذرا جھجکتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے ہم تمہارے لئے سپر وائزر تلاش نہیں کر سکے' نہ ہی اگلے کسی نزدیکی سیشن میں اس کا امکان ہے۔ ہمارا بجٹ محدود کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ہمیں اپنے وسائل میں کمی کرنی پڑی ہے۔ تم اپنی ماسٹرز کی ریسرچ کو جاری نہیں رکھ سکو گے اور اگلے سیشن میں تمہیں اپنی ریسرچ کے لئے کوئی نیا موضوع ڈھونڈنا پڑے گا۔ اس کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ نئے سیشن سے تمہارا اسکالر شپ بند ہو جائے گا۔ تمہارے اسکالر شپ کی گرانٹ اسی ریسرچ میں مدد دینے کے لئے تھی جس میں تم کام کر رہے تھے۔ نئے اسکالر شپ کے لئے تمہیں نئے سرے سے درخواست دینی ہو گی۔ اگر تمہیں اسکالر شپ مل گیا تو تم اگلے سال کے پہلے سیشن سے اپنا ماسٹرز دوبارہ شروع کر سکتے ہو۔ لیکن یہ اسکالر شپ صرف یونیورسٹی کی فیس ادا کرے گا۔ اپنے اخراجات کے لئے تمہیں کام کرنا پڑے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے لئے ٹیوٹر یا ریسرچ اسسٹنٹ کی جز وقتی ملازمت کا بندوبست کر دیا جائے۔"

پروفیسر نے بات ختم کر کے ایک گہرا سانس لیا۔ لیکن سلیم کا سانس تو بہت دیر سے ایک جگہ رکا ہوا یوگا کی مشق کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے جیسے کسی نے اس کا سارا رنگ نچوڑ لیا تھا۔ حلق سے آواز بھی بہت مشکل سے نکل پائی تھی۔

"اسکالر شپ کے بغیر اگلے سیشن تک چھ سات مہینے کیسے گزاروں گا۔ میرے پاس تو کوئی نوکری بھی نہیں ہے۔" سلیم نے پروفیسر کی طرف بڑی بے چارگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نوکری کیلئے تمہیں یونیورسٹی سے باہر ہی کوشش کرنی پڑے گی۔ اس سیشن میں تمہیں ٹیوٹر کی کوئی نوکری نہیں دے سکوں گا۔ میرا بجٹ ختم ہو چکا ہے۔ دو جز وقتی ٹیوٹر مجھے پہلے ہی نکالنے پڑے ہیں۔ ایڈمنسٹریشن سے میں نے معلوم کیا تھا تمہارا ویزا اگلے سال مارچ تک کے لئے کارآمد ہے' اس لئے تمہیں یہاں رہنے میں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ اسکالر شپ مل جانے کے بعد داخلہ لینے کی صورت میں تمہارا ویزا خود بخود بڑھوا دیا جائے گا۔"

پروفیسر کی بات ختم ہونے کے بعد سلیم کے پاس کہنے یا پوچھنے کے لئے اب کچھ

نہیں تھا۔ وہ بہت آہستہ سے اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے واپس جانے لگا۔ پروفیسر اسے تسلی دینے اس کے پیچھے دروازے تک آیا تھا۔

"مجھے افسوس ہے۔ مجھے واقعی افسوس ہے۔ لیکن تم مایوس نہ ہونا اسکالر شپ کے لئے درخواست ضرور جمع کرانا۔ میں وعدہ نہیں کر سکتا اسکالر شپ دینے کا اختیار اکیڈمک بورڈ کے پاس ہے، لیکن یقین رکھو کہ میں تمہارے لئے پوری کوشش کروں گا۔" پروفیسر وہائٹ کا اظہار افسوس اور یقین دہانیاں اسے اشتعال دلا رہی تھیں لیکن وہ کسی غصے یا تاثر کا اظہار اور کوئی رسمی شکریہ ادا کئے بغیر خاموشی سے کمرے سے نکل آیا۔ یونیورسٹی اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ وہ اس وقت اس ماحول سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ یونیورسٹی سے باہر نکل کر وہ آہستہ آہستہ قدموں سے کوجی کے ساحل کی طرف چل دیا۔ اس کے گھر کے قریب ہی واقع یہ ساحل ایک ایسی مانوس جگہ تھی جہاں کچھ دیر تنہا بیٹھ کر وہ سوچ بچار کر سکتا تھا۔

ساحل پر گہما گہمی نہیں تھی۔ بادل کے ایک آوارہ ٹکڑے نے سورج کا چہرہ چھپا دیا تھا، ہوا کے جھونکے تیز اور زیادہ ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ سلیم کے جسم میں ہلکی سی کپکپی پیدا ہو گئی۔ لیکن بڑھتی ہوئی خنکی سے اس طوفان میں ٹھہراؤ آگیا جو اس کے دل و دماغ کو تہہ و بالا کئے ہوئے تھا۔ وہ اپنا جسم سکیڑ کر ساحل کے کنارے بنی ہوئی منڈیر پر بیٹھ گیا۔

سلیم نے ساحل سے ذرا دور پانیوں میں ابھرے ہوئے اس چھوٹے سے گول ٹیلے کو دیکھا جو ویڈنگ کیک آئی لینڈ کہلاتا تھا۔ اس جزیرے سے ایک چھوٹی سی دکھ بھری کہانی منسوب تھی۔ ایک مہم جو جوڑا شادی کے دن ہوا بھر کر پھلائی جانے والی پلاسٹک کی بوٹ پر سوار ہو کر اس ویران ٹیلے تک پہنچا تھا۔ چاندنی رات تھی انہوں نے اپنی شادی کی پہلی رات کو اسی جزیرے پر یادگار بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ چھوٹا سا خیمہ گاڑ کر اس میں اپنے حجلہ عروسی کو سجایا اور وہیں شادی کا کیک کاٹا تھا۔ دنیا کے شور اور آلودگی سے پاک فضا میں ایک دوسرے کو اپنی آغوش میں انہوں نے لیا ہی ہو گا کہ ایک اونچی موج ان کے خیمے کو اکھاڑ کر لے گئی۔ شاید ان کے قدم بھی کائی سے

چکنی ہو جانے والی سطح پر نہ جم سکے اور وہ بھی پیچھے سے آتی ہوئی ایک اور بے رحم موج کا نشانہ بن گئے۔ دونوں ماہر پیراک تھے اور ویڈنگ کیک آئی لینڈ ساحل سے اتنا دور نہیں تھا۔ وہ کوشش کر کے کنارے پر پہنچ سکتے تھے لیکن چاندنی نے موجوں کو پاگل کر دیا تھا۔ دوسرے دن صبح ان کی لاشیں ساحل پر پڑی ہوئی ملیں۔ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے نوبیاہتا جوڑے کو سمندر نے اپنی دنیا سے باہر پھینک دیا تھا۔ اس حادثے کے بعد اس جزیرے پر جانا ممنوع ہو گیا تھا۔ سلیم نے سوچا اگر وہ ماہر پیراک ہوتا تو اس وقت آئی لینڈ پر جا بیٹھتا اور کسی مداخلت کے بغیر اپنی سوچوں کے تانے بانے بنتا۔ ایک دوسرے کے ہونٹ اور زبان چوستا ہوا جوڑا، کوڑے دانوں میں المونیم کے ڈبے تلاش کرتا ہوا بڈھا، نشے میں لہراتا ہوا نوجوان اور یخ پانی میں نہاتے ہوئے جیالے، سلیم کی سوچوں کو بار بار بھٹکا رہے تھے اس کی سوچوں کو مکمل تنہائی چاہیے تھی۔ اسے آج گھر جانے سے پہلے فیصلہ کر لینا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

سلیم کی ہر سوچ اسے ایک ہی راستے پر لے کر جا رہی تھی۔ پاکستان واپسی کا راستہ۔ اس سے پہلے کہ سردی اور اندھیرا بڑھ کر ساحل کو بالکل ویران کر دیتا وہ فیصلہ کر کے گھر واپس چل دیا۔ وہ کل ہی جا کر اپنی سیٹ بک کرائے گا اور واپس چلا جائے گا۔ فیصلے پر پہنچ کر سلیم نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا۔ احمد کچن میں کھانا پکانے کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ آج کھانا پکانے کی باری اس کی تھی۔ میز پر ڈاک رکھی تھی جس میں ایک خط سلیم کے نام بھی تھا۔ وہ اپنے خالو کی بہت مانوس سی تحریر لفافے پر لکھے پتے سے پہچان گیا۔ اسے سخت حیرت ہوئی۔ صدیقی صاحب نے اسے کبھی خط نہیں لکھا تھا۔ جس طرح کم بولتے تھے اسی طرح وہ بے ضرورت خط لکھنے کے بھی قائل نہیں تھے۔ خط کھول کر پڑھتے ہوئے اس کے دماغ میں ایٹمی دھماکوں کی وہ گونج پھر شروع ہو گئی جو آج دوپہر پروفیسر وہائٹ کے دفتر میں اس کی باتیں سن کر ہوئی تھی۔

صدیقی صاحب کا بیٹا نعیم صدیقی جو سلیم کے گھر میں اس کی امی کے ساتھ رہتا تھا گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وہ مہاجر قومی موومنٹ میں سرگرم تھا اور پولیس نے اسے

دہشت پسند سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام میں پکڑا تھا۔ رات میں گھر کو چاروں طرف سے گھیر کر چھاپہ مارا تھا۔ دروازے توڑ کر اندر گھسے تھے اور نعیم کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ سلیم کی امی روتی اور چیختی رہ گئیں تھی۔ سلیم کی خالہ کو جب معلوم ہوا تو وہ پلنگ سے لگ گئی تھیں۔ بہت صبر کرنے والی خاتون تھیں منہ سے کچھ نہیں بولیں' لیکن دل پر اثر ہوا تھا۔ صدیقی صاحب جو اپنے کسی کام کے لئے زندگی بھر کسی کے در پر نہیں گئے اب اپنے تعلقات کے لوگوں کو تلاش کر کے بیٹے کی رہائی کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ یہ بھاگ دوڑ وہ بیٹے کے لئے نہیں اپنی بیوی کے لئے کر رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ نعیم نے جو راستہ اختیار کیا تھا اس کے نتائج کا اس کو علم تھا اس لئے اسے ان نتائج کو خود بھگتنا چاہئے۔ سلیم کی خالہ نے اپنے میاں سے زندگی بھر کچھ نہیں کہا' کچھ نہیں مانگا' لیکن اب انہیں وہ ان نظروں سے دیکھتیں جیسے زندگی بھر وہ انہیں معاف نہیں کریں گی۔ ان نظروں سے بچنے کے لئے صدیقی صاحب بھاگ دوڑ پر مجبور تھے۔ صدیقی صاحب نے لکھا تھا کہ انہوں نے قریشی سے بات کی ہے۔ قریشی ایک بااثر بیوروکریٹ ہے' وہ خود کسی منسٹری میں ہو اس کے تعلقات ہر جگہ ہیں۔ پھر وہ کام کرانے کا طریقہ بھی جانتا ہے۔ قریشی نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ معاملات ٹھنڈے ہوتے ہی ہوم سیکریٹری سے کہہ کر نعیم کو رہا کروا دے گا۔ لیکن قریشی نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ نعیم کو رہا ہوتے ہی ملک سے باہر بھجوا دیں کیونکہ قریشی کا خیال تھا کہ ان کا بیٹا مانے گا نہیں' دوبارہ اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو جائے گا اور پھر پکڑا جائے گا یا تشدد کا نشانہ بن کر مارا جائے گا۔ صدیقی صاحب جانتے تھے' انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ نعیم سننے والا نہیں ہے' پھر بھی انہوں نے قریشی کے مشورے پر اعوان سے بات کی تھی جو ان دنوں کلچرل سیکریٹری تھا۔ اعوان نے صدیقی صاحب سے کہا تھا کہ اس کے جاپان کے سفارت خانے میں اچھے تعلقات ہیں۔ وہ نعیم کو جاپان کا ویزا دلوا دے گا۔

یہ حالات ایسے تھے کہ سلیم کو پاکستان جانے کے لئے اور جلدی کرنی چاہئے تھی۔ اس کے گھر والوں کو اس بحرانی دور میں اس کی سخت ضرورت ہو گی۔ لیکن

صدیقی صاحب نے آخر میں جو کچھ لکھا تھا اور ان کے خط کے ساتھ جو دو اور خط تھے انہوں نے سلیم کے فیصلے کو نفی کر دیا۔ صدیقی صاحب نے لکھا تھا کہ سلیم کراچی واپس آنے کے بارے میں سوچے بھی نہیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ واپسی پر نوکری تو کیا زندگی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ وہ کمپنی جس میں سلیم کام کرتا تھا اپنا پروجیکٹ مکمل کر کے کراچی سے ہجرت کر گئی تھی' باقی سارے منصوبے دھرے کے دھرے پڑے تھے' شہر مہینے میں پندرہ دن بند رہتا تھا۔ سلیم کے خالو نے لکھا تھا کہ تمام گھر والوں کا یہ اصرار ہے کہ سلیم اپنی ڈگری لینے کے بعد وہیں مستقل ہونے کی کوشش کرے۔ ایک چھوٹا سا خط اس کی ماں کا بھی منتھی تھا۔ انہوں نے کوئی دلیل دینے کی کوشش نہیں کی تھی صرف حکم جاری کیا تھا کہ سلیم موت کے اس شہر کا رخ نہ کرے ساتھ ہی یہ دھمکی بھی تھی کہ اگر وہ واپس آیا تو اپنی ماں کا مرا ہوا منہ دیکھے گا۔ ایک تیسرا خط بھی تھا اس کا نفس مضمون بھی یہی تھا۔ بلکہ اس میں صورت حال کو تمام جزئیات کے ساتھ تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔

سلیم بستر پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کا سر اور اس کے ساتھ اسے سارا کمرہ گھومتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ احمد اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر اس کی طرف آیا۔

"برادر کیا ہوا۔ خیریت تو ہے۔" احمد نے بہت پریشان لہجے میں اس سے پوچھا۔ سلیم اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کی سوچ کے ساتھ اس کی زبان بھی گنگ تھی۔ صرف چھٹی حس بیدار تھی جو اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ آج کا صرف ایک دن اس کی زندگی کو مستقبل کی طرف جانے والے ہر راستے کو بدل دینے والا ہے۔ احمد سکتے کی کیفیت میں بیٹھے ہوئے سلیم کے لئے پانی لے کر آیا۔ ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کرنے کے بعد اس کا پیمانہ چھلک پڑا۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو امڈ امڈ کر آ رہا تھا۔ وہ دیر تک روتا رہا۔ سلیم کا رونا کم ہوا اور ہچکیاں تھمیں تو اس نے احمد کو آج کے دن گزر جانے والے ان طوفانوں کا ذکر سنایا جو اس کی زندگی کے تمام منصوبوں اور فیصلوں کو تنکوں کی طرح اڑا کر لے گئے تھے۔ یونیورسٹی میں جو کچھ ہوا تھا وہ احمد کے

لئے نیا نہیں تھا وہ خود اس بحران سے گزر رہا تھا ساتھ ہی ایسی کئی اور کہانیوں سے واقف تھا۔ لیکن جب سلیم نے نعیم کی گرفتاری اور اس کے گھر والوں پر جو گزر رہی ہے اس کا ذکر کیا تو احمد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ سلیم کی آنکھیں بھی ایک بار پھر ڈبڈبانے لگیں۔

"میری خالہ تو اٹھ کر چل نہیں سکتیں۔ بیٹے کے غم نے انہیں پلنگ پر لگا دیا ہے۔ صدیقی صاحب بیٹے کی رہائی کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ضد کے پکے ہیں۔ بیٹے کو ڈھونڈنے تھانے کے چکر نہیں لگائیں گے۔ میری ماں نعیم کی چھوٹی بہن کو لے کر اس کے لئے کھانے کا ناشتے دان ہاتھ میں لٹکائے تھانے تھانے گھومتی رہی لیکن کوئی نعیم کا پتہ بتانے پر راضی نہیں ہے۔ ایک تھانے والا دوسرے تھانے کا اور دوسرا تیسرے تھانے کا پتہ بتاتا ہے۔ تیسرا کہتا ہے فوجی لے گئے ہیں۔ فوج والے کہتے ہیں رینجرز کے پاس ہے، رینجرز والے دوبارہ کسی تھانے کا پتہ بتا کر بھیج دیتے ہیں۔ میں اپنے ملک کی پولیس کو اچھی طرح جانتا ہوں، انہوں نے دو شریف عورتوں کو کس کس طرح تنگ نہ کیا ہو گا۔ کیا کیا نہ کہا ہو گا۔ آج جبکہ انہیں میری سب سے زیادہ ضرورت ہے تو وہ کہتے ہیں کہ میں واپس نہ آؤں۔ میری ماں کہتی ہے کہ وہ میرا منہ نہیں دیکھے گی۔ تم ہی بتاؤ احمد بھائی میں کیا کروں۔" سلیم سوالیہ نظروں سے احمد کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

"لیکن یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔" احمد نے صورت حال سمجھنی چاہی۔

"کچھ نہیں پتہ اور کیوں ہو رہا ہے۔ کون کس کو مار رہا ہے۔ لگتا ہے سب اجتماعی خودکشی پر تل گئے ہیں۔ پاگل پن کا پلیگ ہے جو پورے شہر میں پھیل گیا ہے۔ بے نشان بندوقوں سے گولیاں نکل کر آتی ہیں اور لہو چاٹ جاتی ہیں۔ پولیس مقابلے ہوتے ہیں جن میں چلنے والی گولیاں صحیح نشانوں پر پہنچ کر سینے چھلنی کرتی ہیں۔ بوریاں اپنا منہ کھول کر آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی لاشیں اگلتی ہیں۔ عمارتوں میں راکٹ پھٹتے ہیں، شہر میں بے روزگار نوجوانوں کی فصلیں تیار کھڑی ہیں جنہیں کاٹنے والا کوئی نہیں۔ علاقائی مصلحتوں نے نئی نفرتیں اگا دی ہیں۔ سیاست کرنے والے بے حس

گورکن بنے قتل گاہوں پر طاقت کے تخت بچھائے بیٹھے ہیں۔" سلیم کا غم غصہ میں ڈھل گیا تھا۔ احمد کی سمجھ میں آیا کچھ نہیں بھی آیا۔

"میں وہ آخری آدمی ہوں جو پردیس کو وطن بنانے کا مشورہ دے گا۔ لیکن تمہارے حالات ایسے ہیں کہ تمہیں اپنے گھروالوں کا مشورہ مان لینا چاہئے۔ واپس گئے تو تم اپنے گھروالوں کے لئے ایک اور مسئلہ بن جاؤ گے۔ جذبات میں بہہ کر اس رو میں شامل ہو جاؤ گے جو جیل جا رہی ہے یا گولیاں کھا رہی ہے۔ اس وقت تمہارا جانا واقعی صحیح نہیں ہو گا۔" احمد نے سلیم کو مشورہ دیا۔

"لیکن میں کیسے رہوں گا' میرے پاس تو کوئی نوکری بھی نہیں ہے۔ اگلے مہینے سے میرا اسکالر شپ بھی بند ہو جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اگلے سال بھی اسکالر شپ ملے گا یا نہیں۔ نوکریوں کے لئے فیکٹریوں کے چکر لگاؤں یا ٹیکسی چلاؤں تو میں بھی زندگی بھر کے لئے غیر قانونی بن کر زندگی کی اس دلدل میں دھنس جاؤں گا جس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔" سلیم نے اپنی تشویش ظاہر کی۔

"برادر فیکٹریوں میں کوئی اپنی خوشی سے کام نہیں کرتا' نہ ٹیکسی اپنی مرضی سے چلاتا ہے۔ کبھی حالات اور ان کی مجبوریاں اس رستے پر لے جاتی ہیں اور کبھی سنہرے مستقبل کے خواب زندگی کو اس دلدل میں ڈال دیتے ہیں جس کی تم نے بات کی ہے۔ فیکٹریوں میں کام کرنے اور ٹیکسیاں چلانے والے پیسے کما کر جدائیوں کا مرہم خریدتے ہیں۔ اس لئے ان کا تذکرہ اتنی بے دردی سے نہ کرو۔" احمد کا لہجہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"نہیں نہیں میرا مقصد کسی کام کی تحقیر کرنا نہیں تھا۔ سڈنی میں میرے سب سے اچھے دوست انہیں کاموں میں گرفتار ہیں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ان کاموں میں پھنس گیا تو پھر وہ مقصد ختم ہو جائے گا جس کے لئے میں یہاں آیا تھا۔" سلیم نے وضاحت کی۔

"مسئلہ ترجیحات کا ہے۔ کل جب تم یہاں آئے تھے تمہاری ترجیحات مختلف تھیں آج تمہارے شہر کے بدلے ہوئے حالات نے یہ ترجیحات بدل دی ہیں۔ فیصلہ

تمہیں کرنا ہے کہ تم اس تبدیلی کے لئے تیار ہو یا نہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔" سلیم نے ایک بار پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔

"چلو باہر چلتے ہیں، میرے پاس فون کارڈ ہے، پبلک بوتھ سے تم گھر فون کر کے بات کر لو۔ تمہیں آج جو خط ملا ہے وہ آٹھ دس روز پہلے چلا ہو گا۔ اس عرصے میں تو بہت کچھ ہو گیا ہو گا۔ تازہ صورت حال جان کر تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی۔" احمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ سلیم نے احمد کو تشکر بھری نظروں سے دیکھا اور خاموشی سے احمد کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔ پبلک فون سامنے ہی سڑک پر لگا تھا۔ احمد کا خیال صحیح تھا۔ ان آٹھ دس دنوں میں بہت کچھ بدل گیا بلکہ ٹھیک ہو گیا تھا۔

فون صدیقی صاحب کے گھر میں تھا۔ سلیم کے اپنے گھر میں فون نہیں تھا۔ فون صدیقی نے ہی اٹھایا تھا۔ یہ اس لئے اچھا تھا کہ وہ کم وقت میں کام کی ساری باتیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ قریشی کی کوششوں سے نعیم رہا ہو گیا تھا اور اب جاپان کا ویزا لگوانے کے لئے اعوان کے پاس اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ صدیقی صاحب نے اسے بتایا کہ اسلام آباد سے واپس آتے ہی اگلے ہفتے تک وہ نعیم کو جاپان بھجوا دیں گے اور کہیں گے کہ فون پر سلیم سے رابطہ رکھے۔ نعیم کی رہائی کے بعد سے گھر کا ماحول اور طبیعتیں کافی بہتر ہو گئی تھیں۔ لیکن شہر اجڑا ہوا تھا۔ صدیقی صاحب نے بتایا آج بھی ہڑتال تھی ہر طرف سڑک پر جلتے ہوئے ٹائروں کی بو پھیلی تھی۔ دس لاشیں اٹھائی جا چکی تھیں۔ صدیقی صاحب نے سلیم کو پھر تاکید کی کہ وہ کراچی آنے کا ارادہ نہ کرے۔ سلیم نے انہیں اپنی صورت حال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ان کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ تقدیر نے فیصلہ لکھ دیا ہے۔ اسے ابھی یہیں رہنا ہو گا۔

سلیم نے دوسرے ہی دن سے نوکری کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ نوکری تلاش کرنے کی بسم اللہ اس نے تبلیغی جماعت والے ان دونوں پاکستانیوں سے کی جن

سے اس کی اس زمانے میں ملاقات ہوئی تھی جب وہ سڈنی آکر کچھ دن سرے ہلز کی مسجد میں رہا تھا۔ ان دونوں نے اس زمانے میں بھی سلیم کو ہفتے میں چند گھنٹوں کی نوکری دینے کی پیشکش کی تھی۔ لیکن اس وقت سلیم کو دن رات پڑھ کر اپنا کورس ختم کر کے وقت سے پہلے ہی پاکستان جانے کی دھن تھی۔ سلیم پہلے ان کے پاس گیا جو وکیل تھے۔ اسے سخت حیرت ہوئی جب اس نے ریسپشن پر مسکراہٹیں بکھیر کر صبح بخیر کہتی ہوئی ایک لڑکی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ سلیم کو یاد تھا کہ وکیل صاحب لڑکیوں کی مسکراہٹ کے ذریعے کاروبار کرنا حرام سمجھتے تھے۔ لڑکی نے بتایا کہ وکیل صاحب کسی کام کے سلسلے میں نیوزی لینڈ گئے ہیں۔ ایک ہفتے میں آئیں گے۔

"میں ان کی بیٹی ہوں۔ میں بھی قانون پڑھ رہی ہوں اور ساتھ ہی اپنے والد کے ساتھ پریکٹس کرتی ہوں۔ اگر میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں تو آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔" لڑکی نے بہت خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ سلیم کو موکل سمجھ رہی تھی۔

"جی نہیں۔ کوئی خاص کام نہیں میں پھر آؤں گا۔" سلیم نے واپس جانے کے لئے مڑتے ہوئے کہا۔

سلیم کی اگلی منزل تبلیغی جماعت والے خان صاحب تھے جو گراسری کا اسٹور چلاتے تھے۔ ان کے اسٹور میں کیش رجسٹر پر کھڑی ہوئی ایک خاتون نظر آئیں۔ معلوم ہوا خان صاحب کی بیگم ہیں اور آج کل وہی اسٹور چلاتی ہیں۔ خان صاحب نے خود کو زیادہ تر تبلیغی کاموں کے لئے وقف کیا ہوا ہے۔ آج کل بھی وہ ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ پرتھ گئے ہوئے تھے۔ ان کے دو لڑکے اسکول سے واپس آکر اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتے اور اسٹور بند کرنے میں مدد کرتے تھے۔ سلیم سمجھ گیا کہ اس کی ضرورت یہاں بھی نہیں ہو گی۔ جس وقت خان صاحب نے اسے نوکری دینے کی پیشکش کی تھی اس وقت شاید ان کی بیوی بچے کاروبار چلانے میں ان کے شریک نہیں رہے ہوں گے۔

سلیم وہاں سے مایوس لوٹا تو اس کے پاس جانے کے لئے اب صرف ایک ہی

گھنٹہ بچا تھا۔ وہ گھر جس میں ظہیر' چودہری انور اور ظہور بیدل رہتے تھے۔ ویسے بھی ایک دن میں نوکری حاصل کرنے کی دو کوششیں کافی تھیں۔ آدھا دن بیت چکا تھا۔ دونوں جگہیں کافی فاصلے پر تھیں اور سلیم کو دونوں جگہ جانے میں کئی گھنٹے لگے تھے۔ سلیم کو معلوم تھا کہ چودہری انور پورے ہفتے میں صرف منگل کو چھٹی کرتا ہے اس لئے وہ گھر پر ہو گا۔ ظہیر صبح تین سے شام کے تین بجے تک کی شفٹ میں ٹیکسی چلاتا تھا اس لئے وہ بھی کام ختم کر کے گھر آنے والا ہو گا۔ ظہور بیدل البتہ کام پر گیا ہوا ہو گا۔ سلیم کو ان کے گھر پہنچتے پہنچتے تین بج گئے۔ سلیم کو حیرت ہوئی جب اس نے ظہور بیدل کو بھی گھر میں موجود دیکھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر کمبل اوڑھے لیٹا تھا۔ چودہری انور اس کے قریب ہی دوسرے صوفے پر بیٹھا تھا۔ ظہیر نہیں تھا ظہیر کے ساتھی نے اس سے شفٹ تبدیل کر لی تھی اس لئے وہ شام تین سے صبح تین بجے تک کی شفٹ میں ٹیکسی چلانے ابھی ابھی گھر سے نکل گیا تھا۔ چودہری انور نے بتایا کہ ظہور بیدل کے سینے میں درد ہے اس لئے اس نے کام سے چھٹی کی ہے۔

"میں نے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضد کی تھی لیکن یہ کہتے ہیں کہ یہ درد انہیں اکثر ہوتا ہے اور تھوڑی دیر کے آرام کے بعد چلا جاتا ہے' اس لئے ڈاکٹر کے پاس جانا فضول ہے۔" چودہری انور نے سلیم کو بتایا۔

"ظہور بھائی' سینے کا درد تو خطرناک بات ہے۔ آپ کو فوراً ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے۔" سلیم نے بھی اصرار کیا۔

"سلیم میاں' ہم شاعروں کے پاس ایک یہی تو سرمایہ ہوتا ہے۔ اسے ہم بہت سنبھال کر بہت سنوار کر رکھتے ہیں۔ درد دل گیا تو ہم بھی چلے جائیں گے۔" ظہور نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"آپ بالکل الٹی بات کہہ رہے ہیں' دل کا درد اس طرح رہا تو آپ کا رہنا خطرے میں پڑ جائے گا۔ شاعری چھوڑیئے اور ڈاکٹر کے پاس چلئے۔" سلیم نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔ درد کو بھی آرام آ رہا ہے۔ تمہیں دیکھ کر چہرے پر

رونق بھی آ گئی ہے۔ اسپرین کھا رہا ہوں یہ خون کو پتلا رکھ کر دل میں رواں رکھتی ہے۔ شام تک درد ٹھیک نہ ہوا تو اسپتال چلا جاؤں گا۔ تم سناؤ تمہارے کیا حال ہے، آج بہت بے وقت آئے ہو۔ خیریت تو ہے۔" ظہور نے اسی طرح غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"خیریت ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ لیکن اپنا احوال سنا کر آپ کا درد دل نہیں بڑھاؤں گا۔ ویسے بھی میرے حالات اب پوری طرح قابو میں ہیں۔" سلیم نے ذرا مدھم لہجے میں کہا۔

"تم میری فکر نہ کرو۔ میرا دل بہت مضبوط ہے۔ یہ بتاؤ کیا ہوا۔ کراچی میں تو سب خیریت ہے۔" ظہور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا لہجہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ چودہری انور بھی تشویش بھری نظروں سے سلیم کو دیکھنے لگا۔ سلیم نے انہیں بتایا کل ایک دن میں اس کے ساتھ کیا کیا گزری تھی اور اسے فوری طور پر نوکری حاصل کرنے کی کتنی سخت ضرورت ہے۔

"اگر تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو تو میرے پاس ہزار ڈالر ہیں چودہری انور فورا" قربانی دینے کے لئے تیار ہو گیا۔"

"نہیں چودہری مجھے تمہارے پیسے نہیں چاہئیں۔ میرا مسئلہ اب عارضی نوعیت کا نہیں رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسکالر شپ ملے گا یا نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ کراچی کے حالات مجھے کب تک یہاں یرغمالی بنا کر رکھیں گے۔ مجھے اپنا دیرپا انتظام کرنا ہے۔ مجھے ایک مستقل نوکری کی ضرورت ہے۔" سلیم نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"میرے ریسٹورنٹ میں کچن کے مددگار کا کام مل سکتا ہے۔ لیکن تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔ سارا وقت برتن دھونے اور صفائی کرنے میں گزرتا ہے۔ تنخواہ کا ریٹ بھی اچھا نہیں ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ مشتاق کو تلاش کرتے ہیں وہ شخص جو ہمارے ساتھ جیل میں تھا۔ وہ کسی فیکٹری میں سپروائزر ہے، یقیناً" سلیم کو کوئی مناسب کام دلوا دے گا۔" ظہور نے مسئلے کا حل تلاش کر ہی لیا۔

"مجھے اس فیکٹری کا پتہ معلوم ہے جہاں مشتاق کام کرتا ہے اس علاقے میں ایک مسافر کو چھوڑا تھا۔ وہاں مجھے مشتاق بھی ملا تھا۔ ابھی چلتے ہیں' وہ اس وقت یقیناً" ڈیوٹی پر ہوگا۔" چودہری انور فوراً" حرکت میں آگیا۔ ظہور بھی اٹھنے لگا' لیکن دونوں نے اسے مجبور کیا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے وہ گھر میں آرام کرے۔

دو بسیں بدل کر وہ مشتاق کی فیکٹری پہنچے تو ان کا یہ سفر زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ مشتاق مل گیا تھا لیکن اس نے بتایا کہ پروڈکشن آج کل مندی کا شکار ہے۔ فی الحال اس کی فیکٹری میں کام نہیں ہے لیکن وہ آس پاس کی دوسری فیکٹریوں میں معلوم کرے گا اور جیسے ہی کہیں کام ملنے کا امکان ہوا وہ سلیم کو فون کر دے گا۔ دونوں گھر واپس آئے تو ظہور کی طبیعت ٹھیک تھی۔ اس کے دل کا درد ختم ہو گیا تھا اور وہ شعر گنگناتا ہوا کھانا پکانے میں مصروف تھا۔

سلیم ہفتے بھر نوکری کے لئے بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ مشتاق نے اسے دو تین فیکٹریوں میں بھیجا لیکن انہیں مولڈنگ مشینوں پر کام کا تجربہ رکھنے والے کاریگر چاہئیں تھے۔ ان کے پاس کام سکھانے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے بشیر کو بھی کئی دفعہ فون کئے لیکن وہ اسے مل نہیں سکا۔ سب سے آسانی کے ساتھ ٹیکسی چلانے کا کام مل سکتا تھا۔ لیکن سلیم کے پاس ڈرائیونگ کا عام لائسنس بھی نہیں تھا۔ ڈرائیونگ لائسنس کے چھ مہینے بعد ٹیکسی چلانے کا لائسنس لیا جا سکتا تھا۔ سلیم نے سڈنی میں گزارے ہوئے اس ایک سال میں اپنے اطراف میں سب کو کام کرتے دیکھا تھا۔ ہر سطح کے' ہر پس منظر کے پڑھے لکھے' کم پڑھے لکھے' سب لوگ کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ اس لئے شروع میں سلیم کا خیال تھا کہ نوکری ملنے میں رکاوٹ صرف اس کا ارادہ تھا' ارادہ کر لیا تو نوکری بھی ہاتھ باندھے سامنے آ جائے گی۔ ایک ہفتے کی اس تگ و دو میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح مایوس ہوتا اسے کام مل گیا۔ کام بھی ایسا جسے کرتے ہوئے اس نے سڈنی میں کسی کو دیکھا نہ سنا تھا اور ملا بھی ایک ایسے ذریعے سے جسے اس نے نوکری حاصل

کرنے کی جستجو میں استعمال نہیں کیا تھا۔

سلیم شام کو تھکا ہارا گھر پہنچا تو احمد پہلے سے موجود تھا اس نے سلیم کو بتایا کہ اگر وہ تیار ہو تو اسلامی طریقے سے ذبیحہ کرنے کا کام کر سکتا ہے۔ پیسے بھی برے نہیں ہیں اور کام بھی اچھا ہے۔ آسٹریلیا کی گوشت برآمد کرنے کی مارکیٹ بہت بڑی تھی، ہر سال کروڑوں ڈالر کا گوشت دنیا بھر میں بھیجا جاتا تھا۔ سب سے بڑی منڈی مشرق وسطیٰ کے اسلامی ملکوں کی تھی۔ لیکن شرط حلال گوشت کی تھی۔ اس بات کی تصدیق کے لئے کہ جانوروں کو حلال کر کے ذبح کیا گیا ہے سعودی عرب نے ایک مکمل نظام وضع کیا تھا۔ آسٹریلیا کی اسلامی کونسل کو حلال کے سرٹیفکیٹ دینے کا ٹھیکہ ملا ہوا تھا۔ سعودی عرب میں اسلامی کونسل کے مستند لوگوں کے دستخطوں کے نمونے موجود تھے، کونسل ذبیحہ کے لئے اپنے آدمی مقرر کرتی تھی جنہیں فی جانور کے حساب سے ذبح کرنے کے پیسے دیئے جاتے تھے۔ وہ کونسل کو اپنی تصدیق فیکس کرتے تھے جس کی بنیاد پر کونسل اپنی تصدیق سعودی عرب بھیجتی تھی جہاں تصدیق کرنے والوں کے دستخط ملائے جاتے تھے۔ لیکن کسی وجہ سے آسٹریلیا کا سعودی سفارت خانہ اسلامی کونسل سے ناراض ہو گیا تھا اور ان سے حلال گوشت کی تصدیق کا کام واپس لے لیا گیا تھا۔ یہ کام علماء کی ایک کونسل کو تفویض ہوا تھا جو مذبح خانوں میں اپنے آدمی مقرر کر رہی تھی۔ اس نئی کونسل میں شامل ایک انڈونیشی مولوی احمد کا جاننے والا تھا جس نے احمد سے کہا تھا کہ وہ چاہے تو کام مل سکتا ہے۔ احمد کو کام کرنے سے دلچسپی نہیں تھی اس نے سلیم کا نام لکھ دیا تھا جو بلا جھجک تیار ہو گیا تھا۔

سلیم کو کام کرتے ہوئے تین مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے علی الصبح جاتا اور واپس آتے آتے شام ہو جاتی۔ مذبح خانہ شہر سے بہت دور تھا۔ صرف آنے جانے میں چار گھنٹے صرف ہوتے۔ صبح سے شام تک اللہ اکبر کہہ کر چھری پھیرتے ہوئے اسے ایسی عادت ہو گئی تھی کہ کام کے بعد بھی اٹھتے بیٹھتے اس کی زبان سے اللہ اکبر نکل جاتا۔ ظہور کو شک تھا کہ سلیم کو زندگی میں کبھی گناہ کرنے کی جرات ہوئی ہو گی، لیکن یہ یقین تھا کہ اگر اس نے کوئی گناہ کیا بھی تھا تو اب تک اللہ اکبر کے اس مسلسل

ورد سے معاف ہو چکا ہو گا۔
سلیم نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا تھا۔ صرف ایک روز جا کر اپنے نئے اسکالر شپ کی درخواست جمع کرائی تھی۔ درخواست کے ساتھ تین ریفرنس کا پروفیسر وہائٹ نے بندوبست کیا تھا۔ ایک ریفرنس خود پروفیسر نے لکھا تھا۔ درخواست داخل کرنے اور ریفرنس تیار کرنے میں پروفیسر وہائٹ نے جس طرح مدد کی تھی اس سے سلیم کو یقین آ رہا تھا کہ پروفیسر اس کی مدد کے سلسلے میں مخلص تھا۔ سلیم کو یہ بھی یقین ہو چلا تھا کہ اس کا اسکالر شپ منظور ہو جائے گا۔ لیکن سلیم نے طے کیا تھا کہ اب وہ پڑھائی کے ساتھ نوکری کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ احمد کی اس بات کو اس نے پرکھ لیا تھا کہ جدائیوں کے زخم پر پیسوں کا مرہم کتنا آرام دیتا ہے۔
لیکن اگر سب کچھ اس طرح ہو جس طرح چاہا جائے یا منصوبہ بنایا جائے تو پھر زندگی کبھی ختم نہ ہونے والی ڈزنی لینڈ کی سیر بن جائے۔ سلیم کو ٹھیک نشانے پر کئی گولیاں اس تواتر سے لگیں کہ وہ یہ بھی محسوس نہ کر سکا کہ کس گولی کا زخم زیادہ کاری تھا۔
سب سے پہلے تو نوکری گئی۔ ایک دن مذبح خانے پہنچا تو وہاں حلال ذبیحہ کا کام بند تھا۔ اسے بتایا گیا کہ سعودی عرب بھیجے جانے والے گوشت میں وہاں کے صحت کے حکام نے وائرس پایا ہے جس کے بعد سارا گوشت سمندر میں پھینک کر ضائع کر دیا گیا ہے اور مزید گوشت کی فراہمی بند کر دی گئی ہے۔ آسٹریلیا کے اعلیٰ حکام سعودی عرب جا کر انہیں منانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سلیم کو بتایا گیا کہ کام دوبارہ شروع ہونے پر اگر اس کی ضرورت ہوئی تو اطلاع کر دی جائے گی۔
سلیم گھر پہنچا تو ابھی دن کے صرف ۲ بجے تھے۔ فلیٹ میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے میل بکس سے خط نکالے تو ایک لفافے پر یونیورسٹی کا مونوگرام جگمگا رہا تھا۔ سلیم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اسے معلوم تھا کہ اسکالر شپ ملنے یا نہ ملنے کے فیصلے کی اطلاع دی گئی ہو گی۔ اس نے لفافہ کھولنے میں جلدی نہیں کی۔ فلیٹ میں آ کر آرام سے بیٹھا اور اللہ اکبر کا ورد کرتے ہوئے لفافہ کھولا اور خط پر دیر تک نظریں

گاڑے ساکت بیٹھا رہا۔ اس دفعہ چھری نے خود اس کے منصوبوں کو ذبح کر کے حلال کر دیا تھا۔ اسے بڑے افسوس کے ساتھ اطلاع دی گئی تھی کہ اس کا اسکالر شپ منظور نہیں کیا جا سکا ہے۔ سلیم آہستہ سے صوفے پر نیم دراز ہو گیا اور اپنے آپ کو سکون دینے کی کوشش کرنے لگا۔ باہر ہوا تیز تھی ورنہ ساحل کی منڈیر پر اپنی من پسند جگہ پر بیٹھ کر سمندر سے آنے والی رطوبت زدہ ہوا سے اپنے زخم دھونے کی کوشش کرتا۔ آسودگی پہنچانے والی دوسری جگہ ظہیر کا حجرہ تھا لیکن آج پیر کا دن تھا اور وہاں اس وقت کسی کے ملنے کا امکان نہیں تھا۔ سلیم اپنی سوچوں کو تھپکیاں دینے لگا۔ سلیم نے اسکالر شپ نہ ملنے کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا تھا لیکن اس بات کا یقین زیادہ تھا کہ اسکالر شپ مل جائے گا۔ حقیقت سامنے آئی تو اندازہ ہو رہا تھا کہ صرف ایک اسکالر شپ نہ ملنے نے اس کا مستقبل کتنا بے یقینی اور زندگی کتنی پیچیدہ بنا دی تھی۔

ایک خیال سلیم کے ذہن میں کوندے کی طرح چمکا اور وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ابھی چار سے زیادہ مہینے باقی تھے۔ اس عرصے میں دن رات کام کر کے وہ اتنے پیسے بچا سکتا تھا کہ یونیورسٹی کی فیس ادا کر کے داخلہ لے سکے۔ ایک دفعہ داخلہ مل گیا تو پھر پڑھائی کے ساتھ کام کر کے اگلے سیشن کی فیس بھی جمع کر لے گا۔ ایک ڈیڑھ سال کی تو بات تھی۔ ماسٹرز مکمل کر کے سرخرو ہو کر واپس جائے گا۔ کراچی کے حالات نے واپس نہ جانے دیا تب بھی زندگی اتنی بے مصرف معلوم نہ ہو گی۔ جس مقصد کے لئے آیا تھا اس کے حاصل ہونے کا اطمینان شکستگی کا احساس پیدا نہیں ہونے دے گا۔ لیکن اسے صحیح معلوم نہیں تھا کہ یونیورسٹی کو کتنی فیس دینی پڑے گی۔ سلیم نے سوچا اسے اب سستی ترک کر کے فوراً حرکت میں آ جانا چاہئے۔ ابھی صرف تین بجے تھے۔ یونیورسٹی کے دفاتر بند ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ وہ یونیورسٹی جانے کے لئے فلیٹ سے نکل پڑا۔

انٹرنیشنل سینٹر سے اسے معلوم ہوا کہ ایک سیشن کے لئے اس کی داخلہ فیس چھ ہزار ڈالر ہو گی۔ یہ فیس وہ دو قسطوں میں ادا کر سکتا تھا۔ سلیم نے حساب لگایا تو سب کچھ بہت آسان لگا۔ فیس جمع کرنے کی قطعی آخری تاریخ مارچ میں تھی۔ اس

طرح اس کے پاس ابھی نو ہفتے باقی تھے۔ وہ ابھی مشتاق کے پاس جائے گا اور کہے گا کہ وہ ایک ہفتے تک اس کے پاس مفت کام کرنے کے لئے تیار ہے۔ کام سکھا کر مشتاق اسے کسی بھی فیکٹری میں ملازمت پر رکھوا سکتا تھا۔ روز بارہ گھنٹے کی شفٹ کر کے وہ یونیورسٹی کی فیس جمع کر سکتا ہے۔ یونیورسٹی شروع ہونے کے بعد بھی ویک اینڈ پر فیکٹری میں کام کرے گا اور باقی دنوں میں پڑھائی کے ساتھ ٹیوٹر کا کام کرے گا۔ اس نے ڈپارٹمنٹ کا رخ کیا اور پروفیسر وہائٹ سے ایک بار پھر یقین دہانی حاصل کی۔ پروفیسر وہائٹ سلیم کو اسکالر شپ نہ ملنے پر پہلے ہی بہت شرمندہ تھا' اس نے یقین دلایا کہ اگر سلیم داخلے کا بندوبست کر لے تو وہ اسے ٹیوٹر کا مستقل کام دیتا رہے گا۔

پروفیسر وہائٹ سے فارغ ہو کر سلیم مشتاق کی فیکٹری پہنچا۔ بس یہیں آ کر اس کے منصوبے کی کڑی ٹوٹ گئی۔ فیکٹری میں معلوم ہوا کہ مشتاق ملبورن گیا ہے۔ فیکٹری کا مالک ملبورن میں بند ہونے والی ایک پرانی فیکٹری کی ساری مشینیں خرید رہا تھا۔ مشتاق ان مشینوں کی حالت اور مالیت کا اندازہ لگانے گیا تھا۔ وہ ایک ہفتے میں بھی آ سکتا تھا اور اسے ایک مہینہ بھی لگ سکتا تھا۔ سلیم نے اپنے حالات بہتر بنانے کے لئے بڑی تیزی سے حرکت کی تھی لیکن اب اس پر اچانک ہی تھکن غالب آ گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے اپنے آئندہ قدم کے بارے میں سوچتا ہوا بس اسٹاپ تک آیا جہاں سے بس پکڑ کر ظہیر اور چودہری انور کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کم از کم ظہیر گھر میں ضرور ہو گا۔

ظہیر گھر میں تھا لیکن اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک اور لڑکا بیٹھا تھا جس کا ظہیر نے اقبال کہہ کر تعارف کرایا تھا۔ یہ وہی اقبال تھا جو پہلے اسی فلیٹ میں رہتا تھا اور جس کے لئے امیگریشن کا وہ چھاپہ پڑا تھا جس میں چودہری انور اور مشتاق پکڑے گئے تھے۔ اقبال خوش قسمتی سے چھاپے کے وقت گھر میں نہیں تھا اس لئے بچ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کوئی پکڑوانے کے لئے اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے اس لئے کچھ عرصہ کے لئے سڈنی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ایک مہینے پہلے ہی واپس آ کر کسی دور دراز علاقے میں ایک کمرے کا فلیٹ لے کر رہتا تھا۔ مولڈنگ مشین اور اسکرین پرنٹنگ کا ماہر تھا'

اس لئے فیکٹری میں دوبارہ کام ملنے میں اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ سلیم کے آنے سے پہلے وہ ظہیر کو بتا رہا تھا کہ وہ اکیلے رہ رہ کر اکتا گیا ہے۔ امیگریشن کے خوف کی وجہ سے کسی سے ملتا بھی نہیں ہے اور ظہیر کے ساتھ اس فلیٹ میں دوبارہ آ کر نہیں رہ سکتا جہاں اس کے لئے پہلے بھی امیگریشن چھاپہ مار چکی تھی۔ ظہیر نے یہ کہہ کر اسے حیران کر دیا کہ وہ ظہور اور چودھری انور کے ساتھ مل کر کوئی فلیٹ لے لے۔

"لیکن اس مکان کا کیا ہو گا۔ کیا تم اکیلے رہو گے۔" اقبال نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں میں پاکستان جا رہا ہوں۔ بابا کا خط آیا ہے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اس لئے وہ اپنی زندگی میں ہی زمینیں میرے نام کرنے کا کام مکمل کرنا چاہتا ہے۔ مجھے شاید سال چھ مہینے لگ جائیں گے اس لئے میں اپنا گھر چھوڑ کے جانا چاہتا ہوں۔ اس مکان کا کرایہ زیادہ ہے۔ اس لئے یہی اچھا ہے کہ تم تینوں مل کر فیکٹری کے پاس کوئی فلیٹ ڈھونڈ لو۔" ظہیر کے اس انکشاف نے سلیم اور اقبال دونوں کو حیران کر دیا۔

"ظہیر بھائی آپ نے یہ تو اچھی خبر نہیں سنائی۔ آپ واپس بھی آؤ گے یا زمینداری میں پھنس کر وہیں رہ جاؤ گے۔" سلیم نے سچ مچ افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

"زمینداری میں میرا دل نہیں لگتا۔ میں تو بابا کے ہاتھ پاؤں دبانے جا رہا ہوں۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک بار پھر جوان ہو کر زمینوں کے جھگڑوں میں لگ جائے گا اور میں دوبارہ اپنے اس نئے دیس کو پلٹ آؤں گا۔" ظہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ظہیر بھائی آپ چودھری اور ظہور سے بات کر لیں۔ میں کل آ جاؤں گا۔ میری شام کی شفٹ ہے ظہور اور انور تیار ہوئے تو ہم کل ہی فلیٹ دیکھنے نکل جائیں گے۔" اقبال یہ کہہ کر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن ظہیر نے اسے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

"کھانا کھا کر جانا آج میں چھولے پلاؤ پکا رہا ہوں۔ سلیم کو پسند نہیں ہے۔ لیکن یہ رات کا بچا ہوا آلو گوشت کھا لے گا۔ یہ کراچی والا ہے یہ نہیں جانتا چھولوں

کا مزا کیا ہوتا ہے۔" ظہیر یہ کہہ کر ہنستا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔ اقبال بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

سلیم نے تہیہ کیا کہ آج بہت مزے لے لے کر ظہیر کا چنا پلاؤ کھانے کا مظاہرہ کرے گا۔ ظہیر نے بہت اصرار کیا اور سمجھایا کہ اس کے چنا پلاؤ پسند کرنے یا نہ کرنے سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ بالکل برا نہیں مانے گا۔ لیکن سلیم چنے پلاؤ کی عزت افزائی پر تلا ہوا تھا۔ ویسے بھی آج اسے بھوک نہیں تھی۔ منہ کے سارے ذائقے رخصت ہو چکے تھے۔ صرف پیٹ بھرنا تھا جس کے لئے وہ کچھ بھی کھا سکتا تھا۔ کھانے کے دوران اس نے آج گزرنے والے حادثوں کی تفصیل سنائی۔ نوکری چلے جانے اور اسکالر شپ نہ ملنے کے بعد وہ مشتاق کے پاس کام سیکھنے کے ارادے سے جانے اور مشتاق کے ملبورن جانے کی تفصیل سنا رہا تھا کہ اقبال نے اسے ٹوک دیا۔

"تمہیں مولڈنگ مشین پر کام سیکھنا ہے تو میرے پاس سیکھ سکتے ہو۔ ہفتے دو ہفتے میں تمہیں طاق کر دوں گا۔ اس وقت تک ملبورن سے مشتاق بھائی بھی آ جائیں گے اور تمہاری نوکری کا بندوبست کر دیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری فیکٹری میں کوئی جگہ خالی ہو اور تم میرے ساتھ ہی لگ جاؤ۔" اقبال شاید اس کے لئے فرشتہ بن کر آیا تھا۔ سلیم کا دل چاہا کہ اٹھ کر اسے گلے سے لگا لے۔

"بہت بہت شکریہ اقبال بھائی۔ میں کل ہی تمہاری فیکٹری پہنچ جاؤں گا۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ اس کی بھوک بھی کھل گئی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ میز پر رکھی ہوئی آلو گوشت کی پلیٹ کی طرف بڑھا۔ اس کی پلیٹ میں بچا ہوا چنا پلاؤ ظہیر کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ کھانا ختم کر کے سلیم گھر واپس جانے لگا تو کافی مطمئن تھا۔ لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ آج اس پر جو امتحان گزرے ہیں ان کا ایک مرحلہ ابھی اور باقی ہے۔

گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ علی احمد کی مدد سے اپنا سامان باندھ رہا تھا۔

"خیریت علی بھائی۔ کہاں کی تیاری ہے۔" سلیم نے اپنی حیرت ظاہر کرتے

ہوئے پوچھا۔ علی صرف خاموشی سے سلیم کی شکل دیکھنے لگا۔

"برادر علی کی ماں سخت بیمار ہے۔ آج شام اس کی بہن کا فون آیا تھا۔ علی الصبح کی فلائٹ سے اپنے گھر جا رہا ہے۔" احمد نے سلیم کو بتایا۔

"مجھے افسوس ہے۔ مجھے واقعی افسوس ہے۔" سلیم بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"برادر سلیم۔ اگلے ہفتے میں بھی انڈونیشیا واپس جا رہا ہوں۔" احمد نے تھوڑے سے توقف کے بعد جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میں اپنی ریسرچ اب جکارتہ جا کر اپنی یونیورسٹی میں مکمل کروں گا۔ میں نے اگلے ہفتے کی سیٹ بک کرا لی ہے اور یہ فلیٹ اور اس کا سامان بھی ایک انڈونیشی فیملی کو دے دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک ہفتے میں اپنے رہنے کی جگہ تلاش کر لو گے۔ تمہارے پاکستانی دوست تمہارا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ جگہ ڈھونڈنے میں ضرور تمہاری مدد کریں گے۔"

احمد کچھ مجرم سا بنا کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلیم نے کچھ نہیں کہا صرف اپنا سر ہلا دیا اور سامان پیک کرنے میں علی کی مدد کرنے لگا۔ احمد کی بات صحیح تھی سلیم کے دوست اس کا بہت خیال رکھتے تھے اور اسی وجہ سے سلیم ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ ظہیر کے پاس رہنے کے لئے بہت دنوں سے جگہ خالی تھی۔ اس نے سلیم سے کہا بھی تھا لیکن اس نے بہانہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے انڈونیشی دوستوں کو اس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔ وجہ یہی تھی کہ اس کے دوست اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اسے شیشے کا بنا ہوا گڈا سمجھتے جو ٹھیس لگتے ہی ٹوٹ جائے گا۔ اسے گھر کا کام تک نہیں کرنے دیتے۔ سلیم ان کی موجودگی میں ایک بچہ بن جاتا جسے ہر وقت نگرانی کی اور تحفظ کی ضرورت ہوتی۔ جسے سڑک پار کرنے کے لئے بڑوں کا ہاتھ تھامنا ہو۔ سلیم ان بڑوں کے ساتھ بچہ بن کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے پاس کوئی اور آسان راستہ بھی نہیں تھا۔ دوسرے دن صبح ظہیر کے ڈیرے پر پہنچ کر وہ ظہور، چودہری انور اور اقبال کے اسی قافلے میں شامل ہو گیا جو مکان کی تلاش میں نکل رہا تھا۔

سلیم، چودہری انور، ظہور بیدل اور اقبال نے مل کر بوٹنی میں دو بیڈ روم کا

ایک فلیٹ لے لیا تھا۔ وہ ایک ایک کمرے میں مل کر دو دو رہتے تھے۔ ڈرائنگ روم کو انہوں نے بہت صاف کر کے اور نوک پلک سے سنوار کے اس طرح رکھا تھا جیسے ابھی کوئی مہمان آنے والا ہے۔ یہ ظہور بیدل کا شوق تھا۔ بڑے اہتمام سے منی پلانٹ کی بیل لگائی تھی۔ انڈور پلانٹس کے کئی گملے بھی ایک ایک کر کے آ گئے تھے۔ کافی ٹیبل، کھانے کی میز پر صاف کور بچھ گئے تھے۔ گلدانوں میں اکثر پھول سجے نظر آتے۔ روز اپنے ہاتھ سے سارے فرنیچر اور ٹی وی، وی سی آر پر چڑھتی ہوئی گرد صاف کرتا۔ ڈرائنگ روم میں سگریٹ نوشی بالکل منع تھی۔ کہتا تھا پودوں کو زکام ہو جائے گا۔ اس پابندی کی سب سے زیادہ تکلیف خود ظہور کو تھی کیونکہ گھر میں اس کے سوا کوئی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ سگریٹ پینے باہر بالکونی میں جانا پڑتا۔ ایک دن تیز بارش میں پانی کی پھوار سے بھیگتے ہوئے سگریٹ نوشی کرتے دیکھ کر سب نے سمجھایا تھا کہ پودوں کو تو نہیں خود اسے زکام ہو جائے گا لیکن اس نے "ہو جائے" کہہ کر سگریٹ سمیت اندر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اقبال نے ایک دن جھنجلا کر کہا تھا کہ اس گھر میں سب چھڑے رہتے ہیں، کسی کا کوئی ملنے والا نہیں آتا۔ کسی خاندان سے کسی کی کوئی دوستی نہیں ہے پھر ڈرائنگ روم کو اس قدر صاف ستھرا رکھنے اور سجانے کی کیا ضرورت ہے۔ ظہور کو اس منطق پر سخت غصہ آیا۔

"تمہارا خیال ہے میں کسی آنے والے کے لئے اتنی مشقت کرتا ہوں۔ نہیں میاں نہیں۔ دوسرے کے لئے میں صرف پیسے لے کر کام کرتا ہوں۔ یہ ماحول میں نے اپنے لئے تخلیق کیا ہے۔ اپنی اس چھوٹی سی جنت میں بیٹھ کر دوزخ کی اس آگ کو بھلا دیتا ہوں جس میں مجھے دن بھر جلنا پڑتا ہے۔ میں دن کے دس گھنٹے تندور کی بھٹی کے سامنے کھڑے ہو کر گزارتا ہوں۔ میرے اردگرد جھوٹی پلیٹوں کے انبار لگے ہوتے ہیں۔ کالے کالے پیندوں والی دیگچیاں مجھے آئینے دکھاتی ہیں۔ کام کے عذاب میں جلتا ہوا ہر چہرہ اتنا مکروہ نظر آتا ہے کہ قے ہونے لگتی ہے۔ یہ حشر اس ظہور بیدل کا ہوا ہے جس نے اپنی ساری زندگی حسن پرستی میں گزاری تھی۔ وہ گندی نالی میں کیڑے کی طرح رہنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اسے اپنی ضرورتوں کا پیٹ بھرنا ہے۔ لیکن اب یہ

نہیں ہو سکتا کہ ظہور بیدل گندی نالی سے نکل کر گھر آئے تو وہاں بھی کموڈ میں چھپ کر بیٹھ جائے۔ نہیں میاں نہیں۔ مجھے زندہ رہنا اتنا پیارا نہیں۔ میں جب اس صوفے کی پشت پر ٹیک لگا کر بیٹھتا ہوں تو پیچھے کی دیوار پر چڑھی بیل کے پتے میرے گالوں کو بوسہ دے کر میرے کان میں سرگوشیاں کرتے ہیں' گیت گنگناتے ہیں۔ میرے برابر رکھے ہوئے گملے میں کھلا ہوا پھول مجھے آنکھ مارتا ہے۔ کلیاں مجھے دیکھ کر شرمانے اور اپنا چہرہ چھپانے لگتی ہیں۔ میں ٹی وی کھول کر چینل بدلتا ہوں تو بور سے بور پروگرام بھی مجھے تفریح کی اونچی منزلوں تک لے جاتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا پھر بھی نظریں گاڑے رکھتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے رنگ و حسن کی ساری رعنائیاں آنکھوں کے راستے میرے جسم میں اتری چلی جا رہی ہیں۔" ظہور شاید اپنے ماضی میں کھو گیا تھا۔

"ظہور بھائی ہم بھی تو ہیں۔ ہم بھی دن بھر عذاب جھیلتے ہیں۔ لیکن آپ کی طرح شاعری کیے بغیر زندہ ہیں۔ پھول پتیوں کے بغیر زندہ ہیں۔" اقبال نے حجت کرنی چاہی۔

"بدنصیب ہو۔ سخت بدنصیب ہو۔ دن بھر جہنم کی آگ میں جلتے ہو اور پھر اس سے نکلتے ہوئے نئے عذابوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنت تمہارے قدموں میں ہوتی ہے لیکن اس سے کترا کے گزر جاتے ہو۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ لینے کی حسرت۔ ہر وقت کچھ کھو دینے کا خوف۔ تم نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا ہے۔ تنے ہوئے اعصاب نے کتنا کرخت بنا دیا ہے۔ جسم کا ہر پٹھا ہر وقت اکڑا ہوا' ہر سوچ تناؤ کا شکار۔ ذرا خود کو ڈھیلا چھوڑو۔ گہری گہری سانسیں لو۔ کبھی تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ سے فرار حاصل کرو پھر دیکھو زندگی کتنی خوبصورت نظر آتی ہے۔"

سلیم کو اندازہ تھا کہ ظہور کی باتوں میں کتنا وزن ہے۔ وہ جب کام سے واپس لوٹتا اور صوفے پر نیم دراز ہو کر تھکن اتارنے کی کوشش کرتا تو چھوٹے سے کمرے کا ستھرا سا ماحول اسے آہستہ آہستہ تھپکیاں دینے لگتا۔ سلیم کو اسی فیکٹری میں نوکری مل گئی تھی جس میں اقبال کام کرتا تھا۔ بلکہ نوکری اقبال نے ہی دلوائی تھی۔ سلیم نے دو ہفتوں تک اقبال کے ساتھ مولڈنگ مشین پر کام سیکھا تھا۔ لیکن اس وقت وہاں کوئی

جگہ خالی نہیں تھی۔ وہ دو ہفتوں تک آس پاس کی فیکٹریوں پر دستک دیتا رہا۔ مشتاق نے جو ملبورن سے واپس آ گیا تھا سلیم کو کئی جگہ بھیجا تھا لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن اقبال نے بتایا کہ اس کی فیکٹری میں صبح کی شفٹ میں ایک جگہ خالی ہوئی ہے۔ سلیم نے صبح ہی صبح فیکٹری پہنچ کر یہ نوکری حاصل کر لی تھی۔ وہ نوکری ختم کر کے آتا تو گھر میں کوئی نہیں ہوتا۔ اقبال شام کی شفٹ میں کام کرتا تھا۔ ظہور دو بجے گھر سے نکل جاتا اور چودھری انور بھی تین بجے شام سے ٹیکسی چلانی شروع کر دیتا۔

سلیم سخت تھکا ہوا کام سے واپس آتا۔ یہ تھکن جسمانی نہیں تھی۔ جسمانی مشقت کا تو وہ عادی رہا تھا۔ کام ایسا ہو جو دل کو بھی پسند ہو تو تھکنے میں بھی لطف آتا ہے۔ فیکٹری میں کام کر کے واپس آکر سلیم کو اپنے ضائع ہونے کا شدت سے احساس ہوتا۔ اسے ایسا لگتا جیسے اس کی روح تک جھلس گئی ہو۔ لیکن پھر وہ ظہور کا نسخہ استعمال کرتا۔ گرم پانی سے نہا کر جسم کی سکائی کرتا اور صوفے پر اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتا۔ گہری گہری سانسیں لے کر ماحول کو جذب کرنے کی کوشش کرتا اور ٹی وی کھول کر اس پر اپنی نظریں گاڑ دیتا۔ ایک روز اس نے ظہور کو دیکھا تھا۔ ظہور رات کو گیارہ بجے واپس آتا تھا۔ ایک دن سلیم نے آکر دیکھا تو ظہور صوفے پر نیم دراز ٹی وی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ رگبی کا کوئی پرانا میچ دکھایا جا رہا تھا۔ سلیم کو حیرت ہوئی کیونکہ ظہور کو رگبی سے سخت چڑ تھی۔ لیکن اس وقت وہ آنکھیں جھپکائے بغیر گیندوں کے لئے چھینا جھپٹی کرنے والے خون پسینے اور کیچڑ میں لتھڑ کر ایک دوسرے پر گرتے ہوئے بڑے ڈیل ڈول والے جسموں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے براڈ وے کے اسٹیج پر کورس لائن کی نازک بدن رقاصائیں کولہوں پے ہاتھ رکھے اپنی خوبصورت اور دراز ٹانگوں کو ایک ساتھ گھما رہی ہوں۔

سلیم ایک روز کام کر کے شام میں گھر واپس آیا تو حسب معمول گھر خالی تھا لیکن چودھری انور نے اس کے لئے ایک پیغام چھوڑا تھا جسے پڑھ کر سلیم الٹے قدموں دروازے کی طرف بھاگا۔ ظہور بیدل پر صبح دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ اسپتال میں داخل تھا۔

ظہور نے درد دل کی شکایت کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ شاید اس کی وجہ زندگی کے بارے میں اس کا غیر سنجیدہ رویہ تھا۔ جس طرح کی زندگی گزار رہا تھا اس میں اسے بہت زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف زندہ رہنے کے لئے زندہ تھا۔ درد کی لہر آ کر گزر جاتی اور وہ لوٹ پوٹ کر پھر کام پر چلا جاتا۔ دوست ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے اصرار کرتے' سگریٹ پینے سے منع کرتے' رات رات بھر جاگ کر ٹی وی دیکھنے سے روکتے' شراب پینے کی ہفتے واری لت ختم کرنے کے لئے کہتے لیکن وہ انہیں ہنسی میں اڑا دیتا۔ شراب ہفتے میں صرف اس رات پیتا جس کے دوسرے روز اس کی چھٹی ہوتی تھی اور اس وقت تک پیتا رہتا جب تک اوندھا نہیں ہو جاتا۔ کھانے کا بے حد شوقین تھا۔ بہت مصالحے والے روغنی کھانے کھاتا' پرہیز تھا تو صرف ورزش سے۔ سب کا خیال تھا کہ دل کے امراض کا اس سے اچھا میزبان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ظہور ایک ہفتہ نگہداشت کے وارڈ میں رہا جس کے بعد طبیعت سنبھلی تو عام وارڈ میں واپس لے آیا گیا۔ انجیو گرام ہوا تو دو نسیں بلاک تھیں۔ ڈاکٹروں نے فوری بائی پاس آپریشن کی تاریخ دے دی۔ آپریشن پیر کو ہونا تھا جس میں ابھی تین دن باقی تھے۔ سلیم' چودہری اور اقبال تینوں اپنی اپنی شفٹ ختم کر کے کئی کئی گھنٹے اسپتال میں ظہور کے پاس گزارتے۔ مشتاق جس سے عام حالات میں ملاقات بھی نہیں ہوتی تھی ہر روز بڑی پابندی سے ظہور کو دیکھنے آتا۔ ظہیر پاکستان چلا گیا تھا ورنہ سب کا خیال تھا کہ یہاں ہوتا تو اسپتال میں بستر لگا چکا ہوتا۔ ظہور کی حس مزاح واپس آ گئی تھی۔ ایک دن اس نے سلیم اور چودہری انور کو وہ نرس دکھائی جس پر وہ عاشق ہو گیا تھا اور ہر بار جب وہ گولیاں کھلانے آتی اس کے حسن کی تعریف کرتا اور غزل کا کوئی شعر سنا کر اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کرتا۔ درمیانی عمر کی ذرا موٹاپے کی طرف مائل ایک قبول صورت عورت تھی۔ لیکن دوسری نرسوں کے پاسنگ بھی نہیں تھی۔ وارڈ میں کام کرنے والی زیادہ تر نرسیں بہت خوش شکل اور سنہرے بالوں والی

نازک اندام لڑکیاں تھیں۔

"اتنی حسین حسین لڑکیاں چھوڑ کر آپ ان خالہ جان پر کیوں عاشق ہو گئے۔" سلیم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مقابلہ کم اور کامیابی کا امکان زیادہ تھا۔ تجربے کی بات ہے تم نہیں سمجھو گے۔ پھر یہ ہماری قومی عادت بھی ہے۔" ظہور نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کونسی قومی عادت؟" سلیم کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"مشتاق احمد یوسفی نے "آب گم" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ انگریز عورتیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ ہزاروں میں ایک بدصورت نظر آتی ہے۔ لیکن ہمارا پاکستانی ڈھونڈ کر اسی سے شادی کرتا ہے۔" ظہور نے سلیم کو سمجھایا۔

"یہ لطیفہ تو میں نے ایک پاکستانی ڈرامے میں سنا ہے جو پچھلے ہفتے میں نے ویڈیو پر دیکھا تھا۔" چودہری انور نے حیرانی سے کہا۔

"چوری کرنا ہمارے شاعروں اور مصنفوں کا پرانا پیشہ ہے۔ کہانیوں کے پلاٹ اور موضوعات انگریزی' روسی یا فرانسیسی کہانیوں اور مکالمے ایک دوسرے سے چراتے ہیں۔" ظہور نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"پولیس نہیں پکڑتی۔" چودہری انور نے اس معصومیت سے پوچھا کہ سلیم اور ظہور دونوں ہنس پڑے۔ چودہری انہیں حیرانی سے ہنستا ہوا دیکھتا رہا۔ ادب یا ادبی معاملات سے چودہری انور کو کوئی شناسائی نہیں تھی۔

آپریشن سے ایک دن پہلے چودہری' اقبال اور سلیم صبح آ گئے تھے۔ تینوں کو تشویش تھی کہ ظہور نے اپنے ہارٹ اٹیک یا آپریشن کے بارے میں پاکستان اطلاع نہیں کرنے دی تھی۔ پاکستان میں اپنے گھر کا فون نمبر دینے سے صاف منع کر دیا تھا۔ تینوں کا خیال تھا کہ اس کے گھر والوں کو بتانا ضروری ہے۔ یہ ذمہ داری سلیم کے سپرد کر دی گئی کہ وہ شام میں آئے تو ایک بار پھر ظہور کو گھر فون کرنے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرے۔

وارڈ میں ظہور کے پاس واپس آئے تو وہ باتھ روم سے نہا کر واپس آ رہا تھا۔

بستر پر دراز ہو کر اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔

"ایک حجام نے شیو کر کے میرے جسم کا ایک ایک بال صاف کر دیا ہے۔ الٹا پلٹا، دایاں بایاں کر کے گردن سے پاؤں کے انگوٹھے تک کسی جگہ بال کا نشان نہیں چھوڑا۔ پھر نرس کو بلا کر میرے جسم کا معائنہ کرایا۔ وہی میری معشوق ڈیوٹی پر تھی۔ اس نے بھی الٹ پلٹ کر دیکھا، ایک دو جگہ بال رہ گئے تھے۔ وہ بھی صاف کرا دیئے۔ میرے عشق کی کامیابی کے لئے اچھا شگون ہے۔ ہاں کرنے سے پہلے اس نے میرے جسم کے اتار چڑھاؤ دیکھ لئے ہیں۔ اب اسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی۔"

"لیکن پورے جسم کے بال صاف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" چودہری انور نے پوچھا۔

"تا کہ جب سینہ چاک ہو تو بالوں سے چمٹے ہوئے جراثیم دل اور پھیپھڑوں میں نہ گھس جائیں۔ ویسے میں خود کو سخت ہلکا محسوس کر رہا ہوں ایسا لگتا ہے جیسے دس کلو وزن کم ہو گیا ہو۔" ظہور نے بستر پر اپنی بیٹھک درست کرتے ہوئے کہا۔ تینوں کو معلوم تھا کہ ظہور کا پورا جسم کتنے گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سلیم نے سوچا کہ ظہور کو آپریشن کی نزاکت کے بارے میں پورا علم ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اس کا خیال تھا کہ ظہور پر ابھی یہ حقیقت صحیح طرح واضح نہیں ہوئی ہے کہ وہ کل کس مرحلے سے گزرنے والا ہے۔ شاید وہ اپنی خوش مذاقی کا پردہ ڈال کر اس احساس سے بچنا چاہتا تھا۔

تینوں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے دن آپریشن تھا اور تینوں نے طے کیا تھا کہ سلیم شام کو واپس آ کر ظہور کے پاس رہے گا جبکہ چودہری اور اقبال کل اپنی ڈیوٹیوں سے فارغ ہو کر سیدھے اسپتال آ جائیں گے تا کہ ظہور کے آپریشن تھیٹر جاتے وقت اس کے پاس موجود رہیں۔ شام کو سلیم آیا تو ظہور آنکھیں موندے ہوئے بستر پر دراز تھا۔ آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں تو گیلی تھیں۔

"بچے یاد آ رہے ہیں۔" سلیم نے ظہور کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ ظہور کی آنکھیں اور ڈبڈبا گئیں اور آنسوؤں کے دو قطرے اس کی آنکھوں کے

کناروں سے گر کر تکئے پر جذب ہو گئے۔ لیکن ظہور فوراً بستر پر سرہانے کی طرف سرک کر نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا۔ سلیم سے ہاتھ چھڑا کر اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے اور اس کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ پھر سے سج گئی جو اس کی پہچان تھی۔

"موت کا چہرہ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ خدوخال واضح ہو رہے تھے کہ تم آ گئے۔" ظہور نے اپنی مسکراہٹ کو اور پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ظہور بھائی آپ....." سلیم نے کہنا چاہا لیکن ظہور نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"سلیم میاں۔ تسلیاں بعد میں دینا۔ پہلے ایک نظم سن لو۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی کہی ہے۔" ظہور نے سائڈ کی میز پر رکھا ہوا ایک کاغذ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی۔ ارشاد۔" سلیم نے مشاعرے کا سماں بناتے ہوئے کہا۔

"چھوٹی سی آزاد نظم ہے۔ "زندگی" کہا ہے کہ

"زندگی کے سب بکھیڑے کاٹ کر
عمر کی آخری سرحد پے بیٹھا ایک شخص
آخری سانسوں کی گنتی میں مگن
میں نے اس سے پوچھا آخر اے نفس
زندگی کا کچھ تعارف تو کرا
یہ بتا کہ زندگی آخر ہے کیا
گونج اک ابھری کہ آواز جرس
بات سادہ سی ہے یہ
موت تک کا فاصلہ ہے زندگی"

"بہت خوب۔" سلیم نے داد دی۔

"آداب۔ آداب۔" ظہور نے کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔

"ظہور بھائی' آپ اتنے مایوس کیوں لگ رہے ہیں۔ آپ تو زندگی کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کہتے تھے چپت مار مار کر زندگی کو ٹھیک کر دیں گے۔ ہمیں سمجھایا کرتے تھے کہ زندگی ہرجائی ہے اس کی پرواہ مت کیا کرو۔ لیکن آج دل اتنا چھوٹا کئے بیٹھے ہیں۔" سلیم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"وہ سب کہنے کی باتیں تھیں۔ جب موت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں تو زندگی پیاری لگنے لگتی ہے۔ اسے ٹانکے لگا لگا کر جوڑنے اور سنبھال کر رکھنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔" ظہور نے بہت ٹھنڈی سی آہ بھر کر کہا۔

"لیکن بائی پاس تو اب بہت آسان آپریشن ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر بتا رہا تھا کامیابی کا ریٹ سو فیصد سے ذرا ہی کم ہے آپ کا دل پھر سے نیا ہو جائے گا۔" سلیم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اسی کا تو خوف ہے۔ نیا دل ہوا تو نئے عشق پر اکسائے گا۔ یہ عشق بہت ظالم چیز ہے۔ اس نے پہلے بھی بہت رسوا کیا ہے۔ بسی بسائی زندگی اجاڑ دی ہے۔ بہت مشکل سے سنبھلا ہوں۔" ظہور نے کہیں دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔

"اور یہ جو نرس سے آپ نے تازہ تازہ عشق کیا ہے اس کا کیا ہو گا۔" سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے وہ تو مذاق کی بات ہے۔ وہ بہت اچھی اور خوش مذاق عورت ہے اور وہ کیا ساری نرسوں کا یہی حال ہے۔ آدھی بیماری تو اپنی خدمت سے دور کر دیتی ہیں۔ بیماروں کا فضلہ صاف کرتے ہوئے بھی چہرے پر ایسی مسکراہٹ ہوتی ہے جیسے پھول توڑ رہی ہو۔ دو ہی دن میں اتنا گھل مل جاتی ہیں جیسے برسوں کی پہچان ہو۔ مجھے تو اسپتال بہت پسند آیا ہے۔"

"خیر چھوڑیں۔ مجھے آپ پاکستان میں اپنے گھر کا فون نمبر دیں۔ میں انہیں فون کر کے آپ کے آپریشن کے بارے میں بتاؤں گا۔ یہ ان کا حق ہے کہ اس موقع پر انہیں آپ کی خیریت کی اطلاع دی جائے۔" سلیم نے معاملے کی بات شروع کی۔

"میں نے اپنے بیوی بچوں کے بہت حق مارے ہیں۔ ایک اور سہی۔ لیکن

میں تمہیں فون نمبر ضرور دوں گا۔ اس شرط پر کہ تم ابھی فون نہیں کرو گے۔ انہیں پریشان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپریشن کامیاب ہو گیا اور میں ٹھیک رہا تو پھر ان دنوں کو ایک ڈراؤنے خواب کی طرح میں بھی بھول جاؤں گا۔ ہاں اگر مر گیا تو تم انہیں اطلاع ضرور دینا۔ یہ خبر انہیں ملنی ہی چاہئے۔" اس کی آنکھیں ایک بار پھر گیلی ہونے لگی تھیں۔

"ظہور بھائی ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ کے برابر کے بستر پر جو بڈھا ہے آپ نے خود بتایا ہے کہ ستر سال کا ہے اور دوسری بار بائی پاس کرا کے صحت مند ہو کر گھر واپس جا رہا ہے۔ آپ کی صحت تو بہت اچھی ہے۔ بس دل چھوٹا مت کریں۔ آپ کہتے ہیں تو آپ کے گھر فون نہیں کروں گا۔ لیکن میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آئی۔ آپ اپنے گھر والوں کو اپنے بارے میں اتنا بے خبر کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔" سلیم نے کچھ تجسس کے ساتھ پوچھا۔ ظہور تھوڑی دیر خاموش لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ شاید اپنی کہانی کے تانے بانے بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آؤ سلیم میاں کرسی لے کر میرے قریب بیٹھ جاؤ۔ آج شام غریباں ہے تمہیں دل کے داغ دکھاتا ہوں۔ دل سے یادوں کا بوجھ اتر گیا تو ڈاکٹروں کو آپریشن کرنے میں آسانی رہے گی۔" ظہور کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ سلیم کرسی کو گھسیٹ کر بستر کے اور قریب لے آیا۔ ظہور اپنی زندگی کو ورق ورق پلٹنے لگا۔

10

کویت ۱۹۸۹ء

کویت میں نئے پریس اتاشی نے آتے ہی دھوم مچا دی تھی۔ ادبی اور ثقافتی انجمنوں کو سچ مچ کا سرپرست میسر آگیا تھا۔ سفارتی افسروں کو سرپرست بنانا خلیجی علاقوں میں رہنے والے پاکستانیوں کی ایک ایسی روایت تھی جس پر وہ آنکھ بند کر کے عمل کرتے تھے۔ سفیر اور سفارتی افسر بھی مشاعروں کی صدارت اور موسیقی میں مہمان خصوصی بننے کو اپنے سفارتی فرائض کا حصہ سمجھتے۔ ان میں سے اکثر شعر کے شین اور کلچر اور ایگری کلچر کے فرق سے نا آشنا ہوتے۔ کویت کے ایک سالانہ مشاعرے میں سفیر صاحب کو صدارت کے لئے بلایا گیا تھا۔ سفیر صاحب نوکر شاہی کا پرانا کل پرزہ تھے۔ مرعوب کرنے کے لئے انگریزی شاعری سے اپنی واقفیت کا اظہار کرتے اور بڑے فخر سے اس بات پر اظہار افسوس کرتے کہ ان کی اردو کمزور ہے۔ مشاعرے کے دوران ایک شاعر نے چھوٹی بحر کی غزل سنائی۔ سفیر صاحب کو شاید سننے میں دقت پیش

آئی تھی اس لئے اپنی صدارتی تقریر میں انہوں نے اس بات پر بہت حیرت ظاہر کی کہ "شاعر اپنی چھوٹی بہن کی غزل کیوں سناتے ہیں' اپنی شاعری کیوں نہیں بولتے۔"

یہ لطیفہ پورے کویت میں مشہور ہوا تھا' سفیر صاحب تک بھی پہنچا تھا اس لئے انہوں نے مشاعروں کو اپنی صدارت کے اعزاز سے محروم کردیا تھا اور اپنے فرسٹ سیکریٹری کو بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ فرسٹ سیکریٹری کا تعلق قبائلی علاقے سے تھا۔ کئی ملکوں کے سفارت خانوں میں افسری کر چکے تھے۔ لیکن کسی ملک کی ہوا کا کوئی جھونکا انہیں باغ و بہار نہ کر سکا تھا۔ وہ ابھی تک ایسے ہی تھے جیسے کوئی سینہ اور بندوق تانے چٹان پر کھڑا ذرا سے اشارے پر گولی داغنے کو تیار ہو۔ مشاعرے میں صدارتی مسند پر بت بنے بیٹھے رہتے۔ منتظمین کو پہلے سے بتا دیا تھا کہ اگر انہیں صدارتی تقریر کرنے کے لئے بلایا گیا تو سچ مچ گولی مار دیں گے۔ منتظمین نے حل یہ نکالا کہ جب وہ صدارت کرتے تو ایک عدد مہمان خصوصی کا انتظام بھی کر لیتے جس سے آخر میں تقریر کرا کے صدارتی خطبے کی کمی پوری کی جاتی۔

ظہور بیدل جب سے پریس اتاشی ہو کر آیا تھا دوسرے سفارتی افسروں کو مشاعروں اور موسیقی کی محفلوں میں صدر بن کر بیٹھنے کی کڑی سزا سے آزادی مل گئی تھی۔ ظہور بیدل ہر محفل کی جان تھا۔ باتیں کرتا تو شگوفے چھٹتے' تقریر کرتا تو خطابت کا انداز دل موہ لیتا۔ مشاعروں میں ترنم سے غزل پڑھتا تو اچھے اچھے گانے والے بھی اس کی آواز اور انداز پر رشک کرنے لگتے۔ ظہور کو بے وزن اور بے بحر شعر اور بے سرا گانا سخت ناپسند تھا۔ وہ مشاعروں اور محفلوں میں باقاعدہ دھمکیاں دیا کرتا تھا کہ اگر کسی نے وزن سے گرا شعر پڑھا یا بے سرا گانا گایا تو وہ اس کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرا دے گا۔ اس سلسلے میں رعایت صرف خواتین کو حاصل تھی لیکن ان کا خوش شکل ہونا ضروری تھا۔ ان کی شاعری کی اصلاح یا موسیقی کی ریاضت کرانے کے لئے استاد کی حیثیت سے خدمات پیش کرنے پر بھی تیار تھا۔ ایک خاتون نے اپنی غزل کی اصلاح کے لئے اس کے گھر آنا شروع کیا تھا لیکن ظہور کی بیوی کی کڑی نظروں اور سوکھے رویئے سے ڈر کر بھاگ گئی۔ اس لئے ظہور کی توجہ شوقیہ گانے والی ایک خاتون پر تھی جس کے گھر وہ خود جایا کرتا۔ خاتون خاصی خوش شکل لیکن ذرا بھاری بھر کم

تھی۔ گھنے اور خشک بالوں کی لٹیں ان کے چہرے کے آس پاس بکھری ہوتیں۔ چست لباس پہنتیں جس سے ان کے جسم کے اعضاء اور زیادہ نمایاں نظر آتے تھے۔ ظہور نے انہیں موسیقی کی ایک محفل میں دریافت کیا تھا۔

وہ لونگ گواچا گانے کے لئے بلائی گئی تھی۔ آواز اچھی تھی' سانس بھی ٹوٹنے نہیں دیتی تھی' لیکن آواز کے زیرو بم پر قابو نہیں تھا۔ ظہور نے محفل ختم ہونے پر اس کی بہت تعریف کی لیکن کہا کہ اسے مشق اور تھوڑی سی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ خاتون کے شوہر نے جسے اپنی بیوی کی گلوکاری پر بہت فخر تھا اور جو اپنا سماجی رتبہ بڑھانے کے کسی بھی ذریعے کو ضائع کرنے پر یقین نہیں رکھتا تھا فوراً" ظہور کو گھر آنے کی دعوت دے دی۔ ظہور ہفتے کی دو تین شامیں انہیں کے گھر پر گزارنے لگا۔ نبیلہ اور اس کے شوہر جاوید کو ایسی ہر شام اپنا قد بڑھتا ہوا محسوس ہوتا۔ جاوید شوقین آدمی تھا' ہفتے میں ایک آدھ بار کہیں نہ کہیں سے وہسکی لے آتا جو ظہور کی ایک اور کمزوری تھی۔ نبیلہ رات گئے تک اپنے گانوں کا ریاض کرتی اور ظہور اسے فن کی باریکیوں پر لیکچر دیتا' راگ راگنیاں سمجھاتا۔ فن کی خدمت کا یہ سلسلہ اکثر رات گئے تک جاری رہتا۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ جاوید سونے چلا جاتا اور ظہور نبیلہ کے ساتھ اس وقت تک گفتگو میں مشغول رہتا جب تک اس کی توبہ شکن انگڑائیاں جماہیوں میں تبدیل نہ ہو جاتیں۔ یا ظہور کا ڈرائیور دروازہ کھٹکھٹا کر اسے یہ یاد نہ دلاتا کہ وہ اسے لینے آگیا ہے اور باہر گاڑی میں بیٹھا سو رہا ہے۔

رات کو دیر سے واپسی کا سلسلہ مستقل ہوا تو ظہور کی بیوی کو تشویش ہوئی۔ تشویش اس وقت جھگڑے میں بدل گئی جب ہر شام تلاش کا سرا نبیلہ کے گھر پہنچتا۔ ڈرائیور سے تفتیش کی تو اس نے صاحب کے شب و روز کا حساب بتا دیا۔ ظہور نے بیوی کو سمجھایا کہ وہ پاکستان کے قومی دن کی تقریب کے لئے نبیلہ کو قومی ترانے تیار کرا رہا ہے۔ اس کی بیوی عاصمہ ایک پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی تھی۔ مطمئن تو نہیں ہوئی لیکن خاموش ہو گئی۔ قومی دن کی تقریب میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ دیکھے گی کہ ظہور کے بیان میں کتنی صداقت ہے۔ ویسے ظہور نے غلط نہیں کہا تھا۔ نبیلہ اور اس کا شوہر جاوید اس بات پر ظہور کے بہت احسان مند تھے کہ وہ

پاکستان کے قومی دن کی تقریب میں نبیلہ کو گانے کا موقع دے رہا تھا۔ ایک رات اس نے سازندے بلا کر فائنل ریہرسل بھی کرائی تھی۔

عاصمہ کو معلوم تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہو گا۔ لیکن وہ ظہور کے عاشقانہ مزاج سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ظہور عاشق ہونے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتا اور اس میں شادی شدہ یا غیر شادی شدہ کی تخصیص کا بھی قائل نہیں تھا۔ ظہور اپنے یہ کارنامے اسے بڑے فخر کے ساتھ سنایا کرتا تھا۔ وہ ظہور کے طریقہ واردات سے بھی واقف تھی۔ اسے یاد تھا کس جارحانہ انداز سے اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا۔

ظہور کہتا تھا عشق کرنا اس کے خون میں شامل ہے۔ عشق کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس طرح کا کوئی قصہ تو اسے یاد نہیں تھا کہ پیدا ہوتے ہی اس نے نرس کا انگوٹھا تھام کر چھوڑنے سے انکار کر دیا ہو۔ کیونکہ اس کی پیدائش کے زمانے میں بچے اسپتال میں نہیں گھر میں پیدا ہوتے تھے اور اس کام کو انجام دینے والی خرانٹ شکل کی دائی صرف بچوں کو ڈرانے کے لئے استعمال کی جا سکتی تھی۔ لیکن ظہور کو اپنا پہلا عشق اور بوسہ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ اپنے آپ سے چار سالہ بڑی اپنی خالہ زاد بہن پر عاشق ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ لیکن پھر بھی اسے منی کے ساتھ گھس کر سونا بہت پسند تھا۔ بچپن کی اس گرم دوپہر کو ظہور اور منی دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر چور چور کھیل رہے تھے۔ ظہور اور منی کمرے کی دیوار میں بنی ہوئی الماری کے نچلے حصے میں گھس کر چھپ گئے۔ جگہ کشادہ تھی لیکن دو بچوں کے لئے تنگ تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے تقریبا" لپٹے ہوئے تھے۔ منی کی سانسیں تیز ہونے لگی تھیں۔ ظہور نے اچانک ہی بڑھ کر منی کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا۔ اس نے ایک دفعہ اپنے ابا کو اپنی امی کے ہونٹ چومتے دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر ہی بہت مزا آیا تھا۔ بوسے کی نمکین سی لذت اسے آج بھی یاد تھی۔ بارہ سال کی عمر میں بھی منی کی ناک ہر وقت بہتی رہتی جو ظہور کے ہونٹوں پر منتقل ہو گئی تھی۔ زبان چاٹتے ہوئے جو کھارا مزا محسوس ہوا وہ بھول نہیں سکا تھا۔ ساتھ ہی سر کی

چوٹ بھی نہیں بھولی تھی۔ منی اسے زور سے دھکا دے کر الماری سے نکل بھاگی تھی۔ ظہور کا سر دیوار سے بری طرح ٹکرایا تھا۔

آٹھ سے اٹھارہ سال تک پہنچتے پہنچتے اس سے بہت سے عشق سرزد ہوئے۔ اکثر یکطرفہ رہے۔ جو دو طرفہ رہے انہوں نے بوسوں کا ذائقہ نمکین سے میٹھا کر دیا۔ کالج اور یونیورسٹی میں تو کئی کئی عشق ایک ساتھ چلتے لیکن ان میں سے اکثر ضرورتوں کا سودا تھے۔ کسی کو غزل لکھ کر دینی، کسی کی تقریر تیار کرنی، کسی کو انگریزی میں پاس کروانا۔ ظہور جن سے عشق کرتا تھا ان کی پوری طرح خدمت بھی کرتا تھا۔

عاصمہ سے ظہور کی ملاقات کویت آنے سے چند مہینے پہلے ہی ہوئی تھی۔ یونیورسٹی چھوڑے برسوں ہو گئے تھے۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ نے ظہور میں بہت ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا لیکن عشق کے معاملے میں طبیعت اسی طرح سیلانی تھی۔ وہ اس زمانے میں اطلاعات کی وزارت میں آفیسر تھا اور سماجی بہبود کے محکمے میں کام کرنے والے ایک دوست نے عاصمہ کو اس کے پاس بھیجا تھا۔ عاصمہ سوشل ویلفیئر کے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی جس کے لئے اسے اخبارات میں پبلسٹی کی ضرورت تھی۔ سوشل ویلفیئر کی وزارت کی تعلقات عامہ کے کام کا چارج ظہور کے پاس تھا اور عاصمہ جیسی لڑکی پروجیکٹ لے کر آئی تھی اس لئے ظہور کی کارکردگی ایسی تھی کہ اس کے نتائج نے سوشل ویلفیئر والوں کو حیران کر دیا۔ عاصمہ بھی بہت متاثر اور خوش تھی۔ پروجیکٹ کی کامیابی اس کے اپنے کیریئر کی کامیابی کے لئے ضروری تھی۔ ظہور سرکاری جیپ پر عاصمہ کو ساتھ لئے اخبارات کے دفتر میں جاتا۔ عاصمہ ظہور کے تعلقات پر حیران تھی۔ ایڈیٹر سے لے کر رپورٹروں اور ڈیسک پر کام کرنے والے سب ایڈیٹروں تک سے اس کے ذاتی مراسم تھے۔ اسی لئے خبریں اس طرح چھپوانے میں جس طرح عاصمہ اور اس کا ڈپارٹمنٹ چاہتا تھا، کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ ظہور چاہتا تو ایک ہی دن میں تمام اخبارات نمٹا دیتا۔ لیکن تین دن تک وہ عاصمہ کو مختلف اخباروں میں لے جانے کے بہانے بلاتا رہا۔ اخباروں کے دفاتر سے واپسی پر وہ پریس کلب جاتے جہاں ظہور کی مقبولیت دیکھ کر عاصمہ ایک بار پھر متاثر ہوتی۔ آخری دن جس کے بعد عاصمہ کے ظہور کے پاس آنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا، وہ اسے کھانا کھلانے سوسائٹی میں

نرسری کے ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا جو یونیورسٹی کے زمانے سے ظہور کا پسندیدہ مقام تھا۔

ریسٹورنٹ کا ماحول روشنیاں کم کر کے رومانی بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ آمنے سامنے لیدر کی آرام دہ نشستیں تھیں جن کی پشت پارٹیشن کی طرح اونچی تھی۔ گاہکوں کا رش کم تھا۔ چند رومان زدہ جوڑے ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کر رہے تھے یا کھانا کھاتے اور چائے کافی پیتے ہوئے قربت کے مزے اٹھا رہے تھے۔ عاصمہ ریسٹورنٹ میں ظہور کے ساتھ آتے ہوئے جھجکی تھی، لیکن منع بھی نہیں کر سکی تھی۔

"آپ میرے لئے پہلے ہی بہت کچھ کر چکے ہیں۔ تین دن سے آپ کے سر پر سوار ہوں۔ کھانا کھلا کر آپ مجھے اور زیر بار کر دیں گے۔" عاصمہ نے ظہور کے سامنے کی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اس اچھے اور ٹھنڈے ماحول میں مجھ سے تھوڑی دیر بے تکلفی سے باتیں کر لیں، اگر آپ پر میں نے واقعی کوئی احسان کیا ہے تو وہ اتر جائے گا۔ اچھے ماحول میں خوبصورت عورت سے گفتگو کرنا میرا سب سے دل پسند مشغلہ ہے لیکن اس کے مواقع آج کل کم آتے ہیں۔ آج کل خوبصورت عورتیں ناپید ہیں۔ اب تم اتنی مشکل سے ہاتھ آئی ہو تو اس طرح کیسے جانے دوں۔" ظہور نے بہت مضبوط جال عاصمہ کی طرف پھینکا۔ عاصمہ اس اچانک حملے پر شرمانے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

"تمہیں پتہ ہے میں شاعر بھی ہوں۔" ظہور نے اپنی گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر ایک اور سوال داغ دیا۔ "اور تمہیں معلوم ہے میں نے شاعری کیوں شروع کی تھی؟" ظہور نے اس دفعہ خاموش ہو کر عاصمہ کی طرف دیکھا۔

"دل پر کوئی چوٹ کھائی ہو گی۔" عاصمہ نے اپنی خاموشی توڑی لیکن پھر جھینپ کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔

"نہیں دل میرا چوٹ پروف ہے۔ میں نے پہلی غزل نویں جماعت میں اس وقت کہی تھی جب میرے اردو کے استاد نے بتایا تھا کہ غزل کا لغوی مطلب ہے

عورت سے گفتگو کرنا۔ اس زمانے میں عورت سے گفتگو سہانے خواب کی طرح تھی۔ میں غزل کہنے لگا اور سچ مچ بہت مزا آتا۔ آنکھیں بند کر کے اپنی غزل گنگناتا تو ایسا لگتا خوبصورت عورتوں کی ایک صف میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہو۔" ظہور خاموش ہو کر عاصمہ کے چہرے پر اس کا ردعمل دیکھنے لگا۔

"ایک ساتھ اتنی عورتوں سے گفتگو کرنے میں دشواری نہیں ہوئی۔" عاصمہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور ظہور ہنستے ہوئے سوچنے لگا بالکل ہی بے زبان نہیں ہے۔

"گفتگو کے لئے سچ مچ کی عورت کب میسر آئی۔" عاصمہ نے ایک اور وار کیا۔

"تصور میں آنے والی لڑکیوں کی قطار کالج پہنچتے پہنچتے حقیقت بن گئی۔ بلکہ یوں ہوا کہ لڑکیوں کو میں میسر آگیا۔" ظہور نے ذرا اکڑتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے آپ کو اپنے پلے بوائے ہونے پر بہت فخر ہے۔" عاصمہ نے پھر چوٹ کی۔

"نہیں نہیں۔ میں پلے بوئے نہیں ہو سکتا۔ میں اردو میڈیم والا بہت دقیانوسی عاشق ہوں۔ پلے بوائے کی اصطلاح مجھ پر نہیں سجتی۔ پلے بوائے تو ڈیفنس یا کلفٹن میں رہنے والا وہ شخص ہو سکتا ہے جس کا حلیہ انگریزی فلموں کے ولن جیسا ہوتا ہے۔ جو اسپورٹس گاڑی چلاتا اور رقص گاہ کے فرش پر بہت تیزی سے پھسلتا اور مٹکتا ہے۔ وہ اٹھارویں صدی کے عاشقوں کی طرح آہیں نہیں بھرتا۔ محبت کے کھیل میں اپنے ساتھ شریک ہونے والی حسیناؤں کا احسان نہیں مانتا۔ ان کے ناز و ادا پر واری نہیں ہوتا بلکہ نظرانداز کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ کام ہم جیسے روایتی عاشقوں نے سنبھالا ہوا ہے۔ جہاں آپ کا نقش قدم نظر آیا' وہیں اپنی جبیں گاڑ دی۔ ذرا سی لفٹ ملتے ہی سر پر بٹھانے کو تیار ہو گئے۔ کھانا کھانے ساتھ میں ہوٹل آ گئیں تو برتن دھونے ان کے گھر تک چلے گئے۔" ظہور کی گفتگو کے دوران عاصمہ ہنستی رہی۔

"میرے گھر کے برتن دھونے کب آئیں گے۔" عاصمہ نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔

"اگلی منزل وہی ہے۔ یہاں سے سیدھا تمہارے گھر چلیں گے۔ وہاں کوئی ہو گا تو نہیں؟" ظہور نے شرارتی نظروں سے عاصمہ کو دیکھ کر کہا۔ عاصمہ جھینپ کر

نظریں چرانے لگی۔ دونوں اسی طرح اپنے یونیورسٹی کے دنوں کی باتیں کرتے اور کھانا کھاتے رہے۔ بیرا کھانے کے برتن سمیٹ کر چائے سجا گیا تھا۔ برابر کی رو میں ایک میز پر ایک نوجوان جوڑا بھی کھانا کھا کر اب چائے پی رہا تھا۔ دونوں طالب علم لگتے تھے۔ لڑکی بہت سمٹی ہوئی ڈری سی بیٹھی تھی۔

"تمہارے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے اس جوڑے کو دیکھ رہی ہو۔" ظہور نے اس کی طرف عاصمہ کی توجہ مبذول کرائی۔

"جی۔ کیا ہوا' آپ کے جاننے والے ہیں؟" عاصمہ نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"نہیں۔ لیکن میں تمہیں یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ دونوں پہلی بار ڈیٹ پر آئے ہیں۔ یہ لڑکا اب ہاتھ دھونے کے بہانے اٹھے گا اور واپس آکر سامنے اپنی نشست پر بیٹھنے کی بجائے لڑکی کے برابر آ بیٹھے گا۔" ظہور نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"اچھا! پھر کیا ہو گا؟" عاصمہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکی کی قسمت کا حال بتانے کے بہانے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے گا۔ اپنی حس مزاح کی تمام صلاحیتیں استعمال کر کے لڑکی کو ہنسائے گا۔ پھر اس کا ہاتھ انگڑائی کے بہانے اٹھ کر ساتھ والی نشست کی پشت پر دراز ہو جائے گا اور آہستہ آہستہ بڑے غیر محسوس انداز میں لڑکی کے شانے پر آرام کرنے لگے گا۔ مذاق ختم ہو جائے گا اور کہانی اپنے کلا مکس پر پہنچ جائے گی۔ لڑکا لڑکی کی اٹھی ہوئی خوابیدہ آنکھوں میں جوتوں سمیت ڈوب جائے گا۔ لڑکی آنکھیں جھکا لے گی لڑکی کے شانے پر رکھے ہوئے لڑکے کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو جائے گی اور ایک ہلکے سے کھنچاؤ سے لڑکی کا سر پکے پھل کی طرح لڑکے کے سینے پر آگرے گا۔ تھوڑی دیر تک دونوں کے لئے کائنات کی گردش تھم جائے گی۔ بہت خوشگوار سناٹا چھا جائے گا۔ صرف دونوں کے تیز سانسوں کی آوازیں رسیلے سروں کی طرح نغمہ بن کر گونجیں گی۔" ظہور نے کمنٹری ختم کر کے خاموش ہو کر دیکھا تو لڑکا اپنی جگہ سے اٹھ کر ہاتھ دھونے چلا گیا تھا۔

"آپ کی پہلی پیش گوئی تو پوری ہو گئی۔" عاصمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابھی دیکھئے آگے ہوتا ہے کیا۔" ظہور نے کہا اور چائے کی چسکیاں لینے لگا دونوں پھر اسی طرح ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ ظہور کی تمام تر توجہ عاصمہ کی طرف تھی جو کبھی کبھی کنکھیوں سے رومان زدہ جوڑے کی طرف بھی دیکھ لیتی۔ آخر عاصمہ نے ایک گہرا سانس لیا اور میز پر ظہور کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"اس طرف دیکھئے لڑکی نے اپنا سر لڑکے کے سینے پر ٹکا دیا ہے۔ سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا ہے جس طرح آپ نے بیان کیا تھا۔ بہت تجربہ ہے آپ کو۔" اس کے لہجے میں شوخی تھی اور طنز بھی۔

"تجربہ نہیں۔ مشاہدہ۔" ظہور نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب کیا ہو گا۔" عاصمہ نے پوچھا۔

"ہوں۔" ظہور نے گہری سوچ میں ڈوبنے کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ "دو تین سال بعد یہ دونوں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس اپنے نومولود بچے کی کھانسی کا علاج کرانے کے لئے بیٹھے ہوئے مل جائیں گے۔" عاصمہ ہنسنے لگی۔

"آپ کی کوئی کہانی اب تک اس انجام کو کیوں نہیں پہنچی۔" عاصمہ نے ظہور کو شرارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ یہ میرا طریقہ واردات نہیں۔ بہت عام قسم کے لوگوں کا ہے۔ میں تو ڈائریکٹ ایکشن پر یقین رکھتا ہوں۔" ظہور یہ کہہ کر اچانک اٹھا اور عاصمہ کے برابر سیٹ پر بیٹھ کر اپنے ہاتھ اس کے شانوں کے گرد حمائل کر کے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس سارے عمل میں صرف چند سیکنڈ لگے ہوں گے۔ عاصمہ ارے ارے کرتی ہوئی خود کو چھڑانے لگی۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا سمجھے گا۔" اس نے خود کو ظہور کی گرفت سے آزاد کرا لیا تھا۔

"کوئی نہیں دیکھ رہا۔ تم اتنا ڈرتی کیوں ہو۔ اور پھر ہم نے کیا بھی کیا ہے۔ ذرا سا تمہیں قریب ہی تو کیا ہے۔ پیار تک نہیں کیا۔" ظہور نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

"وہ بیرا دیکھ رہا تھا جو برتن سمیٹنے آ رہا تھا لیکن تمہاری حرکت دیکھ کر واپس پلٹ گیا۔ وہ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا لڑکا بھی جھک جھک کر بار بار اندر اسی طرف دیکھ رہا

ہے۔ اور یہ برابر بیٹھا ہوا جوڑا بھی اپنا رومانس چھوڑ کر ہم کو دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ ظہور تم پلیز اٹھ کر اپنی سیٹ پر واپس چلے جاؤ اور جلدی سے بل دے کر یہاں سے نکلو۔ مجھے سخت شرمندگی ہو رہی ہے۔ ہماری عمریں اب اس طرح کے رومانس والی نہیں ہیں۔" عاصمہ نے اپنی آواز اور غصے کو دباتے ہوئے کہا۔ ظہور اٹھ کر واپس اپنی سیٹ پر چلا گیا۔

"یہ تمہارا وہم ہے۔ کوئی نہیں دیکھ رہا۔ اور پھر میں تمہارے برابر بیٹھوں یا سامنے، جو دیکھ رہے ہیں وہ یہیں سمجھیں گے کہ تم میری محبوبہ ہو یا ہونے والی ہو۔" ظہور نے حقیقت پسندانہ لہجے میں کہا۔

"لیکن تمہیں پتہ ہے اور مجھے پتہ ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔" عاصمہ نے بھی اپنے لہجے کو حقیقت پسندانہ بناتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔" ظہور نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ میرے لئے یہ اتنا آسان نہیں ہے مجھے کسی سے جذباتی تعلق استوار کرنے میں شاید زمانے لگیں گے۔ تم بہت بے صبرے لگتے ہو۔ اتنا انتظار نہیں کر سکو گے۔" عاصمہ نظریں جھکائے ہوئے اس طرح بول رہی تھی جیسے خود سے باتیں کر رہی ہو۔

"نہیں نہیں میری تمنا اتنی بے تاب نہیں ہے۔ اور تمہیں بھی زمانے نہیں لگیں گے۔ تم میری صلاحیتوں سے واقف نہیں ہو۔ دیکھو تم میرے ایک ہی حملے میں آپ سے تم پر آ گئیں۔ ویسے مجھ سے واقعی بیوقوفی ہوئی ہے۔ مجھے ہاتھ دیکھنے والے روایتی طریقے سے ابتداء کرنی چاہئے تھی۔ میں سمجھا تھا شاید زمانہ اب آگے نکل آیا ہے۔ لیکن لگتا ہے ہاتھ دیکھنے والا فارمولا آج بھی اور ہم تم جیسے لوگوں میں بھی چلے گا۔" ظہور نے ماحول سے تناؤ کم کرنے کی کوشش کی۔

"شاید آپ نے مجھے بہت سہل الحصول سمجھ لیا تھا جو پہلی ہی ملاقات میں ڈائریکٹ ایکشن پر اتر آئے۔" عاصمہ پھر آپ پر واپس آ گئی تھی۔ لہجے میں تلخی تھی اور کچھ شکایت بھی۔

"چلو چھوڑو۔ مجھے معاف کر دو۔ آئی ایم سوری۔ لاؤ میں تمہارا ہاتھ دیکھتا

ہوں۔ مجھے سچ مچ ہاتھ دیکھنا آتا ہے۔" ظہور نے اس کا ہاتھ ہاتھ میں لیا۔ عاصمہ نے زیادہ مدافعت نہیں کی۔ لیکن ہاتھ زیادہ ڈھیلا بھی نہیں چھوڑا۔

"سب سے پہلے تمہاری شادی کی لکیر دیکھتے ہیں۔" ظہور نے عاصمہ کی ہتھیلی موڑتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"نہیں مجھے شادی وادی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے شادی کی لکیر نہیں دکھانی۔" عاصمہ کے چہرے پر ایک سفید سا رنگ آکر گزر گیا تھا۔

"کیوں؟ کیا کوئی گہری چوٹ؟" ظہور نے پوچھا۔ اس نے عاصمہ کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ لیکن اس کی نظریں اب عاصمہ کے چہرے پر تھیں جو اسے نہیں دیکھ رہی تھیں بلکہ دیوار کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھی۔

"وہ نوجوانی کی ایک حماقت تھی جو شادی کی دہلیز تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن جو انگلی پکڑ کر وہاں تک لایا تھا دہلیز عبور کرنے سے پہلے ہی اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔" عاصمہ نے اسی طرح دیوار پر نظریں گاڑے ہوئے کہا۔

"وہی بے وفا محبوب کا قصہ۔ شادی کا وعدہ کر کے عشق کی بیل چڑھانا اور پھر دھوکہ دے کر بھاگ جانا۔ میں اس منظر نامے کے سخت خلاف ہوں۔" ظہور نے اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے عاصمہ کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"وہ ایسا نہیں تھا۔ وہ شادی بھی کر لیتا۔ بس عین موقع پر اسے ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ امریکہ سے آنے والی ایک گرین کارڈ ہولڈر لڑکی کا رشتہ اسے مل گیا تھا۔ وہ ایم اے کی ڈگری کا پرزہ ہاتھ میں لئے مستقبل کے اندھیروں میں بھٹک رہا تھا۔ سبز کارڈ کے جادوئی قالین پر بیٹھ کر امریکہ اڑ گیا۔" عاصمہ کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"لگتا ہے تم اب تک اسے بھولی نہیں ہو۔" ظہور نے مزید کریدنا چاہا۔

"نہیں اب وہ ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے یاد رکھا جاتا۔ پچھلے دنوں وہ لڑکی مجھ سے ملنے آئی تھی جس کا گرین کارڈ اس کی شادی کا سبب بنا تھا۔ اس لڑکی نے شادی کر کے اسے اپنا تن من ہی نہیں رہنے کے لئے چھت اور ساری آسائشیں بھی دی

تھیں۔ اسے پردیس میں انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔ لیکن جب وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تو اس نے اس لڑکی کو بھی چھوڑ دیا۔ میں سوچتی ہوں اچھا ہی ہوا تھا کہ اس سے میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مجھے شادی کر کے چھوڑتا تو شاید مجھ میں ٹوٹ پھوٹ زیادہ ہوتی۔" وہ خاموش ہو کر کہیں کھو گئی۔ شاید ان وسوسوں میں کہ جو ہوتا یہ تو کیا ہوتا۔ بیرا اس عرصے میں برتن سمیٹ کر لے گیا تھا۔ برابر والا نوجوان جوڑا اٹھ کر چلا گیا تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا لڑکا بھی اندر جھانکنے کے بجائے کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ عاصمہ اٹھ کر ٹائلٹ چلی گئی۔ واپس آئی تو سامنے بیٹھنے کے بجائے ظہور کے ساتھ ہی اس کی نشست پر بیٹھ گئی۔ ظہور نے کچھ کہے یا حیرت ظاہر کئے بغیر اپنا ہاتھ اُس کے شانے پر دراز کر دیا۔ عاصمہ کا سر خودبخود ظہور کے شانے پر ٹک گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ عاصمہ کی تو آنکھیں ہی بند تھیں۔ اس کے لئے کائنات کی گردش تھم گئی تھی۔ بہت خوشگوار سا سناٹا چھا گیا تھا۔ دونوں کے سانسوں کی آوازیں رسیلے سروں کی طرح نغمہ بن کر گونج رہی تھیں۔

چند لمحوں بعد عاصمہ ہڑبڑا کر سیدھی بیٹھ گئی۔ ایسا لگتا تھا کسی خواب سے چونک کر بیدار ہو گئی ہو۔

"چلیں بہت دیر ہو گئی۔ گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو جائے گا۔ دیر ہو جائے تو میری ماں پریشان ہونے لگتی ہے۔" اس نے ظہور کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ظہور بھی سیدھا ہو کر بل لانے کے لئے بیرے کو آواز دینے لگا۔

"پھر کب ملو گی۔" ظہور نے ریسٹورنٹ سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"جب کہو۔ لیکن کسی کھلی جگہ پر۔ ایسی بند جگہ نہیں۔" عاصمہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"فلم دیکھنے کے بارے میں کیا خیال ہے۔" ظہور نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"پھر وہی اندھیروں میں ملنے کی باتیں۔" عاصمہ نے شوخ نظروں سے اسے

دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج کے تجربے کے بعد تو تمہیں مجھ سے نہیں ڈرنا چاہئے۔" ظہور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے تم سے نہیں اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے۔ کہیں ہم کسی ایسے موڑ پر نہ پہنچ جائیں جہاں جانے کے لئے ہم دونوں میں سے شاید کوئی تیار نہ ہو۔" عاصمہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تمہارے گھر آ جاؤں گا۔ تم مجھے اپنے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھلانا اگر تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔" ظہور نے حجت ختم کرنی چاہی۔

"میرے گھر میں اعتراض کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ اکیلی رہتی ہوں۔ میری دو بہنیں اور ہیں۔ ایک شادی ہو کر اسلام آباد چلی گئی ہے۔ دوسری کے پانچ بچے ہیں جو اسے اپنے گھر سے ہلنے نہیں دیتے۔ میرے ایک عمر رسیدہ ماموں میرے ساتھ رہتے تھے' وہ بھی آج کل اپنی بیٹی کے پاس میرپور خاص چلے گئے ہیں۔ میری ماں تمہیں دیکھے گی تو بہت خوش ہو گی اور اس کے کانوں میں پھر سے میری شادی کی شہنائیاں بجنے لگیں گی۔ وہ دن رات اسی پریشانی میں رہتی ہے کہ وہ مر گئی تو میرا کیا ہو گا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ کوئی لڑکی شادی کے بغیر تنہا رہ سکتی ہے۔" عاصمہ نے کھل کر اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔

"ٹھیک ہے' پھر ایسا کرو کہ پرسوں چھٹی ہونے پر میرے دفتر کی طرف چلی آؤ۔ ہم انٹرکان میں شام کی چائے پئیں گے۔ وہاں آج کل سموسے بہت اچھے بنتے ہیں رات ہونے سے پہلے میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔ اسی وقت کوئی اگلا پروگرام بھی بنا لیں گے۔" ظہور کو معلوم تھا کہ عاصمہ کو شادی کا وعدہ چاہئے۔ وہ مستقل کسی نہ کسی بہانے اسی موضوع کے گرد بھٹک رہی تھی۔ لیکن ظہور کو شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ عاصمہ سے اپنے تعلقات کو شادی کے کسی وعدے پر استوار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ نہ ہی اس مسئلے پر کوئی دو ٹوک بات کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس طرح چڑیا اڑ جائے گی۔

عاصمہ کا گھر آ گیا تھا۔ وہ پرسوں آنے کا وعدہ کر کے اتر گئی اور ظہور اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کی چال جو دائرے بنا رہی تھی اس نے ظہور کے دل میں ہلچل مچا دی تھی۔ وہ سوچنے لگا اس نے اسے کل ہی کیوں نہیں بلا لیا۔ پرسوں تک کا دن وہ کیسے گزارے گا۔

وہ پرسوں ملی اور پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ عاصمہ نے ظہور کو ایک فاصلے پر رکھا تھا۔ ایسا کوئی موقع نہیں آنے دیا تھا کہ ظہور کو کسی پیش رفت کا موقع ملتا۔ ایک دن ظہور کو کسی سرکاری کام سے حیدر آباد جانا تھا۔ اس نے عاصمہ کو بھی دعوت دے دی۔

"تمہارے محکمے کا وزیر سوشل ویلفیئر کے ایک بڑے پروجیکٹ کا حیدر آباد میں افتتاح کر رہا ہے۔ مجھے اس کی خبریں چھپوانے کے لئے جانا ہے۔ تم بھی چلو۔ تمہارے محکمے کے سارے افسر ہوں گے۔ وزیر کی نظروں میں آؤ گی تو ترقی کے امکانات بڑھیں گے۔ لیکن رات کو وہیں رکنا ہو گا۔ میں تو ریسٹ ہاؤس میں رہوں گا۔ تمہارے لئے کسی فیملی کے ساتھ رہنے کا بندوبست ہو جائے گا۔" ظہور کو اندازہ نہیں تھا کہ عاصمہ فوراً" ہی تیار ہو جائے گی۔

"میری ایک یونیورسٹی کی دوست حیدر آباد میں رہتی ہے' مجھے کئی دفعہ بلا چکی ہے۔ میں اس کے پاس رہ جاؤں گی۔ ماں کا مسئلہ ہو گا' اسے بہن کے پاس چھوڑنا ہو گا۔ وہ اکیلی نہیں رہ سکتی۔ لیکن جانا کب ہے۔" عاصمہ قطعی طور پر تیار تھی۔

"دو دن بعد۔ تم اپنا سامان دفتر لیتی آنا۔ ہم بارہ بجے نکلیں گے' میرے پاس دفتر کی جیپ ہو گی۔ تم میرے ساتھ ہی چلنا۔" ظہور نے پروگرام کو فائنل کر دیا۔

حیدر آباد پہنچتے پہنچتے انہیں دو بج گئے تھے۔ ظہور جیپ کو تیز نہیں دوڑا سکا تھا کیونکہ راستے بھر بوندا باندی ہوتی رہی تھی جس سے سڑک بہت چکنی ہو گئی تھی۔ لیکن ابر آلود موسم اور ہلکی ہلکی خنکی میں سفر بہت خوشگوار گزرا تھا۔ پھر ظہور کی باتیں اور لطیفے۔ عاصمہ کھل کر ہنس رہی تھی۔ حیدر آباد پہنچ کر پہلے وہ عاصمہ کی سہیلی کے گھر گئے' وہاں سامان رکھ کر ریسٹ ہاؤس آئے جہاں ظہور نے اپنا سامان رکھنا تھا۔ اس

وقت تک بوندا باندی بارش بن گئی تھی۔ چوکیدار نے ظہور کو کمرہ دکھایا اور تھوڑی دیر میں ان کے لئے گرم گرم چائے بھی لے آیا جو اس سردی میں بہت غنیمت تھی لیکن انہیں بھوک لگی تھی۔ راستے میں کہیں کھانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

"بابا کچھ کھانے کو بھی مل سکے گا۔" ظہور نے ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار سے پوچھا۔

"جی بابو ضرور ملے گا۔ بس گھنٹے سے تھوڑا اوپر لگے گا' میں آپ کے لئے تازہ پکا کر لاتا ہوں۔ جب تک آپ کہو تو گزارے کے لئے کچھ بسکٹ دے جاؤں۔" چوکیدار نے پیشکش کی۔

"نہیں بس چائے کافی ہے۔ ہم تمہارے کھانے کا انتظار کریں گے۔" ظہور نے چوکیدار کو سو سو روپے کے دو نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ چوکیدار نوٹ لے کر دروازہ بھیڑ کر چلا گیا۔

ریسٹ ہاؤس شہر سے دور بہت خوبصورت مقام پر واقع تھا۔ کھڑکی سے وہ بہت خوبصورتی سے ترشا ہوا لان دیکھ سکتے تھے جس کے گرد کیاریوں میں کئی رنگ کے گلاب لگے تھے۔ لیکن تیز بارش نے سارے رنگ گڈ مڈ کر دیئے تھے۔ کھڑکی کے شیشے پر پڑی ہوئی بارش کی بوندیں باہر کے منظر کو دھندلا رہی تھیں۔ اندر کا موسم بھی چوکیدار کے جاتے ہی کچھ چپ چپ سا ہو گیا تھا۔ عاصمہ کھڑی ہوئی کھڑکی کے دھندلے شیشے سے پرے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور ظہور عاصمہ کو دیکھ رہا تھا۔ ظہور کو اپنے جسم میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اسے معلوم تھا عاصمہ اس کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ شاید اسی لئے وہ بہت سکڑی ہوئی کھڑی تھی۔

"کیا سردی لگ رہی ہے۔" ظہور نے کئی لمحوں کے طاری سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ خود اسے بھی اپنی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ہاں۔ شاید!" عاصمہ نے ظہور کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ جذبات کی تمتمائی ہوئی سرخی نے عاصمہ کے چہرے کے گرد ایک ہالہ سا بنا دیا تھا جسے وہ کمرے کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ اسے لگا جیسے عاصمہ کے جسم کی برقی رو اس کے

اپنے جسم سے نکلنے والی برقی رو سے ٹکرا کر جھماکے کر رہی ہے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب صرف جذبے گفتگو کرتے ہیں۔ اس زبان میں جس میں کوئی لکنت نہیں ہوتی۔ ظہور نے جب قدم بڑھا کر عاصمہ کو اپنی بانہوں کے حصار میں کھینچا تو اسے ایسا لگا جیسے یہ سب کچھ ایک خودکار نظام کے تحت ہو رہا ہے۔ عاصمہ کو بھی اس وقت یہی لگا جیسے اس کے جسم کا مصرف صرف ظہور کے جسم میں پیوست ہونا تھا۔ دونوں کے ہونٹ اور زبان پیار کی گفتگو کرنے لگے تھے جسم کا ہر حصہ اس گفتگو سے لطف حاصل کر رہا تھا۔ دیر تک دونوں کے سانس اور اس کے بعد بدن ایک دوسرے میں جذب ہوتے رہے۔

بارش کا شور تھم گیا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں سے بھی نمی کی دھند صاف ہو رہی تھی اور پانی کے قطرے ایک ایک کر کے شیشوں پر اسکیٹنگ کر رہے تھے۔ ظہور اور عاصمہ خواب کی دنیا سے باہر نکل آئے۔ دونوں جلدی سے اترے ہوئے کپڑے پہن کر اور پہنے ہوئے کپڑے ٹھیک کر کے کچھ دیر پہلے کے گزرے ہوئے طوفان کے نقصانات کا جائزہ لے رہے تھے کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں چونکا دیا۔ چوکیدار کھانا لے کر آ گیا تھا۔ چوکیدار ان ریسٹ ہاؤسوں کے نیم اندھیرے کمرے میں جنم لینے والی کہانیوں سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے اس نے ایک گھنٹے پہلے سجے ہوئے بستر کی بے ترتیبی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور مزید کوئی حکم بجا لانے کی پیش کش پر 'کچھ نہیں' سن کر واپس چلا گیا۔ ظہور کو بھوک کھل کر لگی تھی۔ اس نے عاصمہ کو بھی کھانے کے لئے بلانا چاہا لیکن وہ تو بستر کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے ہوئے بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا عاصی؟ آؤ کھانا کھا لو' سردی ہے ٹھنڈا ہو جائے گا۔" ظہور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جواب میں عاصمہ کی سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئیں۔ باہر کی برسات اندر کمرے میں آ گئی تھی۔ سگریٹ پیتا ہوا ظہور تھوڑی دیر کھڑا اسے روتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تسلی دینے کا آغاز کہاں سے کرے۔ اسے پتہ تھا کچھ دیر پہلے دونوں لذتوں کی جس منزل سے ہو کر گزرے ہیں وہ اب عاصمہ کے لئے گناہ کی کھائی بنی ہوئی ہو گی۔ اپنی سب سے قیمتی متاع لٹانے کا احساس

اسے ڈس رہا ہوگا۔ ویسے ظہور کو بھی حیرت تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عاصمہ نے یہ منزل پہلی بار سر کی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کی عمر تیس سے کچھ اوپر ہی رہی ہو گی۔ عشق کی وادیوں میں بھٹک چکی تھی اور بقول خود اس کے شادی کی دہلیز تک پہنچ کر واپس پلٹی تھی۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں تھا۔ بھکنے کے لئے مواقع اور ضرورتیں دونوں تھیں، ایسے میں خود کو بچا کر رکھنا ایک بڑا کام تھا۔ ظہور کی نظروں میں عاصمہ کی عزت اچانک ہی بڑھ گئی۔ وہ اپنے آپ سے شرمندہ بھی ہوا۔ "پہلے اگر اسے معلوم ہوتا تو۔" اس نے سوچا۔ لیکن اب سوچنا بیکار تھا وقت گزر چکا تھا۔ عاصمہ اب بھی رو رہی تھی لیکن طوفان گزر چکا تھا۔ بس بوندا باندی جاری تھی۔ چہرہ اسی طرح ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا۔ ظہور اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"رونا بند کرو عاصی۔ آؤ دیکھو کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کچھ کھا لو۔ پھر ہمیں جانا بھی ہے۔" ظہور نے عاصمہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ عاصمہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ تم بہت کمینے ہو۔ ایک لمحے کے لئے میں کمزور ہوئی اور تم نے مجھے لوٹ لیا۔ تم اسی لئے میرے پیچھے لگے تھے۔ بس جاؤ تمہارا کام ہو گیا مجھے اب اکیلا چھوڑ دو۔" عاصمہ نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے تھے۔ آنکھوں کا مسکارا گالوں کے غازے پر پھیل گیا تھا لیکن چہرے پر غصے کی سرخی نمایاں تھی۔

"نہیں میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ ظہور نے اس کے کندھوں کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔ اس دفعہ اس نے ظہور کا ہاتھ جھٹکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس آنکھیں بند کر کے اپنا سر ظہور کے جسم سے ٹکا دیا۔ اس کے لئے اس وقت اتنی ہی یقین دہانی کافی تھی۔ مزید یقین دہانی کی کوشش بات الجھا سکتی تھی۔ وہ اس وقت اسی خوش فہمی کا شکار رہنا چاہتی تھی کہ ظہور اس کے ساتھ زندگی بھر ساتھ نباہنے کا عہد کر رہا ہے۔

"جاؤ منہ دھو کر آؤ، رو رو کر بھتنی بن گئی ہو۔" ظہور نے اس کا سر سہلاتے ہوئے ماحول سے سنجیدگی کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔ وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر باتھ روم میں چلی

گئی۔ منہ دھو کر واپس آئی تو معمول پر آ گئی تھی۔ دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

عاصمہ آہستہ آہستہ نوالے چبا رہی تھی جو کچھ ہوا تھا' ہو چکا تھا' اس پر بحث بیکار تھی۔ گزرے ہوئے لمحے حقیقت بن کر اس میں جذب ہو رہے تھے۔ ظہور بھی ماحول کو سازگار بنانا چاہتا تھا۔ رونا بسورنا بہت ہو چکا تھا۔

"میرا خیال ہے اس ریسٹ ہاؤس کے پیچھے درختوں کے جھنڈ میں شہد کی مکھیوں کا چھتہ ضرور ہو گا۔" ظہور نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ عاصمہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"شہد کی مکھیاں بہت عقلمند ہوتی ہیں' وہ پیار کی پیمبر ہوتی ہیں اور کسی ایسی جگہ اپنا گھر نہیں بناتیں جہاں غصہ اور نفرت رہتی ہو۔ پیار سے بھرے اس ریسٹ ہاؤس کی پھلواریوں میں بھی شہد کی مکھیوں کا ٹھکانہ ضرور ہو گا۔" ظہور نے بہت خیال انگیز انداز میں کہا۔

"اگر ہوا تو کیا کرو گے۔ کیا ان کا بھی شہد چوسو گے۔" عاصمہ نے ڈنک مارا۔

"نہیں' اگر پہلے معلوم ہوتا تو مکھیوں کو تم پر چھوڑ دیتا۔ کم از کم وہ گناہ نہیں ہوتا جس کا احساس تمہاری سوچوں کا رس چوس رہا ہے۔ جن لڑکیوں کا کنوارا پن محفوظ ہو' شہد کی مکھیاں انہیں نہیں کاٹتیں۔ تمہیں بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کے غول سے گزارتا۔ تم امتحان میں کامیاب ہو کر نکل آتیں تو میں چوکیدار بن کر تمہاری عصمت کی حفاظت کے لئے ڈٹ جاتا۔" عاصمہ کچھ نہیں بولی بس پیچھے سرک گئی۔

"تمہیں پتہ ہے کہ قدیم زمانوں میں کنوارا پن ایک عیب تھا اور ضروری تھا کہ شادی سے پہلے کلنک کا یہ ٹیکہ اتار پھینکا جائے۔ اس کام کے لئے معاوضے پر اجنبی لوگوں کو حاصل کیا جاتا تھا یا قبیلے کے سردار کا موڈ ہوتا تو یہ رسم وہ انجام دیتا۔ بعد میں یہ کام پادریوں اور راہبوں کو دے دیا گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے یہاں حلالے کے لئے مولویوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔" ظہور کا خطیبانہ انداز واپس لوٹ آیا تھا۔ لیکن عاصمہ نے بیچ میں ٹوک دیا۔

"یہ حلالہ کیا ہوتا ہے؟"

"کمال ہے تمہیں حلالہ نہیں معلوم۔ تمہیں پتہ ہے کہ ہمارے یہاں طلاق کتنا آسان کام ہے۔ تین دفعہ طلاق کا جادوئی لفظ کہا اور جان چھڑا لی۔ بعد میں پچھتاوا ہوتا ہے ٹوٹے ہوئے گھر کو جوڑنے کا خیال آتا ہے۔ لیکن شرعی طور پر طلاق دینے کے بعد دوبارہ شادی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بیوی کسی اور سے نکاح پڑھوا کر اس سے طلاق لے پھر عدت پوری کرے۔ یہ یقین ہونے کے بعد کہ وہ حاملہ نہیں ہوئی' سابقہ شوہر سے اس کی دوبارہ شادی ہو سکتی ہے۔ درمیان کی یہ شادی حلالہ کہلاتی ہے' مولانا کی خدمت حاصل کرنے کی کوشش اس لئے ہوتی ہے کہ ان پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ مولانا ڈھنڈورہ نہیں پیٹیں گے۔ یہ کام کسی پڑوسی یا دوست کے سپرد کیا جائے تو اس سے زندگی بھر آنکھ ملانا مشکل ہو جائے اور اجنبی پر تو بھروسہ کیا ہی نہیں جا سکتا' وہ اگر طلاق دینے سے انکار کر دے تو......" عاصمہ خاموش ہو کر ظہور سے نظریں چرانے لگی۔ ظہور کچھ دیر چپ رہ کر پھر بولا۔

"تم قدیم زمانے میں ہوتیں تو احسان مانتیں کہ میں نے تمہارا ایک عیب دور کر دیا' تمہیں شادی کے قابل بنا دیا۔" عاصمہ نے میز پر سے چمچہ اٹھا کر زور سے ظہور کے گھٹنے پر مارا۔

"تم مستقل میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ اب مزید بکواس کی تو سر پر پلیٹ توڑ دوں گی۔" عاصمہ نے کچھ شوخی کچھ غصے سے کہا۔ لیکن اس کا موڈ ٹھیک ہوتا جا رہا تھا۔

"نہیں نہیں میں مذاق نہیں کر رہا تمہیں تاریخ پڑھا رہا ہوں۔" ظہور نے دونوں ہاتھ اٹھا کر پسپائی اختیار کی۔

"مجھے تمہاری یہ بیہودہ تاریخ نہیں سننی۔"

"آگے تو سنو۔ مجھے یقین ہے تمہیں پسند آئے گی۔" ظہور نے عاصمہ کی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر اپنی تاریخ گوئی دوبارہ شروع کر دی۔

"قدیم زمانوں کا یہ دور بدلا تو کنواری لڑکیوں کی قسمت بھی بدل گئی۔ وہ خدا کا اوتار اور ہر مرض کی دوا سمجھی جانے لگیں۔ بارش' دھوپ' خدا کو منانے' فصلوں کو

بڑھانے، ہر کام میں برکت کے لئے ان کا ہاتھ لگنا ضروری تھا۔ کنواری لڑکیاں شیطان بھگانے کا ذریعہ بھی بن گئیں۔ کہا جاتا تھا کہ کنوارے پن کی طاقت کے آگے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ عیسائیوں کی شادی میں دلہن کو شادی گاہ تک لانے میں مدد دینے والی دو لڑکیوں کی جو روایت تم دیکھتی ہو وہ اسی زمانے کی یادگار ہے۔ دلہن کے ساتھ دو کنواری لڑکیاں اسی لئے رکھی جاتی تھیں کہ انہیں دیکھ کر شادی کے موقع پر بدروحیں بھاگ جائیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بدروحوں کے ساتھ دولھا بھی بھاگ جاتا۔" عاصمہ ہنسنے لگی۔ لیکن ظہور نے اسی سنجیدگی سے اپنا بیان جاری رکھا۔

"کنواری لڑکیاں زمین کی زرخیزی کے لئے میلوں پھیلے ہوئے کھیتوں میں ننگے پاؤں دوڑتیں۔ مقدس آگ کا ایندھن بنتیں اور سورج دیوتا کو خوش رکھنے کے لئے آفتابی خداؤں سے بیاہ دی جاتیں۔ دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے ان کی قربانی دی جاتی۔ قربانی کے لئے چنی جانے والی کنواریاں اپنی قسمت پر فخر کرتی ہوئی گہرے اندھے کنوؤں میں اتر جاتیں جو قربانی کی رسم ادا کرنے کے لئے خاص طور پر تیار کئے جاتے۔ انہیں یقین ہوتا کہ کنویں کی تہہ میں دیوتا ان کا انتظار کر رہا ہے جو شادی کر کے انہیں محلوں میں لے جائے گا جہاں وہ ملکہ بنی ہمیشہ راج کرتی رہیں گی۔"

"سب کچھ آج بھی اسی طرح ہے۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔" عاصمہ نے بہت اداس سے لہجے میں کہا۔ "آج بھی تیز روشنیوں اور شہنائیوں کے شور میں زیوروں میں لدی اور سرخ جوڑا پہنے سینکڑوں کنواریاں شادی کے اندھے کنوؤں کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں۔ انہیں بھی یقین ہوتا ہے کہ کنوئیں کی تہہ میں ہار پھول پہنے ان کا جو دیوتا کھڑا ہے وہ ان کو محلوں میں لے جائے گا جہاں وہ ملکہ بنی ہمیشہ کے لئے راج کرتی رہیں گی۔ لیکن ٹوٹتے خوابوں کی کرچیاں بھاری پتھر بن کر انہیں تہہ میں اور نیچے کھینچ لے جاتی ہیں۔ اس اندھے کنویں کی تہہ سے وہ کبھی باہر نہیں نکل پاتیں۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن یہ بھی سوچو کہ لمحے بھر کا یقین کتنے اچھے خواب دکھاتا ہے۔ خواب ٹوٹتے ہیں لیکن زندگی کے اندھے کنوئیں میں جگنو بن کر جگمگاتے رہتے ہیں۔ خواب نہ ہوں تو سانس لینا ایک عذاب بن جائے۔ زندگی شاید خواب

دیکھنے، ان کے ٹوٹنے اور پھر انہیں جوڑ کر دوبارہ دیکھنے کے اسی تسلسل کا نام ہے۔"
ظہور یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس تقریب میں جانے کا وقت ہو گیا تھا جس کے لئے وہ حیدر آباد آئے تھے۔ عاصمہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے تم میری سہیلی کے گھر چھوڑ دینا۔ میں تقریب میں اب نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟" ظہور نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بس مجھے ایسا لگے گا جیسے سب کو پتہ ہے کہ میرے اور تمہارے بیچ کیا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ تقریب میں تم مت جاؤ لیکن رات کو واپسی پر میں تمہیں تمہاری سہیلی کے گھر سے لے لوں گا۔ بہانہ کر دوں گا کہ ہمیں رات کو ہی کراچی واپس جانا ہے۔ رات ہم ایک ساتھ اسی ریسٹ ہاؤس میں گزاریں گے۔"
ظہور نے ذرا ہمت کر کے اپنے عزائم بیان کئے۔ اس کا خیال تھا کہ عاصمہ مان جائے گی۔ اس نے عاصمہ کو نارمل کرنے میں بہت محنت کی تھی۔ پوری تاریخ کھنگال ڈالی تھی۔ لیکن عاصمہ نے اپنے چہرے پر ایک بار پھر نقاب ڈال لی تھی۔

"نہیں بالکل نہیں۔ آپ صبح لینے آئیے گا۔ میں تیار ملوں گی۔" عاصمہ نے اسی طرح نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

"تمہاری مرضی۔ لیکن میں رات کو آؤں گا ضرور۔ تمہاری سہیلی نے مجھے رات کا کھانا اپنے گھر کھانے کی دعوت دی تھی۔ کھانا تو میں نہیں کھاؤں گا لیکن تمہاری خیریت معلوم کرنے ضرور آؤں گا۔" ظہور یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

تقریب سے فارغ ہو کر جب رات کو ظہور اس کی سہیلی کے گھر پہنچا تو عاصمہ وہاں نہیں تھی۔ اس کی سہیلی نے ظہور کو بتایا کہ وہ شام کو کوچ سے کراچی واپس چلی گئی ہے۔ اس نے گھر فون کیا تھا جہاں سے معلوم ہوا کہ اس کی ماں کی طبیعت خراب ہے اس لئے اسے فوری واپس جانا پڑا۔ ظہور کو سچ مچ تشویش ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ عاصمہ کی ماں کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ بھی ریسٹ ہاؤس سے اپنا سامان لے

کر کراچی واپس ہوا۔ اسے عاصمہ کی بہن کا پتہ نہیں معلوم تھا لیکن اس امید پر کہ عاصمہ اپنی ماں کو گھر لے آئی ہو گی اس نے جیپ کا رخ عاصمہ کے گھر کی طرف کر دیا۔ اسے اندازہ تھا کہ عاصمہ جذباتی طور پر آج ایک جھٹکا کھا چکی ہے' اب ماں کی طبیعت اچانک خراب ہونے پر بہت ٹوٹی ہوئی ہو گی۔ بہت دیر تک گھنٹی بجانے کے بعد وہ واپس جانے والا تھا کہ عاصمہ نے دروازہ کھولا اور ظہور کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس نے جلدی سے ظہور کو اندر بلا کر دروازہ بند کر لیا۔ ظہور خاموشی سے چلتا ہوا اس کے پیچھے ڈرائنگ روم تک آیا لیکن بیٹھا نہیں اسی طرح کھڑا رہا۔

"کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔ مجھے بدنام کرنے تم اتنی رات گئے میرے گھر بھی آ گئے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ اگر کسی نے دیکھا ہو گا تو کیا سوچا ہو گا۔" عاصمہ نے ذرا غصیلے لہجے میں کہا۔

"مجھے نہیں معلوم کیا سوچا ہو گا۔ اور نہ ہی مجھے اس کی پرواہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ زمانے بھر سے لڑنے کا حوصلہ رکھنے والی ایک لڑکی اتنی بزدلی سے اور اس خوف کے عالم میں رہ رہی ہے کہ اپنے دروازے پر پڑنے والی ہر نگاہ سے ڈرتی ہے۔ اطمینان رکھو میں نے اپنی جیپ تمہارے گھر سے دور کھڑی کی ہے۔ دروازے پر دستک دینے سے پہلے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا۔ یقین رکھو تمہارے محلے میں تمہاری نیک نامی محفوظ ہے۔" ظہور کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ وہ بیٹھا نہیں تھا۔ اسی طرح کھڑا تھا۔

"لیکن اتنی رات گئے آنے کی ضرورت کیا تھی۔" عاصمہ نے ایک صوفے پر ٹکتے ہوئے کہا۔

"تمہاری سہیلی نے بتایا تھا کہ تمہاری ماں کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ میں نے سوچا تمہیں کسی مدد کی سہارے کی ضرورت ہو گی۔ کیسی ہے تمہاری ماں۔ کہاں ہے۔" ظہور بھی صوفوں کے درمیان رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ تھوڑی دیر اسی طرح خلاء میں گھورتی رہی تو ظہور کی تشویش بڑھ گئی۔ وہ اٹھ کر عاصمہ سے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"بتاؤ۔ کیسی ہے تمہاری ماں۔" ظہور نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
عاصمہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور جا کر سامنے کی نشست پر بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی تک میری بہن کے گھر ہے۔ تمہاری وجہ سے مجھے بھی جھوٹ بولنا آ گیا ہے۔ ماں کی طبیعت کا میں نے بہانا کیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ رات کو جب تم مجھے لینے آؤ گے تو میں شاید منع نہ کر سکوں۔ لیکن تم یہاں تک بھی پہنچ گئے۔ پلیز چلے جاؤ۔ میری عزت کا خیال کرو۔ کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہو گا۔" عاصمہ نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ظہور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر اٹھ کر عاصمہ کے پاس آیا اور اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"اس وقت میرا جانا ٹھیک نہیں ہو گا۔ آتے وقت میں نے احتیاط کر رکھی تھی۔ لیکن اتنی رات گئے کسی نے تمہارے گھر سے نکلتے دیکھا تو تمہارے لئے ٹھیک نہیں ہو گا۔ میں کل دن گئے کسی وقت چلا جاؤں گا۔ کوئی دیکھنے والا نہیں ہو گا۔ کسی نے دیکھا بھی تو دن کے وقت خیال نہیں کرے گا۔ میرے گھر والوں کو معلوم ہے کہ میں رات حیدر آباد میں گزار کر آؤں گا' اس لئے انہیں بھی پریشانی نہیں ہو گی۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ' میں یہیں صوفے پر سو جاؤں گا۔" ظہور نے یہ سب کچھ بہت خلوص سے کہا تھا۔ لیکن جو اس نے کہا تھا وہ اس طرح ہوا نہیں۔ رات اس نے صوفے پر نہیں' عاصمہ کے ساتھ اس کے بیڈ روم میں گزاری۔ اور اس طرح گزاری کہ دونوں نے ایک دوسرے کو سونے نہیں دیا۔ دوسرے دن اٹھتے اٹھتے سورج سر پر آ گیا تھا۔ دوپہر کو ظہور جب عاصمہ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھا کر اور اسے ساتھ لے کر گھر سے نکلا تو شاید دونوں کو یہ پرواہ نہیں رہی تھی کہ انہیں کون اور کن نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

اس کے ایک ہفتے تک ظہور کی عاصمہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس نے کئی دفعہ فون کیا لیکن عاصمہ نے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیا۔ پھر ظہور خود بھی اچانک مصروف ہو گیا۔ اس کا یونیورسٹی کے زمانے کا ایک جاگیردار دوست قومی اسمبلی کا رکن اور حکومت کی آنکھوں کا تارا تھا جس کی کوئی خواہش ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے

ظہور سے بھی پوچھا تھا کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ ظہور کی خواہش پریس اتاشی ہو کر باہر جانے کی تھی وہ اس نے بیان کر دی تھی۔ کاغذات بھی تیار ہو کر چلے گئے تھے' لیکن کافی عرصے تک کچھ خبر نہیں ملی۔ ظہور کو معلوم تھا کہ یہ ایک ناممکن کام ہے نہیں ہوا ہو گا اس لئے وہ بھی خاموش ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن پچھلے ہفتے کویت میں پریس اتاشی کی حیثیت سے اس کی تقرری کے احکامات آ گئے تھے۔ حکم جلدی پہنچنے کا بھی تھا اس لئے ظہور کو دفتری معاملات نمٹانے تھے' اپنی خدمات صوبے سے وفاق کے سپرد کرانی تھیں اور پھر اسلام آباد جا کر پاسپورٹ' ویزا اور بریفنگ کی رسمی کارروائیاں پوری کرنی تھیں۔ وہ ہفتے بھر اس طرح مصروف رہا کہ عاصمہ کا خیال تک اس کے پاس سے نہیں گزرا۔ ایک شام وہ دفتر سے نکلنے ہی والا تھا کہ اچانک عاصمہ پہنچ گئی۔ اس نے آتے ہی ظہور سے کافی پلانے کے لئے ہوٹل لے جانے کی فرمائش کی۔ وہ بہت سنجیدہ لگ رہی تھی۔ تاج محل کے سنسان کافی شاپ کے ایک کونے میں کافی پیتے ہوئے ظہور بڑے پرجوش انداز میں اسے اپنی کویت کی پوسٹنگ کے بارے میں بتاتا رہا لیکن وہ اس طرح بیٹھی رہی جیسے کچھ نہ سن رہی ہو۔ تھوڑی دیر بعد جب ظہور کی لن ترانیوں نے تھوڑا سا وقفہ لیا تو عاصمہ نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔

"تم نے ہمارے بارے میں کیا سوچا ہے۔"

"ہمیں اپنے بارے میں کیا سوچنا ہے۔" ظہور نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ کہ ہم شادی کب کر رہے ہیں۔" عاصمہ نے بالکل غیر جذباتی لہجے میں جواب دیا۔

"شادی؟" ظہور حیرت سے صرف یہی ایک لفظ اپنے حلق سے نیچے اتار سکا۔

"ہاں شادی..... میری ماں اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہے۔ لیکن مرنے سے پہلے میری شادی کرانے پر مصر ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ نکاح پڑھوا کر ہم رسمی کارروائی بھی مکمل کر لیں تاکہ میرے گناہ کا احساس ختم ہو اور میری ماں مرے تو اس کی روح بھی بے قرار نہ رہے۔" عاصمہ نے بہت صاف صاف انداز میں اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ لیکن ظہور کے لئے یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں تھا۔

"میں تم سے شادی کیسے کر سکتا ہوں۔" ظہور نے بہت آہستہ سے کہا۔ اس طرح جیسے وہ یہ سوال عاصمہ سے نہیں خود اپنے آپ سے پوچھ رہا ہو۔

"کیوں نہیں کر سکتے۔ مجھ میں کیا خرابی ہے۔ میری شکل اچھی نہیں ہے، کیا میں پڑھی لکھی نہیں ہوں، میرا خاندان برا ہے یا تم مجھے پسند نہیں کرتے، کسی اور سے شادی کرنا چاہتے ہو۔" عاصمہ نے تیز لہجے میں کہا۔

"نہیں اس میں سے کوئی بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے، تمہیں میرا نوکری کرنا پسند نہیں ہے؟ تم کہو تو میں کل ہی استعفیٰ دے سکتی ہوں۔"

"نہیں یہ بات بھی نہیں ہے۔" ظہور نے بڑی مشکل سے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں!"

عاصمہ کو ایسا لگا جیسے کسی نے لوہے کا بھاری ہتھوڑا اس کے سر پر دے مارا ہو۔ جیسے چاروں طرف سے باجے بجاتی باراتیں اس کے جسم کو روندتی ہوئی گزر رہی ہوں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں اور پلکوں کا جھپکنا رک گیا۔ چہرہ بالکل سفید ہو گیا۔ وہ گہرے سکتے کے عالم میں چلی گئی تھی ظہور نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا لیکن اس کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ظہور نے اس کے دونوں گالوں پر تھپڑ مارے اور آخر میں گلاس میں بھرا ہوا پانی اس کے منہ پر کھینچ مارا۔ عاصمہ ایک جھرجھری لے کر چونک پڑی۔ ہوش میں آتے ہی اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور اس طرح بلک بلک کر روئی جیسے حیدر آباد کے ریسٹ ہاؤس میں روئی تھی۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ وہ ظہور کے ہاتھوں دوسری بار لوٹی گئی ہو۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح روتی رہی۔ کافی شاپ میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ آس پاس بیرے بھی نہیں تھے۔ شاید انہوں نے عشق میں مبتلا جوڑے کو اپنے جذباتی مسائل حل کرنے کے لئے تنہا چھوڑا ہوا تھا۔

ظہور کے لئے عاصمہ کو سمجھانا آسان نہیں تھا۔ یہ اس کی زندگی کی کہانی کا

سب سے پیچیدہ حصہ تھا۔ وہ شادی شدہ تھا' دو بچوں کا باپ تھا لیکن پھر بھی ایسا تھا جیسے غیر شادی شدہ۔ بچپن کے ایک دو دوستوں کے سوا اس کے کسی ساتھی کو' دفتر میں ساتھ کام کرنے والوں میں سے کسی کو اس کی شادی کے بارے میں علم نہیں تھا۔ خود اسے اپنی شادی ایک بھولا بسرا خواب لگتی تھی۔ اس کی شادی' شادی کی طرح ہوئی بھی نہیں تھی۔ یہ ایک قربانی تھی جو اپنے خاندان کے لئے اسے دینی پڑی تھی۔ اس سے چار سال بڑی اس کی خالہ زاد بہن منی کو ظہور کی ماں نے اپنی بیٹی کی طرح پالا تھا۔ منی صرف چھ سال کی تھی جب اس کے ماں باپ اور بڑا بھائی امرتسر میں فرقہ وارانہ فساد کا شکار ہو کر مارے گئے تھے۔ ظہور کے باپ نے بڑی مشکل سے منی کا پتہ چلا کر پناہ گزینوں کے ایک کیمپ سے اسے حاصل کیا تھا۔ ظہور کی ماں نے اپنی ساری محبت اور توجہ منی پر نچھاور کر دی تھی۔ لیکن پھر بھی بچپن کے المئے نے جو زخم ناسور بنا دیئے تھے وہ کبھی ٹھیک نہ ہو سکے۔ منی پر بچپن اور جوانی کے موسم بے اثر ہو کر گزر گئے۔ اداسی کا ایک گہرا سایہ جو ہر وقت اس کے چہرے پر پڑا رہتا تھا عمر کے کسی بھی حصے میں ہلکا نہ ہو سکا تھا۔ شادی کے وقت دلہن بنانے کے لئے منی کے چہرے پر میک اپ کی جو تہہ جمائی گئی تھی اس نے غم کی لکیروں کو اور نمایاں کر دیا تھا اور اس کی آنکھوں کو لال جوڑے کا رنگ بھی نشیلا نہ کر سکا تھا۔

ظہور کے باپ کا منی سے کوئی براہ راست خون کا رشتہ نہیں تھا لیکن وہ بھی منی کے دیوانے تھے۔ شام کو ان کے دفتر سے آتے ہی منی گرم پانی سے بھرا ہوا تسلا لے کر دوڑتی۔ اپنے ہاتھ سے جوتے موزے اتار کر ان کے پیروں کو گرم پانی سے سینکتی۔ کھانے کے وقت گرم گرم پھلکے ڈال کر مستقل باورچی خانے سے کھانے کی میز تک دوڑ لگاتی۔ اس نے انہیں رات کو سونے کے کپڑے بھی کبھی استری کئے بغیر نہیں پہننے دیئے تھے۔ منی کی خدمت انہیں خوش تو کرتی لیکن اس کے چہرے پر ہر وقت چھائی ہوئی اداسی انہیں بھی اداس کر دیتی۔ انہیں دکھ تھا کہ ان کی ساری توجہ اور محبت منی کے چہرے پر ایک مسکراہٹ بھی نہیں سجا سکی۔ انہوں نے منی کو ہنستے مسکراتے کیا روتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ منی نے شاید خود کو ہر طرح کے جذبوں سے

عاری کر لیا تھا۔

ظہور کے باپ کے ایک ڈاکٹر دوست نے منی کی شادی کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ شادی کے بعد اپنا الگ اور نیا گھر منی کو بچپن کے زخم بھولنے اور ایک نئی زندگی شروع کرنے میں مدد دے گا۔ ظہور کے باپ نے اپنے دفتر میں کئی برسوں سے اپنے ساتھ کام کرنے والے ایک دوست کے بیٹے سے منی کا رشتہ پکا کر دیا۔ لیکن منی کی قسمت کاتب تقدیر نے بہت خراب موڈ میں اور بدخط ہو کر لکھی تھی۔ تمام عمر دوسروں کی خدمت اور پابندی سے عبادت کرنے کی عادت نے بھی اس کی قسمت کے نوشتے کا ایک لفظ نہیں بدلا تھا۔ شادی کے کارڈ چھپ کر تقسیم ہو چکے تھے اور شادی میں صرف تین دن باقی تھے کہ دولہا والوں نے شادی منسوخ کر دی۔ انہوں نے بہانہ بنایا کہ منی نفسیاتی مریضہ ہے اور ظہور کے گھر والوں نے شادی کرتے وقت اس کی یہ کیفیت ان سے چھپائی تھی۔ لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ اصل وجہ یہ نہیں تھی۔ ظہور کے باپ کے لالچی دوست کو اپنے بیٹے کے لئے ایک ایسی لڑکی کا رشتہ مل رہا تھا جس کے ماں باپ جہیز میں اور سب چیزوں کے ساتھ فلیٹ بھی دے رہے تھے۔ ظہور کے ماں باپ کو ایسا لگا جیسے منی کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا ہو۔

ظہور اس وقت بی اے کے پہلے سال میں تھا۔ اسے اپنی سرگرمیوں سے فرصت نہیں تھی۔ لیکن وہ رشتوں کے سلسلے میں بے حس اور گھر کے معاملات سے بے خبر بھی نہیں تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر تھی اس لئے خون ابلتا بھی بہت تھا۔ وہ ہاکی لے کر منی کے منگیتر کا سر پھاڑنے اور اس کے ساتھ ہونے والی بے انصافی کا بدلہ لینے چلا گیا تھا۔ کسی کا سر تو نہیں پھاڑ سکا الٹا اپنے سینے پر طنز کے یہ تیر کھا کر آیا کہ اتنی محبت ہے تو وہ خود شادی کیوں نہیں کر لیتا۔ خون کا ابال اور جذبات کا طوفان اترا نہیں تھا اس لئے گھر آتے ہی اس نے اپنے باپ کو یہ جذباتی فیصلہ سنا دیا کہ شادی منسوخ نہیں ہو گی۔ منی سے وہ خود شادی کرے گا۔ ظہور کے ماں اور باپ نے یہ سن کر اپنے بیٹے کی تمام پرانی خطائیں معاف کر دیں۔ شادی اسی دن ہوئی جس دن طے تھی، لیکن جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا وہ اس طرح بے حس تھی جیسے اسے کچھ

خبر نہ ہو۔ شادی کا ہنگامہ ختم ہوتے ہی وہ معمول کے مطابق گھر کے کاموں میں لگ گئی۔ شاید اسی لئے اس نے اپنے ہاتھوں میں مہندی نہیں لگوائی تھی اور یہ کہہ کر منع کر دیا تھا کہ مہندی کی خوشبو سے اسے الٹی ہونے لگتی ہے۔

ظہور نے منی سے شادی کر کے جو قربانی دی تھی اسے وہ نباہ نہیں سکا۔ منی کو بیوی کے طور پر قبول کرنا اس کے لئے ممکن ہی نہ ہو سکا۔ منی مٹی کا ایک بت تھی، یا ایک معمول جو صرف خدمت کرنا اور حکم بجا لانا جانتی تھی۔ وہ مٹی کے اس بت میں کوشش کر کے جان ڈال سکتا تھا، لیکن ظہور کے پاس اس کے لئے وقت نہیں تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں جذبات کی وہ لہر گزر گئی تھی جس نے اسے منی سے شادی کرنے پر اکسایا تھا۔ کالج، اس کے بعد یونیورسٹی، اس کی سیاستوں، ادب و فن کی خدمتوں، دوستوں اور اس کے بعد نوکری اور اپنے کیریئر کو آگے بڑھانے کی کوششوں میں اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ اس کے دو بچے پیدا ہو کر بڑے بھی ہو گئے۔ بچوں سے اس کا رشتہ بس واجبی سا تھا۔ رات کو وہ دیر سے آتا تھا بچے اس وقت سو رہے ہوتے اور صبح اس کے اٹھنے سے پہلے اسکول جا چکے ہوتے یا ظہور ان کے اٹھنے سے پہلے دفتر چلا جاتا۔ چھٹی کے دن باپوں والی رسمی سی گفتگو کرتا اور پھر اپنی مصروفیات میں حصہ لینے گھر سے نکل جاتا۔

منی کے لئے بھی کچھ نہیں بدلا تھا۔ وہ کسی مشین کی طرح سب کی خدمتوں میں مصروف تھی۔ اسی طرح گرم پانی کے تسلے میں ظہور کے باپ کے پاؤں ڈبو کر پانی میں انگلی گھماتی اور رات کو سونے سے پہلے دیر تک ان کے کپڑے استری کرتی رہتی اور جب ظہور کا موڈ ہوتا تو اسے حق شوہریت ادا کرنے کا موقع دینے اس کے ساتھ سو بھی جاتی۔ لیکن دو بچے ہونے کے بعد منی کے جذبے آہستہ آہستہ سرد اور چند سالوں بعد بالکل منجمد ہو گئے۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان کبھی کبھی قائم رہنے والا یہ جسمانی تعلق بھی بالکل ختم ہو گیا۔ لیکن بچوں کو منی اپنی جان کے ساتھ لگا کر رکھتی تھی۔ بچوں کی کیفیتیں اب کبھی کبھی اس کے چہرے پر تاثر ابھارنے لگی تھیں۔ وہ روتے تو ایسا لگتا کہ اس کے چہرے کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔ اور ہنستے تو منی

کے چہرے پر بھی ہلکی سی لالی آ کر گزر جاتی۔ ان کے گھر کے صحن میں نیم کا ایک بڑا سا درخت تھا جس پر دن بھر کوے بیٹھے کائیں کائیں کرتے رہتے۔ اکثر دوپہر میں اس کے بچے نیم کی چھاؤں میں پڑوس کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے۔ ایسی ہی ایک دوپہر ایک کوا منی کے بیٹے کے سر پر چونچ مار کر اڑ گیا' منی دیکھ رہی تھی' اس کے ہاتھ میں جو آیا وہ اس نے اڑتے ہوئے کوے پر پھینک مارا اور پھر جوتا اور دوپٹہ پہنے بغیر ہاتھ میں پتھر لئے گھر سے نکل کر گلی میں دور تک بھاگتی ہوئی اڑتے ہوئے کوے کا نشانہ لینے کی کوشش کرتی رہی۔ کسی نے منی کو پہلی بار اتنے غصے میں دیکھا تھا۔

ظہور کا باپ منی کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا۔ اسے معلوم تھا کہ منی کے بچپن نے جو گھاؤ دیئے تھے وہ شادی کے واقعے نے اور گہرے کر دیئے ہیں۔ منی کی شادی کے اس المئے کا ذمہ دار وہ خود کو سمجھتا تھا۔ وہ چند سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا اور دل کا دورہ پڑنے کے چند دن بعد ہی چٹ پٹ ہو گیا۔ منی ظہور کے باپ کو مرنے پر بھی نہیں روئی۔ لیکن ایک عرصے تک وہ شام کو تسلے میں گرم پانی لئے ویران آنکھوں سے دروازے کو تکا کرتی۔ ظہور کی ماں اسے بے دھیانی میں تسلے کے گرم پانی میں انگلی گھماتا دیکھ کر آنکھوں سے ساون برسانے لگتی تو منی چونک کر پانی پھینک کر تسلا واپس رکھ آتی اور حسب معمول اپنے کاموں میں لگ جاتی۔

عاصمہ بت بنی ظہور کی کہانی سن رہی تھی۔ ظہور اسے نہیں کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ عاصمہ سے نہیں اب اپنے آپ سے گفتگو کر رہا ہے۔

"میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس میں قصور کس کا ہے۔ میرا' حالات کا یا منی کا جسے اپنے جذبوں کے اظہار کے لئے زبان ہلانا اور اپنے حق کے لئے لڑنا نہیں آیا۔" ظہور نے اب عاصمہ کی طرف دیکھا جو اسی طرح خاموش بیٹھی ظہور کو تک رہی تھی۔ ظہور تھوڑی دیر عاصمہ کی آنکھوں میں نظریں گاڑے کچھ سوچتا رہا جس کے بعد اس نے عاصمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بہت آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔

"آؤ عاصی، زندگی کے پہیئے کو مل کر آگے کی طرف کھینچتے ہیں۔ شادی کر کے نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔" عاصمہ کا منہ حیرت سے کھل کر رہ گیا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا۔

"ابھی کچھ مت کہو پہلے میری پوری بات سن لو۔" ظہور نے اسے بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔ "تم سن چکی ہو کہ منی بہت دکھی لڑکی ہے۔ وہ کچھ نہیں کہے گی، اسی طرح اپنی دنیا میں مگن رہے گی۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ اندر سے کھوکھلی ہو جائے گی۔ میں اس کے دکھ اور بڑھانا نہیں چاہتا۔ بچے بھی اب بڑی عمروں کے ہیں اور بہت حساس ہیں۔ ان کے لئے بھی میری شادی ایک اچانک صدمہ بن جائے گی۔ میری ماں تو شاید صدمے سے مر ہی جائے۔ اس لئے ہم خاموشی سے شادی کریں گے۔ اپنے گھر والوں کو تم کچھ بھی وجہ بتا کر مطمئن کر دینا۔ بتا دینا ہمیں فوراً کویت جانا ہے اس لئے بڑے پیمانے پر کچھ کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اور یہ صحیح بھی ہے۔ ایک ہفتے بعد ہم کویت روانہ ہو جائیں گے، میں تمہاری چھٹیاں منظور کرا لوں گا، اگر ان شرائط پر تمہیں مجھ سے شادی کرنا قبول ہے تو ہم کل ہی اپنی نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔" ظہور نے عاصمہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔

"ہاں قبول ہے۔ بالکل قبول ہے۔ میں جا کر منی باجی کے پاؤں پڑ جاؤں گی۔ انہیں اپنی بڑی بہن بنا لوں گی۔ ان سے کہوں گی اب وہ آرام کریں میں ان کی اور بچوں کی خدمت کروں گی۔ تمہاری ماں کے پاؤں اپنے سر پر رکھ لوں گی۔ میں....." ظہور نے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

"نہیں تم یہ سب کچھ نہیں کرو گی۔ ہمارے پاس ابھی تین سال کا وقت ہے۔ کویت میں میری تین سال کی پوسٹنگ ہے، وہاں سے واپس آ کر پھر حالات دیکھ کر فیصلہ کریں گے، ویسے واپس آ کر تم اپنی ماں کے پاس رہ سکتی ہو، میرے گھر والوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ میں اپنی رات کہاں گزارتا ہوں۔ مجھے اپنے گھر والوں سے یہ شادی چھپانی ہی پڑے گی۔ ہمیں ان کے دکھ بڑھانے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ عاصمہ اپنی نگاہیں نیچی کئے کچھ سوچتی رہی، پھر ظہور کی

آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی تو بہت جذباتی لگ رہی تھی۔

"مجھے منظور ہے۔ جس طرح تم کہو گے منظور ہے۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ جب تک تم چاہو گے چپ رہوں گی۔ جس طرح اور جہاں کہو گے رہوں گی، میں تمہاری ہو چکی ہوں، تم جب چاہو جہاں چاہو مجھے لے چلو۔"

"تو پھر بیٹھی کیوں ہو۔ اٹھو اور منہ دھو کر آؤ۔ رو رو کر بالکل بھتنی بن گئی ہو۔ ہمیں انگوٹھی خریدنی ہے اور گھر چل کر تمہاری امی سے بھی ملنا ہے۔" ظہور کی بشاشت واپس لوٹ آئی تھی۔ ایک ہفتے بعد ایک مختصر سی تقریب میں ظہور عاصمہ کو اپنی شرعی بیوی بنا کر کویت روانہ ہو گیا تھا۔ اپنے گھر سے نکلتے ہوئے اس نے بچوں کو لپٹا کر پیار کرنے کی رسم ادا کی تھی اور منی کو بتایا تھا کہ وہ کویت سے انہیں خرچ کے پیسے پابندی سے بھیجتا رہے گا۔ منی کے چہرے پر جدائی کے اس لمحے کا بھی کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔

کویت میں نبیلہ کے ساتھ ظہور کے تعلقات اسی طرح بڑھتے اور فاصلے کم ہوتے رہے۔ نبیلہ کا شوہر جاوید ان تعلقات سے اب کچھ مضطرب اور کھنچا کھنچا سا رہنے لگا تھا۔ ظہور کبھی کبھی بلائے بغیر بھی ان کے گھر آ دھمکتا تھا، نبیلہ بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کرتی لیکن جاوید بے چینی سے بیٹھا اس انتظار میں رہتا کہ وہ کب اٹھ کر جاتا ہے اور اس کے جاتے ہی نبیلہ سے اس کی زوردار جھڑپ شروع ہو جاتی۔ لیکن نبیلہ آخر میں اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے منا لیتی اور اسے وہ فائدے گناتی جو ظہور سے دوستی کی وجہ سے انہیں پہنچے تھے یا پہنچ سکتے تھے۔ پاکستان کے قومی دن کے فنکشن میں نبیلہ پر ظہور کی محنت رنگ لائی تھی اور اس کے گانے بہت پسند کئے گئے تھے۔ تعریف سمیٹتا ہوا جاوید خود کو محفل کا دولہا سمجھ رہا تھا۔ اس نے فنکشن ختم ہونے پر ظہور کو دعوت دی کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر گھر آئے، جشن منائیں گے۔ لیکن ظہور عاصمہ کو گھر چھوڑ کر پہنچا اور بتایا کہ عاصمہ تھکی ہوئی تھی اس لئے نہیں آ سکی۔ جاوید نے بوتل کا انتظام کیا تھا ظہور کو پلاتے پلاتے وہ خود بھی کچھ زیادہ ہی پی گیا

تھا اور صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی خراٹے لینے لگا تھا۔ صبح کے تین بج گئے تھے' ظہور اٹھا تو نبیلہ اسے چھوڑنے دروازے تک آئی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے نبیلہ کو اتنے نزدیک دیکھ کر ظہور برداشت نہ کر سکا اور نبیلہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس نے اسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ نبیلہ نے خود کو ظہور کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

"جاوید دیکھ لیں گے تو قیامت آ جائے گا۔" ظہور نے دل میں "وہ مارا" کا نعرہ لگایا۔ نبیلہ کو اعتراض نہیں تھا۔ صرف دیکھے جانے کا خوف تھا۔

"وہ پی کر لڑھک گیا ہے۔ اسے ہوش نہیں آئے گا۔" ظہور نے نبیلہ کو دوبارہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں کچھ پتہ نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ کل دن میں آئیں جب کوئی نہیں ہوتا۔" یہ کہہ کر خود کو ظہور کی بانہوں سے آزاد کر کے ایک قاتلانہ نظر ڈالتی اور اٹھلاتی ہوئی واپس اپنے ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی اور خراٹے بھرتے ہوئے جاوید کو صوفے پر سیدھا کر کے لٹانے لگی۔

ظہور دوسرے دن دفتر میں شکل دکھا کر ٹھیک صبح دس بجے نبیلہ کے گھر پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے یہ احتیاط کی تھی ڈرائیور اور گاڑی کے بجائے ٹیکسی لے کر آیا تھا۔ اور بلڈنگ میں آتے وقت دیکھ لیا تھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ نبیلہ نے اس کی آمد کا پورا اہتمام کیا تھا۔ بال سنوارے تھے' باندھے نہیں تھے' ہلکی گلابی رنگ کی نائیلون کی نائٹی پہنے ہوئی تھی۔ اس نے ظہور کی دستک کے جواب میں اتنی جلدی دروازہ کھولا تھا جیسے دروازے پر ہی کھڑی انتظار کر رہی ہو۔

"مجھے نہیں معلوم تھا آپ اتنی جلدی آ جائیں گے' میں نے اب تک کپڑے نہیں بدلے۔ بال بھی نہیں سنوارے۔ آیئے آپ بیٹھیں میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔" نبیلہ یہ کہہ کر بیڈ روم کی طرف چل دی۔ ظہور کو معلوم تھا وہ صبح بیٹی کو اسکول چھوڑنے نائٹی پہن کر نہیں گئی ہو گی۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بجائے نبیلہ کے پیچھے اس کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ اس نے نبیلہ

کی آنکھ میں نشیلے ڈورے تیرتے ہوئے دیکھ لئے تھے۔ بستر بہت سلیقے سے بنایا ہوا تھا۔ نبیلہ نے اپنے ساتھ بستر کو بھی بالکل تیار رکھا تھا۔ اسے دونوں چیزوں کے استعمال ہونے کا یقین رہا ہو گا۔ ظہور کو پہلے بھی خیال تھا کہ نبیلہ کوئی مشکل عورت ثابت نہیں ہو گی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ سب کچھ اتنا آسان ہو گا۔ اسے اپنے پیچھے بیڈ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر نبیلہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن ظہور نے اپنے ہونٹوں سے اس کا منہ بند کر دیا۔ اس کے بعد سب کچھ بہت آسان تھا۔ سانسیں ٹھہریں تو نبیلہ نے بہت شوخ نظروں سے ظہور کو دیکھتے ہوئے چٹکی لی۔

"آپ بڑے شیطان ہیں۔"

"اور تم میری خالہ ہو۔"

"میں آپ کی خالہ والہ نہیں ہوں۔" نبیلہ نے برا مانتے ہوئے کہا اور ظہور نے سوچا کہ سب کچھ ہے لیکن حس مزاح بالکل نہیں ہے۔

"نہیں خالہ نہیں، تم تو میری جان ہو، لیکن یہ بتاؤ کہ میں نے کیا شیطانی کی ہے۔"

"رات کو دروازے کے پاس، اگر جاوید دیکھ لیتے تو......"

"تو کہہ دیتا آئی ایم سوری، میں نشے میں ہوں۔ لیکن میں سمجھا تھا تم اس وقت کی بات کر رہی ہو۔"

"یہ شیطانی نہیں ہے۔ یہ تو محبت ہے۔ عشق ہے۔ پیار ہے۔" نبیلہ نے ظہور کی طرف کروٹ لے کر اس کے گلے میں اپنے بازو ڈال دیئے۔

"اور اگر جاوید نے اس وقت اور اس طرح دیکھ لیا۔"

"کیوں۔ آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔"

"تمہیں نہیں لگ رہا۔"

"پیار کیا تو ڈرنا کیا۔" نبیلہ نے ایک توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ایک بیوی سینہ ٹھونک کر اپنے شوہر سے بے وفائی کو پیار کا نام دے رہی تھی۔ معاشرے شاید اسی طرح اخلاقی زوال کا شکار ہوتے ہوں گے۔ ظہور نے سوچا۔ لیکن اس وقت

کے اخلاقی انحطاط نے اس کے اپنے لئے مسرتوں کے نئے دروازے کھولے تھے۔ وہ ایک دم پکا پاکستانی بن گیا۔ بالکل خودغرض۔ اپنے فائدے کے لئے ہر قدر کو سولی پر چڑھا کر اخلاقیات کے درس دینے والا منافق۔ سچا محب وطن۔

اسے سگریٹ کی سخت طلب ہو رہی تھی۔ ایسے ہر موقع پر سگریٹ نوشی اسے بہت مزا دیتی تھی۔ عاصمہ تو کہا کرتی تھی کہ وہ بستر اسی لئے گرم کرتا ہے کہ سگریٹ کا مزا لے سکے۔ عاصمہ کا خیال کرتے ہی وہ اس کا اور نبیلہ کے ساتھ گزارے ہوئے ان لمحوں کا موازنہ کرنے لگا۔ نبیلہ بالکل شیرنی تھی۔ اس کے مقابلے میں عاصمہ کھونٹے پر بندھی ہوئی گائے کی طرح تھی۔ ظہور کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

دن کے وقت نبیلہ کے گھر جانے کا یہ سلسلہ باقاعدگی سے چلتا رہا۔ دفتر میں اس کی تلاش ہوتی' لیکن دوپہر کے بعد وہ واپس آتا تو اخباروں کے ایڈیٹروں سے ملنے ملانے کی روز نئی کہانیاں سناتا۔ ایک دن اس کی سخت ضرورت تھی۔ ظہور کو پورے شہر میں ڈھونڈ لیا گیا تھا لیکن وہ کسی اخبار کے دفتر میں نہیں پایا جا سکا تھا۔ پاکستان سے کوئی اہم وفد آنے والا تھا۔ ظہور کو ان کی ملاقاتوں اور پریس کانفرنس کا بندوبست کرنا تھا۔ سفیر ہر تھوڑی دیر بعد اسے پوچھتا اور ہر دفعہ نہیں پتہ چلا کا جواب سن کر اس کا پارہ ایک ڈگری اور چڑھ جاتا۔ عاصمہ کو اور ظہور کے ڈرائیور کو اندازہ تھا کہ وہ کہاں ہو گا' لیکن ایک عزت کے اور دوسرا نوکری کے ڈر سے خاموش تھا۔

ظہور گنگناتا ہوا جب سفارتخانے کی عمارت میں داخل ہوا تو جلد ہی اس کی دھن گم ہو گئی۔ نیچے کھڑے گارڈ سے لے کر اوپر بیٹھے ہوئے فرسٹ سیکریٹری تک سب نے دھکے دے کر اسے سفیر کے سامنے پیش کر دیا۔ سفیر سخت غصے میں تھا۔

"ظہور صاحب آپ کہاں ہیں۔ میں صبح سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں لیکن کسی کو آپ کا پتہ نہیں معلوم۔ آپ جانتے ہیں کہ دفتر سے باہر جاتے ہوئے رابطے کا نمبر چھوڑ کر جانا ضروری ہے۔ کس وقت کوئی ایمرجنسی ہو سکتی ہے۔ آپ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ آپ یہاں شعر سنانے گانا گانے اور چائے خانوں میں بیٹھ کر دانشوری کرنے نہیں آئے کام کرنے آئے ہیں جس کے لئے ایک غریب ملک آپ پر اپنا فارن ایکسچینج

خرچ کرتا ہے۔"

"سر میں......" ظہور نے کہنا چاہا لیکن سفیر نے بیچ میں روک دیا۔

"مجھے معلوم ہے آپ کے پاس بہت بھاری وجہ ہو گی۔ لیکن میرے پاس اب وقت نہیں ہے۔ اگلے پانچ منٹ میں میری میٹنگ ہے اپنی وضاحت آپ تحریری طور پر دیجئے گا۔ میرے سیکریٹری نے وضاحت طلبی کا لیٹر آپ کی میز پر رکھ دیا ہے۔ صرف یہ بتایئے کہ وفد کی آمد کے سلسلہ میں جو کام آپ کے پاس تھے وہ آپ نے کئے یا نہیں۔"

"جی ہاں' اسی لئے تو میں......" ظہور نے پھر بولنا چاہا لیکن سفیر نے ایک بار پھر روک دیا۔

"وفد کے سارے پروٹوکول کی ذمہ داری میں آپ کو دے رہا ہوں۔ آپ کو ہر وقت وفد کے ساتھ رہنا ہے۔ کوئی بات واضح نہ ہو تو فرسٹ سیکریٹری سے سمجھ لیجئے گا۔ پریس کوریج کا خاص طور پر خیال رکھئے گا۔ کوئی کمی نہیں آنی چاہئے۔ اور یہ مت بھولئے کہ یہاں پر اپنی پوسٹنگ کا انحصار صرف آپ کی کارکردگی پر ہے۔" یہ کہہ کر سفیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ظہور پسینہ پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ سفیر کے آخری جملے میں چھپی ہوئی دھمکی اس نے صاف محسوس کر لی تھی۔ ظہور سے اس لہجے میں بات کر کے کوئی بچ نہیں سکتا تھا۔ ظہور کی زبان کی کاٹ بہت تیز تھی۔ اسے بھی سفیر پر خرچ ہونے والے زرمبادلہ کاحساب معلوم تھا۔ کارکردگی کے معیار کو بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ سارے افسر اور کلرک دن بھر کسی رشتے دار کو کویت کا ویزا دلوانے اور اپنی پوسٹنگ کی مدت بڑھانے کی منصوبہ بندی میں مصروف رہتے۔ جو وقت بچتا وہ سفیر کی بیوی کے اس کتے کی چاپلوسی میں گزار دیتے جو اپنی مالکہ کے ساتھ سفارتخانے میں دندناتا ہوا پھرتا تھا۔ سفیر کی بیوی نے ایک دفعہ ظہور سے بھی کہا تھا کہ وہ مقامی اخبار کے "ڈاگ آف دی ویک" کے کالم میں اس کے کتے کی تصویر چھپوا دے۔ لیکن ظہور اس وقت سفیر سے کچھ کہہ نہ سکا۔ آج اس کی کمزوری نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔ وہ سفیر کو مزید ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ابھی کویت میں رہنا تھا۔

ظہور اگلے کئی روز تک وفد کے ساتھ مصروف رہا۔ اسے وفد کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ اس کی ایک معمولی سی لغزش بھی معاف نہیں کی جائے گی۔ وفد کی سرگرمیوں کے دوران سفیر اس کی ہر حرکت پر نگراں رہا۔ وفد چلا گیا تو ظہور رپورٹیں لکھنے میں غرق ہو گیا۔ ایک دن دفتر میں نبیلہ کا فون آ گیا۔ وہ کہیں باہر سے فون کر رہی تھی اس کے اپنے گھر میں فون نہیں تھا۔ کویت میں گھر میں فون لگوانا آسان نہیں تھا۔ دفتر سے ضمانت کا خط لکھوانا پڑتا۔ ڈیپازٹ دینا پڑتا' پھر انتظار کرنے والوں کی قطار میں لگنا پڑتا۔ نبیلہ فکر مند تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ظہور بیمار ہو گیا ہو۔ اس نے بتایا کل اس کی سالگرہ بھی ہے۔ اس لئے وہ صبح ضرور گھر آئے۔ ظہور اپنی تنخواہ کب کی ختم کر چکا تھا لیکن نبیلہ کے لئے تحفہ بھی لینا ضروری تھا۔ اس نے اپنے پاکستانی سنار دوست سے تنخواہ پر پیسے دینے کا وعدہ کر کے سونے کا ایک بریسلیٹ خرید لیا۔ ظہور کو کچھ دنوں بعد یقین کرنا پڑا کہ اس بریسلیٹ کی نحوست کسی کی نیا بھی ڈبو سکتی تھی۔

کئی دنوں کے وقفے کے بعد نبیلہ کے پاس گیا تھا اس لئے گزری ہوئی وہ صبح بے حد حسین اور لذت آمیز ثابت ہوئی۔ نبیلہ نے ظہور کے پورے جسم کو انچ بہ انچ اپنے ہونٹوں سے ناپا تھا۔ وہ بریسلیٹ پا کر بہت خوش ہوئی تھی۔ لیکن اسے بند کرنے والا ہک ڈھیلا تھا' ظہور نے اسے ٹھیک کرا کے اگلی ملاقات پر واپس لانے کا وعدہ کیا۔ سنار دوست کو بریسلیٹ دے کر وہ دفتر پہنچا تو ایک بار پھر اس کی تلاش جاری تھی۔ لیکن اس دفعہ سفیر نہیں سفیر کی بیوی ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ سخت ناراض تھی۔ پرتگال کے سفیر کی بیوی کی کتیا کی تصویر اخبار میں چھپ گئی تھی۔ آج ہی امریکہ کے قومی دن کی پارٹی تھی۔ "کتیا دعوت میں سب کی گفتگو کا موضوع اور توجہ کا مرکز ہو گی۔" سفیر کی بیوی نے دانت بھینچتے ہوئے کہا تھا۔ ظہور اندازہ نہیں کر سکا کہ اس کا اشارہ پرتگال کے سفیر کی بیوی کی طرف تھا یا سچ مچ اس کتیا کی طرف جو اس ہفتے کا کتا ہو کر اخبار میں چھپی تھی۔ ظہور نے بڑی مشکل سے نئے وعدے کر کے اس سے جان چھڑائی۔ حالانکہ یہ آسان کام نہیں تھا۔ سفیر کی بیوی جان کا عذاب بن جاتی تھی۔

ایک دفعہ وہ ظہور کے سنار دوست کی جان کو آ گئی تھی۔ غلطی ظہور کی تھی۔ ایک دن سفیر کے گھر سفارتخانے کے عملے کی دعوت میں وہ اپنا بندہ دکھا رہی تھی جس کا کنڈہ ٹوٹ گیا تھا۔ ظہور نے اپنے سنار دوست سے ٹھیک کرانے کی پیش کش کر دی۔ اس کے دوست نے کنڈا تو ٹھیک کر دیا لیکن سفیر کی بیوی نے الزام لگا دیا کہ اس نے ریتی سے گھس کر اس کا سونا چرا لیا ہے۔ اس نے دھمکی دی کہ وہ شکایت کر کے اس کا زیور بنانے والا کارخانہ بند کرا دے گی۔ سنار کو معلوم تھا کہ کویت میں سفیر کی شکایت کو سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی نہیں سنے گا۔ اس نے نئے ڈیزائن کے ٹاپس بنا کر سفیر کی بیوی کی نذر کئے اور ظہور کے ہاتھ جوڑے کہ آئندہ وہ سفیر یا اس کی بیوی کے کسی کام کو نہ کہے۔

دوسرے دن ظہور نبیلہ کے پاس پھر مصروف رہا۔ اس نے ظہور سے اپنے برسلیٹ کے بارے میں پوچھا۔ ظہور بالکل بھول گیا تھا۔ دفتر پہنچ کر فون کیا تو سنار اپنے کارخانے میں نہیں تھا۔ بات کل پر ٹل گئی' کیونکہ شام میں ہفتہ واری میٹنگ تھی جس میں سفیر اپنے افسروں کی کارکردگی کا حساب لیتا تھا۔ رات میں اسے نبیلہ کے گھر پھر جانا تھا۔ لیکن آج کی دعوت اس کے شوہر جاوید کی طرف سے تھی۔ جب سے دن میں نبیلہ سے ملنے کا سلسلہ شروع ہوا وہ جاوید کی موجودگی میں اس کے گھر کبھی نہیں گیا تھا۔ جاوید نے بھی کبھی نہیں بلایا۔ لیکن کل اس نے خاص طور پر اصرار کر کے آنے کی دعوت دی تھی۔ نبیلہ نے اس سے کہا تھا کہ بہت محتاط رہے' جاوید کو شک ہے کہ وہ دونوں چھپ کر ملتے ہیں۔ ظہور نے ہنس کر اسی کے انداز میں دہرایا تھا۔

"پیار کیا تو ڈرنا کیا۔"

سفارتخانے سے فارغ ہو کر شام میں گھر آیا تو داخل ہوتے ہی اس کی سانسیں ایک جگہ تھم گئیں۔ عاصمہ نبیلہ کو تحفے میں دیا جانے والا وہ برسلیٹ اپنے ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی جو اس نے ٹھیک کرنے اپنے سنار دوست کو دیا ہوا تھا۔

"تمہارا سنار دوست آیا تھا۔ وہ سمجھا تھا کہ یہ برسلیٹ تم نے میرے لئے

خریدا تھا۔ وہ مجھے دکھانے آیا تھا کہ میں اس کا ہک چیک کر لوں کہ ٹھیک ہوا یا نہیں۔" ظہور کو اپنے چہرے کے تاثرات اور جذبات پر قابو پانے میں کمال حاصل تھا۔ اس نے بڑی لاپرواہی کے انداز میں جواب دیا۔

"مائک نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنے سنار دوست سے اس کی بیوی کے لئے بریسلیٹ بنوا دوں، وہ بیوقوف سمجھا کہ میں نے بنوایا ہے، وہ تمہارے پاس دوڑا آیا۔"

عاصمہ مائک کو جانتی تھی۔ وہ برطانوی سفارتخانے کا پریس اتاشی تھا۔ عاصمہ ظہور کے ساتھ کئی بار اس کی دعوتوں میں جا چکی تھی۔ مائک کی بیوی بہت ہنس مکھ لڑکی تھی وہ عاصمہ کی اچھی دوست بن گئی تھی۔ دونوں اکثر فون پر گپیں لگایا کرتے تھے۔

"ظہور تم اب جھوٹ بولنا بھی بھولتے جا رہے ہو۔ تمہیں یاد نہیں رہا کہ مائک آج کل چھٹیوں پر لندن گیا ہوا ہے۔ اس کی بیوی نے جانے سے قبل مجھے فون کیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لندن جانے سے قبل وہ مجھ سے کہہ کر گیا تھا۔ واپس آئے تو تم اس سے پوچھ لینا۔" ظہور ڈھٹائی سے اپنے جھوٹ پر قائم تھا۔

"مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے سب پتہ ہے کیا ہو رہا ہے تم بے شرمی کی ہر حد پھلانگ چکے ہو۔ جیب میں ٹکا نہیں ہوتا لیکن بازاری عورتوں میں سونے کے زیور بانٹتے پھرتے ہو۔ دو مہینے سے میرے کپڑے درزی کے پاس ہیں نہیں لا سکی۔ تمہارے اپنے سارے سوٹ ڈرائی کلینر کے پاس پڑے ہیں۔ سگریٹ تک ادھار خرید کر پیتے ہو۔ ہر وقت قرض لینے کے لئے شکار ڈھونڈتے ہو۔ تم اتنے گر جاؤ گے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" عاصمہ کب سے کھول رہی تھی۔

"بچوں کی فیسوں، کتابوں اور کچھ دوسرے ضروری خرچوں کے لئے مجھے منی کو پیسے بھیجنے تھے جس کی وجہ سے ہاتھ تنگ ہوا ہے۔ کچھ دنوں کی بات ہے۔ اگلے مہینے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" ظہور نے کہا۔ اس نے اپنی سرد مزاجی برقرار رکھی تھی۔ لیکن منی کو پیسے بھیجنے کا سن کر عاصمہ کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ وہ بیڈ روم جا کر وہاں سے ایک کاغذ نکال کر لائی اور اسے ظہور کے منہ پر مار کر بولی۔

"تم نے منی کا یہ خط پڑھا ہے۔" خط کو دیکھتے ہی ظہور پر جیسے ٹھنڈے پانی کی ایک اور بالٹی الٹ گئی۔ منی کا یہ خط اسے چند روز پہلے ہی ملا تھا جسے بے خیالی میں وہ کمرے میں ڈال کر بھول گیا تھا۔ خط میں منی نے لکھا تھا کہ ظہور نے تین مہینے سے انہیں کوئی پیسے نہیں بھیجے۔ گھر کا خرچ تو کسی نہ کسی طرح چل رہا ہے لیکن بچوں کی فیسوں' کتابوں اور یونیفارموں کا انتظام نہیں ہو سکا ہے۔ پیسے فوری نہیں آئے تو بچے اس سال اسکول جانے سے محروم رہیں گے۔ منی شاید بچوں کی وجہ سے خط لکھنے پر مجبور ہوئی تھی۔ اس نے کسی القاب کے بغیر بہت غیر جذباتی انداز میں کسی اکاؤنٹنٹ کی طرح اخراجات کا گوشوارہ بھیجا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ ماں اکثر بیمار رہتی ہے' اس کی دواؤں کا خرچ بھی بڑھ گیا ہے۔ ظہور فکرمند ہوا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اپنے اسی سنار دوست سے ادھار لے کر پیسے بھیج دے گا اور تنخواہ ملنے پر ادا کرے گا۔ لیکن پھر نبیلہ کے لئے برسلیٹ ادھار لینا پڑا اس لئے رقم ادھار مانگنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ سفارتخانے کے عملے میں ایک شکار اس کی نظر میں تھا جس سے اس نے سوچا تھا کل ادھار مانگ کر دیکھے گا۔

"میں ڈرافٹ بھجوا چکا ہوں' ڈاک کی گڑ بڑ کی وجہ سے نہیں مل سکا ہو گا۔ لیکن یہ تم میرے کاغذات میں کیا تلاش کرتی ہو۔" ظہور نے بھی ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

"تمہارے پوشیدہ خزانوں کا نقشہ۔" عاصمہ بہت تلخ انداز میں ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ "مجھے تمہارے چیتھڑوں سے کچھ نہیں لینا۔ کمرہ صاف کرتے ہوئے خط پر نظر پڑ گئی تھی۔ منی باجی کا نام دیکھ کر پڑھنے لگی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اپنے بچوں اور اپنی ماں کو بھی اپنی بدکرداری کی بھینٹ چڑھا دو گے۔"

"کیسی بد کرداری۔ کس کی بدکرداری۔ کیا بکواس کر رہی ہو۔ رائی کا پربت کیوں بنا رہی ہو تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارے یہ شک غلط ہیں۔ جھوٹ ہیں۔" ظہور کے لہجے میں تیزی بھی قائم تھی۔ اپنے جھوٹ کو وہ شاید اونچی آواز کے پیچھے چھپانا چاہتا تھا۔

"جھوٹ! تم گناہوں کی دنیا میں دھنس کر شترمرغ بن گئے ہو۔ تمہاری آنکھوں اور کانوں پر پٹی بندھ گئی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارا ڈرائیور ڈیروں پر جا کر تمہاری بدچلنی کی کہانیاں کتنے چٹخارے لے کر سناتا ہے۔ اور پھر ڈیرے والے شام کو کیفے زرقا میں بیٹھ کر ان کہانیوں پر کیا کیا مصالحہ لگاتے ہیں۔ یہ کہانیاں سفارتخانے کے ہر افسر تک پہنچتی ہیں۔ وہ رات میں اپنی بیویوں کو مزے لے کر سناتے ہیں۔ ان کی بیویاں صبح مجھے ہمدردی کے فون کرتی ہیں۔ میں ان کی کافی مارننگز کا مستقل موضوع بن گئی ہوں۔ سب کا خیال ہے کہ اس بدچلن عورت کا شوہر بھی سب کچھ جانتا ہے۔ لیکن اپنی عزت کے ڈر سے خاموش ہے یا شاید بالکل بے غیرت ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اب تک جانے کیا ہو گیا ہوتا۔ تمہارے سفیر سے ڈانٹ کھانے کا قصہ بھی سارے شہر کو معلوم ہے۔ تمہارے چہیتے سنار دوست کو بھی معلوم ہے۔ مجھے بھی کسی سے سن کر وہی بتا رہا تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تو تمہیں جسے صرف یہ پتہ ہے کہ کسی کو کچھ نہیں پتہ۔" عاصمہ بہت مشکل سے اپنی آواز کو قابو میں رکھ رہی تھی۔

"سب پروپیگنڈہ ہے۔ لوگ مجھ سے جلتے ہیں' میرے خلاف افواہیں پھیلاتے ہیں۔" ظہور کی آنکھوں پر واقعی پٹی بندھ گئی تھی۔ وہ رات ہی ایک مشاعرے کی صدارت کر کے آیا تھا۔ سب نے کتنی واہ واہ کی تھی۔ دل کھول کر داد دی تھی۔ غزل کے ایک ایک شعر' تقریر کے ایک ایک جملے پر جھوم جھوم اٹھے تھے۔ مشاعرے کے بعد ہر شخص ہاتھ ملانے کو کتنا بے تاب تھا۔ کتنے خلوص سے مل رہا تھا۔ سب تو منافق اور دوغلے نہیں ہو سکتے۔ اس نے سوچا۔ اس کی سوچیں بضد تھیں کہ کسی کو کچھ نہیں معلوم۔

"عاصی حالات اتنے برے نہیں ہیں جو پریشانیاں ہیں وہ بھی دور ہو جائیں گی۔ مجھ پر اپنا بھروسہ مت توڑو۔ بلاوجہ شک کرنا بند کر دو۔" ظہور نے اپنا لہجہ نرم کر کے مصالحانہ انداز میں کہا۔

"میرا شک!" عاصمہ یہ کہتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے ظہور کا گریبان پکڑ کر چیر دیا۔ بٹن ٹوٹ کر بکھر پڑے اور قمیض چر کرتی ہوئی پھٹ گئی۔

ظہور کا سینے اور اس کے پیٹ تک کا حصہ ننگا ہو گیا تھا۔ جسم پر گہرے نیلے رنگ کے نشانوں ایک جنگل اگا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورے جسم کو کسی نے دہکتی ہوئی سلاخ سے داغا ہے۔ وہ ان نشانوں کی بہت حفاظت کرتا تھا۔ ہر وقت گلے تک بٹن لگائے رکھتا۔ اسے پتہ تھا ان نشانوں کو دیکھ کر گونگا بھی پوری کوک شاستر سنا سکتا تھا۔ نبیلہ کو یہ نشان بنانے میں بہت مزا آتا تھا۔ وہ انہیں محبت کے پھول' کہا کرتی اور ہر ملاقات پر ان کی تعداد گنا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی ظہور کے پورے جسم پر محبت کے ان پھولوں کا گلشن آباد کر دے گی۔ پیار کرتے کرتے کچکچا کر دانت کا ہلکا سا کھروچا لگاتی تو ظہور کے پورے جسم میں سنسنی دوڑ جاتی۔ لیکن محبت کے یہ پھول اب کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔

"بولو یہ بھی میرا شک ہے۔ وہم ہے۔ جھوٹ اور بکواس ہے۔ پروپیگنڈہ ہے۔ پہلے میں دیکھ کر ڈر گئی تھی میں سمجھی تھی تمہارے جسم پر کوئی الرجی اگ آئی ہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ تمہارے گناہوں کا کوڑھ ہے۔ دیکھنا ایک دن اس کوڑھ سے تمہارا پورا بدن سڑ جائے گا۔" غصے کی زیادتی سے عاصمہ کے لئے اب بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ صوفے پر گر گئی اور عادت کے مطابق دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر اپنے غصے کو آنسوؤں کی شکل میں نکالنے لگی۔

ظہور کے لئے یہ سب کچھ برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ اسے دیوار سے چپک جانا بالکل پسند نہیں تھا اپنی آزادیوں پر روک ٹوک کی عادت نہیں تھی۔ عاصمہ سے اس کی شادی کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ سر پر چڑھنے لگی تھی۔

وہ کچھ بولے بغیر عاصمہ کو روتا چھوڑ کر کمرے میں گیا اور کپڑے بدلنے لگا۔ جاوید کی دعوت پر نبیلہ کے گھر جانا تھا۔ اسے دیر ہو رہی تھی۔ صبح تک عاصمہ کا جذباتی بخار اتر جائے گا تو اس سے بات کرے گا۔ اسے سمجھائے گا کہ وہ اب بدل نہیں سکتا۔ اگر اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے تو اسے ظہور کی عادتوں اور اس کے ہر شوق سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا تو عاصمہ نے اپنا چہرہ اسی طرح ہاتھوں سے چھپایا ہوا تھا۔ لیکن اس کی سسکیاں رک گئی تھیں۔ اسی

وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ عاصمہ نے چونک کر چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے۔ ظہور نے سوچا کہ جا کر منہ دھو لے۔ رو رو کر بھتنی بن گئی ہے۔ لیکن وہ کچھ کہے بغیر فلیٹ سے نکل گیا۔ فون وصول کرنے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ فون کی گھنٹی بند ہو گئی تھی۔ عاصمہ نے شاید فون اٹھا لیا تھا۔

نبیلہ کے گھر دعوت میں بھی اس کا موڈ کچھ بجھا بجھا سا رہا۔ دعوت میں شراب کی شکل میں ظہور کا موڈ اٹھانے کا انتظام نہیں تھا۔ اس کی وجہ دعوت میں شریک جاوید کا ایک کویتی دوست تھا جو شراب نہیں پیتا تھا۔ پولیس میں درمیانے درجے کا کوئی افسر تھا۔ جاوید نے جب اس کا تعارف کرایا تو پولیس سے اس کے تعلق پر کافی زور دیا تھا۔ ظہور کو ایسا لگا جیسے وہ اسے خبردار کر رہا ہو۔ دعوت میں جاوید کی بہن اور بہنوئی بھی شریک تھا جو کویت میں رہتے تھے۔ جاوید اپنی ساری توجہ کویتی دوست کو خوش کرنے میں صرف کر رہا تھا جس کی تمام تر توجہ کا مرکز نبیلہ تھی۔ نبیلہ نے ہمیشہ کی طرح بہت چست اور کھلے گلے کا لباس پہنا تھا جس میں کسے ہوئے اس کے اعضاء اور نمایاں ہو جاتے تھے۔ جاوید کا کویتی دوست تو شاید پہلی بار دیکھ رہا تھا' خود ظہور کے لئے جو نبیلہ کے ان اعضاء کی ہر جنبش کا رازدار تھا' نظریں ہٹانا مشکل تھا۔ رات گئے تک کویتی پولیس افسر لطیفے سنا کر خود ہی زور زور سے ہنستا رہا۔ اس کے اور اس کا ساتھ دیتے ہوئے جاوید اور نبیلہ کے قہقہے ظہور کی سماعت پر بار گزر رہے تھے۔ اس نے بہت خاموش بیٹھی ہوئی جاوید کی بہن سے ایک بار گفتگو کی ڈور باندھنی چاہی لیکن اس کا شوہر ندیم ظہور کی شہرت سے واقف تھا اس لئے بہت چوکنا ہو کر بیٹھا تھا۔ اس نے درمیان سے ہی بات اچک لی اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ کھانا نکالنے کے بہانے کچن گئی تو پھر وہ کھانا شروع ہونے کے وقت تک نظر نہیں آئی۔

گھر واپس آیا تو رات کافی بیت گئی تھی۔ دروازے میں قدم رکھا تو صوفے پر بیٹھی عاصمہ اسی طرح اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے سسکیاں لے رہی تھی۔ ظہور کو سخت حیرت ہوئی۔ عاصمہ اتنی دیر تک نہیں برستی تھی۔ جس تیزی سے بارش آتی تھی اسی تیزی سے گزر جاتی تھی۔ اسے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ لیکن رحم بھی آیا۔

قصور اس کا ہی زیادہ تھا۔ ایک طرح سے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ اس لئے منانا بھی اسے تھا۔

"کیوں رو رو کر خود کو ہلکان کئے ہوئے ہو۔ چلو مجھے معاف کر دو' اب کسی دعوت میں کہیں بھی تمہارے بغیر نہیں جاؤں گا۔ سارے ایسے تعلق ختم کر لوں گا جو تمہیں پسند نہیں ہیں۔ چلو اٹھو منہ دھو کر آؤ۔ بالکل بھتنی لگ رہی ہو۔" لیکن عاصمہ پر اس جادوئی جملے کا بھی اثر نہیں ہوا بلکہ ظہور کو دیکھ کر وہ اور بلک بلک کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر اسی طرح روتی رہی۔ ظہور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں تھمیں تو ظہور نے ایک اور کوشش کی۔

"میرے قصور اب اتنے بڑے بھی نہیں ہیں کہ تم معاف نہ کر سکو۔ میں تم سے معافی مانگ چکا ہوں۔ اب چلو اٹھو' منہ پر پانی ڈال آؤ' بہتر محسوس کرنے لگو گی۔" ظہور نے اپنے لہجے میں محبتوں کی مٹھاس بھرتے ہوئے کہا۔ اسے دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کا جادو دوبارہ کام کرنے لگا ہے۔ عاصمہ اٹھ کر باتھ روم چلی گئی تھی۔ منہ دھو کر آئی تو بہت پرسکون لگ رہی تھی۔ بولی تو آواز میں بھی ٹھہراؤ تھا۔

"میں تمہاری وجہ سے نہیں رو رہی تھی۔ تم میرے آنسوؤں کے لائق نہیں ہو۔ یہ آنسو میری ماں کے لئے تھے۔ آج شام اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ تمہارے جاتے ہوئے جو فون آیا تھا وہ میرے بہنوئی کا تھا۔"

"اف میرے خدا۔ تم نے مجھے بلوایا کیوں نہیں' آواز دے کر روکا کیوں نہیں۔" ظہور اٹھ کر عاصمہ کو سینے سے لگانے کے لئے بڑھا جس کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئی تھیں اور رونے کے لئے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔ لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر ظہور کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور رومال سے اپنی ناک کو رگڑتی اور مزید لال کرتی رہی۔ ظہور کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ اسے بہت شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ صوفے پر واپس بیٹھ گیا اور تشویشناک نظروں سے عاصمہ کو دیکھنے لگا۔ آنکھوں کو خشک کر کے عاصمہ نے خود کو پھر سنبھال لیا تھا۔

"میرے پہنچنے تک وہ تدفین نہیں کریں گے۔ مجھے صبح کی فلائٹ سے کراچی

جانا ہے۔" عاصمہ نے اطلاع دینے کے انداز میں اسے بتایا۔

"ٹھیک ہے میں صبح ہوتے ہی تمام بندوبست کر دوں گا۔ جو بھی پہلی فلائٹ ہو گی اس سے تمہیں بھجوا دوں گا۔" عاصمہ کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ ظہور نے بھجوانے کی بات کی تھی۔ رسماً" بھی ساتھ چلنے کے لئے نہیں کہا تھا۔

"نہیں اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سارا انتظام کر لیا ہے صرف پیکنگ باقی ہے۔" عاصمہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا تم کس دعوت میں گئے ہو۔ سفارتخانے کے کسی آدمی کو فون کر کے تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تمہارے سنار دوست کا فون نمبر مل گیا تھا۔ اس نے کسی ٹریول ایجنٹ دوست سے اس کا دفتر کھلوا کر ٹکٹ بنوا دیا ہے۔ صبح گیارہ بجے کی فلائٹ بھی بک کرا دی ہے۔ میں نے اسے ضمانت دی ہے کہ ٹکٹ کے پیسے اسے مل جائیں گے۔"

ظہور نے سوچا اس سنارے کا قرضہ تو بڑھتا جا رہا ہے۔ مستقل ماتوں پر مات دیئے جا رہا ہے۔ عاصمہ سامان پیک کرنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ظہور بھی اس کے پیچھے آیا تھا۔ عاصمہ اس کی موجودگی سے بے نیاز خالی سوٹ کیس میں کپڑے بھرتی رہی۔ ظہور نے مدد کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عاصمہ نے روک دیا تھا۔ وہ باہر آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ اسے ایک ڈرنک کی شدت سے خواہش تھی۔ اس کا برطانوی سفارتخانے والا دوست مائک لندن سے بیئر بنانے کا سامان لایا تھا اور اس نے اپنے سری لنکا کے باورچی کو گھر میں بیئر کشید کرنے کی ترکیب سکھا دی تھی۔ ظہور کو بھی ہفتے میں گھر کی بنی ہوئی بیئر کی چار بوتلوں کا عطیہ ملتا تھا۔ ایک بوتل اس وقت بھی اس کے ریفریجریٹر میں رکھی تھی لیکن وہ اسے پی کر عاصمہ کے زخموں پر زہر انڈیلنا نہیں چاہتا تھا۔

عاصمہ ایک کمرے سے دوسرے، پھر باتھ روم اور باورچی خانے کے چکر لگا لگا کر سامان سمیٹ رہی تھی۔ ظہور کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کتنا سامان لے کر جا رہی ہے۔

اس نے کمرے میں جا کر دیکھا تو وہ الماریاں بالکل خالی پڑی تھیں جن میں

عاصمہ کے کپڑے لٹکے اور جوتوں کی قطاریں لگی ہوتی تھیں۔ عاصمہ اس وقت باورچی خانے میں اپنے لئے چائے بنا رہی تھی۔ ظہور ڈرائنگ روم میں آیا تو صوفے پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔ ظہور سے اس نے چائے کے لئے پوچھا بھی نہیں تھا۔

"عاصی تم کتنے دن کے لئے جا رہی ہو۔ اتنا سامان لے جا کر کیا کرو گی۔" ظہور نے اپنی حیرت ظاہر کی۔

"میں واپس آنے کے لئے نہیں جا رہی۔" عاصمہ نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بہت سکون تھا۔

"لیکن مجھے ابھی دو سال یہاں اور رہنا ہے۔ اتنے عرصے الگ کیسے رہو گی۔ میرا کیا ہو گا۔" ظہور کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ لہجے میں درد بھی پیدا ہو گیا تھا۔

"مجھے شک ہے کہ تم اپنے باقی بچے دو سال پورے کر سکو گے۔ لیکن یہ اب میرا مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے تم سے علیحدگی چاہئے۔ آزادی چاہئے۔ مجھے تم سے طلاق چاہئے۔ آج۔ ابھی اور اسی وقت۔" ظہور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"تم دیوانی ہو گئی ہو۔ ماں کے انتقال نے تمہارے ذہن پر برا اثر ڈالا ہے۔ ماں کی میت سے لپٹ کر بین کرو گی تو ٹھیک ہو جاؤ گی۔ دسویں پر میں خود تمہیں لینے آؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت تک تمہاری ذہنی حالت بہتر ہو جائے گی۔" ظہور نے ذرا سختی سے کہا۔

"نہیں میں دیوانی نہیں ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ ماں کے مرنے کی خبر کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ میں اس کے لئے کب سے تیار تھی۔ اس وقت اس کے غم نے مجھے فیصلہ کرنے کی طاقت دے دی ہے۔ آنسوؤں نے آنکھیں دھو کر میری بینائی ٹھیک کر دی ہے۔ مجھے ہر چیز اب بہت صاف صاف نظر آ رہی ہے۔" عاصمہ نے پیالی اٹھا کر چائے کا ایک اور گھونٹ لیا۔

"تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ غصے اور صدمے میں تم بالکل اندھی ہو گئی ہو۔ شادیاں بچوں کا کھیل نہیں ہوتیں۔ کل کر لیں آج توڑ

دیں۔ یہ زندگی بھر کا سودا ہیں۔ زندگی بھر کے اس سفر میں مشکل موڑ آئیں گے۔ اترائیاں چڑھائیاں بھی آئیں گی۔ تم تو پہلے موڑ پر ہی گھبرا گئیں۔ تھک کر بیٹھ جانا چاہتی ہو۔" ظہور نے اپنے خطیبانہ انداز میں کہا۔

"میں اس سفر کا ہر موڑ کاٹ سکتی تھی۔ عمر بھر کانٹوں پر چلتی' اف نہیں کرتی۔ لیکن تمہارے ساتھ اس سفر میں مجھے صرف گھسٹنا پڑے گا۔ تمہارے ساتھ مجھے تمہارے ہر جھوٹ کو سچ مان کر زندہ رہنا ہو گا۔ تمہاری ساتھی افسروں کی بیویاں جب مجھے فون کر کے تمہارے کارنامے سناتی ہیں تو وہ مجھے ایک کمتر عورت سمجھتی ہیں جس میں کوئی کمی یا خامی ہے۔ ایک نے تو صاف صاف مجھ سے کہا بھی کہ میں کیسی بیوی ہوں جو تمہیں باندھ کر نہیں رکھ سکتیں۔" عاصمہ نے چائے کے ساتھ اپنی بات بھی ختم کر دی تھی۔ لیکن ظہور کا غصہ بڑھا دیا تھا۔

"وہ سب تنگ موریوں میں رہنے والے بے عقل کیڑے ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنے گھر کی کیچڑ سے ناک اٹھا کر دیکھنا نہیں سیکھا۔ ان کے لئے شادی ایک دوسرے کو ہتھکڑی پہنا کر ایک دوسرے کو باندھ کر رکھنے اور ایک دوسرے کی چوکیداری کرنے کا نام ہے۔ مجھے حیرت ہے عاصی تمہیں ان میں اور ہم میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔"

"ان میں اور ہم میں بہت فرق ہے۔ اسی لئے آج ہمارے گھر کے برتن نہیں ٹوٹ رہے۔ محلے والے ہمارے جھگڑا سننے جمع نہیں ہیں اپنی بالکونیوں سے ہمیں سڑک پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتا نہیں دیکھ رہے۔ ہم بہت مہذب انداز میں بیٹھے اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے موسموں پر گفتگو کی جاتی ہے۔ لیکن شادی چوکیداری کا نہیں بھروسے کا نام ہے۔ بھروسہ ٹوٹ جاتا ہے تو سب کچھ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہمارے درمیان بھی اب کچھ نہیں بچا۔ سب کچھ ٹوٹ گیا ہے۔" عاصمہ کا لہجہ اسی طرح پر سکون تھا۔

"توڑنا جوڑنا تم نے بہت آسان سمجھ رکھا ہے۔ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر گنگا جمنا بہائی۔ پھر منہ دھویا اور نارمل ہو گئیں۔ کبھی کچھ جوڑ لیا۔ کبھی کچھ توڑ دیا۔ آج طلاق مانگ رہی ہو۔ کل میرے سامنے اسی طرح رو پیٹ کر شادی کی التجائیں کر رہی

تھیں۔" ظہور نے طنز کرتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

"وہ شاید میری بیوقوفی تھی لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ شادی کر کے گناہ کا وہ احساس ختم ہو گیا تھا جس میں تم میرے حصہ دار تھے۔ لیکن تمہاری کہانی سننے کے بعد بھی ہاں کرنی واقعی میری بیوقوفی تھی۔ تم مجھے بہت مظلوم لگے تھے۔ تمہارے لئے میری ممتا ابھر آئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہیں اتنا پیار دوں گی کہ محبت کے لئے ترسی ہوئی تمہاری روح سیراب ہو جائے گی۔ لیکن یہ میری بیوقوفی تھی۔ میں یہ نہیں جان سکی تھی کہ تم صرف ہوس کے غلام ہو۔ جسموں کے شکاری ہو۔" عاصمہ نے سوچ و بچار میں واقعی بہت وقت صرف کیا تھا۔ لیکن ظہور اس بحث کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

"تم بھی دوسری منی نکلیں۔ منی نے بھی کبھی مجھے ہاتھ پکڑ کر کھینچنے اور بھٹکنے سے روکنے کے لئے لڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اس نے کم از کم رشتے کی ڈور نہیں توڑی۔" ظہور کا لہجہ اداس ہو گیا تھا۔

"تم کوئی قیمتی ٹرافی نہیں ہو جسے جیتنے کے لئے لڑنے بھڑنے اور جدوجہد کرنے کے مرحلوں سے گزرا جائے۔ پہلے میں یہی سمجھی تھی کہ منی نے تمہیں اپنا بنا کر رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے تم جیسے شخص کو اپنا بنا کر رکھنے کی کوششوں کو بے سود سمجھا ہو گا۔ عورتیں اس سلسلے میں چھٹی حس رکھتی ہیں۔ میری بہن نے دنیا نہیں دیکھی۔ میٹرک کرتے ہی اس کی شادی ہو گئی تھی۔ اب بھی اس کی ساری زندگی اپنے بچوں تک محدود ہے۔ اس کو جب میں نے تم سے شادی کی خبر سنائی تو وہ صرف خاموش ہو گئی تھی۔ لیکن جب میں نے ساری کہانی سنائی تو وہ فکرمند ہو گئی۔ منع کرنے کی ہمت نہ کر سکی لیکن اس نے مجھے جلد بازی نہ کرنے اور اچھی طرح سوچنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے اپنی معصوم بہن کی دقیانوسی سوچ پر اس کا مذاق اڑایا تھا۔ اب گھر جاؤں گی تو وہ میرا مذاق اڑائے گی۔" عاصمہ جاتے جاتے ظہور کو اس کا اصل چہرہ دکھانے پر تل گئی تھی۔ ظہور اپنا یہ چہرہ دیکھنے پر تیار نہیں تھا۔

"تمہاری بہن نے صحیح مشورہ دیا تھا کہ جلد بازی مت کرو۔ یہی جلد بازی اب

تم پھر کر رہی ہو۔ تم پاکستان جا کر جب تک چاہو وہاں رہو۔ اچھی طرح ٹھنڈے دماغ سے سوچ کر فیصلہ کرو۔ پھر جس طرح کہو گی وہی ہو گا۔ ابھی جلد بازی کر کے طلاق لو گی۔ بعد میں پچھتاؤ گی اور حلالے کے لئے مولوی ڈھونڈو گی۔" ظہور نے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ لا کر کہا۔ لیکن عاصمہ پر اس کی خوش مذاقی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

"میری زندگی میں اب تمہارے ساتھ کوئی کل نہیں ہے۔ میں تم سے طلاق لئے بغیر کویت نہیں چھوڑوں گی۔ یہ کام خاموشی سے ہو جائے تو بہتر ہے۔ تمہاری ناک بھی نہیں کٹے گی۔ سب یہی سمجھیں گے ماں کے انتقال پر گئی ہے' کسی نہ کسی وجہ سے رک گئی ہے۔ کہانیاں گڑھنے میں تم خاصے ماہر ہو۔ میں وعدہ کرتی ہوں یہاں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ لیکن تم اس وقت طلاق نہیں دو گے تو سب کے سامنے گریبان پکڑ کر مانگوں گی۔ تم بہت تماشے کر چکے ہو۔ ایک اور سہی۔" عاصمہ نے بہت مضبوط لیکن سرد لہجے میں کہا۔ ظہور اس طرح کے لہجے کو جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عاصمہ فیصلہ کر چکی ہے' اسے روکنا بیکار ہے۔ وہ تھوڑی دیر اسی طرح خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ عاصمہ اس کے بولنے کی منتظر تھی۔

"ٹھیک ہے عاصی تم نے اگر فیصلہ کر لیا ہے تو جا تجھے کشمکش زیست سے آزاد کیا۔ تم آزاد ہو۔ ابھی اور اسی وقت سے آزاد ہو۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔" ظہور نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر کہا اور پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر پوچھا۔ "اب تو خوش ہو۔"

"ہاں خوش ہوں۔ بے حد خوش ہوں۔" عاصمہ نے کہا۔ "لیکن اس کی آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی تھی۔ ظہور خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا تھا۔ عاصمہ اسے گھر کے اندر سگریٹ نہیں پینے دیتی تھی۔ کہتی تھی پودوں کو زکام ہو جائے گا۔ ظہور ہمیشہ فلیٹ کی بالکونی میں جا کر سگریٹ پیتا تھا۔ لیکن کہنے سننے والا بندھن اب ٹوٹ چکا تھا۔ ظہور نے سوچا جو ہوا اچھا ہی ہوا تھا۔ وہ خود کو بہت ہلکا

محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے عاصمہ کو نہیں خود اپنے آپ کو آزاد کیا تھا۔ ہر وقت روتی بسورتی عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے تنہا رہنا کہیں بہتر تھا۔ عاصمہ اپنا رونا بند کر کے منہ دھونے اور پانی پینے چلی گئی تھی۔ واپس آئی تو نارمل تھی۔"

"میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں' مجھے امید ہے تمہارا اگلا شوہر مجھ جیسا بے وفا نہیں ہو گا۔" ظہور نے میز پر رکھی ہوئی چائے کی پیالی میں سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔ عاصمہ ظہور کی اس حرکت پر بھی بہت چڑتی تھی۔

"میرا اب شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ شادی میری ماں کا شوق تھا۔ مجھے خوشی ہے وہ اس کی زندگی میں پورا ہو گیا۔ میں اب تنہا رہ کر اپنی زندگی کو بامقصد بنانے کی کوشش کروں گی۔"

"لیکن ہم اچھے دوست تو رہ سکیں گے۔" ظہور نے نئی توقعات باندھتے ہوئے کہا۔

"ہم کسی انگریزی فلم کا کردار نہیں ہیں۔ اچھے میاں بیوی نہیں رہے تو اچھے دوست کیسے رہیں گے۔ دوست رہنا شادی نباہنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ہماری کہانی آج یہیں ختم ہو جائے گی۔ آج کے بعد میں تمہارا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہوں گی۔" عاصمہ کا جواب بہت دو ٹوک تھا۔ ظہور کچھ نہیں بولا۔ بس ایک اور سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

"تم سامان دیکھ سکتے ہو۔ جو کچھ میرا تھا وہی لے کر جا رہی ہوں۔ تمہارا دیا کچھ تھا بھی نہیں شادی کے دن زیور کے نام پر جو انگوٹھی اور کڑے تم نے دیئے تھے میں نے تمہارے سنار دوست کو دے دیئے ہیں۔ وہ نہیں لے رہا تھا میں نے زبردستی دیئے ہیں اور اسے قسم دی ہے کہ اگر تم میرے ٹکٹ کے پیسے نہ دے سکو تو وہ بیچ کر اپنی رقم وصول کر لے۔ کویت تم مجھے لے کر آئے تھے' واپس بھیجنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔" عاصمہ یہ کہہ کر اٹھی اور کمرے میں چلی گئی۔ ظہور اسی طرح بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔

صبح عاصمہ کی ایئرپورٹ روانگی سے قبل سفارتخانے کے عملے کے بیشتر لوگ اور ان کی بیویاں تعزیت کے لئے ملنے ان کے گھر آئے تھے۔ افسروں کی بیویوں نے سامان کے کئی بکسے بندھے دیکھ کر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ سفیر نے بھی ذاتی طور پر آکر تعزیت کی تھی اور فاتحہ پڑھی تھی۔ سفیر کی بیوی ساتھ نہیں آئی تھی۔ صبح نو بجے کا وقت اِس کے کتے کی واک کے لئے مخصوص تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی اپنی ماں مری تب بھی وہ اپنے کتے کی چہل قدمی کا معمول ترک نہیں کرے گی۔ ظہور کا سنار دوست روانگی کے انتظامات میں پیش پیش تھا۔ عاصمہ کو ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہنے کے بعد سنار نے ظہور کو انگوٹھی اور کڑے واپس کرنے چاہے لیکن ظہور نے نہیں لئے اور کہا کہ بیچ دے۔ ظہور کی جیب میں نبیلہ کے لئے بنوایا ہوا برسلیٹ بھی ابھی تک چبھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کل جا کر نبیلہ کو دے آئے گا۔ آج تو اسے سخت ذہنی اور جسمانی تھکن تھی۔ کچھ دیر آرام کر کے وہ دفتر چلا گیا۔ لیکن رات اس پر جو کچھ بیتی تھی اس کا سایہ آج اس کے دن پر بھی دراز تھا۔ شام میں جب سب دفتر سے روانگی کی تیاری کر رہے تھے تو اسے سفیر کا بلاوا آگیا۔ ظہور کو حیرت ہوئی کیونکہ یہ سفیر کے جانے کا وقت تھا اور وقت کی پابندی کے معاملے میں سفیر بالکل انگریز تھا۔ وہ جانے کے لئے تیار کھڑا تھا ظہور آیا تو خود بیٹھا نہ ظہور کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ غمی کے اس موقع پر آپ اپنی بیوی کے ساتھ نہ جا سکے۔"

"جی ہاں، لیکن یہاں کے کام چھوڑ کر جانا مشکل تھا۔" ظہور نے فرض شناسی کا مظاہرہ کیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ یہاں آپ کے بغیر کتنے کام رک جاتے۔" ظہور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ طنز کر رہا ہے یا اس کی کارکردگی کا اعتراف۔ وہ کچھ نہیں بولا سفیر نے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے اگلے سوال سے اسے چونکا دیا۔

"آپ کسی خیر النساء کو جانتے ہیں۔"

"خیر النساء؟" ظہور تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ یہ منی کا اصلی نام تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید خود منی کو اپنا یہ نام اب یاد نہ رہا ہو گا۔ ظہور نے بھی پہلی بار یہ نام نکاح نامے میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔

"جی ہاں یہ میری خالہ زاد بہن کا نام ہے۔ لیکن آپ کو کیسے....."

"لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ وہ آپ کی بیوی ہیں اور ان سے آپ کے دو بچے بھی ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے۔" سفیر نے ظہور کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں صحیح ہے' وہ میری پہلی بیوی ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس پوچھ گچھ کا مطلب کیا ہے؟" ظہور نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ لیکن اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔

"انہوں نے آپ کی شکایت بھیجی ہے کہ آپ نے ان کی اجازت کے بغیر غیر قانونی طور پر دوسری شادی کر لی ہے اور تین مہینے سے اپنے بیوی اور بچوں کو خرچ کے پیسے نہیں بھیجے ہیں۔ انہوں نے درخواست کی ہے کہ آپ کی تنخواہ کو ادائیگی روک دی جائے اور گھر پیسے بھیجنے کا پابند کیا جائے۔" ظہور کو چکر سا آ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ منی کی اتنی ہمت کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ شاید عاصمہ نے منی کی آڑ میں انتقام لینے کی کوشش کی ہو' لیکن عاصمہ تو ابھی کراچی پہنچ کر اپنی ماں کی میت کے سرہانے بیٹھی ہو گی۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔ آپ کو معلوم ہے یہ میرے جانے کا وقت ہے' میرے پاس وقت بہت کم ہے۔" سفیر نے ظہور کو اس کی سوچوں سے چونکا دیا۔

"سر یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ سفارتخانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" ظہور نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"سفارتخانے میں کام کرنے والے کسی شخص کا معاملہ ذاتی نہیں ہے۔ ہر معاملے کا تعلق سفارتخانے سے ہے۔ آپ شہامت سوری کو جانتے ہیں۔ جو پہلے یہاں سفیر تھا اور پچھلے ہفتے عراق میں سفیر ہو کر آیا ہے۔"

"جی۔" ظہور جانتا تھا۔ عراق جاتے ہوئے وہ کویت رکا تھا جہاں اس کے

اعزاز میں ایک مشاعرہ بھی ہوا تھا۔

"وہ بھی آپ کی طرح گانے بجانے اور شاعری کا شوق رکھتا ہے۔ افسانے بھی لکھتا ہے۔ وہ کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ بدکردار عورت تھی' اس کے گھر جا کر رات رات بھر رہتا تھا۔ بیوی نے محکمہ خارجہ میں اس کی شکایت کر دی۔ دو سال تک اس کی کوئی فارن پوسٹنگ نہیں ہو سکی۔ سال بھر اپنی بیوی کے پیروں پر ناک رگڑتا رہا تب کہیں معافی ملی۔ وہ کیریئر ڈپلومیٹ تھا لیکن آپ تو کسی دوست کی سفارش پر ایک پوسٹنگ لے آئے ہیں' آپ کا تو پتہ بھی نہیں چلے گا۔" سفیر کو ظہور کی پگڑی اچھالنے میں مزا آتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ظہور بھی ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھتا اور اپنی زبان کی تیزی دکھاتا سفیر نے اسے بولنے سے روک دیا۔

"مجھے اب جانا ہے۔ آپ کو میں ایک مہینے کی مہلت دے رہا ہوں میں ابھی اس فائل پر کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ آپ اپنے ذاتی معاملے کو اس عرصے میں نمٹانے کی کوشش کریں اس کے بعد یہ مسئلہ آپ کا ذاتی نہیں رہے گا۔ یہ مت بھولئے گا کہ پاکستان میں دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی سے اجازت لینے کا قانون ابھی تک نافذ ہے۔ آپ کے خلاف محکمہ جاتی ہی نہیں عدالتی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ اب جا سکتے ہیں۔" سفیر اپنا بریف کیس اٹھوانے کے لئے چپراسی کو آواز دینے لگا۔ ظہور کی تقریریں اس کے سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔ وہ دل میں "پھر سہی" کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ لیکن وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اسے یہ معاملہ فوری نمٹانا تھا ورنہ وہ جانتا تھا کہ سفیر اس کا ٹکٹ کٹوا دے گا۔ اسے حیرت تھی کہ منی میں اتنی ہمت آئی کیسے۔

منی کو دوسروں کی طرح ظہور نے بھی سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ اس کی بے زبانی کو سب اس کی بے ہمتی سمجھنے لگے تھے۔ وہ تھی بھی ایسی ہی۔ زبان پر شکایت لائے بغیر غموں کے پہاڑ کاٹ رہی تھی۔ لیکن اپنے بچوں پر وہ غم کا سایہ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔ ان کے لئے وہ چیخ چیخ کر زمین آسمان ایک کر سکتی تھی۔ کئی مہینوں سے جب ظہور نے پیسے نہیں بھیجے اور اس کے خطوں کا بھی کوئی جواب نہیں

آیا تو اس نے کویت جانے والے محلے کے ایک شخص سے مدد مانگی کہ وہ کویت میں ظہور کی خیریت معلوم کر کے اسے اطلاع دے۔ اس کے پڑوسی نے اسے ظہور کی شادی شدہ زندگی کی کہانی لکھ بھیجی۔ ظہور کی شادی منی کے اپنے لئے کوئی جذباتی صدمہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے بچوں کا حق مارا جا رہا تھا۔ ظہور اس کے لئے وہ کوا بن گیا تھا جو اس کے بچوں کے سروں پر چونچیں مار رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پتھر کھائے بغیر کوا باز نہیں آئے گا۔ اس نے انفارمیشن ڈپارٹمنٹ اور فارن آفس کے بڑے افسروں اور سفیر کو تفصیلی شکایت نامے بھیج دیئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ ظہور دباؤ برداشت نہیں کر سکتا۔ ہر طرف سے دباؤ پڑے گا تو اسے اچانک بچوں کی محبت یاد آ جائے گی۔ اس لئے عاصمہ جب منی سے ملنے آئی تو منی اسے اپنے شکایت ناموں کا اثر سمجھی۔

عاصمہ اپنی ماں کا سوئم کر کے منی کے پاس گئی تھی۔ اس کے پاس بینک میں اپنی بچت کے کافی پیسے جمع تھے جس میں سے بیس ہزار روپے نکال کر ساتھ لائی تھی۔ اس نے منی کو بتایا کہ وہ ظہور کے ساتھ کام کرنے والے ایک افسر کی بیوی ہے اور یہ رقم اس کے اور بچوں کے لئے ظہور نے بھجوائی ہے۔ منی کی آنکھوں میں رقم دیکھ کر چمک آئی تھی لیکن یہ حیرت بھی ہوئی تھی کہ ظہور نے کوئی خط نہیں بھجوایا تھا۔ ظہور ایسے موقعوں پر احسان جتانا ضروری سمجھتا تھا۔

عاصمہ وہاں سے جلدی چلے جانا چاہتی تھی۔ لیکن منی کے اصرار پر اسے چائے کے لئے رکنا پڑا تھا۔ عاصمہ کے لئے اپنے آنسو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ منی کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر تھا۔ اداسی تھی لیکن بے حد پاکیزگی' نہایت معصومیت لئے ہوئے۔ عاصمہ کو ایسا لگا جیسے کسی بوڑھی ہو جانے والی حور کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیا گیا ہو۔ وہ آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگائے مشین پر سلائی میں مصروف تھی۔ کپڑوں کا ڈھیر دیکھ کر عاصمہ کو اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ منی اس مشکل دور سے گزرنے کے لئے کپڑوں کی سلائی کا کام کر رہی تھی۔ اس کی بیٹی ساتھ بیٹھی ہوئی دوپٹے پیکو کر رہی تھی۔ اس کے بیٹے کی صرف ایک جھلک نظر آئی تھی۔ وہ اندر

کمرے میں اندھے بلب کی روشنی میں کتابوں میں غرق تھا۔ عاصمہ منی کو سلام کر کے اور باہر تخت پر تسبیح پڑھتی ہوئی ظہور کی ماں سے اپنے سر پر ہاتھ پھروا کر باہر نکل آئی۔ گھر آ کر وہ دیر تک ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے سسکتی رہی۔

ایک ہفتے بعد منی کو ظہور کا خط ملا جس میں پانچ ہزار روپے کا ڈرافٹ اور ایک تفصیلی خط تھا جس میں اس نے اپنی خطاؤں کی معافیاں مانگی تھیں' بچوں کی یاد میں آنسو بہائے تھے اور لکھا تھا کہ وہ ان کو اپنے پاس بلانے والا ہے۔ یہ بھی لکھا تھا کہ شادی اس کی ایک بڑی غلطی تھی لیکن اب طلاق دے کر اس نے اپنی غلطی کا ازالہ کر دیا ہے۔ وہ گڑگڑایا تھا کہ منی سفارتخانے کو بھیجی جانے والی شکایت واپس لے لے ورنہ اس کی نوکری چلی جائے گی۔ اور نوکری گئی تو وہ اپنے بچوں کو کس طرح تعلیم دلوا سکے گا۔ منی تھوڑی دیر کے لئے الجھن میں پڑ گئی تھی۔ سلائی مشین پر اس کا ہاتھ سست ہوگیا تھا۔ "تو پھر وہ کون تھی!" اس نے سوچا' اور پھر سب کچھ ایک دم واضح ہو تا گیا۔ وہ یقیناً" ظہور کی دوسری بیوی رہی ہو گی۔ منی جان گئی تھی کہ ظہور اسے بھی صرف بے وفائیوں کے زخم دے سکا ہو گا۔ منی اور بچوں کے پاس وہ اپنا احساس جرم ختم کرنے آئی ہو گی۔ منی کو انجانے میں لیا ہوا یہ احسان اچھا نہیں لگا۔ مشین پر اس کا ہاتھ تیزی سے چلنے لگا۔

ظہور کے روز و شب اسی طرح تھے۔ وہ عاصمہ کے جانے کے بعد سے ابھی تک نبیلہ سے ملنے نہیں جا سکا تھا۔ اس کے دفتر اور فلیٹ میں تعزیت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس کی زندگی کا یہ باب ختم ہو چکا تھا' لیکن اسے اب بھی دن میں کئی کئی بار فاتحہ پڑھنے کی پوری رسم ادا کرنی پڑتی۔ ایک دن نبیلہ کا بھی فون آیا تھا' اس نے بھی تعزیت کی تھی اور بتایا تھا کہ آج کل جاوید کی بہن نسرین کا شوہر ندیم عمرے کے لئے گیا ہوا ہے اس لئے نسرین انہی کے پاس رہ رہی ہے۔ لیکن بیوٹیشن کا کورس کر رہی ہے اور صبح دس بجے اپنی کلاس کے لئے چلی جاتی ہے' اس لئے ظہور دس بجے کے بعد آ سکتا ہے۔ دوسرے دن ساڑھے دس بجے ظہور نبیلہ کے

گھر پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ کھولنے والی نبیلہ نہیں نسرین تھی جو باہر جانے کے لئے تیار نظر آتی تھی۔ نبیلہ کو معلوم تھا کون ہو گا اس لئے وہ بھی بھاگی ہوئی دروازے تک آئی تھی۔ ظہور کے اعصاب ایسے موقعوں پر فولاد کے بن جاتے تھے۔ اس نے بڑی خوشگوار مسکراہٹ لا کر اور چہرے کا رنگ بدلے بغیر بتایا کہ اس کا خیال ہے کہ دعوت والی رات وہ اپنا قیمتی قلم بھول گیا تھا' دفتر جاتے ہوئے ادھر سے گزرا تو سوچا معلوم کر لے۔ نسرین نے پلٹ کر اپنی بھابی کی طرف دیکھا۔

"آپ یہیں ٹھہریئے میں جا کر تلاش کرتی ہوں۔" نبیلہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے بھابی میں جاتی ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے۔" نسرین نے گھر کے اندر جاتی ہوئی نبیلہ کو دیکھ کر کہا اور پھر ظہور سے مخاطب ہوئی۔ "آپ چاہیں تو اندر بیٹھ کر انتظار کر لیں۔"

"نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔ دو منٹ کی تو بات ہے۔ آپ کہاں جا رہی ہیں۔ آپ بھی دو منٹ انتظار کر لیں تو میں آپ کو جہاں کہیں گی چھوڑ دوں گا۔ میرا ڈرائیور نیچے کھڑا ہے۔" ظہور نے نسرین کا شک بالکل دھو دینا چاہا۔ اس کا ڈرائیور اور گاڑی نیچے نہیں تھی۔ دن میں نبیلہ کے پاس وہ ہمیشہ ٹیکسی لے کر آتا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ نسرین لفٹ کی پیشکش قبول نہیں کرے گی۔ اس کی توقع کے عین مطابق نسرین بڑی نرمی سے "شکریہ' میں خود چلی جاؤں گی۔" کہہ کر چلی گئی۔ ظہور کو پانچ منٹ انتظار کرا کے نبیلہ نے دروازہ کھول کر اسے اندر کھینچ لیا۔ ظہور نے اسے ہنس کر نسرین کو لفٹ دینے کی پیشکش کے بارے میں بتایا۔

"ایک بڑی امریکی گاڑی اگلے موڑ پر اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ وہ تمہارے سفارتخانے کی پھٹیچر گاڑی میں کیوں بیٹھتی۔ حرافہ سمجھتی ہے کہ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے ایک دن اپنے کمرے کی کھڑکی سے خود اسے گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔ اس آدمی کو بھی پہچانتی ہوں۔ جس کی گاڑی میں وہ بیٹھ کر گئی تھی اس کی یہاں گاڑیاں ٹھیک کرنے کی ورکشاپ ہے۔ شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ ہے۔ بیوٹیشن کے کورس میں پیسے دے کر داخلہ بھی اسی نے دلوایا ہو گا تاکہ نسرین کو گھر سے نکلنے کا بہانہ اور

انہیں ملنے کا موقع مل سکے۔" نبیلہ اپنی نند کے خلاف کب سے بھری بیٹھی تھی۔ پہلی بار کوئی ایسا ملا تھا جسے وہ اپنے گھر کی یہ کہانی سنا سکتی۔

"لیکن شکل سے تو بہت معصوم اور سیدھی لگتی ہے۔" ظہور نے اپنی حیرت ظاہر کی۔

"اس گمان میں مت رہنا۔ پوری چھنال ہے۔ پاکستان میں تھی تو کالج کے بہانے محلے کے ایک درزی کے ساتھ فلمیں دیکھنے جاتی تھی۔ بدنامی ہوئی تو اس کے ماں باپ نے یہ بلا کویت بھیج کر ہمارے سر منڈھ دی۔ سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک پاکستانی بینکر سے تعلقات قائم کر لئے۔ وہ ایسا دیوانہ ہوا کہ اسے پاکستان لے کر بھاگ گیا۔ جاوید نے سفارتخانے میں اپنے تعلقات استعمال کر کے دونوں کو پکڑوایا اور اسے پھر کویت لے کر آگیا۔ ندیم میرا ایک دور کا رشتے دار تھا' جاوید نے کویت کا ویزا خرید کر اسے یہاں بلایا اور نسرین سے اس کی شادی کر دی۔ جاوید کہتے تھے کہ شادی کے بعد سنبھل جائے گی لیکن شادی کو ابھی سال بھی نہیں ہوا اس نے پھر گل کھلانے شروع کر دیئے۔ ہر وقت ندیم سے لڑتی رہتی ہے وہ میرے پاس آکر روتا ہے۔ ندیم اب عمرے کے بہانے سعودی عرب میں نوکری تلاش کرنے گیا ہے۔ نوکری مل گئی تو اسے چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔" ظہور کو ان کہانیوں سے اس وقت دلچسپی نہیں تھی۔ فراق کے کئی دن گزار کر آیا تھا اس لئے نبیلہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے کھینچتا ہوا بیڈ روم میں لے گیا۔ "ابھی نہیں' ابھی نہیں" کرتی ہوئی نبیلہ نے بھی کپڑوں سے اپنا بدن چھڑانے میں دیر نہیں لگائی۔

دونوں لذتوں میں اس طرح ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں پتہ ہی نہیں چلا کس نے دروازہ کھولا اور کون گھر میں داخل ہوا۔ نسرین نے بیڈ روم کا دروازہ کھولا تو ظہور ابھی تک اپنا قلم تلاش کر رہا تھا۔ نسرین کو ایسا لگا جیسے اس کی لاٹری نکل آئی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے وہ سخت غصے میں تھی۔ سڑک کے کنارے آدھے گھنٹے تک کھڑی رہی تھی' لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ شاید کوئی بڑا شیخ گاڑی ٹھیک کرانے آگیا تھا جس نے اسے نکلنے نہیں دیا۔ وہ زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکی تھی۔ اکیلی لڑکی کو سڑک کے کنارے

کھڑا دیکھ کر کئی گاڑیاں ہارن بجاتی ہوئی بار بار پلٹ کر آ رہی تھیں۔ وہ گھر واپس آ گئی۔ سوچا تھا بھابی سے کوئی بہانہ کر دے گی۔ لیکن بھابی تو رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی اس کا موڈ ایک دم خوشگوار ہوگیا۔ بدلہ چکانے کا وقت آگیا تھا۔ نبیلہ نے اپنے اور ظہور کے ننگے جسموں پر چادر ڈال لی تھی۔

"آپ لوگ شاید ابھی تک کھویا ہوا قلم ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں بھائی کو فون کرتی ہوں' وہ ابھی آ کر آپ کی مدد کریں گے۔" یہ کہہ کر نسرین کمرے سے نکل کر باہر کے دروازے کی طرف چل دی۔ نبیلہ بستر سے اتر کر اسی طرح ننگی نسرین کو پکڑنے بھاگی۔ بھاگتے ہوئے نبیلہ نے چادر اتار پھینکی تھی ظہور ایک بار پھر ننگا ہو گیا تھا وہ جلدی سے کپڑے پہن کر فلیٹ سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ اس کے اعصاب پر چڑھا ہوا فولادی خول اتر گیا تھا۔ دونوں کو دیکھے بغیر وہ فلیٹ سے نکل آیا۔ نبیلہ اسی طرح ننگی کھڑی نسرین کو بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"دیکھ تو نے اگر جاوید کو کچھ بتایا تو میں تیرا سارا پول کھول دوں گی۔ گیراج والے کی کہانی بتا دوں گی۔ گیراج والے کی بیوی کو بھی بتا دوں گی۔ اس کے مسٹنڈے بھائی تیری تکہ بوٹی کر دیں گے۔ میرا کچھ نہیں ہو گا۔ جاوید کو تھوڑی مار پیٹ کے بعد صبر آ جائے گا۔ وہ مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے اپنی بیٹی سے بہت محبت ہے۔ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکے گا۔ لیکن تجھے میں برباد کر دوں گی۔" نبیلہ اسی طرح ہذیانی انداز میں بولے جا رہی تھی۔

"بھابی جاؤ پہلے کپڑے پہن کر آؤ پھر بات کرنا۔" نسرین نے اسے خاموش کرتے ہوئے بڑے سرد لہجے میں کہا اور ڈرائنگ روم کے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ وہ اس لمحے کا پورا پورا مزا لینا چاہتی تھی۔

ظہور گھر جاتے ہی نائک کی دی ہوئی بیئر کی بوتلوں پر ٹوٹ پڑا۔ دفتر فون کر دیا تھا کہ وہ بیمار ہے نہیں آئے گا۔ رات میں کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ محرم کا مہینہ ہونے کی وجہ سے آج کل مشاعروں اور موسیقی کی محفلیں بند تھیں۔ لیکن مغرب کے

وقت علیم صاحب کا فون آگیا۔ وہ اسے کھانے پر بلا رہے تھے۔ ظہور انکار نہیں کر سکا۔ علیم صاحب پاکستان کے ایک سینئر صحافی تھے اور کویت کے ایک مقامی انگریزی اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ ظہور رات گئے تک ان کے ساتھ شراب پیتا اور غالب کے شعر سنتا رہا۔ صبح وہ دفتر دیر سے پہنچا تھا۔ لیکن بالکل نارمل تھا۔ نبیلہ نے صبح ہی صبح جب وہ اپنی بیٹی کو اسکول چھوڑنے گئی تھی اسے گھر پر فون کر کے بتا دیا تھا کہ اس نے نسرین کو ٹھیک کر لیا ہے۔ وہ جاوید کو کچھ نہیں بتائے گی۔ نبیلہ نے ظہور کو بولنے کا موقع دیئے بغیر اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا تھا۔ وہ بہت جلدی میں لگتی تھی۔

"میں نے اس سے یہ وعدہ بھی کر لیا ہے کہ اب تم سے کبھی نہیں ملوں گی اور اس کے بھائی کی وفادار رہوں گی۔ اس لئے تم فی الحال گھر نہ آنا۔ وہ کتیا کی طرح تمہاری بو سونگھتی پھرے گی، اچانک چھاپے مارے گی اور پھر پکڑے گئے تو میرے ساتھ تمہیں بھی بلیک میل کرے گی۔" ظہور نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ خود بھی کچھ عرصے نبیلہ سے دور رہنا چاہتا تھا۔ گولی کان کے پاس سے گزری تھی۔ لیکن ظہور قسمت کا اتنا دھنی نہیں تھا کہ ہر بار بچ جاتا۔ کسی اور کی بگڑی ہوئی قسمت اس کے مقدر سے بھی کھیل گئی تھی۔

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد ہی نسرین کو اس کے شوہر ندیم نے سلطان سینٹر کے کیفے میں گیراج والے کے ساتھ کھانا کھاتے اور خوش گپیاں کرتے پکڑ لیا۔ سلطان سینٹر کا آج کل کویت میں بہت شہرہ تھا۔ نیا نیا ڈپارٹمنٹل اسٹور کھلا تھا۔ جو شاپنگ کرنے نہیں آتے وہ صرف اس کی سیر کرنے آتے تھے۔ اسی میں اوپر جینز کے نام سے یورپی انداز کا کیفے بھی تھا جو بھرا رہتا تھا۔ نسرین کا دل آج کسی خالی فلیٹ کے بند کمرے کی جگہ شیشے کی قد آدم کھڑکیوں سے سمندر کا نظارہ کرتے ہوئے لنچ کرنے کو چاہا تھا۔ اسے معلوم تھا ندیم ریفائنری سے شام گئے تک واپس نہیں آتا کوئی اور دیکھے تو دیکھے، نسرین کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن اس روز ریفائنری کا شٹ ڈاؤن تھا اس لئے ندیم کے ساتھ کام کرنے والوں نے سلطان سینٹر جا کر لنچ کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور ندیم کو بھی ساتھ آنے پر مجبور کیا تھا۔ ندیم نسرین کو ایک دوسرے آدمی کے

ساتھ دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا نبیلہ کے گھر لے آیا اس نے جاوید کو بھی فوراً" گھر آنے کے لئے فون کر دیا تھا۔ نسرین کا کہنا تھا کہ سلطان سینٹر میں وہ شاپنگ کے لئے گئی تھی اسے کھانے کی دعوت ملی تو اس نے انکار نہیں کیا۔ وہ اس بات پر سخت غصے میں تھی کہ وہ اتنے تنگ نظر کیوں ہو گئے ہیں جو کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کو بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ندیم کا خون بری طرح کھولا ہوا تھا۔ اسے نسرین کی کسی بات کا یقین نہیں تھا۔ وہ آج فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ نبیلہ خاموش رہی لیکن جاوید سخت غصے میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بہن عادی مجرم ہے۔ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ سکی ہے۔ لیکن اسے ندیم پر بھی غصہ تھا کہ وہ کیسا مرد ہے جو اپنی بیوی کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ ندیم خاموشی سے جاوید کی ڈانٹ سنتا رہا۔ لیکن جب جاوید نے نسرین کی چٹیا پکڑ کر اسے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو نسرین نے زور کا جھٹکا دے کر اپنے بال چھڑا لئے۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"بھائی خبردار جو مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں نہ تمہارا دیا ہوا کھاتی ہوں۔ مارنا ہے تو اپنی بیوی کو مارو۔ اس کی چٹیا کھینچو۔ بیوی کو قابو رکھنا پہلے تم سیکھو۔" نسرین کا لہجہ ٹھنڈی آگ کی طرح سرد تھا۔ نبیلہ کا چہرہ سفید ہو گیا۔ لیکن جاوید دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن جو اس کے سامنے بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی کس بے خوفی سے زبان چلا رہی تھی۔

"کیا بکواس کر رہی ہے۔" وہ حلق کے بل چیخا۔

"یہ مجھ سے نہیں اپنی بیوی سے پوچھو۔ اس سے پوچھو کہ جب تم دفتر اور نیلی اسکول چلی جاتی ہے تو قلم تلاش کرنے کون تمہارے گھر آتا ہے۔ تمہارے کمرے اور تمہارے بستر پر تمہاری بیوی کے ساتھ کون رنگ رلیاں مناتا ہے۔" جاوید کی چنگاریاں برساتی ہوئی نظریں نبیلہ پر گڑ گئی تھیں۔

"میرے پیچھے گھر میں کون آتا ہے۔" وہ پھنکارا۔

"یہ بکواس کر رہی ہے۔ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مجھ پر جھوٹے الزام لگا رہی ہے۔ تم جانتے ہو یہ ہمیشہ کی جھوٹی اور مکار ہے۔" نبیلہ نے کانپتے

ہوئے کہا۔ لیکن اسے خود بھی پتہ تھا کہ اس کی بدلی ہوئی رنگت اور لڑکھڑاتا ہوا لہجہ اس کی چغلی کھا رہا تھا۔

"بھائی یہ نہیں بتائے گی۔ تم اپنے آپ سے پوچھو کہ وہ کون ہے جس کے سامنے بھابی کھلے گلے کی قمیض پہن کر ٹھمکے لگاتی ہے' گانے گاتی ہے جسے تم سر پر بٹھاتے ہو خوش کرنے کے لئے شرابیں پلاتے ہو۔" نسرین کا لہجہ اسی طرح سرد تھا۔ جاوید کا ہاتھ بے ساختہ اسے مارنے کے لئے اٹھ گیا۔ نسرین اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ جاوید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی۔ جاوید نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

"چپ ہو جا ورنہ تیری زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔" وہ ایک بار پھر چیخا۔ نسرین پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے شوہر ندیم کا ہاتھ پکڑا جو سکتے کی کیفیت میں کھڑا تھا۔

"آؤ ندیم گھر چلیں۔ اپنے جھگڑے ہم خود نمٹائیں گے۔ ہم بڑے ہو گئے ہیں' ہمیں کسی قاضی کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے فیصلے ہم خود کر سکتے ہیں۔" ندیم کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ فلیٹ سے باہر چل دیا۔ باہر نکلنے سے قبل نسرین نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔

"بھائی تم بھی نیلی کے آنے سے پہلے اپنے جھگڑے نمٹا لینا۔ وہ بہت حساس ہے۔ تم دونوں کو لڑتا دیکھ کر بکھر جائے گی۔" نسرین کی آنکھوں میں اچانک درد سمٹ آیا تھا۔ اپنی دس سالہ بھتیجی کو وہ دل و جان سے چاہتی تھی۔ بھائی کے گھر میں یہ آگ اس نے جان بوجھ کر لگائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔ اسے اپنے بھائی سے بے حد پیار تھا۔ اس کے بھائی نے اس کی نوجوانی کی ہر بھول بھلا کر ہر قدم پر سہارا دیا تھا وہ اس کے گھر کو ٹوٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ظہور اور نبیلہ کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے بعد اس نے کئی دن اپنی صورتحال پر بھی غور کیا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ اسے اپنا چلن بھی بدلنا ہو گا اور زندگی کی ناؤ کو کسی ایک کنارے لگانا ہو گا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ جسموں سے کھیلنے والے صرف گھر تباہ کر سکتے ہیں۔ اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔ وہ گھر بسا نہیں سکتے۔ وہ آج سلطان سینٹر جیسی کھلی جگہ لنچ کرنے اسی

لئے گئی تھی تاکہ گیرج والے کو بتا سکے کہ ان کے تعلق کی عمر اب ختم ہو چکی ہے۔ گیرج والا بھی سمجھ گیا تھا۔ بلکہ اس نے خود بھی اطمینان کا سانس لیا تھا اسے بھی خوف تھا کہ راز افشا ہوا تو اس کی اپنی گھریلو زندگی ختم ہو سکتی ہے۔ نسرین اب اپنی زندگی کا محل نئے سرے سے سجانا چاہتی تھی۔ ندیم ایک اچھا اور سیدھا انسان تھا۔ وہ جانتی تھی وہ اچھا شوہر اور اچھا باپ ثابت ہو گا۔ وہ اب ماں بننا چاہتی تھی۔

نسرین اور ندیم کے فلیٹ سے چلے جانے کا جاوید نے کوئی اثر نہیں لیا۔ وہ اسی طرح شعلہ بار نگاہوں سے نبیلہ کو دیکھ رہا تھا جس نے اپنے کانپتے ہوئے بدن کو دیوار سے ٹکا دیا تھا۔

"مجھے معاف کر دو۔ بس یہ پہلی غلطی تھی۔ قصور میرا نہیں تھا۔ وہ اپنا کھویا ہوا قلم لینے آیا تھا۔ نسرین سے پوچھ لو۔ وہ بھی اس وقت یہاں تھی۔ پھر وہ اندر آ گیا اور اپنی لچھے دار باتوں سے مجھے پھسلا لیا۔ مجھ سے بھی بیوقوفی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔ میری پہلی غلطی' میری بیوقوفی معاف کر دو۔" نبیلہ کی آنکھوں سے آنسو بھی شروع ہو گئے تھے۔ لہجے میں رقت تھی۔

"کتیا تو اسے غلطی کہتی ہے۔ بیوقوفی کہتی ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ڈرائنگ روم میں ایک طرف ٹینس کا ریکٹ پڑا تھا۔ ان کی بیٹی نیلی کو شوق ہوا تھا تو وہ خرید کر لایا تھا۔ اس نے ریکٹ اٹھا کر نبیلہ کو مارا تو وہ دوہری ہو کر صوفے پر گر گئی۔ جاوید پاگلوں کی طرح اس وقت تک اس کو کوٹتا رہا جب تک اس کے ہاتھ شل نہیں ہوئے اور ریکٹ ٹوٹ نہیں گیا۔ نبیلہ "مجھے معاف کر دو۔" کی رٹ لگا کر مار کھاتی اور روتی رہی۔ جاوید ٹوٹا ہوا ریکٹ پھینک کر صوفے پر بیٹھ کر ہانپنے اور پھر اپنا منہ چھپا کر رونے لگا۔ نبیلہ اس کے پاؤں سے لپٹ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ رونا اس کا بھی جاری تھا۔ جاوید نے اسے پاؤں سے الگ نہیں کیا۔

"غلطی میری ہے۔ مجھے اس حرامی کو گھر میں گھسنے ہی نہیں دینا تھا۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا وہ اتنا بڑا سور ہو گا۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ ایک دن کویت میں

نہیں رہنے دوں گا۔ وہ مجھے ابھی جانتا نہیں ہے۔" جاوید رونا بھول کر بڑی بڑی قسمیں کھانے لگا تھا۔ نبیلہ کا رونا بھی بند ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جاوید ظہور کو واقعی نہیں چھوڑے گا۔ جہنم میں جائے۔ نبیلہ نے سوچا۔ اس کی اپنی جان بچ گئی تھی۔ اسے معلوم تھا جاوید کا غصہ نکل گیا ہے اب اسے منانا مشکل نہیں ہو گا۔ ویسے اسے آج جاوید کے مردانہ پن پر بہت پیار آیا۔ اس کی چوٹ سے درد کی جو ٹیسیں اٹھ رہی تھیں وہ بہت مزا دے رہی تھیں۔ اس نے سوچا وہ رات میں جاوید کو سات آسمانوں کی سیر کرائے گی۔ اسے جاوید کو منانے کا فن آتا تھا۔

وہی ہوا جس طرح نبیلہ نے سوچا تھا۔ جاوید کو اس نے سات آسمانوں کی سیر کرائی لیکن وہ خود ساتویں آسمان تک نہ پہنچ سکی۔ ظہور کی بات ہی کچھ اور تھی۔ نبیلہ نے سوچا۔ لیکن پھر اپنے منہ پر تھپڑ مارے۔ ظہور کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ظہور اب چھوت کی بیماری تھا وہ جانتی تھی کہ گھر ٹوٹا تو ظہور اسے جوڑ نہیں سکے گا۔ نبیلہ کو اپنا اور اپنی بیٹی کا تحفظ زیادہ عزیز تھا۔ جاوید رات بھر نبیلہ کی چوٹوں کو سینکتا اور چومتا رہا۔ یہ اس کی مردانگی کی نشانیاں تھیں۔ ان پر ہاتھ پھیرنے میں اسے بھی بہت مزا آیا۔

ظہور کی تنہا زندگی مزے میں گزر رہی تھی۔ وہ سچ مچ کی آزادی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ دیر سے گھر آنے پر لڑنے اور روک ٹوک کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ نبیلہ سے بھی جان چھوٹ گئی تھی۔ نبیلہ کے ساتھ مزا تو آتا تھا لیکن پھر یہ ملاقات دن بھر بوجھ بنی رہتی۔ ضمیر بھی ملامت کرتا' پکڑے جانے کا خوف اور شہر میں ہونے والی چہ مہ گوئیاں الگ۔ ظہور اب اپنی راتیں مرغاب کے علاقے میں گزارتا۔ یہ شہر کا بالکل بیچ تھا جہاں کئی پاکستانی ہندوستانی ہوٹل تھے۔ پان اور پرچون' وڈیو' اخباروں اور رسالوں کا دکانیں تھیں۔ بڑا پوسٹ آفس بھی یہیں تھا جہاں اپنے گھروں کو پیسے بھیجنے والوں کی لمبی قطاریں لگی رہتیں۔ پاس ہی ان کی رقموں کا ڈرافٹ بنانے والے ایکسچینج تھے۔ صرافہ بازار تھا جہاں چھوٹی چھوٹی دکانوں پر شو کیس میں لاکھوں کروڑوں روپے

کی دنیا بھر کی کرنسیاں بجی ہوتیں۔ سناروں کی دکانوں پر اتنا سونا ٹنگا ہوتا کہ وہ پیتل کے برتنوں کا بازار لگتا۔

ظہور زرقا نامی ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھاتا۔ ہوٹل کا مالک اس کا دوست تھا جو ظہور کی بہت عزت کرتا تھا۔ ظہور کو بھی وہ پسند تھا۔ اس کمیاب نسل سے تھا جو دوستی کرنا اور نباہنا جانتی تھی۔ ظہور کو اس لئے بھی پسند تھا کہ ادھار دے کر کبھی واپس نہیں مانگتا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا اس لئے رات کو ہوٹل کے باہر کھلے میدان میں کرسیاں اور میزیں لگ جاتیں۔ شہر میں جو بھی چھڑے رہتے تھے ان کی پنچایتیں لگتیں اور پھر یہ ہوتا کہ آخر میں یہ ساری پنچایتیں ایک بڑا دائرہ بنا کر شہر کے سب سے بڑے چھڑے۔ ظہور۔ کی چوپال میں ضم ہو جاتیں۔ دن بھر مشقت کی چکی میں پسے اور مستقل ہجر کی کیفیت میں مبتلا لوگ ظہور کی باتوں سے محظوظ ہوتے۔ ملکی سیاست، مقامی انجمنوں کے جھگڑے، شاعرانہ چشمکیں، استادی شاگردی کی چپقلش۔ ہر معاملے میں ظہور کا لفظ آخری سمجھا جاتا۔ ظہور کو بہت مزا آ رہا تھا۔ اس کی باتوں کی اتنی عقیدت سے سننے والے سامعین اسے پہلی بار میسر آئے تھے۔ وہ راتوں کو دیر سے گھر جاتا۔ دیر سے سو کر اٹھتا اور دیر سے دفتر پہنچتا۔

لیکن اس روز وہ صبح نو بجے ہی دفتر پہنچ گیا تھا۔ ایک وہی دیر سے نہیں آتا تھا سارے افسر دیر سے آتے تھے۔ صرف فرسٹ سیکرٹری تھا جو ہر صبح ٹھیک آٹھ بجے دفتر پہنچ کر فائلیں نمٹانی شروع کر دیتا تھا۔ ظہور کو سفیر کی گاڑی بھی کھڑی ہوئی نظر آئی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ سفیر گیارہ بارہ بجے سے پہلے نہیں آتا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب سفیر کے پی اے نے اسے سفیر کا بلاوا دیا۔ ظہور کو اس بلاوے کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ سفیر اسے ملکی سیاست پر گفتگو کرنے کے لئے نہیں بلا سکتا۔ کوئی اہم دفتری معاملہ بھی نہیں ہے۔ کل شام ہی ہفتہ واری میٹنگ میں وہ اپنی رپورٹ دے چکا ہے۔ منی کے معاملے میں اس نے جو مہلت دی تھی اسے ختم ہونے میں بھی ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ پھر کیا معاملہ ہے۔ کیا عاصمہ نے کوئی گل کھلایا ہے۔ وہ آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرتا ہوا سفیر کے کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن

پرانے وظیفوں میں اب اثر ختم ہو گیا تھا۔ سفیر کے دفتر میں جاوید بیٹھا ہوا تھا۔ ظہور پہلی بار اپنے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ پر قابو نہ پا سکا۔

"آیئے ظہور صاحب۔ بیٹھئے۔ آپ انہیں جانتے ہیں' یہ جاوید اختر ہیں۔ ایک کویتی کمپنی میں سیلز منیجر ہیں۔" سفیر نے ظہور کو دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں میں انہیں جانتا ہوں یہ میرے اچھے دوست ہیں۔" ظہور نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم دوست نہیں دوستی کے نام پر دھبہ ہو۔ کمینے انسان ہو۔ دوستوں کی ماں بہنوں پر نظر رکھنے والے گھٹیا انسان۔" جاوید سخت اشتعال میں تھا۔

"جاوید صاحب پلیز آپ اپنے مزاج پر قابو رکھئے۔ ظہور صاحب جاوید صاحب نے مجھے تحریری طور پر آپ کے بارے میں شکایت دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ ان کی غیر موجودگی میں ان کے گھر جاتے رہے ہیں جہاں آپ نے ان کی بیوی کو پھسلا کر اس کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔" سفیر نے کسی تھانے میں بیٹھے ہوئے انسپکٹر کی طرح پوچھ گچھ شروع کی۔

"میں ان کے گھر ان کی دعوت پر جاتا رہا ہوں۔ کچھ دن پہلے ہی انہوں نے مجھے کھانے پر بلایا تھا۔ اس دعوت کے کئی گواہ ہیں۔" ظہور نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

جاوید نے غصے میں اٹھ کر پھر کچھ کہنا چاہا لیکن سفیر کے گھورنے پر خاموش ہو گیا۔

"ان کی درخواست کے ساتھ ان کی بہن کا بیان بھی لگا ہے جس میں انہوں نے آپ کو ان کی بیوی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا پورا واقعہ تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کی بیوی کا حلفیہ بیان بھی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ آپ قلم تلاش کرنے کا بہانہ کر کے ان کے گھر گئے تھے۔ جہاں تنہا پا کر آپ نے اسے بہلا اور پھسلا کر اس کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔" سفیر کی نظریں ظہور کے چہرے پر جمی تھیں جو ان سے بچنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ سب جھوٹے بیان ہیں۔ میرے خلاف گھڑے گئے ہیں۔ ان کی بیوی اور بہن کو یہاں بلایئے۔ وہ میرے سامنے یہ بیان دیں تو پھر میں بھی جواب دوں گا۔ ان

کے سامنے آئے بغیر میں کچھ نہیں کہوں گا۔" ظہور نے کہا لیکن وہ سفیر سے آنکھیں نہیں ملا سکا۔

"ظہور صاحب آپ معاملے کی نزاکت نہیں سمجھ رہے۔ یہ ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔ ایک شریف گھرانے کی عزت کا سوال ہے۔ وہ ایسا الزام کیوں لگائیں گے جس سے ان کی اپنی بدنامی ہو۔ میں نے اس شکایت کی کاپی اپنے پی اے اور فرسٹ سیکرٹری تک کو نہیں دی ہے۔ یہاں ہونے والی گفتگو باہر جائے گی بھی نہیں میں نے یہ وعدہ پہلے ہی کر لیا ہے۔ لیکن یہ کوئی عدالت نہیں ہے جہاں میں دو گھریلو عورتوں کو گواہی کے لئے طلب کروں۔ مجھے صرف آپ کا جواب چاہئے۔ مجھے یقین ہے یہ لوگ بلاوجہ ایسی شکایت نہیں کریں گے۔" سفیر کی نظریں ظہور کے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں۔

"یہ لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ جنہیں آپ شریف اور گھریلو کہہ رہے ہیں بہت بے غیرت لوگ ہیں۔ پورا شہر ان کے کارناموں سے واقف ہے۔ ان کی بہن کو جب کوئی بھگا کر لے گیا تھا تب بھی یہ روتے ہوئے سفارتخانے آئے تھے۔ اب بھی ان کی بہن چار بچوں کے باپ کے ساتھ تعلقات رکھتی ہے۔ یہ اور ان کی بیوی اپنا کام نکالنے کے لئے شام کو اپنے گھر پر سفارتخانے کے افسروں اور کو-لیگوں کی دعوتیں کرتے ہیں اور ان کا دل لبھاتے ہیں اور پھر شریف بن کر دوسروں پر اپنی عزت سے کھیلنے کا الزام لگاتے ہیں۔" ظہور نے بھی اپنے دل کا غبار نکال دیا۔ لیکن جاوید کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"کتے کمینے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تیرا خون پی جاؤں گا۔" وہ ظہور پر حملہ کرنے کے ارادے سے کرسی پر اٹھ کھڑا ہوا لیکن سفیر کی ڈانٹ سن کر وہ رک گیا۔

"سٹ ڈاؤن مسٹر جاوید۔ یہ میرا دفتر ہے مرغاب کا چائے خانہ نہیں ہے۔ آپ اگر خود اپنا تماشا بنانا چاہتے ہیں تو یہ کام شہر کے چوک پر جا کر کیجئے گا۔ آپ نے یہاں بدتمیزی کی تو گارڈ بلا کر آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" جاوید سفیر کی اس

دھمکی کے بعد تھوڑی دیر اسی طرح کھڑا رہا پھر بیٹھ گیا۔ سفیر اب ظہور سے مخاطب ہو گیا تھا۔

"ظہور صاحب ان کی بہن اور ان کی بیوی کیا کرتے ہیں کس سے تعلقات رکھتے ہیں، کس کو دعوت پر بلاتے ہیں، کیوں بلاتے ہیں یہ میرا مسئلہ ہے نہ یہ لوگ میری ذمہ داری ہیں۔ میرا کام معاشرے کی اخلاقیات سدھارنا نہیں ہے۔ میرا مسئلہ اور میری ذمہ داری آپ ہیں۔ اگر میرا کوئی بھی افسر کسی غیر اخلاقی کام میں جو ہمارے اور اس ملک کے قانون کے اعتبار سے ایک سنگین جرم بھی ہے ملوث ہے تو پھر اس سے نمٹنا میرا کام ہے۔ میں آپ سے صرف آپ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ کیا مسٹر جاوید کی یہ شکایت صحیح ہے کہ آپ ان کی غیر موجودگی میں ان کے گھر جاتے ہیں۔"

"میں کہیں کسی کے پاس اس کی مرضی کے خلاف نہ جاتا ہوں نہ ملتا ہوں۔ زبردستی کو میں ایک بہت بڑا گناہ سمجھتا ہوں۔ اسی طرح کوئی دعوت بھی کبھی رد نہیں کرتا۔ دل توڑنا بھی میرے نزدیک ایک بڑا گناہ ہے۔ رات کو جاوید کھانے پر بلاتے تھے جاتا تھا۔ دن میں ان کی بیوی مجھے بلاتی تھیں میں انہیں بھی منع نہیں کر سکا تھا۔ کل ان کی بہن بلائیں گی تو ان سے ملنے بھی جاؤں گا۔ جاوید صاحب کو چاہئے کہ بچوں کی طرح شکایتوں کے آنسو بہانے کے بجائے اپنی بیوی اور بہن کو قابو میں رکھیں۔ ورنہ آج میں ہوں کل کوئی اور ہو گا۔" ظہور کے جواب سے جاوید ہی نہیں سفیر بھی غصے میں آیا تھا۔ جاوید تو بری طرح مشتعل ہوا تھا۔

"سفیر صاحب مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ نے مجھے رسوا کرنے کے لئے یہاں بلایا ہے۔ میں اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے کہ میرے ہاتھ سے اس شخص کا خون ہو جائے میں جا رہا ہوں لیکن میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ میں حکومت کو لکھوں گا۔ کویتی پولیس کو رپورٹ کروں گا۔ آپ نے اپنے افسر کو بچانے کی کوشش کی تو آپ کی شکایت بھی کروں گا۔" دھمکیاں دیتا ہوا جاوید پاؤں پٹختا ہوا طوفان کی طرح سفیر کے کمرے سے نکل گیا۔

"تم بد کردار ہی نہیں بد زبان بھی ہو۔ تم نے اپنے آپ کو ہی نہیں مجھے اور اس پورے سفارتخانے کو رسوا کرنے کا بندوبست کیا ہے۔ اس نے کویتی حکومت کو شکایت کی تو محکمہ خارجہ میں جوابدہی کے لئے تمہیں نہیں مجھے جانا ہو گا۔" سفیر ظہور سے مخاطب تھا لیکن شاید اپنے آپ سے بات کر رہا تھا۔ ظہور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سوچا یہی بہتر ہے کہ چلا جائے۔ وہ سفیر سے کسی بڑے معرکے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا ہوا تو آج کویت میں اس کا آخری دن ہو گا۔ لیکن سفیر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھ جانے کے لئے کہا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ تمہاری بیوی۔ میرا مطلب ہے دوسری بیوی یہ سب کچھ جانتی تھی۔ اسی لئے طلاق لے کر ہمیشہ کے لئے چلی گئی ہے۔" سفیر کے سوال پر ظہور ایک بار پھر کھڑا ہو گیا۔ اسے پہلے ہی شبہ تھا کہ اس کی اور عاصمہ کی طلاق کی کہانی سفارتخانے میں سب کو معلوم ہے لیکن اس سے پہلے کبھی کسی نے اس کے منہ پر نہیں کہا تھا۔ سفیر نے آج اس کی تصدیق کر دی تھی۔

"سر میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ میرے ذاتی معاملے ہیں۔ ان سے سفارتخانے کا اور آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اور میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ سفارتخانے سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کا کوئی عمل ذاتی نہیں ہے۔ خاص طور پر تمہارے یہ اعمال۔ تم اپنے دفتر کے اوقات میں دوسروں کی بیویوں کے ساتھ داد عیش دیتے ہو۔ تمہاری بیوی تمہیں چھوڑ کر چلی جاتی ہے، پہلی بیوی شکایتوں کے دفتر لگاتی ہے۔ مجھے اپنا قیمتی وقت تمہارے خلاف کچہری لگانے میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ دو ٹکے کے لوگ میرے دفتر میں بیٹھ کر مجھے میرے خلاف شکایت کرنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ اور تم کہتے ہو کہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہیں معلوم ہے میں تمہیں اگلے جہاز سے پاکستان بھیج سکتا ہوں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہو گی کہ تمہارا وہ دوست کتنا با اثر ہے جس نے تم پر احسان کر کے تمہاری مصیبت ہمارے سروں پر نازل کی ہے۔" ظہور نے سوچا کہ شاید اس معرکے کی گھڑی آ ہی گئی ہے جس سے وہ اب تک بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے آپ بہت بااثر ہیں۔ وفاقی کابینہ کا ایک اہم وزیر آپ کا رشتے دار ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ فرسٹ سیکریٹری قبائلی علاقے کا ایک سینیٹر کے کوٹے پر ہے۔ لیبر اتاشی قومی اسمبلی کے اس رکن کا بھائی ہے جس کا ووٹ نہ ملے تو حکومت چلی جائے گی۔ کلرک تک کسی وزیر کی سفارش پر آیا ہوا ہے۔ خود آپ کا ڈرائیور آپ کی اس بہن کی سفارش پر یہاں آیا ہے جس کے گھر اس کی بیوی برتن دھونے اور جھاڑو لگانے کا کام کرتی ہے۔ جاہلوں کی یہ فوج صرف سفارش کے ٹٹو پر سوار ہو کر ہی ان مقامات کا سفر کر سکتی ہے۔ اس لئے آپ مجھے سفارشی ہونے کا طعنہ نہ دیں۔ میں نے یہاں رہ کر اپنے رشتے داروں کو ویزے نہیں بھجوائے۔ سفارتخانے کا وقار بلند کیا ہے۔ گلی کوچوں میں اس کی عزت بڑھانے کے لئے کام کیا ہے۔" ظہور نے اسی طرح کھڑے کھڑے اپنی تقریر جاری رکھی۔

"جی ہاں مجھے معلوم ہے۔ ان گلی کوچوں میں آپ کی عزت کا جو ڈھول بجتا ہے میں اسے بھی جانتا ہوں۔ بیٹھ جائیے۔ بیٹھ جائیے۔ میں نے سنا ہے آپ تقریر بہت اچھی کرتے ہیں۔ آج میں بھی آپ کی زبان کا کمال دیکھنا چاہتا ہوں۔" سفیر کے پاس شاید آج وقت تھا۔ اس نے فون پر پی اے کو کافی بھجوانے کے لئے کہا دراز سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگائی اور پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ کا ایک بھرپور کش لینے کے بعد سگریٹ کا پیکٹ ظہور کی طرف اچھال دیا۔

"سگریٹ پیجئے۔ آپ جو گستاخیاں کر چکے ہیں وہ میرے سامنے سگریٹ پینے سے زیادہ بڑی ہیں۔" سفیر تم سے پھر آپ پر آگیا تھا۔ ظہور جانتا تھا کہ سفیر نے اس معرکے کے لئے اپنا مورچہ لگا لیا ہے۔ وہ اسے ڈھیل دے گا اور پھر اپنا کانٹا کھینچے گا۔ وہ جان گیا تھا آج اس کا فیصلہ ہونے کا دن ہے۔

"شکریہ، لیکن میں مینتھل سگریٹ نہیں پیتا۔" ظہور نے یہ کہہ کر جیب سے سگریٹ کا اپنا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگا لی۔ اسے سخت طلب ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سفیر کی طرف دیکھتا رہا جو اس وقت دھواں اڑاتا ہوا سگریٹ نوشی کا پورا مزا لے رہا تھا۔ ظہور کو اس کا سگریٹ پینے کا انداز کچھ مضحکہ خیز سا لگا۔ سگریٹ کا کش لیتے

ہوئے وہ ہونٹوں کی ایسی چونچ بناتا تھا جیسے کوئی اناڑی بوسہ لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ اتنے میں کافی آ گئی۔ سفیر شاید کافی کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر اس نے کافی کا گھونٹ لیا۔ ظہور نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا تھا۔

"وہ جو آپ کا صحافی دوست ہے اس کا کیا نام ہے' جو اٹھارویں صدی کی بہت مشکل انگریزی میں اداریہ لکھ کر اکڑتا ہے اور تیسرا پیگ لیتے ہی غالب کے شعر پڑھنے لگتا ہے۔"

"علیم صاحب۔ وہ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔" ظہور کو سفیر کا لہجہ بہت برا لگا۔ وہ جانتا تھا کہ سفیر علیم صاحب سے ان کے ایک اداریئے پر بہت ناراض تھا۔ خود اسے بھی سفیر سے صلواتیں سننی پڑی تھیں۔

"آپ کو پتہ ہے آپ جیسے خود کو پڑھا لکھا سمجھنے والوں کا مسئلہ کیا ہے۔ پہلی دو ملاقاتوں میں آپ لوگوں کو بہت متاثر کرتے ہیں لیکن تیسری کے بعد چوتھی ملاقات میں آپ کی دانشوری کا کوٹہ ختم ہو جاتا ہے۔ آپ لوگ خود کو دہرانے لگتے ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ کی جنسی فتوحات میں آپ کی زبان دانی کو بہت دخل ہو گا۔ آپ کی بیوی ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ پہلی چند ملاقاتوں میں متاثر ہو کر شادی کر بیٹھی ہو گی لیکن جلد ہی آپ کا اصلی چہرہ دیکھ کر آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔"

"سر آپ حد سے گزر گئے ہیں آپ کو میری گھریلو زندگی کا تجزیہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" ظہور نے احتجاج کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

"یہ تجزیہ نہیں تھا آپ کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ تجزیہ آپ سننا چاہتے ہیں تو آپ وہ بھی سن لیجئے۔ معلوم ہے آپ جیسے بدکرداروں کے بارے میں جو اپنی بیویوں کو چھوڑ کر دوسروں کے گھروں میں منہ مارتے پھرتے ہیں ماہرین کیا کہتے ہیں۔ وجوہات کی ایک لمبی فہرست ہے لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ ایسے لوگ ذہنی طور پر نابالغ اور جنسی طور پر کمزور ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنے اوپر اعتماد نہیں ہوتا۔ جو اپنی مردانگی پر تصدیق کی مہر لگوانے ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔" سفیر نے بہت حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن میرا شمار اس طرح کے لوگوں میں نہیں ہے۔ آپ جاوید کی بیوی کو بلوا کر شہادت حاصل کر سکتے ہیں اور آپ بار بار بدکردار کہہ کر میری توہین کر رہے ہیں۔ میں بدکردار نہیں محبت کا پجاری ہوں۔ محبت کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ بدکردار آپ کے بدعنوان افسر ہیں جو آپ کی سرپرستی میں قوم کا مال لوٹ رہے ہیں۔" ظہور نے بڑی ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے سفیر کو زچ کرنا چاہا۔

"میں تم جیسے محبت کے پجاریوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم لوگ صرف جنس کے غلام ہو۔ تم خود کو شاید ان کا اوتار سمجھتے ہو جو آج سے کوئی ہزار سال پہلے رومان پسندی کے نام پر بیویوں سے بیوفائی کو جائز سمجھتے تھے' تمہارا خیال ہے کہ تم خیالی جنتوں میں رہنے والے سترہویں صدی کے کوئی دانشور' اٹھارویں صدی کے فلسفی اور یا پھر انیسویں صدی کے رومان پسند اور سماجی اصلاح کار ہو جو مذہب اور ریاست کے بنائے ہوئے نظام کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا سکتا ہے۔ لیکن اصل میں تم کچھ نہیں ہو' محض ایک پرانا پٹا ہوا ڈھول ہو۔ تم جیسے لوگوں کی کوششوں کے باوجود بدکاری کی تحریکیں کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ بلکہ انسان پھر اپنی اصل کی طرف واپس چلا گیا۔ اس ابتدائی زمانے کی طرف جب جوڑے بنانے کی روایت کا آغاز ہوا تھا اور ان جوڑوں سے پیدا ہونے والوں کو اپنے ماں باپ کی پہلی بار شناخت ملی تھی۔" سفیر کسی مبلغ کے انداز میں بولنے لگا تھا۔ لیکن ظہور کا غیر سنجیدہ انداز اسی طرح باقی تھا۔

"میں اس ابتدائی زمانے سے بھی پہلے کا آدمی ہوں۔ اس زمانے کا جس کے بارے میں افلاطون نے لکھا ہے۔ اس زمانے میں انسان عورت اور مرد میں تقسیم نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں کا مشترکہ روپ تھا۔ اس کے دو سر' چار ہاتھ اور چار ٹانگیں تھیں۔ وہ بہت طاقتور تھا۔ اتنا کہ اس وقت کے خدا سے باغی ہونے لگا۔ خدا نے سزا دینے اور اپنا تابع رکھنے کے لئے اسے مرد اور عورت کے الگ الگ حصے میں کاٹ کر کمزور کر دیا۔ مرد اور عورت کی جب سے یہ تقسیم ہوئی ہے وہ مکمل ہونے کے لئے ایک دوسرے سے جڑنے کو بے تاب رہتے ہیں۔ مجھ میں شاید اسی بے تابی کا عمل تیز ہے' جب اور جہاں یہ موقع ملتا ہے جڑ بیٹھتا ہوں۔" ظہور کو اب اس گفتگو میں مزا

آنے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کویت میں اس کی کہانی اب ختم ہو چکی ہے۔ اس نے ایک اور سگریٹ سلگائی اور سفیر کو خاموش دیکھ کر اپنا بیان پھر شروع کر دیا۔

"لیکن آسمانی کتابوں میں جن پر آپ کو بھی یقین ہے جو کچھ لکھا ہے وہ اس یونانی کہانی سے مختلف ہے۔ حوا کو آدم کی پسلی سے نکال کر پیدا کیا گیا تھا۔ وہ مرد کے پہلو سے نکلی تھی اس لئے اسے مرد کے پہلو میں ہی قرار آتا ہے۔ مرد بھی اپنی کھوئی ہوئی پسلی سینے سے لگانے کو بے تاب رہتا ہے۔ میری یہ بے تابی بھی قدرتی ہے۔ میں بھی ایسی پسلی کی تلاش میں ہوں جو میری کھوئی ہوئی پسلی کی جگہ ٹھیک آ جائے۔ میری بدنصیبی ہے کہ مجھے ابھی تک صحیح سائز کی پسلی نہیں مل سکی۔ میں جس کے ساتھ سو سکتا ہوں وہ میری پسلی کے سائز کی نہیں ہوتی' جو میری پسند کے معیار کی ہوتی ہے اس کے ساتھ میں رہ نہیں سکتا۔ دعا کیجئے میری یہ بدنصیبی دور ہو جائے۔ میں پھر سے باکردار ہو جاؤں۔"

"تم واقعی بدنصیب ہو' تمہاری یہ بدنصیبی کبھی دور نہیں ہو گی۔" سفیر نے ظہور کے خاموش ہوتے ہی بولنا شروع کیا۔ "تم کو پتہ ہے آسمانی کتابیں کس زبان میں نازل ہوئی تھیں۔" سفیر نے ظہور سے پوچھا لیکن پھر اس کے بولنے سے پہلے خود ہی جواب دے دیا۔ "یہودیوں کی زبان میں۔ قدیم ہبرو میں پسلی کو تسلیا (Tsela) کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے۔ "بدنصیبی" تم جس کی تلاش میں جڑنے کے لئے بے تاب ہو اور جسے تم اپنی فتح کا پھل سمجھتے ہو وہ صرف تمہاری بدنصیبی ہے۔ تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔ تمہاری یہ بدکرداری تمہارے خون میں بسے ہوئے کسی فطری عمل کا نتیجہ ہے۔ تم نے پولینڈ کے اس بادشاہ کی کہانی شاید کہیں پڑھی ہو جس کے سالاروں کی بیویاں برسوں کی جدائی برداشت نہ کرتے ہوئے ان سے بے وفائی کرنے لگی تھیں نتیجے میں اس کے سپاہیوں کی بے شمار بیویاں حاملہ اور بہت سی ناجائز بچوں کی مائیں بن گئیں۔ محاذ جنگ سے واپس آ کر اس نے انہیں ایسی سزا دینے کا فیصلہ کیا کہ وہ بدکرداری ہمیشہ کے لئے بھول جائیں۔ ناجائز طور پر پیدا ہونے والے تمام بچوں کو ان کی ماؤں سے چھین کر جنگل میں ان کی قسمت کے حوالے کر دیا جہاں جنگلی جانوروں

نے ان کی تکہ بوٹی کر دی۔ بیوفائی کرنے والی بیویوں کی گود میں کتوں کے بچے دے دیئے گئے' انہیں گھر سے باہر نکلتے ہوئے کتے کا بچہ ہر وقت اپنی گود میں رکھنا پڑتا۔ ان کی گود سے چمٹے ہوئے کتے ان کی بدکرداری کا اشتہار بن گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ شاہ بولسلا نے جنگل میں جو بچے پھینکے تھے ان میں کوئی زندہ بچ کر نکل گیا تھا۔ تم شاید اپنی یہی وراثت دہراتے پھر رہے ہو۔ میں اگر شاہ بولسلا ہوتا تو تمہیں دوبارہ اس جنگل کے درندوں کے حوالے کر دیتا۔" سفیر اسے منہ پر حرامی کی اولاد قرار دے رہا تھا۔ ظہور نے بہت سخت جواب دینے کے لئے پینترا بدلا ہی تھا کہ میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سفیر کسی سے تھوڑی دیر پشتو میں گفتگو کرتا رہا اور فون رکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ظہور بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ سفیر نے اسے خاموش کر دیا۔

"اس گفتگو کے لئے میرے پاس اب مزید وقت نہیں ہے۔ میں تمہیں شاید اگلے جہاز سے پاکستان واپس بھیج دیتا۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ میں تمہیں ناپسند کرتا ہوں اس لئے سمجھا جائے گا میں نے تمہارے خلاف تعصب برتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی اس پوسٹنگ سے استعفیٰ دے کر اپنی نوکری کے اس بلیک ہول میں واپس چلے جاؤ جہاں سے نکل کر یہاں آئے تھے۔ اس صورت میں تمہاری اصلی نوکری بچی رہے گی۔ دوسری صورت میں تمہارے خلاف ملنے والی تمہاری پہلی بیوی اور آج ملنے والی جاوید کی شکایت کی بنیاد پر مجھے کارروائی کرنی پڑے گی۔ ایسا ہوا تو شاید تمہاری نوکری نہ بچ سکے۔ فیصلہ کرنے کے لئے تمہارے پاس صرف ایک ہفتہ ہے۔ پاکستان سے کوئی سفارش منگوانے کی کوشش کی تو اسی روز تمہیں روانہ کر دوں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔ مجھے کہیں لنچ پر جانا ہے۔" سفیر نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ ظہور کی اختتامی تقریر ابھی باقی تھی۔ اسی وقت سفیر کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی وہ اپنی گود میں کتا لئے ہوئے تھی۔ ظہور کو اب اختتامی تقریر کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے کتا گود میں لئے آتی سفیر کی بیوی کو دیکھا اور پھر سفیر کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ سفیر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا سفیر کی بیوی ظہور کو دیکھتے ہی بول پڑی۔

"آپ بہت وعدہ خلاف ہیں۔ "ڈاگ آف دی ویک" کے کالم میں آپ نے اب تک میرے کتے کی تصویر نہیں چھپوائی۔"

"اس کالم میں اب سفیر صاحب کی تصویر چھپے گی۔" ظہور نے سفیر کے کمرے سے نکلتے ہوئے اسے دیکھے بغیر کہا۔ سفیر کی بیوی اس کی خوش مذاقی پر بہت محظوظ ہوئی تھی۔

"ڈارلنگ تمہارے اس افسر کا سینس آف ہیومر بہت اچھا ہے۔" ظہور سفیر کا جواب نہیں سن سکا تھا۔ وہ سیٹی بجاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ سفیر نے اسے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن آخر میں اس نے بھی بدلہ لے لیا تھا۔ اس نے سوچا روز کی جھک جھک سے تو نجات ملی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ابھی پیک کرنا شروع کر دے گا اور استعفیٰ دے کر ایک ہفتے میں پاکستان واپس چلا جائے گا۔

اس کے دفتر میں ہر طرف کاغذوں کا انبار لگا تھا۔ وہ تمام دن کام کے کاغذ الگ کر کے باقی کاغذات پھاڑتا اور پھینکتا رہا۔ دوپہر کو اس کا ڈرائیور زرقا سے اس کا لنچ لے آیا تھا۔ وہ شام میں دفتر سے اٹھنے ہی والا تھا کہ فرسٹ سیکریٹری کمرے میں داخل ہوا اور اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند کرتا ہوا ظہور کے سامنے بیٹھ گیا۔ ظہور نے ذرا حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ فرسٹ سیکریٹری پہلی بار اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ ہمیشہ بلایا کرتا تھا۔

"تم نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" فدا خان نے اس کے گرد کاغذوں کے پھٹے ہوئے ڈھیر کو دیکھ کر پوچھا۔

"تو آپ کو سفیر صاحب نے بتا دیا۔"

"نہیں سفیر اپنے فیصلوں میں کسی کو شامل نہیں کرتا۔ فیصلے لکھنے کے بعد فائل آگے بڑھاتا ہے۔ لیکن تمہاری "ڈاگ آف دی ویک" والی چوٹ زبردست تھی۔" خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ظہور نے سنا تھا کہ فدا خان سفیر سے خوش نہیں ہے۔

"لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا۔" ظہور نے حیرت ظاہر کی۔

"میں اس سفارتخانے کی آنکھ اور کان ہوں۔ مجھے سب پتہ ہوتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔" ظہور کو یاد آیا کہ کسی نے اسے بتایا تھا کہ فدا خان انٹیلی جنس کی پوسٹنگ پر ہے۔

"تمہارے خلاف کیس بہت مضبوط ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہارے پاس استعفیٰ دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ لیکن تم رکنا چاہتے ہو۔" فرسٹ سیکریٹری کے اس سوال پر سخت حیرت ہوئی۔

"لیکن کیسے؟"

"تم ابھی استعفیٰ نہیں دو۔ سفیر پرسوں تین چار روز کے لئے دوبئی جا رہا ہے۔ اس کے جاتے ہی میں ہنگامی ضرورت کی بنیاد پر تمہاری چھٹی کی درخواست منظور کر دوں گا۔ تم ایک مہینے کے لئے پاکستان جا کر بیٹھ جانا۔ سفیر نے تمہارے معاملے سے مجھے بے خبر رکھا ہے اس لئے میرے پاس تمہیں روکنے کا جواز نہیں ہے۔ اس نے تمہارے خلاف کوئی کارروائی بھی کی تو فائلیں میرے پاس آئیں گی۔ میں انہیں دبا دوں گا۔"

"لیکن کب تک' ایک مہینے بعد کیا ہو گا۔"

"دو ہفتوں تک سفیر کا یہاں سے تبادلہ ہو جائے گا۔" ظہور یہ سن کر اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"سفیر چلا جائے تو تم اپنی چھٹی سے واپس آ جانا۔ اپنی بیوی پر زور دے کر اس سے شکایت واپس منگوا لینا جاوید کو میں ٹھیک کر لوں گا۔" خان نے معاملات سدھارنے کا پورا منصوبہ بنا لیا تھا۔

"لیکن یہ اچانک تبادلہ کیسے۔ ابھی تو اس کی ٹرم ختم ہونے میں دو سال باقی ہیں۔" ظہور کی حیرت دور نہیں ہوئی تھی۔

"وہ اپنی بیوی کی وجہ سے سیکورٹی رسک بن گیا ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ تم آم کھاؤ۔ پیڑ مت گنو۔"

"لیکن اس کے بدلے مجھے کیا کرنا ہو گا۔" ظہور جانتا تھا کہ کچھ لو کچھ دو کی

دنیا میں رہنے والا فدا خان اس کی محبت میں یہ سب کچھ کرنے پر تیار نہیں ہوا ہو گا۔ فدا خان تھوڑی دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک کاغذ جیب سے نکال کر ظہور کی طرف بڑھا دیا۔

"تمہارے پاکستان میں اخبار والوں سے اچھے تعلقات ہیں۔ یہ خبر کسی انگریزی اخبار میں ایسے دوست کو بھیج دو جو اس کا ذریعہ نہ بتائے۔ مجھے معلوم ہے یہ چھپے گی نہیں۔ لیکن اس کا کسی باوثوق ذریعے سے اخبار تک پہنچنا ضروری ہے۔" یہ تو ظہور کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ کویت میں ایک انگریزی اخبار کا نمائندہ اس کا دوست تھا وہ اس کے ذریعے بھیج سکتا تھا۔ لیکن فدا خان شاید اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔

"کوئی مقامی ذریعہ استعمال نہ کرنا۔ بات لیک ہو جائے گی۔ سفارتخانے کا فون اور فیکس بھی استعمال مت کرنا۔ تم مرغاب جاتے ہو وہاں پوسٹ آفس سے فون کرنا اور وہیں سے فیکس بھی کرنا۔ یہ کہنا بے کار ہے کہ تم نے اگر کسی سے اس گفتگو کا تذکرہ کیا تو تمہیں سفیر بھی نہیں بچا سکے گا۔" فدا خان یہ کہہ کر چلا گیا۔ ظہور نے دل میں ہرا کا نعرہ لگایا۔ اس کی قسمت نے پلٹا کھایا تھا۔ لیکن یہ سوچتے وقت وہ بھول گیا تھا کہ قسمتیں اتنی تیزی سے بہت کم بدلتی ہیں۔

ظہور نے خبر اسی شام پاکستان پہنچوا دی تھی۔ خبر کیا تھی سفیر کے خلاف پورا وہائٹ پیپر تھا۔ لیکن فدا خان کا خیال صحیح تھا خبر چھپ نہیں سکتی تھی۔ خبر کلیرنس کے لئے فارن آفس بھیجی گئی تھی جنہوں نے اسے شائع نہ کرنے کی درخواست کی تھی۔ حساس معاملوں میں اخبارات حکومت کی درخواست ماننے پر مجبور ہوتے تھے۔ سفیر دوبئی چلا گیا تھا اور ظہور نے اس کے آنے سے پہلے چھٹی پر جانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ چھٹی پر جانے سے ایک روز پہلے وہ برطانوی سفارتخانے میں اپنے دوست مائک کی دعوت سے گھر واپس جا رہا تھا۔ وہ سالمیہ کے فیشن ایبل علاقے کی ایک اونچی عمارت میں رہتا تھا۔ اس کے گھر جانے والی سڑک ساحل سمندر کے پاس سے ہو کر گزرتی تھی۔ ظہور کو ہلکا سا نشہ تھا اور سمندر سے آنے والی ہوا سرور بھی دے رہی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے اچانک ہی گاڑی روک لی۔ ایک عورت نے گاڑی روکنے

کا اشارہ دیا تھا۔ گاڑی رکتے ہی عورت نزدیک آ گئی۔ اس کے پاؤں ننگے اور ساڑی پھٹی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے اور بڑی بڑی کالی آنکھیں ویران تھیں جن میں خوف بسا ہوا تھا۔ وہ سری لنکا کی ان خادماؤں میں سے لگ رہی تھی جو ہزاروں کی تعداد میں اور تقریباً" ہر دوسرے گھر میں خدمت گاری کے کام پر مامور تھیں۔ وہ گھر کی صفائیاں کرتیں، گاڑیاں دھوتیں، کھانا پکاتیں، بچوں کی دیکھ بھال کرتیں پھر اکثر اپنے مالک کی ہوس کا نشانہ بن کر مالکہ کی جوتیاں کھاتی تھیں۔ ان پر ہونے والے مظالم کی کہانیاں عام تھیں۔ ظہور کو سری لنکا کے سفارتخانے کے کسی افسر نے بتایا تھا کہ ظلم سے بچنے کے لئے پناہ لینے آنے والی خادماؤں کا ایک ہجوم ہر وقت سفارتخانے میں جمع رہتا ہے۔

عورت شاید تامل زبان میں بات کر رہی تھی جس سے ظہور اور اس کا ڈرائیور دونوں نابلد تھے۔ لیکن یہ واضح تھا کہ عورت مصیبت زدہ ہے۔ ظہور نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ اسے گاڑی میں بٹھا کر لے چلے۔ اس کی بلڈنگ کا چوکیدار سری لنکا کا تھا۔ اس نے سوچا لڑکی کی مصیبت کی کہانی وہی ترجمہ کر کے سنا سکے گا۔ لیکن چوکیدار عمارت میں نہیں تھا۔ اس کے کمرے پر تالا لگا تھا۔ ظہور لڑکی کو اوپر اپنے فلیٹ میں لے آیا اور ڈرائیور چوکیدار کو ڈھونڈنے چلا گیا۔ ظہور کے ریفریجریٹر میں کھانا بھرا ہوا تھا۔ لڑکی اس طرح کھانے پر ٹوٹی تھی جیسے کئی دن کی بھوکی ہو۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی میں پہلی بار ظہور نے اطمینان کا سایہ تیرتے دیکھا تھا۔ وہ کچھ عجیب سی نظروں سے ظہور کو دیکھنے لگی تھی۔ ظہور کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اسی وقت ڈرائیور بلڈنگ کے چوکیدار کو لے کر آ گیا۔ چوکیدار کے ذریعے لڑکی کی کہانی سن کر سب بے حد متاثر تھے۔ وہ ایک ہفتہ پہلے ہی سری لنکا سے خادمہ کے ویزے پر آئی تھی۔ جس کی اسپانسر شپ پر آئی تھی اس نے اچھا سلوک نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے وہ گھر سے نکل بھاگی۔ اسے نہ زبان آتی تھی نہ رستے۔ سڑک کے کنارے کھڑا دیکھ کر ایک گاڑی نے اسے لفٹ دینے کی پیشکش کی اور کہا کہ وہ اسے سری لنکا کے سفارتخانے چھوڑ آئیں گے۔ لیکن گاڑی میں سوار تین افراد ایک ویرانے میں لے جا کر باری

باری اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہے اور بعد میں ساحل کے کنارے ایک ویران مقام پر گاڑی سے دھکا دے کر بھاگ گئے۔ وہ میلوں پیدل چلتی ہوئی اس مقام تک آئی تھی جہاں ظہور نے اسے پایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے آج کی رات پناہ دے کر صبح سری لنکا کے سفارتخانے پہنچا دیا جائے۔ ظہور تیار ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ رات کو اس کے فلیٹ میں رہ سکتی ہے۔ ڈرائیور سے اس نے کہا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی اسے آکر سری لنکا کے سفارتخانے لے جا کر چھوڑ آئے۔

ڈرائیور اور چوکیدار کے جانے کے بعد ظہور نے لڑکی سے کہا تھا کہ وہ باہر صوفے پر سو جائے اور خود بیڈ روم میں کپڑے بدل کر سونے لیٹ گیا۔ لیکن آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ سائڈ لیمپ جلا کر ایک بار پھر اس نے زر گزشت پڑھنا شروع کر دی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک بری کتاب پڑھنے سے بہتر ہے کہ ایک اچھی تحریر دوبارہ پڑھی جائے۔ لیکن اردو میں اچھی کتابیں آج کل نایاب ہو گئی تھیں اس لئے وہ مشتاق یوسفی کی اس کتاب کو چوتھی بار پڑھ رہا تھا۔ کتاب میں وہ اس طرح جذب ہو گیا تھا کہ اسے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر میں اسے ایک سایہ سا لہراتا ہوا محسوس ہوا تو اس نے کتاب سے نظریں ہٹا کر دیکھا۔ جانے کس وقت وہ لڑکی آکر بستر کے کنارے کھڑی ہو گئی تھی۔ ظہور نے اشارے سے پوچھا کہ کیا چاہئے وہ کچھ بولی نہیں بلکہ بستر کے کنارے پر اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر پاؤں دبانے لگی۔ ظہور نے ایک دم اپنے پیر کھینچ لئے۔

"بیوقوف لڑکی کیا کر رہی ہے۔ جا کر سو جا اور مجھے بھی سونے دے۔" لیکن زبان یار من ترکی والا مسئلہ پیش تھا۔ لڑکی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ معافی مانگنے کے انداز میں جوڑ لئے۔ اس کی آنکھوں میں ظہور کو کئی کیفیتیں مدغم نظر آئیں خوف، بیچارگی، افسوس، التجا، ظہور سمجھ گیا کہ یہ اس کے شکریہ ادا کرنے کا انداز ہے۔ وہ مصیبت کے صحرا میں بھٹکتی رہی تھی، تھوڑی دیر کے لئے سائے تلے آئی تھی تو شکر گزاری کا فریضہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ظہور اپنے آپ سے ڈرتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہیں اس کا شیطان نہ جاگ جائے۔ بہت دنوں سے وہ

عورت کو ترسا ہوا تھا۔ لیکن ایک مصیبت زدہ مجبور عورت کے ساتھ برائی کا خیال بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ یہ لڑکی تو صرف ترس اور رحم کھانے کے لئے تھی۔

لڑکی اسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ ظہور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح اسے سمجھائے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ایک بار پھر جانے کے لئے کہا لیکن لڑکی نہیں کے انداز میں آہستہ آہستہ اپنا سر ہلا رہی تھی۔ ظہور کی ٹانگیں خود بخود پھیل گئیں۔ وہ دوبارہ بستر پر بیٹھ کر ظہور کے پاؤں دبانے لگی۔ ظہور نے سوچا پاؤں دبوانا کوئی بری بات نہیں ہے۔ لڑکی اس طرح اس کا احسان اتارنا چاہتی ہے تو یہی سہی۔ ویسے پاؤں دبوانا اسے مزا بھی دے رہا تھا۔ اس نے سائڈ لیمپ بجھا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اسی طرح آہستہ آہستہ اس کے پاؤں دباتی رہی۔ کچھ ہی دیر میں ظہور کو نیند آ گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے خوابیدہ حالت میں لذت کا احساس ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو لڑکی کا ننگا بدن اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ ظہور کے سلیپنگ سوٹ کی قمیض کے بٹن کھول کر اب آہستہ آہستہ پاجامے کو نیچے سرکا رہی تھی۔ ظہور تھوڑی دیر کے لئے سکتے کی سی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ ہوش اس وقت آیا جب لڑکی اس کے نچلے دھڑ کو کپڑوں سے آزاد کرا کے اس سے بری طرح لپٹ گئی۔ لیکن اب دیر ہو گئی تھی۔ اسی وقت باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور چار پانچ آدمی دھڑ دھڑ کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک نے سوئچ آن کر کے کمرے کی بجلی کھول دی تھی۔ چار کویتی تھے جن کے پیچھے عمارت کا چوکیدار تھا۔ دروازہ اسی نے کھولا ہو گا۔ اس کے پاس ہر فلیٹ کی ڈپلیکیٹ چابی تھی۔ ظہور لڑکی کو اچھال کر بستر سے اتر آیا تھا اور اپنا پاجامہ دوبارہ پہننے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی بھی زمین سے پھٹی ہوئی ساری اور بلاؤز کو اٹھا کر اپنا جسم ڈھانپنے لگی۔

"یہ سب کچھ ایسا نہیں ہے جیسا آپ کو نظر آ رہا ہے۔ یہ لڑکی......" ظہور نے جو ابتدائی صدمے سے سنبھل چکا تھا کہنا شروع کیا۔ لیکن کمرے میں داخل ہونے والوں میں سے ایک نے جو سب سے آگے آگے تھا' اس کی بات کاٹ دی۔

"ہم اندھے نہیں ہیں۔ ہمیں سب کچھ نظر آ رہا ہے۔ آپ کپڑے تبدیل کر لیں، آپ کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہے۔" ظہور اس شخص کو اچھی طرح پہچان گیا۔ یہ جاوید کا وہی پولیس افسر دوست تھا جس سے اس کی جاوید کے گھر دعوت میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے حواس آہستہ آہستہ واپس آ گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے پھانسنے کی سازش کی گئی ہے۔

"آپ کو معلوم ہے میں ڈپلومیٹ ہوں مجھ سے آپ صرف وزارت خارجہ کے توسط سے بات کر سکتے ہیں۔ میں اپنے سفیر کو فون کر کے آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔" ظہور نے اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"آپ کے سفیر کو ہم خود فون کریں گے۔ وزارت خارجہ کو بھی ہم فون کر کے اطلاع دے دیں گے، لیکن یہ سارے کام تھانے جا کر ہوں گے۔ ڈپلومیٹ کو قانون توڑنے کا کھلا لائسنس نہیں ملا ہوتا۔ یہ غلط جگہ پارکنگ کرنے کا معاملہ نہیں ہے۔ آپ زنا کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں جس کی سزا موت ہے اور جس سے سفارتکار بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ایک ایسی لڑکی آپ کے فلیٹ میں پائی گئی ہے جو کسی اور کی کفالت میں تھی۔ آپ پر اغوا کا بھی کیس بنے گا۔ میرے تین افسر اور عمارت کا چوکیدار گواہ ہے جنہوں نے آپ کو اور لڑکی کو ایک ہی بستر پر ایک دوسرے کے ساتھ ننگی حالت میں دیکھا ہے۔ آپ ایک مجبور لڑکی کی عزت کے ساتھ کھیلے ہیں۔ مجھے یقین ہے لڑکی بھی اس کی گواہی دے دے گی۔ آپ کے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔ آپ کپڑے تبدیل کر لیں ورنہ ہم آپ کو اسی حالت میں لے چلیں گے۔ اس لباس میں آپ کی تصویر اخباروں میں چھپی تو آپ کے لئے اچھا نہیں ہو گا۔" پولیس افسر نے بڑے سرد لیکن سخت لہجے میں کہا۔

"دیکھئے آپ اس چوکیدار سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں نے لڑکی کو مصیبت زدہ سمجھ کر خود اس کی درخواست پر پناہ دی تھی۔ میرے ڈرائیور کو بلوا لیجئے، وہ بھی آپ کو گواہی دے گا، اس نے گاڑی روک کر اس لڑکی کو ساتھ لیا تھا۔ آپ خود لڑکی سے پوچھ لیجئے۔ پلیز مجھے سفارتخانے فون کرنے دیجئے وہ آپ کو میری ضمانت دیں گے۔"

ظہور گھگیانے لگا۔ وہ تھانے جانے اور اخباروں میں خبریں اور تصویریں چھپنے کے خیال سے ہی کانپ گیا تھا۔

"چوکیدار سے ہم بیان لے چکے ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ آپ نے لڑکی کو رات میں آپ کے پاس چھوڑنے کے لئے کہا تھا۔ آپ کا ڈرائیور بھی نیچے موجود ہے۔ اس کا بیان بھی یہی ہے کہ آپ نے کہا تھا کہ رات بھر لڑکی آپ کے پاس رہے گی وہ دوسری صبح آ کر اسے لے جائے۔ نیچے چوکیدار کے کمرے میں بیٹھے ہوئے میرے آدمی یہ بیان لکھ رہے ہیں۔ باقی بیان بھی وہ لکھ لیں گے۔ آپ کا بیان تھانے جا کر ہو گا۔ لڑکی کا بیان ہم اسے اس کے کفیل کے حوالے کرنے کے بعد اس کی موجودگی میں لیں گے۔" ظہور کچھ بولنا چاہتا تھا، لیکن پولیس افسر اپنے آدمیوں کی طرف مڑ گیا اور چوکیدار کو ہدایت دینے لگا۔

"اس لڑکی سے کہو کپڑے پہن کر نیچے چلی جائے اور اپنے کفیل کے آنے کا انتظار کرے۔" اس کے بعد اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ وہ ظہور کو لے چلیں۔ لیکن پولیس والوں کے اپنی طرف بڑھنے سے پہلے ظہور نے انہیں ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا بحث بیکار ہے۔ سارا منصوبہ بہت سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہے۔ پولیس والے اسے تھانے لے جائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ وہ اپنے کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ چوکیدار لڑکی کو لے کر پہلے ہی نیچے چلا گیا تھا۔

پولیس ظہور کو لے کر تھانے چلی گئی۔ چوکیدار کے کمرے میں جاوید بیٹھا چوکیدار، ظہور کے ڈرائیور اور لڑکی کو ان کے حصے کے سو سو دینار تقسیم کر رہا تھا۔ لڑکی کی کہانی غلط نہیں تھی۔ اس کے ساتھ سب کچھ اسی طرح ہوا تھا جس طرح اس نے بیان کیا تھا۔ صرف فرق یہ تھا کہ ویران سڑک پر کھڑی ہوئی لڑکی کو گشتی پولیس پکڑ کر جاوید کے پولیس افسر دوست کے پاس لائی تھی جو اس دن ڈیوٹی پر تھا۔ جاوید اس کے پاس بیٹھا ظہور کے خلاف اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔ ظہور اس پولیس افسر کو بھی پسند نہیں آیا تھا۔ جاوید کے گھر کی دعوت میں ظہور نے اسے وہ عزت نہیں دی تھی جو اس کا حق تھی۔ پھر اس نے اس عورت سے تعلقات بڑھائے تھے جس پر اس

کی اپنی نظر تھی۔ اس نے لڑکی کو استعمال کر کے ظہور کو پکڑوانے کا منصوبہ تیار کیا۔ چوکیدار اور ڈرائیور سے پولیس افسر نے خود بات کی تھی۔ دونوں کی مجال نہیں تھی کہ وہ کویت میں وہاں کی پولیس کے ایک افسر کے کہنے کے خلاف کچھ کرتے۔ لڑکی کو بھی دھمکیاں دے کر تیار کیا گیا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ نہیں مانی تو اسے اس کے کفیل کے حوالے کر دیا جائے گا یا اس کے پاس کاغذات نہ ہونے کے جرم میں جیل بھیج دیا جائے گا۔ اس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر اس نے اپنے حصے کا کردار ٹھیک طرح سے ادا کیا تو پولیس افسر خود اپنی کفالت میں خادمہ کا ویزا نکلوا دے گا۔ جاوید نے تینوں کو ایک ایک سو دینار کا بونس دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ ظہور کو گھر لے جاتے وقت ڈرائیور کو پتہ تھا کہ لڑکی کہاں کھڑی ہو گی اور چوکیدار کو بھی معلوم تھا کہ اس نے اسی وقت تک غائب رہنا ہے جب تک لڑکی اوپر ظہور کے کمرے میں نہیں چلی جاتی۔

ظہور کو صبح سے پہلے نہیں چھڑایا جا سکا تھا۔ کویتی وزارت خارجہ کا ایک افسر خود اسے تھانے سے لے کر سفارتخانے پہنچا کر گیا تھا' ساتھ ہی ۴۸ گھنٹے میں کویت چھوڑنے کا حکم بھی اس کے حوالے کیا تھا۔ ظہور کو خوشی تھی کہ سفیر دوبئ گیا ہوا تھا۔ وہ ہوتا تو اسے کچھ دن تھانے میں سزا کاٹنے دیتا۔ اسے یقین تھا کہ فدا خان نے خبر ملتے ہی اپنے تعلقات استعمال کر کے اسے چھڑایا ہو گا۔ سفارتخانے پہنچ کر ظہور اپنا چہرہ چھپاتا ہوا سیدھا اوپر فدا خان کے دفتر پہنچا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے پی اے نے اسے حیرت زدہ کر دیا۔

"فدا صاحب دفتر نہیں آئے۔ وہ آج شام کی فلائٹ سے پاکستان جا رہے ہیں۔ ان کا کابل تبادلہ ہو گیا ہے۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر رپورٹ کرنے کی ہدایت ہے۔"

"لیکن پھر مجھے کس نے......" ظہور نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

"آپ کو سفیر صاحب نے رہا کرایا ہے۔ براہ راست وزیر خارجہ کو فون کر کے بات کی تھی۔ میں نے خود فون ملا کر دیا تھا۔ ان کا پی اے اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ آپ کے لئے ہدایت ہے کہ سفارتخانے پہنچتے ہی انہیں اطلاع دیں۔" ظہور یہ

سن کر آہستہ آہستہ سفیر کے کمرے کی طرف چل دیا۔ ذلیل ہونے میں جو کچھ کمی رہ گئی تھی وہ اب پوری ہونا تھی۔ ظہور کو آدھے گھنٹے سفیر کے پی اے کے کمرے میں بیٹھنا پڑا۔ سفیر اندر کسی کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو سیکنڈ سیکریٹری باہر نکل کر آیا۔ فدا حسین کے جانے کے بعد اس کو فرسٹ سیکریٹری کا چارج ملا ہو گا۔ اس کی بغل میں فائلوں کا گٹھر تھا۔ وہ ظہور کو دیکھے بغیر فائلوں کو سنبھالتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ ظہور کمرے میں داخل ہوا تو سفیر کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا بہت مطمئن نظر آتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ظہور کو دیکھتا رہا لیکن اس کی آنکھوں میں طنز یا تمسخر نہیں ہمدردی تھی۔ ظہور کو اس نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ میٹنفل نہیں ہے۔ تازہ تمباکو سے خاص طور پر پرائم منسٹر ہاؤس کے لئے بنایا گیا ہے۔ پرسوں رات پرائم منسٹر نے مجھے ڈنر کے بعد کافی کے دوران دیا تھا۔" پیکٹ پر حکومت پاکستان کا مونو گرام اور ایک طرف پرائم منسٹر ہاؤس چھپا ہوا تھا۔ ظہور نے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ سگریٹ کے پیکٹ نے اسے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ سفیر کی پہنچ پرائم منسٹر تک تھی۔ اسے اپنے خلاف فدا خان کی سازش کا پتہ چل گیا ہو گا اور اس نے دوبئی کے بہانے پاکستان جا کر خود فدا خان کا پتہ کٹوا دیا۔

"میرے خلاف جاوید نے اپنے پولیس افسر دوست کے ساتھ مل کر سازش تیار کی تھی میرا ریکارڈ کتنا بھی خراب سہی' بدکاری کا یہ الزام بالکل غلط ہے۔" ظہور نے سفیر کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اپنی صفائی پیش کر دی۔

"مجھے معلوم ہے۔ اسی لئے میں نے آپ کو چھڑوایا بھی ہے۔ آپ کا ڈرائیور مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ایک ہی ڈانٹ پر اس نے سب کچھ اگل دیا تھا۔ لیکن آپ کے خلاف کیس بہت مضبوط بنایا گیا ہے۔ آپ کے ماضی کی بدکاریاں بھی آپ کے خلاف گواہی دے رہی ہیں۔ آپ کو پرسوں صبح تک کویت چھوڑنے کی شرط پر رہائی مل سکی ہے لیکن مجھے یقین ہے جاوید نے اپنے دوست سے مل کر اخباروں کو خبر ضرور بتائی ہو گی۔ آپ کو اپنی اور پاکستان کی عزت کا ذرا سا بھی خیال ہے تو اپنے

تعلقات استعمال کر کے خبر رکوانے کی کوشش کیجئے۔ یہاں خبر چھپی تو پاکستان میں بھی چھپے گی ایسا ہوا تو پاکستان میں آپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"
ظہور کچھ نہیں بولا۔ سفیر تھوڑی دیر اسے اسی طرح دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

"آپ کے بارے میں میرا یہ خیال غلط تھا کہ آپ ایک سمجھ دار انسان ہیں۔ میں آپ کو بلا کر سمجھاتا رہا، خبردار کرتا رہا، مہلت دیتا رہا، مجھے آپ کو واپس بھیجنا ہوتا تو پہلی شکایت پر بھیج دیتا۔ لیکن آپ فدا حسین کی باتوں میں آ کر میرے خلاف خبریں فیکس کرنے لگے۔" ظہور نے کچھ بولنا چاہا لیکن سفیر نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"آپ لوگوں کی حیثیت میرے لئے پیادوں کی طرح ہے میں جانتا ہوں کس کو کب آگے بڑھانا ہے اور کب پٹوانا ہے۔ مجھے آپ سے بہت سے کام لینے تھے۔ لیکن آپ کو کام کا آدمی بنانے کے لئے آپ کی بدکرداری کو حدود میں رکھنا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ مستقل دباؤ نہ رہے تو آپ جیسے لوگ بے قابو ہو جاتے ہیں لیکن آپ میرے اشاروں کو سمجھ نہیں سکے اور فدا خان کے ساتھ مل کر پورس کا ہاتھی بننے کی کوشش کرنے لگے۔ فدا خان سفیر بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ پیادہ ہے اور پیادہ رہے گا۔ انٹیلی جنس سے اپنے تعلق کی بنیاد پر خود کو بادشاہ گر سمجھنے لگا تھا۔ اس نے میرے خلاف بہت مضبوط کیس بنایا تھا۔ بھارتی سفارتخانے کا فرسٹ سیکریٹری برج میں میری بیوی کا پارٹنر ہے۔ اس نے رپورٹ بنا دی کہ اس طرح پاکستان کے راز بھارت کو پہنچ رہے ہیں۔ وہ جانتا تھا یہ الزام ایسا ہے کہ حکومت میں میرے جو تعلقات ہیں وہ مجھے نہیں بچا سکیں گے۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری بیوی وزیراعظم کے ساتھ آکسفورڈ میں پڑھ چکی ہے اور اب بھی وزیراعظم کو ان کے پہلے نام سے پکارتی ہے۔" سفیر نے سگریٹ کے سفید پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور دھواں بکھیرنے لگا۔ ایسا لگتا تھا وہ وزیراعظم سے ملاقات اور کابل میں فدا خان کی متوقع موت کا مزا لے رہا ہے۔ جلتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں رکھ کر وہ پھر ظہور سے مخاطب ہوا۔

"آپ کے انٹرٹین منٹ کے جتنے بل رکے ہوئے تھے وہ میں نے منظور کر

دیئے ہیں۔ آپ کی اگلی پچھلی تنخواہ کا حساب بھی کروا دیا ہے۔ پرسوں صبح کی فلائٹ کے لئے ٹکٹ منگوا دیا گیا ہے' میرے پی اے سے لے لیجئے گا۔ امید ہے آپ اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کریں گے اور زندگی کے تانے بانے نئے سرے سے بننے کی کوشش کریں گے۔" سفیر نے کھڑے ہو کر خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ بڑھایا۔ ظہور ہاتھ ملا کر اور صرف شکریہ کہہ کر باہر نکل آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ سفیر کے بارے میں کیا رائے قائم کرے۔ اس نے ظہور کو اپنے رتبے اور عہدے سے نہیں خود ظہور کے میدان میں چت کیا تھا' اس کی علمیت کو کلین بولڈ کیا تھا۔ اسے کئی بار سامنے بٹھا کر ذلیل کیا تھا لیکن اسے کویتی جیل میں سڑنے سے بھی بچایا تھا اور اب اس کے بلوں کی ادائیگی کرا کے اسے مالی طور پر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ بیروزگاری کی صورت میں کئی مہینے آرام سے کاٹ سکتا تھا۔ لیکن ظہور کے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اسے اخبارات میں اپنی خبر رکوانی تھی۔ اس نے برطانوی سفارتخانے میں مائک کو فون کیا۔ مائک کو ساری کہانی معلوم تھی۔ سفارتکاروں کا اطلاعاتی نظام بہت تیز ہوتا ہے۔ مائک یہ بھی جانتا تھا کہ ظہور کو پھنسایا گیا ہے۔ وہ ظہور کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے ظہور کو اپنے دفتر بلا لیا۔ دونوں اخبارات کو فون کرتے رہے۔ ہر اخبار کے پاس خبر تھی۔ ظہور کو یقین تھا کہ مائک نہ ہوتا تو وہ خبر نہیں رکوا سکتا تھا۔ دوستیاں ظہور کی بھی تھیں لیکن وہ دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا۔ مائک کے بارے میں ظہور کو یقین تھا کہ اس کا تعلق برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی سے رہا ہو گا۔ ایک عربی اخبار کے ایڈیٹر نے خبر روکنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مائک نے کویتی حکومت میں اپنے کسی ایسے ذریعے سے اس ایڈیٹر کو فون کرایا کہ پھر وہ انکار نہ کر سکا۔ لیکن مائک نے ظہور کو ذریعہ بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انگریزی اخبار کے بارے میں جس کے ایڈیٹر علیم صاحب تھے ظہور نے کہا تھا کہ علیم صاحب خود ہی یہ خبر نہیں چھپنے دیں گے۔ پھر بھی احتیاطاً" اس نے علیم صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کئی بار فون کرنے پر بھی اسے ہر دفعہ ایک ہی جواب ملا تھا کہ علیم صاحب دفتر میں نہیں ہیں۔

دوسرے دن کسی اخبار میں خبر نہیں چھپی تھی۔ صرف اسی انگریزی اخبار میں چھپی تھی جس کے ایڈیٹر ظہور کے سب سے قریبی دوست علیم صاحب تھے۔ خبر کے ساتھ اگر تصویر نہ چھپی ہوتی تو ظہور علیم صاحب کو شک کا فائدہ دے سکتا تھا۔ لیکن یہ تصویر اس گروپ فوٹو سے نکالی گئی تھی جو علیم صاحب کی ذاتی البم میں ظہور ایک بار دیکھ چکا تھا۔ خبر اس جگہ چھپی تھی جہاں "ڈاگ آف دی ویک" کی تصویر چھپا کرتی تھی۔ علیم صاحب اس شام سفیر کے گھر بیٹھے اعلیٰ نسل کی شراب پی رہے تھے اور علیم صاحب کے گلاس میں بلیک لیبل کی بوتل سے وہسکی انڈیلتا ہوا پاکستانی سفیر مطمئن تھا کہ اس نے کتا کہنے والے ایک پیادے کی گستاخی کا حساب برابر کر دیا ہے۔ علیم صاحب اسکاچ کی چسکی لیتے ہوئے سفیر کو یہ لیکچر دے رہے تھے کہ دوستی پر صحافت کی اعلیٰ قدریں قربان نہیں کی جا سکتیں۔ سفیر جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پاکستان میں صحافت کی اعلیٰ قدریں صرف شراب کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتی ہیں۔ لیکن وہ یہ شام جلد نمٹا دینا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ علیم کسی بھی وقت غالب شروع کر سکتا ہے۔

ظہور کو معلوم تھا پورے کویت میں اس کے ڈنکے بج چکے ہوں گے۔ دوستوں کے لئے وہ اچھوت بن چکا ہو گا۔ وہ دن بھر گھر میں بند رہا۔ اس کا ٹکٹ اور چیک سفیر کے پی اے نے اسے گھر بھجوا دیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا سامان پیک کرتا رہا شام میں زرقا کا مالک ریسٹورنٹ سے چھٹی کر کے اور سنار اپنا کارخانہ بند کر کے اس کے گھر آ گئے تھے۔ ظہور کو خوشی ہوئی کہ دنیا سے دوستی بالکل ہی ناپید نہیں ہوئی تھی۔ اس نے وہ بریسلیٹ سنار کو واپس کیا جو اس نے نبیلہ کے لئے لیا تھا۔ کم از کم ایک قرضہ چڑھنے سے بچ گیا تھا یہ بریسلیٹ جب سے آیا تھا نحوست نے اس کا گھر دیکھ لیا تھا۔ اس نے سنار کو مشورہ دیا کہ وہ بھی اس بریسلیٹ کو اپنے پاس نہ رکھے اور کسی نالی میں پھینک دے۔ سنار ایک سیدھا سادھا اور بہت توہم پرست شخص تھا۔ وہ یہ بریسلیٹ گٹر میں پھینک بھی دیتا لیکن اچانک اسے یاد آیا کہ ایک بدلہ اسے بھی چکانا ہے۔ وہ ظہور سے تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ واپس آ کر جب اس نے ظہور کو بتایا کہ اس

نے بریسلیٹ کا کیا کیا ہے تو ظہور کے چہرے پر بھی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ہر وقت ہنسنے اور قہقہے لگانے والے ظہور کے چہرے پر گزشتہ دو دنوں میں یہ پہلی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

ایئرپورٹ پر زرقا کے مالک اور سنار کے علاوہ مائیک بھی چھوڑنے آیا تھا۔ مائیک نے انگریزی اخبار میں خبر چھپنے پر افسوس کیا تھا اور کہا تھا کہ علیم اس کے فون کرنے پر خبر چھاپنے کی ہمت نہیں کرتا۔ علیم صاحب سے اپنی دوستی پر بہت ناز کرنے والا ظہور شرمندہ ہونے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ مائیک نے ظہور کو اسلام آباد کے آسٹریلوی سفارتخانے میں کام کرنے والے اپنے ایک دوست کا پتہ بھی دیا تھا اور کہا تھا کہ کوئی بھی ضرورت پڑنے پر وہ اس کے پاس جا سکتا ہے۔ ظہور کو حیرت تھی کہ مائیک اتنے برے وقت میں اس کا کتنا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انگریز اس حد تک دوستی نباہنے کی روایت نہیں رکھتے۔ مائیک نے ظہور کو ہنستے ہوئے بتایا کہ وہ انگلش نہیں اسکاٹش ہے۔

جہاز میں بیٹھتے ہوئے ظہور نے سوچا کہ وہ کویت کو ایک برا خواب سمجھ کر بھول جائے گا۔ لیکن ایک بار پھر اس کا خیال غلط تھا۔ جہاز میں اس صبح کے پاکستان کے اخبار موجود تھے۔ کراچی سے چھپنے والے اس انگریزی اخبار میں جس کا کویت میں نمائندہ ظہور کا دوست تھا خبر موجود تھی۔ سب سے زیادہ چھپنے والے اردو کے اخبار کے صفحہ اول پر بھی ظہور کے بارے میں سنگل کالم خبر چھپی ہوئی تھی۔ وہ اپنی سیٹ میں بالکل گڑ گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے جہاز ناک کی سیدھ میں نیچے جا کر ابھی زمین سے ٹکرائے گا اور تباہ ہو جائے گا۔ اگر ہوائی جہاز میں کھڑکیاں کھل سکتیں تو وہ ابھی نیچے کود پڑتا۔ اسے لگ رہا تھا جہاز کا ہر مسافر صرف اسے ہی گھور رہا ہے۔ سیٹ پر اور دھنس کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کراچی ایئرپورٹ کے باہر سامان کے ساتھ کھڑے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جائے۔ منی اور بچوں کو شکل دکھانے کے لائق پہلے ہی نہیں رہا تھا۔ کئی دوست تھے جن کے پاس جا سکتا تھا، لیکن اب خبریں چھپنے کے بعد ان کے گھر والوں کا سامنا

کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ کس کس کو وضاحت پیش کرے گا۔ مسافروں کے لئے آپس میں لڑنے والے کئی ٹیکسی ڈرائیور اس کا سامان اور بازو کھینچنے کی کوشش کر کے اس کی جھڑکیاں کھا چکے تھے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ صدر کے ایک چھوٹے ہوٹل کے ایجنٹ کی گاڑی میں بیٹھا اور ہوٹل میں سامان رکھ کر عاصمہ کے گھر چل دیا۔ اس کا خیال تھا کہ عاصمہ کم از کم چند روز کے لئے اپنے پاس پناہ دینے پر تیار ہو جائے گی۔ لیکن عاصمہ کے گھر میں کوئی اور خاندان آباد تھا۔ انہوں نے بتایا کہ عاصمہ نے یہ مکان بیچ دیا ہے اور وہ عورتوں کے کسی ہوسٹل میں رہتی ہے۔ ہوسٹل جا کر عاصمہ سے ملنا بیکار تھا۔ وہ شاید ملتی بھی نہیں۔ بہت سوچ و بچار کے بعد وہ اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ بہت دیر تک دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ ہمت کر کے گھنٹی بجائی تو اس کی بیٹی نے دروازہ کھولا' لیکن کچھ کہے یا سلام کئے بغیر واپس جا کر کپڑے سیتی ہوئی اپنی ماں کے پاس بیٹھ کر معمول کے مطابق دوپٹے کا پلو تر پنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پہچانتی نہ ہو۔ بس اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ منی نے نظر اٹھا کر دیکھا تھا کہ کون آیا ہے اور پھر مشین چلانے لگی تھی۔ بیٹے نے اندر کمرے سے جھانک کر دیکھا اور پھر اپنا چہرہ کتابوں میں دھنسا دیا تھا۔ ماں دالان میں اپنے تخت پر مصلا بچھائے بیٹھی تھی۔ اس نے ظہور کو دیکھ کر فوراً" اسے نکل جانے کے لئے کہا۔ وہ گھر' بہو اور بچوں پر اس کا سایہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ظہور نے تخت کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر ماں کی جوتیاں سر پر رکھ لیں۔ دل ایک دم بھر آیا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے روتا رہا۔ لیکن ماں منہ موڑے بیٹھی رہی۔ اس کی تسبیح کے دانے تیزی سے گردش کرنے لگے تھے اور رعشہ زدہ سر بھی زور زور سے ہل رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا نکل کر اس کے چہرے کی جھریوں کو بھر رہا تھا۔ منی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ بس مشین کا پہیہ تیزی سے گھما رہی تھی' یہ دیکھے بغیر کہ سوئی سے دھاگہ کبھی کا نکل چکا ہے۔ بیٹی نے اندر کمرے میں اپنے پڑھاکو بھائی کے پاس جا کر کمرے کا دروازہ بھیڑ لیا تھا۔ ظہور جب اچھی طرح رو چکا تو اٹھ گیا۔

"تم لوگ ہو سکے تو مجھے معاف کرنے کی کوشش کرنا۔" اس نے ماں کے پاؤں

تھام کر کہا اور منی پر اور اس دروازے پر جس کے پیچھے اس کے بچے بند تھے ایک نظر ڈال کر تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ اسے لگا جیسے وہ بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا ہو۔ اس کے ذہن اور نظر کی دھند بالکل صاف ہو گئی تھی۔ آنسوؤں نے اس کے دل کی کالک دھو دی تھی۔ گھر کی دہلیز سے باہر نکلتے ہی اس نے سوچا کہ اس کی زندگی کا وہ دور اب ختم ہو گیا ہے جس میں وہ صرف اپنے لئے جی رہا تھا۔ اب اسے ان لوگوں کے لئے جینا ہے جو اس دہلیز کے اندر آباد ہیں۔ آنسوؤں سے بھرے ماں کے ہلتے ہوئے چہرے، خالی مشین پر تیزی سے چلتے ہوئے منی کے ہاتھ، اسے دیکھتے ہی سفید ہو جانے والی بیٹی کے چہرے اور پیلی روشنی میں کتابوں پر جھکی ہوئی بیٹے کی آنکھوں نے اسے زندگی کے نئے معنی سمجھا دیئے تھے۔ ظہور کو یہ بھی معلوم تھا کہ پاکستان کی زمین اس پر تنگ ہو چکی ہے۔ یہاں تو اسے پھر اپنے ہی لئے لڑنا پڑے گا۔ گھر والوں کے لئے وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ وہ ہوٹل سے اپنا سامان لے کر اسی وقت ایئر پورٹ اور وہاں سے پہلی فلائٹ لے کر اسلام آباد چلا گیا۔ اس کی جیب میں مائک کے آسٹریلوی دوست کا نام اور پتہ محفوظ تھا۔ اس کی مدد سے آسٹریلیا کا ویزا لگوا کر ایک ہفتے بعد وہ سڈنی جانے والے جہاز میں بیٹھ کر پرواز کر رہا تھا۔ سڈنی روانگی سے قبل اس نے کویت کے پاکستانی سفیر کے تبادلے کی خبر پڑھ لی تھی۔ اس نے سوچا شاید برسلیٹ نے کام دکھا دیا تھا۔ فدا خان نیا سفیر ہو کر کویت جا رہا تھا۔ پیادہ بساط کے دوسری طرف پہنچ کر وزیر بن گیا تھا۔

ظہور کا سنار دوست شروع شروع میں کویت اور پھر پاکستان میں اس کا واحد رابطہ تھا جو اسے اکثر خط لکھ کر حالات سے باخبر رکھتا۔ ظہور سے برسلیٹ لے کر اس نے سفیر کی بیوی کو تحفے کے طور پر دیا تھا۔ سفیر کی بیوی کو برسلیٹ بہت پسند آیا تھا اور خوش ہو کر اس نے اسی وقت پہن لیا تھا۔ تین روز بعد سفیر نے اپنی بیوی کو اس کے برج پارٹنر کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں پکڑ لیا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اس کی پٹھان غیرت اتنی پرجوش نہیں رہی تھی کہ وہ دونوں کو گولی مار دیتا لیکن اس

نے طلاق دے کر بیوی کو کتے سمیت پاکستان جانے والی فلائٹ میں بٹھا دیا تھا۔ سفیر کی طلاق شدہ بیوی کی وزیراعظم دوست کو سخت غصہ آیا تھا اور سفیر کو فوری طور پر واپس طلب کر کے سزا کے طور پر افسر بکار خاص بنا کر ڈیسک پر بٹھایا گیا تھا۔ سفیر کی بیوی نے سونے کا بریسلیٹ وزیراعظم کو تحفے میں دے دیا تھا۔ ظہور کو یہ بات معلوم ہوتی تو وزیراعظم کی حکومت ختم ہونے کے لمبے چوڑے تجزیئے کرنے کے بجائے صرف ایک وجہ بیان کرتا۔ بریسلیٹ!

آسٹریلیا آنے کے کئی سال بعد ظہور کو اپنے سنار دوست کا بہت زمانے بعد خط ملا۔ خط کے ساتھ اس نے اپنی شادی کا کارڈ بھی بھیجا تھا۔ جس کے ساتھ اس کی شادی ہو رہی تھی کارڈ میں اس کا نام عاصمہ لکھا تھا۔ ظہور نے کارڈ دیکھ کر ایک گہری سانس لی تھی۔ اسے یقین تھا یہ وہی عاصمہ ہو گی جو بڑی تیزی سے اس کی زندگی میں آئی تھی اور اسی تیزی سے نکل گئی تھی۔ ظہور کا یقین غلط نہیں تھا۔ عاصمہ نے تنہا زندگی گزارنے کا عزم کیا تھا لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے معاشرے میں اور اس جیسی نرم مزاج کی لڑکی کے لئے یہ آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے جب ظہور کے سنار دوست کی بہنیں عاصمہ کی بہن کے پاس رشتہ مانگنے گئیں تو عاصمہ نے ہاں کہنے میں دیر نہیں لگائی۔ صرف یہ شرط رکھی تھی کہ وہ کویت نہیں جائے گی۔ سنار بھی کویت میں اتنے عرصے رہنے کے بعد تنگ آ گیا تھا۔ اس نے کویت میں اپنا کاروبار بیچ کر پاکستان میں ایک فیکٹری خرید لی۔ عاصمہ کو شادی کے کچھ ہی عرصے بعد یقین ہو گیا تھا کہ اس کے شادی کے ستارے اتنے برے بھی نہیں تھے۔ منی اور اس کے دونوں بچے عاصمہ کی شادی کی ہر تقریب میں شریک ہوئے تھے۔

منی کے سینے کی مشین کا پہیہ اسی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے میٹرک میں دوسری پوزیشن لے کر اسکالر شپ حاصل کی تھی۔ شام میں وہ ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ بٹی نے انٹر کر کے پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور محلے کے ایک اسکول میں ٹیچر ہو گئی تھی۔ سلائی سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ تینوں مل کر زندگی کو اپنی منزل کی

طرف بڑے عزم کے ساتھ کھینچ رہے تھے۔ عاصمہ ان سے ملنے باقاعدگی سے آیا کرتی تھی۔ اس نے جب مکان بیچا تھا تو اپنے حصے کی رقم میں سے ایک لاکھ روپے لے کر منی کو دینے آئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کہہ کر دے۔ وہی پرانا جھوٹ بولا تھا کہ ظہور کے کچھ پیسے ان کے ذمہ نکلتے تھے وہ دینے آئی ہے۔ منی نے جب اسے بتایا کہ وہ جانتی ہے وہ کون ہے تو عاصمہ بہت دیر تک روتی اور گڑگڑاتی رہی کہ وہ یہ پیسے لے لے۔ منی نے پہلی بار اپنی مشین کا پہیہ بند کر کے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور اسے اپنے سینے سے لگا کر تسلی دی۔ وہ عاصمہ کا دکھ سمجھتی تھی۔ لیکن پیسے اس نے پھر بھی نہیں لئے اس نے بڑی نرمی سے عاصمہ کو سمجھایا تھا۔

"میرے بچے ابھی یتیم نہیں ہوئے ہیں تم پہلے جو پیسے دے گئی تھیں مجھ پر ابھی تک انہیں کا بوجھ ہے۔ پھر ہمیں ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہماری زندگی کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ کبھی ایسی ضرورت آئی جس کے لئے پیسے مانگنے پڑے تو میں خود تمہارے پاس آؤں گی۔"

عاصمہ جانتی تھی کہ منی کو کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو کبھی نہیں آئے گی۔ چند ہی مہینے میں ظہور نے آسٹریلیا سے باقاعدگی سے پیسے بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔ یہ پیسے اتنے ہوتے تھے کہ اس کے بیٹے کو اب ٹیوشن کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ سارا وقت اپنی پڑھائی پر صرف کر سکتا تھا۔ منی بھی اب صرف بیٹی کے جہیز کے کپڑے سینے کے لئے مشین چلاتی تھی۔ ظہور کی واقعی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ وہ جو کچھ کماتا تھا اپنا خرچ نکال کر سب گھر بھیج دیتا تھا۔ اس نے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر خود کو بالکل پادری بنا لیا تھا۔ صرف چھٹی کے دن شراب پیتا تھا۔ وہ بھی گھر میں بیٹھ کر۔ پرانی یادوں کو بھلا دینے کے لئے۔ لیکن یادوں کو جتنا بھلانا چاہتا وہ اتنی ہی سر پر چڑھ کر ناچتیں۔

سلیم ظہور کے خاموش ہونے کے بعد بھی سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ظہور سے نفرت کرے یا ہمدردی۔ ظہور نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن اس کا ہاتھ سلیم کے ہاتھ میں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں سلیم کو لگا کہ وہ گہری نیند سو گیا ہے۔ آپریشن سے پہلے اس نے بوجھ اتار کر دل کو بالکل ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔

11

سڈنی ۱۹۹۵ء

مارچ گزر گیا لیکن سلیم یونیورسٹی کی فیس جمع نہیں کرا سکا۔ بچت کے منصوبے صرف کاغذ پر ہی اچھے لگتے ہیں۔ گھر وہ باقاعدگی سے پیسے بھیجتا تھا۔ یہ سلسلہ ختم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے گھر والوں کو بھی شاید اس کے پیسوں کی عادت ہو گئی تھی۔ سڈنی میں گھر کے خرچ بھی اپنی جگہ تھے۔ ظہور آپریشن کے بعد سے ابھی تک کام پر نہیں جا سکتا تھا اور سلیم، چودہری انور اور اقبال نے طے کیا تھا کہ اس کے حصے کا رہنے کا خرچ وہ تینوں مل کر ادا کریں گے۔ یہ اضافی دباؤ نہ بھی ہوتا تب بھی سلیم فیس پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اسے صرف ایک سیشن کے لئے چھ ہزار ڈالر سے کچھ زائد رقم جمع کرانی تھی جبکہ وہ اب تک صرف ڈھائی ہزار ڈالر جمع کر سکا تھا۔ اس کی ضرورت زندگی اور موت کا ایسا مسئلہ تھی بھی نہیں کہ وہ کسی سے قربانی مانگ لیتا۔ سب کے

اپنے اپنے مسائل تھے۔ ہر شخص اپنی قبر کا عذاب سہ رہا تھا۔

سلیم کا داخلہ منظور ہو گیا تھا اور لیٹ فیس کے ساتھ پیسے جمع کرانے کی تاریخ بھی قریب آ گئی تھی۔ سلیم نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ سیشن چھوڑ کر اگلے سیشن میں داخلہ لے گا۔ اسے یقین تھا کہ جولائی اگست تک اس کے پاس اتنی بچت ہو جائے گی کہ وہ فیس جمع کرا سکے۔ مسئلہ صرف ویزے کا تھا مارچ میں اس کا ویزا ختم ہو گیا تھا اور لیٹ فیس کی تاریخ گزرنے کے بعد اس کے پاس رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا تھا۔ اگلے سیشن میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر کے اس نے ویزے میں چھ مہینے کی توسیع کی درخواست کے ساتھ اپنا پاسپورٹ یونیورسٹی میں جمع کرا دیا۔ ایک ہفتے بعد ہی اسے یونیورسٹی نے پاسپورٹ واپس کر دیا۔ امیگریشن نے اس کی درخواست منظور نہیں کی تھی۔ اس کا ویزا صرف ایک مہینے کے لئے بڑھا دیا گیا تھا۔ اس ایک مہینے میں یا تو داخلہ لے کر ویزے کے لئے نئے سرے سے درخواست دینی تھی یا واپس جانا تھا۔ اس کے پاس اپریل کے آخر تک کی مہلت تھی۔ جس روز یونیورسٹی سے یہ بری خبر ملی وہ گھر آ کر کسی کو کچھ بتا نہیں سکا۔ اس روز گھر میں ظہور کی صحت یابی کی دعوت تھی۔ آپریشن کے بعد ظہور کی خوش مذاقی اسی طرح قائم تھی لیکن ساتھ ہی وہ کچھ چڑچڑا بھی ہو گیا تھا۔ شاید ان دواؤں کا اثر تھا جو وہ ابھی تک کھا رہا تھا۔ وہ اقبال کے ایک دوست کو جو پہلی بار ان سے ملا تھا دیر سے برداشت کر رہا تھا۔ وہ ہر مسئلے پر بڑی یقینی رائے دینے اور بلا ضرورت اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ظہور اس وقت خاموش نہ رہ سکا جب دل کے آپریشن پر بات چل نکلی اور اقبال کے دوست نے بڑی سرسری انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے جناب بائی پاس اب کوئی خاص چیز نہیں رہا۔ ختنوں کی طرح آسان ہو گیا ہے۔"

"آپ کو اپنا ختنہ یاد ہے۔" ظہور نے پوچھا۔ اور سلیم نے سوچا کہ اب اس شخص کی خیر نہیں۔ وہ ظہور کے اس لہجے کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

"جی نہیں۔ میری چڑیا تو بہت بچپن میں اڑ گئی تھی۔" اس نے خوش مذاقی کا

مظاہرہ کیا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا بائی پاس بھی نہیں ہوا۔" ظہور نے ایک اور سوال کیا۔

"جی نہیں بڑے لوگوں کا یہ شوق بھی مجھے نہیں ہوا۔" اس نے اپنی خوش مذاقی کا مظاہرہ جاری رکھا۔

"لیکن بڑے آدمیوں کے اس شوق کا میں شکار ہو چکا ہوں اور مجھے اپنی ختنہ بھی یاد ہے۔ میری عمر اس وقت بارہ سال کی تھی۔ ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر پہلے تو منہ پر دوپٹہ رکھ کر شرمائی' پھر اس نے ایک دو تین کر کے چڑیا اڑا دی۔ میں اماں کا لال دوپٹہ دھوتی کی طرح باندھ کر کراچی کی سڑکوں کے گڑھوں پر اچھلتی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھا آرام سے گھر آ گیا تھا۔ اماں نے لڈو کھلائے تھے اور نظر اتاری تھی۔ شاید ابا نے لیڈی ڈاکٹر کی بد نظری کا تذکرہ کر دیا تھا۔ اس کے ایک ہفتے کے اندر ٹانکے کھلوا کر باہر گلی میں کرکٹ کھیلنے لگا تھا۔" ظہور نے کھانسنے کا وقفہ لیا۔ سینے کو نرم تکئے سے دبا کر کھانستا تھا' پھر بھی ایسا لگتا تھا جیسے دو دھاری تلوار سینہ کھرچ رہی ہو یا کسی غیر شرابی نے پانی سمجھ کر واڈکا کا بڑا سا گھونٹ لے لیا ہو۔

"ظہور بھائی ڈاکٹروں نے آپ کو زیادہ بولنے سے منع کیا ہے۔" سلیم نے اسے مزید بولنے سے روکنا چاہا۔ لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر سلیم کو تسلی دی اور اپنا بیان اسی طرح جاری رکھا۔

"لیکن دل کا آپریشن چڑیا کے اڑنے کا تماشا نہیں ہے۔ اس میں عقاب جھپٹتے اور شیر پنجے مارتے ہیں۔ پہلے آپ کے سینے کی سب سے مضبوط ہڈی اوپر سے نیچے تک بجلی کی آری سے اس طرح کاٹ دی جاتی ہے جیسے آرا مشین پر کسی درخت کا تنا۔ اس کے بعد آپ کی پسلیوں کو چیر کر ان پر **کلیمپ** لگایا جاتا ہے تاکہ حضرت دل تک پہنچ ممکن ہو سکے۔ پھر خون کھینچنے اور سینچنے کا کام دل سے لے کر ایک مشین کے حوالے کر دیا جاتا ہے لیکن دل دل ہے وہ پھر بھی دھڑکتا ضرور ہے۔ اس دھڑکن کو روکنے کے لئے برفانی محلول ڈال کر دل کو بالکل مردہ کر دیا جاتا ہے۔ دل کے ڈاکٹر

ساکت ہو جانے والے دل پر اپنے نشتر آزماتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ایک جونیئر ڈاکٹر دل کی پیوند کاری کے لئے آپ کے پاؤں کی پنڈلی چیر کر رگ نکال کر اسے غسل دیتا اور دل میں لگانے کے لئے تیار کرتا ہے۔ اس عمل کے بعد آپ کے دل کو دوبارہ دھڑکانے کے لئے جھٹکے لگائے جاتے ہیں اور مشین سے لے کر دل کا کام دل کو واپس کر دیا جاتا ہے۔ سینے کا پنجر بند کیا جاتا ہے اور درمیان سے کٹی ہوئی سینے کی ہڈی کو تار سے اس طرح باندھا جاتا ہے جیسے ہم گھر میں کرسی کے ٹوٹے ہوئے پائے کو باندھتے ہیں۔ پیٹ سے فاسد خون خارج کرنے کے لئے تین موٹے موٹے پائپ سوراخ کر کے پیٹ میں ڈالے جاتے ہیں اور نصف انچ کا ایک پائپ آپ کی پیشاب کی نالی کے سوراخ میں کئی انچ اندر تک گھسا دیا جاتا ہے۔ آپریشن کے بعد ضرورت نہ رہنے پر جب یہ پائپ باہر نکالے جاتے ہیں تو لگتا ہے ان کے ساتھ جان بھی نکلی جا رہی ہے۔ دل کے اندر جو زخم پڑے ہیں ان کا حال آپ سینے سے باہر آئے ہوئے ان نشانوں سے کر سکتے ہیں۔" ظہور نے بٹن کھول کر اپنا سینہ ننگا کر دیا۔ اوپر سے نیچے تک ایک کنکھجورا بنا ہوا تھا۔ اقبال کا دوست اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی خوش مذاقی بالکل رخصت ہو گئی تھی۔ لیکن ظہور کا آخری پنچ ابھی باقی تھا۔

"میرے بھائی بڑے آدمی ہو بھی جاؤ تو شوقیہ بائی پاس مت کرانا۔ دو چار بار ختنے کرا لینا۔ صرف کھال جائے گی، قد نہیں بدلے گا۔" ظہور کے خاموش ہونے پر بھی خاموشی ہی چھائی رہی۔ اقبال کا دوست فوراً اجازت لے کر چلا گیا۔

"یار تمہارے دوست کے خلاف میں نے کوئی زیادتی تو نہیں کر دی۔" ظہور نے اس کے جانے کے بعد اقبال سے کہا۔

"نہیں ظہور بھائی آپ نے ہمارا ایک مسئلہ حل کر دیا۔ اس نے ہماری زندگی عذاب کر رکھی تھی۔ اب وہ کم از کم ہمارے سامنے سوچ سمجھ کر بولے گا۔" اقبال نے ہنستے ہوئے کہا۔

چودھری انور اس گفتگو سے بور بلکہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا بائی پاس آپریشن کبھی نہیں کرائے گا۔ ختنے کرا لے گا۔ دل ہی دل میں یہ سوچ کر وہ مسکرا دیا

اور موضوع بدلنے کے لئے سلیم سے اس کے ویزے کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ سلیم نے ویزا بڑھوانے کے لئے اپنا پاسپورٹ بھیجا ہوا ہے۔ سلیم نے جب بری خبر سنائی تو سب مل کر کافی دیر سلیم کو سمجھاتے رہے کہ یہ کوئی بری خبر نہیں ہے۔ دو چار مہینے غیر قانونی ہو کر رہنا کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ جولائی اگست میں فیس جمع کر کے وہ نئے سرے سے اپنا ویزا بحال کر سکتا ہے۔ سلیم کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہو گا۔ غیر قانونی ہونے کے بعد اسے اسٹوڈنٹس ویزا نہیں ملے گا اور جہاز میں چڑھا کر واپس بھجوا دیا جائے گا۔ تینوں نے اسے اپنی اپنی مثالیں دیں اور بتایا کہ کتنے برسوں سے وہ غیر قانونی طور پر رہ رہے ہیں' جیل کی سیر کر آئے پھر بھی کوئی انہیں واپس نہیں بھجوا سکا۔

"لیکن آپ لوگوں کے کیس فائل ہو چکے ہیں' آپ لوگ اب بہتر پوزیشن میں ہیں۔ پھر آپ کے پاس جواز بھی ہے۔ چودہری انور کو قتل کے مقدمے میں پھنسوایا گیا تھا' ظہور بھائی کو شیف کی حیثیت سے ان کا مالک اسپانسر کر رہا ہے۔ میرے پاس تو غیر قانونی ہو کر رہنے اور واپس نہ جانے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔" سلیم نے ان کو سمجھانا چاہا۔

"وجہ سب کی بن جاتی ہے۔" چودہری انور نے اسے سمجھایا۔ "اور پھر ہم اب بھی غیر قانونی طور پر کام کرتے ہیں' پکڑے گئے تو اس دفعہ ضمانت بھی نہیں ہو گی۔ اقبال کا تو کیس تک فائل نہیں ہوا ہے اور وکیل اسے ابھی تک چکر دے رہا ہے۔ امیگریشن اس کے لئے پہلے بھی چھاپہ مار چکی ہے۔ وہ کبھی پکڑا گیا تو اس کے ساتھ کوئی بھی رعایت نہیں ہو گی۔"

"سلیم میاں فکر مت کرو۔ چند مہینوں کی بات ہے۔ ہمارے تو کئی سال گزر گئے کچھ دنوں کے لئے ہم جیسے غیر قانونیوں کی برادری میں شامل ہو جاؤ عیش کرو گے۔" ظہور بھی سمجھانے لگا۔ اپریل کا آخر ہوتے ہوتے سلیم غیر قانونیوں کی برادری میں شامل ہو گیا۔ لیکن چودہری انور' ظہور اور اقبال کے سمجھانے پر نہیں۔ وہ اسے قائل نہیں کر سکے تھے۔ سلیم کا خیال تھا کہ انہیں غیر قانونی طور پر رہنے کی عادت ہو

گئی ہے اس لئے وہ سلیم کے مسئلے کی شدت کو محسوس نہیں کر رہے۔ اس مسئلے پر سلیم نے بشیر سے مل کر رہنمائی حاصل کی تھی اور اس کے مشورے پر عمل کر رہا تھا۔

سلیم کا خیال تھا کہ بشیر ان معاملوں میں زیادہ تجربہ کار ہے۔ وہ کوئی بہتر مشورہ دے سکے گا اور ہو سکتا ہے کوئی ایسی راہ نکالے کہ وہ غیر قانونی ہونے کے اس عمل سے گزرنے سے بچ جائے۔ لیکن بشیر کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ سلیم نے کئی بار فون کئے۔ فون بجتا رہتا لیکن کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ ایک دفعہ ایک عورت نے اٹھایا تھا۔ سلیم کو یقین تھا کہ بشیر کی بیوی لیزا ہو گی۔ لیکن اس کی آواز سخت نیند یا نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سلیم نے پیغام چھوڑا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ لیزا کو پیغام یاد نہ رہا ہو گا۔ سلیم کو بشیر پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ ہر وقت چرس کے نشے میں ڈوبی رہنے والی تھی۔ غیر قانونی ہو جانے کا وقت قریب آ رہا تھا اس لئے سلیم کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ بشیر کو ڈھونڈنے ایک روز وہ کنگز کراس میں واقع بلیز کارنز چلا گیا جس کے بارے میں بشیر نے بتایا تھا کہ وہ اپنی شامیں اکثر وہاں گزارتے ہیں۔ سلیم کے لئے کنگز کراس جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ بلیز کارنز کے ہجوم میں اسے بشیر نظر نہیں آیا۔ سلیم ایک کونے میں دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

ایک عجیب دنیا اور اس میں بسنے والی عجیب مخلوق تھی۔ سلیم نے بالوں کے اتنے رنگ اور ایسے عجیب انداز پہلے نہیں دیکھے تھے۔ موسیقی کان کے پردے پھاڑے دے رہی تھی اور ڈانس کے لئے مخصوص فلور پر کھوے سے کھوا چھلنے کا محاورہ حقیقت کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ کندھے، سینے، کولہے اور ٹانگیں ہلانے کی یکسانیت کو سلیم دیر تک مبہوت ہو کر دیکھتا رہا۔ لیکن وہ جلد ہی باہر نکل آیا ہر طرف لہراتے ہوئے سگریٹ کے گہرے نیلے دھوئیں اور بیئر کی تیز بو سے اسے کھانسی اور متلی ہونے لگی تھی۔ اس نے سوچا وہ کچھ دیر سڑکوں پر آوارہ گردی کرے گا اور ایک بار پھر بلیز کارنز میں بشیر کو دیکھے گا۔ لیکن کنگز کراس کی سڑکوں پر گھومنا صحیح قسم کی آوارہ گردی تھی۔ سلیم کو جلد ہی وہاں سے بھاگ جانا پڑا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہر قدم پر دروازوں پر کھڑی ہوئی نیم برہنہ لڑکیاں اور پہلوان نما مرد اندر آنے اور قدرت کا

نظارہ دیکھنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ ان کا اصرار اتنا شدید تھا کہ سلیم اگر رفتار ذرا بھی سست کرتا تو اپنی آنکھوں کو گنہگار کرنے کے لئے اسے کسی نہ کسی دروازے کی سیڑھیاں ضرور چڑھنی پڑتیں۔ اس نے بازار کی مرکزی سڑک چھوڑ کر اطراف کی نسبتاً" خاموش اور تاریک گلیوں کا رخ کیا۔ لیکن یہاں صرف آنکھوں کے گنہگار ہونے کا معاملہ نہیں تھا۔ ہر قدم پر گناہ کے اشتہار مجسم شکل میں کھڑے ایمان کو بہکا رہے تھے۔ ان کی ٹانگوں کے قد اور رنگ مختلف تھے لیکن ایک بات مشترک تھی کہ ان پر کوئی دھجی نہیں چڑھی تھی۔ مختصر لباس رانوں کے شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا اور سینے پر جا کر اتنا تنگ ہو جاتا کہ چھپنے والی چیز نظروں میں سمانے کے لئے ابل رہی ہوتی۔ ان میں ہر رنگ، نسل اور عمر کی عورتیں شامل تھیں۔ ان کی زبانوں پر ان کے نرخنامے ٹنگے ہوئے تھے۔ سلیم گھبرا کر ان گلیوں سے نکل آیا اور ایک بس پر یہ دیکھے بغیر کہ وہ کہاں جا رہی ہے سوار ہو گیا۔

بشیر کا فون دوسرے روز آگیا تھا۔ لیزا کے بارے میں سلیم کا خیال غلط تھا کہ اس نے پیغام نہیں دیا ہو گا۔ بشیر نے بتایا کہ وہ چند راتوں سے اپنے گھر نہیں سو رہا تھا اس لئے اسے پیغام نہیں مل سکا تھا۔ وہ جمعہ کا روز تھا۔ اس نے سلیم کو بتایا کہ وہ اپنی شام یونیورسٹی کے شراب خانے میں گزارے گا وہ اگر چاہے تو آ کر مل سکتا ہے۔ یونیورسٹی کے بار میں بھی اتنا ہی رش تھا جیسا اس نے بلیز کارنر میں دیکھا تھا۔ سلیم کو بشیر کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ باہر جانے ہی والا تھا کہ بشیر باتھ رومز سے نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے دو تین لڑکے اور باہر نکلے تھے۔ سلیم کو لے کر وہ باہر بڑے سے ٹیرس پر آگیا جہاں لکڑی کی بنچوں پر کئی جوڑے بیٹھے اپنے بوسوں کو چاندنی کا غسل دے رہے تھے۔ سلیم بھاگ کر بشیر کے لئے بیئر اور اپنے لئے مچھلی اور آلو کے چپس لے آیا۔ بشیر کی آنکھوں پر ہمیشہ کی طرح کالا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ بیئر کی چسکیاں اور سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ سلیم اسے اپنی کہانی سناتا رہا۔ بشیر کی بیئر ختم ہونے سے پہلے ہی وہ اس کے لئے ایک اور بیئر اور اپنے لئے کوک لے آیا تھا۔

"بشیر بھائی تین چار مہینوں کا مسئلہ ہے۔ کوئی ایسی ترکیب کرو کہ میں غیر قانونی

ہونے سے بچ جاؤں اور قانونی رہوں۔" سلیم نے بہت امید بھری نظروں سے بشیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن قانونی ہونے کے لئے تمہیں غیر قانونی ہونا پڑے گا۔ یہ بہت سادہ سی منطق ہے۔ تم غیر قانونی نہیں بنو گے تو پھر قانونی بننے کا عمل کیسے شروع ہو گا۔" بشیر نے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا اور پھر اس سے پوچھا "اسٹوڈنٹس ویزے پر رہنے میں تمہیں اتنی دلچسپی کیوں ہے۔"

"اس لئے کہ میں اسٹوڈنٹ ہوں۔ مجھے پڑھنا اور اپنی ڈگری ختم کرنا۔ میرے آسٹریلیا آنے کا یہی مقصد تھا اور اس مقصد کو حاصل کئے بغیر میں واپس نہیں جاؤں گا۔" سلیم نے بڑے عزم کے ساتھ کہا۔

"لیکن مقصد حاصل کرنے کا تمہارا طریقہ غلط ہے۔ تم ایک پاؤں نوکری اور دوسرا پڑھائی کی ناؤ میں رکھ کر دریا عبور نہیں کر سکتے۔ تمہاری ٹانگیں چر جائیں گی۔ تم جو نوکری کرتے ہو وہ بابو گیری نہیں ہے۔ سخت قسم کی جسمانی مشقت ہے۔ نوکری کر کے گھر آؤ گے تو کتاب اٹھانے کی طاقت نہیں ہو گی۔ یونیورسٹی جا کر پڑھتے رہو گے تو صبح اٹھ کر نوکری پر جانے کو دل نہیں چاہے گا۔ شاید کچھ دن شوق میں یا جذبات میں آ کر یہ سب کچھ کر بھی لو، لیکن جلد ہی تھک کر بیٹھ جاؤ گے۔ جو کچھ کماؤ گے فیس کی شکل میں یونیورسٹی کے اندھے کنوئیں میں ڈال دو گے۔ نہ خدا ملے گا نہ وصال صنم ہو گا۔ نہ پیسے بچا پاؤ گے۔ نہ پڑھ پاؤ گے۔" بشیر نے خاموش ہو کر بیئر کا گلاس منہ سے لگا لیا۔ سلیم کو معلوم تھا کہ بشیر جو کچھ کہہ رہا ہے غلط نہیں ہے۔ نوکری کر کے واپس آنے کے بعد پڑھائی تو الگ، کھانا کھا کر اپنی پلیٹ دھوتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی تھی۔

"لیکن پھر میں کیا کروں۔ مجھے پڑھائی بھی نہیں چھوڑنی۔ ڈگری لئے بغیر مجھے واپس نہیں جانا۔ لیکن پڑھنے کے لئے پیسے چاہئیں۔ پیسوں کے لئے نوکری چاہئے۔ رہنے کے لئے ویزا چاہئے۔ آپ ہی بتاؤ میں کیا کروں۔" سلیم کے لہجے میں بڑی بیچارگی تھی۔

"اگلے تین چار مہینے تک تم پڑھائی کرنے کا ارادہ پہلے ہی ترک کر چکے ہو۔ چند مہینے کے لئے اور بھول جاؤ۔ بس نوکری کرتے اور پیسے جمع کرتے رہو۔ ویزا بڑھوانے کا خیال چھوڑ دو۔ وہ بڑھے گا بھی نہیں۔ جس دن غیر قانونی ہو جاؤ گے اسی روز تمہاری ریفیوجی کی درخواست ڈلوا دیں گے۔ امیگریشن کا ایک ایڈوائزر میرا جاننے والا ہے۔ تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا۔ کم پیسوں میں تمہارا کیس لے لے گا۔ ان لوگوں کے ریفیوجی کیسوں کا آج کل جلدی فیصلہ ہو رہا ہے جن کی عمریں زیادہ نہیں ہیں' ڈگری یافتہ ہیں' کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں رکھتے اور جو کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہیں۔ تم ہر طرح سے معیار پر پورے اترتے ہو۔ جب مستقل شہریت مل جائے تو اپنا ڈگری لینے کا شوق بھی پورا کر لینا۔ کوئی فیس نہیں مانگے گا۔ حکومت تمہیں داماد بنا کر پالے گی۔ مجھے دیکھو عیش کر رہا ہوں۔ میرے گھر کا کرایہ تک حکومت دیتی ہے۔" اسی وقت دو افراد بشیر کی طرف آئے۔ بشیر ان سے ہیلو ہیلو کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے ساتھ بیت الخلاء کی طرف چل دیا۔ سلیم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس اڈے پر چرس کی فروخت کا ٹھیکہ بشیر کے پاس ہے۔ بشیر واپس آیا تو سلیم بھی اٹھ کھڑا ہوا اور بشیر سے اجازت لینے لگا۔

"ویزے کی فکر اور غیر قانونی ہونے کی پرواہ مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شیر بنو شیر۔ اور جب شیر ہو جاؤ تو مجھے فون کر دینا۔" اس نے سلیم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

سلیم اگلے ہفتے ہی شیر بن گیا تھا۔ اس کا ویزا ختم ہو گیا تھا اور وہ غیر قانونیوں کی برادری میں شامل ہو گیا تھا۔ فلیٹ میں رہنے والے اس کے تینوں ساتھیوں نے اسے مبارکباد دی تھی۔ سلیم کو معلوم تھا اس کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ فلیٹ کے ساتھیوں اور بشیر' سب کی رائے ایک ہی تھی۔ فرق یہ تھا کہ چودھری انور' ظہور اور اقبال نے غیر قانونیوں کی برادری میں شامل ہونے کا صرف مشورہ دیا تھا۔ بشیر احمد نے مسئلے کا حل بھی بتایا تھا۔ پورا لائحہ عمل سمجھایا تھا۔ ایسا حل جو سلیم کے دل کو بھی لگا تھا۔ فیس کے ہزاروں ڈالر دینے سے بہتر تھا کہ وہ چند ہزار ڈالر لگا کر امیگریشن

لینے کی کوشش کرتا۔ اس کے بعد جب تک چاہتا مفت پڑھ سکتا تھا۔ نہ فیس جمع کرنے کا دباؤ نہ اسکالر شپ کی ضرورت اور پھر ریسرچ میں ہی سر کھپانا ہے تو صرف ماسٹرز کیوں، پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے تک کیوں نہ پڑھے۔ گھر والوں کو آسٹریلیا بلانے کا حق بھی مل جائے گا۔ پڑھائی، دوا، کرایہ سب کچھ حکومت کے ذمے۔ نہ جدائی کا غم نہ فکر معاش۔ سلیم نے اپنے مستقبل کا سارا بوجھ بشیر احمد کے پلڑے میں ڈال دیا اور بڑی یکسوئی سے نوکری اور بشیر احمد سے رابطہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ لیکن بشیر احمد سے رابطہ کرنا نوکری کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ سلیم فون کرتا تو کوئی جواب نہیں ملتا کنگز کراس جانے کی ہمت نہیں تھی۔ جمعہ کی ایک رات یونیورسٹی کے بار میں بھی گیا۔ لیکن اس روز شاید بشیر نہیں آیا تھا یا آ کر چلا گیا تھا۔ دو ہفتوں کی کوششوں کے بعد ایک شام بشیر کے گھر کسی عورت نے فون پر جواب دیا۔ لیکن یہ وہ نہیں تھی جس نے ایک بار پہلے سلیم کا پیغام لے کر بشیر کو پہنچایا تھا۔ سلیم کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ بشیر کی بیوی لیزا کون سی تھی۔ پہلے والی یا آج والی۔ جو بھی تھی اس کی آواز جاگتی ہوئی اور لہجے میں بہت شائستگی تھی۔ اس نے سلیم کا نمبر لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ بشیر کو پیغام پہنچا دے گی۔ اسی رات بشیر کا فون آ گیا۔ سلیم گھر میں ہمیشہ کی طرح اس وقت اکیلا تھا رات میں سلیم کے بعد سب سے پہلے ظہور آتا تھا، لیکن گیارہ بجے کے بعد۔ بشیر احمد نے کسی تمہید کے بغیر سلیم کو بتایا کہ اس نے سلیم کے لئے امیگریشن ایڈوائزر سے کل شام کا وقت لے لیا ہے۔ اس نے سلیم سے اس کی فیکٹری کا پتہ لیا اور بتایا کہ شام ساڑھے پانچ بجے جب وہ کام ختم کرتا ہے وہ اسے اس کی فیکٹری سے لے لے گا۔ فیکٹری کا پتہ بتا کر سلیم نے غیر قانونیوں کے پہلے اصول سے انحراف کیا تھا۔ جس روز اس کے دوستوں نے اس کے غیر قانونی ہونے کا جشن منایا تھا اسے غیر قانونی کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا فن سکھانے کی کوشش بھی کی تھی۔ سب سے اہم اور بنیادی اصول تھا کہ کبھی کسی کو، اپنے دوست کو بھی اپنی کام کی جگہ، پتہ اور فون نمبر مت بتاؤ۔ کسی قیمت پر مت بتاؤ۔ بشیر کو فیکٹری کا پتہ بتاتے ہوئے سلیم کے ذہن میں اپنے دوستوں کی یہ وارننگ تھی لیکن بشیر احمد کے

ہاتھوں میں تو وہ اپنا مستقبل دے چکا تھا۔

شام کو ٹھیک ساڑھے پانچ بجے جب بشیر احمد سلیم کو لینے پہنچا تو وہ فیکٹری کے گیٹ پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ بشیر ٹیکسی میں سوار ہو کر آیا تھا اور اسی ٹیکسی میں وہ امیگریشن ایڈوائزر کے دفتر روانہ ہو گئے۔ دفتر لکیمبا کے علاقے میں تھا جہاں لبنانی عربوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ بازار میں بیشتر دکانوں کے بورڈ انگریزی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھے ہوئے تھے۔ اسی علاقے میں مرکزی مسجد بھی واقع تھی۔ امیگریشن ایڈوائزر کا دفتر ایک پرانی عمارت میں دوسری منزل پر تھا۔ نیچے سبزی اور پھلوں کی اور اس کے ساتھ ہی حلال گوشت کی دکان تھی۔ چھ بج چکے تھے پھر بھی دونوں دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ جمعرات کو سڈنی کے بازار رات کو نو بجے تک کھلے رہتے تھے۔ لکیمبا پہنچتے پہنچتے ٹیکسی کے چالیس ڈالر بن گئے۔ بشیر نے تکلفاً" بھی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سلیم کا کام تھا۔ پیسے بھی اسی کو دینے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر دکانوں کے اوپر پہنچے تو چھوٹے کمروں کی شکل میں ایک لائن سے چار دفتر بنے ہوئے تھے۔ پہلا کسی ٹریول ایجنسی کا تھا اور دوسرا کسی امپورٹر ایکسپورٹر کا تھا۔ تیسرا دفتر شاید خالی تھا۔ اس پر کسی نام کی تختی نہیں تھی۔ امیگریشن ایڈوائزر کا دفتر سب سے آخر میں کونے والا تھا۔ بڑے بڑے حرفوں میں ملک آفتاب احمد امیگریشن ایڈوائزر کا بورڈ لگا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی سامنے ایک چھوٹی سی میز پر پتلی دبلی سی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ رنگ اور شکل سے فیجی کی لگتی تھی۔ سخت بیزار نظر آتی تھی' انہیں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ بھی نہیں ابھری جو سیکریٹریوں کی شناخت ہوتی ہے۔ لیکن اس نے سیکریٹری کا یہ روایتی فرض ضرور ادا کیا تھا کہ ان کا نام پوچھ کر پارٹیشن کے پیچھے بیٹھے ہوئے امیگریشن ایڈوائزر کو ان کی آمد کی اطلاع دینے گئی تھی۔ حالانکہ یہ بھی ایک تکلف تھا۔ چھوٹے سے کمرے کے کسی بھی کونے میں کی جانے والی سرگوشی دوسرے کونے تک آسانی سے سنی جا سکتی تھی۔ امیگریشن ایجنٹ نے پارٹیشن کے دوسری طرف سے نکل کر بہت گرم جوشی کے انداز میں ان سے ہاتھ ملایا۔ وہ پیچھے والے حصے میں اس کی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ

سانولے رنگ کا چھوٹے قد کا اور زیادہ سے زیادہ تیس سال کا نوجوان تھا۔ بہت اسمارٹ سا گہرے نیلے رنگ کا سوٹ پہنے اور بنکیوں والی لال ٹائی باندھے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر نظروں کا چشمہ تھا جس میں سے اس کی تیزی سے گھومتی ہوئی آنکھیں کسی ایک جگہ ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں ٹھہرتی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کس وقت وہ کسے دیکھ رہا ہے۔

"بشیر بھائی کیسے ہو آپ۔ کاروبار کیسا ہے۔" ملک آفتاب نامی امیگریشن ایڈوائزر نے ہندوستانی سیٹھوں کے سے لہجے میں پوچھا۔

"اپنا تو پڑیا کا کاروبار ہے' گولی کی طرح چلتا ہے۔ تم سناؤ' سنا ہے بہت چمک رہے ہو۔ دھڑا دھڑ ریفیوجی بنا رہے ہو۔" بشیر کے انداز میں وہی لاپرواہی تھی۔

"بس مالک اللہ کی دیا ہے۔ مولا کا کرم ہے کہ بات اپنی بنی ہوئی ہے۔ اس دھندے میں پیسے سے زیادہ دعائیں کماتا ہوں۔ روز میرا کوئی نہ کوئی کیس پکی شہریت کے کاغذ لے کر نکلتا ہے اور آ کر مجھے دعائیں دیتا ہے ابھی ابھی آپ لوگ کے آنے سے پہلے ایک یہ مٹھائی دے گیا ہے۔ لو آپ بھی کھاؤ۔" ملک آفتاب نے سائڈ کی میز پر رکھا ہوا مٹھائی کا ڈبہ انہیں پیش کیا۔ سلیم نے شکریہ کہہ کر اور بشیر نے صرف ہاتھ ہلا کر انکار کر دیا۔

"یہ سلیم ہیں۔ تازہ تازہ غیر قانونی ہوئے ہیں اور قانونی ہونے کی جلدی میں ہیں۔ یونیورسٹی میں ان کی ڈگری ادھوری پڑی ہے۔ اپنا جادو دکھاؤ اور ان کی بات بھی بنا دو۔" بشیر نے کام کی بات شروع کی۔

"مالک اسی خدمت کے لئے ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ بولو سلیم بھائی۔ ریفیوجی ڈال دیں یا شادی کا بندوبست کریں۔" ملک آفتاب نے سلیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں شادی کا چکر نہیں چلاؤ۔ چھنالوں کے منہ بہت کھل گئے ہیں پیسہ بھی زیادہ مانگتی ہیں اور بیچ میں بھاگ بھی جاتی ہیں۔ جو بھاگتی نہیں وہ بلیک میل کرنے لگتی ہیں۔" بشیر نے سلیم کے بولنے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ٹھیک ہے مالک ریفیوجی کی درخواست ڈال دیتے ہیں۔" ایڈوائزر نے میز کی دراز سے ایک فارم نکالتے ہوئے کہا۔ "مالک آپ کا پورا نام" مالک کہنا آفتاب کا شاید تکیہ کلام تھا۔

"سلیم امتیاز۔"

"آگے پیچھے بھی کچھ ہو گا مالک"

"جی نہیں۔ صرف سلیم امتیاز۔ امتیاز میرے دادا کا نام تھا۔ میرے والد بھی اپنے نام کے آگے صرف امتیاز لکھتے تھے' میں بھی یہی لکھتا ہوں۔ ویسے ہم جیلانی ہیں' لیکن کاغذات میں یہ نام کہیں استعمال نہیں ہوتا۔" سلیم نے اپنے نام کی وضاحت کی۔

"یہ نام تو ذرا مشکل پڑ جائے گا۔ خیر دیکھیں گے۔"

"نام میں کیا مشکل ہے۔" سلیم نے اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ کے نام کے آگے نقوی' رضوی' علی یا حسین لگا ہوتا تو ہم فقہ جعفریہ کا کیس ڈالتے۔ پاکستان میں ان کی جانوں کو بڑا خطرہ ہے۔ حال ہی میں ان کے ایک امام باڑے پر فائرنگ ہوئی ہے۔ کئی لوگ مارے گئے ہیں۔ آپ محمد سلیم ہوتے تو سپاہ صحابہ کا رکن بنا دیتے۔ ان کی بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئی ہیں۔ سلیم احمد ہوتا تو قادیانی بنا کر کیس فائل کرنا زیادہ آسان ہو جاتا۔ سلیم امتیاز بڑا نیوٹرل نام ہے۔ آپ کو شیعہ' سنی یا قادیانی بنانے کے لئے حلف نامہ تیار کرنا پڑے گا۔"

"میں شہریت بدلنے کے لئے مذہب یا فرقہ نہیں بدلوں گا۔" سلیم کو اچانک اپنی اصول پسندی یاد آ گئی۔

"مالک آپ کا مذہب کون بدل رہا ہے۔ صرف حلف نامہ بھریں گے' چلو آپ اس پر راضی نہیں ہو تو ایم کیو ایم کا کیس ڈال دیتے ہیں۔ آپ لگتے بھی کراچی کے ہو۔" سلیم کو کراچی کا لگنے والی بات سے ہمیشہ چڑ رہی تھی' لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

"لیکن میرا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" سلیم نے پھر احتجاج کیا۔

"تو مالک کس سے تعلق ہے وہ بتاؤ۔ جس کا کہو گے کیس بنا دیں گے۔ کہو تو

مسلم لیگ کا کیس ڈال دیں۔ نواز شریف والوں پر برا وقت آیا ہوا ہے۔ تمہارے لئے ان کے لیٹر بھی منگوا دیں گے۔ پیپلز پارٹی کے ہو تو اس کا کیس ڈال دیتے ہیں۔"

"لیکن پیپلز پارٹی تو حکومت میں ہے۔"

"یہ کام ہمارا ہے۔ کہہ دیں گے تم مرتضیٰ بھٹو کے ساتھیوں میں سے ہو۔ بہن اپنے بھائی کے بجائے اس کے ساتھیوں سے انتقام لے رہی ہے۔ اپنے بہنوئی تک کو جیل بھیج چکی ہے۔ آپ خالی ہاں کرو کیس بنانا ہمارا کام ہے۔" سلیم کے ضدی انداز کے باوجود امیگریشن ایڈوائزر کے لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"لیکن یہ سب کچھ تو سراسر جھوٹ ہو گا۔ انٹرویو ہوا تو میں اتنے سارے جھوٹ کیسے بول پاؤں گا۔" سلیم کے تحفظات ابھی باقی تھے۔

"تو مالک سچے آدمیوں کی طرح چپ چاپ گھر بیٹھے رہو۔ امیگریشن والے پکڑ کر جب واپس جہاز میں چڑھا دیں تو خاموشی سے سچ کی صلیب پر چڑھ جانا۔ پاکستان میں ایف آئی اے والے کچھ دن مہمان رکھیں گے' جو کچھ کما کر لے جاؤ گے وہ انہیں بھینٹ دے دینا۔" آفتاب نے شاید صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن لہجے کی نرمی اسی طرح تھی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ ملک آفتاب نے ایک کوشش پھر کی۔

"ٹھیک ہے مالک آپ بولو تو پھر جھوٹی شادی کا سچا کیس ڈال دیتے ہیں۔"

"نہیں یار نہیں میں نے بول دیا شادی کا کیس نہیں ڈالیں گے۔ ایسا کرو ایم کیو ایم کا کیس ڈال دو۔ اس میں جھوٹ کم بولنا پڑے گا۔" بشیر نے سلیم کی طرف سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"میرا خالہ زاد بھائی ایم کیو ایم میں تھا' جیل بھی جا چکا ہے' گھر والوں نے بڑی مشکل سے ملک سے بھگا کر جاپان بھجوا دیا ہے۔" سلیم نے انہیں بتایا تو امیگریشن ایڈوائزر جیسے اچھل پڑا۔

"مالک پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔ آپ کا تو بنا بنایا کیس ہے۔ آپ کو جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ کی تو فیملی ہسٹری ہے۔ آپ تو واپس جا ہی نہیں

سکتے۔ گئے تو بھائی کے بدلے پکڑ کر لے جائیں گے اور پھر پولیس مقابلے میں مار دیں گے۔" اس نے بڑے پرجوش انداز میں اس کی قسمت کا فیصلہ سنایا۔

"میرے گھر والے یہی کہتے ہیں۔ میری ماں نے قسم دی ہے کہ میں واپس نہ جاؤں۔" سلیم نے مزید انکشاف کیا۔

"آپ تو مالک خود کو پکا سمجھو۔ ادھر کیس داخل ہوا اور ادھر آپ کا انٹرویو آیا۔ آپ کا تو بالکل اوپن اور شٹ کیس ہے۔ آپ اس فارم کو بھر دو' اپنے بھائی کا نام اس کی گرفتاری کی تاریخ اور کراچی میں اپنا پتہ بھی لکھ دینا۔ میں ایک ہفتے میں آپ کا کیس تیار کر لوں گا۔" امیگریشن ایڈوائزر نے سلیم کی طرف فارم اور قلم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن پیسے کتنے ہوں گے؟" سلیم نے بشیر کی طرف دیکھ کر ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ بشیر بھائی کے ساتھ آئے ہو' مالک ہو' جو یہ بولیں گے دے دینا۔" ملک آفتاب نے بشیر اور سلیم کو بیک وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

"لین دین کے معاملے میں مجھے بیچ میں مت ڈالو۔ ایک دوسرے کے ساتھ خود فیصلہ کرو۔ کوئی اونچ نیچ ہو تو کل میرا گریبان مت پکڑنا۔" بشیر نے خود کو درمیان سے نکال لیا۔

"مالک ریفیوجی کیس ڈالنے کے میں نے دس سے پندرہ ہزار ڈالر لئے ہیں۔ آپ گھر کے آدمی ہو اس لئے آپ سے صرف پانچ ہزار ڈالر لوں گا۔ ایک پیسہ کم نہ ایک پیسہ زیادہ۔ لیکن فل گارنٹی دوں گا۔ کیس نہیں ہوا تو پیسے واپس۔" مالک آفتاب نے میز پر جھکتے ہوئے بہت پریقین لہجے میں کہا۔

"لیکن میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں میں تو صرف ایک ہزار ڈالر لایا تھا۔" سلیم نے ذرا آہستگی سے کہا۔

"ایک ہزار ڈالر بہت ہیں مالک میں ایک ساتھ پورے پیسے لیتا بھی نہیں ہوں۔ ایک ہزار ڈالر ابھی لوں گا۔ ایک ہزار ڈالر اگلے ہفتے آپ کا کیس داخل ہوتے

وقت' ایک ہزار ڈالر اس وقت لوں گا جب انٹرویو آئے گا اور دو ہزار ڈالر اس وقت جب آپ کا کیس منظور ہو جائے گا۔ آپ کو ایک ایک پیسے کی رسید دوں گا۔" ملک آفتاب نے ادائیگی کا ٹائم ٹیبل بتاتے ہی جواب کا انتظار کئے بغیر اپنی سیکریٹری کو آواز دی "مونی مسٹر سلیم کے نام ایک ہزار ڈالر کی رسید بنا کر دو۔" سلیم نے بشیر کی طرف دیکھا۔ وہ پیسے دینے سے پہلے اس کی منظوری چاہتا تھا۔ لیکن بشیر ملک آفتاب کی پشت پر کھلی ہوئی کھڑکی کے پرے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلیم نے اسے چونکا دیا۔

"بشیر بھائی' کیا خیال ہے' ٹھیک ہے' دے دوں۔"

"میں اس کا کمیشن ایجنٹ نہیں ہوں۔ میرا کام تمہیں ملوانا تھا ملوا دیا۔ اب تمہاری مرضی ہے۔ تم مطمئن ہو تو دو نہیں ہو تو کوئی اور رستہ دیکھیں گے۔ میں نے تم کو پہلے ہی بول دیا ہے لین دین میں مجھ کو بیچ میں مت ڈالو۔" بشیر نے ایک بار پھر اپنی جان چھڑائی۔ سلیم کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ پیسے بچا اور بھاگ' لیکن ہاتھ خود بخود جیب سے نوٹ نکال کر گننے لگے۔

"پورے ایک ہزار ہیں' آپ گن لیجئے۔" سلیم نے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مالک یہاں اعتبار کا سودا ہوتا ہے۔ آپ نے گن لئے کافی ہیں۔ اب آپ ذرا تفصیل کے ساتھ یہ فارم بھر دو۔" ملک آفتاب نے پیسے لے کر گننے بغیر جیب میں رکھ لئے اور سلیم کو وہ رسید دے دی جو اس کی سیکریٹری میز پر رکھ کر چلی گئی تھی اور دوبارہ اپنے ناخنوں پر لگی ہوئی بہت گہری سرخ نیل پالش تمنر سے صاف کرنے لگی تھی۔ سلیم فارم بھرنے لگا اور بشیر نے کھڑکی چھوڑ کر اپنی توجہ پھر ملک آفتاب پر کر دی جو کرسی کی پشت سے ٹک گیا تھا' اور اپنی آنکھوں کو گھماتا ہوا بشیر اور سلیم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

"کل جارج اسٹریٹ پر مجھے ظفر نظر آیا تھا۔ اس نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ رش زیادہ تھا۔ بس مچھلی کی طرح میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔ لیکن یہ آیا کیسے' اسے تو امیگریشن نے جہاز میں چڑھا کر پاکستان بھجوا دیا تھا۔" بشیر نے امیگریشن ایجنٹ سے

پوچھا۔

"جانے دو مالک۔ ایک بار اسے تڑی پار کرا چکے ہو' بڑا پیسہ خرچ کر کے آیا ہے اب کے پکڑا گیا تو بالکل مارا جائے گا۔" ملک آفتاب نے اپنی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"میں اسے چھوڑوں گا نہیں اس نے ایک بار میرا راستہ کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ ملے تو بول دینا میرے پاس آئے ورنہ میں پاتال میں بھی تلاش کر لوں گا' اور اب کے پکڑا گیا تو واپس نہیں جائے گا۔ جیل میں سڑے گا۔ مجھے معلوم ہے جعلسازی کئے بغیر وہ واپس نہیں آیا ہو گا۔"

"لیکن تمہارا اس سے جھگڑا کیا ہے۔ وہ تو یہاں کا پرانا آدمی ہے۔" ملک آفتاب نے ذرا کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

"وہ اس نواب کا آدمی تھا جسے میں نے پکڑوا کر واپس بھجوایا تھا۔ نواب کی محبت میں اس نے میرے خلاف رپورٹ کر دی۔ لیکن اس وقت تک میں لیزا سے شادی کر کے اپنا کیس فائل کر چکا تھا اس لئے بچ گیا۔ جب مجھے معلوم ہوا یہ کام کس کا ہے تو پھر وہ نہیں بچ سکا۔ لیکن یہ بتا کہ وہ آیا کیسے۔" بشیر نے ملک آفتاب کو گھورتے ہوئے ایک بار پھر پوچھا۔

"جنوبی افریقہ کے ذریعے۔" ملک آفتاب نے کرسی پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"جنوبی افریقہ کے ذریعے......؟ ابے کہاں کی چھوڑ رہا ہے۔" بشیر نے حیرت ظاہر کی۔

"مالک یہ نیا راستہ کھلا ہے۔ لمبا ہے پیسے بھی زیادہ ہیں لیکن کام بہت پکا ہے۔ پاکستان سے جنوبی افریقہ کا ویزا مل جاتا ہے۔ کیپ ٹاؤن میں ایک گینگ ہے جو پانچ ہزار امریکی ڈالر میں جنوبی افریقہ کا پاسپورٹ بنوا دیتا ہے۔ جنوبی افریقہ کے پاسپورٹ پر آسٹریلیا کا ویزا لگنا ایسا ہے جیسے پیس آف کیک۔ آسٹریلیا آ کر ریفیوجی کی درخواست ڈالو' امیگریشن والے آنکھ بند کر کے ٹھپہ لگا دیتے ہیں۔" ملک آفتاب نے ایک آنکھ

دباتے ہوئے کہا۔
"لیکن جنوبی افریقہ میں تو اب نیلسن منڈیلا آ گیا ہے۔ اب وہاں کا مسئلہ کیا ہے۔" بشیر کی حیرت ابھی بر قرار تھی۔
"جب سے گوروں کا راج ختم ہوا ہے بھارتی نسل کے لوگوں پر وقت بھاری ہو گیا ہے۔ پوری مغربی دنیا کو پتہ ہے۔ لیکن نسلی تعصب بڑی لمبی جدوجہد کے بعد ختم ہوا ہے اسی لئے کوئی اس معاملے کو اچھالنے کی کوشش نہیں کرتا۔ پھر وہ سب ہی پڑھے لکھے پیسے والے لوگ ہیں' اس لئے ترس کھانے کے لائق بھی نہیں سمجھے جاتے۔ لیکن جو بھاگ سکتا ہے بھاگ رہا ہے۔ آسٹریلیا والے جانتے ہیں کہ وہ پیسہ اور مہارت دونوں لے کر آئیں گے اس لئے ان کا کیس آسانی سے نمٹ جاتا ہے۔" ملک آفتاب نے بشیر کو تفصیل کے ساتھ سمجھایا۔
"میرے دو لڑکے اعوان والوں کی شکایت پر پکڑے گئے تھے۔ وہ نکال دیئے گئے اور اب لاہور میں بیٹھے ہیں۔ پیسے سے ٹھیک ٹھاک ہیں' کیپ ٹاؤن کا رابطہ دے دے انہیں بھی ادھر سے بلوا لیتا ہوں۔ وہ آ جائیں تو اپنی فیس بھی لے لینا۔" بشیر نے محسوس کیا تھا کہ اعوان کے نام پر ملک آفتاب کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔ لیکن وہ فوراً" ہی سنبھل گیا۔
"مالک تم سے فیس کیا لینی۔ لیکن میں ناک گھما کر نہیں پکڑتا۔ اپنے آدمیوں کو بنکاک میں سیام روڈ پر فرحت ریسٹورنٹ میں صابر کے پاس میرا نام لے کر بھیج دو۔ آسٹریلیا کی پکی شہریت لگے ہوئے پاسپورٹ مل جائیں گے۔ دس ہزار ڈالر لگیں گے۔ لیکن نقد۔ ایک ہاتھ سے پیسہ دوسرے ہاتھ سے پاسپورٹ۔ پکڑے گئے تو باہر نکلوانے کی ذمہ داری بھی میری۔ بولو کیا بولتے ہو۔" دونوں سلیم کی موجودگی کو نظر انداز کئے ہوئے اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ ان کے لئے پیسے دینے کے بعد شاید سلیم کا کردار ختم ہو گیا تھا۔ سلیم بھی دونوں کی بات چیت سے بے نیاز بڑی توجہ اور غور سے فارم بھرنے میں مصروف تھا۔ وہ اپنی پوری صلاحیتیں استعمال کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اپنے قلم سے نکلے ہوئے ہر لفظ سے وہ آسٹریلیا میں اپنے مستقبل کی سنہری عمارت تعمیر کر رہا

ہے۔ فارم بھر کر اس نے اس کا جائزہ لیا اور نوک پلک ایک بار پھر درست کی۔
"آپ دیکھ لیجئے، کوئی کمی رہ گئی ہو تو مجھے ابھی بتا دیجئے۔" سلیم نے بھرا ہوا فارم ملک آفتاب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ امیگریشن ایجنٹ نے دیکھے بغیر اپنی دراز میں رکھ لیا۔
"میں جب کیس تیار کروں گا تو دیکھ لوں گا۔ آپ یہ ہفتہ چھوڑ کر اگلے ہفتے کی صبح گیارہ بجے آ جاؤ۔ آپ کی چھٹی ہو گی، میرے پاس بھی رش نہیں ہو گا۔ اس لئے آرام سے بیٹھ کر ہر نکتے کا اچھی طرح جائزہ لیں گے۔ آپ دستخط کر دو گے تو پیر کو بسم اللہ کر کے کیس فائل کر دیں گے۔" امیگریشن ایجنٹ کے بیان پر سلیم کی تسلی ہوئی۔ دونوں ملک آفتاب سے ہاتھ ملا کر دفتر سے نیچے اتر آئے۔ نیچے اتر کر بشیر کو کچھ یاد آگیا۔ اس نے سلیم سے کہا کہ وہ امیگریشن ایجنٹ سے کچھ بات کر کے ابھی آتا ہے۔ نیچے حلال گوشت کی دکان ابھی تک کھلی ہوئی تھی۔ سلیم کو بھی یاد آیا کہ گھر میں گوشت ختم ہو گیا ہے۔ اس نے بشیر کو بتایا کہ وہ جب تک گوشت بنواتا ہے۔
بشیر اوپر آیا تو ملک آفتاب اپنی میز کے پیچھے کھڑا ہوا سلیم کے دیئے ہوئے نوٹ گن رہا تھا۔
"ابے گن کیا رہا ہے۔ وہ بہت ایماندار چھوکرا ہے۔ زیادہ ہوں گے کم نہیں ہوں گے۔" بشیر کی بات سن کر ملک آفتاب کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔
"آج کل مالک کوئی پتہ نہیں۔ معصوم صورت والے اندر سے بڑے جلاد نکلتے ہیں۔"
"فلمی ڈائیلاگ مت بول۔ میرا حصہ نکال۔" بشیر نے اس کے ہاتھوں میں دبے ہوئے نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ملک آفتاب نے ہاتھ فوراً کھینچ لیا۔
"مالک کیا جلدی ہے۔ اگلے ہفتے وہ ایک ہزار کی دوسری قسط لائے گا وہ ساری تم لے لینا۔ میری رقم کیوں توڑتے ہو؟"
"تیرا کوئی بھروسہ نہیں کب بھاگ جائے۔ اعوان والے تیرے پیچھے پڑے

ہیں' مجھے معلوم ہے وہ تجھے چھوڑیں گے نہیں۔ لا جلدی سے نکال۔ میرا پنٹر نیچے انتظار کر رہا ہے۔"

"مالک یہ دو سو لے لو' آج جمعرات ہے' مجھے تنخواہ دینی ہے' دفتر کا کرایہ ادا کرنا ہے' اگلے ہفتے حساب برابر کر لینا۔" ملک آفتاب نے پچاس پچاس کے چار نوٹ بشیر کی طرف بڑھاتے ہوئے باقی پیسے اپنی جیب میں رکھ لئے۔ بشیر کے لئے اب صبر کرنا مشکل تھا۔ اس نے ملک آفتاب کی ٹائی پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ امیگریشن ایجنٹ اپنا گلا گھٹنے سے بچنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے قمیض کا کالر پکڑ کر آگے کی طرف جھک آیا۔ بشیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا پھنکارا۔

"مالک مالک کر کے مجھے بیوقوف مت بنا۔ میں تجھے اٹھا کر اس کھڑکی کے نیچے پھینک دوں گا' تیرے لئے کوئی گواہی دینے بھی نہیں آئے گا۔" بشیر نے اس کے بعد دو تین جھٹکے اور دے کر اسے چھوڑ دیا۔

"دلے کے بچے میری ٹائی خراب کر دی۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی خریدی تھی۔ سالا ہاتھ بھی نہیں دھوتا۔ سارا میل ٹائی پے لگا دیا۔" ملک آفتاب اپنی ٹائی سہلاتا ہوا بڑبڑایا۔ بشیر نے پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ملک پیچھے سرک کر اس کی پہنچ سے باہر ہو گیا تھا اور جیب سے نوٹ نکال کر گن رہا تھا۔

"گن لے پورے پانچ سو ہیں۔" اس نے میز پر بشیر کی طرف نوٹ پھینکتے ہوئے کہا۔

"مالک یہاں اعتبار کا سودا ہوتا ہے۔ آپ نے گن لئے کافی ہیں۔" بشیر نے نوٹ اٹھاتے ہوئے امیگریشن ایجنٹ کے لہجے کی نقل کی اور جاتے ہوئے بولا "آئندہ میرا حصہ دیتے ہوئے چیں چیں کی تو ٹائی نہیں چہرہ خراب کر دوں گا۔" اور یہ مٹھائی کا ڈبہ اٹھا کر پھینک دے۔ ایک مہینے سے ابھی ابھی کوئی دے کر گیا ہے کی رٹ لگا کر کھلا رہا ہے۔ نیا ڈبہ منگا لے ورنہ کسی کو ہیضہ ہو جائے گا۔" بشیر سیکرٹری کو ٹاٹا کرتا ہوا نیچے اتر گیا۔ سیکرٹری جھگڑے سے بے نیاز اپنے ناخنوں کی پالش صاف کر رہی تھی۔ اس کے لئے اس طرح کے جھگڑے روز کا معمول تھے۔ ملک آفتاب نے بشیر

کے جانے کے بعد دروازہ بند کر کے اندر سے لاک کیا اور پلٹ کر سیکریٹری کی طرف بڑھ گیا جس نے ناخنوں کی صفائی چھوڑ کر ہونٹوں پر بہت قاتل سی مسکراہٹ سجا لی تھی۔

بشیر نیچے اترا تو سلیم گوشت کٹوا چکا تھا۔ ٹیکسی میں بشیر نے پہلے سلیم کو اس کے گھر اتارا اور پھر آگے چلا گیا۔ اس دفعہ ٹیکسی کا کرایہ سلیم کو نہیں دینا پڑا تھا۔ لیکن اس نے غیر قانونیوں کے ایک اور اصول کی خلاف ورزی کی تھی اسے بتایا گیا تھا کہ گھر کا پتہ صرف فلیٹ میں رہنے والوں کے مشترکہ اور قریبی دوستوں کے علاوہ کسی کو نہیں بتانا۔ سلیم کو یہ اصول بھی یاد تھا۔ لیکن اس نے یہ سوچ کر کندھے اچکا دیئے کہ اب بشیر سے زیادہ قریبی دوست کون ہو گا۔

سلیم دو ہفتوں بعد ٹھیک گیارہ بجے امیگریشن ایجنٹ کے دفتر پہنچ گیا۔ دفتر کے دروازے سے ملک آفتاب احمد کا بورڈ غائب تھا اور اس کی جگہ کرائے کے لئے خالی ہے کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ سلیم کے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ آس پاس کے سارے دفتر بند تھے صرف ٹریول ایجنسی کھلی تھی جس میں ایک آدمی میز کے پیچھے بیٹھا کسی سے فون پر عربی میں باتیں کر رہا تھا۔ سلیم آدھے گھنٹے تک فون پر اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ سلیم نے اس سے پڑوس کے دفتر کے بارے میں پوچھا تو اس نے کندھے اچکا کر لاعلمی ظاہر کی اور دوبارہ فون کا نمبر گھمانے لگا۔ سلیم کا خیال تھا کہ شاید اس نے دفتر تبدیل کر لیا ہو اس لئے وہ دفتر کے قریب جا کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ شاید کہیں نئے دفتر کے پتے کا نوٹس لگا ہو۔ لیکن To Let کے بورڈ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دروازے کے باہر ایک بڑے سے ڈبے میں کاغذوں کا انبار پڑا تھا۔ شاید دفتر کے مالکوں نے صفائی کر کے پرانے کرائے دار کا کوڑا کرکٹ پھینکا تھا۔ ڈبے میں پڑے ہوئے کاغذوں کو دیکھتے ہوئے ان میں ایک جانی پہچانی تحریر نظر آئی۔ سلیم نے کاغذ جھاڑ کر نکالا تو یہ وہی فارم تھا جو سلیم نے بھر کر ملک آفتاب کو دیا تھا۔ ڈبے میں ایسے فارموں کا ایک انبار تھا جن پر جانے کس کس نے اپنے قلم سے مستقبل کے سنہرے محل تعمیر کئے تھے۔ سلیم کاغذ کو ہاتھ میں مروڑتا ہوا آہستہ آہستہ قدموں سے

نیچے اتر گیا۔ پہلے اس نے سوچا تھا حلال گوشت کی دکان سے معلوم کرے گا۔ لیکن اب کسی سے کچھ پوچھنا بیکار تھا۔ وہ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ حلال گوشت کی دکان سے وہ لڑکی نکلتی دکھائی دی جو امیگریشن ایڈوائزر کے دفتر میں سیکریٹری بنی بیٹھی تھی۔ سلیم اسے دیکھتے ہی تیزی سے اس کی طرف بڑھا وہ بھی سلیم کو ٹھٹھک گئی۔

"تم نے مجھے پہچانا۔ میں پچھلے ہفتے تمہارے دفتر آیا تھا۔ تمہارا نام شاید مونی ہے۔" سلیم نے تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ شاید تم بھی ان میں سے ہو جنہیں ملک نے ٹھگا تھا۔ وہ بھاگ گیا اب نہیں آئے گا۔ اپنے پیسوں پر فاتحہ پڑھ کر اب کوئی اور دروازہ دیکھو۔" لڑکی نے کہا۔ اس کے چہرے پر بہت بیزاری آ گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ جاتی سلیم جلدی سے بولا۔ "لیکن وہ گیا کہاں ہے میں نے اسے پورے ایک ہزار ڈالر دیئے تھے۔ مجھے اس کے گھر کا پتہ بتا دو۔ تمہیں ضرور پتہ ہو گا۔ تم اس کی سیکریٹری تھیں۔" سلیم نے بہت عاجزی سے کہا۔

"میں کچھ نہیں تھی۔ اور شکر کرو تمہارے صرف ایک ہزار گئے ہیں کئی ایسے ہیں جن سے پانچ پانچ ہزار لے کر بھاگا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ فریب اس نے مجھے دیا ہے۔ کہتا تھا شادی کروں گا۔ چھ مہینے سے بیوقوف بنا رہا تھا۔ مفت میں اس کی سیکریٹری بنی رہتی تھی۔ رسیدیں بھی مجھ سے اور میرے دستخطوں سے بنواتا تھا۔ سب غیر قانونی ہیں۔ کسی کی پولیس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ورنہ میں بری طرح پھنس گئی تھی۔" مونی نے کہا اور پلاسٹک کا نیا تھیلا جس میں حلال گوشت لے کر نکلی تھی ہلاتی ہوئی جانے کے لئے قدم اٹھانے لگی۔ سلیم بھی اس کے ساتھ قدم ملانے لگا۔

"تم یہیں نزدیک رہتی ہو۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" مونی نے اسی طرح چلتے ہوئے جواب دیا۔

"تم بھی حلال گوشت کھاتی ہو۔" سلیم نے ذرا حیرت ظاہر کی۔

"ہم فیجی کے مسلمان ہیں۔ میرا نام میمونہ ہے لیکن سب پیار سے مونی کہتے ہیں۔"

"تمہارے پاس اگر وقت ہو تو کہیں بیٹھ کر کافی پئیں۔" سلیم کو جانے کہاں سے حوصلہ آ گیا تھا۔ مونی ایک دم ہی ٹھہر گئی۔ غصہ سے سرخ ہو کر اس کا چہرہ اور کالا ہو گیا تھا۔

"کافی کے بعد تم کل کھانے کی دعوت دو گے۔ پھر عشق کرو گے اور چند دن میں شادی کرنے کے لئے کہو گے۔ شادی کر کے پکی شہریت لگواؤ گے اور پھر چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔ میں تم لوگوں کو اب خوب جان گئی ہوں۔ میری بہن مجھے پہلے ہی سمجھاتی تھی کہ پاکستانیوں کے چکر میں مت آنا لیکن میں بیوقوف بنتی رہی۔ میں سمجھتی تھی کہ میری بہن مجھ سے جلتی ہے لیکن میری آنکھوں کی پٹی اب کھل گئی ہے۔ میں تم لوگوں کا سایہ بھی اپنے اوپر نہیں پڑنے دوں گی۔ جاؤ کسی اور بیوقوف کو تلاش کرو۔" مونی یہ کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ کر سڑک پار کرنے کے لئے بتی کے سبز ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ سڑک پار کرنے سے پہلے سلیم کو دیکھے بغیر اس نے زمین پر بہت زور سے تھوکا تھا۔ سلیم کو ایسا لگا جیسے اس کا پورا چہرہ گیلا ہو گیا ہو۔ اس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ نہ صرف ایک ہزار ڈالر کھوئے تھے بلکہ جعلساز امیگریشن ایڈوائزر کے کئے پر ذلت کا نشانہ بھی بننا پڑا تھا۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ بھی آگے بڑھ کر سرخ بتی کے سبز ہونے کا انتظار کرنے لگا' لیکن جس طرف مونی گئی تھی اس سے بالکل مختلف سمت میں۔

سلیم بالکل خالی الذہن ہو کر بھٹکے ہوئے کسی مسافر کی طرح گلی گلی پھرتا رہا۔ تھوڑی دیر اسی طرح وہ آوارہ گردی کرتا ہوا گھر لوٹ گیا۔ ظہور اور چودھری انور اپنے اپنے کام پر جانے کی تیاری کر رہے تھے اقبال ٹانگیں پھیلائے ویڈیو پر امیتابھ بچن کی کوئی پرانی فلم دیکھ رہا تھا۔

"منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔ خیریت تو ہے۔" ظہور نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ سلیم صرف "کچھ نہیں۔" کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور کپڑے تبدیل کر کے آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ ظہور اور چودھری انور دونوں کو اس وقت دریافت حال کی فرصت نہیں تھی۔ ہفتہ دونوں کے لئے کام کا سب سے مصروف دن ہوتا تھا۔ اس دن

ٹیکسی کی مانگ زیادہ ہوتی تھی اور ریسٹورنٹ میں گاہکوں کا رش بھی زیادہ ہوتا تھا۔ وہ دونوں چلے گئے تو تھوڑی دیر میں سلیم بھی کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ فلم اس وقت اختتامی موڑ پر پہنچ گئی تھی جب اکیلا اور نہتا ہیرو دس بارہ مسلح آدمیوں کی زبردست ٹھکائی کر رہا تھا۔ فلم کا یہ منظر اس وقت سلیم کو بہت اچھا لگا۔ برائی کے منہ پر اچھائی کے یہ گھونسے اسے حوصلہ دے رہے تھے۔ گھونسے لاتیں چلانے والوں میں وہ بھی شامل ہو گیا۔ لیکن اس کے گھونسوں کی زد میں بار بار صرف ایک ہی چہرہ آ رہا تھا۔ امیگریشن ایڈوائزر ملک آفتاب کا چہرہ۔ ایک دفعہ بشیر احمد سامنے آیا لیکن سلیم نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ یہ تو میرا ہمدرد ہے۔ میرا دوست ہے۔ لیکن یہ ملک آفتاب کا بھی تو دوست ہے۔ سلیم الجھن میں پڑ گیا۔ اتنے میں وہ چہرہ غائب ہو گیا اور ملک آفتاب پھر سامنے آگیا اسے ایک اور گھونسا جڑ کے سلیم سوچنے لگا اس کے دشمن اور کون کون ہیں وہ کس کس کو مار مار کر اپنے انجام کو پہنچا سکتا ہے۔ بہت یاد کرنے پر بھی کوئی چہرہ سامنے نہیں آیا۔ یونیورسٹی میں اس کے ڈپارٹمنٹ کا سربراہ پروفیسر وہائٹ' اس کا سویڈن چلے جانے والا سپروائزر تھیو۔ لیکن یہ تو دشمن نہیں تھے۔ دشمن تو حالات تھے بہت سوچنے پر بھی حالات مجسم ہو کر' ایک ایسا چہرہ بن کر اس کے سامنے نہ آسکے کہ انہیں ایک تھپڑ رسید کر کے وہ خوش ہو سکتا۔ اقبال سلیم کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ فلم کب کی ختم ہو چکی تھی لیکن سلیم اسی طرح ٹی وی کی اسکرین پر نظر جمائے ہوئے تھا۔

"کیا بات ہے آج بہت گم سم اور غائب ہو۔ گھر سے بھی صبح ہی نکل گئے تھے۔ پاکستان میں تو سب خیریت ہے۔" اقبال نے سلیم کو اس طرح کھویا کھویا دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" سلیم نے ٹالنا چاہا۔ لیکن پھر سوچا کہ کسی نہ کسی کو تو بتانا ہی ہو گا۔ اس نے پہلے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے ساتھ رہنے والے تینوں دوستوں کو بتا کر شرمندہ نہیں ہو گا۔ لیکن اگر اس نقصان کو دل ہی دل میں چھپائے رہا تو سچ مچ بیمار ہو جائے گا۔ پھر اقبال اس سلسلے میں بات چیت کے لئے سب

سے مناسب آدمی تھا۔ اس کے رابطے بہت اچھے تھے غیر قانونیوں کے معاملات پر اتھارٹی تھا۔ بیشتر لوگوں کو جانتا تھا۔ کب کہاں کیا ہو رہا ہے' اقبال کو سب معلوم رہتا تھا۔ ظہور اسے اپنے اس چھوٹے سے گھر کی ریاست کا انفارمیشن منسٹر کہا کرتا تھا۔

"تم امیگریشن ایڈوائزر ملک آفتاب احمد کو جانتے ہو۔" سلیم نے تھوڑے سے توقف کے بعد پوچھا۔

"اس نو سرباز کو کون نہیں جانتا۔ امیگریشن دلانے کے بہانے بہت سے لوگوں کو لوٹا ہے۔ لاکھوں ڈالر کمائے ہیں' لیکن ابھی تین چار روز پہلے ہمیشہ کے لئے بھاگ گیا ہے۔ میں نے سنا ہے بنکاک چلا گیا ہے' وہاں اس کا ایک پارٹنر ہے جس کے ساتھ وہ جعلی پاسپورٹوں اور ویزے کا کام کرتا تھا۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ کہیں تم بھی تو اسے پیسے نہیں دے آئے۔" سلیم اقبال کی معلومات پر حیران رہ گیا۔ سلیم تو ہزار ڈالر دینے کے بعد جان سکا تھا۔ اقبال کو پہلے سے سب کچھ معلوم تھا۔ ظہور اسے بلاوجہ وزیر اطلاعات نہیں کہتا تھا۔

"میں نے پچھلے ہفتے ملک آفتاب کو اپنا ریفیوجی کا کیس ڈالنے کے لیے دیا تھا۔ ایڈوانس کے ایک ہزار ڈالر بھی دیئے تھے۔ اس نے آج بلایا تھا۔ صبح اس کے دفتر گیا تو وہ خالی پڑا تھا۔" سلیم نے بڑے دھیمے لہجے میں ڈرتے ڈرتے اقبال کو بتایا۔

اقبال ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ "اور تم اب بتا رہے ہو۔ پیسے دینے سے پہلے پوچھنے میں شرم آتی تھی۔ لگتا ہے تمہارے پاس پیسے بہت ہو گئے ہیں۔ اسی طرح لٹانے کا شوق ہے تو زکوٰۃ خیرات دو۔ ثواب بھی ملے گا۔ ملک آفتاب کو تو آج کل کوئی ایک ڈالر دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا پول کھل گیا تھا وہ چھوت کی بیماری بن گیا تھا۔ اس پر شبہ تھا کہ وہ جعلی ڈگریاں بناتا ہے۔ امیگریشن والوں نے بڑی سخت پوچھ گچھ کرنے کے بعد اس کا لائسنس معطل کر دیا تھا۔ اسے زیادہ ڈر اعوان والوں سے تھا۔ ملک ان کے کئی آدمیوں سے پیسے لے کر کھا گیا تھا۔ نہ پیسے واپس کرتا تھا نہ کیس داخل کرتا تھا۔ انہوں نے اسے چند دنوں کی مہلت دی تھی ورنہ کہا تھا کہ غائب کر دیں گے۔ لیکن تم کیسے پھنس گئے۔ یقیناً" اس کے

کسی ایجنٹ نے پھنسایا ہو گا۔ تمہیں اس کے پاس کون لے گیا تھا۔" اقبال نے ایک دم اتنے سارے سوال کر لئے تھے۔

"یونیورسٹی میں کسی نے اس کا پتہ بتایا تھا۔" سلیم بشیر کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"تم نہیں بتانا چاہتے نہ بتاؤ۔ لیکن آئندہ کسی ایسے معاملے میں پھنسنے سے پہلے پوچھ لیا کرو۔ تم ان معاملات کو اور ان لوگوں کو بالکل نہیں جانتے۔ خود بھی پھنسو گے ساتھ میں ہمیں بھی مرواؤ گے۔" اقبال یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ظہور بھائی اور چودہری انور کو مت بتانا' مجھے شرمندگی ہو گی۔" سلیم نے گھگیاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بتاؤں گا۔ لیکن وعدہ کرو آئندہ مجھ سے پوچھے بغیر کسی فراڈ کے پاس نہیں جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے۔" سلیم نے وعدہ کیا اور اقبال فلمیں واپس کر کے نئ فلمیں لانے گھر سے نکل گیا لیکن بشیر کے بارے میں سلیم کو شبہات کا شکار کر گیا۔ ملک آفتاب کے بارے میں سارا شہر جانتا تھا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بشیر کو نہ پتہ ہو۔ بشیر تو اڑتی چڑیا کے پر گننے کا دعویٰ کرتا تھا۔ عقل یہی کہتی تھی کہ بشیر بری خبر ہے۔ اس سے بچو۔ لیکن سلیم کا دل نہیں مانتا تھا۔ اس نے سوچا کہ بشیر کو فون کرے۔ لیکن بشیر سے رابطہ کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آج کوشش کرے گا تو ہفتے دو ہفتے میں جواب آئے گا۔ پھر بھی اسے فون تو کرنا تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اقبال کے کسی دوست کا فون ہو گا۔ اس گھر میں آنے والی زیادہ تر فون کالیں اقبال کے لئے ہوتی تھیں۔ لیکن دوسری طرف سے آتی ہوئی آواز کو سن کر سلیم اچھل پڑا

"مبارک ہو تمہارے ہزار ڈالر بچ گئے۔" یہ بشیر تھا جو بہت چہکتی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔

"بچ گئے......؟ بشیر بھائی آپ کا دوست تو ملک چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کا دفتر

خالی پڑا ہے۔ میرے تو کئی ہزار ڈالر پانی ہو گئے۔ آپ کہہ رہے ہیں بچ گئے۔" سلیم نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"وہ میرا دوست نہیں بس جاننے والا تھا۔ لیکن تم فکر مت کرو میں اس حرام کے نطفے کو چھوڑوں گا نہیں۔ پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ اس نے تمہارے نہیں میرے پیسے کھائے ہیں۔ لیکن جو گئے وہ گئے ان پر مٹی ڈالو۔ یہ شکر کرو کہ تم آج جو ہزار ڈالر اسے دینے والے تھے وہ بچ گئے۔ اگر وہ کل بھاگتا تو تمہارے یہ ہزار ڈالر بھی تیل ہو گئے ہوتے۔" سلیم نے اس طرح تو سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ آج واقعی ہزار ڈالر جیب میں ڈال کر دینے گیا تھا اس نے سوچا کہ بشیر کا یہی کمال ہے کہ وہ ہمیشہ مثبت انداز میں سوچتا ہے۔ نفی کو بھی جمع بنا دیتا ہے۔ بشیر کے بارے میں اس کے دماغ میں شک کی جو دھند جمع ہونے لگی تھی وہ ایک دم ہی چھٹ گئی۔

"لیکن بشیر بھائی اب کیا ہو گا۔ میرے قانونی ہونے کا کیا بنے گا۔ میرے پاس تو صرف ہزار ڈالر بچے ہیں۔ اتنے پیسوں میں کوئی اور وکیل کیسے کیس فائل کرے گا۔" پریشانی کے بادل سلیم کے ذہن پر ابھی تک سایہ کئے ہوئے تھے۔

"اس کی فکر مت کرو۔ بس ہزار ڈالر دانتوں میں دبائے رہو۔ میں نے تمہارے لئے لیزا کی ایک سہیلی سے بات کر لی ہے۔ اس سے تمہاری کاغذی شادی کرا کے تمہارا کیس فائل کر دیں گے۔ کوئی پیسہ بھی خرچ نہیں ہو گا' وکیل کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ سمجھو تم جو پانچ ہزار ڈالر خرچ کرنے والے تھے وہ پورے کے پورے بچ گئے۔ میں نے تمہیں اسی لئے فون کیا تھا۔ کل اتوار کا دن ہے' تمہاری چھٹی ہے۔ تم شام کو پانچ بجے بلیز کارنر میں آ جانا۔ لیزا کے ساتھ اس کی دوست ایلن بھی آئے گی۔ تمہارا ٹانکا کرا دیں گے۔ اگلے ہفتے ہی شادی کرا کے کیس فائل کر دیں گے۔ تین مہینے میں پکے ہو جاؤ گے۔" بشیر نے سلیم کے لئے خوابوں کی دنیا سجا کر فون بند کر دیا۔ سلیم کا دل چاہا کہ "وہ مارا۔" کا نعرہ لگا کر چھلانگیں لگائے۔ بشیر واقعی صحیح دوست تھا۔ اس نے پیسہ خرچ کئے بغیر اسے قانونی بنوانے کا انتظام کر دیا تھا۔

سلیم جب پانچ بجے بلیز کارنر پہنچا تو بشیر اس وقت تک آیا نہیں تھا۔ کنگز

کراس کی گلیوں میں پھرنے کے مقابلے میں اسے بار میں بیٹھ کر انتظار کرنے میں عافیت نظر آئی۔ شام کے سائے گہرے نہیں ہوئے تھے اس لئے بار میں رش اور ڈانس کے لئے میوزک بجنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ سلیم کو ایک گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا۔ اس عرصے میں کوک کے تین گلاس پی چکا تھا اور اس بات پر کڑھ رہا تھا کہ اس بار میں کوکا کولا بھی شراب کے بھاؤ ملتی تھی۔ چھ بجے بشیر دو عورتوں کے ساتھ داخل ہوا۔ دونوں تقریباً ایک ہی قد و قامت کی تھیں۔ ایک کے بال مردانہ انداز میں چھوٹے کٹے ہوئے تھے۔ صرف ایک کان میں کراس کی شکل کی بالی پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں مالا تھی جو کالے رنگ کے دھاگے میں پلاسٹک کے رنگ برنگے دانے پرو کر بنائی گئی تھی۔ اس نے میلی سی ایک جینز اور اس کے اوپر کالے رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ لیکن دوسری لڑکی ایک مکمل شاہکار تھی۔ اس نے سر کے بال بالکل صاف کئے ہوئے تھے۔ کانوں میں لو سے لے کر اوپر تک چھوٹی چھوٹی بالیوں کی قطار ٹنگی ہوئی تھی۔ ایک بالی ناک میں بھی تھی۔ ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیوں میں کالے ہوتے ہوئے اسٹیل کی انگوٹھیاں اور دوسرے ہاتھ میں انہیں سے ملتا جلتا ایک چوڑا کڑا تھا۔ گلے میں کچھ نہیں تھا۔ لمبی گھیردار کالی اسکرٹ اور اس پر سفید رنگ کی ٹی شرٹ تھی۔ دونوں کی ٹی شرٹوں پر "مارڈی گرا" لکھا ہوا تھا۔ سڈنی میں ہونے والا دنیا بھر کے ہم جنس پرستوں کا یہ میلہ ابھی پچھلے مہینے ہی ختم ہوا تھا۔ یہ مارڈی گرا کہلاتا تھا' لاکھوں لوگ ہم جنس پرستوں کی اس پریڈ میں شرکت کرتے۔ عورت بنے ہوئے مردوں کو دیکھ کر عورتوں کی خوبصورتی بھی شرماتی تھی۔ سلیم کو معلوم نہیں تھا کہ بشیر کے ساتھ آنے والوں میں اس کی بیوی لیزا کون سی ہے اور ایلن کون سی۔ لاٹری کا نتیجہ اس وقت معلوم ہوتا جب بشیر تعارف کراتا۔ سلیم دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ گنجی لڑکی بشیر کی بیوی لیزا ثابت ہو۔ لیکن آج کل اس کے ستارے خراب تھے۔ بشیر نے تعارف کرایا تو گنجی لڑکی ایلن نکلی جس سے بشیر سلیم کی شادی طے کرانے والا تھا۔ دونوں نے بغیر ہاتھ ملائے بڑی بیزاری سے ہائے ہیلو کی تھی بشیر انہیں لے کر بلیز کارنر کی اوپری منزل کی طرف چلا جہاں روشنی بہت کم تھی اور میزیں بھی تقریباً خالی

تھیں۔ اوپر کا بار بھی ابھی تک نہیں کھلا تھا۔

"تم نے پینی شروع کی یا ابھی تک مولوی ہو۔" بشیر نے ایک میز سنبھالتے ہوئے کہا۔ سلیم اسے کوک کا گلاس دکھا کر جھینپی ہنسی ہنسنے لگا۔

"ٹھیک ہے تو بھاگ کر نیچے سے "وی بی" کے تین گلاس پکڑ لاؤ۔" بشیر نے حکم چلایا۔ سلیم دو ہاتھوں میں بیئر کے تین گلاس بمشکل اٹھائے ہوئے آیا تو ایلن کے سوا کسی نے شکریہ نہیں کہا۔ ایلن بھی منہ ہی منہ میں منمنائی تھی فون پر تو اس نے بڑے شائستہ لہجے میں گفتگو کی تھی لیکن اس وقت اس کی تھکی تھکی سی آواز برسوں سے جاگی ہوئی لگتی تھی۔

"اس کے حلیئے پر مت جاؤ۔" بشیر نے ایلن کے بارے میں بتایا۔ "بہت پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ ایم بی اے کر کے مارکیٹنگ کی کسی بڑی کمپنی میں کام کرتی تھی لیکن اچانک انقلابی ہو گئی۔ انقلاب تو ختم ہو گیا اب "مارڈی گرا" کی مارکیٹنگ میں مدد کرتی ہے اور باقی وقت منشیات کے نشے میں مگن رہتی ہے۔ اس وقت دونوں کا نشہ اکھڑا ہوا ہے اس لئے تمہیں بیزار لگ رہی ہے۔" بشیر نے بیئر کے گھونٹ لے کر ایلن کے بارے میں سلیم کی بے چینی دور کرنی چاہی۔

"لیکن بشیر بھائی یہ تو بالکل...... بالکل....."

"بالکل کیا......" بشیر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بالکل گنجی ہے۔" سلیم کی سمجھ میں بس یہی جواب آ سکا۔

"اب تمہارے لئے زلف بنگال کہاں سے لاؤں۔ یہ آسٹریلیا ہے آسٹریلیا۔ یہاں عورتوں بالوں سے نہیں ناپی جاتیں۔ نیک بی بی پروین آج کل پاکستان میں بھی نہیں ملتی۔ یہاں کہاں ملے گی۔" بشیر نے بہت کھردرے لہجے میں کہا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میرا مطلب تھا........."

"مطلب وطلب چھوڑو۔ مجھے دو سو ڈالر دو تو ان کا موڈ ٹھیک کرنے کا بندوبست کروں۔ ایلن جب بھی آتی ہے ہمارا چرس کا خرچ بڑھ جاتا ہے۔" بشیر نے ایک بار پھر سلیم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"دو سو ڈالر چرس کے لئے......؟" سلیم نے حیرت ظاہر کی۔

"نہیں۔ جس سے لیتے ہیں اس پر دو سو کا ادھار چڑھا ہوا ہے۔ ادھار چکائے بغیر وہ نیا سودا نہیں کرے گا۔" بشیر نے سلیم کی طرف ہاتھ بڑھا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ سلیم کے لئے اس نے کسی اور جواب کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ سلیم نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر انگلیوں سے دو سو ڈالر گنے اور نکال کر بشیر کو دیتے ہوئے منمنایا۔

"بس یہی بچے ہیں۔" بشیر اس کے ہاتھ سے پیسے جھپٹ کر نیچے اتر گیا۔ لیزا اور ایلن اس کے وجود سے جیسے بے خبر سگریٹ پیتی ہوئی بیئر کے گھونٹ لے کر برے برے منہ بنا رہی تھی۔ ایک دفعہ ایلن نے لیزا کے کان میں جھک کر کچھ کہا جس پر دونوں بے ساختہ ہنس پڑیں۔ سلیم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے دونوں نے اس کا مذاق اڑایا ہو۔ یہ شاید اس کے اپنے دل کا چور تھا۔ دونوں کو یہ یاد بھی نہیں تھا کہ ان کی میز پر کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔ سلیم اسی طرح اپنی بچی ہوئی کوک سے کھیلتا رہا۔ اس کا بیئر کی قیمت پر ایک اور کوک خریدنے کا موڈ نہیں تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد بشیر واپس آ گیا۔ اسے آتا دیکھتے ہی لیزا اور ایلن کے چہرے پر رونق دوڑ گئی تھی۔ بشیر نے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی تھیلی ان کے حوالے کی۔ وہ دونوں تیزی سے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئیں۔

"ایلن کیا آپ کے ہی پاس رہتی ہے۔" سلیم نے اپنی مجوزہ بیوی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہی۔

"مارڈا گرا کے لئے مہینے بھر سے ہمارے پاس آئی ہوئی تھی۔ ہمارا فلیٹ شہر میں ہے اس لئے اسے آسانی رہتی ہے۔ وہ خود بلیو ماؤنٹین میں رہتی ہے۔ کہتی ہے کہ پہاڑوں میں اسے بہت سکون ملتا ہے۔ لیکن شہر سے اس کا گھر دو گھنٹے کی دوری پر ہے۔ اس لئے جب شہر آتی ہے تو دو تین روز ہمارے پاس رہتی ہے۔ مارڈی گرا ختم ہو چکی ہے لیکن اسے لیزا سے عشق ہے اس لئے مارڈی گرا کا نشہ اس کے ساتھ ہی اتار رہی ہے۔ عشق کرتی ہے اس سے۔ تم سے شادی کرے گی لیکن سوئے گی لیزا

کے ساتھ۔" بشیر نے ایک زور کا قہقہہ لگا کر بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ وہ اوپر آتے ہوئے اپنے لئے ایک بیئر اور لیتا آیا تھا۔

لیزا سے ایلن کے عشق کا مظاہرہ دیکھ کر سلیم کو اپنا مستقبل ہلتا ہوا نظر آیا۔ دونوں باتھ روم سے واپس آئیں تو ان کے چہرے کی رونق بحال ہو چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے نیا خون چڑھوا کر آئی ہوں۔ لیکن ان کے موڈ کا ٹھیک ہونا سلیم کے لئے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ وہ آپس میں خود ہی اٹھ کھیلیاں کر کے خوش ہو رہی تھیں۔ واپس آ کر میز کے گرد بیٹھتے ہوئے ایلن نے سلیم کے گال پر ایک بوسہ دے کر بہت شائستگی سے شکریہ کہا تھا۔ یہ مظاہرہ شاید اس لئے تھا کہ اس نے سلیم کو پیسے نکال کر بشیر کو دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے نشے کی خوراک نے آج کس کی جیب کاٹی ہے۔ لیکن اس کے بعد دونوں کے لئے سلیم کا وجود پھر سے عدم ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے کاندھے پر بازو ٹکائے ہوئے تھے۔ یہاں تک غنیمت تھا لیکن تھوڑی دیر بعد لیزا اور ایلن ایک دوسرے کو لپٹا کر پیار کرنے لگی تھیں۔ بالکل ایسا پیار جیسا مرد عورت سے کرتا ہے۔ ہونٹ سے ہونٹ اور زبان سے زبان لپٹی ہوئی۔ سلیم شرم سے گڑا جا رہا تھا۔ عورتوں کے آپس میں بوس و کنار کا منظر اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ لیکن بشیر بے حیائی سے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے بیئر کی چسکیاں لے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا سب کچھ اس کی سرپرستی میں اور رضامندی کے ساتھ ہو رہا ہو۔ آس پاس کی چند میزوں پر جو لوگ بیٹھے تھے وہ اپنے اپنے بوسے گرم کر رہے تھے۔ کسی کو ایک دوسرے کو دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

"بشیر بھائی یہ کیا ہو رہا ہے۔" سلیم نے بشیر سے پوچھ ہی لیا۔

"تم نے پیسہ پھینکا ہے اب تماشا بھی دیکھو۔" بشیر نے ہنستے ہوئے بیئر کا ایک لمبا گھونٹ لیا اور پھر تھوڑے سے توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ "پہلے مجھے نہیں معلوم تھا کہ لیزا لزبین (ہم جنس پرست) ہے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ دونوں شوق رکھتی ہے۔ لیکن اس کا پہلا شوق وہی ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔ شروع میں میرے ساتھ اس طرح رہی کہ مجھے احساس تک نہ ہوا۔ لیکن جب ایلن آ جائے تو پھر وہ

صرف ایلن کی ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں بیڈ میں ہوتی ہیں میں صوفے پر سوتا ہوں اور سوتا بھی کہاں ہوں کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ شروع میں تو برداشت کرتا رہا لیکن جب ایلن آتی ہے تو میں اپنی گرل فرینڈ کے پاس چلا جاتا ہوں اور رات اسی کے پاس گزارتا ہوں۔"

"آپ کی گرل فرینڈ!" سلیم نے درمیان میں اسے ٹوک کر اپنی حیرت ظاہر کی۔

"نیچے کے بار میں تم نے لمبے قد والی بار ٹنڈر دیکھی ہو گی۔" سلیم نے دیکھی تھی۔ اسے ہر دفعہ کوک اسی نے نکال کر دی تھی۔ وہ کالے رنگ کی منی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ چھوٹی اسکرٹ نے ٹانگیں اور لمبی کر دی تھیں۔ ہر بار کوک لیتے ہوئے سلیم کی آنکھیں بھٹکتی ہوئی اس کی ٹانگوں پر جم جاتیں۔

"وہ آج کل اپنے بوائے فرینڈ سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ میری اس سے کافی دنوں کی دوستی ہے اس لئے جب اس کی ڈیوٹی ختم ہوتی ہے تو لیزا کو میں ایلن کے ساتھ رخصت کر کے اس کے گھر چلا جاتا ہوں۔ لیزا اور ایلن بھی خوش میں بھی خوش، میری لمبی معشوق بھی خوش۔" بشیر صرف سلیم کی حیرتوں میں اضافہ کر رہا تھا۔

"لیکن آپ کی بیوی کو پتہ ہے۔" سلیم کی حیرتیں اب سوال کی شکل اختیار کر رہی تھیں۔

"اسے معلوم ہے۔ بالکل معلوم ہے جس طرح مجھے اس کے اور ایلن کے بارے میں معلوم ہے۔ شادی ہمارے لئے صرف ایک قانونی بندھن ہے۔ مجھے ابھی اپنی آسٹریلوی شہریت کا انتظار ہے۔ اس سے پہلے لیزا سے قانونی ناطہ توڑا تو وہ ہنگامہ کر سکتی ہے۔ لیزا کو پاکستان جانا ہے۔ وہ جانتی ہے مجھے زیادہ دیر باندھ کر نہیں رکھ سکے گی اس لئے اس نے مجھ پر دباؤ بڑھا دیا ہے۔ میں بھی اس کا یہ قرضہ اتار دینا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں نے پاکستان جانے کے لئے ٹکٹ خرید لئے ہیں۔ ہم شاید چلے بھی جاتے لیکن ایلن بیچ میں آ گئی وہ ابھی تک اسی لئے ٹھہری ہوئی ہے کہ لیزا کی جدائی سے پہلے کے لمحوں کا اچھی طرح حساب چکا سکے۔ مجھے بھی کچھ انتظامات کرنے ہیں۔ ہم شاید اگلے مہینے کسی وقت پاکستان روانہ ہو جائیں۔"

"لیکن بشیر بھائی میرے کیس کا کیا بنے گا۔" سلیم بھی ایک دم خود غرض ہو گیا۔

"فکر مت کرو، تمہارا بینڈ بجا کر اور تمہیں دولہا بنا کر جائیں گے۔ لیکن ایلن لیزا کی طرح دونوں شوق نہیں رکھتی۔ جنسی معاملے میں وہ صرف اور صرف عورت پرست ہے۔ اس لئے تمہیں میری طرح کوئی اضافی منافع حاصل نہیں ہو گا۔" بشیر نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ سلیم کچھ نہیں بولا۔ لیزا اور ایلن اسی طرح ایک دوسرے میں گم تھیں۔ بشیر کی بیئر بھی ختم ہو گئی تھی۔ اوپر کی منزل کا بار کھل چکا تھا لیکن بشیر پھر بھی نیچے جانے والی سیڑھیاں اترنے لگا۔ سلیم کی وہ کوک ختم ہو گئی تھی جس سے وہ بہت دیر سے کھیل رہا تھا۔ لیزا اور ایلن ملن کے ان لمحوں اور اردگرد پھیلی ہوئی تاریکی کا پورا فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ سلیم نظریں نیچی کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ نظریں چرا کر انہیں بھی دیکھ لیتا لیکن شرمندہ ہو کر پھر نظریں جھکا لیتا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ایلن سے اس کا معاملہ جمنے والا نہیں ہے۔ اس کے اور ایلن کے درمیان صدیوں کا فاصلہ تھا۔ امیگریشن والے تو ان معاملوں کے ماہر ہوتے ہیں کوئی اندھا بھی انہیں دیکھ کر شادی شدہ نہیں مان سکتا تھا۔ بشیر کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی، سلیم بھی اٹھ کر نیچے چلا گیا۔ بشیر بار کے کاؤنٹر پر بیئر پیتا ہوا اسی لمبی بار ٹنڈر سے باتیں کر رہا تھا جس کی ٹانگیں سلیم کو بھی پسند آئی تھیں۔ سلیم نے جب اسے بتایا کہ وہ جا رہا ہے تو اس نے سلیم کی طرف دیکھے بغیر اسے خدا حافظ کہا اور پھر لمبی بار ٹنڈر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سلیم کا خیال تھا کہ بشیر کے ساتھ اس کی دوستی کا کھیل ختم ہو گیا ہے۔ لیکن بلیز کارنر میں اتوار کی ملاقات کے تین روز بعد وہ جب کام ختم کر کے فیکٹری سے باہر نکلا تو بشیر گیٹ پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سلیم کو کچھ حیرت ہوئی۔ لیکن وہ بڑی خوش اخلاقی سے ہاتھ ملاتا اور اس کی اور لیزا کی خیریت پوچھتا ہوا اسے لے کر ایک نزدیکی گلی میں مڑ گیا۔

"تمہیں ایلن پوچھ رہی تھی۔" بشیر نے سلیم کو بتایا۔

"بشیر بھائی اس کے ساتھ میرا جوڑ چلے گا نہیں۔ امیگریشن میں ہم دونوں کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرے گا کہ ہم شادی شدہ ہیں۔ ویسے بھی وہ ہر وقت نشے میں رہنے والی ہے۔ کسی وقت بھی بھانڈا پھوڑ سکتی ہے۔ وہ نہیں پھوڑے گی تو خود بخود پھوٹ جائے گا۔ آپ کی بڑی مہربانی لیکن مجھے اس چکر سے محفوظ رکھئے۔ کوئی اور لڑکی دیکھئے یا کوئی اور راستہ نکالئے۔" سلیم نے بشیر کو صاف صاف بتا دیا۔

"ٹھیک ہے کسی اور کو دیکھ لیتے ہیں۔ وہ لمبی بار ٹنڈر کیسی رہے گی۔" بشیر نے آنکھیں مارتے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ تو آپ کی گرل فرینڈ ہے اور بہت..... لمبی بھی ہے۔" سلیم نے ذرا ہکلاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں امیگریشن لینا ہے کہ عشق کرنا ہے۔ وہ گنجی ہے۔ وہ لمبی ہے۔ وہ تیری معشوق ہے۔ وہ اس کی عاشق ہے۔ بھیئے یہاں کوئی کسی کا عاشق معشوق نہیں ہے۔ تم پیشاب کر کے واپس آؤ گے تو اس عرصے میں وہ کسی دوسرے کے ساتھ جا چکی ہو گی۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو اور جاگ جاؤ۔ دنیا بہت بدل گئی ہے۔"

"ایسا بھی نہیں ہے بشیر بھائی۔ اور میرا بھی مسئلہ گنجی یا لمبی کا نہیں ہے۔ لیکن کچھ توازن تو ہونا چاہئے۔ امیگریشن والے آنکھیں بند کر کے کسی کو بھی میری بیوی نہیں مان لیں گے۔" سلیم بحث کے موڈ میں تھا۔

"ٹھیک ہے کوئی اور ڈھونڈ لیں گے۔ کوئی چھوٹے قد کی لمبے بالوں والی ڈھونڈ لیں گے۔ لیکن آج میں کسی اور کام سے آیا تھا۔ مجھے اس وقت پانچ سو ڈالر چاہئیں۔" بشیر نے کہا اس کے قدم بھی رک گئے تھے۔

"اس وقت تو میرے پاس نہیں ہیں بشیر بھائی۔" سلیم نے صاف صاف منع کر دیا۔ بشیر کی دوستی کا پردہ سلیم کی آنکھوں سے اب آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔ اتوار کو بلیز کارنر میں اس نے بشیر کے ساتھ جو وقت گزارا تھا اس کے بعد اس نے بہت سوچا تھا۔ آج بشیر کی آمد اور پانچ سو ڈالر کا مطالبہ اس کا شک صحیح ثابت کر رہا تھا وہ بشیر کے لئے دودھ دینے والی گائے بن گیا تھا۔ اسے اب اس سے جان چھڑانی ہی

تھی۔

"نہیں ہیں؟" بشیر نے حیرت سے دہرایا۔ "ابے کل تک تو جیب میں ہزار ڈالر لئے گھوم رہا تھا۔ اس فراڈیئے ملک کو دینے کے لئے تھے مجھے دینے کے لئے نہیں ہیں۔" بشیر کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ نقاب اتر گئی تو چہرے پر چھایا ہوا کمینہ پن اب سلیم کو صاف نظر آ رہا تھا۔

"بشیر بھائی میں نے وہ پیسے گھر بھیج دیئے۔ کوئی ضرورت تھی کل ہی خط آیا تھا۔" سلیم بھی جھوٹ بولنا سیکھ گیا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ بشیر کو اب ایک پیسہ بھی نہیں دے گا۔ اب تک جتنا بیوقوف بن چکا تھا اتنا ہی کافی تھا۔ بشیر نے اپنا کالا چشمہ آنکھوں سے اتار کر جیب میں رکھ لیا اور اپنی آنکھیں سلیم کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ تھوڑی دیر اسی طرح ساکت کھڑے رہنے کے بعد اچانک آگے بڑھا اور سلیم کا گریبان پکڑ کر اسے دھکا دے کر دیوار تک لے گیا۔

"بچے مجھ سے چالاکی کرے گا تو گلا دبا کر یہیں زمین میں گاڑ دوں گا۔ تو نے گھر بھیج بھی دیئے ہیں تو تجھے آج تنخواہ ملی ہو گی۔ میں ان فیکٹریوں کا سارا حساب کتاب جانتا ہوں۔ ہر جگہ منگل بدھ کو پیسے ملتے ہیں۔ چل جلدی سے نکال ورنہ سچ مچ گلا دبا دوں گا۔"

"گردن چھوڑو میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میرے پاس اس وقت نہیں ہیں۔ تنخواہ بینک میں جاتی ہے۔ میرے پاس بینک کارڈ بھی نہیں ہے۔ پیسے نکلوانے بینک جانا پڑے گا۔ بینک اس وقت بند ہیں' کل ہی نکلوا سکوں گا۔ آپ کل اسی وقت فیکٹری آ کر لے لینا۔ میں منع کب کرتا ہوں۔ لیکن میرا گریبان تو چھوڑ دو۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا سمجھیں گے۔" سلیم نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے کبھی نہ مت کرنا ورنہ بہت برا حشر کروں گا۔ کل اسی وقت فیکٹری آؤں گا یا رات میں گھر آ جاؤں گا۔ پیسے تیار رکھنا۔" بشیر نے یہ کہہ کر اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

"نہیں نہیں گھر مت آنا میں یہیں آپ کا انتظار کروں گا۔" سلیم نے اپنی

گردن مسلتے ہوئے کہا۔

"تیرے ساتھ فلیٹ میں رہنے والے بھی اسی فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔" بشیر نے پوچھا۔

"نہیں وہ ٹیکسی چلاتے ہیں۔" سلیم کو اب غیر قانونیوں کے اصول یاد آنے لگے تھے۔ کسی کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا۔

"ٹھیک ہے۔ انہیں بھی دیکھ لوں گا۔ میں کل آؤں گا۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پاتال میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔" بشیر یہ کہہ کر آتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ دینے لگا۔

سلیم تھوڑی دیر اسی طرح کھڑا بشیر کو لے جانے والی ٹیکسی کو دیکھتا رہا۔ ٹیکسی آنکھوں سے اوجھل ہوئی تب بھی اسی طرح کھڑا رہا۔ اس کا ذہن بالکل گنگ تھا۔ ایسا لگتا تھا کوئی راستہ یاد نہیں رہا ہو۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ یہ ایک بالکل نئی مصیبت تھی۔ ایسی مصیبت جس سے چھٹکارا آسان نہیں تھا۔ سوچا کہ بھاگ کر کہیں چلا جائے۔ لیکن کہاں جائے۔ اور چلا بھی گیا تو کیا ضمانت تھی کہ بشیر یا اس کا کوئی اور گرگا اسے دوبارہ نہیں ڈھونڈ نکالے گا۔ دوبارہ ڈھونڈ لیا گیا تو ان کے مطالبے بھی بڑھ جائیں گے۔ مطالبے نہیں مانے گا تو وہ بیچ سڑک پر ذلیل کریں گے اور شاید امیگریشن سے پکڑوا کر واپس بھی بھجوا دیں۔ ایک بار تو اس نے سوچا کہ خود ہی ٹکٹ لے کر پاکستان واپس چلا جائے۔ اس کے پاس اتنے پیسے تھے کہ ٹکٹ خرید سکتا تھا۔ لیکن پھر خالی ہاتھ جا کر وہاں کیا ڈنڈے بجائے گا۔ زندگی روٹی کمانے کی الجھنوں کا شکار ہو جائے گی۔ اس نے سوچا کہ فلیٹ واپس جا کر دوستوں کو کس منہ سے بتائے گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس نے بشیر سے اپنی دوستی کو اور اس سے متعلق سارے معاملات کو سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ اقبال تو بہت ناراض ہو گا۔ وہ ہمیشہ سلیم کو تاکید کرتا تھا کہ وہ اسے بتائے بغیر کسی مہم جوئی کا شکار نہ ہو۔

اسی ادھیڑ بن میں سلیم دو تین بسیں بدل کر کوجی بیچ پہنچ گیا۔ بہت عرصے بعد آیا تھا۔ بلکہ جب سے کوجی چھوڑ کر گیا تھا ساحلی ہوا سے محروم رہا تھا۔ دراصل پچھلے

چند مہینوں میں کوئی ایسا مشکل مرحلہ آیا بھی نہیں تھا کہ سلیم کو سوچ و بچار کے لئے ساحل کی وہ پسندیدہ منڈیر یاد آتی جس پر بیٹھ کر وہ اس وقت سمندر کی جھاگ اڑاتی موجوں کو دیکھ رہا تھا۔ سورج دہکتا انگارہ بنا ہوا آہستہ آہستہ سمندر میں اتر رہا تھا۔ ہوا تیز اور خنک تھی لیکن بھلی لگ رہی تھی۔ ساحل پر زیادہ لوگ نہیں تھے۔ پانی میں غوطے لگا کر تیراکی کا مظاہرہ کرنے والی دو تین لڑکیاں تھک کر واپس نکل آئی تھیں۔ ایک بہت موٹا شخص گھٹنوں سے نیچا سفید نیکر اور شوخ لال رنگ کی پولو شرٹ پہنے ہوئے ساحل کی گیلی اور ٹھنڈی ریت پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ سلیم کو آج وہ بڈھا نظر نہیں آیا جو کچرے کے ڈھیر میں المونیم کے خالی ڈبے تلاش کرتا تھا۔ منڈیر کے اس حصے کے سامنے جہاں سلیم بیٹھا تھا ایک بورڈ پر لکھا تھا کہ ساحل پر کتوں کو لانا منع ہے۔ بورڈ جس ڈنڈے پر لگا تھا ایک کتا ٹانگ اٹھائے اسے گیلا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے تھوڑی دور اس کا مالک ریت پر پاؤں پھیلائے بیٹھا اپنے کتے کی اس ادا پر بڑی فراخدلی سے مسکرا رہا تھا۔ سلیم کو کتے کی قسمت پر رشک آیا۔ ساحل پر غیر قانونی ہونے کے باوجود کس آزادی سے سارے کام کر رہا تھا۔ کسی بشیر کا ڈر نہ کسی امیگریشن کا خوف۔

سلیم دیر تک اسی طرح بیٹھا اجالوں کو تاریکی میں گم ہوتا دیکھتا رہا۔ آج کل چاندنی کھلنے کا موسم نہیں تھا۔ ویڈنگ کیک آئی لینڈ بھی تاریکی کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ سلیم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا کہ بشیر کی مصیبت سے نکلنے کی کیا صورت کرے۔ آخر میں یہی فیصلہ کر کے گھر کی طرف چل دیا کہ اس معاملے میں اب اسے اپنے دوستوں کی ماہرانہ رائے لینی ہی پڑے گی۔ تھوڑی دیر کے لئے دوستوں کے سامنے شرمندہ ہونا بشیر کے ہاتھوں ذلیل ہو کر بلیک میل ہونے سے کہیں بہتر تھا۔ اسے یہ سوچ کر شرمندگی ہونے لگی کہ اب سے پہلے وہ بشیر کو بھی دوستوں کی اس فہرست میں شامل رکھتا تھا جس میں ظہور، چودھری انور اور اقبال کے نام لکھے تھے۔ گھر پہنچتے پہنچتے رات کے نو بج گئے۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت کوئی نہیں ہو گا، تینوں اپنی اپنی نوکریوں پر گئے ہوئے ہوں گے۔ لیکن گھر میں داخل ہو کر وہ ایک بار پھر سکتے میں رہ گیا۔ قہر اور

افسوس بھری چھ آنکھیں اندر آتے ہی اس پر جم گئی تھیں۔

ظہور' چودہری انور اور اقبال تینوں اپنے اپنے سامان باندھے ہوئے جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔

"آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔" سلیم نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہم یہ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ صرف تمہارا انتظار تھا۔" ظہور نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"لیکن کیوں......؟" سلیم کے لہجے میں حیرت اسی طرح قائم تھی۔

"کیوں؟۔ یہ تم پوچھ رہے ہو۔ آج فیکٹری پر تم سے ملنے کے لئے جو آیا تھا اسے جانتے ہو وہ کون تھا۔" اقبال کا لہجہ دھیما نہیں تھا۔ وہ اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بشیر احمد۔ وہ میرا دوست ہے۔"

"اسے فیکٹری کا پتہ تم نے بتایا تھا۔"

"ہاں لیکن........."

"اور گھر کا پتہ بھی اسے معلوم ہے۔"

"ہاں اس نے ایک دفعہ مجھے گھر پر چھوڑا تھا۔"

"ملک آفتاب کے پاس بھی تمہیں وہی لے کر گیا تھا۔"

"ہاں لیکن........."

"پھر بھی اسے دوست کہتے ہو۔ کب سے جانتے ہو اسے۔"

"بہت دنوں سے۔ میں جب آسٹریلیا آیا تھا تو مجھے اسی کے پاس رہنا تھا۔ وہ میرے ایک پرانے دوست کا دوست تھا۔ چودہری انور سے پوچھ لو' اسی کے ساتھ میں اسے ڈھونڈنے کیبرا میٹا گیا تھا۔ لیکن اس کے میرے پاس آنے یا مجھے کہیں لے جانے سے آپ لوگوں کا کیا تعلق ہے۔ یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔" سلیم اقبال کے ان لگاتار سوالوں سے بری طرح جھنجھلا گیا تھا۔

"اپنے معاملے کا ہم سے تعلق جاننا چاہتے ہو تو سنو۔ ہم سب تمہارے اسی

دوست کے ڈسے ہوئے ہیں۔ اگر آج میں اتفاقاً اسے فیکٹری پر آتے اور تمہارے ساتھ جاتے نہ دیکھ لیتا تو بے خبری میں اور تمہاری بیوقوفی کے ہاتھوں ہم ایک بار پھر مارے جاتے۔ میرے لئے ظہیر کے گھر پر چھاپہ اسی تمہارے دوست نے پڑوایا تھا۔ میں تو بچ گیا تھا لیکن چودہری انور پکڑا گیا تھا۔ مجھے بھی کئی مہینے نوکری کے بغیر ادھر ادھر چھپ کر گزارنے پڑے تھے۔ ظہور بھائی کے جیل جانے میں بھی تمہارے اسی دوست کا ہاتھ تھا۔ ظہور بھائی ظفر نامی جس شخص کے پاس رہتے تھے اس سے بشیر کی دشمنی تھی۔ وہاں بھی چھاپہ اسی نے پڑوایا تھا۔ تمہارا یہ دوست نامی گرامی بلیک میلر ہے۔ یونیورسٹی میں جا کر اپنے شکار پھانستا ہے۔ منشیات کے اسمگلروں سے تعلق رکھتا ہے۔ لڑکیوں کی دلالی بھی کرتا ہے۔ شادی کرانے کے بہانے غیر قانونیوں کو گھیرتا ہے اور پھر بلیک میل کرنے لگتا ہے۔ ملک آفتاب کا وہ آدھے کا حصہ دار تھا۔ گاہک پھنسا پھنسا کر اسکے پاس بھیجتا تھا۔ اس کا طریقہ واردات یہ تھا............"

"میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ مجھے مت بتاؤ۔" سلیم نے اقبال کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کا سر گھومنے لگا تھا۔

"تمہیں نہیں بتاؤں تو کسے بتاؤں۔ تم کو میں نے کام سکھایا اپنی فیکٹری میں کام دلایا۔ اب میں اس فیکٹری کے پاس بھی نہیں جا سکتا۔ ایک بار پھر سے نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھروں گا۔ لوگوں کے سائے سے بھی ڈروں گا۔ تمہاری وجہ سے وہ پانچوں پاکستانی اور سکھ بھی نوکری سے گئے جو ہماری طرح غیر قانونی تھے۔ فیکٹری کے مالک کو خبردار کرنے کے لئے فون کیا تو مجھے اس کی گالیاں بھی کھانی پڑیں۔ وہ سخت ناراض تھا کہ میں نے تم جیسے ناقابل بھروسہ شخص کو کام کیوں دلوایا۔ تم نے ہم سب کی چولیں ہلا دی ہیں۔" اقبال سخت غصے اور بے بسی کی کیفیتوں کا شکار تھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور آواز تیز ہو گئی تھی۔ ظہور اور چودہری انور خاموش کھڑے تھے۔ ظہور کے چہرے پر پریشانی کے سائے تو نہیں تھے لیکن آنکھیں سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اقبال کے دل کا بخار نکلنا ضروری ہے۔ چودہری انور کی زمین پر گڑی ہوئی آنکھوں میں صرف افسوس تھا۔ سلیم کو اپنا سر اور اس کے ساتھ ہر چیز گھومتی ہوئی

لگ رہی تھی۔ وہ سر پکڑ کر صوفے کے کونے پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ بشیر کو وہ صرف اپنی حصے کی مصیبت سمجھا تھا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس نے اپنے ان دوستوں کے لئے جنھوں نے اس کو ہر قدم پر سہارا دیا تھا' کتنی بڑی مصیبتیں کھڑی کر دی تھیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ تینوں کے پیروں سے جوتے اتار کر اپنا سر دھن لے یا تینوں کے قدموں کو پکڑ کر اس وقت تک معافی مانگتا رہے جب تک وہ اسے سینے سے لگا کر معاف نہ کر دیں۔ لیکن اس میں ہلنے کی بھی تاب نہیں تھی۔ وہ اسی طرح دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اور نظریں نیچی کئے بیٹھا رہا کہ اسے ظہور کی آواز نے چونکا دیا۔

"اپنا سامان باندھ لو۔ ہمیں یہاں سے جلدی روانہ ہونا ہے۔ جو لے سکتے ہو لے جاؤ باقی چھوڑ دو محفوظ رہے گا۔ میں نے مشتاق کو فون کر دیا ہے۔ وہ چابی لے جائے گا اور جیسے ہی وقت ملے گا سامان لے جا کر اپنے گیرج میں رکھ دے گا۔ جب نیا ٹھکانہ بنے گا تو ہم اپنا سامان لے جائیں گے۔ وہ قانونی ہو گیا ہے اس لئے اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

سلیم اپنا سامان پیک کر کے ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ اسی طرح خاموش بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"ہم جائیں گے کہاں۔" سلیم کے اس سوال پر تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ظہور کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے اقبال بول پڑا۔

"تم ہمارے ساتھ نہیں جا رہے۔ ہمیں بہت احتیاط سے رہنا ہے اس لئے ہم تمہیں گھنٹی بنا کر اپنے گلے میں نہیں باندھ سکتے۔ تمہیں اپنا ٹھکانہ خود تلاش کرنا ہو گا۔"

"تم لوگ مجھے چھوڑ جاؤ گے تو میں اکیلا کہاں جاؤں گا۔ میں...... میں تو......" سلیم کے لہجے میں سخت بیچارگی تھی۔ وہ اپنا جملہ بھی مکمل نہیں کر سکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ اقبال نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن ظہور نے اسے خاموش کر دیا۔

"تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ہم تمہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہم تمہیں چھوڑ

ہی نہیں سکتے۔ دوستیاں بس اور ٹرین کے سفر کا ساتھ نہیں ہوتیں۔ دوستیاں زندگی کی وہ بچت ہیں جو کبھی خرچ نہیں ہوتیں۔ سود در سود بڑھتی رہتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی دوستی کا ایسا ہی سرمایہ ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو چھوڑ نہیں رہے ایک دوسرے سے پھر ملنے کے لئے بچھڑ رہے ہیں۔ اس وقت خود ہمیں بھی نہیں معلوم کہ ہم کہاں جائیں گے۔ فی الحال کسی نہ کسی کے پاس سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈیں گے اور بادل چھٹنے کا انتظار کریں گے۔ لیکن تمہیں ساتھ رکھیں گے تو دوست ٹھکانہ دینے میں ہچکچائیں گے۔ تمہارے بارے میں انہیں شبہات ہوں گے۔ ہمارے سرکٹ میں خبریں بڑی تیزی سے دوڑتی اور پھیلتی ہیں۔ اقبال نے جن پانچ لڑکوں کو فیکٹری جانے سے منع کیا ہے وہ اب تک شہر کے پانچ کونوں میں پھیل چکے ہوں گے اور ساتھ ہی تمہارے اور بشیر احمد کے تعلق کی خبر بھی۔۔۔۔۔ تمہیں آج اپنے آپ کو آزمانے کا موقع مل رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم خود کو کبھی مایوس نہیں کرو گے۔ چلو گے تو راستہ خود بخود تمہارے سامنے آ جائے گا۔ ہم مشتاق کا انتظار کر رہے ہیں اسے چابی دیئے بغیر نہیں جا سکتے۔ لیکن تم چاہو تو نکل جاؤ۔ تمہارے لئے خطرہ زیادہ ہے۔ بشیر ابھی نہیں جانتا کہ تمہارے ساتھ یہاں ہم رہتے ہیں۔ لیکن تمہارے لئے وہ اچانک کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ جاؤ پوری دنیا تمہارے لئے کھلی پڑی ہے۔ گڈ لک۔"
ظہور نے سلیم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سلیم کو معلوم تھا کہ ظہور بڑی خوبصورتی سے اسے گھر سے نکال رہا ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ظہور کا ایک ایک لفظ سچ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کل وہ نہیں ملا تو بشیر شہر بھر میں اس کی بو سونگھتا پھرے گا اور صرف سلیم ہی نہیں، اس کے ساتھ جو بھی ہو گا وہ بشیر کا نشانہ بن جائے گا۔ سلیم نے ظہور کا بڑھا ہوا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر بڑی گرمجوشی سے ہلایا۔ اس کے بعد اپنا ہاتھ چودہری انور کی طرف بڑھایا۔ چودہری انور نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اقبال سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن اقبال کو صرف خدا حافظ ہی نہیں کہنا تھا اس سے تو معافی بھی مانگنی تھی۔ اقبال کے چہرے سے غصہ چھٹ گیا تھا اس کی جگہ افسوس اور اداسی کے ملے جلے تاثر نے لے لی تھی۔

"آئی ایم ساری اقبال۔ مجھے معاف کر دو۔ انجانے میں تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہو گئی۔" سلیم نے بہت جذباتی انداز سے کہا۔ اقبال نے بھی سلیم کو بڑھ کر گلے لگایا۔

"مجھے معلوم تھا تم اپنی معصومیت کے ہاتھوں اپنے آپ کو نقصان پہنچاؤ گے۔ بشیر احمد کا تم نام بھی لے لیتے تو آج یہ نوبت نہیں آتی۔ اگر تم میری بات مان سکو تو اسی وقت کسی دوسرے شہر چلے جاؤ۔ تم کل فیکٹری اور گھر میں نہیں ملو گے تو بشیر شہر بھر میں تمہیں تلاش کرتا پھرے گا۔ تم اس سلسلے میں ابھی زیادہ تجربہ کار نہیں ہو اور اس کے رابطے بہت ہیں اس لئے جلد ہی اس کے ہاتھ آ جاؤ گے۔ ایک بار ہاتھ آ گئے تو اس کے جال سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ کم از کم دو تین مہینے باہر رہنا۔ اس عرصے میں مایوس ہو کر وہ تمہاری تلاش چھوڑ دے گا۔"

سلیم نے اقبال کے مشورے کو اچھی طرح گرہ میں باندھا۔ اس نے سوچا اگر وہ پہلے اقبال سے مشورہ کر لیتا تو..... لیکن اب پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اپنا سوٹ کیس اور بیگ اٹھا کر تیزی سے فلیٹ سے باہر نکل گیا۔ نیچے اتر کر تھوڑی دیر فٹ پاتھ پر کھڑا سوچتا رہا اور پھر ٹیکسی لے کر سینٹرل ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ سینٹرل ریلوے اسٹیشن سے آسٹریلیا کے دوسرے شہروں کو جانے والی ٹرینیں چلتی تھیں۔ اسٹیشن کے ساتھ ہی کوچوں کا اڈہ تھا۔ ہر ایک گھنٹے بعد کسی نہ کسی شہر جانے والی کوچ روانہ ہوتی تھی۔ سلیم پہلے ٹرین ٹرمنل پر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ملبورن چلا جائے گا۔ لیکن ملبورن جانے والی ٹرین پونے نو بجے جا چکی تھی۔ دوسری ٹرین صبح آٹھ بجے جاتی تھی۔ جانے کے لئے کوئی دوسرا شہر سلیم کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سڈنی سے زیادہ دور جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کوچ ٹرمنل پر پہنچا تو پندرہ منٹ بعد ہی ایک کوچ کینبرا جا رہی تھی۔ کینبرا کا نام دیکھتے ہی اس نے ایک دم فیصلہ کر لیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ کینبرا اس کے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آیا۔ کوچ میں جگہ مل گئی تھی۔ سلیم کینبرا پہنچا تو صبح کے تین بجے تھے وہ کوچ ٹرمنل کے ویٹنگ روم میں کرسی پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ صبح ہوئی تو سامان لے کر ٹرمنل سے باہر نکلا سامنے ہی موٹل کا بڑا سا بورڈ

اسے دعوت دے رہا تھا' سلیم بیگ کندھے پر ڈال کر اپنا بہت بھاری سوٹ کیس کھینچتا ہوا موٹل پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔ رات بھر کا بھوکا اور جاگا ہوا تھا۔ نیند اور بھوک کے مارے برا حال تھا۔ سامان کمرے میں رکھ کر وہ ڈائننگ روم جا کر ناشتے پر ڈٹ گیا۔ ناشتہ کر کے واپس آیا تو تازہ بنا ہوا سفید نرم بستر اسے للچا رہا تھا۔ وہ اپنی تمام پریشانیاں بیچ کر کپڑے بدلے بغیر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

بشیر سے پہلی بار اندازے کی غلطی ہوئی تھی۔ وہ کسی کو اس طرح مہلت نہیں دیتا تھا جس طرح اس نے سلیم کو دی تھی۔ اور مہلت دیتا بھی تھا تو سر پر سوار رہتا تھا۔ لیکن سلیم کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ کمزور اعصاب کا ناتجربہ کار لڑکا ہے۔ ڈرپوک بھی ہے اس لئے کوئی ہوشیاری نہیں دکھائے گا۔ نہ روئے گا نہ گھر جا کر بتائے گا۔ اور بشیر کا خیال شاید ٹھیک ہی تھا۔ اگر اقبال نے بشیر کو فیکٹری کے گیٹ پر نہ دیکھا ہوتا تو سلیم شاید آج پانچ سو ڈالر کا ہار لئے فیکٹری کے گیٹ پر بشیر کے انتظار میں کھڑا ہوتا۔ دوسرے دن کافی دیر تک جب سلیم نظر نہیں آیا تو بشیر کا ماتھا ٹھنکا اور وہ فیکٹری میں داخل ہو گیا۔ فیکٹری کا مالک اس کے لئے تیار تھا۔ بشیر اس سے سلیم کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"یہاں اس نام کا کوئی آدمی کام نہیں کرتا۔ لیکن تو کون ہے اور فیکٹری میں داخل کیسے ہوا۔ فورا" دفع ہو جا ورنہ پولیس کو بلا کر پکڑوا دوں گا۔" فیکٹری کے چھ فٹ لمبے اور دو فٹ چوڑے مالک نے اسے بری طرح جھڑکتے ہوئے جواب دیا۔

"اوئے آرام سے بات کر۔ مجھے پتہ ہے تیری فیکٹری میں غیر قانونی کام کرتے ہیں ابھی امیگریشن کو فون کر کے چھاپہ پڑوا دوں گا۔" بشیر نے بھی ذرا اکڑ کر جواب دیا۔

"تیری اور تیری امیگریشن کی تو میں........" فیکٹری کا مالک موٹی موٹی گالیاں دیتا ہوا نزدیک ہی رکھا ہوا بیس بال بیٹ اٹھا کر اسے مارنے بڑھا۔ بشیر اتنی تیزی کے ساتھ گیٹ سے نکل کر بھاگا کہ دور تک پلٹ کر نہیں دیکھا۔ بشیر سمجھ گیا تھا کہ سلیم کو

اس کے کسی تجربہ کار دوست نے اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے اور وہ اب گھر پر بھی نہیں ملے گا لیکن پھر بھی وہ اس کے گھر جا کر دیر تک دروازہ پیٹتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا اور فلیٹ کا نمبر بتا کر امیگریشن کو فون کر دیا۔ امیگریشن جب نصف شب کو پولیس لے کر فلیٹ میں پہنچی تو مشتاق بیٹھا ٹی وی پر آسٹریلیا ویسٹ انڈیز کا کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ امیگریشن والے مشتاق کے کاغذات دیکھ کر اس سے معذرت کر کے واپس چلے گئے۔ دوسرے دن بشیر کو معلوم ہوا تو وہ پاکستان جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"اگر مجھے پاکستان جانا نہ ہوتا تو دیکھتا۔ پاتال میں بھی نہ چھوڑتا۔ خیر بچ کے کہاں جائے گا واپس آ کر دیکھوں گا چوہا کون سے بل میں چھپا ہے۔" بشیر سلیم کو اس کے انجام تک پہنچانے کی قسمیں کھاتا ہوا دوسرے روز لیزا اور ایلن کے ساتھ پاکستان روانہ ہو گیا۔ ایلن کو ساتھ چلنے پر بشیر نے ہی آمادہ کیا تھا اس کا خیال تھا ایلن ان کی بڑی مددگار ثابت ہو گی۔

12

کینبرا۔ سڈنی ۱۹۹۵ء

سلیم صرف پانچ ہفتوں میں سڈنی واپس آ گیا تھا۔ کینبرا میں یہ پانچ ہفتے پانچ برس بن کر گزرے تھے۔ سڈنی واپس آتے ہوئے ایسا لگا تھا جیسے گھر واپس آ رہا ہو۔ حالانکہ سڈنی میں اس کے پاس ابھی رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سڈنی میں رہنے کی جگہ اور فیکٹری میں کام ملنا اب مشکل نہیں ہو گا۔ سڈنی آنے کی خوشی اس لئے بھی تھی کہ اسے سر جھکا کر یا چھپ کے نہیں آنا پڑا تھا۔ خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹل گیا تھا۔

کینبرا کے پانچ ہفتے اتنے برے بھی نہیں رہے تھے۔ بس کچھ کئے بغیر خالی جاتا ہوا وقت اسے تکلیف دے رہا تھا۔ کینبرا میں کرائے کی جگہ بھی اسے قسمت سے سستی مل گئی تھی۔ موٹل میں پہلا دن تو سوتے گزرا تھا۔ لیکن دوسرے دن صبح ہوتے

ہی وہ اخبار لا کر اشتہاروں پر نشان لگانے لگا۔ موٹل میں پچاس ڈالر روز کے کمرے میں وہ دو ہفتے سے زیادہ نہیں گزار سکتا تھا۔ وہ اشتہاروں میں دیئے گئے نمبروں پر فون کرتا رہا۔ لیکن چند فون کالوں کے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ مکان کی تلاش اتنی آسان نہیں ہو گی۔

اس کے کمرے میں اس وقت بستر بنانے اور صفائی کرنے والی عورت اپنے کام میں مصروف تھی۔ باتھ روم دھو کر اب وہ بستر کی چادریں بدل رہی تھی۔ سلیم آخری فون کال ختم کر کے اب اخبار کے صفحے پلٹ کر پاکستان کے بارے میں کوئی خبر تلاش کر رہا تھا۔ عورت صفائی کر کے کمرے سے جانے کے بجائے ایک طرف رکھے ہوئے چمڑے کے کالے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ۴۵۔۵۰ سال کی بھاری بھر کم سی عورت تھی، بہت چمکتے ہوئے سنہری بال تھے جو اس نے پونی ٹیل کی شکل میں باندھ رکھے تھے چہرہ میک اپ سے بے نیاز اور کھردرا ہونے کی وجہ سے سخت گیر لگتا تھا۔ ہاتھ پاؤں بھی محنت کی عادت سے بھاری اور بھدے ہو گئے تھے۔ سلیم اخبار میں سے چہرہ نکال کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تمہاری اجازت ہو تو اس کمرے میں بیٹھ کر ایک سگریٹ پی لوں۔" اس نے جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالتے ہوئے پوچھا۔ سلیم کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے کندھے اچکا دیئے۔

"میں اپنے شوہر سے چھپ کر سگریٹ پیتی ہوں۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ سگریٹ چھوڑ دوں گی۔ تین مہینے تک نہیں پیا لیکن پھر برداشت نہیں ہوا تو دوبارہ شروع کر دیا تم بالکل نہیں پیتے۔" عورت سگریٹ کے کش لیتی ہوئی بولی۔

"نہیں۔ میں نے کبھی نہیں پیا۔" سلیم نے مختصرا سا جواب دیا۔

"تم کینبرا کیا کرنے آئے ہو۔ بزنس یا ملازمت۔ گھومنے تو آ نہیں سکتے۔ یہاں پارلیمنٹ اور میوزیم کے سوا دیکھنے کے لئے اور ہے ہی کیا۔" عورت اپنی سگریٹ نوشی کے ساتھ بات چیت بھی جاری رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن سلیم کے لئے یہ سب سے مشکل سوال تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ وہ ایک بلیک میلر کے ڈر سے بھاگا ہوا غیر قانونی

ہے۔

"میں سڈنی کے شور سے گھبرا کر سکون کی تلاش میں آیا ہوں۔ ایک دو مہینے یہاں رہوں گا۔ کام مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ پھر سڈنی واپس چلا جاؤں گا۔ میں کرائے کے لئے جگہ ڈھونڈ رہا ہوں۔" سلیم نے ساتھ ساتھ اپنا مسئلہ بھی بیان کر دیا۔

"تمہیں شہر میں رہنا ہے، کسی خاص مقام کے قریب یا کہیں بھی رہ سکتے ہو۔" عورت نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"کہیں بھی۔ جگہ ملے تو جنگل میں بھی رہ لوں گا۔ لیکن سستی ہونا شرط ہے۔" سلیم نے جواب دیا۔ اسے اس عورت سے کچھ امید ہو چلی تھی۔

"تم انڈین ہو۔" عورت نے سوالات کا رخ ایک دم بدل دیا۔

"نہیں، میں پاکستان سے ہوں۔" سلیم نے فوراً احتجاج کیا۔

"مسلمان ہو۔"

"ہاں۔" سوال کی طرح سلیم کا جواب بھی مختصر تھا۔

"شراب پیتے ہو۔"

"نہیں۔" سلیم نے ذرا غصیلے لہجے میں کہا۔ صفائی کرنے والی یہ عورت اب اس کا صبر آزما رہی تھی۔ اس کا اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں لگتا تھا۔ پہلا سگریٹ ختم کر کے اس نے دوسرا سگریٹ لگا لیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے تمہیں غصہ آ رہا ہو گا۔ لیکن میں یہ سوال اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ میری چھوٹی بہن کو اپنے گھر کے لئے ایک کرائے دار کی ضرورت ہے۔ وہ شہر سے ذرا دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہتی ہے۔ بڑا مکان اور کھلی جگہ ہے۔ کرایہ صرف ساٹھ ڈالر ہفتہ ہو گا جس میں بجلی پانی بھی شامل ہے۔ ڈپازٹ بھی کوئی نہیں چاہئے۔ لیکن دونوں عادی شرابی ہیں۔ ان کے ساتھ رہنے سے تمہارے مذہبی جذبات کو تکلیف پہنچے گی۔" سلیم کا غصہ ایک دم ہی کافور ہو گیا۔

"نہیں نہیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کون کیا کرتا ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں سگریٹ نہیں پیتا، لیکن تم میرے سامنے بیٹھ کر پی رہی ہو۔ وہ

شراب پئیں یا پانی مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے شہر سے دور رہنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ اچھا ہے' میں سکون کی تلاش میں آیا ہوں۔ گاؤں کی کھلی فضا مجھے راس آئے گی۔" سلیم نے جلدی سے کہا۔ اسے ڈر تھا کہیں وہ ارادہ نہ بدل دے۔

"ٹھیک ہے باربرا سے میں تمہاری بات کرا دیتی ہوں۔" عورت نے فون ملا کر اپنی بہن کو بتایا کہ اس نے کرائے دار تلاش کر لیا ہے۔ سلیم نے فون کیا تو دوسری طرف سے بولنے والی بہت نرم اور شائستہ لہجے میں بات کر رہی تھی۔ گفتگو سے پڑھی لکھی لگتی تھی' بالکل نہیں لگتا تھا کہ وہ صفائی کرنے والی اس کھردری شکل اور لہجے والی عورت کی بہن ہو گی۔ اس کا ہر جملہ ڈارلنگ سے شروع ہوتا تھا۔ ساری گفتگو یک طرفہ تھی۔ سلیم صرف ہوں ہاں کر رہا تھا۔ باربرا اسے اپنے مکان کے گرد پھیلی ہوئی خوبصورتی اور اس جھیل کے بارے میں بتا رہی تھی جس کے خاموش پانی کو دیکھتے ہی دل میں سکون کی لہریں موجزن ہو جاتی تھیں۔ سلیم نے اسے بتایا کہ وہ کل صبح سامان لے کر پہنچ جائے گا۔

"تم نے یہاں کے ایک گاہک کو بھگا کر ہوٹل کا نقصان کیا ہے۔ تمہارے مالک کو پتہ چلا تو بہت ناراض ہو گا۔" سلیم نے فون رکھ کر مسکراتے ہوئے صفائی کرنے والی عورت سے مذاق کیا۔

"یہ نقصان تو ہونے ہی والا تھا۔ تم میری بہن کے گھر نہ جاتے تو کہیں اور جاتے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کل کے بعد اس موٹل میں ٹھہرنے والے نہیں تھے۔ کل صبح میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گی۔ تمہارے لئے تنہا جانا مشکل ہو گا۔ اس بہانے باربرا سے بھی مل لوں گی۔" عورت نے اٹھتے ہوئے کہا۔ سگریٹ ختم کر کے وہ منہ میں بو بھگانے والا اسپرے کر رہی تھی۔

"تمہیں چھٹی لینی پڑے گی۔ مل جائے گی؟" سلیم نے فکرمندی کے ساتھ پوچھا۔

"تم فکر مت کرو۔ بس صبح دس بجے تیار رہنا۔" عورت باہر جانے کے لئے

مڑنے لگی۔

"تمہارے کام کا جو نقصان ہو گا میں اس کے پیسے دینے کے لئے تیار ہوں۔" سلیم نے اس کی احسان مندی کا بوجھ اتارنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ جاتے جاتے رک گئی اور سلیم کو مسکرا کر دیکھنے لگی۔

"میرے وقت کی قیمت تمہارے کئی ہفتے کے کرائے کے برابر ہو گی۔ یہ موٹل میرا اپنا ہے۔ میں اس کی مالک ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل کر چلی گئی۔ سلیم حیرت کے ساتھ منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔

اس کی بہن جس گاؤں میں رہتی تھی وہ کینبرا سے تھوڑے نہیں اچھے خاصے فاصلے پر تھا۔ موٹل کی مالکہ بہت آرام سے گاڑی چلا رہی تھی اسی لئے انہیں پہنچنے میں چالیس منٹ لگے تھے۔ موٹل کی مالکہ نے اپنا نام جارجیا بتایا تھا۔ وہ راستے بھر سگریٹ پیتی اور اپنی زندگی کی کہانی اور مستقبل کے منصوبے سناتی ہوئی گاڑی چلا رہی تھی۔

"تمہاری بہن کیا کرتی ہے۔" سلیم کے اس سوال پر جارجیا تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی لیکن پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

"وہ کچھ نہیں کرتی۔ صرف اپنے خوابوں کی راکھ کریدتی رہتی ہے۔ بلکہ اب تو خود راکھ کا ڈھیر بن گئی ہے۔ اسے جو ساتھی ملا ہے وہ بھی بالکل ناکارہ ہے۔ وہ بھی کچھ نہیں کرتا۔ صرف باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے وہ بہت جلد مشہور ہونے والا ہے۔ وہ کوئی کتاب لکھ رہا ہے جو وہ کہتا ہے تہلکہ مچا دے گی۔ میرا شوہر کہتا ہے کہ جو چالیس سال کی عمر تک کچھ نہیں بن سکا وہ اس کے بعد بھی کچھ نہیں بن سکتا۔" وہ بھی کچھ اداس ہو گئی تھی اور گاڑی چلاتے ہوئے نیا سگریٹ سلگانے لگی تھی۔ اسے کھلی ہوا میں سگریٹ پینے کی آزادی ملی تھی جس کا وہ پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ لیکن جب بھی وہ نیا سگریٹ سلگانے لگتی. سلیم کی سانسیں رک جاتیں۔ اسے ایسا لگتا جیسے گاڑی ابھی سڑک سے اتر کر کسی درخت سے ٹکرا جائے گی۔ وہ ایک ہاتھ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دباتی، پھر دونوں کلائیاں اسٹیرنگ پر رکھ کر لائٹر کو کلک کر کے اپنا منہ

اسٹیرنگ پر جھکا کر سگریٹ کو شعلے تک لے جاتی۔ لیکن اس سارے عمل میں اس کی پلک نہیں جھپکتی اور نظریں سامنے سڑک پر جمی رہتیں۔ سلیم کو یہی خوف تھا کہ کہیں چہرے کے ساتھ آنکھیں بھی اسٹیرنگ پر جھک گئیں اور کوئی موڑ کٹنے سے رہ گیا تو کیا ہو گا۔ لیکن سڑک بہت چوڑی اور صاف تھی۔ ٹریفک بہت کم تھا۔ پیچ و خم بھی زیادہ نہیں تھے۔ اس نے گیئر بدل کر گاڑی کی رفتار کچھ اور کم کر دی اور جب دوبارہ بولنا شروع کیا تو اپنی بہن کے تذکرے پر اس کے لہجے کی اداسی اور گہری ہو گئی۔

"ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ باربرا پڑھنے لکھنے کی شوقین اور بہت نازک مزاج تھی۔ اسکول کے زمانے میں اسے پیانسٹ بننے کا شوق تھا۔ یونیورسٹی میں جا کر وہ رائٹر بننے کے خواب دیکھنے لگی۔ مجھے پڑھائی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میں نویں جماعت میں پڑھتی تھی اسی وقت سے میکڈانلڈ میں کام کرنے لگی تھی۔ چودہ سال کی عمر سے سگریٹ پیتی اور لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتی تھی۔ ہائی اسکول جیسے تیسے پاس کیا لیکن یونیورسٹی نہیں گئی۔

"باربرا یونیورسٹی تو چلی گئی اس نے ڈگری بھی لے لی۔ لیکن زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہی۔ اخباروں میں صحافی بننے کے لئے قسمت آزماتی رہی لیکن ہر دروازہ بند ملا۔ صرف ایک کامیابی ہوئی۔ ایک بڑے اخبار کا سینئر صحافی اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ دونوں نے جلد ہی شادی کر کے ایک بیٹا بھی پیدا کر لیا لیکن اس کا صحافی شوہر بھی رائٹر یا صحافی بنانے میں باربرا کی زیادہ مدد نہیں کر سکا۔ مستقل ناکامیوں کے بعد اس نے سگریٹ اور شراب میں پناہ حاصل کرنا چاہی۔ بیٹھے بیٹھے اس کا جسم پھیلنا شروع ہو گیا تو شوہر نے بھی ایک ناکام اور مایوس عورت سے جان چھڑا لی۔ لیکن بیٹے کو اپنی تحویل میں رکھنے کے عوض اپنا یہ مکان باربرا کے نام کر دیا جس میں تم کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے جا رہے ہو۔"

"تو کیا اس نے کبھی کوئی نوکری نہیں کی۔" سلیم نے پوچھا۔

"کی تھی۔ ایک ہوٹل کے بار میں پیانو بجانے لگی تھی۔ یہ اس کی پہلی اور آخری نوکری تھی۔ اینڈریو بھی اسے اسی ہوٹل میں ملا تھا۔ وہ بھی باربرا کی طرح زندگی

کی لڑائی ہار کر شراب اور سگریٹ میں زندہ تھا۔ وہ باربرا کا پیانو سن کر اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ لیکن دونوں مل کر صفر جمع صفر بن گئے ہیں۔ باربرا کی نوکری زیادہ عرصے چل نہیں سکی۔ اینڈریو بھی کچھ نہیں کرتا۔ دونوں کو سرکاری الاؤنس اتنا مل جاتا ہے جس سے ان کا سگریٹ شراب کا خرچ نکل جاتا ہے۔"

جارجیا خاموش ہو کر ایک اور سگریٹ سلگانے لگی۔ سلیم کو اس وقت اس کے سگریٹ سلگانے سے اور ڈر لگا کیونکہ گاڑی اب مرکزی شاہراہ سے ایک پتلی اور خم دار سڑک پر مڑ گئی تھی۔ پل جھپکتے ہی گاڑی سڑک کے نیچے اتر سکتی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ حد نظر تک کم پانی کی بہت خاموش سی جھیل پھیلی تھی۔ پانی کی سرحد بہت دور جا کر شروع ہوتی تھی۔ کافی آگے تک سوکھی ہوئی زمین تھی۔ جھیل کے بیچوں بیچ لکڑی کے ڈنڈوں کی ایک فینس تھی جو دور تک چلی گئی تھی۔ شاید پانی چڑھنے کے زمانے میں خطرے کے نشان کا کام کرتی ہو گی۔

سلیم کی نئی پناہ گاہ اسی سڑک کے کنارے بنا ہوا ایک پرانا سا بوسیدہ مکان تھا۔ دیواروں کی نصف بلندی تک پانی کی سیلن سے اکھڑے ہوئے پلاسٹر کی پپڑیاں مکان کی بوسیدگی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ دروازے کے باہر ہی پلاسٹک کی ایک بڑی سی ناؤ دیوار سے ٹکی کھڑی تھی۔ جارجیا نے بتایا تھا کہ اکثر سیلاب مکانوں تک پہنچ جاتا ہے اس لئے ہنگامی استعمال کے لئے ہر مکان میں پلاسٹک کی کشتی رکھنی پڑتی ہے۔ سلیم مطمئن تھا کہ پانی دور تک اترا ہوا تھا اور اگلے چند ہفتوں میں سیلاب کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سلیم کو تو تیرنا بھی نہیں آتا تھا۔ مکان بالکل تنہا کھڑا تھا۔ دوسرا مکان کافی فاصلے پر تھا۔ جارجیا کے مطابق سب گاؤں والے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ رابطے کا ذریعہ محلے کا واحد شراب خانہ تھا جہاں گاؤں میں رہنے والے آتے جاتے ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ ہر ہفتے کی شام کو بیئر پینے کا مقابلہ ہوتا۔ شام ختم ہونے پر جس کی میز پر بیئر کی سب سے زیادہ خالی بوتلیں یا گلاس ہوتے اسے اس ہفتے کا شرابی قرار دے کر سرخ اور سفید وائن کی دو بوتلیں انعام میں ملتی تھیں۔ باربرا اور اینڈریو جب اس گاؤں میں رہنے آئے تھے تو شروع شروع میں ہر ہفتے اس مقابلے میں شریک

ہوتے۔ وہ لگاتار انعام جیتتے رہے تو شراب خانے کے مالک نے انہیں چیمپئن شرابی کا تاحیات ٹائٹل دے کر مقابلوں میں شرکت سے مستثنیٰ کر دیا جس کے بعد سے انہوں نے شراب خانے جانا چھوڑ دیا تھا۔

جارجیا کی گاڑی جیسے ہی رکی سلیم کا سانس اوپر کا اوپر رہ گیا۔ دو بڑے بڑے کتے اونچی آوازوں میں بھونکتے ہوئے گاڑی پر چڑھ دوڑے تھے۔ سلیم کی کھڑکی کا شیشہ نہ چڑھا ہوتا تو شاید انہوں نے اس کی گردن پکڑ لی ہوتی۔ سلیم کو اگر معلوم ہوتا کہ گھر میں کتے بھی ہیں تو وہ مفت میں بھی یہاں رہنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ کوئی جنبش کئے بغیر اسی طرح گاڑی میں بیٹھا رہا۔ جارجیا گاڑی سے اتر کر کتوں کے سروں پر دست شفقت پھیرنے لگی تھی۔ کتے اس سے شناسا لگتے تھے اس لئے ان کا بھونکنا بند ہو گیا تھا اور وہ لمبی لمبی زبانیں نکالے جارجیا کا ہاتھ چاٹنے لگے تھے۔ دروازہ کھول کر چھوٹے قد کا ایک شخص لال اور سفید رنگ کی پٹیوں والا نیکر اور سفید بنیان پہنے ننگے پاؤں باہر نکلا تھا۔ قد کی طرح اس کی جسامت بھی کم تھی۔ نہ موٹا نہ دبلا۔ آنکھوں پر گہرے کتھئی رنگ کی پلاسٹک کی گول شیشوں والی عینک تھی۔ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز' بہت گھنے جھبڑے کھچڑی جیسے سفید اور سیاہ بال۔ وہ یقیناً" باربرا کا بوائے فرینڈ اینڈریو رہا ہو گا۔ وہ جارجیا سے گلے ملتے ہوئے کتوں کو چمکار کر اپنے ساتھ مکان کے پچھواڑے لے گیا۔

"باہر نکل آؤ۔ اینڈریو نے کتوں کو باندھ دیا ہو گا۔ چند دن رہو گے تو کتے تمہیں بھی پہچاننے لگیں گے اور تمہارے لئے بے ضرر ہو جائیں گے۔" جارجیا نے سلیم کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے اترنے کے لئے کہا۔

"لیکن میں کتوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ مجھے خوف آتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہی واپس چلوں گا۔ مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں آتا بھی نہیں۔" سلیم نے گاڑی سے اترتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن اندر آکر باربرا اور اینڈریو سے مل لو۔ ممکن ہے وہ اس مسئلے کا کوئی حل نکال لیں۔" جارجیا نے برا مانے بغیر کہا۔ اینڈریو بھی کتوں کو

باندھ کر آ گیا تھا۔ جارجیا نے دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ دن کے گیارہ بجے تھے لیکن اینڈریو کے منہ سے اس وقت بھی شراب کی تیز بو آ رہی تھی۔ سگریٹ نوشی کی کثرت نے اس کے دانت گہرے زرد کر دیئے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار ہچکیاں لیتا تھا۔ تینوں مکان میں داخل ہو کر بائیں ہاتھ کے دروازے سے لاؤنج میں داخل ہوئے تو ایک نشست والے صوفے پر وہ عورت گوتم بدھ کی طرح بیٹھی تھی۔ دونوں پاؤں اٹھائے بہت کشادہ سے صوفے پر اس طرح پھنسی ہوئی بیٹھی تھی کہ سلیم کو یقین تھا اٹھتے ہوئے صوفہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ جائے گا۔ جارجیا نے تعارف کرایا تو اس نے سلیم کے لئے اپنا گال آگے بڑھا دیا۔ اس کے چہرے اور بدن میں کوئی مناسبت نہیں تھی۔ چہرہ بچوں کی سی معصومیت لئے ہوئے تھا۔ جارجیا کے مقابلے میں اس کے خط و خال بہت نازک تھے۔ صرف بال ایک سے تھے۔ بہت چمکدار سنہرے بال جن کی لٹیں اس کے کاندھوں پر گری ہوئی تھیں۔ سلیم اس کے گالوں کا بوسہ لے کر حسب معمول سرخ ہو گیا تھا۔

"ویلکم ڈارلنگ" باربرا کی آواز بھی اس کے جسم سے بے تعلق لگتی تھی۔ بہت نرم اور سریلی سی یہ آواز جب سلیم نے فون پر سنی تھی تو کسی نازک اندام عورت کے حسن کی تفسیر لگی تھی۔ اینڈریو باربرا کے صوفے کے پاس ہی پڑی ہوئی لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ سائڈ کی میز پر اس کے بیئر کا گلاس رکھا تھا۔ مشکیزے کی طرح کی پلاسٹک کی ایک بڑی تھیلی میں ہلکے پیلے رنگ کا مشروب ساتھ ہی پچاس سگریٹوں والا موٹا سا پیکٹ رکھا تھا۔ ایک سلگا ہوا سگریٹ باربرا کے ہاتھ میں تھا جبکہ اینڈریو پوچ سے تمباکو نکال کر اپنا سگریٹ رول کر رہا تھا۔

"جارجی نے بتایا ہے کہ تم سگریٹ اور شراب دونوں سے پرہیز کرتے ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کن نعمتوں سے محروم ہو۔ جارجی کو ڈرائیو کرنا ہے وہ بھی نہیں پیئے گی۔ ڈارلنگ کافی کا پانی رکھ دو۔ سلیم آج کے دن ہمارے مہمان ہیں۔ کرائے دار یہ کل سے بنیں گے۔" باربرا نے اینڈریو کی طرف دیکھ کر کہا جس کی ہچکیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے، لیکن پہلے میں اپنا علاج کر لوں۔" اینڈریو نے کہا اور رول کیا ہوا سگریٹ سلگائے بغیر میز پر رکھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک باتھ روم میں الٹیاں کرتے ہوئے اس کے ڈکارنے کی آوازیں پورے گھر میں شور مچاتی رہیں۔ باربرا بہت افسردہ آنکھوں سے باتھ روم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ الٹیاں کرنے کی آوازیں بند ہوئیں تو مکان میں بالکل خاموشی چھا گئی۔ باہر کے کھیتوں میں ہواؤں کے پتوں سے ٹکرانے کی سرسراہٹ اچانک ہی کانوں کو بھلی لگنے لگی تھی۔

"ہچکیوں کے ساتھ اسے الٹیوں کا مرض بھی ہو گیا ہے۔ یہ علاج کیوں نہیں کراتا۔" جارجیا نے بہت تیز نظروں سے باربرا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"الٹیاں ہی اس کی ہچکیوں کا علاج ہیں۔ ابھی تم دیکھنا باہر آئے گا تو ہچکیاں غائب ہوں گی۔ واڈکا کے دو تین گھونٹ لے گا تو پھر سے بالکل ترو تازہ ہو کر چہکنے لگے گا۔" باربرا نے بڑی پیار بھری نظروں سے باتھ روم سے نکلتے ہوئے اینڈریو کو دیکھ کر کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ماں اپنے کسی شرارتی بچے کا کارنامہ سنا رہی ہو۔

"تم دونوں پاگل ہو گئے ہو۔ دیکھنا اسی طرح ہچکیاں لیتا اور الٹیاں کرتا ہوا مر جائے گا۔ خدا کے لئے پاگل پن چھوڑو اور اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔" جارجیا کے لہجے میں تشویش تھی۔ باربرا کچھ نہیں بولی۔ اس نے اپنا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا تھا۔ اینڈریو باتھ روم سے نکل کر سیدھا کچن میں کافی بنانے چلا گیا تھا۔

"ڈاکٹروں کے پاس جا کر دیکھ لیا۔ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سب ایک ہی علاج بتاتے ہیں۔ الکحل سے نجات۔ ایک ڈاکٹر نے تو چھ ہفتے کے لئے سینی ٹوریم میں داخل کرنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ انہوں نے یقین دلایا تھا کہ ڈرائی ہو کر باہر نکلے گا۔ لیکن اینڈریو نہیں گیا۔ کہتا ہے میں اکیلی کیسے رہوں گی۔" باربرا نے وائن کے دو تین گھونٹ لینے کے بعد جارجیا کو بتایا۔

"تم میرے پاس رہ سکتی تھیں۔ چھ ہفتے کی ہی تو بات تھی۔" جارجیا کے لہجے کی تیزی اسی طرح قائم تھی۔

"میں نے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن اینڈریو کہتا ہے کہ شراب پئے بغیر وہ ایک لفظ

نہیں لکھ سکتا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ کتاب ختم ہوتے ہی سینی ٹوریم جا کر الکحل کی عادت سے نجات حاصل کر لے گا۔" باربرا نے بڑے پریقین لہجے میں کہا۔

"سب تم لوگوں کی بہانہ بازیاں ہیں۔ دس سال ہو گئے کتاب لکھتے ہوئے۔ دس سال اور گزر جائیں گے۔ اس وقت تک شراب تم دونوں کو پی چکی ہو گی۔" جارجیا نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"ایسا مت کہو ڈارلنگ۔ صرف آخری حصہ باقی رہ گیا ہے۔ اور اب تو میں بھی اینڈریو کی مدد کر رہی ہوں۔ بس چند مہینوں کی بات ہے۔ اینڈریو نے ایک پبلشر سے بات کر لی ہے۔ وہ اسکرپٹ ملتے ہی دس ہزار ڈالر ایڈوانس کرنے پر تیار ہے۔" اینڈریو کافی لے آیا تھا۔ باربرا جارجیا کو چھوڑ کر اب سلیم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ڈارلنگ سالیم کو ان کا کمرہ دکھا دو اور گاڑی سے ان کا سامان اتار کر لے آؤ۔ جارجی کو واپس بھی جانا ہو گا۔" باربرا نے اینڈریو کے لئے ایک اور ہدایت نشر کی۔ اینڈریو کو شاید باربرا کے حکم کی تعمیل کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ اٹھنے لگا لیکن جارجیا نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"سالیم کو اب یہاں نہیں رہنا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے پاس کتے ہیں۔ اسے کتوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں ہے۔" جارجیا نے سلیم کا مسئلہ صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیا۔ سلیم سچ مچ شرمندہ ہو رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے۔ مگر مجھے......" اینڈریو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے ہم رات میں سالیم کے سونے کے بعد کتے کھولیں گے اور صبح اس کے اٹھنے سے پہلے بند کر دیں گے۔ رات میں بھی وہ صرف باہر رہیں گے گھر میں نہیں آئیں گے۔ دن میں ہمیں چوکیداری کی ضرورت ہے بھی نہیں۔" اینڈریو نے مسئلے کا آسان سا حل پیش کر دیا۔

"میری وجہ سے آپ لوگ خواہ مخواہ ......" سلیم نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن اس دفعہ باربرا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ڈارلنگ ہم کتوں سے اپنی محبت باہر جا کر پوری کر لیں گے۔ میں ہر وقت

اپنی کرسی میں نہیں دھنسی رہتی۔ صبح کو میں اور اینڈریو باہر جا کر کھیتی باڑی کا شوق پورا کرتے ہیں۔ اینڈریو کو صبح اٹھنے کا مرض ہے۔ وہ کہتا ہے کہ غیب سے مضامین صرف سورج نکلنے سے پہلے خیال میں آتے ہیں۔ سورج نکلنے کے بعد تو صہبا طلوع ہوتی ہے۔ دس بجے کے بعد اسے ہچکیاں لگ جاتی ہیں اور پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔" باربرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ اینڈریو بھی ہنسنے لگا۔

سلیم کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ جارجیا اس کا سامان اتار کر اور باربرا کے لئے لائی ہوئی وائن کی بوتلیں اور سگریٹوں کا ایک کارٹن دے کر چلی گئی۔

صرف پہلے دن ہی نہیں، باربرا اور اینڈریو نے سلیم کو آخری دن تک کرائے دار کی بجائے مہمان کی طرح رکھا۔ اپنے وعدے کے مطابق انہوں نے کتوں کو کبھی گھر میں نہیں آنے دیا۔ وہ دن بھر باہر بندھے رہتے۔ سلیم کو بھی پہچاننے لگے تھے۔ سلیم جب کبھی ٹہلنے نکلتا تو اسے دیکھ کر بھونکنے کے بجائے صرف دم ہلا کر شناسائی کا اظہار کرتے تھے۔ اب اسے بھی ان سے خوف نہیں آتا تھا۔ باربرا نے تو لگتا تھا سلیم کو گود لے لیا ہے۔ وہ سلیم کو لے کر بیٹھتی اور گھنٹوں اس کی کہانیاں سنتی رہتی۔ اس کا ردعمل بہت فطری ہوتا۔ نہ سرپرستی کرنے کا انداز نہ ہمدردی کے مصنوعی اشارے۔ کوئی بھی اس کے سامنے دل کھول کر رکھ سکتا تھا۔ اینڈریو باربرا کے مقابلے میں بہت کم گو تھا۔ صرف شام کو جب نشہ گہرا ہوتا اور دنیا کے حالات کا تذکرہ چھڑ جاتا تو ایسا لگتا اس کے منہ میں بہت سی زبانیں اگ آئی ہیں۔ پھر وہ کسی کو بولنے نہیں دیتا۔ سب کا زیادہ وقت ڈرائنگ روم میں گزرتا۔ مکان کا یہی سب سے کشادہ کمرہ تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے سونے کے کمرے تھے۔ ایک سلیم کے پاس تھا اور دوسرا باربرا اور اینڈریو کی خواہ گاہ تھا۔ سلیم نے انہیں کبھی سوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ سلیم کے سونے سے پہلے سو گئے ہوں۔ صبح اٹھتا تو سلیم انہیں جاگا ہوا دیکھتا۔ باربرا صبح ہی صبح اپنے جسم کا بھاری بوجھ اٹھا کر ٹہلنے نکل جاتی گاؤں کی پتلی سی پکی سڑک کے کنارے چلتی چلتی دور تک چلی جاتی۔ اینڈریو مکان کے

پچھواڑے میں کتوں کو باندھنے اور انہیں ناشتہ پانی دینے کے بعد منہ میں سگریٹ دبائے کیاریوں کے معائنہ میں مصروف نظر آتا۔ نو بجے تک وہ سب ناشتے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں آ جاتے۔ صرف سلیم کے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہوتی۔ باربرا کا گلاس وائن سے اور اینڈریو کا بیئر یا واڈکا سے بھر جاتا۔ سلیم کا خیال تھا کہ صبح اٹھ کر وہ کلی بھی اپنے اپنے برانڈ کی شراب سے کرتے ہوں گے۔

انہیں ٹیلی ویژن سے پرہیز تھا۔ ڈرائنگ روم کے کارنس پر ایک پورٹ ایبل ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ ریڈیو کی سوئی دن بھر دو اسٹیشنوں کے درمیان گھومتی رہتی۔ اینڈریو کو دنیا کی خبریں اور باربرا کو میوزک سننے کا شوق تھا۔ ڈرائنگ روم کے کونے میں ایک پرانا پیانو پڑا تھا۔ اینڈریو اور باربرا جب بھی عالمی مسائل سلجھانے کی کوشش میں بحث کرتے ہوئے جھگڑا کرتے اور باربرا ناراض ہو کر چپ سادھ لیتی تو اینڈریو پیانو پر جمی ہوئی گرد صاف کر کے باربرا کو مناتا وہ اسے اپنے پاس بلا کر گلے لگاتی۔ دونوں ایک دوسرے کو چمٹا کر پیار کرتے ہوئے محبت کی وادیوں میں بھٹکنے لگتے۔ زندگی گزارنے کا یہ انداز سلیم کے لئے بالکل نیا تھا۔ جارجیا نے اپنی بہن کی زندگی کا بہت بھیانک نقشہ کھینچا تھا۔ باربرا اور اینڈریو دونوں کو صفر جمع صفر اور ناکامیوں کے مقبرے کا مجاور کہا تھا۔ لیکن سلیم کو دونوں اپنی زندگی اور حالات سے بہت مطمئن نظر آئے۔ مطمئن ہی نہیں اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کا مزا لے رہے تھے۔ سلیم کا بھی زاویہ نظر بدلنے لگا تھا۔ وہ سوچتا کامیابی کا معیار کیا ہے۔ اس کی حدود کیا ہیں۔ کامیابی زندگی کو اچھی طرح گزارنے کی اہلیت حاصل کرنے کا نام ہے تو پھر کامیاب کون ہے۔ باربرا کی بہن جارجیا جسے کامیابی کا دعویٰ ہے جسے فخر ہے کہ وہ ایک ہوٹل کی مالک ہے۔ جو دن بھر گندے کمرے اور باتھ روم صاف کرتی ہے۔ ناشتے بناتی اور جھوٹی پلیٹوں کے انبار دھوتی ہے۔ اس کا شوہر بینک کا قرضہ چکانے کے لئے دن بھر دو اور دو چار کرتا ہے۔ سلیم نے سوچا کہ کامیابی اگر یہ ہے تو یہ کیسی کامیابی ہے۔ اینڈریو کہتا تھا کہ ضرورتیں اس جن کا نام ہے جو ہمارے حالات کے چھوٹے سے شیشے میں قید رہتا ہے جیسے ہی ہم اسے بوتل سے نکالتے ہیں وہ اپنا نام بدل کر ہوس رکھ لیتا ہے اور مسلسل

اپنی جسامت بڑھاتا رہتا ہے۔ وہ اتنا قد آور ہو جاتا ہے کہ اسے مٹھی میں پکڑنا اور بوتل میں بند کرنا ممکن نہیں رہتا۔

ان کے گھر میں کھانا پکنے کا رواج نہیں تھا۔ وہ مختلف طرح کے کولڈ سینڈوچ کھا کر گزارا کرتے۔ سلیم سینڈوچ پر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ چند دن تو وہ کچی سبزیوں کے سلاد اور سینڈوچ کھا کر صحت بناتا رہا۔ ایک دن بس پکڑ کر کینبرا گیا اور شام کو واپس آیا تو گوشت اور کھانے پکانے کا ضروری سامان ساتھ لایا تھا اور جب کھانا پکا کر کھلایا تو معدوں کے ذریعے ان کے دل تک پہنچ گیا۔ باربرا اس دن بہت خوش تھی۔ اس شام بہت دیر تک فون پر اپنے بیٹے سے بات کرتی رہی تھی۔ کھانے کے بعد دیر تک شراب پینے کا دور چلتا رہا۔ باربرا نے اصرار کر کے سلیم کو بھی شراب چکھنے پر راضی کر لیا تھا۔ سلیم نے موج میں آ کر باربرا سے ایک فرمائش کر کے دونوں کو خاموش کر دیا۔ سلیم نے باربرا سے پیانو پر کچھ سنانے کے لئے کہا لیکن دونوں کو اچانک خاموش دیکھ کر اسے لگا اس نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ باربرا شراب کے دو تین لمبے گھونٹ لینے کے بعد تھوڑی دیر اسی طرح بیٹھی سگریٹ پیتی رہی۔ سگریٹ ختم ہوا تو اسے ایش ٹرے میں بجھا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کونے کی طرف چل دی جہاں پیانو رکھا ہوا تھا۔

"ڈارلنگ اس وقت رہنے دو۔ رات بہت ہو گئی ہے' پھر کبھی سنیں گے۔" اینڈریو نے جلدی سے کہا۔ لیکن باربرا نے جیسے سنا نہیں۔ وہ پیانو کے سامنے بیٹھ کر تھوڑی دیر انگلیاں چلا کر مختلف دھنیں نکالتی رہی۔ اس کی جسامت کا اثر اس کی انگلیوں پر نہیں ہوا تھا۔ ان کی نرمی اور پھرتی اسی طرح باقی تھی۔ باربرا نے جب دھن ترتیب دینی شروع کی تو سلیم کو ماننا پڑا کہ اس کی پیانو بجانے کی مہارت پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے درد کا ایک چشمہ ابل رہا ہو اور کبھی محبتوں کے رس میں ڈوبی ہوئی بہت میٹھی سی دھن جسم میں سنسنی دوڑانے لگتی۔ باربرا گھنٹے بھر پیانو پر اپنی مہارت کا کمال دکھاتی رہی۔ اس کا پورا جسم ساکت تھا۔ صرف انگلیاں گردش کر رہی تھیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی دو لکیریں نکل کر گالوں پر بہہ رہی تھیں۔ اسے

آنسوؤں کا احساس تک نہیں تھا۔ پیانو کے پاس دیوار سے لگ کر زمین پر بیٹھے ہوئے اینڈریو نے اپنا سر دیوار سے ٹکا دیا تھا۔ آنکھیں خشک اور بند تھیں لیکن اندر ہی اندر آنسوؤں کی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ باربرا کی انگلیاں پیانو پر رکیں تو کمرے میں خاموشی شور مچانے لگی۔ پیانو کے سامنے وہ اب بھی اسی طرح ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اینڈریو اپنا چہرہ اس کی گود میں رکھ کر آہستہ آہستہ سسکنے لگا۔ سلیم نے سوچا کہ دونوں کو ایک دوسرے میں ڈوبا چھوڑ کر اٹھ جائے لیکن اسی وقت باربرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اینڈریو اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی طرف لے جانے لگا۔ باربرا نے سلیم کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ کسی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اپنے شراب کے نصف بھرے گلاس اور سگریٹوں کے پیکٹ کی طرف بھی نہیں' نگاہیں کسی نامعلوم نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ اینڈریو باربرا کو بستر پر لٹا کر تھوڑی دیر میں باہر نکل آیا اور بیئر میں واڈکا کا تڑکا لگانے لگا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے شاید پیانو سننے کی فرمائش نہیں کرنی چاہئے تھی۔" سلیم نے اینڈریو سے کہا جس نے کرسی پر بیٹھ کر گلاس منہ سے لگا لیا تھا۔

"نہیں اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ اب سو گئی ہے۔ کل دیر تک سوئے گی۔ اٹھے گی تو بخار میں تپی ہوئی ہو گی۔ معمول پر آنے میں اسے کم از کم تین دن لگیں گے۔ پیانو سے اسے عشق ہے۔ اس نے اسے ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھائی ہے۔ لیکن ذرا سا بہانہ ہاتھ آتے ہی قسم توڑ دیتی ہے اور پھر کئی دن اس کا عذاب سہتی ہے۔"

"لیکن کیوں۔ پیانو پر اس کی انگلیاں کس کمال سے چلتی ہیں۔ کتنی درد بھری دھنیں نکالتی ہے۔" سلیم نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے باربرا کے کمال فن کو سراہا۔

"ہاں لیکن اس کے فن کی قدر نہیں ہو سکی۔ اب کئی سالوں سے وہ اپنے حال پر بہت مطمئن ہو گئی ہے لیکن پیانو پر بیٹھتے ہی حال سے اس کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ اپنے ماضی میں واپس چلی جاتی ہے تو ناکامی کا احساس جاگ جاتا ہے۔ پھر اسے ہوٹل کا وہ زمانہ بھی یاد آتا ہے جہاں ہماری محبت پروان چڑھی تھی۔ آج اس نے جو

آخری دھن بجائی تھی وہ میرے لئے تھی۔ وہ میری سب سے زیادہ پسندیدہ دھن تھی۔ ہوٹل میں بھی اس کی آخری دھن یہی ہوتی تھی۔ لیکن پھر ہوٹل والوں نے اسے نکال دیا۔ انہیں ایک ہی گاہک پر اس کی اتنی توجہ پسند نہیں تھی۔ ہمیں اپنی ناکامیوں کا کوئی دکھ نہیں ہے۔ ہمیں تو ان معصوم لوگوں پر ترس آتا ہے جو روز ایک نئی اذیت خرید کر اسے کامیابی کا سنگ میل سمجھتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ پیانو ہماری مطمئن زندگی میں آگ لگا دیتا ہے۔ اسے بھی ٹی وی کی طرح میں ایک دن گاؤں کے شراب خانے میں رکھ آؤں گا۔" اینڈریو نے پیانو کو بہت زہریلی نظروں سے گھورتے ہوئے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

"باربرا کی بہن جارجیا سمجھتی ہے ہمارا ناول ایک ایسا خواب ہے جس کی اوٹ میں ہم نے اپنی ناکامیوں کو چھپایا ہوا ہے۔ لیکن یہ ناول جب چھپے گا تو کامیابی ہمارا چہرہ بن جائے گی۔" سلیم کو اینڈریو کا لہجہ پہلی بار اعتماد سے بھرپور لگا۔

"آپ کا یہ ناول ہے کیا۔ کس بارے میں ہے۔" سلیم کو اچانک ہی ان کے ناول میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ اس نے دیکھا تھا دن میں کئی گھنٹے وہ اسی ناول پر صرف کرتے تھے جس کے لکھے' ادھ کھلے اور سادے کاغذ ان کے چاروں طرف بکھرے ہوتے۔ اپنی صبح کی مصروفیات سے فارغ ہو کر وہ کہانی کے کسی نہ کسی موڑ پر بحث کرتے اور پھر کمرے میں دیر تک ٹائپ کی کھٹ کھٹ گونجتی رہتی۔

"اب یہ ناول ہماری تلخیوں اور ناکامیوں کی داستان نہیں رہا۔ ایک نئی امید ہے۔ ناول لکھنے میں جب سے باربرا میرے ساتھ شامل ہوئی ہے' اس نے مجھے سوچنے کا ایک نیا ڈھنگ دیا ہے۔ وہ نہ ہوتی تو یہ ناول بھی میرے ان مسودوں میں شامل ہو جاتا جسے دیمک تک کھانے سے انکار کر دیتی ہے۔" اینڈریو اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور اپنا سگریٹ رول کرنے لگا۔

"لیکن اس کی کہانی کیا ہے۔" سلیم نے اینڈریو کو خاموش ہوتا دیکھ کر پھر اصرار کیا۔

"تم شراب پیو گے۔" اینڈریو نے اپنا رول کیا ہوا سگریٹ سلگا کر اس طرح کہا

جیسے اس نے سلیم کا سوال سنا ہی نہ ہو۔

"نہیں۔ میں اپنے لئے کافی بنا کر لاتا ہوں۔" سلیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ جب کافی لے کر آیا تو اینڈریو اسی طرح سگریٹ، واڈکا اور شاید اپنی کہانی کے پلاٹ کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ سلیم کافی کے گھونٹ لے کر اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تم واقعی کہانی سننا چاہتے ہو۔ تمہیں نیند تو نہیں آ جائے گی۔" اینڈریو نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں نے کافی اسی لئے بنائی ہے۔ رات کو کافی پینے کے بعد مجھے کئی گھنٹوں تک نیند نہیں آتی۔" سلیم نے کہا۔

"کہانی سچ اور افسانے کی ملی جلی شکل ہے۔" اینڈریو نے تھوڑے سے توقف کے بعد بولنا شروع کیا۔ "میں دنیا کے غریبوں کی مدد کرنے والے ایک بین الاقوامی ادارے میں کام کرتا تھا۔ کتاب مجھ سے اور اسی ادارے سے وابستہ میرے تجربات سے شروع ہوتی ہے۔ ادارے کی طرف سے میں نے دنیا کا ہر وہ خطہ دیکھا جہاں صرف بھوک اور اس کے نتیجے میں بیماری اور موت اگتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ دکھی انسانیت کی خدمت کر رہا ہوں۔ لیکن ایک دن اچانک میری آنکھیں کھل گئیں۔ یہ خدمت میرے ضمیر پر بوجھ بن گئی۔ میں نے دیکھا کہ یہ ادارے ایک ایسی نوکر شاہی ن گئے تھے جو ٹی وی پر افریقہ کے قحط کی فلمیں دکھا کر دنیا بھر سے چندے جمع کرتے ور اس پیسے کو اپنی بڑی بڑی تنخواہوں، دنیا بھر کے دوروں اور ہوٹلوں کی رہائش پر لٹا یتے۔ آٹے کا ایک ٹرک پہنچانے کے لئے آٹے کے دس ٹرکوں کی قیمت خرچ ہوتی ی۔ مجھے ایسا لگا کہ میں بھی قحط زدہ ریگستان میں پڑی ہوئی لاشوں کو نوچنے والا گدھ ن گیا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے کراہت آنے لگی۔ نوکری چھوڑ کر تیسری دنیا کا ملک ے گھوما۔ لیکن وہاں بھی صورتحال اچھی نہیں تھی بلکہ اور خراب تھی۔ سماجی رہنما، ور لیڈر، دانشور سب بہت اچھی اچھی باتیں کرتے۔ لیکن آرام دہ گھروں اور زوں میں اور اعلیٰ نسل کی شراب پیتے ہوئے۔ وہ مجھے اس لئے ساتھ لگا کر رکھتے کہ

میں ان کے اداروں کو غیر ملکی امداد دلا سکوں گا۔ یہاں بھی وہی مسئلہ تھا۔ بڑی بڑی تنخواہیں اور نام کمانے کا۔ اس دفعہ گدھ میری لاش نوچنے کے درپے تھے۔ میں بھاگ آیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہو گا۔ نظام بدلنا پڑے گا۔ میں نظام بدلنے کا دعویٰ کرنے والوں سے منتھی ہو گیا۔ لیکن وہ فلسفیانہ لڑائیوں اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف تھے۔ نظام بدلنا محض ایک نعرہ' ایک اچھی تحریر یا دلنشیں تقریر بن گیا تھا۔ ان سے چھٹ کر جب تنہا رہ گیا تو شراب میری ساتھی بن گئی۔" اینڈریو نے شراب کا گھونٹ لینے کے لئے وقفہ لیا تو سلیم کو اسے ٹوکنے کا موقع مل گیا۔

"لیکن یہ تو اخبار میں چھپنے والی کہانی یا آپ بیتی بن گئی۔ آپ کا خیال ہے مایوسیوں سے بھری ہوئی ایسی کہانی کو پڑھنے میں کسی کو دلچسپی ہو گی۔" سلیم کو واقعی مایوسی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جس کتاب کی کامیابی کے بارے میں اینڈریو کو اتنا یقین ہے اس میں کوئی انوکھی بات ہو گی۔ اینڈریو نے سلیم کی طرف مسکرا کر دیکھا اور نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔

"باربرا نے بھی یہی کہا تھا۔ میں نے آپ بیتی ہی لکھنا شروع کی تھی۔ لیکن باربرا نے کہا یہ آپ بیتی اندھیری سرنگ کا سفر بن جائے گی۔ سرنگ کے ایک دہانے پر امید کی شمع ضرور جلانی چاہیئے۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ لکھا تھا پھاڑ دیا اور باربرا کے ساتھ مل کر نئے سرے سے لکھنا شروع کیا۔ ناول کی شروعات تو اب بھی میری آپ بیتی سے ہوتی ہے لیکن ہم نے الہ دین کے جادوئی چراغ اور اس کے جن کو اس آپ بیتی میں شامل کر لیا ہے۔" اینڈریو نے ڈرامائی تاثر دینے کے لئے ایک لمحے کا توقف کیا۔

"الہ دین کے چراغ اور اس کے جن کو.........؟" سلیم نے حیرت ظاہر کی۔

"ہاں لیکن ہمارا جن ذرا نئے دور کا جن ہے۔" اینڈریو نے کہانی سنانے کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ "ایک دن میں کیاری کھود رہا تھا' نیبنو کا درخت لگانا تھا اس لئے کافی گہرا گڑھا کھودنا پڑا تھا۔ کدال کسی دھات کی سطح سے ٹکرائی اور

مٹی ہٹا کر دیکھا تو ایک پرانا چراغ تھا' بالکل ایسا جیسا الہ دین اور جادوئی چراغ والی فلموں میں دیکھا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہنسی آگئی کہ اس علاقے میں جو اکثر سیلاب کی زد میں رہتا تھا کوئی طوفان نوح واپس پلٹتے ہوئے یہ چراغ چھوڑ گیا ہو گا۔ میں نے مذاق میں چراغ کو اس طرح رگڑا جیسے الہ دین کو فلم میں کرتے دیکھا تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دھوئیں کے مرغولے سے سچ مچ ایک جن کو برآمد ہوتے دیکھا۔ لیکن یہ الہ دین کا زمانہ نہیں تھا اسی لئے اس جن نے اس زمانے کے روایتی کپڑے نہیں پہنے تھے۔ وہ نئے دور کا جن تھا اور بالکل جدید وضع کا گہرے نیلے رنگ کا سوٹ اور خوش رنگ پھولوں کی ٹائی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں لیپ ٹاپ کمپیوٹر تھا۔ وہ بہت باوقار انداز میں دھوئیں کے مرغولے سے قدم باہر نکال کر میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یس باس۔ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔" میرے حیرت ظاہر کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کی وفاداریاں اس چراغ کی غلام ہیں اور جس نے یہ چراغ حاصل کیا ہے وہ اس کی سات خواہشیں پوری کرنے کا پابند ہے جس کے بعد وہ چراغ سمیت غائب ہو جائے گا۔ وہ میری دعوت پر گھر کے اندر آیا اور بہت شائستگی سے ایک صوفے پر لیپ ٹاپ کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے بٹن دبا کر ایک کاغذ پرنٹ کر کے مجھے پیش کیا۔ یہ کاغذ ایک معاہدہ تھا جس کے مطابق اس نے اپنی خدمات سات خواہشات پوری ہونے تک میرے سپرد کی تھیں۔ اس کاغذ میں شرائط بھی درج تھیں اور وہ مدت بھی جس میں اپنی یہ خواہشیں میں پوری کرا سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس طرح کی خواہشیں پوری کر سکتا ہے۔ اس کی انگلیاں تیزی سے اپنے کمپیوٹر پر چلنے لگیں اور رنگ برنگے بروشر چھپ کر میرے سامنے آنے لگے۔ محلوں میں جیسے مکانوں' اعلیٰ درجے کی گاڑیوں' دنیا کے بہترین تفریحی مقامات کا لٹریچر اور سنہرے بالوں والی لڑکیوں کی تصویریوں کے ڈھیر اس نے میرے سامنے ڈال دیئے۔ ساتھ ہی اس کی زبان بھی تیزی سے چل رہی تھی کہ وہ میرے لئے محل بنا سکتا ہے' گاڑیاں لا سکتا ہے' دنیا میں جہاں جانا چاہوں پہنچا سکتا ہے' خدمت کے لئے حسیناؤں کی قطاریں لگا سکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں یہی

خواہشات کی جانی ممکن ہیں لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اس دفعہ ایک مشکل شخص کی خدمت پر لگایا گیا ہے۔ وہ اس وقت جن نہیں کوئی سیلز مین لگ رہا تھا۔ میں نے اسے روک دیا اور کہا مجھے اپنے لئے کچھ نہیں چاہئے۔ میں اپنی زندگی سے بالکل مطمئن ہوں اور مجھے سات خواہشیں بھی پوری نہیں کرانی۔ میری صرف ایک خواہش ہے' وہ پوری کر دے تو میں باقی چھ خواہشیں معاف کر کے اسے اسی وقت آزاد کر سکتا ہوں۔ میں نے جب اسے خواہش بتائی تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ دنیا سے بھوک کا خاتمہ کر دے۔ اس نے خاموشی سے کمپیوٹر پر اپنی انگلیاں چلائیں لیکن جواب میں ایک زور کی بیپ سنائی دی۔ اس نے مجھے بتایا کہ معاہدے کی شرط تین الف کے تحت یہ خواہش پوری نہیں کی جا سکتی۔ میں نے معاہدے کے کاغذ میں شرط تین الف دیکھی اس شرط کے مطابق خواہش مبہم نہیں ہونی چاہئے بلکہ واضح طور پر بتانا ضروری ہے کہ کیا کیا جائے۔ جن نے مزید وضاحت کی کہ خواہش کو اس عمل کی شکل میں بیان کیا جائے جس میں بھوک کا خاتمہ ممکن ہو جن بہت قانونی بن رہا تھا۔ لیکن اس کا سامنا مجھ سے تھا۔ میں جانتا تھا کہ بھوک کیسے ختم کی جا سکتی ہے۔ میں نے اسے حکم دیا کہ تیسری دنیا کے ان سارے ملکوں کے صحراؤں اور بنجر زمینوں پر جو اناج کی کمی کا شکار ہیں چاول اور گیہوں کی فصلیں لہرا دی جائیں اور کھلیان بھر دیئے جائیں۔ جن نے جب کمپیوٹر پر انگلیاں چلائیں تو یہ خواہش قبول کر لی گئی تھی۔ وہ اپنا لیپ ٹاپ بند کر کے کھڑا ہو گیا اس نے مجھے بتایا کہ محل تیار کر کے گاڑیاں اور لڑکیاں فراہم کرنے کا کام تو وہ چند سیکنڈ میں چٹکی بجا کر کر سکتا تھا لیکن دنیا بھر کے کھیتوں اور خشک بنجر زمینوں پر اناج اگانے میں وقت لگے گا۔ اسے جنوں کی پوری فوج مدد کے لئے بلانی پڑے گی اس لئے میری یہ خواہش پوری کرنے میں اسے چند دن لگیں گے۔ اس نے کہا کہ میری دوسری خواہش جب بھی تیار ہو چراغ رگڑ کر میں اسے پھر طلب کر سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ہاتھ ہلاتا ہوا دھوئیں کے مرغولے میں داخل ہو کر غائب ہو گیا۔

"تو کیا دنیا سے بھوک واقعی دور ہو گئی تھی۔" سلیم نے ذرا بے صبری سے

پوچھا۔

لیکن اینڈریو نے اس کا سوال سنے بغیر اپنی کہانی پھر شروع کر دی۔

"میں باقاعدگی سے گاؤں کے شراب خانے جا کر ٹی وی پر خبریں دیکھنے لگا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کوئی نظرباز جادوگر تھا یا سچ مچ کا جن۔ سچ مچ کا ہوتا تو میری خواہش پوری ہونے کے نتائج خبروں کے ذریعے سامنے آ جاتے۔ تین دن بعد اس کا جن ہونا ثابت ہو گیا۔ ٹی وی پر دن بھر خصوصی بلیٹن نشر ہوتے رہے جن میں اس معجزے کا احوال تھا کہ تیسری دنیا کے ملکوں کی ان بنجر زمینوں پر جہاں ایک تنکا نہیں اگتا تھا اناج کی فصلیں لہلہانے لگی تھیں۔ افریقی اور عرب صحراؤں' لاطینی امریکہ کے جنگلوں' ایشیا کے چٹیل میدانوں' سیم اور تھور زدہ کھیتوں اور پانی سے محروم زمینوں پر فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ میں اس دن بہت خوش رہا اور شراب پی کر رات بھر جشن مناتا رہا۔ میں جو خواب لے کر نگر نگر گھومتا پھرا تھا اس طرح اچانک بیٹھے بیٹھے پورا ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بھی خوشی تھی کہ اب امدادی ایجنسیوں کی دکانیں اٹھ جائیں گی۔ بھوک کے نام پر چندہ جمع کرنے والے پہلی بار بے روزگاری کا مزا چکھیں گے۔"

"لیکن میری یہ خوشی جلد ہی دم توڑ گئی۔ بھوک ختم کرنے کی خواہشیں پوری کرنے کا جو نسخہ میں نے استعمال کیا تھا وہ الٹے تیر کی طرح واپس آ کر مجھے لہولہان کرنے لگا تھا۔ غریب ملک خوراک اور اناج درآمد کرنے کے لئے جو پیسہ خرچ کرتے تھے وہ بچا تو انہوں نے اسے ترقیاتی کاموں کے بجائے اسلحے کی خریداری پر لگا دیا۔ پڑوسی ملکوں کے درمیان جنگ کے خطرات بڑھنے لگے۔ زرعی اجناس برآمد کرنے والے امریکی اور یورپی ممالک کی معیشتیں تباہ ہونے لگیں جنہیں بچانے کے لئے انہوں نے پہلے تو صحراؤں اور بنجر زمینوں پر اگی ہوئی فصلوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی لیکن فصل تباہ ہوتے ہی اس کی جگہ فوراً ہی نئی فصلیں لہلہانے لگتی۔ اس میں ناکامی کے بعد انہوں نے ایٹمی طاقت استعمال کر کے ریڈیائی لہریں چھوڑ دیں۔ فصلیں تو باقی رہیں لیکن تابکاری اثرات نے انہیں استعمال کے قابل نہیں رہنے دیا۔ ایٹمی اثرات نے ملک کے ملک تباہ کر دیئے۔ ہر طرف ہلاکت کا بازار گرم تھا۔ امدادی ایجنسیوں کی

دکانیں اور زیادہ چمکنے لگیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والی ہلاکتوں کا محض میں ذمہ دار تھا۔ میں نے بھوک مٹانے کا بہت احمقانہ حل سوچا تھا۔ نتائج پر غور کئے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا تھا۔

ایک رات تو میں اتنا بکھرا ہوا تھا کہ میں نے سوچا خودکشی کر لوں۔ لیکن پھر ایک خیال تیزی سے میرے ذہن میں آیا۔ میں نے کارنس پر رکھا ہوا چراغ زور سے رگڑا تو تھوڑی دیر میں ہی دھوئیں کے مرغولے سے کمپیوٹر جن آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہنا ہوا تھا لیکن ہاتھ میں لیپ ٹاپ موجود تھا۔ اس کو رات گئے جگانا پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت نرم لہجے میں درخواست کی کہ آئندہ اسے صرف نو سے پانچ کے دفتری اوقات میں طلب کیا جائے۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ اس کے کئے ہوئے ایک کام نے پوری دنیا کی نیندیں اڑا دی ہیں اور اسے اپنے سونے کی فکر تھی۔ میں نے اپنے غصے کا اظہار کیا تو اس نے بتایا کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے اپنی ہلاکت کا سامان انسان نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔ اس نے مجھے صاف صاف بتایا کہ انسانوں کے اعمال اور انسانی جذبات سے جنوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے واپس جانے کی جلدی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ بحث کرنے کے بجائے میں اپنی خواہش بیان کروں تاکہ وہ واپس جا کر اپنی نیند پوری کر سکے۔"

"میں نے کہا کہ مجھے اپنی پہلی خواہش واپس لینی ہے۔ اس نے کہا کہ معاہدے کے تحت خواہش کی واپسی بھی خواہش سمجھی جائے گی۔ مجھے پرواہ نہیں تھی۔ میں دنیا سے ہلاکت کا بازار ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھول کر بیک اسپیس یعنی پیچھے جانے والا بٹن دبایا اور گڈ نائٹ کہہ کر دھوئیں کے مرغولے میں بیٹھ کر غائب ہو گیا۔"

"دوسرے دن میں نے شراب خانے جا کر ٹی وی دیکھا تو ایسا لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ہر چیز اسی طرح تھی جیسے کہ پہلے تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ میں کوئی خواب دیکھ کر اٹھا ہوں، یا پوری دنیا ایک ٹائم مشین میں بیٹھ کر پیچھے چلی گئی ہے۔ اس رات

میں جلدی گھر واپس آ گیا اور رات بھر اپنی نئی خواہش کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس دفعہ مجھے بہت احتیاط سے کام لینا تھا۔ تمام نتائج پر اچھی طرح غور کر کے اپنی خواہش بیان کرنی تھی۔ مجھے آخر ایک حل سوجھ گیا۔ مجھے غصہ آیا کہ اتنی سادہ سی بات پہلے میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ دوسرے دن صبح نو بجے کے بعد ناشتہ کر کے اور اپنا پہلا پیگ بنا کر میں نے جن کو طلب کیا۔ میں اپنی پہلی خواہش کے تجربے سے سمجھ گیا تھا کہ مسئلہ بھوک کا ہے اسے ملکوں کی معیشتوں کو متاثر کئے بغیر بہت سیدھے سادھے طریقے سے حل کرنا چاہئے۔ میں نے اس سے کہا کہ تیسری دنیا کے نادار خاندانوں کو دونوں وقت کا کھانا ان کی میز پر پہنچتا رہے۔ اس میں کسی کا نقصان نہیں تھا۔ میں وہ کام کر رہا تھا جو وہاں کی حکومتوں کو کرنا چاہئے تھا۔ ٹھیک ہے فصلیں پیدا کر کے میں نے غلطی کی تھی، معیشت کے عالمی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا، لیکن ایک بھوکے شخص کی میز پر کھانے کی پلیٹ پہنچا کر میں کسی کے مفاد کو نقصان نہیں پہنچا رہا تھا۔ جن کی انگلیاں لیپ ٹاپ کمپیوٹر پر چلنے لگیں۔ وہ مجھے یاد دلا کر کہ میری تین خواہشیں ہو چکی ہیں چلا گیا۔

"میں ایک بار پھر خوش ہو گیا تھا کہ میں نے بھوک کا مسئلہ دنیا سے ختم کر دیا ہے۔ اب ٹی وی اور اخباروں میں دھنسی ہوئی آنکھوں، پچکے گالوں، سوکھی ٹانگوں اور پھولے ہوئے پیٹ والے بچوں کی تصویریں نظر آنا بند ہو جائیں گی۔ لیکن میری یہ خوشی بھی زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ غریبوں کو دو وقت کا کھانا ملنے لگا تو انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ کام پر صرف پیٹ بھرے جاتے تھے۔ غریبوں کی ساری زندگی تو صرف دو وقت کے کھانے کے حصول کی جنگ تھی۔ کھانا انہیں ملنے لگا تھا۔ کبھی کبھی تن ڈھانپنے یا چھت ڈالنے کی ضرورت انہیں بھی کام پر لے جاتی ورنہ وہ کھانا کھاتے اور دن بھر بیٹھ کر خوش گپیاں یا جھگڑے کرتے، عورتیں سارا وقت غیبت کرنے میں صرف کرتیں۔ صفائی کرنے اور غلاظت کے ڈھیر اٹھانے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ ہر طرف گندگی کے ڈھیر لگ رہے تھے۔ کھانا پیٹ بھر کے ملتا تو غلاظت بھی زیادہ ہوتی۔ ہر شخص کہتا وہ صرف اپنی غلاظت صاف کرے گا کسی دوسرے کی نہیں۔ لیکن گندگی

کے ڈھیر میں یہ ڈھونڈنا مشکل تھا کہ کونسی غلاظت کس کی ہے۔ بلدیاتی اور حکومتی ادارے بھی مدد کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ ان لوگوں کی غلاظت تھی جنہیں کچھ کئے بغیر روٹی ملتی تھی، جنہوں نے کام کر کے روٹی کمانے والے طبقے سے خود کو کاٹ لیا تھا۔ غلاظت اور صفائی بھی اسی کی ذمہ داری تھی جو انہیں روٹی دے رہا تھا۔ غلاظت اور گندگی کے ڈھیر پھیلنے اور بڑھنے شروع ہوئے تو بیماریاں پھوٹنے لگیں۔ ہیضے سے لاکھوں بچے اور ہزاروں لوگ مر گئے۔ بیماریوں نے ان سے بھوک بھی چھین لی تھی۔ دونوں وقت کھانا اسی طرح آتا لیکن جن گھروں میں بیماریاں آ گئی تھیں وہاں وہ اسی طرح پڑا سڑتا رہتا۔ کوئی اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ صرف مکھیاں اور کیڑے بھن بھناتے رہتے۔ بیماریاں جب وبائیں بن گئیں تو امدادی ایجنسیاں عطیات جمع کرنے اور دواؤں کے ڈبے لے کر پہنچنے لگیں۔

"میرا دماغ ایک بار پھر سن ہو گیا۔ میں نے تو بھوک کے مسئلے کا بہت سادہ سا حل دریافت کیا تھا مگر اس کے نتائج نے صورتحال کو ایک بار پھر پیچیدہ کر دیا۔ لیکن ابھی یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں ہوا تھا کہ حل نہ کیا جا سکے۔ میرے پاس ابھی چار خواہشیں باقی تھیں میں ایک خواہش استعمال کر کے گندگی کا ہمیشہ کے لئے بندوبست کر سکتا تھا۔ میں نے ایک رات چراغ رگڑ کر جن کو پھر طلب کیا۔ وہ ایک بار پھر سلیپنگ سوٹ پہنے اور ہاتھ میں لیپ ٹاپ لئے ہوئے حاضر تھا۔ مزاج کچھ بگڑا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بعض ماتحت نرمی برتنے پر بے لگام ہو جاتے ہیں۔ ان سے کام لینے کے لئے سخت رویہ اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے جب بے وقت بلائے جانے پر اس نے احتجاج کرنا چاہا تو میں نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا اور کہا کہ جب تک میری سات شرائط پوری نہیں ہوتیں وہ میرا پابند ہے اور معاہدے میں یہ کہیں تحریر نہیں ہے کہ میں اپنی خواہشات کا اظہار صرف نو سے پانچ بجے کے دوران کر سکتا ہوں۔ میں نے اسے یہ بھی ہدایت دی کہ وہ آئندہ سونے کے کپڑے پہن کر کام پر نہ آئے اور آداب کا خیال رکھے۔ میری ڈانٹ کا اس پر وہی اثر ہوا جو میں چاہتا تھا۔ وہ چند سیکنڈ کے لئے غائب ہوا اور جب دوبارہ آیا تو سوٹ پہنے ہوئے تھا چہرے پر ناراضی

بھی نہیں تھی۔ وہ بہت ادب سے "یس باس" کہہ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے اپنی چوتھی خواہش بیان کی کہ میری تیسری خواہش پوری ہونے کے نتیجے میں جو گندگی جمع ہو رہی ہے اس کی صفائی کا مستقل بندوبست کیا جائے۔ اس نے جواب میں کمپیوٹر نہیں کھولا بلکہ ناک سکیڑ کر کہا وہ جن ہے بھنگی نہیں ہے' میں نے اسے بتایا کہ اس میں بری کیا بات ہے۔ اپنے گھر کی غلاظت میں خود صاف کرتا ہوں۔ جن نے کہا کہ وہ بھی یہی کہہ رہا ہے۔ انسانوں کو اپنی غلاظت خود صاف کرنی چاہئے جنوں پر نہیں چھوڑنی چاہئے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ معاہدے کی شرط کے تحت جن ایسی کوئی خواہش پوری نہیں کریں گے جس سے ان کا ضابطہ اخلاق متاثر ہوتا ہو۔"

"وہ مجھے عورتیں فراہم کرنے کی لالچ دے چکا تھا' میں نے اس پر چوٹ کی کہ کیا عورتوں کی دلالی جنوں کے ضابطہ اخلاق میں شامل ہے۔ اس نے برا مانے بغیر بتایا کہ عورتوں کی دلالی کا مطلب جسم فروش عورتوں کا کاروبار ہے۔ جبکہ میرے لئے خدمت کرنے والی عورتیں خاص طور پر تیار کی جاتیں کیونکہ دنیا میں ایسی کوئی عورت موجود نہیں ہے جو ہر اعتبار سے آدمی کی خواہشات سے مطابقت رکھتی ہو۔ پھر ان عورتوں کی خدمت جنسی ضرورتوں کو تسکین پہنچانے تک محدود نہیں ہوتی۔ وہ کھانا پکانے اور کپڑے دھونے سے لے کر پاؤں دبانے تک کے سارے کام کرتیں۔ اس لئے عورتیں فراہم کرنے کی خواہش پوری کرنے میں اسے کسی شرمندگی کا سامنا نہیں ہوتا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جنوں کی اپنی گندگی کون صاف کرتا ہے۔ اس نے بہت فخر سے مجھے بتایا کہ جن انسان نہیں ہیں۔ وہ گندگی نہیں کرتے اس لئے انہیں صفائی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو اس کام کے لئے چڑیلوں کو بلایا جاتا ہے جو اپنی لمبی لمبی جھاڑوؤں سے ہماری گرد جھاڑ دیتی ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کام کے لئے وہ چڑیلوں کو طلب کیوں نہیں کرتا۔ اس نے بتایا کہ چڑیلوں کی ناک بھی بہت بڑی ہے۔ وہ انسانوں کی غلاظت صاف نہیں کریں گی اور ہمارے کہنے پر ہمیں خوش کرنے کے لئے ایک بار کر بھی دیں تو دوبارہ نہیں کریں گی۔ مسئلہ اسی طرح باقی رہے گا۔"

"میرے پاس اب کوئی اور راستہ نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے خواہش واپس لینے کی خواہش بیان کی۔ کمپیوٹر کھول کر اس نے بیک اسپیس دبایا اور شب بخیر کہہ کر چلا گیا۔ دنیا ایک بار پھر ٹائم کیپسول میں بند ہو کر تھوڑا سا پیچھے کھسک گئی۔ بھوکے ایک بار پھر بھوکے رہ گئے اور دوسروں کی غلاظت صاف کرنے کے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ لیکن میں ان کی اس صورتحال سے مطمئن نہیں تھا۔ مجھے ان کے مسئلے کو حل کرنا تھا۔ بھوک کو شکست دینی تھی۔ مجھے اگر یہ طاقت مل گئی تھی کہ دنیا سے غربت ختم کر سکوں تو مجھے اس طاقت کو استعمال کرنا ہی تھا۔ میرے پاس ابھی تین خواہشیں باقی تھیں۔ لیکن مجھے اب بہت سوچ و بچار کی ضرورت تھی۔ کوئی ایسا طریقہ ڈھونڈنا تھا کہ بھوک کا مسئلہ بھی حل ہو جائے اور اس کے برے اثرات بھی نہ ہوں۔ اس نتیجہ پر تو میں پہنچ چکا تھا کہ سیدھا اور آسان راستہ کوئی نہیں ہے۔ بھوک کو تجارت کا ذریعہ بنانے والے آسانی سے ہار نہیں مانیں گے۔ مجھے معلوم تھا بھوک اسی لئے باقی ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس کھانے کے لئے زیادہ ہے۔ یہ توازن ٹھیک ہو گیا تو وہ توازن بگڑ جائیں گے جو بھوک اگانے والے نظام نے بنا رکھے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نظام کے مقامی اور بین الاقوامی رکھوالے بہت طاقتور ہیں۔ انہیں صرف جنوں کی طاقت ہی ہرا سکتی تھی۔ لیکن مجھے جنوں کی اس طاقت کا استعمال بہت ہوشیاری سے کرنا تھا۔ میں رات رات بھر جاگ کر سوچ و بچار کرتا رہتا۔ کئی حل ذہن میں آئے تھے۔ لیکن ان سب کے نتیجے میں کسی نہ کسی خرابی کی توقع تھی۔ ایک رات میں بالکل نہیں سویا اور سوچ سوچ کر صبح تک اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا جس پر مجھے بہت پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میری پہلی خواہش بھی شاید یہی ہوتی' لیکن اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ عالمی سطح پر جن اتنا بڑا کام کر سکتے ہیں یا نہیں۔ میں اپنی پچھلی خواہشوں کے نتیجے دیکھ چکا تھا کہ جن کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"میں نے صبح ہی صبح جن کو طلب کر لیا۔ وہ آیا تو بہت ترو تازہ اور خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس کے چہرے پر آفٹر شیو کی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ سوٹ نیا تھا اور ٹائی کے رنگ بھی بدلے ہوئے تھے۔ میں نے جب اپنی خواہش بیان کی تو اس کے چہرے

کا رنگ بھی بدل گیا۔ وہ تشویش بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ مجھے اپنے فیصلوں پر ماتحتوں کا سوال کرنا کبھی پسند نہیں آیا تھا۔ فیصلہ کرنے کے بعد سنا دیا گیا تھا' ان کا کام اب اسے انجام تک پہنچانا تھا۔ اس پر عمل درآمد کرنا تھا۔ میں نے اسے ایک بار پھر بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ دنیا کا تمام اسلحہ تباہ کر دیا جائے۔ تمام ایٹم اور ہائیڈروجن بم' ایٹمی و کیمیائی ہتھیار' میزائل' راکٹ' ٹینک' توپیں' بندوقیں' پستول' خنجر' تیر کمان غرض ہر وہ ہتھیار جو انسان نے ایک دوسرے کو مارنے کے لئے بنایا ہے ناپید کر دیا جائے۔ جن نے کمپیوٹر پر میری پانچویں خواہش کی کمانڈ دی اور دھوئیں کے مرغولے پر سوار ہو کر واپس چلا گیا۔ میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری اس خواہش کے پورا ہونے سے بھوک اچانک ختم نہیں ہو گی۔ آہستہ آہستہ ختم ہو گی لیکن دنیا امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ کسی کو کسی کا ڈر نہیں رہے گا۔ غریب ملک جو اپنے بجٹ کا پچاس پچاس فیصد ہتھیار خریدنے پر خرچ کرتے ہیں اب عوامی بہبود کے پروگراموں پر خرچ کر سکیں گے۔ فوجی بغاوتوں کا اندیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا۔ بڑی طاقتوں کی بلیک میلنگ بند ہو جائے گی۔ میں تمام دن بہت اطمینان سے سوتا رہا۔ رات کو اٹھ کر گاؤں کے شراب خانے گیا تو ٹی وی پر خبریں دیکھ کر میرا دل چھلانگیں مارنے کو چاہا۔ تیسری دنیا کے نادار عوام بے خوفی سے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ انہیں اب فوج اور پولیس کی توپوں اور گولیوں کا سامنا نہیں تھا۔ انہوں نے بدعنوان حکمرانوں کو ان کے محلوں سے نکال کر کھڑے کھڑے موت کی سزا سنا کر پھانسیوں پر لٹکا دیا تھا۔ ہر طرف عوامی راج کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی اس وقت ہوئی جب نائیجیریا اور برما میں عوام نے فوجی جنتا کے تختے الٹ دیئے اور فوج کے ذریعے حکومت کرنے والے جرنلوں کو ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ لائبریا میں خانہ جنگی کرنے والے مسلح گروہوں کو چھپنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ چیچنیا میں مسلمانوں نے روسی فوجوں کو مار بھگایا تھا۔ میں گھر واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ مجھے اس رات بہت اچھی نیند آئی۔ دوسرے دن شراب خانے جاتے وقت میری روح بہت

اونچی پرواز کر رہی تھی۔ میں نے بھوک سے زیادہ بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ جمہوریت اپنی اصل شکل دکھا رہی تھی۔ الیکشن میں پیسوں سے خریدی ہوئی مصنوعی جمہوریت کی جگہ بے داغ جمہوریت لے رہی تھی۔"

"دوسرے دن ٹی وی پر خبریں دیکھیں تو جمہوریت اتنی بے داغ نہیں رہی تھی۔ اگلے کئی دنوں تک ہر آنے والی خبر میری تشویش بڑھاتی رہی اور آخر میں تو مجھے حیرت تھی کہ میں اب تک پاگل کیوں نہیں ہوا۔ ایک بار پھر میری تدبیر الٹ گئی تھی۔ حکومتوں کے تختے تو الٹ گئے تھے لیکن انارکی کا عالم تھا۔ کسی کے پاس اپنے اقتدار کو قائم رکھنے اور امن بحال کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ جس کے حامیوں کا غول بڑا ہو جاتا وہ دست بدست جنگ لڑ کے اقتدار کے محلوں میں گھس جاتا۔ فوج اور پولیس کی نفری اتنے بڑے بڑے ہجوموں کا مقابلہ نہ کر سکی تو وہ بھی کسی نہ کسی گروہ کے پیچھے لگ کر خانہ جنگی میں شامل ہو گئی۔ تعمیرات میں استعمال ہونے والے لوہے کے سریئے اور فرنیچر کی لکڑی نئے ہتھیار بن گئے تھے۔ جو زیادہ ماہر تھے وہ ٹرکوں پر پتھر لاد کر گھومتے اور جہاں ضرورت ہوتی پتھروں کی بارش کر کے حملہ آور ہوتے۔ بازار بھی بند ہو گئے تھے۔ دکانوں کی لوٹ مار کو روکنے والی طاقت نہیں رہی تھی۔ ٹی وی کی نشریات بھی بیچ میں کئی بار رک جاتیں۔ کوئی غول ٹی وی اسٹیشن میں گھس کر قبضہ کرتا اور تقریریں کر کے چلا جاتا۔ مغربی ممالک اور امریکہ میں حکومتیں تو نہیں بدلی تھیں کیونکہ ان کے عوامی ادارے بہت مضبوط تھے لیکن بدامنی نے وہاں بھی ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ سب سے خطرناک صورت اس وقت ہوئی جب میکسیکو سے لاکھوں افراد کے غول نے سرحد پار کر کے کیلی فورنیا پر قبضہ کر لیا۔ کیوبا سے کشتیوں میں لائے ہوئے ہزاروں افراد میامی پہنچنے لگے۔ تاہیتی سے بھی کشتیوں کی کشتیاں امریکہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ویت نام، کمبوڈیا اور فلپائن سے بوٹس میں سوار ہو کر سینکڑوں لوگ آسٹریلیا کے ساحلوں پر اترنے لگے تھے۔ چینیوں نے جاپان کا رخ کیا تھا۔ عراقیوں نے کویت کی طرف مارچ شروع کر دیا تھا۔ مشرقی یورپ سے مغربی یورپ کی طرف عوامی یلغار ہونے لگی تھی۔ پوری دنیا ایک افراتفری کا شکار تھی۔ لوگ ہتھیار کے بغیر

بھی مر رہے تھے۔ بجلی، پانی، فون سب نظام گڑ بڑ تھے، ڈر کے مارے تمام بینک بند تھے، دکانیں اور بازار اجڑے پڑے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اسے اب کیسے روکا جائے۔ میں نے سوچا جن کو بلا کر ہر جگہ ایک حفاظتی فوج کھڑی کرا دوں۔ لیکن جن انسانوں کی لڑائی کیوں لڑیں گے اور اگر لڑیں گے بھی تو وہ انسانی جذبوں سے عاری ہوں گے اور قتل و خون کا ایسا بازار گرم کریں گے کہ دنیا پناہ مانگے گی۔ شراب خانے میں دن بھر سر پکڑ کر بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ مجھے کچھ کرنا ہی تھا۔ رات کو بارہ بجے گھر پہنچ کر جن کو طلب کرنے کے لئے میری نظریں چراغ کو تلاش کرنے لگی تھیں۔ جن کمپیوٹر ہاتھ میں لئے ہوئے جب دھوئیں کے مرغولے سے باہر آیا تو اس کے ماتھے پر بل تھے لیکن اس نے اپنا بزنس سوٹ پہنا ہوا تھا اور لیپ ٹاپ کھولے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کچھ کہے بغیر سر ہلا دیا۔ اس نے بیک اسپیس کا بٹن دبا کر کمپیوٹر بند کیا اور خاموشی سے دھوئیں میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔"

"دنیا پھر ایسی ہی ہو گئی تھی جیسی کہ تھی۔ بھوک، بدامنی، بدعنوان حکمران، خانہ جنگیاں، بڑی جنگوں کے خطرے، سب کچھ اسی طرح تھا۔ مجھے ان سب کو بدلنا تھا لیکن میرے پاس اب صرف ایک خواہش باقی بچی تھی۔ اب غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میری کوئی نئی مہم جوئی کوئی غلط تجزیہ میری خواہش کا کوئی ان دیکھا نتیجہ جو تباہی لے کر آتا اسے میں پلٹ نہیں سکتا تھا۔ میری سوچ و بچار کا نیا دور شروع ہو گیا تھا۔"

اینڈریو خاموش ہو کر باربرا کے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

"تو پھر آپ نے ساتویں خواہش کیا سوچی؟" سلیم نے بہت بے تابی سے پوچھا۔ لیکن اینڈریو کے جواب نے اسے بہت مایوس کر دیا۔

"جس دن ساتویں خواہش سمجھ میں آ گئی ناول مکمل ہو جائے گا۔ میں اور باربرا روز سوچتے ہیں لیکن ابھی تک کوئی اچھا حل سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لئے ہماری ناول بس یہیں پر رکی ہوئی ہے کہ میں ابھی سوچ رہا ہوں۔ ایک روز جن بھی آتا ہے اور یاد دلاتا ہے کہ مجھے اب ساتویں خواہش بتا کر اسے آزاد کر دینا چاہئے۔ میں نے

جب اسے بتایا کہ ابھی تک میں فیصلہ نہیں کر سکا ہوں تو اس نے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں دنیا کا خیال چھوڑ دوں اور اپنی پرواہ کروں۔ دنیا جس طرح چل رہی ہے اسی طرح چلتی رہے گی۔ بہتر یہی ہے کہ میں ساتویں خواہش استعمال کر کے زندگی بھر کے لئے مکان، شراب اور عورت کا بندوبست کر لوں۔ لیکن میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ لالچ دے کر مجھے بھی خودغرض اور بے ایمان بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر بے یقینی کے عالم میں سر ہلاتا رہا پھر اس نے مجھے تجویز دی کہ دنیا سے بھوک مٹانے اور امن قائم کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انسان کو تہذیب سے پہلے کے دور کی طرف بھیج دیا جائے۔ اس دور میں جب انسان غاروں میں رہتا تھا۔ شکار کر کے پیٹ بھرتا اور پتوں سے تن ڈھانپتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حرص و ہوس سے بیگانی دنیا ہی امن کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ لیکن میں نے اس کی تجویز رد کر دی۔ ایک تو مجھے فیصلہ کرنے کے عمل میں ماتحتوں کی مداخلت پسند نہیں تھی۔ پھر ابتدائی زمانے کے مقابلے میں اب دنیا کی آبادی بہت ہو گئی تھی۔ سر چھپانے، پیٹ بھرنے اور تن ڈھانپنے کے لئے شاید اتنے غار، جانور اور پیڑ موجود نہ ہوں جتنی کہ ضرورت ہے۔ اور سب سے بڑھ کر مجھے شبہ تھا کہ جن انسانوں سے اپنا بدلہ چکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جنوں کو انسان کی ترقی پسند نہیں آئی ہو گی۔ یہ جن میری خواہش کی آڑ میں انسان کو دوبارہ حیوان بنا کر اپنی خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ جن تو مایوس ہو کر چلا گیا لیکن میں اب بھی سوچ رہا ہوں کہ دکھی انسانیت کو ٹھیک کرنے کے لئے کون سا نسخہ استعمال کروں۔" اینڈریو خاموش ہوا تو اسے ہچکیاں لگ گئیں۔ اس نے باقی بچی ہوئی شراب کا بڑا سا گھونٹ لیا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے ایک بڑی سی ہچکی آئی۔ وہ اپنا علاج کرنے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا اور سلیم اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔

سلیم کو رات بھر خواب میں مختلف طرح کے جن آ کر ڈرا ڈرا کے اس کی خواہشیں پوچھتے رہے۔ لیکن سہمے ہوئے سلیم کی آواز رات بھر بند رہی۔ صبح اٹھ کر ناشتہ کرتے ہوئے سلیم دل ہی دل میں مسکرا کر سوچ رہا تھا کہ اگر سچ مچ کا جن آ گیا تو

وہ اس سے بشیر کو برباد کر دینے کی خواہش کا اظہار کرے گا۔ لیکن سلیم کو یہ خبر نہیں تھی کہ بشیر کو برباد کرنے کے لئے کسی جن کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی بربادی کے سامان کرنا خود جانتا تھا۔

باربرا کی طبیعت دو تین دن تک خراب رہنے کے بعد ٹھیک ہو گئی تھی۔ ان کے روز و شب بھی اپنے معمول پر آ گئے تھے۔ سلیم ساتویں خواہش کی تلاش میں ان کی بحث اور جھگڑوں کو بہت مزے لے کر سنتا۔ آج کل اینڈریو کی طبیعت زیادہ اچھی نہیں رہتی تھی۔ ہچکیوں کے شدید دورے پڑتے۔ دن میں کئی کئی بار الٹیاں کرنی پڑتیں۔ باربرا اسے بہت تشویش سے دیکھتی رہتی۔ لیکن اس کے شراب کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس نے باربرا سے کہا تھا کہ انہیں اب ناول ختم کرنے کے لئے کوئی حل نکال ہی لینا چاہئے تاکہ کتاب ختم کر کے علاج کرانے وہ اسپتال میں داخل ہو سکے۔ ایک صبح دونوں میں زور کا جھگڑا ہوا تھا۔ اس روز اینڈریو کی طبیعت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ باربرا کی شراب اور سگریٹ کا کوٹا بھی ختم ہو رہا تھا۔ اس نے دنیا کے مسائل کا جو حل اینڈریو کو بتایا اس نے اینڈریو کو مشتعل کر دیا۔ باربرا کا کہنا تھا کہ جن سے کہہ کر شراب کی نہریں نکالی اور بنے بنائے سگریٹوں کے کھیت اگائے جائیں۔ اس کا کہنا تھا کہ روٹی تو لوگوں کو مل ہی جاتی ہے۔ اصل مسئلہ شراب اور سگریٹ کا ہے جس کے لئے بہت سے پیسے چاہئیں۔ وہ پیسے جو اکثر لوگوں کے پاس نہیں ہوتے۔ شراب اور سگریٹ مفت ملنے لگے گی تو وہ امن سے رہیں گے۔ اینڈریو نے پہلی بار اسے بیوقوف اور احمق جیسے لقب سے یاد کیا تھا اور کہا تھا کہ شراب اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے۔ اسی پر دونوں میں تکرار بڑھ گئی تھی۔ سلیم ایسے موقعوں پر انہیں تنہا چھوڑ دیتا اور باہر نکل جاتا۔ کبھی گاؤں کی سیر کرتا یا پھر شہر چلا جاتا۔ شہر گئے بہت دن ہو گئے تھے اس لئے وہ کینبرا جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔

کینبرا کے مرکزی بازاروں میں گھومنا اور پھر درختوں کے جھنڈ میں پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھنا اسے بہت پسند تھا۔ گھومتے گھومتے تھک گیا تو آج بھی وہ کافی لے کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ موسم اتنا خنک ہو جائے گا ورنہ وہ گرم سوئٹریا

جیکٹ پہن کر آتا۔ ایک ہاتھ میں کافی اور ایک ہاتھ جیب میں ڈالے وہ سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ گرم کافی سے نکلتی ہوئی بھاپ سے خود کو گرمی پہنچاتے ہوئے اس کی نظر نزدیک بنچ پر رکھے ہوئے اخبار پر پڑی۔ شاید پڑھنے کے بعد کوئی اخبار چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ سلیم بے خیالی میں جیب سے ہاتھ نکال کر بنچ پر رکھے ہوئے اخبار کے ورق پلٹنے لگا۔ اندر کے صفحے پر ایک بڑی سی تصویر دیکھ کر اس کے ہاتھ سے کافی کا کپ چھٹ کر گرتے گرتے بچا۔ کافی بنچ پر رکھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اخبار اٹھا لیا۔ تصویر لیزا اور ایلن کی تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں جن کا سرا ایک پولیس والے کے ہاتھ میں تھا۔ خبر پڑھی تو دل چاہا کہ اٹھ کر ناچنا شروع کر دے۔ اپنے اس خیال پر بعد میں اسے افسوس ہوا۔ وہ دکھ کی ایک خبر پر مسرت کا اظہار کر رہا تھا۔ خبر کے مطابق پولیس نے ہیروئن اسمگل کر کے آسٹریلیا لانے کے الزام میں بشیر احمد اور اس کی دو ساتھی عورتوں کو گرفتار کیا تھا۔ بشیر احمد جہاز سے سخت تکلیف کے عالم میں اترا تو کسٹمز کے افسران نے بیمار سمجھ کر اس کی مدد کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ مدد لئے بغیر چلے جانا چاہتا تھا اور اس کی ساتھی دونوں عورتیں بھی اسے کسٹمز کے ساتھ دیکھ کر نکل جانے کی کوشش کر رہی تھیں جس پر کسٹمز کے افسر کو شبہ ہوا اور وہ پولیس کی مدد سے تینوں کو حراست میں لے کر اسپتال لے گیا۔ بشیر احمد کی حالت راستے میں ہی خراب ہو گئی تھی' اسپتال میں آپریشن کر کے اسے بچانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ وہ اپنے پیٹ میں آپریشن کر کے ہیروئن سے بھرے دو کیپسول رکھوا کر لایا تھا جن میں سے ایک پھٹ گیا تھا۔ دونوں لڑکیوں کے پیٹ سے بھی ہیروئن بھرا ہوا ایک کیپسول نکلا تھا' لیکن دونوں نے ساری ذمہ داری بشیر احمد پر ڈال دی تھی اور کہا تھا کہ وہ انہیں پاکستان گھمانے لے گیا تھا اور انہیں بلیک میل کر کے پیٹ میں کیپسول رکھنے پر رضامند کیا تھا۔ عدالت نے دونوں لڑکیوں کی ضمانت کی درخواست مسترد کر دی تھی۔

سلیم کو بشیر احمد کے انجام پر افسوس ہوا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ بشیر احمد کا اس کے سوا کوئی اور انجام ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اگر پیٹ میں ہیروئن کے پھیلے ہوئے

زہر سے نہیں مرتا تو کسی نہ کسی کے ہاتھوں مارا جاتا۔ لیکن جو کچھ ہوا تھا شاید اچھا ہی ہوا تھا۔ سلیم کو معلوم تھا کہ سڈنی میں کتنے لوگوں نے بشیر احمد کے مرنے پر اطمینان کا سانس لیا ہو گا۔ سلیم نے اخبار کا وہ صفحہ پھاڑ کر اپنی جیب میں رکھا اور ایک ہی گھونٹ میں کافی ختم کر کے بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا بن باس ختم ہو گیا تھا۔ وہ اگر جلدی کرتا تو اپنا سامان باندھ کر شہر آنے والی آخری بس پکڑ سکتا تھا۔ شہر سے سڈنی جانے والی کوچیں ہر گھنٹے بعد مل جاتی تھیں۔ گھر جاتے ہوئے سلیم وائن اور واڈکا کی ایک ایک بوتل بھی لیتا گیا تھا۔ باربرا اور اینڈریو کا شکریہ ادا کرنے کا اس سے بہتر طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔

سلیم گھر واپس پہنچا تو باربرا اور اینڈریو بہت خوشگوار موڈ میں ہنس بول رہے تھے۔ وائن اور واڈکا کی بوتل سلیم سے لے کر اینڈریو نے اسے لپٹا لیا اور باربرا نے بوسے کے لئے اپنا گال آگے بڑھا دیا۔

''آج کے دن اس سے اچھا تحفہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ تمہیں پتہ ہے ہمیں اپنی ساتویں خواہش مل گئی ہے۔ ہمارا ناول اب کچھ ہی دنوں میں مکمل ہو جائے گا۔'' اینڈریو نے بہت پرجوش انداز میں کہا۔ سلیم کو واقعی بہت خوشی ہوئی۔ لیکن اس وقت وہ اس سے زیادہ اپنے واپس جانے کی خوشی میں گم تھا۔

''بہت بہت مبارک ہو' میں بہت خوش ہوں۔ آج کا دن ہم سب کے لئے خوشی کا دن ہے۔ آپ کو پتہ ہے میں جس کے ڈر سے یہاں چھپا ہوا تھا وہ مارا گیا۔ میں اب سڈنی جانے کے لئے آزاد ہوں۔ میں سات بجے کی بس لے کر واپس جا رہا ہوں۔'' دونوں سلیم کے جانے کی خبر سن کر ایک دم خاموش ہو گئے۔ باربرا نے خاموشی توڑتے ہوئے سلیم کو اپنے پاس بلا کر گلے سے لگایا۔

''ہم دونوں تمہارے لئے بہت خوش ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تم سڈنی جا کر اپنی تعلیم مکمل کرو گے اور وطن واپس جا کر اپنے خاندان سے جا ملو گے۔'' سلیم نے دل میں آمین کہا لیکن سوچا کہ اس سے پہلے اسے قانونی بھی ہونا ہے۔ اس نے دل میں تہیہ کیا تھا کہ قانونی بننا اب اس کی سب سے اول ترجیح ہو گی۔ وہ بار بار کسی بشیر

احمد کے ہاتھوں بلیک میل ہو کر خانہ بدوش بننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ سلیم سامان باندھنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے اینڈریو کی آنکھوں میں لکھے ہوئے اس سوال کو پڑھنے کی فرصت نہیں تھی کہ ''آخری خواہش سن کر نہیں جاؤ گے۔'' ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کی بس جانے والی تھی۔

کینبرا چھوڑے سلیم کو کئی مہینے ہو گئے تھے۔ سڈنی میں سلیم کی زندگی اب اپنے ڈھب پر آتی جا رہی تھی۔ اس کے سارے منصوبے آج کل سائرہ کی ہاں یا نہیں میں اٹکے ہوئے تھے۔ سائرہ ایک اچانک جھونکے کی طرح آئی تھی اور اس کی زندگی میں اٹک گئی تھی۔ سلیم نے اسے مضبوطی سے تھام لیا تھا وہ اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ ایک دن سائرہ کے ساتھ کافی پینے جا رہا تھا کہ جارج اسٹریٹ پر کتابوں کی ایک دکان کے شو کیس میں اسے ایک بڑے پوسٹر کے ساتھ کتابوں کا اہرام بنا نظر آیا۔ سلیم شاید توجہ نہ دیتا کیونکہ اینڈریو نے سلیم کو اپنی کتاب کا نام نہیں بتایا تھا۔ لیکن کتاب کی پشت پر اینڈریو اور باربرا کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ سلیم شو کیس کے سامنے جم کر رہ گیا۔ پورے شو کیس کو اینڈریو اور باربرا کی کتابوں سے سجایا گیا تھا۔ سلیم نے سوچا کہ دکان کے سب سے بڑے شو کیس میں سجنے کا اعزاز تو سب سے زیادہ بکنے والی کتاب کو ملتا ہے۔ کتاب کا نام تھا ''خوابوں کا سوداگر'' دکان میں جا کر دیکھا تو سلیم کا خیال غلط نہیں تھا۔ ''خوابوں کا سوداگر'' سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں سرفہرست تھی۔ سلیم نے جب سائرہ کو بتایا کہ اس کتاب کے لکھنے والے اس کے دوست ہیں، وہ ان کے شب و روز میں شامل رہا ہے تو سائرہ بہت متاثر ہوئی۔ وہ ایک کتاب خرید کر نکل آیا۔

گھر پہنچ کر سلیم نے سب سے پہلے کتاب کا آخری باب کھولا۔ اسے یہ معلوم کرنے کی بے چینی تھی کہ اینڈریو نے آخری خواہش کیا بیان کی تھی۔ آخری باب پہلے ابواب کے مقابلے میں زیادہ تفصیلی تھا۔ سلیم کو پڑھتے ہوئے ایسا لگا جیسے کتاب میں سے جھانکتا ہوا اینڈریو سگریٹ کے کش لیتا اسے کہانی کا خلاصہ سنا رہا ہو۔ کتابوں کے

صفحات سے ہچکیاں لیتے ہوئے اینڈریو کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ساتویں اور آخری خواہش کے خدوخال واضح ہونے شروع ہو گئے تھے۔ جن ایک دن صبح ہی صبح بن بلائے آ گیا تھا۔ وہ اس بات پر زیادہ خوش نہیں تھا کہ میں نے اس کی دی ہوئی تجویزیں رد کر دی تھیں۔ وہ مجھ پر دباؤ ڈالنے آیا تھا کہ میں جلدی سے اپنی آخری خواہش بیان کر کے اس کی آزادی کا سامان کروں۔ وہ اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ انسانوں کا کمینہ پن دیکھ دیکھ کر وہ بہت بور ہو گیا ہے اور ڈرتا ہے کہ اس کی عادتیں بھی خراب نہ ہو جائیں۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ معاہدے کے مطابق میرے پاس ابھی ایک ہفتہ اور باقی ہے' اس لئے اب وہ اس وقت تک نہ آئے جب تک میں خود اسے طلب نہ کروں۔ اس نے بڑی سعادت مندی سے اپنا سر ہلایا اور "یس باس" کہتا ہوا دھوئیں میں بیٹھ کر اڑ گیا۔"

"میں نے اسے وقت ختم ہونے سے ایک روز پہلے رات کے وقت طلب کیا۔ میں بھی شاید اذیت پسند ہو گیا تھا۔ میں چاہتا تو صبح بھی بلا سکتا تھا۔ لیکن یہ آخری موقع تھا جب میں اسے بے آرام کر سکتا تھا۔ وہ آیا تو اس کے ماتھے پر بل نہیں بلکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ سویا نہیں تھا تیار بیٹھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج میں اسے رات گئے بلاؤں گا۔ وہ میری نفسیات جان گیا تھا۔ آج اس نے "یس باس" نہیں بلکہ لیپ ٹاپ کھول کر "کیا حکم ہے میرے آقا" کا نعرہ لگایا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ میں نے اس سے اپنی خواہش بیان کی تو وہ ضد پر اتر آیا۔ کہنے لگا کہ اس خواہش پر عملدرآمد ممکن نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ ایٹم بم جیسے مہلک ہتھیار ختم کرنے کی خواہش مان سکتا تھا' یہ تو بہت بے ضرر سی خواہش تھی۔ میں نے صرف یہ چاہا تھا کہ دنیا کو جن لکیروں نے تقسیم کیا ہے وہ مٹا دی جائیں' سرحدیں ختم کر دی جائیں' زبان' تہذیب' ثقافت' کھانا' رہن سہن' بول چال' ذات' قبیلے یہ سب فرق ختم کر دیئے جائیں۔ دنیا کو سمیٹ کر ایک گاؤں بنا دیا جائے۔ عالمی گاؤں بنانے کی یہ خواہش جن کو پسند نہیں آئی تھی۔ وہ بہانے بازیاں کرنے لگا۔ مجھے بھی اپنے ماتحتوں کی حکم عدولی پسند نہیں تھی۔ میں نے اس سے سختی

کے ساتھ کہا کہ میری آخری خواہش معاہدے میں بیان کی گئی شرائط کے مطابق ہے اس لئے وہ کمپیوٹر میں ڈال کر دیکھے کہ اسے کیا جواب ملتا ہے۔ میرے سخت لہجے سے ڈر کر اس نے کمپیوٹر پر انگلیاں چلانی شروع کیں۔ کوئی بیپ سنائی نہیں دی۔ جنوں کے کمپیوٹر نے میری خواہش تسلیم کر لی تھی۔ جن نے ایک لمبا سانس لے کر لیپ ٹاپ بند کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ اس خواہش کی تکمیل کے لئے اسے عام جنوں کی نہیں ماہر جنوں کی ضرورت پڑے گی جس میں کچھ وقت لگے گا۔ اس نے کہا۔ اب وہ مجھ سے آخری ملاقات کے لئے اسی وقت آئے گا جب میری ساتویں خواہش پوری ہو جائے گی اور اس کے نتائج سامنے آ جائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ دھوئیں کے غبار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

میں ڈر کے مارے بہت دنوں تک ٹی وی پر خبریں سننے شراب خانے نہیں گیا۔ گھر سے ہی نہیں نکلا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی خواہش بیان کی تھی۔ لیکن پھر بھی ایک انجانا سا خوف تھا۔ میں نے اپنی پچھلی خواہشیں بھی بہت سوچ سمجھ کر تیار کی تھیں۔ لیکن ان کے نتائج بہت بھیانک نکلے تھے۔ اس وقت میں ان نتائج کو بدلنے پر قادر تھا۔ لیکن اگر اس دفعہ کچھ ہوا تو پھر دنیا پیچھے کی طرف نہیں جا سکے گی۔ میں نے دنیا بدل تو دی تھی لیکن اپنی بدلی ہوئی دنیا کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا تو ایک شام جن بغیر بلائے آگیا۔ آج اس کے ہاتھ میں کمپیوٹر نہیں تھا۔ وہ جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ وہ اب میرا پابند نہیں رہا ہے' خواہشوں کا کمپیوٹر بھی اس نے لوٹا دیا ہے اور اب آزاد ہو کر وطن واپس جا رہا ہے اس لئے ڈریس کوڈ سے بھی آزاد ہے۔ میرے چہرے پر فکر اور پریشانی کے آثار دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی۔ وہ پوچھنے لگا کہ اپنی آخری خواہش پوری ہونے پر میں خوش کیوں نہیں ہوا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے اب تک اپنی بدلی ہوئی دنیا دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوا ہے۔ میں گھر سے ہی نہیں نکلا ہوں۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔ ''آؤ میں تمہیں تمہاری بدلی ہوئی دنیا دکھاؤں۔'' اس نے بہت خوشدلی سے کہا اور مجھے لے کر گاؤں کے شراب

خانے کی طرف چل دیا۔ شراب خانے کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ خوب چهل پہل تھی۔ آسٹریلیا کے قدیمی باشندے مختلف میزوں پر بیٹھے گاؤں کے مقامی لوگوں سے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنی قدیم "کوری" زبان بول رہے تھے جو آسانی سے سب کی سمجھ میں آ رہی تھی' اس سے پہلے اس شراب خانے میں قدیمی باشندوں کا داخلہ بند تھا۔ وہ گاؤں سے ذرا فاصلے پر اپنی علیحدہ بستی میں رہتے تھے۔ لیکن آج تو پورا جغرافیہ بدل گیا تھا۔ جن مجھے ایک میز پر لے گیا جہاں ایک ویت نامی خاندان بیٹھا وہسکی پی رہا تھا۔ ان کی ویت نامی زبان مجھے انگریزی کی طرح سمجھ میں آ رہی تھی اور میری انگریزی سمجھنے میں انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بوٹ پر کئی دنوں کا سفر کر کے آسٹریلیا پہنچے تھے اور آج گھومتے ہوئے اس طرف آ نکلے تھے۔ میں نے ٹی وی دیکھا تو اس میں گم ہو گیا۔ کوئی جاپانی فلم آ رہی تھی لیکن مجھے ایسا لگا کہ وہ جاپانی بادشاہ جس کی یہ کہانی تھی میری اپنی تاریخ کا حصہ تھا۔ جن نے دنیا کی خبریں سنا کر مجھے سکتے میں ڈال دیا۔ اس نے بتایا کہ پوری دنیا بدل گئی تھی۔ بھارت کے بازاروں میں چینی بے خوفی سے گھومتے اور خریداری کرتے نظر آتے۔ بھارتی بھکشو تبت جا کر اپنا روحانی وجدان حاصل کرتے۔ کشمیر کی کنٹرول لائن ختم ہو گئی تھی۔ پہاڑی ندیوں سے دریاؤں میں اترنے والا پانی سرحدوں کے امتیاز کے بغیر دوڑنے لگا تھا۔ ہندو مسلم نفاق ختم ہو گیا تھا۔ میکسیکو سے اب بھی بڑی تعداد میں کیلی فورنیا آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن میکسیکن اب امریکہ میں اجنبی نہیں لگتے تھے۔ اس طرح رچ بس گئے تھے جیسے صدیوں سے یہیں رہتے آئے ہوں۔ امریکیوں کی ایک بڑی تعداد بھی میکسیکو کے بے فکر اور بے پرواہ ماحول میں رہنے کے لئے ان کے علاقوں میں جا کر بسنے لگی تھی۔ کیوبا سے اب بھی کشتیاں غریب الوطنوں کو بھر کر میامی لاتی تھیں لیکن اس سے زیادہ امریکی باشندے میامی سے کیوبا کی طرف پرواز کرنے لگے تھے۔ یورپ میں بھی مشرق و مغرب کی تفریق ختم ہو گئی تھی۔ زبان کا فرق مٹ گیا تھا تو سب کے رنگ ایک دوسرے میں مل گئے تھے۔ صدام حسین مکہ معظمہ میں اور شاہ حسین بیت المقدس میں عبادت کرنے لگے تھے۔ اقوام متحدہ کو بیکار سمجھ کر توڑ دیا گیا تھا۔ سرحدی لسانی

اور نسلی جھگڑے ختم ہو گئے تو ہتھیاروں کو بھی زنگ لگنے لگا۔ فوجوں کو کھیتی باڑی اور تعمیراتی کاموں پر لگا دیا گیا تھا۔ تھائی اور چینی ہوٹلوں میں فرانسیسی اور ہندوستانی ہوٹلوں میں اٹلی اور برازیل کے لوگ کھانا کھاتے نظر آئے۔ سری لنکا میں بیس بال اور جاپان میں کرکٹ کھیلی جانے لگی تھی۔ افریقہ میں ستار اور امریکہ میں طبلہ مقبول ہو رہا تھا۔ سرحدیں مٹنے لگیں اور زبان و ثقافت کا فرق دور ہوا تو پوری دنیا سمٹ کر ایک چھوٹا سا گاؤں بن گئی تھی۔

"میں جن کے ساتھ کئی گھنٹے گزار کر گھر واپس آیا تو خوشی میں ڈوبا ہوا تھا بہت سی ملی جلی لذتیں مجھ میں سما گئی تھیں۔ میری آخری خواہش نے دنیا کو بدل کر رہنے کے قابل بنا دیا تھا۔ گھر میں آ کر جن میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کا چراغ مجھے واپس کرنا تھا اس لئے میں نے اسے چمکا کر اور صاف کر کے رکھا تھا۔ اسے دیا تو اس نے مجھے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ جن اور چراغ کی صدیوں پرانی کہانی آج ختم ہو گئی ہے۔ اس چراغ کو رگڑنے سے اب کوئی جن حاضر نہیں ہو گا۔ یہ چراغ یادگار کے طور پر میں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔ وہ مجھ سے مرعوب تھا کہ حالات کتنے بھی خراب ہوئے میں نے دنیا کو بدلنے کا جذبہ ترک نہیں کیا ایک بڑی خواہش کا کسی ذاتی خواہش سے سودا نہیں کیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ اگر جنوں میں کبھی قبائلی اور نسلی جنگ چھڑی تو امن قائم کرنے میں مدد دینے میں ان کے دیس ضرور آؤں گا۔ میں نے اسے اپنی واڈکا کی خالی بوتل دی اور کہا کہ وہ جب بھی اس بوتل کو رگڑے گا میں حاضر ہو جاؤں گا۔ وہ ہنستا ہوا بہت گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر اور دھوئیں کے غبار پر سوار ہو کر رخصت ہو گیا۔ واڈکا کی خالی بوتل وہ سچ مچ ساتھ لے گیا تھا اور شاید اپنے وطن پہنچتے ہی اسے میری ضرورت پیش آ گئی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے دھوئیں کے ایک بادل پر سوار میں بھی آسمانوں میں اڑا جا رہا ہوں۔"

13

سڈنی ۱۹۹۵ء

سائرہ سلیم کو دوسری لڑکیوں سے مختلف لگی تھی' بہت خاموش خاموش' لئے دیئے رہنے والی بہت اکیلی سی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ہر وقت ہلکی سی اداسی گھر کئے رہتی۔ بیٹھے بیٹھے اچانک کہیں کھو جاتی۔ ایسا لگتا جیسے کھوئے ہوئے کسی لمحے کو تلاش کر رہی ہو۔ وہ اسی فیکٹری میں کام کرتی تھی جہاں کینبرا سے آنے کے بعد سلیم کو کام ملا تھا۔ سلیم سے اس کا تعارف دفتر کی کرسمس پارٹی میں ہوا تھا۔ سلیم اس زمانے میں بہت مایوسی کا شکار تھا۔ قانونی بننے کی کوششوں میں ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ سائرہ سے ملاقات نے اس کے منصوبوں کو ایک بار پھر زندہ کر دیا۔

کینبرا سے واپس آتے ہی سلیم نے مشتاق کو فون کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اپنے تینوں دوستوں کا پتہ اسے مشتاق سے مل جائے گا۔ اس کا خیال صحیح تھا۔ لیکن کم

گو مشتاق کے مختصر سے جواب نے سلیم کے دل میں غلط فہمیوں کے گھاؤ ڈال دیئے۔ مشتاق نے بتایا تھا ظہور، چودھری انور اور مشتاق تینوں اسی پرانے فلیٹ میں ہیں، فون نمبر بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ سلیم کے حیرت ظاہر کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ فلیٹ خالی نہیں کیا گیا تھا۔ سلیم نے فون جب ہک پر واپس لٹکایا تو اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں اسے لگا جیسے تینوں نے مل کر سارا ڈرامہ اسے گھر سے نکالنے کے لئے کیا تھا۔ وہ اسے بشیر احمد سے دوستی کی سزا دینا چاہتے تھے۔ سلیم کو یقین تھا کہ تینوں اس فلیٹ سے کبھی گئے ہی نہیں ہوں گے، اسی لئے وہ مصر تھے کہ سلیم انتظار نہ کرے اور چلا جائے۔ سلیم نے سوچا فون کر کے ان سے پوچھے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن سلیم بھی غلط فہمی کے بھینسے کو سینگ سے پکڑنے والا پہلوان نہیں تھا۔ اسے اندر ہی اندر کھولنے میں مزا آتا تھا۔

وہ سینٹرل اسٹیشن کے پاس ایک سستے سے موٹل میں ٹھہر گیا۔ قسمت اچھی تھی کہ دو دن بعد ہی اسے نوکری مل گئی۔ ہوسٹل کی طرز پر چلائی جانے والی ایک عمارت میں اس نے ایک کمرہ بھی کرائے پر لے لیا تھا۔ اپنے معاملات جب ٹھکانے پر لگ گئے تو ایک ہفتے کی صبح سلیم اپنے دوستوں سے ملنے گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ہر ہفتے کو صبح کے وقت تینوں گھر پر ہوں گے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ انہوں نے سلیم کی جگہ کسی اور کو اپنے ساتھ رکھ لیا ہو گا۔ سلیم کا یہ خیال تو ٹھیک تھا کہ تینوں گھر پر تھے لیکن اسے کوئی چوتھا نظر نہیں آیا۔ ظہور اور اقبال چائے کے کپ ہاتھ میں لئے ہوئے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ چودھری انور اپنی نیند پوری کر رہا تھا۔ سلیم کو دیکھتے ہی دونوں خوشی سے اچھل پڑے۔ چودھری انور بھی آنکھیں ملتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے بھی سلیم کو گلے سے لگا لیا۔ ظہور کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"مولانا کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مشتاق کو فون کیا تو کوئی نمبر چھوڑا نہ پلٹ کر فون کیا۔ لگتا ہے ناراض ہو۔" ظہور نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ سلیم ان کی گرمجوشی دیکھ کر اپنے آپ سے شرمندہ ہو رہا تھا شاید اس کی سوچ غلط تھی لیکن پھر اسے اپنا اس گھر سے نکالا جانا یاد آیا۔ انہوں نے کس طرح اسے تنہا بھٹکنے کے لئے

وڑ دیا تھا۔

"نہیں ظہور بھائی میں نے ایک دو بار فون کیا لیکن آپ لوگ نہیں تھے۔" ں نے منمناتے ہوئے جھوٹ بولا۔

"لیکن تمہارا سامان کہاں ہے۔ تمہارا بستر ابھی تک گرم ہے اور تمہارا انتظار ر رہا ہے۔ تمہارا چھوڑا ہوا سامان بھی اسی طرح رکھا ہے۔ مشتاق نے فلیٹ چھوڑنے کے بجائے پاکستان سے آنے والی کسی فیملی کو رکھ لیا تھا۔ اسی لئے سامان بیچنے' یدنے اور نیا مکان لینے کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔ بشیر احمد کی چھٹی ہوتے ہی ہم یٹ میں واپس آ گئے تھے۔ تمہارا کوئی پتہ ہی نہیں تھا۔ تم کہاں رہے۔" ظہور نے پوچھا۔

"میں کینبرا چلا گیا تھا۔ بشیر کے مرنے کی خبر اخبارات میں پڑھی تو واپس آ گیا۔ ایک فیکٹری میں نوکری مل گئی تو اسی کے پاس میں نے رہنے کی جگہ بھی لے لی ہے۔ چھ مہینے کی لیز سائن کی ہے اس لئے ابھی تو میرا یہاں آ کر رہنا مشکل ہے۔" سلیم نے نظریں چراتے ہوئے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا انہیں شاید یقین نہیں آیا تھا۔ چودہری انور کی آنکھوں میں یوسی ابھر آئی تھی لیکن اقبال نے کندھے اچکا دیئے۔ ترجمانی کا فریضہ ظہور کے ذمے تھا۔

"تمہاری مرضی۔ لیکن اس گھر میں تمہاری جگہ اسی طرح رہے گی۔ کوئی چوتھا آیا تو تم ہی آؤ گے۔ چودہری انور کمرے میں اکیلا سوتے ہوئے ڈرتا ہے۔ لیکن ہم میں کسی نئے رنگروٹ کا تجربہ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔" سلیم نے سوچا شاید اس کا خیال غلط تھا۔ شاید وہ صحیح کہہ رہے تھے۔ لیکن بہانے بازیاں بھی کر سکتے تھے۔ ظہور اس فن کا ماہر تھا۔ ظہور سلیم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چہرے پڑھنے کا ماہر تھا۔ لیکن سلیم کا چہرہ پڑھنے کے لئے کسی مہارت کی ضرورت نہیں تھی۔ بالکل شفاف چہرہ تھا۔ جو کچھ سوچتا تھا بڑے بڑے حرفوں سے چہرے پر تحریر ہو جاتا تھا۔ ظہور کو لگا یہ پہلے والا سلیم نہیں ہے۔ اس کے انداز میں پہلی سی گرمجوشی

نہیں تھی۔ پچھلے چند ہفتوں کے واقعات نے شاید اسے بڑا کر دیا تھا۔ اس میں فیصلے کرنے کی جرات آ گئی تھی۔ اسے بڑا ہونے کا لیکچر بھی ظہور نے ہی دیا تھا۔ ظہور سمجھ گیا کہ وہ ابھی تک اپنے تنہا چھوڑے جانے پر ناراض ہے۔

ظہور نے سلیم کے گھر واپس آ کر رہنے کے مسئلے پر اس کے بعد کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اپنے اپنے کام پر ہونے والی دلچسپ کہانیاں سناتے رہے۔ سلیم نے انہیں اینڈریو اور باربرا کی کہانی سنائی۔ ظہور نے اپنے ریسٹورنٹ کے قصے سنا کر مسکراہٹیں بکھیرنے کی کوشش کی۔ وہ بتا رہا تھا جب سے ان کے ریسٹورنٹ میں ایک ٹرکش لڑکی کے بیلی ڈانس کا پروگرام ہونے لگا ہے ہوٹل بھرا رہتا ہے۔ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔

"ڈانس ختم کرتے ہی وہ کچن میں چلی آتی ہے اور دو آدمیوں کا کھانا اکیلے کھا جاتی ہے۔ میں اپنے مالک کو بتا رہا تھا کہ کھا کھا کر اس کی رقص کرنے والی کمر کمرہ بن جائے گی اس لئے وہ کسی دوسری لڑکی کا بندوبست کر لے۔ میرے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کی عاشق ہو گئی ہے۔ مجھے لالچ دیتی ہے کہ گھر آ کر اپنے ڈانس کا اسپیشل شو دکھائے گی۔" ظہور نے ہنستے ہوئے سلیم سے کہا۔ "سلیم میاں تمہاری شادی پر بیلی ڈانس کا پروگرام کرائیں گے۔ لیکن اس کی کمر غائب ہونے سے پہلے کوئی لڑکی تلاش کر لو۔" سب ہنسنے لگے۔

چوہدری انور گفتگو میں کم حصہ لیتا تھا لیکن اس وقت اس کی کہانی ظہور سے بازی لے گئی تھی۔ وہ پچھلی رات اپنی ٹیکسی میں بیٹھنے والی ایک مسافر عورت کا قصہ سنا رہا تھا۔

"میں نے اسے آکسفورڈ اسٹریٹ کے ایک نائٹ کلب سے اٹھایا تھا۔ صبح کے دو بجے تھے وہ کلب سے نکل کر فٹ پاتھ پر کھڑی ادھر ادھر ہل رہی تھی۔ بیس اکیس سال سے زیادہ عمر کی نہیں تھی۔ کالے رنگ کا تنگ بلاؤز اور کالے رنگ کی چھوٹی سی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ بڑے ماہرانہ انداز میں بہت تیز سیٹی بجا کے مجھے روکا اور میرے برابر ہی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ آدھے راستے وہ اپنی ساتھی لڑکیوں کو گالیاں دیتی

رہی جو اسے اکیلا چھوڑ کر اپنے اپنے ہم رقص لڑکوں کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ باقی آدھے راستے وہ جھومتی ہوئی بار بار میرے اوپر گر جاتی تھی۔ سڑکیں سنسان نہ ہوتیں تو حادثہ ہو سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے سیٹ بیلٹ باندھنے پر مجبور کیا۔ وہ نارتھ رائڈ میں کہیں رہتی تھی۔ تیس ڈالر کے قریب کرایہ بنا تھا۔ اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ کر میں نے اسے سوتے سے اٹھایا اور بتایا کہ اس کا گھر آگیا ہے۔ وہ میری شکل دیکھنے لگی۔ میں نے اسے کرائے کے پیسے بتائے تو اپنی قمیض کے بٹن کھولنے لگی۔ میں گھبرا گیا۔ میں نے پوچھا کیا کر رہی ہے کہنے لگی اس کے پاس کرائے کے پیسے نہیں ہیں۔ میں اس طرح اپنا کرایہ وصول کر لوں۔"

"کس طرح۔" ظہور نے شرارتی نظروں سے چودھری انور کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ظہور بھائی چودھری کو ٹوکو مت۔ قصہ سنانے دو۔" اقبال نے کہا۔ اسے مزا آ رہا تھا۔

"میں نے اسے دھمکی دی کہ میں اسے پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا۔" چودھری نے اپنی کہانی دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ "کہنے لگی میں صرف اپنا وقت ضائع کروں گا۔ مجھے پیسے پھر بھی نہیں ملیں گے۔ پیسے اس کے پاس تھے ہی نہیں۔ اس نے مجھے اپنا خالی پرس الٹا کر کے دکھایا اور انگڑائی لے کر کہنے لگی میں جلدی سے اپنا کرایہ وصول کروں تاکہ وہ جا کر سو سکے۔ اس کی بے شرمی پر مجھے سخت غصہ آنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میرے تیس ڈالر مارے گئے۔ میں نے اس سے کہا کہ فوراً میری گاڑی سے اتر کر دفع ہو جائے۔ لیکن اس نے اترنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگی کرایہ دیئے بغیر نہیں جائے گی۔ میں نے گاڑی سے اتر کر اس کی طرف کا دروازہ کھولا اور ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ کر ٹیکسی سے اتارنے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ سڑک پر تماشا نہ بنائے اور میری جان چھوڑ دے۔ ٹیکسی سے تو اتر گئی کہنے لگی کہ گاڑی میں ڈر لگتا ہے تو میں اس کے کمرے میں چلوں۔ میں نے ایک بار پھر اسے دفع ہو جانے کے لئے کہا اور اس سے ہاتھ چھڑانے لگا۔ لیکن وہ میرا بازو پکڑ کر لٹک گئی۔ بڑی مشکل سے

بیس ڈالر دے کر جان چھڑائی۔"
"بیس ڈالر دے کر۔" سلیم نے حیرت ظاہر کی۔
"ہاں۔ کہتی تھی کہ اس کے پاس کھانے کے بھی پیسے نہیں بچے ہیں۔ کم از کم اس کے پیٹ کی بھوک مٹا کر جاؤں۔ میں نے جیب سے بیس ڈالر نکال کر دیئے تو کتیا شکریہ ادا کرنے کے بجائے گالی دے کر چلی گئی۔ کہتی تھی کہ آج کا دن ہی خراب ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور تک ہاتھ لگانے کو تیار نہیں ہے۔" چودھری انور نے بہت جھینپتے ہوئے اپنی کہانی ختم کی۔
"انور بھائی مجھے اس لڑکی کی محرومیوں سے ہمدردی ہو رہی ہے۔ اس کا پتہ بتا دو۔ میں ابھی جا کر اس کی خدمت بجا لاؤں گا۔" اقبال نے چودھری انور کے گھٹنے پکڑتے ہوئے کہا۔ چودھری انور نے اس کی کمر پر ایک زور کا دھپ رسید کیا۔
"بہت خوش نصیب ہو گی وہ لڑکی جس کے لئے چودھری نے خود کو بچا کر رکھا ہے۔" ظہور نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔
"بابا کا خط آیا ہے انہوں نے فیصل آباد میں برادری کی ایک لڑکی سے میری بات پکی کر دی ہے۔" چودھری انور شرماتے ہوئے انہیں بتانے لگا۔ "میرے کیس کا جو بھی فیصلہ ہو اگلے سال میں پاکستان چلا جاؤں گا۔ بابا کہتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے مجھے اپنے ہاتھوں سے گھوڑی پر چڑھانا چاہتا ہے۔"
چودھری انور کے اس انکشاف پر سب حیران رہ گئے۔ تینوں نے اسے بڑے خلوص سے مبارکباد دی۔
"لیکن پاکستان میں تمہارے خلاف قتل اور زنا کا جو کیس تھا اس کا کیا ہو گا۔ پولیس کو اگر تمہارے آنے کا پتہ چل گیا تو......." سلیم نے اپنی تشویش ظاہر کی۔
"وہ کیس چند مہینے پہلے ختم ہو گیا ہے۔ کالو بدمعاش الیکشن کے دوران ایک جھگڑے میں مارا گیا۔ جو سیاستدان اس کی سرپرستی کرتا تھا وہ بھی الیکشن ہار گیا ہے اور اس کی جگہ مہرانیوں کا آدمی آ گیا ہے۔ میرے باپ نے بڑے مہرانی کے ذریعے اور کچھ پیسے کھلا کر کیس ختم کرا دیا ہے۔ بابا نے کیس ختم ہوتے ہی کہا تھا کہ آ جاؤں لیکن

امیگریشن کے کیس کو بیچ میں چھوڑ کر چلا گیا تو اتنے برسوں کی محنت بیکار چلی جائے گی۔ پھر مجھے ابھی اپنے چھوٹے بھائی کو بھی بلانا ہے۔" چودھری انور کے لہجے میں نیا عزم تھا۔ آنکھیں بھی چمکنے لگی تھیں۔

سلیم جانا چاہتا تھا لیکن تینوں نے اسے کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دیا۔ ظہور نے کہا تھا کہ وہ سلیم کے پسند کا آلو گوشت پکائے گا۔ چودھری انور لہسن چھیل کر اور پیاز کاٹ کر ظہور کی مدد کر رہا تھا۔ اقبال سلیم کو غیر قانونیوں کے بلیٹن کی تازہ خبریں سنانے لگا۔ اقبال کا خیال تھا کہ شہریت حاصل کرنے کا سب سے مختصر اور آسان راستہ اب بھی شادی تھا۔ لیکن اس نے سلیم کو خبردار کیا تھا کہ کاغذی شادیاں کرانے والے کسی ایجنٹ کے پاس نہ جائے۔ خود کچھ کرنے کی کوشش کرے۔ اقبال خود بھی آج کل پابندی سے عاشقی نائٹ کلب کے چکر لگا رہا تھا جہاں فجی کی بھارتی نژاد لڑکیوں کی بڑی تعداد ڈسکو کرنے آتی تھی۔ وہ ہم زبان تھیں اور ان کی ثقافت بھی ملتی جلتی تھی۔ اکثر پاکستانی لڑکے آج کل فجی کی لڑکیوں کے گرد ہی چکر کاٹ رہے تھے۔ اقبال نے سلیم کو بھی دعوت دی تھی وہ اس کے ساتھ عاشقی نائٹ کلب چلے۔ وہ کسی لڑکی سے اس کی دوستی بھی کرا دے گا۔ لیکن سلیم نے اسے بڑی نرمی سے منع کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کا امیگریشن لینے کے لئے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ سلیم ڈسکو ٹائپ نہیں تھا۔ وہاں ناچنے کے لئے آنے والی تیز طرار لڑکیاں اس کے قابو میں نہیں آتیں۔ وہ سایوں کے پیچھے بھاگ کر وقت اور پیسہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ظہور اور چودھری انور اپنے اپنے کام پر چلے گئے۔ اقبال نے اصرار کر کے سلیم کو فلم دیکھنے کے لئے روک لیا۔ اقبال "بازار" لے کر آیا تھا اس کی بہت تعریف کر رہا تھا۔ سلیم نے اس فلم کے بارے میں سنا تھا لیکن دیکھی نہیں تھی۔ فلم بہت اچھی لیکن اداس کرنے والی تھی۔ حیدر آباد دکن میں لڑکیوں کی شادی کے مسئلے پر بنائی گئی تھی۔ دوبئی سے ادھیڑ عمر کا ایک امیر آدمی شادی کرنے حیدر آباد آتا ہے۔ غربت کا مارا ہوا ایک خاندان پیسوں کے لالچ میں اس سے اپنی جوان بیٹی کا رشتہ کر دیتا ہے۔ لیکن لڑکی ایک اور غریب لڑکے سے محبت کرتی ہے اور شادی

کی رات زہر کھا کر مرجاتی ہے۔ گھر واپس آکر بھی سلیم کے ذہن پر فلم کا تاثر قائم رہا تھا۔ اقبال نے سلیم کو بتایا تھا کہ حیدر آباد میں ایسی کہانیاں عام تھیں۔ فرق یہ تھا کہ شادی کے نام پر فروخت کی جانے والی ہر لڑکی زہر کھا کر نہیں مرتی تھی' بار بار مرنے کے لئے زندہ رہتی تھی۔

سلیم نے اپنے لئے آسٹریلوی بیوی کی تلاش بڑے منظم انداز میں شروع کی۔ سب سے پہلے مسلم نیوز اور فجی ٹائمز میں ضرورت رشتہ کا اشتہار چھپوایا۔ دو ہفتے تک یہ اشتہار چھپتا رہا۔ سلیم کا خیال تھا کہ بے شمار فون آئیں گے۔ وہ ہر ہفتے اور اتوار کو دن دن بھر فون کی گھنٹی بجنے کے انتظار میں رہتا۔ فون آئے لیکن بہت کم اور جو آئے ان میں سے کوئی بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ زیادہ تر ہندوستانی اور پاکستانی لڑکیوں کے لئے تھے۔ لیکن یہ معلوم ہو کر کہ وہ ایک فیکٹری میں ملازم ہے' فون کرنے والوں کا جوش ختم ہو جاتا۔ ایک دو ایسے فون آئے جن کی رشتے دار لڑکیاں ہندوستان اور پاکستان میں تھیں۔ وہ سلیم کے لئے بیکار تھیں۔ ایک فلسطینی لڑکی کا رشتہ آیا تھا۔ لیکن یہ لڑکی بھی غیر قانونی تھی۔ ریفیوجی کا کیس فائل کر کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔ بنگلور کی ایک ہندوستانی لڑکی کے سلسلے میں بات بڑھی تھی اور ملاقات کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ سلیم کو بلا کر دیکھا اور لڑکی کو دکھایا گیا تھا لیکن اگلے ہفتے جب اس نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ لڑکی کا رشتہ کہیں اور پکا ہو گیا ہے۔ ضرورت رشتہ کے اشتہار کے بعد سلیم نے پلان نمبر دو آزمایا۔ اس نے آسٹریلیا کی اسلامی کونسل سے رابطہ قائم کیا۔ کونسل کے سیکریٹری سے وقت لے کر ملا اور بتایا کہ وہ کسی بھی نیک مسلمان مطلقہ یا بیوہ سے شادی کر کے ثواب کمانے کا خواہشمند ہے۔ کونسل کے سیکریٹری نے بتایا کونسل شادی بیاہ کے معاملات میں خود کو ملوث نہیں کرتی' لیکن اگر کسی نے کبھی رابطہ کیا تو وہ بڑی خوشی سے انہیں سلیم کا پتہ بتا دیں گے۔ کئی دنوں بعد سلیم کو اسلامی کونسل کے سیکرٹری کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ ایک بوسینن لڑکی کے والدین رشتہ دیکھ رہے ہیں۔ سلیم سرے ہلز کی مسجد میں مغرب کی نماز کے بعد امام سے ملے۔ وہ لڑکی

کے باپ سے تعارف کرا دیں گے۔ سلیم کو خوشی ہوئی، کیونکہ مسجد کے امام سلیم کو اس وقت سے جانتے تھے جب اس نے آسٹریلیا آنے کے بعد کچھ دن مسجد میں قیام کیا تھا۔ سلیم مغرب کی نماز میں شریک ہوا اور بعد میں امام سے مل کر آنے کا مقصد بیان کیا۔ مولانا اور ان کی تبلیغی جماعت میں شامل بہت نورانی شکل اور لمبی داڑھی والے بوسینن مولانا نے مل کر سلیم کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو میں سلیم بری طرح ناکام ہوا تھا۔ انہیں نماز، روزہ اور شرع کے پابند مسلمان لڑکے کا رشتہ چاہئے تھا۔ سلیم کو تو انہوں نے کبھی جمعہ کی نماز میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ داڑھی بھی نہیں تھی۔

جس روز یہ دروازہ بند ہوا اسی روز ایک اور دروازہ کھل گیا۔ مسجد میں اس وقت نماز پڑھنے کے لئے آنے والے ایک پاکستانی نے اسے ایک مولانا کا پتہ بتایا جو آسٹریلوی حکومت کے منظور شدہ نکاح خواں تھے اور شادی بیاہ کے معاملات میں پاکستانی اور بھارتی خاندانوں میں بہت بھروسے کے قابل سمجھے جاتے تھے۔ سلیم نے فون کر کے ان سے ملاقات کا وقت لیا۔ وہ شہر سے دو گھنٹے کی مسافت پر جھیل کے کنارے بنے ہوئے ایک بڑے سے مکان میں رہتے تھے۔ مولانا کے بہت شائستہ لہجے سے ان کا پڑھا لکھا ہونا ظاہر تھا۔ وہ امامت کو ذریعہ معاش نہیں دینی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے اور کسی کمپنی میں اچھے عہدے پر ملازم تھے۔

ابتدائی تعارف اور رسمی گفتگو کے بعد جب سلیم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو مولانا نے تھوڑی دیر توقف کیا اور پھر کچھ سوچ کر سلیم کو بتایا کہ سڈنی میں بہت زمانے سے رہنے والے ایک پاکستانی ڈاکٹر اپنی چھوٹی بیٹی کے لئے رشتہ دیکھ رہے ہیں۔ لڑکی کو حال ہی میں صرف چھ ماہ کی شادی کے بعد طلاق ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی تین بیٹیاں تھیں۔ جس لڑکی کا رشتہ تھا وہ تیسرے نمبر کی تھی۔ پہلی دو کی شادیاں آسٹریلیا میں رہنے والے پاکستانی خاندانوں میں ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جہیز میں ایک داماد کو ریسٹورنٹ اور دوسرے کو فلیٹ خرید کر دیا تھا۔ سب سے چھوٹی کی شادی پاکستان میں رہنے والے اپنے ایک دور کے رشتے دار لڑکے سے کی تھی۔ انہوں نے اس لڑکے کو اپنے ساتھ گھر داماد بنا کر رکھا تھا۔ آسٹریلیا میں پلی بڑھی لڑکی اپنی دونوں

بہنوں کے مقابلے میں شاید زیادہ تیز تھی۔ وہ پاکستان کے بالکل مختلف ماحول سے نکل کر آنے والے لڑکے سے نباہ نہ کر سکی۔ خود بیوی کا رویہ اچھا نہیں رہا تو گھر کے دوسرے لوگوں کا برتاؤ بھی خراب ہو گیا۔ چھ مہینے کے اندر لڑکے نے ان کے گھر کے ساتھ بیوی کو بھی چھوڑ دیا۔ اس لڑکے نے انہیں مولانا کے پاس آکر پناہ حاصل کی تھی اس کی طلاق کی کارروائی بھی مولانا نے مکمل کی تھی اور سڈنی لے جا کر اسے ملازمت بھی دلوائی تھی۔ اب ڈاکٹر صاحب کی طلاق یافتہ بیٹی کا رشتہ بھی وہی تلاش کر رہے تھے۔

مولانا نے سلیم کو ساری کہانی صاف صاف بتا دی تھی۔ "ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیٹی دونوں کو سخت پچھتاوا ہے۔ ناکام شادی کا مجرم دونوں خود کو سمجھتے ہیں۔ لڑکی کی ساری تیزی نکل گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی انا کو بھی سخت دھچکا پہنچا ہے۔ انہیں ڈر ہے شادی کی ناکامی پر ان کی بیٹی نفسیاتی کیس بن جائے گی اس لئے فوری طور پر وہ اس کی شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے تمہارا رشتہ ان کے لئے ہر اعتبار سے قابل قبول ہو گا۔"

"مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ بات آگے بڑھا سکتے ہیں۔" سلیم نے اپنی بے تابی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"آج اتوار کا دن ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی سرجری بند ہوتی ہے۔ اگر وہ گھر پر ہوئے تو آپ کو آج ہی ان سے ملوا دیتا ہوں۔" مولانا یہ کہہ کر فون کرنے اٹھ گئے اور سلیم کے لئے خوشخبری لے کر آئے کہ ڈاکٹر صاحب نے شام کی چائے پر بلایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب سڈنی کے نواح میں رہتے تھے۔ سلیم مولانا کے ساتھ ان کی پرانی گاڑی میں دو گھنٹے کا سفر طے کر کے جب ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچا تو ان کے انتہائی شاندار مکان کی وسعت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اندر سے مکان کی سجاوٹ اور اس کا فرنیچر بھی مکینوں کی امارت ظاہر کر رہا تھا۔ سلیم نے دل ہی دل میں مسکرا کر سوچا کہ اس کی بدنصیبی کے دن شاید پورے ہو گئے ہیں۔ وہ تو قانونی بننے کے لئے کسی بھی راہ چلتی لڑکی سے شادی کے لئے تیار تھا لیکن مقدر کی یاوری سے اسے محلوں والی سسرال مل

رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے سلیم کا بہت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ بہت پر تکلف ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا۔ ان کی بیٹی جس کا نام انہوں نے پروین بتایا تھا بہت فرمانبردار پاکستانی بیٹیوں کی طرح چائے کی ٹرالی کھینچتی ہوئی لائی جس میں تازہ تلے ہوئے گرم سموسے اور بہت خوشبودار گاجر کا حلوہ سجا تھا۔ پروین نے جب سلیم کی طرف پلیٹ بڑھائی تو ایک لمحے کے لئے ان کی نگاہیں ٹکرائی تھیں۔ سلیم کو پروین کی آنکھوں میں اپنے لئے پسندیدگی کی جھلک نظر آئی جس سے اس کی خود اعتمادی اور بڑھ گئی۔ ڈاکٹر صاحب سلیم سے اس کے کیرئیر اور خاندان کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے رہے۔ سلیم کے پس منظر سے سب بہت متاثر ہوئے تھے۔ سلیم جب مولانا کے ساتھ واپس جانے کے لئے ڈاکٹر صاحب سے اجازت لے کر اٹھا تو اسے یقین تھا کہ رشتہ طے ہو گیا ہے۔ مولانا بھی مطمئن نظر آتے تھے۔ انہوں نے سلیم کو گھر چھوڑا اور کہا کہ وہ کل ڈاکٹر صاحب سے بات کر کے ان کا فیصلہ معلوم کریں گے۔

سلیم کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ آنکھ لگی تو دلہن بنی پروین اسے باسی سموسے کھلا رہی تھی یا کبھی سہرے میں منہ چھپائے وہ گھوڑے پر چڑھا ہوا ایک بڑے سے میدان میں تنہا بھاگ رہا تھا۔ سلیم صبح ہی صبح اٹھ کر نہا دھو کر ناشتہ کر کے اور تیار ہو کر مولانا کے فون کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی تیاریوں سے لگتا تھا کہ مولانا کا فون آتے ہی بارات لے کر ڈاکٹر صاحب کے گھر دوڑا جائے گا۔ مولانا کا فون گیارہ بجے آیا تھا۔ ان کے پہلے ہی جملے نے سلیم کے سارے خواب سچے کر دیئے۔

"مبارک ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے پروین سے تمہارا رشتہ منظور کر لیا ہے۔" مولانا کی مسکراہٹ سلیم فون پر بھی محسوس کر سکتا تھا۔

"بہت بہت شکریہ۔ یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے۔ میرا سرپرست بن کر باقی کام بھی آپ کو کرنا ہے۔ آپ کو معلوم ہے میرا اپنا آسٹریلیا میں کوئی نہیں ہے۔" سلیم سے اپنی خوشی ضبط نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں سلیم کو لگا کہ اس کی خوشیوں کا محل ریت کے مکان کی طرح گرنے لگا ہے۔

"رسمی طور پر ہاں کرنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب پاکستان میں تمہارے بارے میں

چھان بین کرنا چاہتے ہیں۔ تم پاکستان میں اپنے بزرگوں کا نام پتہ اور فون نمبر دے دو تو یہ مرحلہ بھی طے کر لیا جائے۔" مولانا نے فون کے دوسری طرف سے کہا۔ وہ اگر سامنے ہوتے تو سلیم کا سرخ ہوتا ہوا چہرہ دیکھ کر انہیں حیرت ہوتی۔

"وہ مجھے دیکھ چکے ہیں۔ میرے بارے میں سب پوچھ گچھ کر چکے ہیں۔ اب انہیں پاکستان میں کیا چھان بین کرنی ہے۔" سلیم کے لہجے میں تیزی تھی۔

"شادیوں کے موقع پر اس طرح کی پوچھ گچھ ایک معمول کی روایت ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔" مولانا کو سلیم کے ردعمل پر حیرت ہوئی۔ سلیم نے بھی سوچا کہ اس کا ردعمل واقعی غیر منطقی تھی۔ اسے وجہ بتانی چاہئے۔

"مجھے اعتراض نہیں ہے' مسئلہ یہ ہے کہ میں اس شادی کے بارے میں اپنی ماں کو نہیں بتانا چاہتا۔ میں ان کی ایک ہی اولاد ہوں' وہ اسی حسرت میں زندہ ہیں کہ دولہا بنا کر اپنے ہاتھوں سے میری بلائیں لیں۔ انہیں میری شادی کا سن کر بہت دکھ ہو گا۔ وہ بیمار بھی رہتی ہیں۔ ممکن ہے اس غم کو برداشت نہ کر سکیں۔ شادی کر کے پاکستان جاؤں گا اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ دوں گا تو وہ مجھے دو چار باتیں سنا کر بہو کو گلے لگا لیں گی۔ اتنی دور بیٹھی ہوئی شادی کی خبر سنیں گی تو کڑھتی رہیں گی اور شدید اذیت میں مبتلا ہو جائیں گی۔" سلیم کی وجہ بہت وزنی تھی۔

"میں ڈاکٹر صاحب سے کہوں گا وہ معلومات اس طرح کریں کہ آپ کی والدہ کو خبر نہ ہو۔" مولانا نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد مسئلے کا حل نکالا۔

"آپ کو معلوم ہے یہ ممکن نہیں ہو گا۔ جس سے پوچھا جائے گا وہ میری ماں کو بتانا اپنا فرض سمجھے گا۔ آپ ڈاکٹر صاحب کو سمجھائیں کہ میں ان کا ہر طرح سے اطمینان کرانے کے لئے تیار ہوں۔ جو پوچھنا چاہتے ہیں بتانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن پاکستان میں انکوائری کھلوا کر اپنی ماں کو تکلیف نہیں دوں گا۔" سلیم نے بہت عاجزانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے مولانا سے کہا۔

"اللہ آپ کی والدہ کو صحت دے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے سمجھانے کی

کوشش کرتا ہوں۔ آپ ابھی گھر پر ہیں؟" سلیم کا اثبات میں جواب سن کر مولانا نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

سلیم بہت بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلتا اور دل میں دعا مانگتا رہا کہ ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں اس کی بات آ گئی ہو۔ اچھا خاصا معاملہ بنتے بنتے بگڑنے لگا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسے ایسا دوسرا رشتہ نہیں ملے گا۔ فون کی گھنٹی بجی تو سلیم کا دل دھڑکنے لگا۔ مولانا نے کسی تمہید کے بغیر اسے ڈاکٹر صاحب سے بات چیت کا نتیجہ سنا دیا۔ "میں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی ہے۔ وہ پاکستان میں تمہارے بزرگوں سے رابطہ کرنے پر مصر ہیں۔ وہ بہت شکی آدمی ہیں۔ تمہارے انکار نے ان کا شک اور بڑھا دیا ہے۔ میرا خیال ہے ان کی احتیاط غلط نہیں ہے۔ میں نے تمہاری والدہ کے بارے میں انہیں بتایا تھا۔ انہوں نے اس کا حل نکال لیا ہے۔ وہ شادی میں شرکت کے لئے تمہاری والدہ کو آسٹریلیا بلوا لیں گے۔ سارا خرچ خود دیں گے۔ ویزے کا بندوبست بھی خود کریں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہاری والدہ کو اپنے گھر میں رکھیں گے اور ان کا اچھی طرح علاج بھی کریں گے تاکہ وہ پوری طرح صحت مند ہو کر پاکستان جائیں۔ میرے خیال میں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔" مولانا کی بات مکمل ہوئی تو سلیم سمجھ گیا تھا کہ بیل جڑوں سمیت اکھڑ گئی ہے۔ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"ڈاکٹر صاحب سمجھتے ہیں کہ وہ پیسے سے ہر چیز خرید سکتے ہیں۔ پہلے وہ صرف داماد خریدتے تھے۔ اب داماد کو اس کی ماں سمیت خریدنا چاہتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجئے گا میں اور میری ماں دونوں بکاؤ نہیں ہیں۔ انہوں نے پہلے بھی بہت احتیاط اور چھان بین کر کے شادی کی تھی لیکن وہ بھی چھ مہینے میں ختم ہو گئی۔ ان کی احتیاط اس وقت کام نہیں آئی اور اگر مقدر اچھا نہیں ہے تو اب بھی کام نہیں آئے گی۔ جوڑے احتیاط سے نہیں مقدر سے بنتے ہیں۔" سلیم نے اپنی طرف سے یہ باب بند کر دیا تھا۔

"بیشک۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔" مولانا نے بہت تحمل کے ساتھ کہا۔ میں آپ کا جواب ڈاکٹر صاحب کو دے دوں گا۔ ان کے رویئے میں کوئی تبدیلی آئی تو آپ کو فون کروں گا۔ خدا حافظ۔" مولانا نے دوسری طرف سے فون رکھ دیا تھا۔ سلیم

تھوڑی دیر تک فون کو اسی طرح ہاتھ میں گھورتا رہا اور پھر کریڈل پر رکھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ ٹی وی روم میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے ٹی وی پر کھیلوں کا پروگرام دیکھ رہے تھے۔ سلیم لڑکے کو پہچانتا تھا۔ وہ اسی ہوسٹل میں رہتا تھا لیکن لڑکی شاید باہر سے آئی تھی۔ اس کی گرل فرینڈ تھی جو ویک اینڈ پر ملنے آئی ہو گی۔ سلیم نے لڑکے کے مقدر پر رشک کرتے ہوئے اسے ہیلو کیا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر ٹی وی پر نظریں گاڑ دیں۔

مولانا کا فون نہ آنے پر سلیم نے انہیں ایک ہفتے بعد فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیٹی کا رشتہ کہیں اور ہو گیا ہے۔ سلیم نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور ان سے کہیں اور رشتہ تلاش کرنے کی درخواست کرنے لگا۔

"سلیم صاحب مسئلہ رشتوں کا نہیں ہے۔ سڈنی میں بہت سی لڑکیوں کے رشتے ہیں۔ لیکن آپ کی صورتحال بہت مشکل ہے۔ اپنی شادی میں آپ اپنے خاندان کو الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ میں بھی ایسی صورت میں کسی لڑکی کے والدین سے آپ کے رشتے کی سفارش نہیں کروں گا۔" مولانا نے سلیم کو بہت نرمی کے ساتھ لیکن دو ٹوک انداز مین بتا دیا۔

"آپ کو میں نے بتایا تھا۔ میری امی........" سلیم صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ مولانا نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ لیکن آپ کو یہاں کسی پاکستانی خاندان میں رشتہ کرنا ہے تو آپ کو اپنی والدہ سے بات کرنی ہو گی۔ آپ اپنے خاندان کو شادی کے اس عمل میں شرکت کے لئے تیار کیجئے۔" مولانا کا دو ٹوک انداز اور لہجے کی نرمی اسی طرح قائم تھی۔

"میں کوشش کروں گا۔" سلیم نے کہا اور مولانا نے "اللہ بہتر کرے گا۔" کہہ کر فون رکھ دیا۔

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ سلیم کی تشویش بڑھ رہی تھی اس کے

معاملات جہاں تھے وہیں کھڑے تھے۔ کوئی نیا امکان تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ ظہور، چودہری اور اقبال کے گھر اس کا آنا جانا جاری تھا۔ اکثر ہفتے کی صبح کو جاتا تھا۔ تینوں کے ساتھ مل کر کھانا کھاتا ظہور اور چودہری انور کام پر چلے جاتے تو وہ اقبال کے ساتھ وڈیو پر بھارتی فلمیں یا پاکستانی ڈرامے کی کوئی سیریل دیکھتا۔ اقبال اسے شہر کی خبریں سناتا۔ کس کا کیس منظور ہو گیا، کس کا منع ہو کر اپیل میں چلا گیا۔ کون پکڑا گیا۔ کس نے کس کی شکایت کی کس کا کس سے جھگڑا ہوا۔ سلیم کے لئے وہ سب محض نام تھے۔ وہ ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ اقبال سب سے واقف تھا۔ اقبال عاشقی نائٹ کلب اب بھی پابندی سے جاتا تھا۔ اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی تھی۔ کہتا تھا ان میں سے کسی کو بھی شادی کی منزل تک لے جا سکتا ہے۔ اور شاید لے بھی جاتا لیکن ظہور کی نصیحت اس کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ ایک دن سلیم کے سامنے ہی ظہور نے اسے سمجھایا تھا۔ ظہور پر اس روز گزرے ہوئے زمانے کی یادیں سوار تھیں۔ وہ نبیلہ کا قصہ دہرا رہا تھا۔ جس سے کویت میں اس کے تعلقات رہے تھے۔ سلیم نے سنا ہوا تھا لیکن ان دونوں کے لئے نیا تھا۔ ظہور قصہ ختم کر کے بتانے لگا۔

"پاکستان سے رسوا ہو کر آسٹریلیا آتے ہوئے یہ شکوہ کر رہا تھا کہ میں نے کس گدھی کو ہاتھ لگایا ہے جو میری قسمت اتنے اندھیرے کنویں میں گر پڑی ہے۔ اسی وقت میرے سامنے نبیلہ کا چہرہ آ گیا۔ میں نے بہت زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ وہ واقعی کھوتی ہی تھی۔ جب سے اسے ہاتھ لگایا تھا سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ "ظہور نے اس وقت بھی ماتھے پر ہاتھ مارا لیکن ہونٹوں پر ایک باریک سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ شاید نبیلہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی تھی۔"

"ظہور بھائی مجھ پر آج کل ایک ہتھنی سوار ہے۔ میں جب بھی کلب جاتا ہوں میرے آگے پیچھے گھومنے لگتی ہے۔ مجھ سے ڈیڑھ گنا موٹی ہے۔ ابھی ابھی تیسرا شوہر چھوڑا ہے۔ مجھ سے کہتی ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ میں بھی سوچ رہا ہوں کر لوں۔ کم از کم امیگریشن کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" اقبال نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"شادی کو کبھی مذاق سمجھ کر مت کرنا۔" ظہور نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"موٹا ہونا بری بات نہیں ہے۔ موٹے لوگ دل کے صاف اور رحم دل ہوتے ہیں۔ ان میں منافقت کم ہوتی ہے لیکن اصل چیز کردار ہے۔ وہ عورت جو اپنے تین شوہروں سے وفا نہ کر سکی وہ تمہیں بھی کچھ نہیں دے گی۔" ظہور نے اقبال کو سمجھایا۔

"مجھے اس سے کچھ لینا بھی نہیں ہے۔ نہ مجھے اس کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے۔ شادی کر کے امیگریشن لوں گا اور پھر بائی بائی۔ میں دھوکہ نہیں کررہا۔ اسے پتہ ہے میں غیر قانونی ہوں اور قانونی بننے کے لئے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اقبال بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"شہزادے میں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شادی کو صرف ضرورت کا سودا سمجھ کر مت کرو اور اگر کر لو تو پھر آخر دم تک نباہو۔ ورنہ کچھ پچھتاوے ایسے ہوتے ہیں جو زندگی بھر دل کو چھیدتے رہتے ہیں۔"

ظہور تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا۔ "آؤ بالکونی میں چلتے ہیں۔ مجھے سگریٹ کی سخت طلب ہو رہی ہے۔" ظہور نے دل کے آپریشن کے بعد سگریٹ پھر شروع کر دی تھی۔ لیکن اب بھی پودوں کے ڈر سے گھر کے اندر سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ تینوں بالکونی میں رکھی ہوئی پلاسٹک کی سفید کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چودھری انور ابھی نہیں اٹھا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں سویا ہوا رات کی نیند پوری کر رہا تھا۔

"کہانیاں تو بہت سی ہیں۔" ظہور نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم لوگوں کا سامان عبرت بننے کے لئے میں کافی ہوں۔ میں نے شادی کے نام پر دو عورتوں کو دکھ دیئے۔ دونوں سے یہ رشتہ نہیں نباہ سکا۔ دیکھ لو آسمان سے گر کر کن کھائیوں میں پڑا ہوا ہوں۔ نہ بیوی پاس ہے نہ بچے۔ ایک بیٹی ہے جو ترس کھا کر کبھی کبھی خط لکھ دیتی ہے۔ میں نے سوچا تھا اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لئے آسٹریلیا بلاؤں گا۔ اسی لئے پیسے بھی جمع کر رہا تھا۔ لیکن یہ اطمینان بھی میرے مقدر میں نہیں تھا۔ میرے بیٹے نے ایم ایس سی میں گولڈ میڈل لیا ہے۔ اسے امریکہ کی سب سے اچھی یونیورسٹی میں ریسرچ کے لئے اسکالر شپ مل گئی ہے۔ وہ ماں کو ساتھ لے کر اگلے مہینے امریکہ جا رہا ہے۔" ظہور خاموش ہوا تو دونوں اسے مبارکباد دینے لگے لیکن اس کے چہرے

پر چھائی ہوئی اداسی کم نہ ہو سکی۔

"ظہور بھائی یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے۔ اپنے بیٹے کی کامیابی پر فخر کرنا چاہیے۔" سلیم نے بہت پرجوش لہجے میں کہا۔

"یہی تو رونا ہے سلیم میاں۔ میں اپنے بیٹے کی کامیابی پر فخر بھی نہیں کر سکتا۔ میرا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ میں صرف اس کو پیدا کرنے کے عمل میں شریک رہا ہوں۔ جس نے اسے نو مہینے پیٹ میں رکھا تھا اسی نے آج اسے اس مقام تک بھی پہنچایا ہے۔" ظہور کے چہرے کی اداسی کم نہیں ہو سکی تھی۔

"ظہور بھائی تو آپ یہ کہتے ہیں کہ ہم شادی نہ کریں۔ اسی طرح غیر قانونی بنے رہیں۔" اقبال نے ظہور کا موڈ بدلنے کے لئے بات بدلی۔

"نہیں شہزادے میں یہ نہیں کہہ رہا۔" ظہور کے چہرے سے اداسی کی لہر غائب ہو گئی اور ہونٹوں پر وہ مخصوص مسکراہٹ سج گئی جو اس کی پہچان تھی۔ "میں یہ کہہ رہا ہوں کہ شادی کو امیگریشن کی درخواست مت بناؤ۔ شہریت کے کاغذ کا ایک ٹکڑا اتنا قیمتی نہیں ہے کہ اس کے لئے رشتوں کی پاکیزگی کو گندا کر دو اور پھر تمہیں شادی کرنی ہے تو فریب دے کر کیوں کرتے ہو۔ اس طرح کیوں نہیں کرتے کہ زندگی بھر کا سچا ساتھی ملے۔ اپنی ضرورت کو سچ مچ کے پیار اور خلوص میں لپیٹو گے تو یہ سودا اتنا برا نہیں لگے گا۔"

ظہور کی بات اقبال کے دل کو لگی تھی۔ شادی کرنی ہے تو ایک ہی بار کیوں نہ کرے۔ سلیم نے ظہور کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ عاشقی نائٹ کلب کو بھی آزمانا چاہیے۔ اسے یہ غرض نہیں تھی کہ لڑکی موٹی ہے یا پتلی۔ کس نسل کی ہے اور کتنی شادیاں کر چکی ہے۔ اسے تو شادی کر کے اپنی شہریت کی درخواست فائل کرنی تھی۔ شہریت لے کر پڑھنا تھا' اپنا ماسٹرز مکمل کرنا تھا۔ پاکستان جانا تھا' گھر والوں کو آسٹریلیا لانا تھا' یہ سب کچھ کرنے کے لئے اسے کاغذ کے ایک ٹکڑے کی ضرورت تھی۔ اس وقت ظہور کی باتیں اسے ایسی لگیں جیسے بلی نو سو چوہے کھا کے اپنی ساتھی بلیوں کو سبزی کھانے کا مشورہ دے رہی ہو۔ ایک دن اس نے کلب

چلنے کے لئے اقبال کو فون کیا۔ وہ فیکٹری میں اوور ٹائم کر رہا تھا۔ اس رات سلیم اکیلا ہی چھت پر چلا گیا۔ یہ اس کے لئے زیادہ بہتر صورتحال تھی۔ اقبال کے ساتھ جاتا تو جھجکتا رہتا۔ آزادی سے نقل و حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن کلب جا کر سلیم کو تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ اس نے اس کلب کا جتنا تذکرہ سنا تھا اور جیسا اس کے بارے میں سوچا تھا وہ ایسا نہیں تھا۔ ایک ہوٹل کے شراب خانے کے ساتھ ہال نما ایک بڑا سا کمرہ تھا جسے ہفتے کی ایک رات کے لئے عاشقی نائٹ کلب میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ باہر لال رنگ کا ایک بڑا سا بینر لٹکا ہوا تھا جس پر موٹے سفید لفظوں سے عاشقی نائٹ کلب' انڈین ڈسکو' انٹری دس ڈالر لکھا تھا۔ سلیم اندر گیا تو ایک طرف بار کا لمبا کاؤنٹر تھا اسی کے ساتھ جینز' ٹی شرٹ اور الٹی ٹوپی پہنے ہوئے ایک لڑکا جو شاید ڈسک جاکی تھا ریکارڈ اور کیسٹ الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ دو بڑے بڑے بدنما اسپیکر دیوار سے ٹکے ہوئے تھے لیکن ان کا کمال ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ موسیقی شروع نہیں ہوئی تھی اس لئے خاموشی تھی اور لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے سکتی تھیں۔ شاید بارہ چودہ لوگ ہوں گے کچھ بار کے کاؤنٹر پر بیٹھے تھے کچھ ان میزوں پر جو مختلف کونوں میں ڈائننگ ہال کے طرز پر سجائی گئی تھیں۔ وہیں کونے میں سموسوں' پکوڑوں اور چاٹ کا اسٹال لگا ہوا تھا۔ وسط میں گول دائرے کی شکل میں لکڑی کا بہت چکنا سا فرش تھا جو رقص کے لئے استعمال ہوتا ہو گا۔ کمرے کے آخر میں بھی کچھ میزیں اور کرسیاں لگی تھیں۔ ایک کونے میں ایک استاد بیٹھے ہتھوڑی سے اپنے طبلے کی جوڑی کا مزاج پوچھ رہے تھے۔ بار ٹنڈر نے جو اپنے ہی رنگ کی کالی پتلون اور واسکٹ پہنے ہوئے تھا سلیم کو کوک دیتے ہوئے بتایا کہ ڈسکو سے پہلے ایک جوڑا کتھک ناچ کا مظاہرہ کرے گا۔ ابھی صرف سات بجے تھے۔ سلیم جذباتی ہو کر جلدی چلا آیا تھا۔ بار ٹنڈر کا کہنا تھا کہ آٹھ بجے لوگ آنا شروع ہوں گے اور نو بجے کھوے سے کھوا چل رہا ہو گا۔

سلیم پکوڑے اور سموسے کھاتا اور کوک پیتا رہا۔ بار ٹنڈر گلاسوں کو کپڑے سے خشک کر کے چمکاتا ہوا اسے فجی کی تاریخ سناتا رہا۔ آٹھ بجے کے بعد بار میں گہما

گھمی شروع ہو گئی تھی۔ بار ٹنڈر کو بھی بات کرنے کی فرصت نہیں رہی تھی۔ برابر کے شرابخانے سے ایک گوری لڑکی اس کی مدد کے لئے آ گئی تھی۔ کلب میں آنے والوں کی اکثریت فیجی کے لڑکے لڑکیوں کی تھی۔ انہیں اپنے حلئے اور کپڑوں سے پہچاننا آسان تھا۔ لڑکے اپنے سیاہ رنگ کے چکنے چمکدار اور بڑے بڑے لچھے دار بالوں سے مِتھن چکرورتی اور بھارت کے دوسرے اداکاروں کا چربہ لگ رہے تھے۔ لڑکیوں نے بھی بھڑکیلے اور چمکدار کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ڈسکو کے لئے وہ شاید خاص طور پر اس فیشن کے کپڑے پہن کر آتی تھیں۔ جیسی بھارتی فلموں کی رقاصائیں پہنتی تھیں۔ اکثر لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ آئی تھیں۔ اکیلی لڑکیوں کے گروپ بھی تھے۔ اسی طرح اکیلے لڑکوں کے غول بھی گھوم رہے تھے جن میں سے اکثر شکل اور حلئے سے پاکستانی لگتے تھے اور وہ بھی سلیم کی طرح اکیلی آنے والی لڑکیوں کے چہروں پر اپنے مقدر کی عبارتیں پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آٹھ بجے رش ابھی کم ہی تھا کہ کتھک رقص کا مظاہرہ شروع ہو گیا۔ سلیم کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ رقص کا مظاہرہ کرنے والا جوڑا آسٹریلین تھا۔ دونوں بہت مہارت اور محنت سے رقص کرتے ہوئے پسینے میں شرابور تھے ان کی جنبشوں میں کمال کی یکسانیت تھی۔ کتھک جیسا مشکل رقص سیکھنے میں انہوں نے واقعی بہت محنت کی تھی۔ طبلے پر اپنی انگلیوں کا کمال دکھاتے ہوئے استاد اپنے شاگردوں کو واری ہو جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ رقص ختم ہونے کے بعد دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اس کے ساتھ ہی دیو قامت اسپیکروں سے ڈسکو کے لئے بہت تیز آواز میں موسیقی کی لہریں نکلنے لگیں۔ بھارتی فلموں کے ہندی گانے تھے لیکن دھنیں مغربی تھیں جن کی لے بہت تیز تھی اس فرش پر جہاں تھوڑی دیر پہلے طبلے کی تال پر ایک سفید فام جوڑا کلاسیکی رقص کا مظاہرہ کر رہا تھا گہرے رنگ اور چمکیلے کپڑوں والے جوڑے موسیقی کی تیز دھنوں پر تھرکنے کے لئے آنے لگے۔

ثقافت کا یہ رنگ حیران کر دینے والا تھا۔ دو مختلف تہذیبیں خود پر ایک دوسرے کا رنگ چڑھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ فیجی کی نئی نسل نے بھارت اور

مغرب کے کلچر کو ملا کر ایک نیا رنگ دے دیا تھا۔ وہ بھارت سے ہزاروں میل دور بحر الکاہل کے جزیروں میں رہنے والے لوگ تھے جو سو سال سے پہلے کھیت مزدور بن کر آئے تھے اور فیجی کو وطن بنا کر وہیں رہ گئے تھے لیکن انہوں نے اپنی نسلی ثقافت قائم کر رکھی تھی۔ ہندی بولتے اور بھارتی فلمیں دیکھتے تھے۔ ثقافت سے ان کا تعلق فلموں کے ذریعے ہی قائم تھا۔ کوئی دس برس ہوئے کہ فیجی کے قدیمی باشندوں نے فوج کے ذریعے انہیں حکمرانی سے الگ کر دیا تو وہ ایک بار پھر بے وطن ہونے لگے۔ ہزاروں نقل مکانی کر کے آسٹریلیا آ گئے تھے یا نیوزی لینڈ اور کینیڈا چلے گئے تھے۔ براہ راست بھارت سے آنے والے بھارتی اپنی ثقافت کے فیجین رنگ کو پسند نہیں کرتے تھے اور انہیں ثقافتی اور تہذیبی طور پر کمتر سمجھنے پر مصر تھے۔

لیکن سلیم عاشقی نائٹ کلب میں تہذیبوں کا موازنہ کرنے یا ان کے عروج و زوال کا جائزہ لینے کے علمی مشن پر نہیں آیا تھا۔ بار ٹنڈر نے انہیں صحیح بتایا تھا۔ نو بجے کلب پوری طرح بھر گیا تھا۔ فلور پر اتنا رش تھا کہ ناچتے ہوئے جوڑے ایک دوسرے سے رگڑ کھا رہے تھے۔ سلیم بار کاؤنٹر کے سامنے جس اسٹول پر بیٹھا تھا وہ اس نے نہیں چھوڑا تھا۔ ڈسک جاکی مختلف رنگوں کی پنیوں والا ایک چکر بلب کے سامنے گھما کر ڈسکو کے رنگوں کی قوس قزح بنا رہا تھا۔ سلیم رنگوں کے سایوں میں بے خود ہو کر ناچتے ہوئے جوڑوں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اسٹول پر بیٹھ کر کوک پیتے رہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ اس کی نظر بہت دیر سے ان دو لڑکیوں پر تھی جو اکیلی آئی تھیں اور فلور پر کسی مرد ساتھی کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ ناچ رہی تھیں۔ سلیم کے دیکھتے ہی دیکھتے دو لڑکے اکیلے رقص کرتے ہوئے راستہ بنا کر ان دو لڑکیوں کے سامنے اپنے رقص کا کمال دکھانے کے لئے جم گئے اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ایک کے مقابل ایک آ گیا۔ کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بڑے غیر محسوس انداز میں جوڑے بن گئے تھے۔ لڑکیاں اپنے اپنے مقابل لڑکے کے ساتھ رقص کرتے ہوئے پہلے سے زیادہ پرجوش ہو گئی تھیں۔ ہونٹ بند تھے۔ اعضاء کی زبان میں آزاد شاعری ہو رہی تھی۔ جب یہ طویل نظم ختم ہوئی تو پسینے میں شرابور لڑکیاں فلور سے باہر آ گئیں۔ لڑکے بھی

ان کے ساتھ آئے تھے اور ڈرنکس لینے کے لئے بار ٹنڈر کی توجہ کے منتظر تھے۔ لڑکوں نے ڈرنکس خرید کر لڑکیوں کے ہاتھ میں دیں اور چاروں اسی میز کی طرف بڑھ گئے جس پر لڑکیاں شاید پہلے بھی بیٹھی رہی تھیں۔ سلیم حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ دونوں لڑکیاں لڑکوں سے بات کرتے ہوئے اس طرح کھل کھلا کر ہنس رہی تھیں جیسے انہیں بہت پہلے سے جانتی ہوں۔

جوڑے بننے کے اس عمل کو دیکھ کر سلیم کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا۔ اس میں اس طرح پیشوائی کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ رقص کرنے کا تھا وہ کبھی ڈسکو میں نہیں ناچا تھا لیکن اس نے خود سے پوچھا کہ اگر یہ نہیں کر سکتا تو پھر آیا کیوں تھا۔ ڈسکو میں لڑکیاں ناچنے کا شوق پورا کرنے آتی تھیں' انہیں ساتھی بھی ناچنے والا چاہئے تھا۔ سلیم نے سوچا اسے ہمت کرنی ہی پڑے گی۔ اس نے سنا تھا کہ شراب آدمی کو جرات دے دیتی ہے۔ وہ خول توڑ کر باہر نکل آتا ہے اور بہادری کے وہ کرشمے دکھاتا ہے جن کا پہلے تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بار ٹنڈر کی توجہ حاصل ہوتے ہی اس نے بیئر کا آرڈر دینے کی ہمت پیدا کی۔ بار ٹنڈر نے اسے حیرت سے دیکھا۔ شام سے کوک پینے والا اچانک بیئر کیسے پینے لگا تھا۔ بیئر آنے کے بعد کافی دیر تک گلاس اسی طرح اس کے سامنے رکھا رہا۔ آخر اس نے ایک بار اور ہمت کی۔ گلاس اٹھا کر ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور اس جھٹکے سے گلاس واپس رکھا کہ بیئر چھلک پڑی۔ شاید بیئر کی برکت تھی کہ اس وقت ایک لڑکی آسمان سے ٹپک کر اس کی جھولی میں آ گری۔ گہرے سرخ رنگ کا لباس پہنے ہوئے پتلی سی گہری سانولی ایک لڑکی اس کے پاس کھڑی ہوئی ڈرنک کے لئے بار ٹنڈر کی توجہ کی منتظر تھی۔ سلیم اسے دیکھ کر مسکرایا تو وہ بھی بے ساختہ مسکرا پڑی۔

"آج تم ڈانس نہیں کر رہے۔" اس نے امید بھری نظروں سے سلیم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ شاید دیر سے سلیم کو اسی طرح بیٹھے دیکھ رہی تھی۔ کوئی لڑکی کسی مرد کو اس سے زیادہ واضح انداز میں اپنے ساتھ رقص کرنے کی دعوت نہیں دے سکتی تھی۔

"مجھے ایسی ہم رقص کی تلاش ہے جو مجھے تیز دھنوں پر ناچنا سکھا سکے۔ میں فاسٹ میوزک پر رقص کرنے میں ابھی کچا ہوں۔" امید اب سلیم کی آنکھوں میں بھر گئی تھی۔

"یہ کوئی بھارتیہ ناٹیم یا کتھک نہیں ہے نہ آپ کو سیکھنے کے لئے پنڈت کی ضرورت ہے۔ بس فلور پر جایئے، موسیقی پر دھیان رکھئے اور ہلنا شروع کر دیجئے آپ خود بخود ردھم میں آ جائیں گے۔" لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ سلیم کو اس کی ہنسی بہت اچھی لگی۔ ہنسی کے گلاب صرف ہونٹوں پر نہیں کھلے تھے بلکہ پورا چہرہ ہنسنے لگا تھا۔

"ردھم میں لانے کے لئے کوئی اچھا سا ساتھی بھی چاہئے۔ کیا تم میری ہم رقص بنو گی۔" سلیم کے پاس اچانک بہت سی ہمت آ گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ بیئر کا صرف ایک گھونٹ یہ کمال دکھا سکتا ہے تو پورا گلاس پینے کے بعد کیا ہو گا۔

"کیوں نہیں۔ بہت خوشی سے۔ لیکن پہلے ایک ڈرنک لے لوں۔" لڑکی نے کہا۔ اس کا چہرہ پھر ہنسنے لگا تھا۔ بار ٹنڈر ابھی تک کاؤنٹر کے دوسری طرف مصروف تھا۔ ابھی اس طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی مددگار لڑکی میزوں سے خالی گلاس جمع کرتی ہوئی گھوم رہی تھی۔

"تم کیا پیو گی۔" سلیم نے پوچھا۔ وہ اس کی ہم رقص بننے والی تھی۔ اس کے لئے ڈرنک بھی سلیم کو خریدنی تھی۔

"پینا کلاڈا۔" لڑکی نے کہا۔

"یہ کوئی وہسکی ہے۔" سلیم نے اپنی معلومات میں اضافہ چاہا۔

"نہیں یہ جزائر کی خاص کاک ٹیل ہے۔ رم اور ناریل سے مل کر بنتی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ اسے شاید پتہ تھا کہ وہ ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہے اس لئے ہر بات پر ہنستی تھی۔

"تم اکیلی آئی ہو۔" سلیم نے یقین حاصل کرنا چاہا۔

"میں اپنی ایک دوست اور اس کے بوائے فرینڈ کے ساتھ آئی ہوں۔ میری دوست اپنے بوائے فرینڈ کو انگلیوں پر نچا کے تھک گئی تھی اس لئے اب ناچنے کے

لئے ٹانگیں استعمال کر رہی ہے۔" وہ اور اس کا چہرہ ایک بار پھر ہنسنے لگے۔ سلیم بھی ہنس دیا۔ اسی وقت ایک لڑکی تیزی سے ان کی طرف آئی۔ وہ شاید اس لڑکی کی دوست تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک لڑکا بھی تھا جو شکل سے لگتا تھا کہ لڑکیوں کی انگلیوں پر ناچنا جانتا ہے۔ سلیم کو لڑکی کی شکل کچھ پہچانی ہوئی لگی۔ وہ نزدیک آئی تو سلیم کا سانس ایک جگہ ٹھہر کر رہ گیا۔ وہ لڑکی کو اچھی طرح پہچان گیا۔ وہ مونی تھی جسے فراڈ امیگریشن ایجنٹ ملک آفتاب نے سیکریٹری بنا کر رکھا ہوا تھا اور جس نے سڑک پر سلیم کو ذلیل کیا تھا۔ پاکستانیوں کے نام پر اتنی زور سے تھوکا تھا کہ سلیم کو اپنا چہرہ اب بھی گیلا لگتا تھا۔ تھوڑی دیر ٹھٹکنے کے بعد مونی بھی سلیم کو پہچان گئی۔

"تو یہ تم ہو۔ امیگریشن کے لئے لڑکی تلاش کرنے یہاں بھی پہنچ گئے۔ تم پاکستانی بہت ہوشیار ہو۔ مفت میں قانونی ہونے کا اچھا نسخہ ڈھونڈا ہے۔ پاسپورٹ پر ٹھپہ لگا اور نو دو گیارہ۔ میری دوست فالتو کی نہیں ہے۔ جاؤ کسی ملک آفتاب کو تلاش کرو۔" مونی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر بار کے دوسری طرف جانے لگی جہاں شراب خریدنے والے دوسرے گاہکوں کا ہجوم تھا۔ سلیم ہاتھ میں آئی ہوئی چڑیا کو اس طرح پھر سے اڑتا ہوا دیکھتا رہ گیا۔ اس لڑکی نے سلیم کو ایک دفعہ پلٹ کر دیکھا تھا اس کے ہونٹوں اور چہرے سے ہنسی غائب ہو گئی تھی۔ سانولا رنگ اور گہرا ہو گیا تھا۔ وہ مونی کے ساتھ خاموشی سے چلی گئی دوبارہ سلیم کو پلٹ کر نہیں دیکھا۔ سلیم اپنے بیئر کا گلاس اسی طرح چھوڑ کر کلب سے نکل گیا۔

سلیم آج دن بھر ایوان کا فون نمبر تلاش کرتا رہا۔ اسے وہ ڈائری نہیں مل رہی تھی جس میں نمبر نوٹ کیا ہوا تھا۔ ڈائری اور اس میں لکھا ہوا نمبر مل گیا تو ایوان نہیں مل رہی تھی۔ سلیم کو ایوان اچانک ہی یاد آئی تھی اور اس کے ساتھ اسے خود پر سخت غصہ آیا تھا کہ اس نے پہلے کیوں نہیں سوچا تھا۔ سلیم اس رات عاشقی نائٹ کلب سے واپس آنے کے بعد دوبارہ وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ جانتا تھا جانا بیکار ہو گا۔ مونی ملک آفتاب کا بدلہ ہر پاکستانی سے لینے پر تلی ہوئی ہے۔ سلیم کسی سے دوستی میں

کامیاب ہوا بھی تو وہ اسے بھڑکا دے گی۔ اقبال نے بھی عاشقی نائٹ کلب جانا بند کر دیا تھا۔ اقبال کو معلوم ہو گیا تھا کہ ایسی بیوی جس کے ساتھ اسے زندگی گزارنی ہے ڈسکو کے ڈانس فلور پر نہیں ملے گی۔

سلیم کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے اپنے تیار کئے ہوئے منصوبوں کا کامیاب ہونا مشکل ہے۔ اسے اب کسی وکیل کے ذریعے ریفیوجی کی درخواست ڈال کر انتظار کا ساغر کھینچنا پڑے گا۔ ایوان اس کے منصوبوں کے سلسلے کی آخری کڑی تھی۔ سلیم نے سوچا تھا وہ ایوان سے صاف صاف بات کرے گا بلکہ اس کے بوائے فرینڈ کو بھی اس میں شامل کرے گا۔ ایوان سے کہے گا کہ وہ اس سے کاغذی شادی کر کے اسے قانونی بنوا دے۔ اس کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے بھی تھے۔ ایک دوسرے کے سامنے ننگے تک ہو چکے تھے۔ ایوان کے بدن پر کتنے تل تھے' وہ بتا سکتا تھا۔ امیگریشن والوں کو شک کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔ سلیم جانتا تھا ایوان بہت ہمدرد لڑکی ہے۔ سلیم کو پسند بھی کرتی ہے۔ بہت آسانی سے مان جائے گی۔ سونے سے پہلے اس نے ایک بار پھر فون کیا تو وہ مل گئی۔ فون بابی نے اٹھایا تھا۔ سلیم کو یہ جان کر تھوڑی سی مایوسی ہوئی کہ بابی اور ایوان کی دوستی ابھی تک باقی ہے اکیلی ہوتی تو اسے منانا آسان ہوتا۔ اب اسے بابی کا مرحلہ بھی طے کرنا پڑے گا۔ ایوان نے بہت چہکتی ہوئی آواز میں ہیلو کہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کی باتوں کی ریل گاڑی چل پڑتی سلیم نے پوچھا کیا وہ کل ایک بجے اسمیس میں مل سکتی ہے۔ اس نے بہت زوردار ہاں کی' ساتھ ہی اسے اپنی باتوں کی ریل چلانے کا موقع بھی مل گیا۔

"لیکن تم بہت دن بعد یونیورسٹی آ رہے ہو اسمیس کو تلاش کیسے کرو گے۔ اسمیس اب وہ نہیں رہا۔ بلکہ اس جگہ پر بھی نہیں رہا۔ دوسرے فلور پر بالکل نیا کیفے بن گیا ہے اس میں پرانے اسمیس والی کوئی بات ہی نہیں۔ مجھے تو اپنا پرانا والا اسمیس پسند تھا۔ ارے بابی چھوڑو کیا کر رہے ہو۔" ایوان نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر اچانک ہی کھل کھلا کر ہنستے ہوئے بابی سے کہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے

ایوان کو گدگدا دیا ہو۔ "یہ بابی بستر میں گھسا ہوا مجھے تنگ کر رہا ہے۔ رات کو دیر سے آتا ہے اور آکر اسے صرف ایک کام ہی یاد رہتا ہے۔ دیکھو یہ کیا کر رہا ہے........"
ایوان ایک بار پھر کھی کھی کرنے لگی تھی۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں کل ایک بجے ملوں گا۔" سلیم نے جلدی سے فون بند کر دیا۔

ایوان سے کچھ بعید نہیں تھا بستر پر جو کچھ ہو رہا تھا وہ فون پر اس کی تفصیلی کمنٹری نشر کر سکتی تھی۔

سلیم دوسرے دن یونیورسٹی پہنچا تو ا-سمیس ہی نہیں بہت کچھ بدلا ہوا تھا۔ وہ کئی مہینوں بعد آیا تھا اس عرصے میں یونیورسٹی کا چہرہ بدل گیا تھا۔ نئے دالان اور وراندے بن گئے تھے۔ باغ باغیچے بھی بدلے ہوئے تھے۔ کئی رستے بند تھے جہاں تعمیر کا کام ابھی جاری تھا۔ ایوان سلیم کو ا-سمیس پہنچنے سے پہلے ہی مل گئی۔ وہ لائبریری کے سامنے والے برآمدے میں جہاں لڑکے لڑکیاں میزوں پر اپنی اپنی انجمن کی دکانیں لگائے بیٹھے تھے ' ایک میز کے پیچھے پیچھے چگی داڑھی والے لڑکے سے باتیں کر رہی تھی۔ ان کے پیچھے لگے ہوئے بینر کو دیکھ کر سلیم بے ساختہ مسکرا پڑا۔ اس انجمن کا نام تھا "شیطان کے چیلے" لڑکے نے کالی پتلون پر کالی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ٹی شرٹ پر جادوگروں والی مردہ کھوپڑی بنی ہوئی تھی۔ ایوان بھی کالی پتلون پر کالی ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کی ٹی شرٹ پر کھوپڑی نہیں تھی۔ لیکن بالوں کو افریقی عورتوں کے انداز میں گوندھ کر چھوٹی چھوٹی باریک چٹیوں کا پیڑ بنایا ہوا تھا۔ سلیم کو دیکھتے ہی اس نے ایک جوشیلی ہائے کے بعد سلیم کے گال پر اپنا مخصوص بوسہ ثبت کیا۔

"اس سے ملو۔ یہ شیطان کے چیلوں کا سردار ہے۔ پیٹر۔ اور یہ سالیم ہے۔ میرا سب سے اچھا دوست۔" ایوان نے تعارف کرایا تو پیٹر میز پر رکھی ہوئی کاپی سلیم کی طرف بڑھانے لگا۔ ایوان نے ہنستے ہوئے کاپی پیچھے کھسکا دی۔

"یہ شیطان کا چیلہ نہیں بنے گا۔ یہ تو فرشتہ ہے۔ محافظ فرشتہ۔ یہ تم سب کو فرشتہ بنا دے گا۔" اس نے ہنستے ہوئے پیٹر سے کہا اور زمین پر پڑا ہوا اپنا بیگ کندھے

پر ڈال کر سلیم کے بازو میں ہاتھ ڈالے وہاں سے چل دی۔ سلیم نے سوچا ایوان اسے ابھی تک نیا نیا آسٹریلیا آنے والا نیک سیرت انسان سمجھ رہی ہے جو بلی کے ڈر سے گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔

"میں بھی شیطان کی چیلی ہو گئی ہوں۔" ا-سمیس کی طرف چلتے ہوئے ایوان نے سلیم کو بتایا۔

"لیکن شیطان کے چیلے کرتے کیا ہیں۔" سلیم نے پوچھا۔

"عیش کرتے ہیں وہ سارے شیطانی کام کرتے ہیں جنہیں تم جیسے فرشتے بہت چھپ کر کرتے ہیں۔" ایوان نے سلیم کو شیطانی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر سنجیدہ ہو کر بتانے لگی۔ "بے فکروں کا ایک گروپ ہے جو پڑھائی سے ایک وقفہ لینے کے لئے چرس کے سٹے لگا کر چیختا چلاتا اور خوشیاں مناتا اپنی بھڑاس نکالتا ہے منافقت کو ہم نے گناہ بنا دیا ہے۔ جسے جو کرنا ہے کھل کر کرو' جو کہنا ہے کھل کر کہو اسی لئے سب خوش رہتے ہیں کسی کے دل میں مواد نہیں پکتا۔ جو بھی لاوا ہوتا ہے باہر نکل کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ میں پہلے بابی کے ساتھ سوشلسٹ انٹرنیشنل میں جاتی تھی۔ لیکن بہت بور لوگ ہیں۔ فضول باتوں پر لڑ کر وقت ضائع کرتے ہیں۔ روس کے انقلابی لیڈر پچاس سال پہلے جس بات پر لڑے تھے یہ اس پر اب لڑتے ہیں۔ شیطان کی چیلی بننے پر بابی مجھ سے ناراض ہے۔ کہتا ہے کہ ہپی کلچر نے دوبارہ جنم لے لیا ہے۔ جلد ہی تم لوگ معاشرے سے کٹ کر چرس کے نشے میں ڈوبے ہوئے کمیون میں پڑے رہو گے۔ کیوں کیا تمہیں میں ایسی ہی لگتی ہوں؟" ایوان نے سوال کیا تھا لیکن جواب کا انتظار کئے بغیر اس کی ریل گاڑی اسی طرح چلتی رہی تھی۔

"اب پیٹر کو دیکھو صبح سفید ٹی شرٹ پہن کر یونیورسٹی آتا ہے۔ بڑی سنجیدگی سے لیکچر سنتا ہے۔ بارہ بجے کلاسیں ختم ہوتی ہیں تو کالی قمیض پہن کر شیطان کا چیلہ بن جاتا ہے اور لائبریری کے سامنے کرسی میز ڈال کر اپنے چیلے بھرتی کرنے لگتا ہے۔ دو بجے کالی ٹی شرٹ اتار کر پیلی قمیض پہنتا ہے جو یونیورسٹی میں کام کرنے والوں کی یونیفارم ہے۔ شام چھ بجے تک ا-سمیس کیفے میں نوکری کرتا ہے اور پھر کالی شرٹ

پہن کر ہوسٹل میں رہنے والے کسی چیلے کے گھر ہونے والے اجتماع میں شریک ہو جاتا ہے۔"

"تم بھی چرس پیتی ہو۔" سلیم نے وقفہ پاتے ہی سوال کیا۔

"ہاں لیکن زیادہ نہیں پی سکتی۔ مشکل سے ایک سگریٹ پیتی ہوں ایک دن دوسرا سگریٹ پی لیا تھا تو سر گھومنے لگا۔ لگتا تھا پورا کمرہ اس میں بیٹھے ہوئے لوگ، میز کرسیاں سب گردش میں ہیں۔ آدھا یا ایک سگریٹ پیتی ہوں۔ ڈٹ کر کھاتی ہوں خوب ہنستی ہوں۔ چیخ چیخ کر باتیں کرتی ہوں اور رات کو گھر آکر بستر میں بابی کو خوب ستاتی ہوں۔

"کیا زندگی ہے۔" سلیم نے سوچا۔ بشیر احمد نے بھی ایسی ہی زندگی چاہی تھی۔ لیکن ایسی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے جو توازن چاہئے وہ قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ توازن جو بابی، ایوان یا پیٹر نے برقرار رکھا ہوا تھا۔ بشیر احمد کو چولے بدل بدل کر زندگی کو مختلف خانوں میں بانٹنے کا فن نہیں آسکا تھا۔ صرف ایک چولا پہن کر خوش ہو گیا اور اسی میں دفن ہو گیا تھا۔

دونوں کافی پینے والوں کی قطار میں لگ گئے۔ ایوان صحیح کہہ رہی تھی ا۔سمیس کیفے کا وہ کیریکٹر باقی نہیں رہا تھا جو اس کی پہچان ہوتا تھا۔ سلیم کو میزوں پر تاش کی بازیاں لگی ہوئی نظر نہیں آئیں۔ پرانے صوفوں کی جگہ ہلکی پھلکی لکڑی کی چمکدار کرسیوں اور چھوٹی چھوٹی گول اور چوکور میزوں نے لے لی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھنے والی بے تکلفی بھی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی اپنی کافی لے کر باہر دھوپ میں پڑی ہوئی ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ سلیم سوچ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ اسے حیرت تھی کہ ایوان نے یہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ اس سے ملنے کیوں آیا ہے۔ بس اپنا شیطانی چرخہ چلا دیا تھا۔ سلیم اپنے آنے کا مقصد بیان کرنے کے لئے گفتگو کا کوئی سرا ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ ایوان نے گفتگو کی گاڑی ایک نئی پٹڑی پر ڈال دی۔

"تمہیں ڈیوڈ یاد ہے، میرا پرانا بوائے فرینڈ جو ایک جنسی بلی کے لئے مجھے چھوڑ

گیا تھا۔" سلیم کیسے بھول سکتا تھا۔ ایوان نے جس روز نتاشا کے ساتھ سلیم کی جوڑی بنانی چاہی تھی وہ اسی روز ایوان کے بوائے فرینڈ کے ساتھ پکڑی گئی تھی۔

"وہ ناک رگڑتا ہوا پھر میرے پاس آیا تھا۔" ایوان نے اس لمحے کا پورا مزا لیتے ہوئے کہا۔ "نتاشا نے اپنا مطلب پورا ہونے کے بعد اسے لات مار کر نکال دیا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس حرامی کا یہی حشر ہونا چاہئے تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں ابھی تک بیٹھی اس کے فراق میں آنسو بہا رہی ہوں۔ بڑی شان سے اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر اندر آیا اور فرج سے بیئر نکال کر پینے لگا تھا۔ میں نے اسے بیگ سمیت اسی وقت باہر نکال دیا۔ بیئر کا ڈبہ بھی اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ وہ' سنو سنو میری بات سنو' چیختا رہا لیکن میں نے اسے دھمکی دی کہ وہ نہیں گیا یا دوبارہ آیا تو میں پولیس کو فون کر دوں گی۔" اپنا کارنامہ سناتے ہوئے ایوان کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔

"لیکن نتاشا نے اسے چھوڑا کیوں۔" سلیم نے پوچھا۔ اسے اس کہانی میں دلچسپی تھی۔ چھوٹا سا سہی لیکن وہ بھی اس کا حصہ رہا تھا۔ ایوان نے جب اسے کہانی سنائی تو سلیم کا منصوبہ ایک بار پھر ریت کا مکان بن گیا۔

"نتاشا اپنے ملک کی خانہ جنگی سے بھاگ کر آسٹریلیا آئی تھی۔ سیاح بن کر آئی تھی لیکن آتے ہی سیاسی پناہ کی درخواست دے دی۔ اس کی درخواست نامنظور ہو گئی تو اس نے ڈیوڈ کو پھانسا۔ ڈیوڈ کو مجھ سے چھین کر فوراً ہی شادی کر لی تھی۔ کرسمس آنے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ جیسے ہی مستقل شہریت ملی ڈیوڈ کو دھکا دے کر الگ ہو گئی۔ کروئیشیا میں پہلے سے اس کا بوائے فرینڈ تھا۔ اس سے شادی کر کے اسے سڈنی لے آئی ہے۔" سلیم نے محسوس کیا تھا کہ نتاشا کا نام آتے ہی ایوان کے چہرے پر نفرت کا ایک سایہ آ کر گزر جاتا تھا۔

"لیکن تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتہ چلا۔" سلیم نے بہت کمزور سی آواز میں پوچھا۔

"ڈیوڈ ایک دن بابی سے ملا تھا' اس نے بتایا تھا۔ بابی نے مجھے بتایا لیکن مجھے

یقین نہیں آیا کہ لوگ شادی کو بھی فٹ بال سمجھ کر کھیل سکتے ہیں۔ کون اتنا نیچے گر سکتا ہے جو ایک مقدس رشتے کو چھوٹے سے مفاد کی بھینٹ چڑھا دے۔"

چھوٹا سا مفاد۔ کاش ان شادیوں کے ذریعے ملنے والا مفاد اتنا ہی چھوٹا ہوتا جتنا ایوان سمجھتی ہے۔ نتاشا کی صورت حال کو وہی سمجھ سکتا تھا جو خود اس سے دوچار تھا۔ سلیم کو پہلی بار نتاشا سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ لیکن اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ایوان جیسی آزاد اور بے باک لڑکی میں بھی ظہور کی روح سما گئی تھی۔ اس دن ظہور نے بھی اقبال کو یہی لیکچر دیا تھا۔ یہ لڑکی جو رشتے کی ڈور باندھے بغیر لڑکے بدل بدل کر زندگی گزار رہی ہے وہ بھی اخلاقیات کا درس دے رہی تھی۔ سلیم کو لگا جیسے ایوان نے اس کے خیالات پڑھ لئے ہوں۔

"اب مجھے دیکھو میں اتنے عرصے ڈیوڈ کے ساتھ رہی۔ اب بابی کے ساتھ ہوں۔ لیکن میں نے پہلے بھی نہیں کی اور اب بھی اس وقت تک شادی نہیں کروں گی جب تک یقین نہ ہو جائے کہ ہم اس رشتے کے تقدس کو سنبھال کر رکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ میری ملبورن والی بہن کئی سال سے اپنے دوست کے ساتھ رہتی ہے لیکن اسے اب تک خود پر اعتماد نہیں ہے اس نے اب تک شادی نہیں کی۔ شادی کر بھی لیتے ہیں تو اس کے تقدس پر آنچ آتے ہی الگ ہو جاتے ہیں۔ میرے ماں باپ کو دیکھ لو۔ میں نے بابی کو صاف صاف بتا دیا ہے۔ مجھے جب تک یقین نہیں ہو گا کہ ہم ساری عمر اسی طرح محبت کرتے ہوئے رہ سکتے ہیں، میں شادی کے پاک منتر نہیں پڑھوں گی۔"

ایوان شاید اپنی شادی کے خواب میں کھو گئی تھی۔ سلیم نے سوچا اب اٹھ جانا چاہئے۔ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ ایوان کی نظروں سے گر کر ذلیل ہونے سے بال بال بچا تھا۔ شادی کے سلسلے میں ایوان کی منطق اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ اس نے دعا کی کہ خواب دیکھنے والی ایوان شادی کا دکھ نہ دیکھے۔

اسے اٹھتا دیکھ کر ایوان بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی کلاس کا وقت ہو گیا تھا۔

"تمہیں کوئی کام تو نہیں تھا۔ تم نے اتنے زمانوں بعد ملنے کے لئے فون کیا تھا میں سمجھی تھی کوئی خاص بات ہو گی۔" ایوان کو اب خدا حافظ کہتے ہوئے پوچھنا یاد

آیا۔

"کچھ نہیں۔ بس تم سے ملنے کو دل چاہا تھا۔" سلیم نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ بولتے ہو۔ کب سے غائب ہو۔ کبھی فون کیا نہ اپنا رابطہ چھوڑا اور اب ملے بھی تو کچھ نہیں بتایا۔ بس میری کتھا سنتے رہے۔" ایوان نے اپنا بیگ کندھے پر ڈال لیا تھا۔

"میرے پاس بتانے کے لئے کچھ تھا بھی نہیں۔ جب ہو گا تو ضرور سناؤں گا۔" سلیم نے سوچا تم نے کچھ کہنے کا موقع ہی کب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر ملیں گے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ سلیم بھی فیکٹری جانے کے لئے تھکے تھکے قدموں سے بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔

بہت سے دن اور ہفتے گزر گئے۔ سلیم کو کوئی نئی ترکیب سوچنے کا وقت اور موقع نہیں مل سکا۔ فیکٹری میں کرسمس کے کام کا زور ایک دم ہی بڑھ گیا تھا۔ دن میں بارہ بارہ گھنٹے کام کرتا۔ اکثر ہفتہ اتوار بھی کام کرنا پڑتا۔ کچھ ہو نہ ہو بینک بیلنس بڑھ رہا تھا۔ پاکستان کو بھیجے جانے والے ڈرافٹ میں تسلسل آگیا تھا۔ رقم بھی موٹی ہو گئی تھی۔ اس کے گھر والوں نے ایک پرانی گاڑی خرید لی تھی اور جز وقتی ڈرائیور بھی رکھ لیا تھا۔ جدائی کا دکھ انہیں آرام پہنچانے لگا تھا۔ ظہور' چودھری انور اور اقبال کی طرف جانے کے ناغے ہو رہے تھے۔ ایک ہفتے کی صبح گیا تو صرف ظہور سے گپ شپ کر کے واپس گیا۔ چودھری انور حسب معمول سو رہا تھا۔ اقبال کے بارے میں ظہور نے ہنستے ہوئے بتایا تھا اس کا رشتہ کہیں طے ہو گیا ہے اور بر دکھوے کے لئے اپنی ہونے والی سسرال گیا ہے۔ سلیم کو سچ مچ بہت خوشی ہوئی وہ جانتا تھا اقبال بہت اچھا شوہر ثابت ہو گا۔

نومبر ختم ہونے تک فیکٹری میں کام سست ہو گیا۔ کافی ملازموں کی چھانٹی ہو گئی

تھی۔ صرف دن کی ایک شفٹ میں کام ہوتا تھا۔ سلیم بھی آٹھ سے دو کی چھوٹی شفٹ میں کام کر رہا تھا۔ دن کا باقی حصہ شہر میں آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارتا۔ بہت دنوں بعد ویک اینڈ پر چھٹی ملی تھی۔ لیکن اس دن فیکٹری کی کرسمس پارٹی تھی۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ پارٹی میں نہیں جائے گا۔ کرسمس اسکا تہوار نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آسٹریلوی پارٹیوں میں شراب نوشی ہوتی ہے یا رقص۔ سلیم ان دونوں شعبوں میں کمزور تھا۔ لیکن تھامس نے کہا تھا کہ وہ پارٹی میں نہیں آیا تو فیکٹری کا مالک برا مانے گا۔ فیکٹری میں صرف ۲۵ لوگ کام کرتے تھے اور مالک سب کو ان کے پہلے ناموں سے جانتا اور بلاتا تھا۔ وہ اپنی کرسمس پارٹی کو بہت سنجیدگی سے لیتا تھا۔ اس موقع پر بونس کے چیک تقسیم کرتا اور سال کے بہترین ورکر کا انعام دیتا تھا۔ جرمن نسل کا تھامس فیکٹری کا سپروائزر تھا۔ اس نے سلیم سے کہا تھا یہ اچھی بات ہے کہ وہ شراب نہیں پیتا' اس کے حصے کی وہ پی لے گا۔

تھامس بہت موٹا تازہ اور لمبا چوڑا تھا۔ پچاس سال سے اوپر کا ہو گا۔ سر کے بال ابھی تک بہت گھنے تھے لیکن سفید ہو گئے تھے۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھائے رکھتا۔ فیکٹری میں کہاوت تھی کہ مشینیں بھی تھامس کے ڈر سے خراب نہیں ہوتیں۔ برسوں کے کام نے مشینوں کی آوازوں کا ایسا عادی بنا دیا تھا کہ آواز میں ذرا سی تبدیلی پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ سیدھا اس مشین پر پہنچتا جس میں گڑ بڑ ہوتی۔ ایک مشین ٹھیک کر رہا ہوتا لیکن آواز باقی مشینوں پر ہوتی۔

پارٹی میں سلیم کو تھامس کی میز پر ہی جگہ ملی تھی۔ چار دوسرے مشین آپریٹر بھی اسی میز پر تھے۔ مختلف قومیتوں کے تھے لیکن پاکستانی یا انڈین کوئی نہیں تھا۔ پہلے سلیم کا خیال تھا کہ فیکٹری میں اپنی نسل کا وہ اکیلا ہے۔ لیکن ایک میز پر جس پر فیکٹری میں کام کرنے والی عورتیں بیٹھی تھیں سانولے رنگ کی بڑی بڑی اداس آنکھوں اور گہرے سیاہ بالوں والی ایک لڑکی اپنی طرف کی لگ رہی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھی نظر اٹھا کر سلیم کی طرف دیکھتی۔ لیکن نظریں ملتے ہی ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ وہ فجی یا بنگلہ دیش کی تو یقیناً" نہیں تھی۔ ساڑھی پہنے ہوتی تو اسے بھارت کی اور شلوار قمیض میں

ہوتی تو پاکستانی سمجھتا' لیکن اسکرٹ بلاؤز میں تھی۔ بال بھی شانوں تک کٹے ہوئے تھے۔ دونوں ملکوں کی سرحد پر کھڑی جھونکے کھا رہی تھی۔ سلیم نے سوچا تھا کہ وہ تھامس سے پوچھے گا وہ سب کوان کے تاریخ و جغرافیہ سمیت جانتا تھا۔ لیکن تھامس اس وقت اپنی جوانی کے عشق کی داستانیں سنا رہا تھا۔ میز پر بیٹھے ہوئے سب لوگ بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ کسی میں اسے درمیان میں ٹوکنے کی جرات نہیں تھی۔ مشینوں پر کام کرنے والوں کو معلوم تھا ان کے لئے تھامس کو خوش رکھنا کتنا ضروری ہے۔ تھامس کی داستانیں پوری فیکٹری میں مشہور تھیں۔ وہ ہر کرسمس پارٹی میں یہ داستانیں دہراتا تھا۔ جو پرانے تھے انہیں اس کے قصے ازبر ہو گئے تھے۔ وہ اسی وقت چپ ہوتا جب نشے میں دھت ہو کر گر جاتا۔ تھامس کے لئے فیکٹری کے مالک کا آخری تحفہ اس کی واپسی کا سفر ہوتا۔ کرائے کی شاندار لیموزین میں ڈال کر بے ہوش تھامس کو بڑی شان کے ساتھ گھر بھیجا جاتا تھا۔ تھامس اس وقت اپنا سب سے مشہور عشق سنا رہا تھا۔ جرمنی کے کسی گاؤں کے ایک شراب خانے کا قصہ تھا۔

"میں پی پی کر بالکل آؤٹ ہو گیا تھا۔ بیروں نے مجھے شراب دینی بند کر دی تھی۔ مجھ سے دو میز چھوڑ کر ایک خاندان بیٹھا تھا جن کی نوجوان لڑکی کو دیکھ کر میرے عشق کی آگ بھڑک گئی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ لڑکی مجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ مجھے لگتا جیسے وہ بار بار صرف مجھے دیکھ رہی ہے۔ اس وقت میرے لئے ہر چیز دھندلی دھندلی تھی۔ صرف اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ ریسٹورنٹ میں ایک موسیقار میز میز گھومتا ہوا وائلن بجا کر اپنے فن کی داد اور ٹپ وصول کر رہا تھا۔ میں نے اسے کئی دفعہ بلانے کی کوشش کی۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے فرمائش کر کے دوسری میز پر بیٹھی ہوئی جولیٹ کو کوئی ایسی دھن سنواؤں کہ وہ بے قرار ہو کر میرے پہلو میں آ بیٹھے۔ لیکن وائلنسٹ مجھے مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔ میری حالت ہی ایسی تھی۔ لڑکو تم لوگوں نے مجھے میری جوانی میں پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لوگ نزدیک آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ جرمنی میں ہم ان چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں پی کر بیئر کی توہین نہیں کرتے تھے۔" تھامس نے اپنے بیئر کے خالی ہونے والے گلاس کو بڑی حقارت سے ایک

طرف سرکا کر جگ منہ سے لگا لیا اور الٹے ہاتھ سے ہونٹوں کو صاف کر کے کہنے لگا۔
"بیئر کے مگے اتنے بڑے ہوتے تھے کہ انہیں ایک ہاتھ سے اٹھا کر منہ سے لگانا مشکل ہوتا۔ سیدھے ہاتھ سے اٹھا کر الٹے ہاتھ کو میز پر بنا کر سہارا دیتے ہوئے اس طرح منہ تک لے جانا پڑتا تھا۔" تھامس نے جگ کو اپنے الٹے ہاتھ پر ٹکا کر پینے کا عملی مظاہرہ کیا اور اس عمل میں ایک چوتھائی جگ اور خالی کر دیا۔ بیئر پینے کے معاملے میں وہ ابھی تک جرمن تھا۔

"پھر کیا ہوا مسٹر تھامس۔" ایک لڑکے نے جو سلیم کی طرح فیکٹری کی کرسمس پارٹی میں پہلی بار شرکت کر رہا تھا باقی کہانی سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔

"ہاں تو وہ وائلنسٹ مجھے مستقل نظرانداز کر رہا تھا۔ میں اسے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے کے لئے موقع تلاش کر رہا تھا کہ وہ میری معشوق کی میز پر چلا گیا اور اس کی فرمائش پر اس زمانے کی ایک مقبول دھن بجانے لگا۔ یہ میری بھی پسندیدہ دھن تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی میرے ہی لئے بنی تھی اسے میرے ہی لئے بھیجا گیا تھا۔ ہماری پسند بالکل ایک تھی۔ میں کرسی سے اٹھ کر لہراتا ہوا ان کی میز پر پہنچ گیا۔ قدم ڈگمگائے تھے لیکن ٹھیک اسی کی کرسی کی پشت پر ہاتھ ٹکا کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تک نہیں۔ اس طرح وائلن پر نظریں جمائے رہی۔ وائلنسٹ نے بھی ہاتھ نہیں روکا۔ لیکن جب میں نے اپنی اونچی اور بے ہنگم آواز میں لے ملاتے ہوئے وہ گانا گانا شروع کیا جس کی دھن بج رہی تھی تو ایک منٹ تک وہ مڑ کر مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی توجہ پا کر میری آواز اور اونچی اور بے ہنگم ہو گئی۔ اس نے اچانک ہی میز پر رکھی ہوئی بیئر کی خالی بوتل اٹھائی اور میرے سر پر توڑ دی۔ پھر اسی طرح کرسی پر بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں فرش پر گر پڑا تو بیرے مجھے اٹھا کر باہر ٹیکسی اسٹینڈ پر پھینک آئے۔ بڑی مشکل سے گھر پہنچا تھا۔" تھامس نے کہانی ختم کر کے جگ کو ایک بار پھر منہ سے لگا لیا۔

"کہانی ختم ہو گئی؟" اسی لڑکے نے بڑی حیرت سے پوچھا۔ اسے کچھ مایوسی ہوئی تھی۔ سلیم کے علاوہ میز پر بیٹھے ہوئے دوسرے لڑکے مسکرانے لگے تھے۔

"نہیں ختم نہیں ہوئی۔ ابھی تک جاری ہے۔ میرا سر پھاڑنے والی اب میری بیوی ہے اور سامنے والی میز پر بیٹھی ہے۔" تھامس نے اس میز کی طرف اشارہ کیا جس پر فیکٹری کے مالک اور اس کی بیوی کے ساتھ تھامس کی بیوی بھی بیٹھی تھی۔ ساتھ ہی وہ اپنا سر سہلانے لگا جیسے سر پر پڑا ہوا پرانا گومڑ تلاش کر رہا ہو۔ اس لڑکے کی طرح سلیم بھی بے ساختہ ہنس پڑا۔ اسی وقت بیرے نے میز پر بیئر کے دو جگ اور بھر کر رکھ دیئے۔ سلیم نے سوچا موقع اچھا ہے۔ وہ تھامس سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھنے لگا کہ وہ کون ہے۔

"ارے تم سارا سے کبھی نہیں ملے۔ میں سمجھا تھا کہ تم ایک دوسرے کو جانتے ہو گے۔ وہ تمہارے ہی وطن کی ہے۔ آؤ تمہیں ملواؤں۔" تھامس سلیم کا ہاتھ پکڑ کر اس میز پر آیا جہاں سائرہ دوسری دو لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے ان لڑکیوں کو اٹھا دیا۔

"لڑکیو تم میری میز پر جا کر لڑکوں کے ساتھ فلرٹ کرو' میں ان دونوں ہم وطنوں کی ڈیٹ کرانے کا بندوبست کرتا ہوں۔" دونوں لڑکیاں ہنستی ہوئی اٹھ گئیں اور اسی میز پر چلی گئیں جہاں سے تھامس اور سلیم اٹھ کر آئے تھے۔ تھامس نے سائرہ سے سلیم کا تعارف کرایا۔

"سارا یہ سالیم ہے یہ بھی انڈیا کا ہے' تم اس سے اپنی زبان میں کھٹ پٹ کر سکتی ہو۔" تھامس نے سلیم کے ساتھ لڑکیوں کی خالی کی ہوئی کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سالیم کی طرح سائرہ بھی سارا ہو گئی تھی۔

"میں انڈیا کا نہیں پاکستان کا ہوں۔" سلیم نے فوراً تصحیح کی۔

"میرا جغرافیہ کمزور ہے۔ مجھے تم لوگ سب ایک جگہ کے لگتے ہو۔" تھامس نے کہا اور سلیم نے سوچا کہ نشے میں آئے ہوئے جرمن کو نظریہ پاکستان سمجھانا مشکل ہو گا۔ اسی وقت فیکٹری کے مالک نے تھامس کو آواز دی تو وہ ان کی میز پر جا کر اپنی کوئی کہانی سنانے لگا۔ سائرہ ہنس کر سلیم کو بتانے لگی آخر میں تھامس کی بیوی اس کے سر پر خالی بوتل مارنے کا سالانہ مظاہرہ کرے گی۔

"آپ کی اردو بہت صاف ہے۔ اس میں ہندی کی آمیزش نہیں ہے۔" سلیم نے سائرہ سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

"میرا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔ ہمارے گھروں میں اردو ہی بولی جاتی ہے۔ لیکن میں بول تو سکتی ہوں لکھ اور پڑھ نہیں سکتی۔ اسکول میں میرے پاس ہندی تھی۔" سائرہ نے بتایا۔

"آپ فیکٹری میں کیا کام کرتی ہیں۔"

"دفتر کا ایڈمنسٹریشن میرے پاس ہے۔"

"آپ سے اسی لئے کبھی ملاقات نہیں ہو سکی۔ ہم نیلی ڈانگری پہن کر مشینوں پر کام کرنے والے مزدور ہیں۔ دفتر تک ہماری رسائی نہیں ہے۔" سلیم نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ آپ تو ڈگری یافتہ انجینئر ہیں۔ پوری فیکٹری میں آپ کے برابر تعلیم یافتہ کوئی نہیں ہے۔" سائرہ کے لہجے میں بہت احترام تھا۔

"آپ کیسے جانتی ہیں؟" سلیم نے بہت حیران ہوتے ہوئے کہا۔

سلیم کو یہ سب سن کر بہت اچھا لگا۔ اب اس کی سمجھ میں وجہ آ گئی تھی کہ کرسمس کا کام ختم ہونے کے بعد جب چھانٹی ہو رہی تھی تو اس کی ملازمت کیوں برقرار رہی تھی۔ وہ دونوں فیکٹری اور اس میں کام کرنے والوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر میں میزوں پر کھانا سرو ہونے لگا۔ وہ لڑکیاں جو اس میز پر بیٹھی تھیں واپس آ گئی تھیں۔ سلیم اپنی میز پر واپس چلا گیا۔ تھامس بھی پلٹ آیا تھا۔ اس کے قصے جاری تھے لیکن زبان بہک رہی تھی۔ کھانے کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں کے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سلیم نے دیکھا تو سائرہ اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک لڑکی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اب مالک اور اس کی بیوی کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ سلیم کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ اس کی طرف آئی۔

"مجھے ایک لڑکی گھر تک لفٹ دے رہی ہے اس لے جاتی ہوں۔ آپ سے پھر ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے واپس چلی گئی۔ سلیم بھی خدا حافظ

کہہ کر اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس نے سوچا شاید پلٹ کر دیکھے گی۔ لیکن وہ گھوم کر دیکھے بغیر دروازے سے نکل کر چلی گئی تھی۔ سلیم تھامس کی آواز سن کر چونکا جو اس سے کہہ رہا تھا۔

"لڑکی حاصل کرنے کے لئے دل پر نہیں سر پر چوٹ کھانی پڑتی ہے۔ خاموش بیٹھے دیکھتے رہو گے تو وہ اسی طرح چلی جائے گی۔ نہ آئے گی نہ پلٹ کر دیکھے گی۔" میز پر بیٹھے ہوئے دوسرے لڑکے ہنسنے لگے۔ سلیم بھی کھسیانا ہو کر ہنس پڑا۔ ویسے اسے حیرت تھی کہ نشے کے باوجود تھامس کی نگاہیں کتنی تیز تھیں۔ اس کے لئے شاید انسان بھی مشین بن گئے تھے جن کا چلنا یا نہ چلنا اس کی فوری توجہ کھینچ لیتا تھا۔ سلیم نے سوچا تھا کہ وہ آخر تک رکے گا اور تھامس کی رخصتی کا منظر دیکھ کر جائے گا۔ لیکن سائرہ کے جاتے ہی اسے ریسٹورنٹ خالی خالی لگنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی تھامس اور مالک سے اجازت لے کر چلا گیا۔

سلیم کا پورا ہفتہ یہی سوچتے ہوئے گزرا کہ وہ سائرہ سے دوبارہ کیسے ملے۔ ایک ہی فیکٹری میں کام کرتے تھے لیکن دونوں کے علاقے الگ الگ تھے۔ ایک دن اپنی تنخواہ کا حساب کتاب پتہ کرنے کے بہانے دفتر میں بھی گیا تھا۔ سائرہ تھی لیکن اس سے صرف ہیلو ہیلو ہی ہو سکی۔ وہ سخت مصروف تھی۔ لگتا تھا دفتر کا پورا کام اس نے اپنے سر پر اٹھایا ہوا ہے۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی کی بورڈ پر تیزی سے انگلیاں چلا رہی تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد فیکٹری کا مالک' اکاؤنٹنٹ یا منیجر سارا سارا' کی آواز لگاتا اور وہ ان کے لئے کوئی نہ کوئی فائل نکالنے اپنے دائیں طرف رکھی ہوئی کیبنٹ کی درازوں میں گھس جاتی۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجنے لگتی تو فون اٹھا کر کال ملانے لگتی۔ سلیم کو سائرہ سے ملنے کا کوئی اور طریقہ تلاش کرنا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ سائرہ کی چھٹی پانچ بجے ہوتی تھی جبکہ سلیم کا کام دو بجے ختم ہو جاتا تھا۔ ایک دن سلیم نے طریقہ ڈھونڈ ہی لیا۔ فیکٹری سے کام ختم کر کے وہ فیکٹری کے آس پاس وقت ضائع کرتا رہا اور ٹھیک پانچ بجے فیکٹری کے سامنے والے بس اسٹاپ پر کھڑا ہو کر دل میں دعائیں

مانگنے لگا کہ سائرہ کے پاس گاڑی نہ ہو یا وہ کسی ساتھی کے ساتھ لفٹ لے کر نہ جاتی ہو۔ اسے اپنی دعائیں اس وقت قبول ہوتی نظر آئیں جب اس نے سائرہ کو فیکٹری سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف آتے دیکھا۔ سلیم کو دیکھ کر وہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

"لگتا ہے آج اوور ٹائم کر رہے تھے۔" سائرہ نے پوچھا۔

"نہیں آج کل کام ویسے ہی کم ہے۔ اوور ٹائم کہاں سے ہو گا۔ فیکٹری کے پاس ہی میرا ایک دوست رہتا ہے۔ وہ انجنیئرنگ کا امتحان دے رہا ہے اس کی مدد کر رہا ہوں۔ آپ کہاں جا رہی ہیں؟" سلیم نے بہت اعتماد سے جھوٹ بولتے ہوئے بات کی۔

"میں سینٹرل تک جاؤں گی۔ وہاں سے "کوگرا" کی ٹرین لوں گی۔ آپ کہاں رہتے ہیں۔" سائرہ نے جواباً پوچھا۔

"میں تو یہاں سے تھوڑے فاصلے پر مخالف سمت میں رہتا ہوں۔ "بوٹنی" میں۔ لیکن شہر میں کام ہے اس لئے میں بھی سینٹرل جا رہا ہوں۔" سلیم نے کہا۔ اسی وقت سامنے سے بس بھی آگئی تھی۔ دونوں سوار ہو گئے۔ دونوں کو بیٹھنے کے لئے الگ الگ سیٹیں ملی تھیں اس لئے آپس میں کوئی بات نہ ہو سکی۔ سینٹرل پر دونوں اترے تو سائرہ جلدی سے خدا حافظ کہہ کر اسٹیشن کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی اور سلیم ایسے ہی بے مقصد ایک طرف کو چل دیا۔

ہر روز سلیم کو فیکٹری کے پاس رہنے والے ایک دوست کے امتحانات میں مدد دینے اور کسی کام سے سینٹرل جانا ہوتا اس لئے وہ ٹھیک پانچ بجے بس اسٹاپ پر موجود ہوتا' سائرہ کے ساتھ سینٹرل تک سفر کرتا۔ کبھی ساتھ بیٹھنے کو سیٹ مل جاتی ورنہ سینٹرل پر تیزی سے اسٹیشن کی سیڑھیاں اترتی ہوئی سائرہ کو اس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ اس کے بعد واپسی کی بس لے کر گھر آجاتا۔ وہ جانتا تھا کہ بس کا یہ سفر اسے اپنی منزل تک نہیں پہنچائے گا اس لئے ایک دن سینٹرل اسٹیشن پر بس سے اترتے ہی سائرہ کے خدا حافظ کہنے سے پہلے اس نے

پیش قدمی کر دی۔

"آج جمعہ کی شام ہے، آپ کو جلدی نہیں ہونی چاہئے۔ چلئے کہیں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔" سائرہ چند لمحے سوچتی رہی پھر جب اس نے "چلیں" کہا تو سلیم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ سینٹرل اسٹیشن کے سامنے ہی دو تین کافی شاپ تھے لیکن بند ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ اس گلی میں چل دیئے جہاں ایک لائن سے کئی کیفے اور ریسٹورنٹ تھے لیکن کچھ پہلے سے بند تھے اور باقی کی کرسیاں الٹائی جا رہی تھیں۔ پھر بھی وہ اس گلی میں کوئی کافی شاپ کھلا ہونے کی امید پر کافی دیر تک چلتے رہے لیکن صرف شراب خانے کھلے ملے، چائے خانے بند تھے۔

"لگتا ہے آپ کی کافی میرے مقدر میں نہیں ہے۔" سائرہ نے تھکے ہوئے انداز میں مسکرا کر کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ اگر چلتے رہیں تو منزل کہیں نہ کہیں ضرور آ جائے گی۔" سلیم نے بغیر رکے ہوئے کہا۔ دونوں اسی طرح گھسٹتے رہے۔ سلیم کو لگ رہا تھا کہ سائرہ تھک گئی ہے۔

"آپ تو واقعی تھک گئیں۔ چلئے واپس چلتے ہیں۔" سلیم نے رکتے ہوئے کہا۔

"نہیں اب اتنی بھی نہیں تھکی۔ سامنے کی سڑک تک چلتے ہیں۔ اگر وہاں بھی کوئی کیفے کھلا نہیں ملا تو لوٹ جائیں گے۔" سائرہ نے شاید سلیم کے لہجے میں مایوسی محسوس کر لی تھی۔

اگلی سڑک کراؤن اسٹریٹ تھی جس پر ان کی منزلوں کے چراغ روشن تھے۔ پوری سڑک پر خوب چہل پہل تھی۔ کئی کیفے تھے لیکن سب ہی بھرے ہوئے تھے اکثر کافی ہاؤسوں کے باہر چوڑی فٹ پاتھ پر سجی ہوئی میز کرسیوں پر رنگ برنگی چھتریاں سایہ کئے ہوئے تھیں۔

"آپ کی اس منزل نے تھکن بالکل دور کر دی۔" سائرہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ سلیم کو بھی جگہ بہت اچھی لگی۔ وہ دونوں بہت دیر بیٹھے کیک کھاتے، کافی پیتے اور دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ گرمیوں کا مہینہ تھا، دن بڑے تھے اس لئے آٹھ بجے بھی

روشنی باقی تھی۔ سائرہ گھڑی دیکھنے لگی۔ سلیم سمجھ گیا کہ چلنے کا وقت آ گیا ہے۔

"ویک اینڈ پر آپ کیا کرتی ہیں۔" سلیم نے کچھ امید بھری نظروں سے سائرہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں آج کل ڈرائیونگ سیکھ رہی ہوں۔ ہفتہ اور اتوار کو انسٹرکٹر آ کے مجھے لے جاتی ہے۔ شام میں فیکٹری میں کام کرنے والی کوئی نہ کوئی لڑکی آ جاتی ہے۔ انہیں میرے پکائے ہوئے مصالحہ دار کھانے پسند ہیں۔ کل تو تینوں آ رہی ہیں۔ میں نے انہیں بریانی کھلانے کا وعدہ کیا ہے۔" سائرہ نے اپنے ویک اینڈ میں سلیم کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

"بگھارے بیگن پکا کر کبھی ہمیں بھی کھلائیے۔" سلیم نے فرمائش کی۔

"میری اماں بہت اچھے بناتی تھیں۔ میں بھی بنا لیتی ہوں لیکن اتنے مزے کے نہیں ہوتے۔ کسی دن پکائے تو آپ کے لئے بھی فیکٹری لے کر آؤں گی۔" سلیم کو سخت مایوسی ہوئی۔ سائرہ نے گھر بلانے کا اشارہ تک نہیں دیا تھا۔ دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے۔

"میں آپ سے ایک بات کہوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے۔" سائرہ نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ سلیم نفی میں سر ہلا کر سوالیہ نظروں سے سائرہ کو دیکھنے لگا۔

"آپ میرے لئے بس اسٹاپ پر نہ آیا کریں۔" سائرہ نے بہت دبی ہوئی آواز میں اپنی آنکھیں جھکا کر کہا۔

"آپ کے لئے......؟ میں تو......" حیرت زدہ سلیم نے کہنا چاہا لیکن سائرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس بس اسٹاپ کے نزدیک کوئی ایسا رہائشی علاقہ نہیں ہے جہاں آپ کا کوئی دوست رہ سکتا ہو۔ آس پاس صرف فیکٹریاں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو شہر میں بھی روز کوئی کام نہیں ہوتا ہو گا۔ فیکٹری میں سب کو پتہ ہے کہ آج کل پروڈکشن دو بجے بند ہو جاتی ہے۔ دفتر کے لوگ روز آپ کو بس اسٹاپ پر آتے اور میرے ساتھ جاتے دیکھ رہے ہیں۔ کچھ دنوں میں اسکینڈل بنا دیں گے۔" سائرہ نظریں نیچی کئے

ہوئے ناخنوں سے میز کی سطح کھرچ رہی تھی۔ سلیم سمجھ گیا کہ اس کا جھوٹ پکڑا گیا ہے۔ اس نے سوچا اچھا ہی ہوا۔ بات اب جلدی آگے بڑھے گی۔ ویسے بھی سائرہ کو ملنا پسند نہ ہوتا تو وہ اس کا جھوٹ جانتے ہوئے بھی اس کے ساتھ کافی پینے نہیں آتی۔ وہ تو صرف اسکینڈل سے ڈر رہی تھی۔

”مجھے یہ جھوٹ تم سے دوستی کرنے کے لئے بولنا پڑا تھا۔ میرا خیال تھا ہم انڈیا میں نہیں آسٹریلیا میں ہیں جہاں لڑکے لڑکی کی دوستی اسکینڈل نہیں بنتی۔“ سلیم نے آپ سے تم پر آتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں انڈین ہوں اور انڈین ہی رہوں گی اور آسٹریلیا میں لڑکا لڑکی دوستی کی ناک اتنی گھما کر نہیں پکڑتے۔ آپ پہلے ہی دن کافی پلانے کی دعوت دے دیتے تو چار پانچ گھنٹے کی روزانہ مشقت سے بچ جاتے۔“ سائرہ نے مسکرا کر کہا۔

”میں بھی پاکستانی ہوں اور پاکستانی ہی رہوں گا۔ لڑکیوں کو چائے کی دعوت دینے کے لئے جو ہمت چاہئے وہ ہم میں بہت دیر میں پیدا ہوتی ہے۔ بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک ہمت آتی ہے لڑکی کسی اور کے ساتھ جا چکی ہوتی ہے۔“ سلیم نے ذرا سنجیدہ بنتے ہوئے کہا۔

”بہت دیر ہو گئی ہے اب چلتے ہیں۔“ سائرہ نے ہنستے ہوئے موضوع کو ادھورا چھوڑ دیا۔ سینٹرل اسٹیشن تک واپس جاتے ہوئے دونوں خاموش رہے۔ سائرہ اپنے خیالوں میں گم تھی اور سلیم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کو کس طرح آگے بڑھائے۔ اگلا موڑ کس طرح کاٹے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر سائرہ اس کی کافی کا شکریہ ادا کر کے خدا حافظ کہنے لگی۔

”بس اسٹاپ آنے پر تو پابندی لگ گئی۔ اب دوستی کی سیدھی ناک کہاں اور کیسے پکڑی جائے۔“ سلیم نے جانے سے پہلے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

”اگلے جمعے کو میری طرف سے اسی وقت اور اسی کافی شاپ میں جوابی کافی پیجئے گا۔“ سائرہ نے مسکرا کر کہا اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی اسٹیشن تک سیڑھیاں اترنے لگی۔

کافی اور جوابی کافی کا سلسلہ کئی جمعوں تک چلتا رہا۔ وہ ہمیشہ اسی کافی شاپ میں ملتے تھے جس کی ویٹر لڑکیاں انہیں پہچاننے لگی تھیں۔ انہیں بہت مسکرا کر خوش آمدید کہتیں۔ کوشش کرتیں انہیں وہی میز ملے جس پر وہ ہمیشہ بیٹھا کرتے تھے۔ سائرہ کافی پیتے پیتے کبھی کبھی کہیں کھو جاتی۔ سلیم کو وہ اس وقت بند پنجرے میں سمٹ کر بیٹھی ہوئی ایک چڑیا لگتی۔ کبھی اس کی آنکھوں میں اتنا خوف بھر جاتا کہ سلیم بھی ڈر جاتا۔ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں وہ کبھی بات نہیں کرتی تھی۔ سلیم نے ایک دو بار پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس نے ٹال دیا تھا۔ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بات کرنا خود سلیم کو بھی پسند نہیں تھا۔ اس لئے دونوں اپنے ملکوں' شہروں اور محلوں کی باتیں کرتے۔ آسٹریلیا سے اپنے سماجوں کا موازنہ کرتے۔ ایک دفعہ دونوں میں پاک بھارت جنگ بھی ہو چکی تھی۔ سلیم نے اسے ظہور اور چودہری انور کی کہانیاں سنائی تھیں۔ ان کہانیوں نے اداس رہنے والی سائرہ کی اداسی کو اور گہرا کر دیا تھا۔ کسی کی غمگین کہانی سن کر' کوئی اداس کرنے والی فلم دیکھ کر یا المیہ افسانہ پڑھ کر آنکھیں اس لئے نم ہونے لگتی ہیں کہ ان میں اپنے دکھ نظر آتے ہیں۔ سائرہ کے غم کی کوئی کہانی بھی اس کی آنکھوں کے روشندانوں سے جھانکنے لگتی تھی۔

ان کی ملاقاتیں جمعہ کو عبور کر کے ویک اینڈ میں داخل نہیں ہو سکی تھیں۔ نہ کافی شاپ سے نکل کر ایک دوسرے کے گھر فلم یا ڈنر تک پہنچ سکیں۔ کرسمس بھی آ کر گزر گئی۔ کرسمس پر فیکٹری ایک ہفتے کے لئے بند رہی تھی۔ فیکٹری میں کام کرنے والی ایک لڑکی کرسمس منانے اپنے ماں باپ کے پاس برسبین جا رہی تھی۔ اس نے سائرہ کو دعوت دی تو وہ اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ چودہری انور اور ظہور کا کام ایسا تھا کہ کرسمس کی چھٹیوں میں وہ زیادہ مصروف ہو گئے تھے۔ اقبال کی چھٹیاں تھیں لیکن اس کی شادی پکی ہونے کے مرحلے میں تھی۔ منگنی سے قبل وہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لئے شامیں ساتھ گزارتے۔ سلیم پورے ہفتے کٹی پتنگ کی طرح ڈولتا رہا۔

کرسمس کے بعد بھی سلیم اور سائرہ جمعے کے جمعے ملتے رہے۔ ایک ہفتے کی صبح

انھوں نے کوچی بیچ پر ناشتے کا پروگرام بنایا۔ سلیم نے اصرار کیا تھا اور سائرہ مان گئی تھی۔ دونوں نے بیچ کے سامنے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ان کا مشہور پین کیک منگایا۔ بہت سا مکھن لگا کر، شہد جیسا میپل سیرپ ڈالا اور آئس کریم اور تازہ پھلوں کی قاشوں کے ساتھ خوب مزے لے کر کھایا۔ کافی پیتے ہوئے سلیم سائرہ کو کراچی کے سمندر اور اس کے ساحلوں کے بارے میں بتانے لگا۔ منوڑا میں بیسن لگی تلی ہوئی تازہ مچھلی کے تذکرے پر اتنے بھاری ناشتے کے باوجود سلیم کو بھوک لگنے لگی۔ سائرہ بھی بہت مزے لے کر سن رہی تھی۔ اس وقت پہلی بار سلیم کو سائرہ کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نظر آئی۔ وہ سلیم کو حیدر آباد کے چار مینار اور نظام کے شاہی عجائب گھر کے بارے میں بتانے لگی۔ سلیم کو لگا جیسے موتیا اور چنبیلی کی خوشبوؤں پر سوار ہو کر وہ خوابوں کی دنیا میں چلی گئی ہے۔

"حیدر آباد دکن کی گلیاں انڈیا کی ایک فلم میں میں نے بھی دیکھی ہیں۔ بہت اچھی فلم تھی بازار مجھے یقین ہے تم نے دیکھی ہو گی۔ نہیں دیکھی تو میں تمھیں لا کردوں گا۔ تم ضرور دیکھنا۔" سائرہ ایک دم چونک پڑی۔ ایسا لگا جیسے خوابوں کے آسمان سے کسی نے دھکا دے کر نیچے پھینک دیا ہو۔

"نہیں مجھے نہیں دیکھنی۔ چلو اٹھیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔" سائرہ نے بہت آہستہ آواز میں کہا۔

"ابھی کہاں۔ ابھی تو ناشتہ کیا ہے۔ ابھی تو ایک کافی اور پیئیں گے پھر ساحل پر گھومیں گے۔ چلو میں تمھیں بازار کی کہانی سناتا ہوں۔" سلیم کا خیال تھا کہ وہ حیدر آباد دکن کی یاد دلا کر سائرہ کو خوش کر رہا ہے لیکن بازار کی کہانی سنتے ہوئے سائرہ کے چہرے سے خون کھنچتا جا رہا تھا۔ جن آنکھوں میں کچھ دیر پہلے زندگی کی ایک چمک نظر آئی تھی ان میں غم اور خوف پھیلتا جا رہا تھا۔ کہانی سنانے کے جوش میں سلیم نے سائرہ کے چہرے کی تبدیلی پر غور نہیں کیا۔ وہ ابھی کہانی کے درمیان میں ہی تھا کہ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"مجھے سخت گھٹن ہو رہی ہے۔ چلو اٹھو یہاں سے چلیں۔" وہ ریسٹورنٹ کے

باہر کے حصے میں چھتری لگی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ہوا کے جھونکے بہت خوشگوار لگ رہے تھے لیکن سائرہ کو کھڑا دیکھ کر سلیم بھی اٹھ گیا۔ سڑک پار کر کے وہ آہستہ آہستہ قدموں سے ساحل کی طرف بڑھنے لگے۔ آج بارش کی پیشگوئی تھی۔ بادلوں کے ٹکڑے ابھی سے آسمان پر تیرنے لگے تھے لیکن ساحل پر گرم دن کا روایتی رش تھا۔ وہ ساحل کے اس حصے پر ٹہلتے رہے جہاں ریت خشک تھی اور موجوں کی رسائی نہیں تھی۔ دور نکل آئے تو پگڈنڈی جیسی پتلی سیڑھیاں چڑھ کر فٹنس ٹریک پر آ گئے جہاں اس وقت بھی کئی مرد اور عورتیں جاگنگ کر رہے تھے یا اپنے کتوں کو ٹہلا رہے تھے۔ اونچائی پر بنے ہوئے ٹریک سے نیچے دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ سمندر کی موجیں چٹانوں پر اپنا سر مارتیں اور غصیلا جھاگ چھوڑ کر واپس چلی جاتیں۔ ٹریک سے اتر کر پتھروں پر قدم جماتے ہوئے وہ چٹانوں پر اترنے لگے اور ایک بڑے سے مسطح پتھر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چٹان کی اوٹ نے ساحل کا منظر چھپا لیا تھا۔ حد نگاہ تک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ آواز بھی صرف اسی کے شور کی تھی۔ یہاں سے ویڈنگ کیک آئی لینڈ بہت صاف نظر آ رہا تھا۔ سلیم سائرہ کو ویڈنگ کیک آئی لینڈ سے منسوب کہانی سنانے لگا۔ سائرہ کی آنکھوں میں اداس ہونے کی مزید گنجائش نہیں تھی۔ پھر بھی اس کی نظریں آئی لینڈ پر جم گئی تھیں۔ دونوں اسی طرح چپ بیٹھے رہے۔ سلیم کو سمندر کے شور میں سناٹے گونجتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سائرہ ساتھ تھی لیکن لگ رہا تھا جیسے وہ اور اکیلا ہو گیا ہو۔ سائرہ کی خاموشی اور تنہائی میں کچھ ایسا ہی اثر تھا۔ اس کی نظریں سائرہ پر جم گئیں۔ اداسی نے اس کے چہرے کی کشش اور بڑھا دی تھی۔ سلیم کے دل سے محبت کی لہریں پھوٹ پڑیں۔

"سائرہ......" سلیم کی آواز میں محبتوں کی جو باز گشت تھی وہ موجوں کے شور میں بھی سنائی دی۔ سائرہ نے اپنی طرف دیکھتے ہوئے سلیم کو دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔ سلیم نے سائرہ کے اور نزدیک کھسک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ سائرہ کو ایسا لگا جیسے کوئی کرنٹ چھو گیا ہو۔ اس نے اک دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آنکھوں میں اداسی کی جگہ خوف نے لے لی۔

"سائرہ تم اتنا ڈرتی کیوں ہو۔ کس چیز سے خوفزدہ ہو۔ اس تنہائی سے۔ ان چٹانوں سے، سمندر سے، ساحل سے، مجھ سے......"

"اپنے آپ سے۔" سلیم کی بات کاٹ کر وہ چٹان پر پیچھے کی طرف کھسک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت بارش کے چھینٹے پڑنے لگے۔ سلیم بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا اور سائرہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اسے چھجے والی ایک چٹان کے نیچے لے آیا۔

"ہم شاید بہت آگے نکل آئے ہیں۔ آؤ واپس لوٹ چلیں۔" سائرہ نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"اب تو آ گئے ہیں سائرہ۔ لوٹنا بہت مشکل ہے۔ دیکھو کتنی تیز بارش ہونے لگی ہے۔"

"مجھے پرواہ نہیں ہے۔ مجھے بارش میں بھیگنا اچھا لگتا ہے۔"

"لیکن مجھے پسند نہیں ہے۔ تمہیں اکیلا بھی نہیں جانے دوں گا۔ ساتھ آئے ہیں۔ واپس بھی ساتھ جائیں گے۔" سائرہ بے بسی سے سلیم کو دیکھنے لگی۔ پھر چٹان کی ٹیک لگا کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"سلیم آج کے بعد ہم نہیں ملیں گے۔" سائرہ نے اپنی نگاہیں زمین پر گاڑ دیں۔

"کیوں نہیں ملیں گے۔" سلیم نے سائرہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہمارا سفر شروع نہیں ہوا اور تم لوٹ جانا چاہتی ہو۔ ابھی ہم ٹھیک سے ملے ہی کہاں ہیں۔ میں تو آج سوچ کر آیا تھا کہ کہوں گا چلو ایک نئی منزل کا سفر شروع کریں۔ تمہیں آج ساحل پر اسی لئے لایا تھا کہ تم سے کہہ سکوں سائرہ میں تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ میں تم سے پوچھنے والا تھا میں تمہارا ہاتھ کس سے مانگوں۔ تم سے، تمہارے ماں باپ سے۔ تم بتاؤ میں کس کے پاس جاؤں یا پھر کہہ دو میں تمہیں پسند نہیں ہوں۔ اس کے بعد میں ملنے کی کوشش نہیں کروں گا۔" بارش کا شور سلیم کی آواز میں دب گیا۔

"تم بہت اچھے ہو سلیم۔ تمہیں کون پسند نہیں کرے گا۔" سائرہ نے آنکھیں

اٹھائیں تو آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ سلیم نے سوچا وہ تو بالکل ڈوب گیا۔ ایک طرف سمندر دوسری طرف بارش اور اب یہ آنسوؤں کا دریا۔

"پھر کیا بات ہے سائرہ۔ کس بات کا ڈر ہے۔" سلیم کی آواز میں محبتیں سمٹ آئیں۔ اس نے سائرہ کا ہاتھ ایک بار پھر تھام لیا۔ سائرہ نے جھٹکا نہیں لیکن بہت آہستہ سے واپس کھینچ لیا۔

"میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ کسی کے بھی قابل نہیں ہوں۔ میں تمہارے اس ویڈنگ کیک آئی لینڈ پر جمی ہوئی کائی کی طرح ہوں جس پر پاؤں رکھنے والا پھسل کر سمندر میں گر پڑتا ہے۔ پیراک ہو کر بھی تیر نہیں سکتا ڈوب جاتا ہے۔ میں ایک ڈراؤنا خواب ہوں۔ میرے بارے میں کوئی خواب مت دیکھو۔" سائرہ اب سلیم کی طرف نہیں دور سامنے شاید بارش کی دھند میں لپٹے ہوئے ویڈنگ کیک آئی لینڈ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے آنکھوں سے آنسو پونچھ لئے تھے لیکن اداسی نہیں پونچھ سکی تھی۔

"کیوں سائرہ۔ لیکن کیوں۔ کیا کیا ہے تم نے۔ تم سے آخر کیا گناہ ہوا ہے۔" سلیم کے لہجے میں اصرار بڑھ گیا تھا۔

"میرے ہاتھوں پر خون کے چھینٹے ہیں۔ دو آدمیوں کے خون کے چھینٹے۔" سائرہ کی آواز خوف سے بلکہ ہر طرح کے تاثر سے عاری ہو گئی تھی۔ بجلی بہت گرج کے ساتھ چمکی تھی۔ سلیم کو ایسا لگا یہیں کسی نزدیک کی چٹان پر گری ہے۔

وہ جن کے عارض و گیسو ہماری فکر میں تھے
انہیں کے سامنے پڑھنے گئے غزل وہ بھی

14

ملبورن ۱۹۹۱ء

سائرہ جب لال بنارسی ساڑھی پہن کر ملبورن کے ایئر پورٹ پر اتری تھی تو اتنے بڑے شہر کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی تھی۔ ایئر پورٹ سے گھر جاتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے کے راستے میں اس نے آسٹریلیا کی باغوں والی ریاست کے بہت سے رنگ دیکھے۔ اس نے شہر کی چوڑی سڑکوں کے دونوں طرف بنے ہوئے بازاروں کی رونق اور سڑک کا سینہ چیر کر چلتی ہوئی ٹرامیں دیکھیں۔ لیکن اسے شہر سے باہر نکل کر ہرے بھرے اور گھنے درختوں کے سائے بہت اچھے لگے۔ ان کی گاڑی جب اس گھر میں داخل ہوئی جس میں اسے رہنا تھا تو سائرہ کی آنکھیں اور پھیل گئیں۔ وہ اپنی چٹیا کے آخری سرے کو انگلی میں لپیٹتی ہوئی گاڑی سے اتری تو اسے یقین نہیں آیا کہ اس گھر میں کسی سے حصہ بٹائے بغیر صرف اسے رہنا تھا۔ لمبے سے ڈرائیو وے سے

گزر کر لال رنگ کی اینٹوں سے بنے ہوئے پورٹیکو کے بیچوں بیچ میگنولیا کا درخت سفید پھولوں سے لدا ہوا کھڑا تھا۔ بائیں ہاتھ پر چھوٹا سا لان اور رنگ برنگ کے گلاب کھلے تھے۔ بہت نفاست سے ترشی ہوئی گھاس پر سرو کے دو درخت آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ مکان کا مالک ریموٹ کنٹرول سے گیرج کا دروازہ خود بخود کھلنے کا جادو دکھاتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ۲۴ گھنٹوں کے سفر نے کاجل بھری آنکھوں میں نیند کے جو سرخ ڈورے بھر دیئے تھے وہ ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے۔

گھر کا چوڑا اور اونچا مرکزی دروازہ کھول کر جس کمرے میں وہ داخل ہوئے اس میں ہلکے رنگوں کے پھولدار صوفے اور کھڑکی دروازوں پر ان سے ملتے جلتے رنگوں کے پردے پڑے تھے۔ دیوار پر سورۃ فاتحہ کا ایک بڑا سا طغرہ تھا ڈرائنگ روم سے گزر کر اور اندر آئے تو ایک طرف کچن اور اسی کے ساتھ ایک اور بیٹھک تھی جس میں لیدر کے گہرے رنگ کے صوفوں کے ساتھ ٹی وی رکھا تھا۔ بیٹھک اور کچن کے درمیان محراب نما پارٹیشن اور اس کے ساتھ اونچے سٹول تھے۔ کھسکنے والے بڑے سے شیشے کے دروازے سے اسے گھر کے پچھلے حصے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ بہت دور تک پھیلا ہوا باغ تھا۔ اونچے اونچے گھنے درخت جیسے اس نے رستے میں سڑک کے دونوں طرف لگے دیکھے تھے۔ ہر طرف رنگ برنگے پھولوں کی بہاریں تھیں اور درمیان میں گردے کی شکل کا سوئمنگ پول بنا ہوا تھا جس میں ٹھہرا ہو نیلگوں پانی دور سے بھی آنکھوں کو ٹھنڈک دے رہا تھا۔ مکان کے مالک نے اس کا سامان جو ایک بڑی اٹیچی اور دو تھیلوں پر مشتمل تھا اندر لا کر رکھ دیا اور اوپر لے جا کر اسے رہائشی کمرے دکھانے لگا۔ دو سونے کے کمرے تھے۔ مہنگے نظر آنے والے فرنیچر اور صاف ستھرے پردوں اور چادروں سے آراستہ۔ ایک کمرہ پڑھنے لکھنے کا تھا۔ اس میں خانہ کعبہ کا طغرہ لگا ہوا تھا اور شیلف میں رکھی ہوئی زیادہ تر کتابیں بھی مذہبی تھیں۔ کتابوں کے شیلف کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بستر اور جھولنے والی کرسی رکھی تھی۔ کونے میں جائے نماز بچھی تھی اور اس طرف کا کونا مڑا ہوا تھا جدھر قبلہ تھا۔

"یہ ہمارا کمرہ ہے۔ میں تمہارا سامان لا دیتا ہوں تم اپنے کپڑے الماریوں میں

لگا لو اور چاہو تو نہا کر تازہ ہو جاؤ یا آرام کر لو۔" مکان کا مالک بڑے بیڈ روم کی طرف اشارہ کر کے سائرہ کو بتانے لگا۔ "تمہارے پاس ابھی تین چار گھنٹے ہیں۔ رات کو ہمیں کسی نے کھانے پر بلایا ہے۔ مجھے اب مارکیٹ جانا ہے۔ میں تمہیں آٹھ بجے لینے آؤں گا تم تیار رہنا۔" سائرہ بڑے سے بیڈ روم میں کھڑی اسے جاتا اور پھر سامان لے کر دوبارہ اوپر آتا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ جب خدا حافظ کہہ کر چلا گیا اور اس نے دروازہ بند ہونے کی آواز سن لی تو وہ بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ یہ سوچ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ وہ پورے گھر میں اکیلی ہے۔ اس کا دل چاہا کہ بستر پر کھڑے ہو کر زور زور سے اچھلے۔ ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی سیڑھیوں سے اترے اور باغیچے میں جا کر گھاس پر بھاگتی پھرے۔ کسی درخت کی ڈالی پر بیٹھ کر جھولا جھولے اور بہت سے پھول جھولی میں بھر کر سوئمنگ پول کے کنارے جا بیٹھے۔ پانی میں پاؤں ڈال کر چھینٹے اڑاتی ہوئی پھولوں کے گجرے بنائے اور ہاتھوں میں پہن کر چاند نکلنے کا انتظار کرے۔ رات کے سائے گہرے ہو جائیں تو چاند سے چھپ کر خوشبوؤں سے لدی اپنی بانہیں کسی کے گلے میں ڈال کر سو جائے۔ اسے اس خیال سے ہی شرم آ گئی۔ اسے اپنی بیوقوفی پر بھی ہنسی آئی کہ وہ ایسے خواب کیوں دیکھ رہی ہے جو اب خواب نہیں رہے۔ یہ سب کچھ تو وہ کر سکتی تھی۔ "کیا سچ مچ؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر سینڈل اتار کر ننگے پاؤں بہت سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ شیشے کا دروازہ کھسکا کر باہر نکلی لیکن بھاگی نہیں۔ آہستہ آہستہ قدموں سے باغ کے آخری سرے تک چلی گئی۔ باغ میں اس کی آمد پر بہت سی رنگ برنگی چڑیاں چہچہاتی ہوئی درختوں سے اڑیں تو سائرہ کا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ چاہتی تھی بچوں کی طرح تالیاں بجائے لیکن سہم کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ ایک پودے پر گہرے سرخ رنگ کے گلاب کا ایک پھول مسکرا رہا تھا۔ سائرہ نے اسے توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا اور سوئمنگ پول کے پانی میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ کنارے پر بیٹھ کر پانی میں پاؤں ڈالتی تو ساڑھی خراب ہو جاتی۔ اسے اپنی لاپرواہی پر غصہ آیا۔ باغیچے میں چلتے ہوئے ساڑھی گھاس سے رگڑ کھا رہی تھی۔ اس نے ساڑھی اٹھا کر دیکھی کہیں گھاس نے

اس کے سنہری حاشئے پر اپنا سبز رنگ تو نہیں چھوڑ دیا۔ گھاس کے ایک دو تنکے لگ گئے تھے وہ اس نے جھٹک دیئے اور بہت احتیاط سے ساڑھی کو ٹخنوں سے اوپر اٹھا کر واپس مکان کے اندر آ گئی۔ یہ ساڑھی اسے جان کی طرح عزیز تھی۔ اسے خریدنے کے لئے اس کی ماں نے پورے گھر کا پیٹ کاٹ کر پیسے جمع کئے تھے۔ اس ساڑھی کے تانوں بانوں میں اس کے گھر کے فاقے ہی نہیں اس کی ماں اور بہنوں کے وہ آنسو بھی جذب تھے جو اسے رخصت کرتے ہوئے ان سب نے بہائے تھے۔

سائرہ اوپر اس کمرے میں آ گئی جو اس کے سونے کا کمرہ تھا۔ اس نے سوچا تھوڑی دیر آرام کرے گی لیکن بڑے سے نرم اور گدیلے بستر کو دیکھ کر اسے شرم آ گئی۔ اسے اپنے گھر کا وہ تخت یاد آ گیا جس پر بچھا ہوا گدا دری کی طرح سخت ہو گیا تھا اور جس پر اس کی ماں اور چھوٹی بہن اس وقت بھی سو رہی ہو گی۔ سائرہ بستر کے پائے کی ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ لیکن نیچے بچھا ہوا قالین بھی اتنا نرم اور دبیز تھا کہ اس کے کولہوں کی ہڈیوں کو راحت ملنے لگی۔ وہ ایک دم اٹھ گئی۔ اسے معلوم تھا اتنی آرام دہ زمین پر بیٹھی رہی تو سو جائے گی۔ دو راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔ سو گئی تو جانے کب آنکھ کھلے۔ اسے دعوت میں جانے کے لئے آٹھ بجے تیار رہنے کی ہدایت تھی۔ اسے اپنے پہلے ہی امتحان میں ناکام نہیں ہونا تھا۔ اسے سونا نہیں تھا' جاگتے رہنا تھا۔ اس نے اپنی ساڑھی کے بل کھولنے شروع کئے اور بہت احتیاط سے تہہ کر کے اسے اپنے بستر کے سرہانے رکھ دیا۔ تہہ کی ہوئی ساڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے ماں' روشن اور عذرا یاد آ گئے۔ لیکن اس نے اپنے ابل جانے والے آنسوؤں کو روک لیا۔ اب رونے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے سوچا ٹھنڈے پانی سے نہائے گی تو جذبے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ نیند بھی بھاگ جائے گی۔ اس نے اپنا بلاؤز اور چولی اتار کر تہہ کی ہوئی ساڑھی پر رکھ دی۔ وہ غسل خانے جانے کے لئے پلٹی تو الماریوں میں لگے ہوئے قد آدم آئینوں میں اسے اپنا سراپا نظر آیا۔ وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پہلی بار وہ اپنے آپ کو پورا دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس سے پہلے اپنے آپ کو صرف گردن تک دیکھا تھا۔ گردن سے نیچے کا بدن اس کے لئے بالکل اجنبی تھا کبھی نظر جھکا

کر نہیں دیکھا تھا۔ شرما کر وہ اپنے بدن کو سمیٹنے لگی۔ ایک بار پھر نظر اٹھا کر دیکھا تو اپنے آپ کو دیکھنا اچھا لگا۔ اس نے بھاگ کر کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے مقفل کر دیا۔ کسی کے آنے کا ڈر نہیں رہا تو آئینے میں خود کو بے خوفی سے دیکھنے لگی۔ اس کے اپنے گھر میں جو چھوٹا سا آئینہ تھا اس میں صرف چہرہ نظر آتا تھا وہ بھی آدھا آدھا۔ آئینہ کبھی گر کر درمیان سے چیخ گیا تھا۔ انہیں پورے آئینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چٹیا اماں باندھتی تھی۔ غازہ اور لپ اسٹک لگانے کے لئے شکل دیکھنے کی ضرورت پڑتی لیکن اس کے لئے آدھا آئینہ کافی تھا۔ سائرہ نے پہلی بار اپنا بغیر بٹا ہوا پورا چہرہ دیکھا تھا۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر شرماتی ہوئی وہ اپنی چٹیاں کے بل کھولنے لگی۔ یہ کام بھی اس کی ماں کرتی تھی۔ چٹیا کھل گئی تو سر کے ایک جھٹکے سے بال اس کے سینے پر بکھر گئے۔ اس نے بالوں کو سمیٹ کر پشت پر ڈالا اور دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لئے۔ اسے لگا جیسے ہاتھ اس کا لباس بن گئے ہوں۔ پورے بدن میں سنسنی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے شرما کر ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے اور سوچنے لگی کہ رات کو جب چاند چھپ جائے گا تو ان ہاتھوں کو کسی کی گردن کا ہار بنا دے گی۔ لیکن اس وقت اسے ٹھنڈے پانی کی پھوار سے غسل کرنا تھا۔ باتھ روم میں گئی تو ہو اتنا صاف تھا کہ اسے استعمال کرتے ہوئے ڈر لگا۔ دروازے کو تالہ لگا کر بہت احتیاط سے وہ چینی جیسے سفید ٹب میں ٹھنڈے پانی کا شاور کھول کر لیٹ گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے باغ کے پھولوں نے ٹھنڈی ٹھنڈی شبنم اس کے جسم پر نچوڑ دی ہو۔

اس کی ماں نے صحیح کہا تھا۔ آج جو اس پر افسوس کر رہے تھے وہ کل حسد کریں گے۔ اس نے سوچا وہ ایک ایک کو اپنے اس گھر کا احوال لکھے گی انہیں بتائے گی وہ کس محل میں آکر اتری ہے۔ سائرہ نے اپنی ساری زندگی پورے خاندان کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں رہ کر گزاری تھی۔ لیکن اس نے بڑی حویلیاں دیکھی تھیں۔ باغوں والی' چوڑے صحن' لمبے دالانوں اور بہت سے کمروں والی حویلیاں جو حیدر آباد میں کم نہیں تھیں۔ لیکن سائرہ کو لگا اس مکان کے آگے وہ سب کھنڈر تھیں۔ ٹھنڈے پانی سے جسم میں کپکپی طاری ہونے لگی تو اس نے دوسرے نل کی

چرخی گھمائی۔ ٹھنڈا پانی آہستہ آہستہ گرم ہونے لگا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ اس کی انگلی کا صرف ایک اشارہ ٹھنڈے پانی کو گرم کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے بدن کو اور ڈھیلا چھوڑ دیا۔ گرم پانی نے اس کے جسم کے مساموں سے ساری تھکن نکال دی۔ وہ دیر تک پانی کو ٹھنڈا اور گرم کرنے کا کھیل کھیلتی رہی۔ پورا غسل خانہ گرم پانی کی بھاپ سے بھر گیا تھا۔ جیسے آسمان پر تیرنے والے بادل کے کسی ٹکڑے نے زمین پر آ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ پانی کا کھیل ختم ہوا تو اس نے ٹب سے اتر کر بڑی سی سفید تولیہ اپنے جسم پر لپیٹ لی۔ غسل خانے کا آئینہ بھاپ سے دھندلا ہو گیا تھا۔ دھندلے آئینے کے سامنے کھڑی وہ خود کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے انگلی سے شیشے کی بھاپ کو کھرچا تو ایک لکیر سی کھنچ گئی۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہوتی ہوئی شیشے پر لکیریں کاڑھتی رہی۔ آئینہ بڑا تھا بہت سی جگہ بچ گئی تھی اس نے بڑے بڑے حرفوں سے اپنا نام لکھ دیا۔ "سائرہ۔" لیکن یہ نام ابھی نامکمل تھا۔ سوچا بیگم لکھ کر پورا کر دے۔ "سائرہ بیگم" لیکن اَب یہ اس کا نام نہیں رہا تھا اس کا گھر اور وطن ہی نہیں نام بھی بدل گیا تھا اس کے پاسپورٹ اور دوسرے سب کاغذات پر اس کا نیا نام ہی لکھا تھا۔ اس نے بہت جھجکتے ہوئے اپنا نام مکمل کر دیا۔ "سائرہ بٹ۔" آئینے پر لکھے ہوئے اس نام میں سے اس کا اداس چہرہ جھانکنے لگا تھا۔ اسے لگا جیسے نام اس کے چہرے پر لکھا ہوا ہو۔

وہ آٹھ بجے سے پہلے ہی تیار ہو گئی۔ باہر گاڑی رکنے اور دروازہ کھل کر بند ہونے کی آواز آئی تو وہ سمجھ گئی کون آیا ہو گا۔ تھوڑی دیر بعد اکرم بٹ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آگیا۔ سخت تھکا ہوا لگتا تھا۔ سر کے بالوں اور مونچھوں کو خضاب لگا کر عمر میں جو کمی کی تھی وہ چہرے پر نظر آنے والی تھکن نے برابر کر دی تھی۔ سائرہ کو دیکھ کر بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ آ سکی۔

"کیا تم باہر باغ میں گئی تھیں۔" اس نے سائرہ سے پوچھا۔ لہجے میں نرمی قائم رکھی تھی لیکن سائرہ سہم گئی۔ شاید اس نے غلطی کی تھی۔ اسے باہر نہیں جانا چاہئے تھا۔ اس نے خوف بھری آنکھوں سے اکرم بٹ کو دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔

"تم واپس اندر آتے ہوئے شیشے والا دروازہ بند کرنا بھول گئی تھیں۔ وہ اب تک کھلا ہوا تھا۔ کوئی چور بھی اندر آ سکتا تھا۔ آئندہ خیال رکھنا۔ گھر کے دروازے کبھی کھلے مت چھوڑنا۔ میں نے تمہارے لئے چابیوں کا سیٹ بنوا دیا ہے۔ کل میں کام سے جلدی واپس آ جاؤں گا۔ تمہیں سب چیزوں کے بارے میں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ تم چلنے کے لئے تیار ہو؟ اکرم بٹ نے تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ اس نے سلمیٰ ستاروں کے کام والی فیروزی رنگ کی ساڑھی پہنی تھی جو اکرم بٹ نے اس کے لئے سنگاپور سے خریدی تھی۔ سائرہ نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔

"تمہارے بال ابھی تک گیلے ہیں۔ باہر کی ٹھنڈی ہوا لگی تو زکام ہو جائے گا۔ ہیر ڈرائر سے سکھا لو۔ براؤن رنگ کے جوتے ساڑھی سے میچ نہیں کر رہے۔ تمہارے پاس سنہرے جوتے ہیں وہ پہن لو تمہاری ساڑھی کے سنہری کام اور سنہری پرس سے میچ کر جائیں گے۔" اکرم ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے ہیئر ڈرائر نکال کر اس کا پلگ لگانے لگا۔ سائرہ نے اس عرصے میں اپنے جوتے تبدیل کر لئے تھے۔"

"میں منہ دھو کر کپڑے بدل لوں۔ دس منٹ میں ہم نکل چلیں گے۔" اکرم نے ہیئر ڈرائر کو آن کر کے گرم ہوا اڑاتے ہوئے اسے سائرہ کی طرف بڑھا دیا اور کمرے سے نکل گیا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اکرم بٹ نے تمام دروازے اچھی طرح چیک کئے تھے' الارم آن کیا تھا' گاڑی میں بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھنے میں سائرہ کی مدد کی تھی اور راستے میں بتا دیا تھا کہ جس دوست کے پاس دعوت پر جا رہے ہیں ان کا تعلق بھی حیدر آباد سے ہے۔

"رحیم پاشا دیکھنا چاہتا ہے کہ میں اس کی کس ہم وطن کو اغوا کر کے لایا ہوں۔" اکرم بٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سائرہ نے بھی پہلی بار مسکرانے کی کوشش کی۔

"رحیم پاشا سائرہ کو دیکھ کر ایک منٹ کے لئے سکتے میں رہ گئے۔ انہیں اندر ہی اندر گناہ کا احساس ہوا۔ اکرم بٹ کو حیدر آباد جا کر کسی مناسب عورت کو بیاہ کر لانے کا مشورہ انہوں نے ہی دیا تھا۔ وہاں کے رابطے بھی دیئے تھے۔ لیکن ان کا خیال

تھا وہ کسی عمر رسیدہ بیوہ سے شادی کرے گا۔ وہ تو اپنی عمر سے تیس چالیس سال چھوٹی معصوم سی بچی کو ذبح کرنے لے آیا تھا۔ "میرے خدا مجھے معاف کر دینا۔" انہوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ سائرہ نے ساڑھی کا پلو اپنے سر پر ڈال لیا تھا اور رحیم پاشا کے سامنے سر پر ہاتھ پھروانے کے لئے جھک گئی تھی۔

"خوش رہو بیٹی۔ بہت بہت مبارک ہو۔" رحیم پاشا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دل سے دعا دی۔ ان کی بیوی نے بھی سائرہ کو سینے سے لگایا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی۔

"میں آپ کا داماد ہو گیا ہوں بھابی۔ آپ نے مجھے دعائیں دیں نہ سر پر ہاتھ پھیرا۔" اکرم بٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔ رحیم پاشا نے اکرم بٹ کو ہنستے ہوئے گلے لگا لیا۔ ان کی بیوی بھی ہنسنے لگی تھی۔ انہیں اکرم بٹ کے مذاق کرنے پر حیرت ہوئی تھی۔ انہوں نے اسے بہت کم ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید اپنی شادی سے وہ بہت خوش تھا۔ اندر ڈرائنگ روم میں رحیم پاشا کے دونوں بیٹے اور بہوئیں اکرم بٹ کی بیوی کو دیکھ کر خاموشی سے کھڑے رہ گئے۔ کوئی کچھ نہیں بول سکا۔ رحیم پاشا کا بڑا بیٹا وکیل اور چھوٹا ان کی طرح اکاؤنٹنٹ تھا۔ وکیل بیٹے کی بیوی آسٹریلیا کی تھی جبکہ چھوٹے بیٹے کی شادی انہوں نے حیدر آباد میں اپنی بہن کی بیٹی سے کی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر سائرہ کو گلے لگایا۔

"کتنی خوبصورت ہو تم۔ بالکل شبانہ اعظمیٰ کی طرح۔ اسی کی طرح کا خوابناک چہرہ، وہی کٹورہ جیسی کالی آنکھیں، ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ۔" اس کی تعریف شاید ابھی جاری رہتی کہ رحیم پاشا کی بڑی بہو نے اسے اپنی طرف کھینچ کر اس کے دونوں گالوں پر بوسے دیئے اور سب کا تعارف کرانے لگی۔

"میں جولی ہوں۔ یہ جن سے تم ابھی ملی ہو حنا ہیں۔ وہ میرے شوہر ہیں عظیم اور ان کے برابر میں حنا کے میاں فہیم ہیں۔" سائرہ نے بہت شرماتے ہوئے انہیں آداب کیا۔ سب صوفوں پر بیٹھ گئے۔ حنا ٹرے میں ان کے لئے شربت لے آئی۔ احول پر تکلیف دہ سی خاموشی تھی جسے توڑنے کے لئے رحیم پاشا اکرم بٹ سے اس

کے بزنس کا حال پوچھنے لگے۔ رحیم پاشا اکرم بٹ کا اکاؤنٹس دیکھتا تھا۔ اکرم بٹ کے سماجی تعلقات اس کے کسی نہ کسی تجارتی رشتے کا نتیجہ تھے۔ بے وجہ کی دوستیوں کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ لیکن اب سوچ رہا تھا کہ وہ بھی دعوتوں کا سلسلہ شروع کرے گا۔ لوگوں کو دکھائے گا کہ وہ کیسے رہتا ہے۔

عظیم اپنی بیوی کے چہرے پر زلزلے کے اثرات دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا جولی کسی بھی وقت پھٹنے والی ہے۔ وہ آسٹریلین لڑکی تھی منافقت کی پاک بھارتی اخلاقیات کی عادی نہیں ہوئی تھی۔ جو سچ سمجھتی تھی کہہ جاتی تھی۔ عظیم کو معلوم تھا اکرم بٹ کی کم عمر بیوی کو دیکھ کر جولی کے اندر جوار بھاٹا ابل رہے ہوں گے۔ وہ نظروں ہی نظروں میں اسے خاموش رہنے کے لئے کہہ چکا تھا لیکن جانتا تھا کہ جولی کو زیادہ دیر روکنا ممکن نہیں ہو گا۔ کسی بھی وقت وہ اکرم بٹ سے اس کی شادی کا موضوع چھیڑ بیٹھے گی۔ اس نے آخر ایک حل نکال لیا۔

"جولی اور حنا تم لوگ چاہو تو سائرہ کو اندر لے جاؤ۔ یہاں اب تھوڑی ہی دیر میں کشمیر کی جنگ چھڑنے والی ہے۔" سب کو معلوم تھا کہ ایک عمر باہر گزارنے کے باوجود اکرم بٹ کشمیر کے معاملے میں بہت جذباتی تھا۔ پیسہ خرچ کرنے کے معاملے میں بس ایک ہی بے احتیاطی کرتا تھا اور اپنی پسند کے ایک کشمیری گروپ کو باقاعدگی سے چندہ بھیجتا تھا۔ رحیم پاشا اس سے کشمیر کی تازہ خبر پوچھتا اور اکرم بٹ کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتے۔ جولی اور حنا سائرہ کو اوپری منزل پر لے گئیں جہاں چھوٹے سے لاؤنج میں آرام دہ صوفے پڑے ہوئے تھے۔ دونوں اس کے ہوائی سفر کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ رسمیات ختم ہوئیں تو جولی نے انٹرویو شروع کر دیا۔

"شادی سے پہلے تم اپنے شوہر سے ملی تھیں۔" سائرہ نے صرف نفی میں سر ہلا دیا۔

"تم سے اس رشتے کے بارے میں پوچھا گیا تھا۔" اس دفعہ سائرہ نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔

"اور تم نے ہاں کر دی تھی۔" سائرہ نے جواب میں پھر ہاں کر دی۔

"تمہیں معلوم تھا کہ ایک بوڑھے آدمی سے تمہاری شادی ہو رہی ہے اور تم نے ہاں کر دی تھی۔" سائرہ نے آنکھیں اٹھا کر جولی کو دیکھا اور پھر حنا کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے مدد طلب کرنے لگی۔ حنا حیدر آباد میں رہی تھی وہ ان کہانیوں کو جانتی تھی۔ اس کے لئے سائرہ جیسی کہانیوں میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی اس کی آنکھوں میں اداسی آ گئی۔ اس نے سائرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکی دی۔

"تمہاری کیا مجبوری تھی۔" جولی نے اپنے لہجے کو نرم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"غربت!" سائرہ نے آنکھیں جھکا کر زیر لب کہا۔

"تمہاری غربت اکرم بٹ نے کتنے پیسوں میں خریدی۔" جولی کے لہجے میں پھر کاٹ آ گئی۔

"جولی پلیز......!" حنا نے جولی کو گھورتے ہوئے کہا۔ سائرہ نے آنکھیں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں بہت درد بھرا ہوا تھا۔ یہی درد لہجے میں بھی آ گیا۔

"ایک چھوٹی سی قربانی مجھے بھی دینی تھی۔ وہ میں نے دی ہے اور اپنی مرضی سے دی ہے۔" جولی اردو سمجھتی تھی اور سائرہ انگریزی، حنا پھر بھی ترجمانی کا فریضہ ادا کرنے لگی۔

"یہ چھوٹی سی قربانی ہے۔ تم نے اپنی زندگی، جوانی کی ساری امنگیں اپنی پوری عمر گروی رکھ دی ہے اور تم اسے چھوٹی سی قربانی کہتی ہو۔" جولی کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سائرہ کچھ نہیں بولی بس اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کی چمکتی ہوئی سرخ پالش کو گھورتی رہی۔ اس نے سوچا کاش یہ ناخن بڑی اسکرین بن سکتا جس پر وہ غربت کی فلم چلا کر جولی کو دکھا سکتی۔

جولی سائرہ کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اس نے بھی سائرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"دیکھو یہ سب میرے لئے بہت عجیب اور انوکھا ہے۔ مجھے ملتے ہی تم سے

شاید ذاتی سوال نہیں پوچھنے چاہئیں تھے۔ تمہیں برا لگا ہو تو معاف کر دو۔ لیکن میرا تجسس بڑھ گیا ہے۔ تمہاری کہانی سنے بغیر میری بے چینی ختم نہیں ہو گی۔ میری سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کسی کے لئے کوئی اپنی زندگی کیسے قربان کر سکتا ہے۔" سائرہ نے سوچا کسی کی مجبوری جاننے کے لئے اس کی قبر میں اترنا پڑتا ہے۔ کسے اتنا حوصلہ ہے۔ سب اپنی بینائی سے اپنے اپنے اندھیرے ٹٹولتے ہیں۔ دوسروں کے اندھیروں میں کون جھانکے کسے اتنی فرصت ہے۔ پھر بھی اسے جولی کے لہجے میں خلوص محسوس ہوا۔

"آپ حنا باجی سے سنئے۔ وہ ہمارے شہر کی بہت سی کہانیوں کو جانتی ہوں گی۔ میری تو بہت معمولی اور عام سی کہانی ہے۔" سائرہ نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"نہیں سائرہ پلیز۔ جولی کی طرح مجھے بھی تمہاری کہانی سننے کا اشتیاق ہو گیا ہے۔ تم ہمیں اپنی بہنوں کی طرح سمجھ کر سناؤ۔ یہ سوچ کر سناؤ کہ تم اس پردیس میں اب اکیلی نہیں ہو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہاری ہر ضرورت میں ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔" حنا نے کہا۔ معصوم شکل کی اس کچی سی لڑکی کے لئے حنا کا دل بھی کھنچنے لگا تھا۔

"ہاں سارا۔ تم خود کو کبھی اکیلا مت سمجھنا۔" جولی نے بھی اسے یقین دہانی کرائی۔ سائرہ کو ان کی یقین دہانیاں اعتماد دے رہی تھیں۔ اسے اطمینان ہوا کہ پردیس میں پہلے ہی دن تھوڑی سی دیر کی ملاقات میں کوئی اپنا کہہ رہا تھا۔ لیکن وہ سوچنے لگی پتہ نہیں انہیں یہ بات پسند آئے گی یا نہیں۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ آتے ہی وہ اپنی غربت کے اشتہار بانٹنے لگی ہے تو انہیں برا لگے گا۔ وہ ان کے غصے کا سامنا کیسے کرے گی۔ حنا نے شاید اس کے خیال پڑھ لئے۔

"تمہاری کہانی تمہاری اپنی کہانی ہے۔ اسے سنا کر تم کوئی گناہ نہیں کرو گی۔ ہم اسے کہیں دہرائیں گے بھی نہیں۔ نہ اپنے شوہروں سے نہ بٹ صاحب سے۔ ویسے بھی کھانے میں ابھی دیر ہے۔ امی دال اور مرد اپنی سیاست بگھار رہے ہیں۔ ہمارے پاس کافی وقت ہے۔" جولی بھی سر ہلانے لگی۔ سائرہ نے سوچا شاید حنا ٹھیک کہتی ہے۔

یہ اس کے اپنے دکھڑے تھے۔ گلہ تھا تو اپنے حالات سے تھا کسی اور کا تو دوش تھا بھی نہیں۔ پھر چھپانے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ اس کی شادی خود اس کے حالات کا اشتہار تھی۔ اکرم بٹ کو اور اسے ساتھ دیکھ کر کوئی بھی پوری کہانی پڑھ سکتا تھا۔ جولی نے ملتے ہی سوالوں کا جو حملہ کیا تھا وہ اس کا ثبوت تھا۔

"کہانی تو بس ایک لفظی ہے۔ غربت۔ جو میرے شہر کے بہت سے گھروں کا مشترکہ درد ہے۔" سائرہ نے ایک گہرا سانس لے کر کہنا شروع کیا لیکن آنکھیں اسی طرح انگوٹھے کے ناخن پر جمی ہوئی تھیں جیسے اپنی خیالی اسکرین پر رول ہوتی ہوئی تحریر پڑھ رہی ہو۔ اس کا چہرہ بھی کسی کچی لڑکی کا معصوم چہرہ نہیں رہا تھا۔ اس پر تجربوں کا سائبان تن گیا تھا۔ آنکھوں میں سنجیدگی آ گئی تھی۔ اس نے ایک بہت گہرا سانس لے کر اس ایک لفظی کہانی کو پھیلانا شروع کیا۔

"ہم ہمیشہ سے غریب نہیں تھے۔ ہم تین بہنیں ہیں جو پیدا ہو کر اپنے اپنے حصے کی نحوستیں ساتھ لے کر آئی تھیں۔ یہ نحوستیں مل کر بہت طاقتور ہو گئی تھیں۔ میری ماں کے والدین بچپن میں مر گئے تھے لیکن انہیں ان کے ایک ماموں نے جن کی کوئی اولاد نہیں تھی بہت لاڈ پیار سے پالا تھا۔ میری ماں کو ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا اس لئے ان کی ساری توجہ پڑھائی لکھائی پر رہتی تھی۔ انہیں میڈیکل میں داخلہ بھی مل گیا تھا اور ڈاکٹر بننے کے خوابوں کے پورا ہونے میں صرف دو سال کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ وہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھیں کہ ان کی شادی کر دی گئی۔ ان کے ماموں بیمار رہنے لگے تھے اور مرنے سے پہلے میری ماں کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ ایک اچھا رشتہ آیا تو انہوں نے فوراً" ہاں کہہ کر ماں کے ہاتھ پیلے کر دیئے۔ ان کی احتیاط غلط نہیں تھی۔ شادی کے چند مہینوں بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔"

"میری ماں سے وعدہ ہوا تھا کہ وہ شادی کے بعد بھی اپنی پڑھائی جاری رکھ سکیں گی۔ وعدہ جھوٹا نہیں تھا۔ لیکن حالات پر کسی کا بس نہیں تھا۔ میرے باپ بہت خوشحال تھے۔ وہ اپنی آبائی فارمیسی سنبھالتے تھے جو خوب چلتی تھی۔ شادی کے پہلے چند مہینے انہوں نے جشن میں گزارے اور نو مہینے کے اندر میری بڑی بہن روشن پیدا ہو

گئی۔ وہ ابھی چھ مہینے کی تھی کہ میں پیٹ میں آ گئی۔ دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کا بوجھ پڑا تو میری ماں کے ڈاکٹر بننے کے منصوبے ادھورے رہ گئے۔ ہم جس گھر میں رہتے تھے وہ تھا تو پرانے طرز کا لیکن بہت کشادہ اور بہت بڑا تھا۔ صحن کی ہر دیوار پر موتیا اور چنبیلی کی بیلیں چڑھی تھیں۔ میں نے انہیں پھولوں کی خوشبوؤں کو ناک میں بسا کر ہوش سنبھالا تھا۔ ہمیں جب وہ مکان چھوڑ کر غریبوں کی بستی میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر رہنا پڑا تو ایک عرصے تک مجھے لگتا کہ میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں باہر نکلتی تو سانس روکے ہوئے رکھتی تھی۔ لیکن کب تک روکتی۔ پوری بستی، بستی کا ہر رستہ غلاظتوں کا ڈھیر تھا۔ گلیوں کی دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے چھوٹے چھوٹے بچے اپنے پیٹ کا بوجھ ہلکا کر رہے ہوتے۔ میرا بچپن انہی بدبوؤں میں رہ کر جوان ہوا تو بو کا احساس ختم ہو گیا۔ موتیا چنبیلی کی خوشبو بس ایک سہانا خواب، بھولی بسری سی کوئی یاد بن کر رہ گیا۔

"میں ابھی تین سال کی ہی تھی کہ میرے باپ کو ایک عجیب مرض نے آ دبوچا۔ انہیں بھول جانے کی بیماری ہو گئی تھی۔ کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ کھانا کھانا بھی بھول جاتے۔ بھوک لگنا یاد نہیں رہا تھا یا اس کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ سوکھ کر بالکل کانٹا ہو گئے۔ فارمیسی پر بھی توجہ نہیں رہی۔ نوکروں کو پرواہ نہیں تھی۔ میرے باپ کو ایک دفعہ ایک مہینے تک اسپتال میں رہنا پڑا۔ میری ماں دو چھوٹی بچیوں اور اسپتال کے درمیان بٹ گئی تھی۔ اسپتال سے نکل کر آئے تو فارمیسی میں خاک اڑ رہی تھی۔ آمدنی تو کیا ہوتی الٹے قرضے چڑھ گئے تھے۔ میرے باپ کی دکانداری کرنے کی حالت نہیں تھی۔ ایک دن میری ماں غصے میں خود فارمیسی جا کر بیٹھ گئی۔ وہ دواؤں کو جانتی تھی۔ کہتی تھی چند دن میں دواؤں کے کاروبار کو بھی جان جائے گی۔ میری ماں شاید فارمیسی چلا لیتی۔ وہ بہت مضبوط ارادے والی عورت تھی۔ آج اس عمر میں بھی وہ چٹان کی طرح سخت ہے۔" ماں کی یاد آئی تو سائرہ کی آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔ لیکن اپنے آنسوؤں کو پونچھ کر اپنی داستان اس نے دوبارہ شروع کر دی۔

"اپنی بیوی کو دکان پر جاتے دیکھ کر میرا باپ ٹوٹ گیا۔ اس کی انا کو سخت دھکا

لگا تھا۔ کچھ کر نہیں سکتا تھا اس لئے کچھ کہہ نہیں سکا لیکن ایک ہفتے کے اندر اندر اس نے فارمیسی بیچ دی۔ گھاٹے میں چل رہی تھی اس لئے کوڑیوں کے مول بکی۔ میرا باپ بالکل ہی بستر سے لگ گیا تھا۔ جو کچھ پیسہ آیا تھا وہ علاج پر اور ہمیں پالنے پر خرچ ہوتا رہا۔ ختم ہوا تو قرضہ چڑھنے لگا۔ میری ماں نے میرے باپ کی خدمت میں تن من دھن لگا دیا تھا۔ وہ جب بیاہ کر آئی تھی پھولوں جیسی تھی۔ لیکن چند سالوں میں اس کا رنگ اتر گیا تھا چہرے پر لکیریں ابھر آئی تھیں۔ میرا باپ اس کے بعد چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ اس وقت عذرا پیٹ میں تھی۔ وہ میرے باپ کے مرنے کے دو ماہ بعد پیدا ہوئی۔ میرے باپ کو بیٹے کی بڑی حسرت تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس دفعہ ان کا بیٹا ہو گا۔ اچھا ہوا کہ عذرا ان کے سامنے پیدا نہیں ہوئی ورنہ مرنے سے پہلے ایک اور حسرت پوری نہ ہونے کا دکھ موت کی تکلیف اور بڑھا دیتا۔

"سوگ کے دن پورے کر کے سب چلے گئے تو حویلی خالی خالی اور سنسان سی ہو گئی۔ عذرا جب تین مہینے کی ہو گئی تو میری ماں نے فیصلے کر لئے تھے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ دور کے رشتے داروں نے اسے سمجھایا تھا کہ دوسری شادی کر لے۔ ایک دو رشتے بھی تھے۔ وہ اتنے بڑے مکان کی مالک تھی۔ کسی ایک کے لئے ہاں کہہ کر بچیوں کو نیا باپ دے سکتی تھی۔ لیکن میری ماں نے ہاں نہیں کی۔ اب وہی ہماری ماں تھی اور وہی باپ۔ اس نے مکان کو فروخت کیا اور ہم تینوں کو ساتھ لے کر ایک غریب بستی میں چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگی۔

"مکان بکنے سے جو پیسے ملے تھے انہوں نے بہت برسوں ہمارا ساتھ دیا۔ ہم چھوٹے سے بڑے ہو گئے۔ میری ماں نے ہم سب کو تعلیم دلانے کا عہد کر رکھا تھا۔ روشن کالج میں آ گئی تھی میں بھی ہائی اسکول کر کے کالج میں جانے کے لئے تیار تھی۔ عذرا پڑھنے میں ہم دونوں سے اچھی تھی۔ میری ماں ڈاکٹر بننے کے اپنے ادھورے خوابوں کو عذرا کی شکل میں دیکھنے لگی تھی۔ پیسے آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے تو میری ماں نے اس محلے میں جس کی ایک حویلی میں کبھی وہ رہتی تھی بچوں کے ٹیوشن لینے شروع کر دیئے۔ ٹیوشن نہیں ملتے تو گھروں کے کام کرنے لگتی۔ رات رات بھر لالٹین

کی اندھی روشنی میں معاوضے پر سوئیٹر بنتی لحاف توشے بناتی۔ ہم بدبودار محلے میں تو رہتے تھے لیکن ماں ہمیشہ ہمیں صاف ستھرا اور گندگیوں سے بچا کر رکھتی۔ باہر نکلتے تو ہمارے کپڑوں پر ایک دھبہ نہیں ہوتا۔ میری ماں ہر وقت دعا کرتی کاش اپنی بچیوں کی ہر خواہش پوری کر سکے۔ لیکن ہم جن حالات میں بڑے ہوئے تھے ان میں ہم نے خواہش کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ عذرا بچپن سے ہی بہت حساس ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ماں کو دوسروں کے گھر کے برتن دھوتے ہوئے دیکھا تھا۔ روشن اور میں تو اسکول چلے جاتے لیکن عذرا چھوٹی تھی اس لئے میری ماں کام کرنے جاتی تو اسے ساتھ لے کر جاتی تھی۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ہاتھ بٹانے کی کوشش پر ماں کو روتے دیکھتی تو وہ ڈر جاتی کہ اس نے کوئی غلط کام کر دیا ہے۔ عذرا نے تو وہ حویلی بھی نہیں دیکھی تھی جو کبھی ہماری تھی اور جس کے بڑے سے آنگن میں ہم کھیلا کرتے تھے۔ ماں کبھی اس طرف سے گزرتی تو اس کی دیوار سے اتری ہوئی چنبیلی کی بیل کے سائے میں دیر تک کھڑی رہتی۔ ایک دفعہ اس نے پھول توڑ کر عذرا کے ہاتھ میں بھر دیئے تھے۔ گھر آ کر عذرا نے پھول ہمیں دے دیئے اور بتایا کہ ماں نے کسی کے گھر کی بیل سے چرائے ہیں۔ ماں کو بہت رونا آیا روشن کو بھی اپنی حویلی کی موتیا اور چنبیلی بہت یاد آتی تھی۔ اس نے عذرا کو گلے لگا کر سمجھایا تھا وہ کسی اور کی نہیں ہماری اپنی حویلی تھی ہماری اپنی چنبیلی تھی۔

"روشن بی اے کر کے روٹی کمانے کی جدوجہد میں ماں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ اسے ایک اسکول میں پڑھانے کی نوکری مل گئی تھی۔ لیکن ماں کی پریشانیوں میں نیا اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے بیٹیوں کے جہیز بنانے تھے۔ روشن کی شادی اسی محلے کے ایک لڑکے کے ساتھ طے ہوئی تھی۔ وہ روشن کی زندگی بھر کا ساتھی بننے والا تھا' روشن نے شادی سے پہلے ہی اسے اپنا مان لیا۔ وہ اس کی محبت میں اس کے لئے بے حد جذباتی ہو گئی تھی۔ روشن جس اسکول میں پڑھانے جاتی تھی وہاں آتے جاتے وہ لڑکا اس کے ساتھ ہوتا۔ پھر گھر آتی تو اسے لمبے لمبے خط لکھتی۔ ماں کو جہیز جمع کرنے کی پریشانی شروع ہو گئی تھی قرضے لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ پیسے فاقے کر کے

بچائے تھے۔ جہیز کی لال بنارسی ساڑھی خرید کر لائی تو ہم سب رات کو دیر تک اس پر ہاتھ پھیر کر خوش ہوتے رہے۔ ماں کو میں نے بہت زمانے بعد اس دن ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن جلد ہی اس کی یہ ہنسی نئے آنسوؤں میں بدل گئی۔

"ہمارے نصیب شاید صرف ہمارے لئے خراب تھے۔ لیکن دوسروں کے پتھر کو چھو کر پارس بنا سکتے تھے۔ روشن کے منگیتر کو جو بی کام کر کے کلرکی ڈھونڈ رہا تھا سعودی عرب کے ایک بینک میں نوکری مل گئی۔ وہ روشن کو روتا چھوڑ کر یہ وعدہ کر کے گیا کہ ایک سال بعد وہ چھٹی پر آئے گا اور روشن کو شادی کر کے لے جائے گا۔ روشن کے خط اور لمبے ہو گئے۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت اور عہد و پیماں کا سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔ سب کو روشن کی قسمت پر رشک آتا تھا کہ وہ جلد ہی ایک اچھی سی خوبصورت زندگی گزارنے جدہ چلی جائے گی۔ لڑکے کے سعودی عرب سے آنے میں ایک دو مہینے باقی تھی کہ اس کی ماں آئی اور میری ماں کو ایک لمبی فہرست دے کر چلی گئی کہ جہیز میں انہیں یہ سب کچھ چاہئے۔ میری ماں کے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ یہ سب کچھ کہاں سے آئے گا۔ وہ لڑکے کے گھر جا کر بہت گڑگڑائی۔ مجبوریاں بتائیں لیکن لڑکے کی ماں ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ روشن کو بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنے منگیتر کو خط لکھ کر بتایا کہ اس کی ماں نے کیا کیا ہے۔ لڑکے نے جوابی خط میں محبتوں کے بہت سے مضمون باندھے لیکن لکھا تھا اپنی ماں کے سامنے وہ بھی بے بس ہے۔ اس نے روشن کو لکھا کہ وہ کسی طرح ماں کی مانگیں پوری کر دے' شادی کر کے وہ اسے سعودی عرب لے جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خط پڑھ کر روشن اور اس کے ساتھ میں اور ماں بہت روئے۔ عذرا نے اپنا چہرہ کتابوں میں چھپا لیا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کریں۔ روشن صرف بڑی بہن نہیں تھی۔ چھوٹی ماں کی طرح تھی مجھ سے صرف ڈیڑھ سال بڑی تھی لیکن اس نے مجھے اور عذرا کو ماں کے ساتھ مل کر پالا تھا۔ عذرا تو اسے اماں ہی کہتی تھی۔ میں بی اے کا امتحان دے چکی تھی اور روشن کے اسکول جا کر اپنی نوکری کی بات بھی کر آئی تھی صرف نتیجہ

کا انتظار تھا۔ عذرا بھی فرسٹ ایئر میں آگئی تھی۔ روشن کی رخصتی کے بعد ایک کمانے والا کم ہو جاتا۔ اس کی جگہ مجھے پوری کرنی تھی۔ میری ماں مدد اور قرضے کے لئے در در جا رہی تھی لیکن خیرات کے چند روپے دینے والے تو ملے قرضہ دینے پر کوئی تیار نہیں تھا۔ ہمیں کوئی قرضہ کس امید پر دیتا۔ روشن کو دیکھ دیکھ کر ہم سب کا دل بیٹھنے لگتا۔ ایسا لگتا جیسے کسی نے اس کے چہرے سے زندگی نچوڑ لی ہو۔ پڑھا کر اسکول سے واپس آتی تو منہ پر دوپٹہ ڈال کر لیٹ جاتی۔ عذرا کے گدگدانے پر بھی نہیں مسکراتی۔ ہمیں ڈر تھا کہیں اپنی جان نہ لے لے۔ وہ اپنی جان بھی شاید ہماری وجہ سے نہ لے سکی۔ وہ نہ رہتی تو ہمیں پالنے کے لئے ماں کا ہاتھ کون بٹاتا۔ اسی زمانے میں میرے لئے ان کا رشتہ آگیا۔ جو رشتہ لے کر آئے تھے انہیں ہماری صورتحال معلوم تھی۔ انہوں نے میری ماں کو بتا دیا تھا کہ ان کی عمر ذرا بڑی ہے لیکن وہ مجھے آسٹریلیا میں ملکہ بنا کر رکھیں گے۔ انہوں نے پیش کش کی تھی کہ وہ روشن کا پورا جہیز اور شادی کا خرچہ دیں گے۔ میری شادی کا سارا خرچ بھی خود کریں گے۔ میری ماں کو رشتہ لانے والا ایسا لگا جیسے کوئی فرشتہ صحن میں اتر آیا ہو۔ میں بھی خوش تھی کہ میرا وجود بھی کسی کام آ رہا ہے۔ میری ماں دوسرے دن روشن کو لے کر ان سے ملنے گئی اور جب واپس آئی تو روشن سخت غصے میں تھی۔ وہ ماں پر بری طرح برس رہی تھی کہ اس نے آخر ایسا سوچا بھی کیوں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کیا بات تھی۔ ماں نے بتایا کہ جس کا رشتہ آیا ہے اس کی عمر کافی بڑی ہے۔ کل وہ جواب لینے آئیں گے تو وہ منع کر دے گی۔ میں یہ سن کر مچل گئی میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ مجھے آسٹریلیا جانا ہے۔ مجھے یہیں شادی کرنی ہے۔ مجھے عمر کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ روشن نے مجھے بہت سمجھایا لیکن میں بالکل اڑ گئی تھی۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر انہوں نے یہ رشتہ نہیں مانا تو کنویں میں کود کر جان دے دوں گی۔ میری ماں رات بھر مجھے لپٹائے ہوئے لیٹی اور روتی رہی۔ دوسرے دن جو رشتہ لے کر آئے تھے وہ پوچھنے آئے تو میری ماں نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔" سائرہ خاموش ہو گئی اس کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے خاموشی مسلط ہو گئی۔

"تمہاری بہن کی شادی اس لڑکے سے ہو گئی جسے وہ چاہتی تھی۔" جولی نے پوچھ کر خاموشی توڑی۔ سائرہ تھوڑی دیر اسی طرح خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلا کر چہرہ جھکا لیا۔

"کیا......؟" حنا حیرت سے چیخ پڑی۔ "تم نے جس کے لئے اپنی زندگی بھینٹ چڑھا دی آنکھیں بند کر کے اتنی دور اس کنوئیں میں کودنے آ گئیں وہ سب بیکار چلا گیا۔" جولی کا منہ بھی کھلا رہ گیا۔ سائرہ خاموش رہی پھر اس نے کہانی پھر وہیں سے شروع کر دی جہاں سے چھوڑی تھی۔

"ایک ہفتے کے اندر ہماری شادی ہو گئی تھی۔ وہ پاسپورٹ ویزا کی کارروائی کے لئے مجھے دہلی لے گئے۔ عذرا ساتھ گئی تھی۔ روشن سے بھی کہا تھا لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ انہیں آسٹریلیا واپس آنے کی جلدی تھی۔ اپنا کام چھوڑ کر آئے تھے اس لئے چلے گئے۔ انہوں نے بتایا تھا میرا ویزا آنے میں تین مہینے لگیں گے، میں آسٹریلیا آتی ہوئی کسی فیملی کے ساتھ آ جاؤں۔ میں خوش ہو گئی میں پہلے سمجھی تھی کہ مجھے ان کے ساتھ فوری جانا ہو گا۔ لیکن اب میں روشن کی شادی میں شریک ہو سکتی تھی۔ روشن بھی اب معمول پر آ گئی تھی۔ بلکہ اب تو اپنے جہیز کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ وہ اس لئے بھی خوش تھی کہ اس کا منگیتر کسی بھی دن آنے والا تھا۔ وہ آیا تو روشن سے نہیں ملا بلکہ ایک دن اپنی ماں کو لے کر ہمارے گھر آ گیا۔ ہمارا صرف ایک کمرے کا گھر تھا۔ روشن کے لئے کہیں چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ بس وہ سر پر دوپٹہ اوڑھ کر ایک کونے میں بیٹھ کر شرمانے لگی۔ میری ماں بہت خوش تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ روشن کی ہونے والی ساس شادی کی تاریخ طے کرنے آئی ہے۔ لیکن اس نے میری ماں کے پاؤں کی زمین ایک بار پھر سرکا دی۔ اس نے کہا کہ اس کے بیٹے کا کہیں سے رشتہ آیا ہے جو جہیز کے ساتھ پچاس ہزار روپے نقد بھی دے رہے ہیں اگر میری ماں پچاس ہزار روپے کا انتظام کر دے تو وہ اس رشتے کو منع کر دے گی۔ تاریخ بھی ابھی طے کر دے گی۔ میری ماں نے بڑی بیچارگی سے کہا وہ پچاس ہزار کہاں سے لائے گی۔ اس کی ماں نے بڑی بے شرمی سے میری طرف دیکھ کر کہا کہ وہ اپنے کروڑ پتی

داماد سے مانگ لے پچاس ہزار روپے اس کے لئے کیا بڑی بات ہیں۔ میں سمجھ گئی تھی کہ یہ ایک لالچی عورت ہے جو ہماری مجبوری کا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اس ساری گفتگو میں اس کا بیٹا سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ میری ماں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ میں نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ اس شادی کے لئے میں نے اپنی زندگی لکھ دی تھی۔ مجھے اپنی بہن کی محبت کو اپنے انجام تک پہنچانا تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے پیسوں کا انتظام ہو جائے گا وہ تاریخ طے کریں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ان سے گڑگڑا کر بھیک مانگ لوں گی' مجھے یقین تھا وہ انکار نہیں کریں گے۔ وہ عورت میری بلائیں لینے لگی۔ لیکن اسی وقت روشن نے منگنی کی انگوٹھی اور وہ ساڑھی جو منگنی پر انہوں نے چڑھائی تھی ان کے منہ پر دے ماری اور ان سے کہا کہ وہ گھر سے نکل جائیں۔ انہیں ایسا لگا جیسے پچاس ہزار ان کے ہاتھ سے نکل گئے ہوں۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن روشن نے ہاتھ میں جوتا اٹھا لیا۔ میری ماں نے اگر اسے پکڑ نہ لیا ہوتا تو وہ سچ مچ جوتے مارتی۔ ہم نے روشن کو اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سر سے محبت کا جنون اتر گیا تھا۔ اس نے ان کا اصلی چہرہ دیکھ لیا تھا۔ انہیں ذلیل کر کے نکالنے کے بعد اس نے ماں کو بتا دیا تھا کہ اس شادی کے لئے وہ ایک بیٹی بیچ چکی ہے اب کچھ اور نہ بیچے۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اب شادی نہیں کرے گی۔ اسے شادی کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اسے میری اس شادی کا بہت ملال تھا وہ خود کو اس کا ذمہ دار سمجھتی تھی۔

"تو کیا واقعی اب وہ کبھی شادی نہیں کرے گی۔" حنا نے سائرہ کو خاموش ہوتا دیکھ کر پوچھا۔

"کہتی تو وہ یہی تھی۔" سائرہ نے روشن کا سراپا اپنے خیالوں میں سجاتے ہوئے کہا۔ "کہتی تھی جب تک عذرا ڈاکٹر نہ بن جائے وہ شادی کا سوچے گی بھی نہیں۔ لیکن اسی زمانے میں اس کا ایک بہت اچھا رشتہ آ گیا۔ روشن کے اسکول کی کوئی ٹیچر یہ رشتہ لے کر آئی تھی۔ وہ بہت اچھے خاندان کے اور بہت امیر لوگ تھے۔ رشتہ لے کر ماں سے ملنے آئے تو ماں کبھی اپنے گھر کو اور کبھی انہیں دیکھتی تھی۔

انہوں نے رشتے کے ساتھ جب اپنی شرط بیان کی تو ماں بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ وہ کہتے تھے کہ جہیز نہیں لیں گے۔ گھر کے کپڑوں میں بیاہ کر لے جائیں گے۔ میری ماں ڈر گئی۔ وہ سمجھی تھی شاید لڑکے میں کوئی عیب ہو گا یا شاید دوسری شادی کر رہا ہو۔ ماں نے جس طرح بھی ہو سکتا تھا چھان بین کرائی۔ اس کا ہر خوف غلط تھا۔ زبیر بہت اچھے تھے۔ بہت پڑھے لکھے اور وجیہہ۔ ان کے خاندان والے ایک بڑی فیکٹری کے مالک تھے۔ زبیر اسے چلانے میں اپنے بھائیوں کی مدد کرتے تھے۔ ماں سمجھ گئی تھی کہ ان کی غربت پر ترس کھا کر وہ جہیز کے لئے منع کر رہے تھے۔ لیکن اسکول کی جس ٹیچر کے ذریعے رشتہ آیا تھا اس نے میری ماں کو وجہ بتائی۔ زبیر کالج میں تھے جب ان کی ایک ساتھی لڑکی نے زہر کھا کر جان دے دی تھی۔ وہ لڑکی جس سے محبت کرتی تھی اس کی شادی جہیز کے لالچ میں کہیں اور کر دی گئی تھی۔ اس واقعہ کا پورے کالج پر اثر ہوا تھا۔ زبیر اور ان کے ساتھی لڑکے لڑکیوں نے جہیز کی لعنت کے خلاف مہم چلائی تھی۔ خود بھی جہیز نہ لینے کا عہد کیا تھا۔ زبیر کی ماں بہت اچھی تھیں۔ اپنے بیٹے کے فیصلے میں وہ بھی پوری طرح شامل تھیں۔ روشن وہ سرخ بنارسی ساڑھی پہن کر رخصت ہو گئی جو ماں نے روشن کے جہیز کے لئے بڑی آرزوؤں سے خریدی تھی۔ اس ایک ساڑھی کے لئے بھی وہ لوگ میری ماں کی ضد کی وجہ سے مجبور ہوئے تھے۔ ورنہ شادی کا ایک ایک جوڑا' ایک ایک چیز وہ خود لے کر آئے تھے۔ روشن اب بہت خوش ہے۔ ساس اسے سینے سے لگا کر رکھتی ہے۔ کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیتی کہ وہ ایک غریب گھر سے آئی تھی۔ زبیر' روشن اور عذرا میری ماں کو لے کر مجھے چھوڑنے مدراس آئے تھے۔ رخصت کرتے ہوئے روشن نے مجھے اس ساڑھی میں لپیٹ دیا تھا جو رخصتی کے وقت ماں نے اسے پہنائی تھی۔ انہیں کا جاننے والا کوئی خاندان آسٹریلیا آ رہا تھا جس کے ساتھ میں آئی ہوں۔" سائرہ کی کہانی کا ایک باب ختم ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا آج سے ایک نیا باب شروع ہو گا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس باب میں اس کے لئے کیا لکھا ہوا ہے۔

"تم نے اپنی بہن کا جہیز بنانے کے لئے شادی کی تھی۔ وہ جہیز بیکار ہو گیا تھا۔ اسے واپس کر دیتیں۔ شادی ختم کر دیتیں۔" جولی نے اسے سوچوں سے چونکا دیا۔ وہ نظریں اٹھا کر حیرت سے دیکھنے لگی۔

"ہمارے یہاں شادی زندگی بھر کا سودا ہوتی ہے۔ میری ماں کہتی ہے جوڑے آسمان سے بن کر اترتے ہیں۔ ایک بار جس سے شادی ہو گئی۔ جس کے ساتھ تقدیر لکھ گئی، لکھ گئی۔ اسے نباہنا ہمارا مقدر ہے۔" جولی جواب میں کوئی تلخ بات کہنا چاہتی تھی لیکن حنا نے بات اچک لی۔

"روشن کے جہیز کا کیا ہوا؟"

"اسے ماں نے عذرا کے لئے رکھ لیا ہے۔" سائرہ نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن عذرا کو تو ڈاکٹر بننا ہے۔" حنا نے پھر پوچھا۔

"ماں نے اب خواب دیکھنے چھوڑ دیئے ہیں۔ وہ کہتی ہے ڈاکٹری پڑھ کے بھی کسی کے گھر کا چولہا جلائے گی۔ اسے اپنی زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ مرنے سے پہلے عذرا کو بیاہ دینا چاہتی ہے۔ آج کل اس کے لئے رشتہ تلاش کر رہی ہے۔" جولی غیر یقینی انداز میں اپنا سر ہلانے لگی۔ لیکن حنا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو کھانا لگانے میں اماں کی مدد کرتے ہیں۔" حنا نے کہا لیکن اسے ایک بات اور یاد آ گئی۔ "اس لڑکے کا کیا ہوا جس سے تمہاری بہن کی منگنی ہوئی تھی۔" حنا نے پوچھا تو پہلی بار سائرہ بہت کھل کر مسکرائی۔

"روشن نے ماں بیٹے کو جس طرح جوتے کی نوک پر نکالا تھا وہ پورے محلے نے دیکھا تھا ان کی لالچ کے قصے دور تک پھیل گئے تھے۔ انہیں کسی نے رشتہ نہیں دیا۔ جو جہیز دے سکتے تھے وہ بھی ڈرتے تھے کہ لالچی خاندان ہے شادی کے بعد بھی لڑکی کو سکھ نہیں دے سکے گا۔ شادی کے انتظار میں وقت پر سعودی عرب واپس نہیں گیا تو نوکری بھی چلی گئی۔ آج کل پھر نوکری کے لئے جوتے توڑ رہا ہے۔ لیکن اس کی ماں بہت ڈھیٹ عورت ہے اس کی ہمت کہ وہ عذرا کا رشتہ لے کر آئی تھی، کہتی تھی پچاس ہزار نہیں چاہئیں صرف جہیز کافی ہے۔ اس دفعہ میری ماں نے جوتا اٹھا لیا تھا۔"

تینوں ہنستی ہوئی نیچے اتر آئیں جہاں اکرم بٹ تشویش بھری آنکھوں سے بار بار اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تینوں ہنستی ہوئی نظر آئیں تو اس کے چہرے پر اطمینان لوٹ آیا۔

"دعوت سے واپس گھر آتے ہوئے اکرم بٹ سے برداشت نہیں ہوا۔

"رحیم پاشا کی بہوؤں کے ساتھ اتنی دیر کیا باتیں ہوتی رہیں۔" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ وہ ہندوستان کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔" سائرہ نے اسی طرح سامنے سڑک پر گھورتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"تم یہاں اپنے حالات کا چرچا مت کرنا۔" اکرم بٹ نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "تم اب بیگم بٹ ہو اور یہی حقیقت ہے' اسی کو یاد رکھنا۔ ماضی کو ایک برے خواب کی طرح بھول جانا۔" اکرم بٹ نے اسے بہت صاف اور دو ٹوک لہجے میں بتا دیا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ اس نے تو پہلے ہی شیشے پر نیا نام لکھ کر اپنے چہرے پر چپکا لیا تھا۔ اس وقت تو وہ کچھ اور سوچ کر اندر ہی اندر شرما رہی تھی۔ آج ان کی سہاگ رات تھی۔ حیدر آباد میں نکاح ہوا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ دہلی میں بھی ہوٹل کے الگ الگ کمروں میں رہے تھے۔ اب رخصتی مکمل ہو گئی تھی۔ وہ ان کے ساتھ اپنے گھر میں تھی۔ دونوں کو ایک کمرے اور ایک بستر میں ساتھ سونا تھا۔ ایک دوسرے سے لپٹ کر۔ اس نے شرماتے ہوئے سوچا۔ وہ اپنا پیار لٹا کر آج کی رات کو امر بنا دے گی۔ اس کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ سج گئی۔ اس نے کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ کیا وہ بھی آج کی رات کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔ لیکن اکرم بٹ کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا اور سوچ میں ڈوبی آنکھیں اگلی گاڑی کی سرخ عقبی بتیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

سائرہ کی زندگی میں وہ سہاگ رات کبھی نہیں آئی جس کے اس نے خواب دیکھے تھے۔ ان خوابوں میں اکرم بٹ کسی فلم کے نوجوان ہیرو کی طرح طوفانوں میں

گھری ہوئی سائرہ کو اپنے کشادہ سینے میں چھپا کر اس پناہ گاہ میں لے آتا جہاں زندگی محبت اور آرام کا نام تھی۔ پہلے ان خوابوں میں سوئمنگ پول، موتیا اور چنبیلی کے پھولوں سے بھر جاتا۔ وہ اور اکرم بٹ مخالف سمتوں سے ان پھولوں پر تیرتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف بڑھتے۔ لیکن اب یہ سفر نہ ختم ہونے والا فاصلہ بن گیا تھا۔ دونوں تیرتے ہوئے دوسرے کناروں تک پہنچ جاتے۔ سائرہ واپس پلٹتی اور یہ سفر دوبارہ شروع ہو جاتا۔ چند دنوں بعد سائرہ نے خواب دیکھنے ہی چھوڑ دیئے۔ مسہری پر آکر لیٹتی تو نرم اور آرام دہ بستر کانٹوں کی طرح چبھتا جسم پر پڑا ہوا گرم لحاف برفانی تودے کی طرح سرد اور ٹھنڈا لگتا۔ سو جاتی تو خواب بھی کسی تاریک سرنگ میں گم ہو جاتے۔

رحیم پاشا کے گھر کی دعوت سے سہاگ رات کے خواب دیکھتے ہوئے جب واپس آئی تو اکرم بٹ کپڑے بدل کر پڑھنے کے چھوٹے کمرے میں چلا گیا۔ سائرہ بھی اپنے کپڑے بدل کر آئینے کے سامنے کھڑی بالوں کو کھول کر دیر تک ان پر برش پھیرتی اور خود کو دیکھ دیکھ کر شرماتی رہی۔ پھر بستر میں لحاف کے نیچے سکڑ کر ان کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ پھر بھی نہیں آئے تو دبے قدموں چھوٹے کمرے میں گئی۔ جھانک کر دیکھا تو اکرم بٹ قرآن شریف کی تلاوت کر رہا تھا۔ وہ بہت شرمندہ ہو کر دوبارہ بستر میں لیٹ گئی۔ اسے اپنے گناہگار ہونے کا احساس ہوا۔ وہ کسی ان دیکھی لذت کے خیالوں میں گم تھی جبکہ وہ عبادت کر رہے تھے۔ گناہگار ہونے کا احساس ختم ہوا تو نیند نے آ دبوچا۔ رات میں کسی وقت آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا وہ دوسری طرف کروٹ کیے ہوئے سو رہے تھے۔ سائرہ کو خود پر سخت غصہ آیا۔ وہ کیوں سو گئی تھی۔ وہ آئے ہوں گے تو اسے سوتا دیکھ کر خود بھی سو گئے ہوں گے۔ خیر۔ کل وہ کسی بھی طرح جاگتی رہے گی۔ تلاوت کر کے جب وہ بستر پر آئیں گے تو اسے جاگتا ہوا اور تیار پائیں گے۔ سوچتے سوچتے وہ پھر سو گئی۔

صبح وہ جلدی اٹھی لیکن اکرم بٹ اس سے بھی پہلے اٹھ گیا تھا۔ وہ بستر پر نہیں تھا۔ سائرہ اٹھ کر اسے دیکھنے چھوٹے کمرے میں گئی تو وہ فجر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ سائرہ

اس کی عبادت گزاری سے سخت متاثر ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا اسے بھی نماز شروع کر دینی چاہیے۔ خدا بھی راضی ہو گا اور وہ بھی۔ وضو کر کے آئی تو وہ چھوٹے کمرے میں کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے مصلے پر کھڑی ہو کر نماز پڑھنے لگی۔ اکرم بٹ سائرہ کو نماز پڑھتا دیکھ کر واقعی خوش ہوا۔ نماز سے فارغ ہوئی تو اکرم بٹ اسے لے کر نیچے کچن میں آ گیا۔ الیکٹرک کیٹل میں چائے کا پانی رکھ کر وہ سائرہ کو کچن میں گیس کے چولہے اور بجلی کے سامان کو استعمال کرنے کا طریقہ سمجھاتا رہا۔ سائرہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتی رہی کہ زندگی اتنی آسان بھی ہو سکتی ہے۔

"آج کا ناشتہ میں بناؤں گا۔ کل سے یہ سلطنت تمہاری ہے۔" اکرم بٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سائرہ بھی مسکرانے لگی۔ سائرہ نے سوچ لیا تھا کل کیا وہ اپنی ریاست آج سے ہی سنبھال لے گی۔ اتنی آسانیاں ہوں تو وہ ہر روز پوری برات کا کھانا پکا سکتی تھی۔

ریفریجریٹر گوشت اور سبزیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ کھانا پکانے میں لگ گئی۔ آٹا گوندھ کر رکھ لیا تھا کہ وہ آئیں گے تو تازہ تازہ روٹیاں ڈال کر دے گی۔ کھانا تیار ہو گیا تو نہا کر کپڑے بدلے اور باغ میں چڑیوں کو چہچہاتے دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔ پھولوں کو توڑ کر لڑیوں میں پرویا اور پھر اپنے بالوں میں سجا کر سوئمنگ پول کے پاس پڑی ہوئی مسند پر لیٹی رہی۔ گاڑی رکنے کی آواز آئی تو دوڑی ہوئی باہر آئی اور دروازے میں خوش آمدید کا اشتہار بن کر کھڑی ہو گئی۔ گھر میں تازہ کھانے کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور جب توے سے تازہ تازہ اتری ہوئی روٹی کھانے کو ملی تو اکرم بٹ کا شادی پر کیا ہوا سارا خرچ وصول ہو گیا۔ برسوں سے لبنانی روٹی کھاتے کھاتے وہ تازہ روٹی کی خوشبو اور مزا بھول گیا تھا۔ اکرم بٹ کو خوش دیکھ کر سائرہ کو لگا امتحان کا نتیجہ نکل آیا ہے اور وہ سب سے زیادہ نمبر لے کر اول آئی ہے۔

"تم نہیں کھاؤ گی۔" اکرم بٹ نے آخری نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

"آپ کھا لیں تو میں بھی اپنا کھانا پروس لوں گی۔" سائرہ نے خالی پلیٹیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بہت کھا لیا میں تھوڑی دیر سوؤں گا۔ تم بھی کھانا کھا کر آ کر آرام کر لو۔ شام کو کہیں باہر چلیں گے۔" سائرہ کو اوپر آ کر ساتھ سونے کی دعوت ملی تو وہ شرما گئی۔ جلدی جلدی کھانا کھا کر اور برتن سمیٹ کر وہ کمرے میں آئی تو اکرم بٹ کے خراٹے گونج رہے تھے۔ بہت آہستگی سے وہ بھی بستر میں گھس گئی اور دیر تک آنکھیں کھولے پڑی رہی۔

"اکرم بٹ نے شام میں اسے گاڑی میں بٹھا کر شہر کی سیر کرائی۔ گھر آتے آتے رات ہو گئی تھی۔ اکرم بٹ کو پھر توے سے اتری ہوئی تازہ روٹیاں کھانے کو ملی تھیں۔ کھانا کھا کر دونوں ٹی وی دیکھتے رہے لیکن جیسے ہی ٹی وی پر کوئی فلم شروع ہوئی اکرم بٹ نے ٹی وی بند کر دیا۔

"کل میں تمہارے لئے دکان سے پاکستانی ڈراموں کے کیسٹ لیتا آؤں گا۔ ٹی وی پر چلنے والی فلمیں تمہیں پسند نہیں آئیں گی۔ اخلاق خراب کرنے والی ننگی فلمیں مجھے بھی پسند نہیں ہیں۔ اسی لئے میں رات کو ٹی وی بند رکھتا ہوں۔" اکرم بٹ نے فیصلہ سنا دیا۔ ٹی وی بند ہوا تو وہ اوپر آ گئے۔ اکرم بٹ حسب معمول عبادت کرنے چھوٹے کمرے میں چلا گیا اور سائرہ بیڈ روم میں آ کر شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بالوں کے بل نکالنے لگی۔ خود کو دیکھتے دیکھتے تھک گئی تو بستر میں آ کر لیٹ گئی۔ آج اس نے طے کیا تھا کہ ان کے آنے تک سوئے گی نہیں۔ خود کو زور زور سے نوچ کر نیند بھگاتی رہی۔ رات کو کسی وقت اکرم بٹ سونے آیا تو سائرہ جاگ رہی تھی لیکن وہ خاموشی سے دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ سائرہ کو خیال ہوا شاید وہ اسے سوتا ہوا سمجھ رہے ہیں۔

"آپ آ گئے۔" اس نے اکرم بٹ کی طرف کروٹ لے کر ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔ تم بھی سو جاؤ۔" اکرم بٹ نے اس کا ہاتھ بہت آہستہ سے اپنے بازو پر سے ہٹا دیا۔ سائرہ ڈر کر ایک دم سیدھی ہو گئی۔ وہ چت پڑی کمرے کی تاریکی میں نظر نہ آنے والی چھت کو گھورتی ہوئی دیر

تک اپنی آنکھیں ٹپ ٹپ کرتی رہی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اکرم بٹ کا سرد لہجہ اس کے جسم میں ٹھنڈی لہر بن کر دوڑ رہا تھا۔ "سو جاؤ۔" کی آواز نیند کو اور دور بھگا رہی تھی۔ انہیں اگر ہاتھ بھی لگانے سے گریز ہے تو انہوں نے شادی کیوں کی تھی۔ کیوں کی تھی، کیوں کی تھی۔ سوال کی باز گشت نے اسے ہپنا ٹائز کر کے سلا دیا۔ خواب میں وہ سانپوں کے پیچھے بھاگتی رہی۔ وہ خود کو ڈسوانا چاہتی تھی لیکن کسی سانپ نے پھن اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ وہ اسے دیکھ کر اپنے بلوں میں گھس جاتے۔ ان کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ پتھریلی چٹانوں میں پہنچ گئی۔ وہاں نہ سانپ تھے نہ ان کے بل وہ اکیلی کھڑی ہانپ رہی تھی کہ چٹانیں پیاسا ریگستان بن گئیں۔ پانی کی تلاش میں وہ دیر تک سرابوں کے پیچھے دوڑتی رہی۔ پیاس سے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے۔ زبان باہر نکل آئی تھی۔ ایک بار ایسی بھاگی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اندھیرے کمرے میں تھوڑی دیر سمجھ نہیں آیا وہ کہاں ہے۔ اس کا تخت اتنا آرام دہ تو نہیں تھا۔ سوتے میں عذرا کی ٹانگیں اس کے پیٹ میں گھس جایا کرتی تھیں۔ لیکن اس وقت تو پیٹ خالی تھا۔ کوئی وجود پاس نہیں تھا۔ آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں اور کانوں سے اکرم بٹ کے مانوس خراٹوں کی آواز ٹکرائی تو وہ اپنے حال میں لوٹ آئی۔ اسے نرم بستر کے مقابلے میں اپنا وہ تخت اچھا لگنے لگا جس پر نیند کے ساتھ خواب بھی اچھے آتے تھے۔ سخت پیاس لگ رہی تھی۔ وہ بہت آہستگی سے بستر سے اتر کر نیچے کچن میں آ گئی اور پانی پی کر شیشے کے دروازے سے باہر کا منظر دیکھنے لگی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ نہ ایسی تاریکی تھی کہ کچھ نظر نہ آئے نہ ایسا اجالا کہ منظر نگاہوں میں چبھنے لگیں۔ روشنی اندھیرے کو گلے لگائے آہستہ آہستہ اس میں ضم ہو رہی تھی۔ اندھیروں کے اجالے بننے کا عمل دیکھنا ایسا لگتا ہے جیسے نابینا سے تاریکی کے پرت ایک ایک کر کے اتر رہے ہوں۔ صبح کی سفیدی واضح ہوئی تو سائرہ کو گزری ہوئی رات یاد آ گئی۔ وہی سوال پھر گونج اٹھا۔ انہوں نے شادی کیوں کی تھی۔ کیوں کی تھی؟

اکرم بٹ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے کیوں شادی کی ہے۔ اس نے شادی

سے ایک تیر سے بہت سے شکار کئے تھے۔ شادی نے اس کی کئی ضرورتوں کو پورا کیا تھا۔ لیکن ضرورتوں کی اس فہرست میں اس جذبے کی تسکین شامل نہیں تھی جس کے بغیر سہاگ رات اپنے انجام کو نہیں پہنچتی یا بیویاں سہاگن اور عورتیں مائیں نہیں بنتیں۔ اسی آسیب سے فرار حاصل کرنے کے لئے بہت برس پہلے اپنا بسا بسایا گھر اور بنا بنایا کاروبار چھوڑ کر وہ آسٹریلیا آ گیا تھا۔ وہ اچھا زمانہ تھا۔ اکرم بٹ کو تجربہ تھا اور اس کی کاروباری سمجھ بہت اچھی تھی۔ وہ پیسہ کمانا ہی نہیں اسے دانت سے پکڑ کر رکھنا بھی جانتا تھا۔ چند برسوں میں ایک چھوٹی سی دکان سے شروع ہونے والی ایشیا مارکیٹ ایک بڑا اسٹور بن گئی۔ کاروبار پھیلا تو اسے گھر بڑا کرنے کی فکر ہوئی۔ اس نے اپنی کنجوسی کی ساری کسر مکان کی تعمیر پر پوری کر دی تھی۔ ایک ایک اینٹ کو بڑی احتیاط سے چنوایا تھا۔ مکان کو سجانے میں بھی پیسوں کی کوئی کمی نہیں کی۔ رحیم پاشا ایک دفعہ گھر آیا تو اس نے اکیلا پن دور کرنے کے لئے شادی کرنے کی تجویز دی۔ اکرم بٹ نے اس وقت تو تجویز مذاق میں اڑا دی لیکن کچھ ہی عرصے میں وہ سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

اکرم بٹ کے لئے اکیلا پن کوئی جذباتی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے پاس اکیلا رہنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ ہفتے میں سات دن کام کرتا تھا۔ اسٹور کی چابیاں صرف اس کے پاس تھیں۔ صبح ہی صبح جا کر خود اسٹور کھولتا اور رات کو خود بند کرتا تھا۔ اتوار کو اسٹور جلدی بند کرتا تو حساب کتاب کے لئے فائلیں اور کاغذات ساتھ لے کر آتا۔ رات کو سونے سے پہلے جو چند گھنٹے ملتے تھے ان میں نماز پڑھتا' تلاوت کرتا یا اس وقت تک کوئی نہ کوئی دینی کتاب پڑھتا رہتا جب تک نیند نہیں آتی۔ مذہب میں ڈوب کر خالی پن کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ لیکن تنہائی مہنگی ثابت ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی تکلیف دہ بھی۔ بہت بڑا مکان تو بنا لیا تھا لیکن اس کی دیکھ بھال اور صفائی آسان کام نہیں تھا۔

اس کی اسٹڈی میں ایک کھڑکی باغ کی طرف کھلتی تھی۔ وہ اکثر کھڑکی سے باغ کو دیکھ کر ان ہواؤں کو کوستا جو ہری ہری گھاس پر سوکھے پتوں کی کیچڑ بکھیر دیتیں۔

سوئمنگ پول میں تیرتا ہوا کچرا اسے اتنا بیزار کرتا کہ وہ کھڑکی کے پردے کھینچ کر پیٹھ موڑ لیتا۔ لیکن ان سب سے زیادہ تکلیف اس وقت ہوتی جب روزانہ صفائی کے لئے آنے والی ست عورت ہر ہفتے اس سے دو ڈالر لے جاتی۔ کپڑے دھونے' سوئمنگ پول صاف کرنے' باغ کی دیکھ بھال کرنے' گھاس کاٹنے اور باغ کا کچرا پھینکنے والے بھی ہر ہفتے اس سے مٹھی بھر ڈالر لے جاتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح دکان کے کاؤنٹر پر کام کرنے والی لڑکی اپنے کام کے آٹھ گھنٹوں میں سے چار گھنٹے رسالوں کی تصویریں دیکھنے یا گاہکوں سے گپیں لڑانے میں صرف کرتی اور ہر ہفتے کئی سو ڈالر وصول کر کے اکرم بٹ کو سخت اذیت سے دو چار کر کے چلی جاتی۔ اکرم بٹ کو لگتا کہ ہوائیں سوکھے پتوں کے ساتھ اس کی بہت حلال کی کمائی کے ڈالر بھی اڑائے لے جا رہی ہیں۔

ایک بڑی تکلیف کھانے کی تھی۔ باہر کا کھانا کھانے میں یہ وہم کہ ان میں کسی نہ کسی شکل میں سور موجود ہے۔ جن ہوٹلوں پر حلال کی تختی لگی ہوتی وہاں خطرہ کہ کھانا پکانے میں سور کی چربی نہ استعمال ہوتی ہو۔ رحیم پاشا نے کہا تھا کہ تلی ہوئی مچھلی کھا لیا کرے لیکن اکرم بٹ کے لئے اس توے کی مچھلی بھی حرام تھی جس پر سور تلے جاتے ہوں۔ اسٹور سے تھک کر واپس آنے کے بعد کھانا پکانے کا طویل عمل شروع کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ صرف چاول ابالتا' دال پکاتا اور شکر کرتا۔ رحیم پاشا مذاق کرتا کہ دال چاول کھا کھا کر ہندو ہو جائے گا۔ دوپہر کو دکان پر ہی ڈبل روٹی میں مکھن لگا کر یا چیز رکھ کے کھاتا۔ رحیم پاشا اس پر بھی مذاق اڑاتا کہ ڈبل روٹی میں بھی سور کی چربی لگی ہو گی تو ہنس کر کہتا۔ "یہاں کی تو ہوا میں بھی سور کی بو شامل ہے' کہو تو سانس لینا بھی چھوڑ دوں۔"

شادی تمام مسائل کا بہت آسان حل تھا۔ بہت سوچ و بچار کے بعد اس نے رحیم پاشا سے اس موضوع پر سنجیدگی سے گفتگو کی لیکن کہا تھا کہ وہ پاکستان یا انڈیا جا کر شادی کرے گا۔ رحیم پاشا نے حیدر آباد میں اپنے جاننے والوں کو فون کر دیئے اور خط دے دیئے تھے۔

اکرم بٹ کو اپنے گھر کے لئے ایک ایسی مالکہ چاہئے تھی جو خادمہ بھی بن سکے۔ سائرہ پڑھی لکھی تھی اس لئے مالکن کے کردار میں ڈھل سکتی تھی۔ غریب اور مجبور خاندان کی تھی اس لئے عمر بھر احسان کے بوجھ تلے دب کر رہتی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جس ماحول اور تہذیب سے آئی ہے اس کی پاسداری کرے گی اور اپنی خواہشوں کی زبان کو دراز نہیں کرے گی۔

سائرہ اکرم بٹ کی تمام توقعات پر پوری اتری تھی۔ اپنے اس کردار پر وہ پوری طرح مطمئن تھی۔ یہ کوئی نیا نہیں ایک روایتی کردار تھا۔ یہ شادی اس کی مجبوری کا نتیجہ نہ ہوتی تب بھی بیوی کی حیثیت میں یہی کردار اس کا نصیب ہوتا۔ اسے تو بس یہ احساس توانائی دینے کے لئے کافی تھا کہ وہ گھر کی مالکہ ہے۔ یہ احساس اس کی خدمت کے جذبے کو اور بڑھا دیتا۔ مہینے بھر میں اس نے گھر کے سارے کاموں کو سنبھال لیا تھا۔ صفائی کرنے والی کی چھٹی تو پہلے ہی ہفتے میں ہو گئی تھی' مہینے بھر بعد ایک ایک کر کے دھوبی' مالی اور سوئمنگ پول صاف کرنے والے بھی فارغ ہو گئے۔ سب کام سائرہ کے معمول کا حصہ بن گئے تھے اور وہ اس پر خوش بھی بہت تھی۔ وہ گھر کی مالکہ تھی۔ اپنے گھر کے کام بھی خود اسی کو کرنے تھے۔

اکرم بٹ کی یہ توقع بھی غلط نہیں تھی کہ سائرہ کی خواہشوں کی زبان منہ میں رہے گی باہر نہیں نکلے گی۔ خواہشیں زور مارتیں لیکن اس نے انہیں دبا کر رکھنا سیکھ لیا تھا۔ صرف ایک دفعہ زبان کھولی تھی۔

"آپ مجھے چھونے سے گھبراتے کیوں ہیں۔" سائرہ نے بہت ہمت کر کے کہا تھا۔ اس رات آنکھوں سے نیند بالکل غائب تھی اور اکرم بٹ نے بھی بستر پر لیٹتے ہی خراٹے لینے شروع نہیں کئے تھے۔

"اس لئے کہ ڈرتا ہوں۔ تم اتنی نازک ہو کہیں میرے ہاتھ لگانے سے ٹوٹ نہ جاؤ۔" اکرم بٹ کھوکھلے انداز میں ہنسا لیکن پھر سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "ابھی جلدی کیا ہے یہ سب کچھ کرنے کے لئے بہت وقت پڑا ہے۔ ابھی اپنی آزادی کے مزے لو اور زندگی کا لطف اٹھاؤ۔" اس کے ساتھ ہی اکرم بٹ نے پیٹھ موڑ کر آنکھیں بند کر

لیں۔ سائرہ نے بڑی محبت سے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے بہت نرمی سے اس کا ہاتھ واپس کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے خراٹے گونجنے لگے۔ سائرہ کو کبھی کبھی اس کے خراٹے مصنوعی لگتے۔ ایسا لگتا جیسے وہ سائرہ کو الگ رکھنے کے لئے درمیان میں خراٹوں کی دیوار کھڑی کر لیتا ہے۔

کبھی کبھی سائرہ کو اتنا بڑا سا گھر بہت تنگ لگنے لگتا۔ اسے حیدر آباد میں اپنے کمرے کے چھوٹے سے گھر کی کشادگی یاد آ جاتی۔ وہاں غربت تھی لیکن خوف نہیں تھے۔ یہاں تو ہر قدم پر کوئی نہ کوئی ڈر دامن کھینچنے لگتا۔ باہر آتے ہوئے ڈر لگتا کہیں اندر آتے ہوئے کوئی دروازہ کھلا نہ رہ جائے۔ نہاتے ہوئے خوف آتا کہیں گرم پانی کی بھاپ غسل خانے میں کائی نہ جما دے۔ کھانے پکاتے ہوئے ڈرتی رہتی کہیں کوئی آگ کسی دیگچی کو نہ جلا دے کہ اس کی کالک نہ چھٹ سکے۔ چھوٹے چھوٹے یہ خوف بھی تھے کہ کسی قمیض پر کوئی دھبہ یا بستر پر کوئی شکن نہ رہ جائے کوئی غیر ضروری بتی کھلی نہ رہ جائے۔ اکرم بٹ کے اسٹور مین ویڈیو فلمیں بھی کرائے پر ملتی تھیں۔ سائرہ کے لئے وہ پاکستانی ڈرامے لے کر آتا تھا۔ اکرم بٹ کو بھارتی فلمیں بھی پسند نہیں تھیں۔ کہتا تھا ان میں عریانی اور مار پیٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سائرہ فلمیں اور ٹی وی پر آنے والے انگریزی پروگرام دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اکرم بٹ کو پسند نہیں تھا اس کے لئے بھی منع تھا۔ بارش اور زیادہ سردی نہیں ہوتی تو رات کو کھانے کے بعد اکرم بٹ سائرہ کو لے کر گھر کے باغیچے میں ٹہلا کرتا۔ لیکن اس طرح جیسے دونوں نے خاموشی کا روزہ رکھا ہو۔ اپنی اپنی کبھی نہ ملنے والی پٹڑیوں پر ایک سیدھ میں چلتے رہتے۔ چہل قدمی تھکا دیتی تو اکرم بٹ نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے اسٹڈی روم میں چلا جاتا اور سائرہ کچن کے ساتھ کے لاؤنج میں اکرم بٹ کا لایا ہوا پاکستانی ڈرامہ دیکھنے لگتی اور کبھی کبھی سوچتی یہ ڈرامے دیکھ کر وہ جلد ہی فلسفیانہ انداز میں چبا چبا کر باتیں کرنے لگے گی۔ بور ہوتی تو اوپر اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ جاتی اور نیند بلانے کی کوشش کرنے لگتی۔ اس نے اب اکرم بٹ کے خراٹوں کا انتظار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

تین مہینے گزر گئے۔ زندگی ایک معمول سے بندھ گئی تھی۔ فرار کا کوئی لمحہ صرف اس وقت آتا جب گھر سے ماں' روشن یا عذرا کا خط آتا۔ بار بار پڑھتی اور پھر خود بھی کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتی۔ دیر تک سوچتی کیا لکھے لیکن جب شروع کرتی تو کئی کئی صفحے سیاہ کر دیتی۔ خط میں باغ کے پھول پتوں سے لے کر تالاب کے پانی تک کا تذکرہ ہوتا' صرف اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھتی۔ اپنے بارے میں لکھنے کے لئے کچھ تھا بھی نہیں۔ بعد میں تو وہ خط میں ان ڈراموں کی کہانیاں بھی لکھنے لگی تھی جو اس کی رات کی تنہائیوں کے ساتھی بن گئے تھے۔ اکیلے پن کی گھٹن اتنی چبھنے لگی تھی کہ جب اکرم بٹ نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ دکانداری کے کام میں اس کا ہاتھ بٹائے گی تو خوش ہو کر اس نے بہت زور زور سے سر ہلا دیا۔ وہ باہر کی دنیا اور اس کے لوگوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے خود سے باہر نکلنے کا موقع شاید کبھی نہ ملے۔ جولی اور حنا باہر لے جانے کے لئے فون کرتیں لیکن وہ ہمیشہ بہانہ بنا دیتی تھی۔ وہ اکرم بٹ کے مزاج کو سمجھنے لگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مجبوراً" اجازت دے بھی دیں دل سے کبھی پسند نہیں کریں گے۔ ان کی پسند کے خلاف کوئی کام کر کے وہ اپنی سیدھی سادھی زندگی میں پیچیدگی پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اسٹور میں نئی پیچیدگیاں اس کا استقبال کرنے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔

دکان میں سائرہ کا استقبال بڑی گرمجوشی سے ہوا۔ اسٹور میں پانچ لوگ کام کرتے تھے جو مختلف اوقات میں آتے جاتے تھے۔ کاؤنٹر پر کام کرنے کے لئے دو لڑکیاں تھیں۔ تین آدمی گودام سے لے کر شیلف تک کے مختلف کاموں کے لئے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ شاید سائرہ اسٹور میں کچھ مسکراہٹیں سجا کر ماحول کا تناؤ کم کر سکے گی۔ لیکن ان کی یہ غلط فہمی دور ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ سائرہ کو بھی جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اکرم بٹ کے لئے مسکرانا بہت ناخوشگوار عمل ہے۔ اکرم بٹ کے پاس کام کے دوران مسکرانے کی فضولیات کے لئے وقت تھا ہی نہیں۔ وہ خود بھی کام میں لگا رہتا اور سب کو کام میں مصروف دیکھنا چاہتا تھا۔ کام کے دوران ملازم ایک

دوسرے سے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اسٹور کے پیچھے کونے میں بنی ہوئی دو چھتی میں اکرم بٹ کا دفتر تھا۔ وہ زیادہ وقت اسٹور میں مختلف کام کرتے ہوئے گزارتا تھا لیکن جب دفتر میں بیٹھتا تو دوربین لگا کر پورے اسٹور کو خاص طور پر کاؤنٹر کو نظر میں رکھتا تھا۔ سائرہ جلد ہی کاؤنٹر اور کیش رجسٹر کا کام سیکھ گئی۔ اکرم بٹ پہلے کچھ دن سائرہ کو صبح اپنے ساتھ لے کر جاتا اور دوپہر کو گھر چھوڑ کر آتا تھا۔ جب وہ کام سیکھ گئی تو اس نے کاؤنٹر سے اس لڑکی کی چھٹی کر دی جو بہت عرصے سے اس کی نظر میں کھٹک رہی تھی اور سائرہ کے لئے ایک شفٹ کا تعین کر دیا۔ سائرہ اب صبح جلدی اٹھ کر کھانے پکانے کا کام کرتی' دوپہر کا کھانا کھاتی اور اکرم بٹ کے لئے کھانے کا توشہ لے کر بس اور ٹرین کے ذریعے اسٹور پہنچ جاتی۔ شام کو چھ بجے خود ہی واپس بھی چلی جاتی تھی۔ اکرم بٹ اسٹور بند کر کے گھر آتا تو تازہ روٹیوں کے لئے چولہے پر رکھا ہوا توا گرم ہوتا تھا۔ ہفتے اور اتوار کو اسٹور سے سائرہ کی چھٹی ہوتی تھی۔ یہ دونوں دن باغیچے' پول' گھر کی صفائی اور کپڑے دھونے کے لئے مقرر تھے۔ اتوار کو اگر دعوت ہوتی تو ہفتے کی رات کو بارہ ایک بجے تک بیٹھی دعوت کے کھانے تیار کرتی۔ اس کے پورے ہفتے کا ہر گھنٹہ اور گھنٹے کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام کے ساتھ بندھ گیا تھا۔ ماں بہنوں کو لکھے جانے والے خط مختصر سے مختصر ہو گئے تھے۔

کیش رجسٹر پر کام کرنے کے دوران پہلی بار اس نے آسٹریلوی سکوں اور نوٹوں کی جھلک دیکھی تھی اور اب تو اکرم بٹ نے اسے خرچ کے لئے ہر ہفتے پچاس ڈالر بھی دینے شروع کر دیئے تھے۔ پہلی بار پیسے دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہفتے کے آخر میں اسے ان پیسوں کے خرچ کا حساب بھی دینا پڑے گا۔ سائرہ نے پیسے واپس کر دیئے۔

"مجھے حساب کتاب نہیں آتا۔ مجھے پیسوں کی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے جو چاہئے آپ خرید دیتے ہیں وہی میرے لئے کافی ہے۔" اکرم بٹ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ حساب کتاب کا سن کر سائرہ ناراض ہو گئی ہے یا واقعی پیسوں سے بے نیاز ہے۔ اکرم بٹ کے لئے سائرہ کا موڈ پہچاننا بہت مشکل تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک ہی تاثر چھایا رہتا تھا۔

"نہیں نہیں رکھ لو۔ حساب کتاب کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ صرف اس لئے ہیں کہ کبھی کچھ خریدنے کو دل چاہے تو ہاتھ خالی نہ ہو۔" پچاس ڈالر کے لئے اکرم بٹ سائرہ کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ سائرہ سے زیادہ نفع بخش کاروبار اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ اکیلی اس کا تین چار ہزار ڈالر مہینے کا خرچ بچا رہی تھی۔ انکم ٹیکس کے ذریعے جو بچت ہوتی وہ الگ تھی۔ پھر توے سے اتری ہوئی تازہ روٹی، مزے مزے کے کھانے اور استری کی ہوئی بے داغ قمیض۔ اس منافع کا تو حساب ہی ممکن نہیں تھا۔ پچاس ڈالر ملنے لگے تو سائرہ اپنی دکان پر آتے ہوئے رستے کی دکانوں میں بھی جھانکنے لگی۔ اسے اپنے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو یہ دیکھتی کہ ماں، روشن اور عذرا کے لئے کیا خرید سکتی ہے۔ لیکن یہ سوچ کر کچھ نہیں خریدتی کہ یہ پیسے جمع کر کے وہ ہر مہینے حیدر آباد بھیجنے لگے تو اس کی ماں کو کتنی سہولت ہو جائے گی۔ اس خیال سے ہی اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ لیکن پیسے بھجوانے کے لئے کسی کی مدد کی ضرورت تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اکرم بٹ کو خبر ہو۔ وہ چوری نہیں کر رہی تھی۔ یہ اس کے اپنے پیسے تھے، لیکن شاید انہیں ماں کو پیسے بھجوانا پسند نہ آتا۔ شاید وہ پیسے دینا ہی بند کر دیتے۔ پیسے بھجوانے کے لئے جولی یا حنا کی مدد لے کر ان کی نظروں میں اپنی ماں کو گرانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کوئی اور ذریعہ تلاش کرنے لگی۔

سائرہ کاؤنٹر پر گاہکوں کا بہت مسکرا کر خیر مقدم کرتی تھی۔ اجنبی لوگوں کو دیکھ کر اپنی بیوی کا مسکرانا اکرم بٹ کو اچھا نہیں لگا۔ اسے سخت غصہ آتا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سائرہ سے کس طرح کہے کہ وہ مسکرانا بند کر دے۔ اسے لگتا جیسے سارے گاہک باہر کھڑے ہو کر سائرہ کے نکلنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ سائرہ جب کام ختم کر کے واپس گھر جاتی تو اکرم بٹ اسٹور کے دروازے پر کھڑے ہو کر اسٹیشن کی طرف جاتی ہوئی سائرہ کو دیکھتا رہتا اور اس کے آگے پیچھے چلنے والوں کے چہرے پہچاننے کی کوشش کرتا۔ سائرہ گھر کا دروازہ پوری طرح کھول بھی نہ پاتی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگتی۔ اکرم بٹ اس کے خیریت سے گھر پہنچنے کی خبر معلوم کرتا اور سائرہ سوچتی۔

"وہ کتنا خیال رکھتے ہیں۔"

اکرم بٹ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو سائرہ کو اپنی مسکراہٹیں قید کرنی پڑیں۔ ایک دن ہری آنکھوں اور چھوٹی سی داڑھی والا ایک خوش شکل نوجوان کچھ خریدنے آیا تھا۔ کاؤنٹر پر پیسے دیتے ہوئے سائرہ کو اس کے لہجے سے پہچان گیا۔ وہ خود بھی حیدر آباد کا تھا اور سائرہ کی طرح چند مہینے پہلے ہی آسٹریلیا آیا تھا۔ کوئی اور گاہک نہیں تھا اس لئے حیدر آباد کے گلی کوچوں کی باتیں کرتے ہوئے دونوں کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ دفتر میں بیٹھا ہوا اکرم بٹ دیر سے دوربین لگائے انہیں دیکھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ آخر اس سے برداشت نہیں ہوا تو اتر کر تیزی سے کاؤنٹر پر آیا۔ سائرہ اسے آتا دیکھ کر سہم گئی۔ لڑکا بھی ڈر گیا کہ اس کی وجہ سے اس کی ہم وطن کو اپنے مالک کے عتاب کا نشانہ بننا پڑے گا۔ وہ اپنے سامان کا تھیلا اٹھا کر جلدی سے دکان سے نکل گیا۔

"گاہکوں سے فضول باتیں مت کیا کرو۔ تمہاری مسکراہٹ سے انہیں خوامخواہ غلط فہمی ہوتی ہے۔" اکرم بٹ کے لہجے میں اس وقت وہ نرمی نہیں تھی جو وہ سائرہ سے بات کرتے ہوئے پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

"میں اس لئے مسکراتی ہوں کہ ہماری خوش اخلاقی سے متاثر ہو کر گاہک دوبارہ بھی ہمارے پاس آئیں گے۔" سائرہ نے بڑی معصومیت سے اکرم بٹ کو کاروبار کا گر سمجھانا چاہا۔

"میرے گاہک مسکراہٹ نہیں چاول خریدنے آتے ہیں۔ ایسی قیمت پر اتنے اچھے چاول انہیں کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتے۔ وہ کہیں بھی جائیں لوٹ کر میرے پاس ہی آئیں گے۔" اکرم بٹ یہ کہہ کر واپس اپنے دفتر میں جا کر کاغذ الٹ پلٹ کرتے ہوئے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے سوچا اسے وہ لڑکا دوبارہ سائرہ کے آس پاس نظر آیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دے گا۔ اسے تیس سال پہلے کا زمانہ یاد آیا جب اس کے ایک ہی گھونسے نے ایک انگریز کے تمام دانت توڑ دیئے تھے۔ اس نے سوچا کہ اس کی ہڈیوں میں آج بھی اتنا دم ہے کہ اپنی بیوی پر غلط نظر

ڈالنے والوں کی آنکھیں پھوڑ سکتا ہے۔ لیکن اس نے سوچا اسے سائرہ پر بھی کڑی نظر رکھنی پڑے گی۔ آج صرف مسکرا رہی ہے' قدم کل بہک بھی سکتے ہیں۔ سائرہ بھی سوچ رہی تھی اسے اپنی مسکراہٹ کے استعمال میں احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ گاہکوں کو دیکھ کر اسے مسکرانے کی جو عادت ہو گئی تھی وہ اس پر قابو پانے لگی۔ کبھی کبھی بے خیالی میں مسکراہٹ آ بھی جاتی تو پھیلے ہوئے ہونٹوں کو فوراً سکیڑ لیتی۔

دکان کے ملازموں میں اکرم بٹ کو کراچی کا ایک لڑکا سلطان سب سے زیادہ پسند تھا۔ اکرم بٹ نے کسی پر بھروسہ کرنا نہیں سیکھا تھا لیکن ضرورت پڑنے پر صرف سلطان پر اعتماد کرتا تھا۔ وہ تھا بھی بے حد محنتی اور ایماندار اور یہی اکرم بٹ کی پسند کا پیمانہ تھا۔ سائرہ کبھی کبھی سوچتی تھی کہ سلطان کھانا کب کھاتا ہو گا' سوتا کب ہو گا۔ وہ صبح پانچ بجے سے بارہ ایک بجے تک ٹیکسی چلاتا جس کے بعد اسٹور پر آ جاتا اور دکان بند ہونے تک کام کرتا۔ اکرم بٹ جب شادی کرنے ہندوستان گیا تھا تو سلطان کی ٹیکسی چھٹوا دی تھی اور اسٹور کی چابیاں دے کر دکان اس کے حوالے کر گیا تھا۔ رحیم پاشا کو ان سب پر نظر رکھنے کی ذمہ داری دی تھی' لیکن رحیم پاشا آتا اور اکاؤنٹس دیکھ کر چلا جاتا۔ دکان کا انتظام سلطان نے سنبھالا تھا۔ اکرم بٹ کی غیر موجودگی میں ماحول سے تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ سب کام کرتے ہوئے ہنسنے بولنے لگے تھے۔ گاہکوں سے برتاؤ بہتر ہوا تو دکان میں بکری بھی بڑھ گئی تھی۔ اکرم بٹ نے واپس آ کر حساب کتاب دیکھا تو سلطان پر اس کا اعتماد اور بڑھ گیا۔ اکرم بٹ کے آتے ہی وہ اپنی ٹیکسی کے معمول پر واپس چلا گیا تھا۔ اکرم بٹ نے بہت کہا تھا کہ وہ ٹیکسی چھوڑ دے اور مستقل اس کے ساتھ کام پر آ جائے۔ ایسا ہو جاتا تو اکرم بٹ کام کرنے والوں میں سے ایک کی کمی اور کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا سلطان اکیلا دو آدمیوں کا کام کر سکتا تھا۔ لیکن سلطان تیار نہیں ہوا۔ اسے معلوم تھا اکرم بٹ اسے اتنے پیسے نہیں دے سکے گا جتنے وہ آدھی شفٹ میں ٹیکسی چلا کر کما لیتا تھا۔ سلطان اکرم بٹ کے اسٹور میں اس لئے اٹکا ہوا تھا کہ وہ پورے بارہ گھنٹے ٹیکسی نہیں چلا سکتا تھا۔ اس کی کمر میں درد ہونے لگتا اور پھر اکرم بٹ امیگریشن لینے میں سلطان کی مدد کر رہا تھا۔ سلطان کو اکرم

بٹ کا دامن تھامے رہتا تھا۔

یہ جرات بھی صرف سلطان میں ہی تھی کہ وہ سائرہ سے ہنستا بولتا رہتا۔ کاؤنٹر کے پاس سے گزرتے ہوئے کوئی نہ کوئی جملہ کہہ کر اسے ہنسا جاتا۔ اکرم بٹ جب گودام میں بوریاں گنتے ہوئے اسٹاک کا آرڈر تیار کرتا یا مال خریدنے کے لئے آئے ہوئے چھوٹے دکانداروں سے سودے طے کر رہا ہوتا وہ سلطان اور سائرہ کے لئے گپیں لڑانے کا بہترین وقت ہوتا۔ سلطان باتیں کرنے کے ساتھ کام بھی کرتا رہتا۔ اسٹاک اٹھا کر کاؤنٹر کے پاس لے آتا اور زبان کے ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے اس کے ہاتھ پرائس مشین سے کھٹ کھٹ کرتے قیمتوں کے لیبل چپکاتے رہتے۔

سلطان کے لئے کام کی چکی میں پستے رہنا اس کی مجبوری تھی۔ وہ اپنے خاندان کا اکیلا پالنے والا تھا۔ اس کی بڑی بہن جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ لیکن مرنے سے پہلے اس کا شوہر اسے چار بچوں کا تحفہ دے گیا تھا۔ یہ خاندان سلطان کی ذمہ داری تھی۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں اور تھیں جو شادی کے انتظار کا وقت یونیورسٹی میں ایم اے کرتے ہوئے گزار رہی تھیں۔ باپ کمزور اور بوڑھا اور ماں سدا کی بیمار تھی۔ سب کا بوجھ سلطان کے کندھوں پر تھا۔ وہ اسٹوڈنٹ ویزے پر آسٹریلیا آیا تھا۔ سال کے سال فیس بھر کے ویزا بڑھواتا اور جب سے امیگریشن کا کیس فائل کیا تھا اپنی محنت کی کمائی سے وکیلوں کا پیٹ بھی بھر رہا تھا۔

اپنی ماں کو پیسے بھیجنے کے لئے سائرہ کو سلطان ایک اچھا ذریعہ لگا۔ لیکن یہ لین دین دکان میں نہیں ہو سکتا تھا۔ سلطان نے وعدہ کیا تھا کہ جس دن بھی وہ ٹیکسی کے کسی مسافر کو چھوڑنے اس کے گھر کی طرف آئے گا اس سے پیسے خط اور پتہ لے کر ڈرافٹ بنوا کر اس کی ماں کو بھجوا دے گا۔ سائرہ نے اسے گھر کا فون نمبر دیا تھا' اکرم بٹ کا مکان وہ پہلے سے جانتا تھا۔ ایک روز صبح فون کر کے آیا اور باہر سے ہی پیسے اور پتہ لے کر چلا گیا۔ ایک دن سلطان اس کے گھر کی طرف سے گزرا تو سائرہ اسٹور جانے کے لئے بس اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ سلطان اصرار کر کے اسے ٹیکسی میں بٹھا کر اسٹور چھوڑ آیا۔ لیکن وہ دکان سے ذرا پہلے ہی اتر گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اکرم بٹ

دیکھے گا تو جانے کیا سمجھے گا۔

اکرم بٹ بالکل ہی بے خبر نہیں تھا۔ وہ سلطان اور سائرہ کو ایک دوسرے سے مسکرا کر باتیں کرتا ہوا دیکھتا تو اس کے دماغ پر خون چڑھنے لگتا۔ وہ اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ سلطان اپنی عادت کے مطابق مذاق کرتا اور سائرہ بھی اپنی عادت کے مطابق مسکراتی ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے میں اسے ان دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے کچھ کہتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے سلطان پر کام کا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ اسے اس طرح الجھائے رکھتا کہ اسے کاؤنٹر کی طرف جانے کا موقع نہیں ملتا۔ اکرم بٹ جانتا تھا کہ وہ دونوں اس کے گھر اور دکان کے لئے بہت قیمتی اثاثہ ہیں۔ شاید اسی لئے وہ اب تک طرح دیتا آیا تھا۔ ورنہ کبھی کا پھٹ پڑتا۔ سلطان بیوقوف نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ عمر کے فرق نے بڈھے کو شکی مزاج بنا دیا ہے۔ سلطان محتاط ہو گیا۔ اسے اپنی پرواہ نہیں تھی، لیکن اسے سائرہ کا خیال تھا۔ اسٹور میں اس نے سائرہ کو دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اسے دن میں گھر پر فون کرتا ادھر ادھر کی باتیں کرتا، خود ہنستا، اسے بھی ہنساتا۔ اکرم بٹ بھی مطمئن تھا کہ اس نے طوفان کا رخ پلٹ دیا ہے۔ لیکن ایک دن طوفان نے اپنا رخ پھر ان کی طرف موڑ دیا۔

سلطان سائرہ کے گھر اس کی ماں کو ڈرافٹ بھیجنے کے لئے پیسے اور خط لینے گیا تھا۔ یہ سائرہ کے اسٹور جانے کا وقت تھا۔ سلطان نے اسے لفٹ دینے کی پیشکش کی۔ سائرہ کو دیر ہو رہی تھی اس لئے کسی تکلف کے بغیر مان گئی۔ منزل پر پہنچ کر اس نے پہلے کی طرح یہ احتیاط کی کہ اسٹور سے ذرا پہلے اتر جائے۔ لیکن اکرم بٹ نے جو کسی کاروباری شخص کو خدا حافظ کہتا ہوا دکان سے باہر آیا تھا سائرہ کو سلطان کی ٹیکسی سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کا بلڈ پریشر آسمان کو چھو رہا ہو۔ وہ دکان کے اندر اپنے دفتر میں واپس چلا گیا۔ وہ دکان میں تماشا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ غصے میں آ کر خود پر قابو رکھنا اس کے لئے ممکن نہیں ہو گا۔ شام تک وہ ضبط کی منزلوں سے کس طرح گزرا یہ وہی جانتا تھا۔

اکرم بٹ رات کو گھر آیا تو سائرہ نے روٹی پکانے کے لئے توا چولہے پر رکھ دیا

تھا اور میز پر سجانے کے لئے پلیٹیں لے کر آ رہی تھی۔ اکرم بٹ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی طرف بڑھا اور پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے کر پھینک دی۔ اچانک حملے اور باورچی خانے کے فرش پر چینی کی پلیٹ ٹوٹنے کے دھماکے نے سائرہ کو اچھال دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے کیا غلطی کی تھی۔ وہ حیرانی سے اکرم بٹ کو دیکھنے لگی۔ چہرہ خوف سے سفید ہو گیا تھا۔

"سلطان تیرے پاس کیا لینے آیا تھا۔" اکرم بٹ حلق پھاڑ کر چیخا۔

"میرے پاس........ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ یہاں نہیں آئے۔" سائرہ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اس کے پاس گئی تھی؟" اکرم بٹ پھر پھنکارا۔

"میں کیوں کسی کے پاس جاؤں گی۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" سائرہ کو بھی غصہ آنے لگا۔

"جھوٹ بولے گی تو جلتے توے پر بٹھا دوں گا۔ چمٹا گرم کر کے زبان داغ دوں گا۔ میں نے خود تجھے اس کی ٹیکسی سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔" اکرم بٹ نے ہاتھ میں چمٹا اٹھا لیا۔

"میں دکان آنے کے لئے بس کا انتظار کر رہی تھی' انہوں نے ادھر سے گزرتے ہوئے مجھے دیکھا تو بٹھا لیا۔ کہتے تھے وہ بھی اسٹور کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ اگر بری بات ہے تو میں آئندہ نہیں بیٹھوں گی۔ آپ یقین مانئے میں غلط نہیں کہہ رہی۔ آپ سلطان سے بھی پوچھ لیجئے۔" سائرہ کی آواز اور آنکھوں میں التجائیں بھر گئی تھیں۔ جسم میں خوف کی سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔

"اس کتے سے تو میں دوسری طرح پوچھوں گا۔ مجھے یقین ہے وہ اتفاقاً ادھر سے نہیں گزرا ہو گا۔ جان بوجھ کر ادھر کے چکر لگا رہا ہو گا۔ تم ان لفنگوں کو نہیں جانتیں۔ آئندہ قریب آنے کی کوشش کرے تو دھتکار دینا۔" اکرم بٹ چمٹا رکھ کر تو سے تم پر آ گیا۔ لہجے میں نرمی بھی لوٹ آئی تھی۔ اس نے سوچا وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ لیکن اسے اپنے رویئے پر ندامت نہیں ہوئی۔ وہ سختی نہیں کرے گا اور دباؤ

برقرار نہیں رکھے گا تو جوانی کی بیل سلطان جیسی کسی بھی دیوار پر چڑھ جائے گی۔ آج اس کے کہنے پر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ کل اس کے ساتھ گھر چلی جائے گی۔ وہ لاؤنج میں ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا اور سائرہ فرش سے ٹوٹی ہوئی پلیٹ کی کرچیاں سمیٹنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں اکرم بٹ توے سے اتری ہوئی گرم روٹی کے اس طرح مزے لے رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ زندگی اپنے معمول پر واپس چلی گئی تھی۔ اس رات سائرہ نے کوئی ڈرامہ نہیں دیکھا۔ زندگی خود اس کے ساتھ جو ڈرامہ کر رہی تھی۔ اسے سوچتی ہوئی بستر پر لیٹی آنسو بہاتی رہی۔ آج اس نے اکرم بٹ کا اصلی چہرہ دیکھ لیا تھا۔

اس کے بعد سائرہ بہت محتاط ہو گئی تھی۔ اسٹور پر کام کرتی تو بھولے سے بھی نہیں مسکراتی۔ سلطان کی طرف دیکھتی تک نہیں تھی۔ بات کرنے کے لئے وہ اسے گھر فون کرتا تھا۔ ڈرافٹ بنوانے کے لئے پیسے لینے آتا تو ایک منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرتا تھا۔ اسٹور پر وہ اسی محنت سے کام کرتا جس سے کبھی اس نے اکرم بٹ کا دل جیتا تھا۔ لیکن اکرم بٹ کے رویئے میں سلطان کے لئے پہلی جیسی گرمجوشی نہیں رہی تھی۔ البتہ سائرہ کے لئے اس کے رویئے میں نرمی اور ہمدردی واپس آ گئی تھی۔ بلکہ اب تو وہ اسے خوش کرنے کی کوشش بھی کرنے لگا تھا۔ رحیم پاشا کے گھر ان کی ایک اور دعوت ہوئی تھی۔ وجہ حنا تھی جو اپنے ماں باپ سے ملنے حیدر آباد جا رہی تھی۔ اس نے سائرہ سے کہا تھا وہ اپنے گھر والوں کے لئے کچھ بھجوانا چاہے تو اسے دے سکتی ہے۔ اکرم بٹ کو معلوم ہوا تو سائرہ کو ساتھ لے جا کر اس نے خود شاپنگ کرائی تھی۔ اپنے گھر والوں کے لئے حنا کو تحفوں کا پیکٹ دیتے ہوئے وہ بہت خوش تھی۔ لیکن سائرہ کی یہ خوشی بھی زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔

اکرم بٹ نے ایک دن سلطان کی ٹیکسی کو اپنے گھر کے ڈرائیو وے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس دن سائرہ کی قسمت خراب تھی۔ اکرم بٹ کو کچھ ضروری کاغذات لینے گھر آنا پڑا تھا۔ اسی وقت سلطان سائرہ سے اس کی ماں کو ڈرافٹ بھیجنے کے لئے پیسے لے کر نکل رہا تھا۔ سلطان دوسری سمت میں مڑ رہا تھا اس لے اس نے اکرم بٹ کو نہیں دیکھا۔ اکرم بٹ آندھی طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوا۔ دونوں اس کی

آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے بیوقوف بنا رہے تھے۔ پچھلے واقعے کو وہ اپنا شک سمجھ کر بھول گیا تھا۔ لیکن سائرہ کے بارے میں اس کا یہ اندازہ غلط تھا کہ وہ اپنی خواہشوں کی زبان منہ میں بند رکھے گی۔ اس کا ایک ملازم اسی کے گھر میں داد عیش دے کر واپس جا رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ اب کیسے جھٹلائے گی۔ سائرہ نیچے نہیں تھی۔ وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر پہنچا تو سائرہ اپنے کمرے میں بستر کی چادریں بدل رہی تھی۔ غصے سے اکرم بٹ کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ سائرہ خوف سے سفید پڑ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اکرم بٹ نے سلطان کو گھر سے نکلتے دیکھ لیا ہو گا اور ایک بار پھر شک کا شکار ہو گیا ہو گا۔ اکرم بٹ کا پہلا اور بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر پڑا وہ دوہری ہو کر رہ گئی۔ دوسرا ہاتھ ہتھوڑے کی طرح سینے پر پڑا تھا۔ وہ زمین پر گر پڑی۔ اسے لگا جیسے اس کا دل چینی کی پلیٹ کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہو۔ وہ کسی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس دفعہ اکرم بٹ کے دونوں ہاتھ گلا دبانے اس کی گردن کی طرف بڑھے تھے لیکن وہ پکڑے جانے سے پہلے ہی بھاگ کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ سیدھی اس چھوٹے کمرے کی طرف آئی جہاں اکرم بٹ نماز پڑھتا اور تلاوت کرتا تھا۔ اکرم بٹ بھی اس کے پیچھے آیا۔ لیکن جب سائرہ پلٹی تو اکرم بٹ کے بڑھتے ہوئے قدم اور اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ سائرہ نے ہاتھوں میں قرآن شریف کا وہ نسخہ اٹھایا ہوا تھا جس کی اکرم بٹ روز تلاوت کرتا تھا۔ اس کے چہرے سے خوف دور ہو گیا۔ ایک عجیب سا اطمینان آ گیا تھا۔

"میں قرآن کی قسم کھاتی ہوں میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔" سائرہ نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کا سیدھا ہاتھ قرآن پر رکھا ہوا تھا۔

"قرآن کو درمیان میں مت لا۔ اسے رکھ دے اور اس کے عذاب سے ڈر۔" اکرم بٹ نے اسی طرح کھڑے کھڑے کہا۔ لیکن اس کا لہجہ کچھ ڈھیلا ہو گیا تھا۔

"قرآن نے میرا ڈر نکال دیا ہے۔ آپ چاہیں تو اب مجھے قتل کر دیں۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ مجھ پر عذاب آئے۔ سلطان ایک منٹ کے لئے آیا تھا اور باہر سے باہر ہی چلا گیا تھا۔ میں نے اسے گھر کے اندر قدم بھی نہیں رکھنے دیا تھا۔"

ہاتھ میں قرآن اور لہجے کے یقین نے اکرم بٹ کو ٹھنڈا کردیا۔ اس نے کرسی پر گر کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ سائرہ بھی قرآن شریف واپس رکھ کر پلنگ کی پٹی پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سیدھی آنکھ کے گرد بہت چوڑا سیاہ حلقہ نمایاں ہونے لگا تھا۔ سینے پر لگتا تھا کسی نے پتھر رکھ دیا ہو۔

"لیکن وہ آیا کیوں تھا۔" اکرم بٹ کو سائرہ کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ لیکن خون اب بھی کھول رہا تھا۔

"اس نے بتایا تھا کہ وہ ادھر سے گزر رہا تھا اس لئے میری خیریت معلوم کرنے آ گیا تھا۔" سائرہ نے اپنا چہرہ اٹھا کر آہستہ سے کہا۔

"سب بہانے بازیاں ہیں۔ کبھی آئندہ آئے تو دروازہ بھی نہیں کھولنا۔ میں آج اسٹور جا کر اس سے سمجھوں گا۔" اکرم بٹ کو اچانک یاد آ گیا کہ اسٹور پر کوئی اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔

"آنکھ پر کچے گوشت کا ٹکڑا رکھ لو اور دو پیناڈول کھا کر سو جاؤ۔ آج اسٹور آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ جب تک آنکھ پر نشان رہے دکان سے تمہاری چھٹی ہے۔ کسی سے کچھ مت کہنا ورنہ جہاز میں بٹھا کر اسی کھولی میں واپس بھیج دوں گا جہاں تم اپنی ماں بہنوں کے ساتھ سڑ رہی تھیں۔" اکرم بٹ نے اٹھتے ہوئے کہا اور جو کاغذات لینے آیا تھا وہ لے کر اور سائرہ کو پلٹ کر دیکھے بغیر تیزی سے مکان سے نکل گیا۔ سلطان جب کام پر آیا تو اس کی اکرم بٹ کے پاس طلبی ہوئی تھی۔

"اپنا حساب کتاب لے کر اسی وقت دفع ہو جاؤ کبھی میرے گھر کے پاس نظر بھی آئے تو زندہ دفن کر دوں گا۔" اکرم بٹ کا بلڈ پریشر سلطان کو دیکھتے ہی بڑھ گیا تھا۔ سلطان کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر خاموشی سے اس کے دفتر سے نکل گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ سائرہ نے اس کے گھر آنے کے بارے میں اکرم بٹ کو کیا بتایا ہو گا۔ پھر بات بڑھانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ سارا اسٹور ان کے جھگڑے کو سنتا تو سائرہ کی عزت پر گند اچھلتی۔ ویسے بھی چند دن میں خود نوکری چھوڑنے والا تھا۔ اسے پورے وقت کے لئے ٹیکسی مل رہی تھی۔ اسے تشویش ہوئی کہ اکرم بٹ نے سائرہ

کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہو گا۔ دکان سے نکلتے ہی اس نے سائرہ کو فون کیا۔ سائرہ نے سلطان کو کچھ نہیں بتایا صرف کہا کہ وہ اب گھر نہ آئے۔ ڈرافٹ بنوانے کے لئے وہ کوئی اور ذریعہ تلاش کر لے گی۔ سلطان سمجھ گیا کہ بڈھے نے سائرہ کو بھی خوب ڈرایا اور دھمکایا ہو گا۔

سائرہ دیر تک بستر میں پڑی سسکتی رہی۔ چہرہ اتنا گرم تھا جیسے کسی نے جلتے ہوئے چولہے میں ڈال دیا ہو۔ سینے میں تکلیف بھی بڑھ رہی تھی۔ بستر سے اتر کر اپنی ٹوٹ پھوٹ کا جائزہ لینے آئینے کے سامنے گئی تو خود کو دیکھ کر ڈر گئی۔ ایسا لگا جیسا یہ آئینہ بھی دو ٹکڑوں میں بٹ گیا ہو۔ اس کا چہرہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک حصے پر ورم تھا جس نے اس کی آنکھ تک چھپا لی تھی۔ جہاں آنکھ تھی وہاں بڑا سا کالا دھبہ پھیل گیا تھا۔ سینہ کھول کر دیکھا تو اس پر بھی نیلے اور عنابی نشان پڑے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ ڈاکٹر کو دکھانا ضروری تھا۔ لیکن اسے ڈاکٹر کا پتہ نہیں معلوم تھا۔ ایک دفعہ ڈاکٹر کی ضرورت پڑی تھی تو وہی لے کر گئے تھے۔ ایسی حالت میں بھی نہیں تھی کہ خود سے جا کر تلاش کر سکتی۔ اس نے سوچا رحیم پاشا کے گھر فون کرے۔ لیکن حنا انڈیا گئی ہوئی تھی۔ اس کے پاس جولی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ جولی کی منتیں کرے گی کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائے۔ فون کیا تو جولی گھر پر ہی تھی۔ اس نے جب بتایا کہ وہ گر کر زخمی ہوگئی ہے اسے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے تو جولی کوئی سوال کئے بغیر "میں فورا" پہنچتی ہوں۔" کہہ کر جس حالت میں تھی اسی طرح تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑتی ہوئی پہنچی اور سائرہ کا چہرہ دیکھتے ہی چیخ پڑی۔

"کس نے تمہارا یہ حشر کیا ہے۔" سائرہ کچھ نہیں بولی تو جولی نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ سائرہ ایک ہمدرد آغوش پاتے ہی بری طرح رو پڑی۔ جولی اس کی پیٹھ تھپکتی رہی۔ ایک معصوم سی خوفزدہ چڑیا لہولہان ہو کر اس سے لپٹی ہوئی اشکوں کے ذریعے اپنا درد نکال رہی تھی۔ جولی بھی شاید رو پڑتی۔ لیکن وہ جذباتی طور پر بہت مضبوط عورت تھی۔ اس کے اندر غصہ ابلنے لگا۔

"مجھے بتاؤ کیاہوا۔ تمہیں کس نے مارا ہے۔" جولی نے اسے بستر پر بٹھاتے

ہوئے پوچھا۔

"کسی نے نہیں۔ غسل خانے میں پھسل کر گر پڑی تھی۔" سائرہ نے سسکیوں پر قابو پا لیا تھا۔ لیکن نظریں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔

"جھوٹ مت بولو۔ یہ زخم گرنے کا نہیں مار کا ہے۔ میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ کیا ہوا ہے۔" سائرہ کچھ نہیں بولی بس ایک بار پھر سسکنے لگی۔

"کیا تمہیں اکرم بٹ نے مارا ہے۔" جولی نے تھوڑی پہ ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اٹھاتے ہوئے ذرا سختی سے پوچھا تو سسکیاں رونے میں بدل گئیں۔

"میرے سینے میں سخت تکلیف ہو رہی ہے۔ لگتا ہے سانس رک جائے گا۔ مجھے پلیز ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔" جولی نے کپڑا ہٹا کر سینہ دیکھا تو احساس ہوا کہ اسے باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

"ٹھیک ہے آؤ چلو۔" اس نے سائرہ کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

"میں اس حرامی بڈھے کو چھوڑوں گی نہیں۔ جیل میں نہیں سڑوایا تو میرا نام جولی نہیں۔ وہ کیا سمجھتا ہے۔ تم اکیلی ہو جس طرح چاہے تمہیں استعمال کرے اور پھر ذبح کر دے۔" جولی سخت غصے میں تھی۔ لیکن سائرہ ایک دم ہی رک گئی۔

"آپ وعدہ کیجئے کچھ نہیں کریں گی۔ کسی سے کچھ نہیں کہیں گی۔ یہی بتائیں گی کہ میں گر گئی تھی۔" سائرہ نے دونوں ہاتھوں میں جولی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"بیوقوف مت بنو۔ اسے ابھی نہیں روکا تو وہ ایک دن تمہیں جان سے مار دے گا۔ ڈاکٹر کے بعد ہم سیدھے پولیس کے پاس جا کر اس کے خلاف رپورٹ کرائیں گے۔" سائرہ کی درخواست سن کر جولی کا لہجہ اور غصیلا ہو گیا تھا۔

"نہیں جولی آپ کچھ نہیں کریں گی۔ وعدہ کیجئے۔ ورنہ میں ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جاؤں گی۔ کچھ بھی ہو جائے آپ سے کبھی مدد نہیں مانگوں گی۔" سائرہ کے لہجے میں اس کے ارادے کی مضبوطی شامل تھی۔ جولی تھوڑی دیر خاموش کھڑی رہی پھر بے یقینی کے انداز میں سر ہلانے لگی۔

"میں شاید تم لوگوں کو کبھی نہ سمجھ سکوں۔ اچھا چلو ڈاکٹر کے پاس تو چلو۔"

ڈاکٹر نے سائرہ کو دیکھ کر دوائیں اور مرہم لکھ دیئے تو جولی نے ڈاکٹر سے سائرہ کی حالت کی رپورٹ لکھوائی اور خود بھی کاغذ قلم لے کر تفصیل سے سائرہ کی وہ حالت لکھی جو اس نے دیکھی تھی اور ڈاکٹر سے اس پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کرائے۔ سائرہ شکایت کے انداز میں جولی کو دیکھنے لگی۔

"فکر مت کرو، تمہارے محبوب شوہر کا کارنامہ کسی کو نہیں سناؤں گی۔ یہ رپورٹیں میرے اور ڈاکٹر کے ریکارڈ میں رہیں گی۔ تمہارے تحفظ کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ کل ضرورت پڑے تو یہ ثابت کرنا آسان ہو گا کہ جلاد تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتا رہا ہے۔" جولی نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر بھی تائید میں سر ہلانے لگا۔ دوائیں لے کر گھر آئے تو جولی نے اسے ایک دفعہ پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

"کمزور عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والے مرد نہیں ہوتے۔ یہ کوئی شوہرانہ حق نہیں ہے۔ ایک بدترین قسم کی بیماری ہے۔ یقین مانو تم نے آج نہیں روکا تو کل وہ تمہیں جان سے مار سکتا ہے۔ اپاہج بنا سکتا ہے۔ پھر تم کچھ نہیں کر سکو گی۔ ابھی وقت ہے۔ پولیس کو رپورٹ کر دو وہ اسے پابند کر دیں گے کہ وہ تم سے دور رہے۔ تمہارے کمرے تک میں داخل نہیں ہو سکے گا۔" جولی کی یقین دہانیاں سائرہ کا خوف ختم نہیں کر سکی تھیں۔

"وہ کہتے ہیں کہ مجھے واپس انڈیا بھیج دیں گے۔ مجھے واپس نہیں جانا۔" سائرہ نے اپنے ایک خوف کاا اظہار کیا۔

"یہ اس کے باپ کا ملک نہیں ہے۔" جولی پھٹ پڑی۔ "تمہیں یہاں سے تمہاری مرضی کے بغیر کوئی نہیں نکال سکتا۔ اکرم بٹ نے تمہاری جو خرید و فروخت کرنی تھی وہ کر چکا۔ اس ملک میں غلامی کا کاروبار نہیں ہوتا۔ تم ایک آزاد شہری ہو۔ اکرم بٹ کی ایک ایک چیز پر۔ اس مکان پر، اس کی دکان پر تمہارا برابر کا حق ہے ہر چیز میں تمہارا برابر کا حصہ ہے۔ وہ ملک تو کیا تمہیں اس مکان سے بھی نہیں نکال سکتا۔" جولی کی یقین دہانیاں سائرہ کے اطمینان کے لئے کافی نہیں تھیں۔ سائرہ کو یقین تھا "وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" وہ کچھ نہیں بولی اسی طرح بت بنی بیٹھی رہی۔ جولی سمجھ

گئی یہ خوف نسلوں کا ورثہ ہے۔ ایک دن میں نہیں جائے گا۔ جولی کو زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب شام کو اس نے اپنے شوہر کو یہ قصہ سنایا۔ عظیم نے سن کر افسوس کیا لیکن جولی کو سختی سے منع کیا کہ وہ اکرم بٹ اور اس کی بیوی کے ذاتی معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہ کرے۔ جولی سائرہ کے خوف کو تو سمجھ سکتی تھی۔ وہ بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے والے کبوتر کی طرح تھی۔ لیکن عظیم نے تو یہیں کے آزاد ماحول میں پرورش پائی تھی۔ یہیں تعلیم حاصل کی تھی' وکیل بنا تھا لیکن وہ بھی ایک ظلم کو آپس کا معاملہ قرار دے کر اسے خاموش رہنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ جولی کو اس وقت اپنا شوہر مختلف لگا۔ ایک اجنبی جسے وہ جانتی نہ ہو۔

سائرہ کو ٹھیک ہونے میں دو ہفتے سے زیادہ لگ گئے تھے۔ جولی پہلے ہفتے تک تو ہر روز آئی۔ لیکن بعد میں ہر دوسرے تیسرے روز آتی تھی۔ ایک دن اس نے سائرہ سے وعدہ لینا چاہا۔

"تم نے پولیس میں رپورٹ نہیں کرنے دی۔ میں نے بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ لیکن اکرم بٹ کو کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملنی چاہئے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ تب بھی اسے قریب مت آنے دینا۔ ہاتھ مت لگانے دینا۔" جولی عورت کے اس ہتھیار کی کاریگری کو جانتی تھی۔

"انہوں نے مارنے کے سوا مجھے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ میرے قریب نہیں آتے۔" سائرہ کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اکرم بٹ کا دیا ہوا یہ زخم اس کی مار سے زیادہ تکلیف دینے والا تھا۔

"کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں سوتا۔" جولی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"سوتے ہیں لیکن صرف سونے کے لئے۔ فاصلہ رکھ کر۔" سائرہ نے آہستہ سے کہا۔

"میرے خدا۔ تو تم شادی کے بعد بھی کنواری ہو۔" جولی کے لہجے میں حیرت کے ساتھ بیچارگی بھی آ گئی تھی۔ یہ لڑکی تو پوری طرح مصلوب ہو گئی تھی۔ سائرہ نے

اسے نہیں بتایا تھا لیکن اب اسے اکرم بٹ کی مار کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ تشویش سے جولی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ جانتی تھی اکرم بٹ کے ساتھ رہتے ہوئے سائرہ ہمیشہ خطرے میں رہے گی۔ کوئی غلط فہمی کسی وقت بھی حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔ لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ کرنے کے سلسلے میں خود سائرہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ خودکشی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جولی کا خوف جلد ہی اس کے سامنے آ گیا۔

وقت اور دواؤں نے سائرہ کے چہرے اور سینے کے زخم مندمل کر دیئے تھے۔ گھر کے کاموں کا معمول پھر شروع ہو گیا تھا اور دکان پر جا کر اپنی شفٹ کا کام بھی کرنے لگی تھی۔ اکرم بٹ کا رویہ اس کے ساتھ اور نرم اور ہمدردانہ ہو گیا تھا۔ ایک دن تو وہ بہت سخی ہو گیا تھا۔ زبیر کے گھر فون کر کے سائرہ کی ماں کو بلوایا تھا اور سائرہ سے سب کی بات کرائی تھی۔ اتنے مہینوں بعد ایک دوسرے کی آواز سن کر ماں بہنیں خوشی سے رو پڑے تھے۔ کئی دفعہ وہ اسے خود بھی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔ سائرہ نے پہلے روز جب اسے بتایا تھا کہ وہ جولی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی تو اس کا پارہ ایک دم پھر چڑھنے لگا تھا۔

"تم نے اسے کیا بتایا ہے۔" اکرم بٹ نے لال ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"غسل خانے میں پھسل کر گر پڑی تھی۔"

"اور اس نے یقین کر لیا۔"

"جولی کو معلوم ہے میں جھوٹ نہیں بولتی۔" اکرم بٹ کو یقین تھا کہ سائرہ سچ کہہ رہی ہے۔ وہ جولی کو جانتا ہے۔ اسے اصل واقعہ کا علم ہوتا تو وہ اب تک اس پر حملہ آور ہو چکی ہوتی۔

سلطان کے فون اب بھی آتے رہتے تھے۔ لیکن وہ بہت مختصر بات چیت کرتی تھی۔ گھر آنے کو تو اس نے بالکل منع کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی اکرم بٹ اس کی ہر حرکت پر نظر رکھتا ہے۔ دن میں جب تک گھر میں رہتی ہر تھوڑی دیر بعد اس کی خیریت معلوم کرنے کے بہانے فون کرتا، اگر فون انگیج ملتا تو جواب طلبی شروع ہو

جاتی۔ سائرہ کے پاس جولی کے سوا کوئی بہانہ نہیں تھا' حنا ابھی واپس نہیں آئی تھی۔ اکرم بٹ کو سائرہ اور جولی کا بار بار فون پر بات کرنا بھی پسند نہیں تھا۔

ایک دن سلطان نے سائرہ کو فون کیا تو بری طرح رو رہا تھا۔ اس کی ماں بہت بیمار تھی۔ رات ہی اس کی بہن کا فون آیا تھا۔ رو رو کر بھائی کو بلا رہی تھی۔ لیکن سلطان کس طرح جاتا۔ اس کا کیس ابھی تک بیچ میں اٹکا ہوا تھا۔ سائرہ اسے بہت دیر تک تسلی دیتی رہی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے آنا بھی چاہتا تھا۔ سائرہ اس کے رونے سے پہلے ہی پگھلی ہوئی تھی منع نہیں کر سکی۔ اس نے سوچا اس بہانے اسے ماں کے لئے ڈرافٹ کے لئے پیسے اور خط بھی دے دے گی۔

اکرم بٹ مستقل اسے فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہر دفعہ انگیج کی ٹون اس کے بلڈ پریشر کا ایک درجہ اور بڑھا دیتی۔ اس نے جولی کے گھر فون کیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ آنسرنگ مشین لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا سائرہ جولی سے بات نہیں کر رہی تھی۔ تو اس کتے سلطان سے فون پر عشق بگھار رہی تھی۔ کتیا کہیں کی۔ مکروہ شکل پر معصومیت کا چہرہ چڑھا کر اسے بیوقوف بنا رہی تھی۔ اکرم بٹ کے دماغ میں خون ٹھک ٹھک کرنے لگا وہ گاڑی میں بیٹھ کر طوفان کی طرح اڑتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔

سلطان جب پہنچا تو سائرہ دروازے پر ہی انتظار کر رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ مل کر اسے جلد ہی رخصت کر دے گی۔ لیکن وہ سائرہ کی شکل دیکھ کر ایک بار پھر سسکنے لگا۔ اس کی زندگی میں صرف وہی تھی جو بہت اپنی لگی تھی۔ جس سے دل کا حال کہہ سکتا تھا۔ سائرہ کا دل بھی بھر آیا۔ دل چاہا اسے قریب لا کر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ دے۔ اس وقت سارے خوف نکل گئے تھے۔ میٹھے میٹھے سے بہت نا آشنا سے جذبے ابھر آئے تھے۔ لیکن ہاتھوں نے دل کی بات نہیں مانی۔ ایسا لگا جیسے پتھر کے ہو گئے ہوں۔ پھر اس کے گوشت پوست کا وجود بھی ایک دم ہڑبڑا کر جاگ گیا۔ وہ کھلے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے تھے۔ کوئی بھی آ سکتا تھا۔ کوئی بھی دیکھ

سکتا تھا۔ سلطان سحر زدہ سا خاموش کھڑا تھا۔ رونا بھول چکا تھا۔ غم پر شاید دوسرے جذبوں نے سبقت حاصل کر لی تھی۔ سائرہ جاگی تو سلطان بھی چونک پڑا۔ سائرہ پیچھے کی طرف سرک گئی۔ دروازہ اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ سلطان چوکھٹ پھلانگ کر اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے گھر کا دروازہ بند ہو گیا۔ وہ کھڑے کھڑے اسی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر سائرہ چند قدم اور پیچھے ہو گئی۔ سلطان نے وہ لمحہ تذبذب میں گزار دیا تھا جب اس کا اٹھایا ہوا ایک قدم کوئی طوفان لا سکتا تھا۔ حقیقتیں جاگ گئیں تو مدافعت کا نظام بھی بیدار ہو گیا تھا۔

"تم بیٹھو میں پیسے اور ڈرافٹ لے کر آتی ہوں۔" سائرہ نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی نظروں کے سحر سے نکل جانا چاہتی تھی۔ سلطان نے سر ہلا دیا اور اسی طرح کھڑے کھڑے اوپر جاتی ہوئی سائرہ کو دیکھنے لگا۔ سائرہ کمرے میں آ کر جلدی جلدی ماں کے نام خط گھسیٹنے لگی۔ اسی وقت آہٹ ہوئی' نظریں اٹھا کر دیکھا تو کمرے کے دروازے میں سلطان کھڑا تھا۔ سائرہ کو لگا جیسے اس کی سانس رک جائے گی۔ یہ اوپر کیوں آ گیا۔ اگر وہ آ گئے تو۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اس کے دل کا خوف دور ہو گیا کہ دکان میں یہ اکرم بٹ کا سب سے مصروفیت کا وقت تھا۔ اسے سائرہ کا خیال آتا بھی تو فون کرتا۔ وہ سوالیہ نظروں سے سلطان کو دیکھنے لگی۔

"مجھے باتھ روم جانا ہے۔ نیچے نہیں ملا تو اوپر آ گیا۔" سائرہ نے باتھ روم کی طرف اشارہ کر کے اطمینان کی سانس لیا اور جلدی جلدی خط مکمل کرنے لگی۔ خط ختم کر کے اٹھی تو سلطان باتھ روم سے نکل کر ایک بار پھر اس کے کمرے میں آ کھڑا ہوا تھا اور عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اکرم بٹ کی گاڑی ڈرائیو وے میں داخل ہونے لگی تو اسے دور سے ہی سلطان کی ٹیکسی کھڑی دکھائی دی۔ اس نے اتنی زور سے بریک پر پاؤں مارا کہ سیٹ بیلٹ نہ بندھی ہوتی تو ونڈ اسکرین توڑتا ہوا باہر جا پڑتا۔ اس کا سر گھوم گیا اور دماغ میں دھماکے ہونے لگے تھے۔ وہ تقریباً" دوڑتا ہوا آیا اور تیزی سے دروازہ کھول کر

اندر داخل ہوا۔ وہ نہ ڈرائنگ روم میں تھے نہ کچن کے ساتھ لاؤنج میں۔ دماغ میں ہونے والے دھماکے اور تیز ہو گئے۔ "میرے اپنے بیڈ روم میں۔ میرے اپنے بستر میں........" اس نے سوچا اور باورچی خانے میں رکھی ہوئی گوشت کاٹنے کی بڑی چھری اٹھا کر تیزی سے اوپر کی طرف بھاگا۔

انہوں نے اکرم بٹ کے اندر آتے وقت دروازہ کھلنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ موٹے قالین پر پاؤں کی دھمک نے بھی آواز پیدا نہیں ہونے دی تھی۔ اکرم بٹ نے اندر آنے کی تیزی میں دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ سائرہ سلطان کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بس ایک ہی بار اس نے خود کو دیکھتے ہوئے سلطان کو دیکھا تھا۔ آنکھیں ملتے ہی سائرہ کے بدن میں بجلی سی دوڑی تھی اور وہ نظریں جھکائے اپنی ساڑھی کے پلو سے کھیلنے لگی تھی۔ وہ ان نگاہوں کا مطلب جاننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو چاہتی تھی سلطان جلدی سے یہاں سے چلا جائے۔ فورا" کمرے سے نکل جائے۔ اس سے پہلے........ اس سے پہلے کہ........ اسی وقت دروازہ بند ہونے کی تیز آواز سے وہ چونک گئی۔ سلطان بھی اچھل پڑا۔ نیچے کا کھلا ہوا دروازہ ہوا کے زور سے خود بخود بند ہوا تھا۔ سلطان تیزی سے کمرے سے نکل کر سیڑھیوں پر پہنچا۔ سائرہ بھی اس کے پیچھے تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ چھری ہاتھ میں لئے اکرم بٹ کو اوپر آتا دیکھ کر سائرہ کو لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن رک جائے گی۔ اکرم بٹ کا منہ کھلا ہوا تھا۔ غصے سے سیاہ ہو جانے والے چہرے پر چمکتے ہوئے سفید دانت بہت بھیانک لگ رہے تھے۔ سائرہ نے اس سے پہلے بھی اکرم بٹ کا غصہ دیکھا تھا۔ اس وقت جب اس نے سائرہ کو مارا تھا۔ لیکن یہ چہرہ اس دن جیسا نہیں تھا۔ یہ اکرم بٹ کا چہرہ ہی نہیں تھا۔

اکرم بٹ ان کے نیچے اترنے سے پہلے ہی اوپر پہنچ گیا۔ سلطان صرف ایک سیڑھی نیچے اتر سکا تھا۔ اکرم بٹ نے ٹھیک اس کے دل کا نشانہ لیا۔ اتنا کاری وار تھا کہ چھری دستے تک اندر گھس گئی اور اسے باہر نکالنے میں اکرم بٹ کو پوری طاقت

لگانی پڑی۔ اس نے دوسرا وار پیچھے کھڑی ہوئی سائرہ پر کرنا چاہا لیکن سلطان درمیان میں آ گیا اس دفعہ چھری سلطان کے پیٹ میں لگی تھی۔ اکرم بٹ نے چھری نکال کر دوبارہ حملہ کرنا چاہا تو سلطان اس سے لپٹ پڑا۔ سائرہ جسے ایک لمحے کے لئے سکتہ ہو گیا تھا ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی بھاگی۔ اس کے پیچھے غسل خانہ تھا اس میں گھس کر اس نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا اور پیچھے کی کھڑکی سے اپنا دھڑ باہر نکال کر مدد مدد چلانے لگی۔ پڑوس کے بنگلے میں پودوں کو پانی دیتی ہوئی بڈھی اس کی چیخیں سن کر بھاگتی ہوئی اپنے مکان کے اندر چلی گئی تھی۔

سیڑھیوں پر سلطان نے اکرم بٹ کا چھری والا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑا ہوا تھا۔ چھری اس کے جسم پر کئی لکیریں ڈال چکی تھی اس کا پورا جسم خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن اس کے چراغ کی لو آخری بار بہت تیزی سے بھڑک رہی تھی۔ اس کا ذہن ڈول رہا تھا۔ اسے بار بار لگتا کہ دماغ اس کا ساتھ چھوڑ جائے گا' لیکن ایک ہی جذبہ اسے جگائے ہوئے تھا۔ اسے سائرہ کو بچانا تھا۔ اس درندے سے سائرہ کی حفاظت کرنی تھی۔ سائرہ اس کی زندگی کا پہلا عشق تھی۔ اس سے فون پر ایک منٹ کی گفتگو اسے رات رات بھر جگائے رکھتی تھی۔ دروازے میں کھڑے کھڑے اس کا چہرہ دیکھ آتا تو دن بھر دل میں خوشیوں کی پریاں ناچتیں اور وہ اپنی شہزادی کو دیو کی قید سے رہائی دلانے کی تدبیریں سوچتا رہتا۔ اس وقت تو اسے شہزادی کو موت کے پنجے سے چھڑانا تھا۔ اس کی نظروں میں اب بھی صرف سائرہ کا چہرہ تھا۔

غصے اور جنون نے اکرم بٹ کی طاقت چار گنا بڑھا دی تھی۔ اس نے دونوں کو جہنم میں پہنچانا تھا۔ وہی ان کا اصل مقام تھا۔ سلطان پر اس نے کتنے احسان کئے تھے۔ پھر بھی وہ اس کی بیوی کے ساتھ مل کر گناہ کا کھیل کھیل رہا تھا اور مظلومیت کا ڈھونگ رچانے والی اس کی بیوی بدکاری کر کے قرآن اٹھا کر جھوٹی قسمیں بھی اٹھا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا اس نے انہیں چھوڑ دیا تو خدا اسے معاف نہیں کرے گا۔

ان کی جدوجہد کے چند سیکنڈ صدیاں بن کر ٹھہر گئے تھے۔ سلطان نے آخری بار اپنی ساری طاقت جمع کر کے اکرم بٹ کا ہاتھ موڑا تو چھری اکرم بٹ کے سینے میں

گھس گئی۔ چھری نے خود اپنا نشانہ لیا تھا اور اس کا دل چھید دیا تھا۔ سلطان کے اس آخری زور نے سیڑھیوں پر اکرم بٹ کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے سیڑھیوں سے لڑھک کر نیچے آ گرے۔ سیڑھیوں سے گرتے ہوئے چھری اکرم بٹ کے سینے میں کیل کی طرح ٹھک گئی تھی۔

چند منٹ بعد ہی سائرن بجاتی ہوئی پولیس کی گاڑیاں پہنچ گئیں۔ پولیس والے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو سامنے ہی سلطان اور اکرم بٹ کی خون میں نہائی اور ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ سائرہ کے لئے انہیں غسل خانے کا دروازہ توڑنا پڑا۔ وہ نہانے کے ٹب میں ایک کونے میں سکڑی ہوئی بیٹھی بری طرح کپکپا رہی تھی۔ خوف سے پھیلی ہوئی آنکھیں پلک جھپکنا بھول گئی تھیں۔ دو پولیس والے اسے سہارا دے کر باہر لائے۔ غسل خانے سے نکلتے ہی اس کی نظریں زینے کی گرل اور سیڑھیوں سے پھسلتی ہوئی نیچے پڑی لاشوں میں اٹک گئیں۔ اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ خارج ہوئی اور وہ بیہوش ہو کر ایک پولیس افسر کے ہاتھوں میں جھول گئی۔

سائرہ کئی روز اسپتال میں داخل رہی۔ رحیم پاشا کے خاندان کو ٹی وی پر شام چھ بجے کی خبروں سے پتہ چلا تھا اور پورا خاندان بھاگا ہوا اسپتال چلا آیا تھا۔ سائرہ کو ڈاکٹروں نے نیند لانے والی دواؤں پر رکھا ہوا تھا۔ دواؤں کا اثر ختم ہوتا اور آنکھ کھلتی تو اس کے حلق سے بے معنی چیخیں نکلنے لگتیں۔ جولی اس کے سرہانے جم گئی تھی۔ رحیم پاشا کی بیوی مستقل آیتیں پڑھتی ہوئی اس پر دم کر رہی تھی۔ دو روز اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن آنکھیں کھول کر وہ پہلی بار چیخی نہیں۔ خشک اور ویران آنکھوں میں جولی کے لئے شناسائی کی جھلکیاں بھی نظر آئی تھیں۔ اس وقت صرف جولی تھی۔ اس نے سائرہ کو گلے سے لگایا تو چیخیں آنسو بن کر نکلنے لگیں۔ دیر تک بلک بلک کر روتی رہی۔ دل پر غم، صدمے، حیرانی اور محرومی کی جمی ہوئی برف ایک ساتھ پگھل گئی۔ جولی اس کی کمر تھپکتی رہی۔ ڈاکٹروں نے اسے اس طرح بے اختیار ہو کر روتے

دیکھ کر اطمینان کے انداز میں اپنا سر ہلایا۔ سائرہ کا ذہن انجانی خلاؤں سے نکل آیا تھا۔ شدتوں کو سمجھنے والی حسیات جاگ گئی تھیں۔ وہ غم دینے والی دنیا میں واپس پلٹ آئی تھی۔ اگلے روز اسے اسپتال سے چھٹی مل گئی تو رحیم پاشا کے گھر والے اسے ٹی وی کے کیمروں سے بمشکل بچا کر اپنے گھر لے آئے۔

کئی دن تک اخباروں اور ٹی وی پر سائرہ کی وہ تصویریں نمایاں رہیں جو فوٹو گرافروں نے کسی طرح اسپتال پہنچ کر حاصل کر لی تھیں۔ اس کے بعد جولی سائرہ اور کیمرے کی ہر آنکھ کے درمیان دیوار بن گئی۔ اخبارات اور ٹی وی میں سائرہ کو جو توجہ ملی تھی اس کا قصوروار جولی خود کو سمجھتی تھی۔ اخباروں میں واقعہ کے دوسرے دن چھپنے والی خبروں میں دوہرے قتل کی وجہ بے وفا بیوی بتائی گئی تھی۔ جولی کو سخت غصہ آیا تھا اور اس نے اخباروں کو فون کر کے سائرہ کی مظلومیت کی کہانی سنائی تھی۔ ثبوت میں ڈاکٹر کی تصدیق شدہ رپورٹ بھیجی تھی جس میں اکرم بٹ کی مار کے نتیجے میں آنے والی چوٹوں کا تذکرہ تھا۔ اخباروں کو کہانی میں چٹخارے لینے والے بہت سے زاویے مل گئے اور دوسرے دن یہ کہانی ہر اخبار کے صفحہ اول پر چلی گئی اور ٹی وی کے ہر بلیٹن کی پہلی خبر بن گئی۔ ان کہانیوں میں اکرم بٹ ایک ایسا شکی مزاج بڈھا شیطان تھا جس نے پیسے کے زور پر خود سے ایک تہائی عمر کم کی لڑکی سے شادی کی تھی اور اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا تھا جبکہ سلطان وہ ہیرو تھا جس نے مظلوم سائرہ کی جان بچائی تھی۔

ان کہانیوں میں چند روز بعد اس وقت نیا موڑ اور نئی جان آ گئی۔ جب ایک بہت پروقار عورت سنہرے بالوں والی امریکی سیکرٹری کے ساتھ اپنے ذاتی جیٹ طیارے سے ملبورن کے ایئرپورٹ پر اتری۔ ایئرپورٹ پر اس کا استقبال کرنے والوں میں آسٹریلیا میں پاکستان کا سفیر اور آسٹریلیا کا ایک بہت بڑا سرمایہ دار بھی شامل تھا۔ اس کے ساتھ ہی اخباروں کی خبروں میں بڈھا شیطان پاکستان کا ایسا پراسرار نواب بن گیا جو کسی وجہ سے آسٹریلیا میں گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا اور جس کی بچھڑی ہوئی بیٹی اپنے ذاتی جیٹ میں اس کی لاش لینے آئی تھی۔ اخبارات نے اسے پاکستان کی جیکی اوناسیس

لکھا تھا۔ جیکی کی طرح سیاہ لباس پہنے اور سیاہ چشمہ لگائے ہوئے تھی۔ اس نے صحافیوں سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور لیموزین میں بیٹھ کر سیدھی ہوٹل چلی گئی تھی۔

اکرم بٹ کی خبر پاکستان کے اخبارات میں بھی چھپی تھی۔ لیکن پاکستانی اخباروں میں اکرم بٹ ولن نہیں ہیرو تھا جو غیرت کی خاطر اپنی بھارتی بیوی کے عاشق کو قتل کر کے شہید ہو گیا تھا۔ کشمیری مجاہدین کی اس تنظیم نے جسے اکرم بٹ باقاعدگی سے چندہ بھیجتا تھا اکرم بٹ کی تصویر اخبارات کو فراہم کی تھی اور اس کی غائبانہ نماز جنازہ بھی پڑھوائی تھی۔

پاکستان میں مسز چنائے بنی ہوئی رفیقہ بٹ نے یہ خبریں پڑھیں اور تصویریں دیکھیں تو یادوں کے نقوش واضح ہو کر نام اور تصویر سے مل گئے۔ اسے کوئی شبہ نہیں رہا کہ یہ وہی اکرم بٹ تھا جو اس کا باپ تھا اور جس کی یاد اب بھی کبھی کبھی چٹکیاں لے کر اس کی آنکھیں نم کر دیتی تھی۔ وہ گہری اداسی میں ڈوب گئی۔ شام سے کمرے میں بند ہو کر روتی اور پیٹتی رہی۔ باپ ملا بھی تو مرا اور خبروں کا موضوع بنا ہوا۔ اختر چنائے نے کئی بار دروازے پر دستک دی لیکن اس نے نہیں کھولا۔ وہ باپ کا سوگ تنہائی میں منانا چاہتی تھی۔ رات ہو گئی تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اولاد کا آخری فرض پورا کرے گی۔ اکرم بٹ کو آسٹریلیا میں لاوارث ہو کر دفن نہیں ہونے دے گی۔ اسے لا کر اس مٹی میں دفنائے گی جہاں سے اس کی خاک اٹھی تھی۔ اس نے بہت سوچ کر فون اٹھایا اور بحرین میں شیخ علی کا نمبر ملانے لگی۔

شیخ علی سے رفی کی دوستی قائم تھی۔ سال میں دو ایک بار دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں ملتے اور ایک دوسرے کی صحبت کا لطف اٹھاتے۔ شیخ علی کو حسرت تھی کہ رفی اس سے کبھی کچھ مانگ کر دیکھے۔ کہتی تھی اسے کچھ نہیں چاہئے۔ جو چاہتی ہے بن مانگے مل جاتا ہے۔ زندگی میں کوئی حسرت ہی نہیں ہے۔ اس لئے جب آسٹریلیا سے اپنے باپ کی میت لانے کے لئے رفی نے شیخ علی سے جہاز مانگا تو شیخ علی نے جہاز کے

ساتھ خود بھی آنے اور اس کے ساتھ چلنے کے لئے اصرار کیا۔ لیکن رفی کے منع کرنے پر جہاز کے ساتھ اپنی سب سے تجربہ کار سیکریٹری کو بھیج دیا۔ شیخ علی نے حال ہی میں آسٹریلیا کے ایک بڑے بزنس مین کے ساتھ کوئی کاروباری سمجھوتہ کیا تھا۔ شیخ علی نے رفی کا خیال رکھنے کے لئے اسے بھی فون کر دیا تھا۔ صبح جب رفی نے اختر چنائے کو بتایا تو اس نے ساتھ جانا چاہا۔ لیکن مسز چنائے نے اسے بھی منع کر دیا۔ یہ اس کا اپنا معاملہ تھا جسے وہ تنہا جا کر خود نمٹانا چاہتی تھی۔ اختر چنائے نے وزیر خارجہ کو فون کر دیا تھا جس نے آسٹریلیا میں پاکستان کے ہائی کمشنر کو ہدایت دی تھی کہ مسز چنائے کو ہر طرح کا تعاون دیا جائے۔

رفی آسٹریلیا جانے کے لئے جہاز سمیت تیار تھی۔ لیکن جانے سے پہلے اسے ایک کام اور کرنا تھا۔ اسے لندن فون کر کے اپنی ماں کو بھی بتانا تھا۔ اس کی ماں مانچسٹر چھوڑ کر لندن آ گئی تھی جہاں رفی نے اسے ایک اچھے فیشن ایبل علاقے میں بوتیک کھول کر دے دی تھی۔ رفی نے سوچا کہ سابقہ شوہر اور اپنی بیٹی کے باپ کی موت کی خبر جاننا اس کا بھی حق تھا۔ لیکن رفی کی ماں کو اکرم بٹ کے مرنے کی خبر پہلے سے معلوم تھی۔ لندن کے اخباروں نے ملبورن میں ہونے والے دوہرے قتل کی کہانی آسٹریلیا کے اخباروں سے لے کر من و عن چھاپی تھی۔ رفی نے جب اپنی ماں کو بتایا کہ وہ آسٹریلیا جا رہی ہے تو فون پر تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

"کیوں۔ تم کیا لینے جا رہی ہو؟" اس کی ماں نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ اس کے لہجے میں اداسی کے ساتھ کچھ تلخی بھی تھی۔

"اپنے باپ کی لاش پر آنسو بہانے اور کس لئے۔ ماں اسے اب مرنے کے بعد تو معاف کر دو۔" رفی کو غصہ آ گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد بھی ماں اس کے لئے دل میں کینہ لئے بیٹھی تھی۔

"تمہارا باپ معاف کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ ایک اذیت پسند اور مطلب پرست شخص تھا۔ تم آسٹریلیا جا کر اس بچی سے ملنا جسے وہ تمہاری سوتیلی ماں بنا کر لایا تھا۔ اگر اس نے معاف کر دیا تو شاید تمہارے باپ کی بخشش ہو جائے۔" ماں کی باتیں

اسے اشتعال دلا رہی تھیں۔
"میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھوں گی اور اگر ملی تو اس کا خون پی جاؤں گی۔"
"نہیں بیٹی ایسا مت کہو۔ وہ بہت مظلوم لڑکی ہے۔"
"ماں تم ایسے کہہ رہی ہو جیسے اسے جانتی ہو۔"
"مجھے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کیا ہوا ہو گا۔ تمہارے باپ نے تیس سال پرانی کہانی پھر دہرائی ہو گی۔"
"تیس سال پہلے کیا ہوا تھا ماں۔ تم نے اسے کیوں چھوڑا تھا۔ کیوں مجھے اس سے چھین لیا تھا۔"
"بھول جاؤ۔ اس کے ساتھ سب کہانیاں ختم ہو گئیں۔ تم ضرور جاؤ۔ تمہیں جو کرنا ہے وہ ضرور کرو۔"
"ہاں میں ہر صورت میں جاؤں گی لیکن پہلے مجھے بتاؤ تیس برس پہلے کیا ہوا تھا۔" رفی کے اصرار پر اس کی ماں تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہی۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔
"کوئی خاص نہیں صرف میری بیوقوفی کی کہانی ہے۔ مجھے جانے تمہارے باپ میں کیا نظر آیا تھا جو اسے دل دے بیٹھی تھی۔ شادی کے بعد اس کا اصل روپ سامنے آیا۔ اسے بیوی نہیں دکان پر کام کرنے کے لئے مفت کی نوکرانی چاہئے تھی۔ پیسوں کے معاملے میں سود خوروں سے بدتر تھا۔ ایک ایک پیسے کو ترساتا تھا۔ تم ہو گئیں تب بھی کچھ نہیں بدلا۔ تم سے بہت پیار کرتا تھا لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ وہی تھا۔ میں پھر بھی اس کے ساتھ گھسٹتی رہی۔ لیکن اسی دوران وہ اپنی مردانگی کی طاقت کھو بیٹھا۔ ایسا لگا جیسے اچانک کوئی سوئچ آف ہو گیا ہو۔ یہ بھی کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ کوئی لاعلاج مرض نہیں ہے۔ میں نے اس سے کئی دفعہ کہا کہ ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں۔ لیکن اس تذکرے پر ہی بھڑک جاتا تھا۔ میں پھر بھی بیوقوف بنی کسی مشرقی بیوی کی طرح اس کی خدمت میں لگی رہی۔ لیکن ہر دن

ایک نیا عذاب لے کر آتا۔ سخت شکی مزاج ہو گیا تھا۔ جس کے ساتھ مسکرا کر بات کرتی اسے میرا یار سمجھنے لگتا۔ ایک دن اس نے حد کر دی اور میرے ایک جاننے والے پر حملہ کر کے اس کے دانت اور ناک توڑ دی۔ اس دن میں اسے لات مار کر اور تمہیں ساتھ لے کر چلی گئی۔ ایک روز تمہیں مجھ سے چھیننے آیا تھا۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ سرعام اس کا پول کھول دوں گی۔ اتنا ڈرا کہ عدالت سے باہر ہی طلاق کا سمجھوتہ کر لیا۔ تمہارے حق سے دستبردار ہو کر مکان میرے نام لکھ دیا اور کاروبار بیچ کر کہیں چلا گیا۔" اس کی ماں خاموش ہو گئی تو رفی کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

"تم نے یہ سب کچھ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔" رفی کے لہجے میں غصے کی جگہ شکایت نے لے لی۔

"تم اپنے باپ کی یاد کے ساتھ جیتی تھیں۔ تمہیں سب کچھ بتا کر ان یادوں میں تلخیاں کیوں گھولتی۔ میرا خیال تھا اب تک کہیں مر کھپ گیا ہو گا۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ بڑھاپے میں یہ کہانی پھر دہرائے گا۔ مجھے تو اس بچی کا خیال آتا ہے جو اپنی غربت کی مجبوری سے اس کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ تم اس کی تصویر دیکھنا اخبار میں چھپی ہے چھوٹا سا سہا ہوا چوزہ لگتی ہے۔"

"مجھے اخباروں کے تراشے فیکس کر دو۔ مجھے اس کی تصویر دیکھنی اور کہانی پڑھنی ہے۔ یہاں کے اخباروں میں تو کچھ اور ہی چھپا ہے۔" رفی نے آہستہ سے کہا اور فون بند کر دیا۔

ملبورن تک بیس بائیس گھنٹے کے پورے سفر میں اس کی ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ اخبار کے تراشے پڑھ کر اور تصویر دیکھ کر سائرہ کی جو شبیہہ بنی تھی وہ دل کو رلاتی رہی۔ باپ کی میت لانے کا سفر اس نے بڑے فخر سے شروع کیا تھا لیکن وہ شرمندگی کا سفر بن گیا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ اس نے سوچا۔ وہ اس کا باپ تھا۔ اسے رشتے کا قرض ادا کرنا تھا۔ آسٹریلیا کے طویل ہوائی سفر میں شراب پی کر وہ سب کچھ بھول جانے کی کوشش کرتی رہی۔

مردہ خانے میں اس کے آنے سے پہلے ہی اکرم بٹ کی لاش تیار کر کے رکھ

دی گئی تھی۔ رات ہوٹل میں گزار کر دوسرے دن صبح وہ میت کے سامنے بہت دیر تنہا کھڑی رہی۔ وہ باپ جس کی یاد اس کی آنکھیں گیلی کر دیا کرتی تھی اس کا مردہ چہرہ اس وقت آنکھوں میں یاد کا ایک موتی بھی نہیں چمکا سکا۔

اس کی ماں کے الفاظ اور آنکھوں میں اخبار کے تراشے گھومنے لگے۔ اسے متلی ہونے لگی۔ وہ فوراً ہی مردہ خانے سے نکل گئی۔

ہوٹل کے سوئٹ میں رحیم پاشا اور ان کا وکیل بیٹا عظیم اس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ اس ملاقات کا انتظام رنی کی درخواست پر پاکستانی سفیر نے کرایا تھا۔ لیکن سفیر خود اس ملاقات میں شریک نہیں تھا۔ مسز چنائے کی عارضی سیکریٹری بھی انہیں کافی دے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"میں مسز چنائے ہوں۔ اکرم بٹ میرے والد تھے۔" رنی نے اپنا تعارف کرایا۔ رحیم پاشا جانتا تھا۔ اسے تشویش تھی کہ اکرم بٹ کی بیٹی دریافت ہونے کے بعد اب جائیداد اور کاروبار کی وراثت سائرہ کو دلوانا آسان نہیں ہو گا۔ وہ اس عورت کے تعلقات اور اس کا رتبہ دیکھ چکا تھا۔

"میں رحیم پاشا ہوں۔ میں اکرم بٹ کا اکاؤنٹس دیکھتا تھا۔ یہ میرا بیٹا عظیم ہے یہ وکیل ہے۔ ان کی بیوہ کے مفادات کی نگرانی بھی اب ہمارے ذمے ہے۔" رحیم پاشا نے بہت محتاط انداز میں کہا۔

"میرے باپ نے کیا کچھ چھوڑا ہے۔"

"ایشیا مارکیٹ کے نام سے ایک اسٹور ہے اس المئے کے روز ہی میں نے اس پر تالہ ڈلوا دیا تھا۔ ایک مکان ہے پولیس کی کارروائی کے بعد اسے بھی سربمہر کر دیا ہے اس کے علاوہ مختلف بینک اکاؤنٹس میں کافی پیسے ہیں۔" رحیم پاشا نے تفصیل بتائی۔

"قانونی طور پر ان سب کا مالک اب کون ہے۔"

"ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اکرم بٹ کی کوئی اولاد بھی ہے۔ انہوں نے کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ اس لئے ہمارا خیال تھا کہ ان کی ہر چیز کی مالک ان کی بیوی ہو گی۔

آپ کے آنے سے صورتحال بدل گئی ہے۔ لیکن اس وراثت میں حصے کے لئے آپ کو ان کی بیٹی ہونا ثابت کرنا پڑے گا۔" رحیم پاشا نے سوچا بہتر ہے بات صاف کر دی جائے۔

"مسٹر عظیم کیا آپ میرے وکیل بننا پسند کریں گے۔" مسز چنائے نے رحیم پاشا کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"مسز چنائے میں سائرہ بٹ کے مفاد کی نگرانی کر رہا ہوں۔ میرے لئے آپ کا وکیل بننا مناسب نہیں ہو گا۔" عظیم نے بہت شائستگی سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے صرف ایک حلف نامہ تیار کرنا ہے جس کے ذریعے میں اپنے باپ کی تمام جائیداد سے اپنی سوتیلی ماں کے حق میں دستبردار ہونا چاہتی ہوں۔ میرے پاس صرف دو گھنٹے ہیں۔ میرے جانے سے پہلے آپ ضروری کاغذات تیار کرا دیں۔ میں آپ کو منہ مانگی فیس دوں گی۔" رحیم پاشا اور عظیم تھوڑی دیر کے لئے حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

"دو گھنٹے سے پہلے کاغذات دستخط کے لئے تیار ہو جائیں گے۔" عظیم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ رحیم پاشا کے سینے سے بھی اطمینان کی ایک لمبی سانس نکلی تھی۔

"مجھے آپ کو ایک زحمت اور دینی ہے۔ جانے سے پہلے میں سائرہ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔" باپ بیٹے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رحیم پاشا تھوڑے توقف کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔

"سائرہ ہمارے ساتھ رہ رہی ہے۔ آپ چاہیں تو میرے ساتھ چلئے۔ عظیم کاغذات تیار کر کے وہیں لے آئیں گے۔" یہ سن کر رفی بھی کھڑی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔" مسز چنائے نے سیکریٹری کو بلا کر گاڑی لگوانے کی ہدایت اور عظیم سے کہنے لگی۔ "آپ میری سیکریٹری کو ساتھ لے جائیں۔ کاغذات تیار کرنے میں آپ کی مدد کرے گی۔ وہ میت کو جہاز پر چڑھوانے کا انتظام کر رہی ہے شاید اس سلسلے میں اسے بھی آپ کی مدد کی ضرورت پڑے۔" میت کو جہاز پر

چڑھوانے میں کسی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ شیخ علی کے آسٹریلوی پارٹنر کے آفس نے یہ سارے کام سنبھال لئے تھے۔ سیکریٹری کو ساتھ بھیج کر وہ کاغذات کی تیاری کے عمل پر نظر رکھوانا چاہتی تھی۔ شیخ علی کی بہت تجربہ کار سیکریٹری ان اشاروں کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

رحیم پاشا جب مسز چنائے کو لے کر پہنچا تو سائرہ اپنے کمرے میں آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ چہرے پر کرب کی کیفیت تھی۔ یادوں کے سائے شاید اس وقت بھی اس کی بند آنکھوں میں ناچ رہے تھے۔ رفی نے دیکھا تو اس کا دل کٹنے لگا۔ فیکس کی ہوئی تصویر میں نقش بہت واضح نہیں تھے۔ چہرہ دیکھ کر رفی اب پوری کہانی پڑھ سکتی تھی۔ اس کی ماں نے صحیح کہا تھا۔ سہمے ہوئے چوزے کی طرح تھی۔ خوف اور بے بسی نے معصوم چہرے کو لہولہان کر دیا تھا۔ رفی نے سوچا اگر وہ اپنا پہلا حمل نہ گراتی تو اس کی اپنی بچی اتنی ہی بڑی ہوتی۔ رفی کو پہلی بار اپنے باپ سے نفرت محسوس ہوئی۔

جولی بستر کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سائرہ نے بھی آنکھیں کھول دی تھیں اور بہت حیرانی سے خود کو دیکھتی ہوئی اس عورت کو دیکھ رہی تھی جس کی شخصیت پورے کمرے پر چھائی ہوئی تھی۔ رحیم پاشا نے صرف مسز چنائے کہہ کر تعارف کرایا تھا۔ سائرہ نہیں جانتی تھی وہ کون ہے لیکن جولی کو معلوم تھا۔ اس کے چہرے کے عضلات تن گئے۔ ایک محافظ کی طرح وہ قدم بڑھا کر سائرہ اور مسز چنائے کی نظروں کے درمیان آگئی۔ رفی جولی کو نظرانداز کرتی ہوئی رحیم پاشا کی طرف مڑ گئی۔

"کیا آپ تھوڑی دیر کے لئے ہمیں تنہا چھوڑ سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ رحیم پاشا نے ایک بار پھر "جی۔" کہا اور کمرے سے جانے لگا لیکن جولی اسی طرح کھڑی رہی۔ اس نے مڑ کر جولی کو دیکھا اور کہا۔ "آؤ بیٹی میرے ساتھ آؤ۔" کچھ تذبذب کے بعد جولی بھی رحیم پاشا کے ساتھ کمرے سے نکل گئی لیکن وہ پلٹ پلٹ کر سائرہ کو دیکھتی گئی جیسے کہہ رہی ہو "ڈرنا نہیں میں باہر کھڑی ہوں۔" سائرہ حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھتی ہوئی تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ رفی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے

ہاتھوں میں لے لیا۔ سائرہ نے ہاتھ کھینچا نہیں بس آنکھوں میں حیرت لئے اسے دیکھتی رہی۔

"بیٹی میں رفی ہوں۔ میرا باپ تمہیں میری ماں بنا کر لایا تھا۔" سائرہ تھوڑی دیر تک اسی طرح حیرت سے تکتی رہی اور جب اس پر حقیقت اچھی طرح واضح ہوئی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیریں بہہ نکلیں۔ اکرم بٹ کے حوالے سے ہی سہی' پہلی بار کوئی اپنا رشتہ دار آیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رفی نے اسے سینے سے چمٹا لیا تو آنسو دھواں دھار بارش بن گئے۔ رفی کی آنکھیں بھی بہنے لگیں۔ رفی ان جذبوں سے آشنا نہیں رہی تھی۔ کسی کے سینے سے لپٹ کر رونا۔ کسی روتے ہوئے کو سینے سے لگا لینا۔ اس کے لئے سینے سے لگنا محض جنسی عمل کا ایک حصہ تھا۔ سائرہ کو سینے سے لگائے ہوئے اس کے اپنے آنسو نکلے تو لگا جیسے اس کی روح دھل رہی ہو' اندر کے سارے درد ابل کر باہر آ گئے ہوں۔ اس نے سوچا وہ کتنے خوش قسمت ہیں جو کسی سے لپٹ کر رو سکتے ہیں۔ سائرہ کو بھی رفی کی آغوش اجنبی نہیں لگی تھی۔ رفی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا سمجھے' ماں' بہن یا بیٹی۔ سائرہ کو قرار آیا تو رفی نے اسے آہستہ سے بستر پر لٹا دیا اور خود اس کرسی پر بیٹھ گئی جس پر پہلے جولی بیٹھی ہوئی تھی۔

"ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے۔ میں ہی ان کی قاتل ہوں۔ وہ میری وجہ سے مرے۔ میں نہ ہوتی تو آپ ان کا زندہ چہرہ دیکھتیں۔" سائرہ ایک بار پھر سسک پڑی۔

"نہیں نہیں۔ تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں میرا باپ بہت ظالم تھا۔ تیس سال پہلے میری ماں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا میری ماں میں ہمت تھی' وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ تم شاید زندگی بھر اس کے جہنم میں سلگتی رہتیں۔ یہ سب کچھ اس طرح نہ ہوتا تو جانے کب تک اس کے عذاب میں قید رہتیں۔ اس لئے جو کچھ ہوا شاید تمہارے لئے اچھا ہی ہوا۔" رفی نے اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں پروتے ہوئے کہا۔

"نہیں ایسا نہ کہیں۔ وہ بہت اچھے تھے۔ انہوں نے میرا بہت خیال رکھا تھا۔

بس میری قسمت ہی خراب تھی۔ میری نحوست انہیں بھی چھو گئی۔" سائرہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"تم بہت اچھی ہو جو سب کو اچھا سمجھتی ہو۔ لیکن اب سب کچھ بھول جاؤ۔ سمجھو ایک ڈراؤنا خواب تھا جو ختم ہو گیا۔ ایک بہت اچھی زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اس زندگی پر اب دکھ کا کوئی سایہ نہیں آئے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" رفی جذباتی ہونے لگی۔ پہلی بار اسے کسی کے دکھ بانٹنے کا موقع مل رہا تھا۔ وہ جس دنیا میں رہتی تھی وہاں صرف پیسوں اور جسموں کے کھیل ہوتے تھے۔ کبھی ضمیر نے ستایا تو خیراتی اداروں کو چندہ دے دیا۔ کوئی ایسا جو قریب ہو، جو اپنا لگے جس سے کوئی رشتہ بھی ہو اس کے دکھ سمیٹنے کا مزا ہی کچھ اور تھا۔

"انڈیا میں تمہارے گھر والوں کو معلوم ہے۔" رفی نے پوچھا۔

"نہیں۔ میری ماں کو معلوم ہوا تو جیتے جی مر جائے گی۔" سائرہ کو اس خیال سے ہی خوف آ گیا۔

"تمہارے گھر میں کون کون ہے۔ مجھے بتاؤ۔ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" رفی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگی۔ سائرہ اسے اپنی ماں بہنوں کے بارے میں بتانے لگی۔ رفی کے سوال ختم نہیں ہوتے تھے اور سائرہ نے بھی اسے اپنی زندگی کا ہر ورق کھول کر دکھا دیا تھا۔ سلطان کا ذکر کر کے اور اس دن کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ایک بار کھل کر روئی تھی۔ اکرم بٹ کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کے بارے میں اس نے پہلی بار کسی کو اتنا کھل کر کچھ بتایا تھا۔

"سلطان بہت اچھا لڑکا تھا۔ وہ زخم جو میرے لئے تھے اس نے اپنے جسم پر کھائے۔ مجھے بچانے کے لئے دیوار بن گیا۔" سائرہ کی آنکھوں میں سلطان کی یاد نے نئے آنسو بھر دیئے۔ سلطان کی میت آج کراچی جانے والی تھی۔ رحیم پاشا نے سارا انتظام کیا تھا۔ انہیں باتیں کرتے اور روتے ہوئے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ دونوں کو وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اسی وقت جولی چائے کی ٹرالی کمرے میں چھوڑ کر اور یہ بتا کر چلی گئی کہ عظیم کاغذات لے کر آ گئے ہیں۔ رفی کے بارے میں تفصیل جان کر جولی کا

رویہ بھی بدل گیا تھا۔ رنی نے سائرہ کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی اور خود بھی پی۔ اسے معلوم تھا اسے اب جانا ہے۔ وقت ہو گیا تھا۔

"تم چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ میں اپنے جہاز میں آئی ہوں۔ پاکستان جاتے ہوئے انڈیا میں تمہیں اپنے گھر پہنچا دوں گی۔" رنی نے پیشکش کی۔

"نہیں میں اپنی بگڑی ہوئی شکل اور اجڑی ہوئی زندگی لے کر گھر نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔" سائرہ نے شکر گزاری کے انداز میں کہا۔

"کیا تمہیں رحیم پاشا اور ان کے خاندان پر پورا بھروسہ ہے۔" رنی نے پوچھا۔

"جی بالکل۔"

"ٹھیک ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن اس بستر سے اٹھو تو آنکھیں کھول کر چلنا۔ کسی پر بھی آنکھیں بند کر کے بھروسہ مت کرنا۔ تم اس دنیا کو نہیں جانتیں۔ یہ تمہارے دل کی طرح اچھی اور صاف نہیں ہے۔" سائرہ نے کچھ کہے بغیر سر ہلا دیا۔

"تمہیں اب کسی مجبوری کے آگے سر جھکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی، کسی بھی وقت، کہیں بھی، کوئی بھی ضرورت ہو مجھے فون کر دینا۔ میں کہیں بھی ہوں گی مجھے خبر مل جائے گی۔" رنی نے اسے ایک کارڈ دیتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے حیدر آباد میں اپنے گھر کا پتہ بھی دے دو۔ میں انڈیا گئی تو تمہاری ماں سے ملنے جاؤں گی۔"

"وہ چھوٹا سا گندا کمرہ آپ کے جانے کی جگہ نہیں ہے۔" سائرہ نے آہستہ سے کہا۔

"چھوٹے مکان ہمیشہ چھوٹے نہیں رہتے۔ دل بڑے ہوں تو گھر بھی بڑے ہو جاتے ہیں۔" رنی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے جانے کا وقت ہو رہا ہے۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاتے ہوئے مت شرماؤ۔" رنی نے ایک بار پھر پوچھا۔ سائرہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ رنی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میری بات شاید آپ کو پسند نہ آئے۔" بڑی مشکل سے سائرہ کے حلق سے آواز نکلی۔

"تمہیں شاید ابھی تک مجھ پر یقین نہیں آیا۔ میری پسند کی فکر مت کرو۔ کہو کیا بات ہے۔"

"آپ کراچی میں رہتی ہیں؟" رفی نے سر ہلایا تو سائرہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "سلطان بھی کراچی کا تھا۔ اپنی بیوہ بہن' اس کے چار بچوں' دو کنواری بہنوں اور اس باپ کا تن تنہا سہارا تھا۔ اکیلا کمانے والا تھا۔ آپ اگر ان کے لئے کچھ کر سکیں تو......" مسز چنائے ایک بار پھر حیران ہو گئی۔ یہ کس دنیا کے لوگ تھے۔ کیسی مخلوق تھے جو اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے مانگ رہے تھے۔ رفی نے سوچا یہ ایک سفر شاید اس کے سوچنے کا ڈھنگ بدل دے گا۔

"تم فکر مت کرو۔ ان کا بیٹا اور بھائی تو واپس نہیں مل سکتا' لیکن انہیں اتنا پیسہ مل جائے گا کہ سلطان زندگی بھر کما کر بھی نہیں بھیج سکتا تھا۔" سائرہ کو ایسا لگا جیسے اس کے دل سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ رفی نے سائرہ کو لپٹا کر پیار کیااور خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکلی تو سائرہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمک گئے۔ یہ آنسو اس عورت کے لئے تھے جو تھوڑی ہی دیر میں اسے اپنا سب کچھ بنا کر چلی گئی تھی۔ مسز چنائے کو بھی اپنا یہ سفر رائیگاں نہیں لگا۔ اس نے اس سفرمیں ایک نیا رشتہ کمایا تھا اور سب سے بڑھ کر اسے اپنے ان پیسوں کا استعمال بھی سمجھ میں آنے لگا تھا جن میں ہر سال اضافہ ہو جاتا اور وہ اکثر سوچتی کہ وہ مر گئی تو یہ سرمایہ کس کے کام آئے گا۔

پاکستان پہنچ کر رفی نے اکرم بٹ کی میت اور چندے کی ایک بڑی رقم اس کشمیری گروپ کے حوالے کی جن سے اکرم بٹ ہمیشہ وابستہ رہا تھا۔ وہ اکرم بٹ کی میت کو اس کے آبائی گاؤں میرپور لے گئے جہاں ایک بڑے جلوس کی شکل میں اس کا جنازہ اٹھا اور اسے شہید کے طور پر دفن کر دیا گیا۔

اکرم بٹ کی دکان اور مکان سائرہ کے نام منتقل ہونے اور بکنے میں تین مہینے لگے تھے۔ رحیم پاشا نے ایک ایک پیسہ سائرہ کے نام منتقل کر کے اکاؤنٹس تیار کیا جس کی ایک کاپی مسز چنائے کو بھی بھیجی تھی۔ سائرہ اس کے ایک مہینے بعد اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنے سڈنی منتقل ہو گئی تھی۔ اس نے انڈیا جانے سے انکار کر دیا تھا۔ جولی نے اس کے فیصلے کی حمایت کی تھی۔ اس کا خیال تھا بھارت جا کر بے مصرف زندگی کے اسی گڑھے میں دوبارہ گر جائے گی جس سے نکل کر آئی تھی۔ وہاں دولت بھی اسے زندگی کی کوئی خوشی نہ دے سکے گی۔ لیکن سائرہ ملبورن میں بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس شہر سے اسے خون کی مہک آتی تھی۔ پھر اخبار اور ٹی وی نے اس کا چہرہ بہت جانا پہچانا بنا دیا تھا۔ پاکستانی اور بھارتی خاندانوں میں تو ہر شخص اسے اچھی طرح جاننے لگا تھا۔ جولی کی ماں سڈنی میں اکیلی رہتی تھی۔ جولی سائرہ کو اس کے پاس چھوڑ آئی۔ جولی کی طرح وہ بھی بہت مہربان عورت تھی۔ کچھ کرنے کے لئے نہیں تھا اس لئے سائرہ اس کی مصروفیت کا مرکز بن گئی۔ سائرہ کو اپنی زندگی نئے سرے سے تعمیر کرنے اور اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونے میں جولی کی ماں نے بہت مدد دی۔ اس نے اپنا شناخت بدلی۔ بال کٹوا دیئے اور ساڑھی اتار کر پتلون قمیض اور اسکرٹ بلاؤز کی عادی ہو گئی۔ اس کے حوصلہ دلانے پر سائرہ نے سیکریٹری کے ایک کورس میں داخلہ لے لیا تھا۔ چھ مہینے میں کورس ختم کر کے نکلی تو اپنے کام میں طاق ہو گئی تھی۔

اپنی نئی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کرنے سے قبل وہ ماں سے ملنے حیدر آباد گئی۔ جانے سے قبل فون پر اس نے ماں کو اکرم بٹ کے اچانک انتقال کی خبر دے دی تھی۔ جب گھر پہنچی تو ماں نئے رنگ و روپ میں خوشحال اور صحتمند نظر آنے والی بیٹی کو دیکھ کر اس کی بیوگی کا زخم بھول گئی۔ واپس آنے سے پہلے سائرہ ماں کو ایک تحفہ دے کر آئی۔ اس نے اپنے باپ کی حویلی منہ مانگے پیسے دے کر خرید لی تھی۔ سائرہ جب روشن اور عذرا کے ساتھ ماں کو حویلی میں لے کر گئی تو اسے یقین نہیں آیا۔ بہت دیر تک تینوں بیٹیوں کو لپٹا کر روتی رہتی۔ پھر ایک ایک گوشے کو سونگھ کر انہیں اپنے سانسوں میں سمانے لگی۔ کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا تو اس آنگن میں ناچتی پھرتی جس

میں کبھی سہاگن بن کر آئی تھی۔ صرف ایک کمرے میں اس نے قدم نہیں رکھا تھا۔ اسی کمرے میں اس کی سہاگ رات بجی تھی اور اسی کمرے میں اس کا سہاگ اجڑا تھا۔ سائرہ جس دن آسٹریلیا واپس آ رہی تھی اس دن اس کی ماں نے گھر کی چنبیلی کے ایک ایک پھول کو دھاگوں میں پرو کر اس کی کلائی کو گجروں سے بھر دیا تھا اور اس کی بیوگی کو بھول کر اسے سدا سہاگن رہنے کی دعائیں دی تھیں۔ ماں کا شوق پورا ہوتے ہی سائرہ نے اپنے ہاتھوں سے پھول اتار دیئے۔ اسے معلوم تھا جب تک ہاتھوں میں پھول ہیں عذرا اس کے پاس نہیں آئے گی۔ عذرا کو چنبیلی کے پھول پسند نہیں تھے۔ اور اس گھر کی چنبیلی سے تو اسے الرجی تھی۔ بیل کے قریب جاتی تو آنکھوں میں پانی بھرنے لگتا۔ چھینکیں آنے لگتیں۔ اسے شاید بچپن کے وہ دن نہیں بھولے تھے جب اس کی ماں دوسروں کے گھروں میں کام کر کے واپس آتے ہوئے اپنی حویلی کی دیوار کے سائے میں بیٹھ کر چنبیلی کے اس بیل کو حسرت سے تکتی ہوئی آنسو بہایا کرتی تھی۔

سائرہ نے واپس آتے ہوئے ماں سے وعدہ لیا کہ وہ عذرا کا رشتہ ڈھونڈنا بند کر دے گی اور اسے میڈیکل کالج میں داخلہ دلانے کی کوشش کرے گی۔ سڈنی واپس آنے کے چند ماہ بعد اس نے فون کر کے ماں سے بات کی تو اس کی ماں بات کرتے ہوئے خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

"وہ آئی تھی۔" جوشیلی ہو کر اس کی ماں کی آواز بہت اونچی ہو گئی تھی۔

"کون ماں۔" سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی مسز چنائے۔" اس کی ماں نے اسی طرح چیختے ہوئے کہا۔ "کہتی تھی تیرے میاں کی طرف سے تیری رشتے دار ہے۔ اس نے عذرا کا داخلہ لندن میں کسی میڈیکل کالج میں کرا دیا ہے۔ کہتی ہے اگلے مہینے عذرا کو خود ساتھ لے کر جائے گی۔ زبیر سے مل کر سارے کاغذ بھروا دیئے ہیں۔ زبیر کی جینز بند کمیٹی کو دس لاکھ روپے کا چندہ بھی دے کر گئی ہے کہتی تھی........." سائرہ اس کے بعد کچھ نہیں سن سکی۔ فون ختم کیا تو اس نے وہ کارڈ تلاش کیا جو مسز چنائے اسے دے کر گئی تھی۔ وہ فون پر اس کا نام سنتے ہی آ گئی تھی۔ سائرہ کے حلق سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔ دل بھر آیا تھا۔

دوسری طرف سے دل کو یقین دلانے والی مسز چنائے کی آواز آنے لگی۔

"عذرا کے بارے میں فکر مت کرنا۔ وہ لندن میں میری ماں کے پاس رہے گی میری ماں اسے سینے سے لگا کر رکھے گی اور سلطان کے گھر والے اب بالکل ٹھیک ہیں۔ انہوں نے وہ مکان خرید لیا ہے جس میں وہ کرائے پر رہتے تھے۔ اس کی دونوں بہنوں کی اگلے مہینے شادی ہے۔ تم تو ٹھیک ہو۔" سائرہ کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو پھوٹ پڑے اسے لگا اس کی ایک نہیں دو مائیں ہیں۔

15

سڈنی ۱۹۹۶ء

بارش تھم گئی تھی لیکن سیاہ بادلوں نے ماحول کو اداس کیا ہوا تھا۔ کہانی سناتی ہوئی سائرہ کے چہرے پر گھٹاؤں کے آتے جاتے موسم سلیم پر بھی چھا گئے تھے۔ سائرہ نے خاموش ہو کر اپنا چہرہ گھٹنوں پر ٹکا دیا اور پتھریلی چٹان پر انگلیوں سے نظر نہ آنے والی کوئی تحریر لکھنے لگی۔ ان کی خاموشی سے موجوں کا شور اور بڑھ گیا تھا۔

"کیا تمہیں بھی سلطان سے محبت ہو گئی تھی۔" سلیم نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ یہ سوال سلیم کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا یہ سوال سائرہ کو ناراض نہ کر دے۔ لیکن سائرہ نے کچھ نہیں کہا۔ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی پھر نظریں اٹھا کر جھاگ اڑاتی ہوئی موجوں کو دیکھنے لگی۔ سلیم اسے اب بھی جواب طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں ایسے سوال خود سے بھی نہیں کرتی۔ اب کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ وہ بس ایک لمحے کا ساتھ تھا۔ میرے لئے ایسی کوئی بات سوچنا بھی گناہ تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ میرے کمرے میں کیوں آیا تھا۔ اس کے دل میں کیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی پیش قدمی کرنے آیا ہو۔ شاید ایسا ہوتا تو میں اسے زینے سے دھکا دے کر گرا دیتی۔ شاید وہ میرے ہاتھوں سے مارا جاتا۔ ہو سکتا ہے میں کچھ بھی نہ کرتی۔ شاید میں بھی اس لمحے کے دباؤ میں آکر بھٹک جاتی۔ میں نہیں جانتی۔ اور اب جاننا بھی نہیں چاہتی۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو۔" سائرہ اب سلیم کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"کچھ نہیں بس ایسے ہی۔ مجھے یقین ہے اس نے تمہیں دل و جان سے چاہا ہو گا لیکن اظہار کرنے سے پہلے ہی مر گیا۔ بلکہ تمہاری محبت پر شہید ہو گیا۔ تم نے خود بتایا ہے تمہیں بچانے کے لئے وہ اپنے بدن پر چھری کے وار روکتا رہا۔" سلیم تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوا۔ پھر اپنی طرف دیکھتی ہوئی سائرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔ "سلطان نے محبت کی کہانی جہاں چھوڑی تھی میں اسے وہیں سے جوڑنا چاہتا ہوں میں تمہارا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں۔" سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے چٹان پر ٹیک دیئے۔

"تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا۔" سائرہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھے مذاق میں مت اڑاؤ۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ اب پھر کہتا ہوں۔ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" سائرہ اس طرح خاموش بیٹھی رہی جیسے اس نے کچھ نہ سنا ہو۔

"آؤ چلیں۔ دیر ہو گئی ہے۔ مجھے گھر جانا ہے۔" سائرہ نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں شاید مجھ پر یقین نہیں آیا۔ آؤ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں اپنی چاہت کا تماشا دکھاؤں۔" سلیم اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اسے چٹان کے کنارے لے گیا۔ "دیکھو نیچے ان چٹانوں کو دیکھو بالکل تمہاری طرح ہیں۔ غور سے ان موجوں کو دیکھو۔

ان میں تمہیں میرا چہرہ دکھائی دے گا۔ تمہارے قدموں پر بار بار سر پٹختا ہوا چہرہ۔ لیکن تم پر کوئی اثر نہیں ہے۔ اسی طرح پہاڑ بنی کھڑی ہو۔ وہ دور آتے ہوئے جہاز کو دیکھ رہی ہو۔ اس کے مستول پر بھی میں کھڑا کنارا دیکھ رہا ہوں لیکن تم نے اب تک لنگر ڈالنے کا اشارہ نہیں دیا۔ سامنے افق پر دیکھو۔ وہ جو ہوائی جہاز آ رہا ہے۔ وہ بھی میری تمنا کی طرح ہے۔ تمہارے ہوائی اڈے پر اترنے کو بے تاب لیکن تم نے رکاوٹیں کھڑی کر کے اسے اترنے سے روک دیا ہے۔ منڈیر پر بیٹھے ہوئے اس آبی پرندے کو دیکھو۔ وہ بھی میں ہوں اور خوراک کو ترس رہا ہوں۔ تم دانے مٹھی میں بند کئے بیٹھی ہو، کھولو۔ اپنی مٹھی کو کھولو۔" سلیم سچ مچ اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مٹھی کی طرح کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ سائرہ کی ہنسی تیز ہو گئی۔ سلیم یہی چاہتا تھا وہ ماحول سے تناؤ ختم کر کے اداسی کی کیفیت کو تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا سائرہ فوری جواب نہیں دے گی۔ بہت سوچ و بچار کرے گی۔ اسے خوش رکھنا ضروری تھا۔ ماضی میں رہی تو اسی طرح تذبذب کا شکار ہو کر ڈری اور سہمی ہوئی بار بار پلٹ کر گزرے ہوئے کل کو دیکھتی رہے گی۔

"چلو واپس چلیں۔ مجھے سچ مچ دیر ہو رہی ہے۔" سائرہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا تو دونوں چٹانوں سے اتر کر واپس ساحل کی طرف چل دیئے۔ بس اسٹاپ کم از کم دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔

"تمہیں جلدی نہ ہو تو لنچ کر کے جاؤ۔" سلیم نے دعوت دی۔

"نہیں مجھے جولی کی ماں کے گھر جانا ہے۔ وہ کل صبح امریکہ جا رہی ہے۔ اس کی بیٹی امریکہ سے کرسمس منانے ماں کے پاس آئی ہوئی تھی۔ جولی بھی کرسمس کے بعد سے ابھی تک یہیں ہے وہ بھی جا رہی ہے۔ تینوں ایک لمبے عرصے کے لئے نیویارک میں رہیں گے اس لئے آج کی شام ان کے ساتھ گزاروں گی۔"

"جولی بھی؟" سلیم نے پوچھا۔

"ہاں جولی کی عظیم بھائی سے علیحدگی ہو گئی ہے وہ بھی کچھ عرصے کے لئے کہیں دور چلے جانا چاہتی ہے۔"

"یہ کیسے ہوا؟" سلیم کو واقعی حیرت ہو رہی تھی۔ سائرہ نے جو کچھ بتایا تھا اس سے تو وہ ایک محبت بھرا خاندان لگتا تھا۔

"عظیم بھائی بہت اچھے ہیں۔ لیکن جولی کہتی ہے کہ کبھی کبھی ان کی بھارتی روح بیدار ہو جاتی تھی اور وہ شوہرانہ حاکمیت جتانے لگتے تھے۔ جولی عورتوں کے حقوق کے مسئلے پر بہت جذباتی ہے۔ دوسروں کے لئے لڑتی رہتی ہے تو اپنے ساتھ یہ رویہ کیسے برداشت کرتی۔ پھر ان کے اولاد بھی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے عظیم بھائی بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔ لیکن دونوں اچھے دوستوں کی طرح الگ ہوئے ہیں۔ جولی کہہ رہی تھی عظیم بھی اب اچھے بچوں کی طرح حیدر آباد جا کر کسی رشتے دار لڑکی کو بیاہ کر لے آئیں گے۔"

سائرہ ایک بار پھر بہت اداس ہو گئی۔ سلیم نے سوچا پھر وہی علیحدگی کا قصہ۔ وہی اداسی کی باتیں۔

"تمہاری بہن نے میڈیکل کر لیا۔" سلیم نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"نہیں ابھی عذرا کے دو سال باقی ہیں۔ پچھلے سال چھٹیوں میں میرے پاس آئی ہوئی تھی۔ آج کل ماں کے پاس حیدر آباد میں چھٹیاں منا رہی ہے۔ رنی کی ماں اسے بیٹی کی طرح چاہتی ہے۔ رنی بھی بہت خیال رکھتی ہے۔ عذرا کہتی ہے اس کی ایک نہیں چار مائیں ہیں۔ روشن کو اب بھی اپنی ماں سمجھتی ہے۔" بہن کے تذکرے پر سائرہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"مسز چنائے سے تمہاری پھر ملاقات ہوئی۔" سلیم نے پوچھا۔

"نہیں لیکن کبھی کبھی فون پر بات ہو جاتی ہے۔ تمہیں پتہ ہے دنیا میں صرف تین لوگ انہیں رنی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی ماں' ان کے دوست شیخ علی اور ایک میں۔ مسٹر چنائے بھی انہیں مسز چنائے کہتے ہیں۔" سائرہ نے بڑے فخر سے ہنستے ہوئے کہا۔

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے بس کا سفر کٹ گیا۔

"اب کب ملیں گے۔" سینٹرل اسٹیشن پر بس سے اترتے ہوئے سلیم نے پوچھا۔

"اگلے ویک اینڈ پر۔ میں تمہیں فون کروں گی۔" یہ کہہ کر وہ اسٹیشن کی سیڑھیاں اترنے لگی اور سلیم ہمیشہ کی طرح اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظر سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

اگلے ہفتے کے روز وہ سائرہ سے نہیں مل سکا۔ صبح ہی صبح چودھری انور کا فون آ گیا تھا کہ پاکستان میں ظہور کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ سلیم بھاگا بھاگا ان کے گھر پہنچا تو ظہور کی حالت اچھی نہیں تھی۔ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ سلیم آیا تو اس سے لپٹ کر دیر تک گریہ و زاری کرتا رہا۔ تینوں مل کر اسے سمجھاتے رہے لیکن اسے قرار نہیں آتا تھا۔ اسے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ وہ اپنی ماں کو کوئی سکھ نہ دے سکا تھا۔ وہ اس سے دکھی اور ناراض ہو کر مری تھی۔ چودھری انور اسے سمجھا رہا تھا۔

"ماں کی ناراضی صرف اس کے چہرے تک رہتی ہے۔ کبھی دل میں گھر نہیں کرتی۔ مائیں اولاد سے ناراض ہو ہی نہیں سکتیں۔" چودھری انور کے لہجے میں بہت یقین تھا۔ ظہور کو بھی ڈھارس بندھنے لگی تھی۔ دوسرے دن اتوار تھا جو انہوں نے سوئم کی فاتحہ اور قرآن خوانی کے لئے اسی وقت طے کر دیا۔ اقبال نے اطلاع دینے کے لئے فون سنبھال لیا تھا۔ چودھری انور ضروری سامان خریدنے اور مسجد میں اطلاع دینے چلا گیا۔ سلیم کے ذمہ ظہور کی دلداری کا کام تھا۔

سلیم کو یقین نہیں تھا کہ اتنے لوگ آ سکیں گے کہ قرآن ختم ہو سکے لیکن اس وقت شدید حیرت ہوئی جب مغرب ہونے تک ریڈ فرن کی مسجد لوگوں سے بھر گئی۔ پچاس سے زیادہ لوگوں نے مل کر تین قرآن ختم کر دیئے۔ کھانا ظہور نے خود پکایا تھا۔ کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ کہا تھا ایک باورچی اپنی ماں کی آخری یاد اسی طرح منا سکتا ہے۔ دن بھر کسی نے اس کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھا تھا لیکن مسجد سے واپس آ کر ایک بار پھر بے اختیار ہو کر رویا اور شراب کی بوتل پر ٹوٹ پڑا۔ سب نے بہت روکا لیکن کہتا تھا شراب میں آنسوؤں کو ملا کر پئے گا اور صبح تک سب کچھ بھول جائے گا۔

ظہور نے غلط نہیں کہا تھا۔ اگلے ہی ہفتے وہ اپنے کچن میں اقبال کی منگیتر کی دعوت کے لئے کھانا پکا رہا تھا تو لگتا نہیں تھا یہ وہی ظہور ہے جو ایک ہفتے پہلے اپنی ماں کے سوئم کا کھانا کھلا رہا تھا۔ سلیم ظہور کے اس کمال کو جانتا تھا اور اکثر پوچھتا تھا کہ اس کے اندر کے زخم اس کے چہرے پر دکھائی کیوں نہیں دیتے۔ جواب میں مسکرا کر کہتا۔ "وہ برج سرطان کا کیکڑا ہے جو اپنے خول کے اندر رہنا جانتا ہے۔" اور اپنے شاعر دوست نقاش کا ایک شعر سناتا جو اس کا خیال تھا کہ ایک سرطانی شاعر نے دنیا بھر کے سرطان زدہ لوگوں کے لئے کہا تھا۔

باہر کا شور اتنا گراں تھا کہ بہرامن
ہر شخص اپنی ذات کے اندر چلا گیا

ظہور کی ماں کی موت نے سلیم کو بھی ہلا دیا تھا وہ سوچ کر ہی کانپ گیا تھا کہ اس کے پیچھے ماں کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گا۔ شاید غم سے مر جائے۔ اس کی ماں بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ اس نے سوچا اسے سائرہ سے جلد بات کرنی ہو گی۔ ہر قیمت پر اسے تیار کرنا ہو گا۔ لیکن اگلے ہفتے بھی سائرہ سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ ہفتے کو اقبال اپنی منگیتر کو دوستوں سے ملوانے لا رہا تھا۔ پھر سائرہ نے بھی اسے فون کر دیا تھا وہ اگلے ویک اینڈ پر اپنی فیکٹری کی ساتھی دوستوں کے ساتھ بلیو ماؤنٹین جا رہی تھی۔

"میں بھی تمہیں وہیں ملوں گا۔" سلیم کو شاعری کرنے کا موقع مل گیا۔

"کہاں.....؟" سائرہ کی حیرانی میں تشویش شامل تھی۔

"یوکلپٹس کے درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی نیلاہٹوں میں۔" سلیم نے اپنے لہجے کو خوابناک بنا کر کہنا شروع کیا۔

"ہواؤں کی تہہ جب پتوں پر جم کر آئینہ بنی تمہیں نیلگوں آسمان کا عکس دکھائے گی تو اس میں تم میرا چہرہ دیکھو گی۔ چھوٹا سا کوالا ریچھ درخت سے کود کر تمہارے پاؤں میں لوٹنے لگے تو سمجھنا اس میں میری روح سما گئی ہے۔ پہاڑوں میں اترتی ہوئی چکردار تنگ سیڑھیوں پر جھاڑیوں کی چہل قدمی کرتے ہوئے جھرنوں اور

آبشاروں کا ترنم تمہیں میری آواز لگنے لگے گا۔ جب صدیوں پرانے غاروں میں پانی سے پگھلے ہوئے پتھروں کو دیکھو گی تو ان کی چھت سے نیچے آتے ستونوں میں میرا چہرہ لٹکا ہوا نظر آئے گا۔ تین بہنوں کے بتوں کے پیچھے سے ان کا بھائی بن کر میں جھانکتا دکھائی دوں گا۔ انکے پیار کی کہانی میری کہانی بن جائے گی......"

"بس کرو۔" سائرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ساحل سمندر پر تم نے جو شاعری کی تھی ابھی تک اسی میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ اب ایک اور پہاڑ تم نے سر پر رکھ دیا ہے۔"

"جب تک ہاں نہیں کرو گی ڈوبتی رہو گی' پہاڑوں کا وزن بڑھتا رہے گا۔" سلیم نے اسی لہجے میں کہا۔ سائرہ ایک بار پھر ہنسنے لگی۔

"اگلے ہفتے ملاقات ہو گی۔" اس نے کہا۔

"اگر میں زندہ رہا تو۔" سلیم نے ایک لمبی سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا اور سائرہ نے ہنستے ہوئے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ سلیم نے اپنی پیٹھ ٹھوکی کہ اسے بھی عشق کرنا آگیا ہے۔

سلیم دوپہر کو پہنچا تو اقبال اپنی منگیتر کو لے کر نہیں آیا تھا۔ ظہور حسب عادت شعر گنگناتے ہوئے ہانڈی بھون رہا تھا۔ چودہری انور سلاد کے پتے توڑ چکا تھا۔ اب ٹماٹر کاٹ رہا تھا۔ سلیم ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ٹی وی کے ریموٹ پر پیانو بجانے لگا۔ وہ ابھی دوسرے چینل پر تھا کہ دروازہ کھول کر اقبال داخل ہوا۔ سلیم کھڑا ہو گیا لیکن جب اقبال کے پیچھے اس کی منگیتر کا چہرہ طلوع ہوا تو حیرت سے سلیم کا منہ کھلا رہ گیا۔ اقبال کی منگیتر بھی تیزی سے پلکیں جھپکانے لگی اور اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

"یہ پروین ہیں میری منگیتر اور یہ ہیں ہمارے شہزادے سلیم جو ابھی تک اپنی انارکلی ڈھونڈ رہے ہیں۔" اقبال نے مسکراتے ہوئے تعارف کرایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ہیلو کیا۔ یہ تاثر تک نہیں دیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ظہور اور چودہری انور بھی آ گئے تھے اقبال ان سے پروین کا تعارف کرانے لگا۔ سلیم دل ہی دل میں حیرت کر رہا تھا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی وہی لڑکی تھی جس کا رشتہ مولانا نے سلیم سے کرایا تھا اور جو اس کی بیوی ہوتے ہوتے بال بال بچی تھی۔ ظہور اور چودہری انور

دوبارہ باورچی خانے میں چلے گئے اور اقبال روٹی اور کولڈ ڈرنکس لینے باہر جانے لگا۔

"اقبال، تم بیٹھو میں لے کر آتا ہوں۔" سلیم نے پیشکش کی۔

"نہیں نہیں تم آج ہمارے مہمان ہو۔ تم پروین سے باتیں کرو، میں پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں۔" اقبال یہ کہہ کر چلا گیا تو کمرے کی خاموشی میں کچھ دیر دروازہ بند ہونے کی بازگشت گونجتی رہی۔

"اقبال آپ کا بہت تذکرہ کرتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ آپ ہیں۔ آپ نے اچھا کیا جو مجھ سے شناسائی ظاہر نہیں کی۔ آپ نے اگر اپنے رشتے کے بارے میں بتایا تو انہیں شاید اچھا نہ لگے۔" پروین کی آنکھوں میں بہت سی التجائیں تھیں۔

"جی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں آپ خود بھی کبھی تذکرہ مت کیجئے گا۔" سلیم نے کہا اور پھر تھوڑی دیر کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد پوچھنے لگا۔ "لیکن مولانا نے بتایا تھا آپ کا کہیں اور رشتہ ہو گیا ہے مجھے معلوم ہے وہ اقبال نہیں تھا۔ کیا وہ........"

سلیم نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"وہ بات غلط نہیں تھی سب کچھ طے ہو گیا تھا لیکن اسی زمانے میں لڑکے کو کینیڈا کی امیگریشن مل گئی تو اسے شادی کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ کچھ کہے بغیر پاکستان چلا گیا جہاں اس کے ماں باپ نے اس کے لئے کوئی اور لڑکی تلاش کی ہوئی تھی۔" پروین کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔

"اوہ......!" سلیم بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"اس کے بعد میں نے اپنے ماں باپ کو دھمکی دے دی تھی کہ وہ میرے لئے رشتہ دیکھنا بند کر دیں ورنہ میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ اسی زمانے میں اقبال کا رشتہ آ گیا۔" پروین خاموش ہو گئی۔ وہ شاید کسی کو اپنی کہانی سنا کر دل کا بوجھ اتارنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔

"اقبال سے شادی کے لئے کیسے تیار ہو گئیں۔" سلیم اقبال کے آنے سے

پہلے پہلے پوری کہانی جان لینا چاہتا تھا۔

"رشتہ آیا تو میں نے منع کر دیا تھا۔" پروین نے اپنی کہانی دوبارہ شروع کر دی۔ "لیکن اس دفعہ پہلی بار میری ماں نے مجھے مجبور کیا۔ یہ رشتہ آیا بھی میری ماں کے کسی جاننے والے کے ذریعے تھا۔ میں نے شرط رکھی کہ اس دفعہ فیصلہ میں خود کروں گی۔ اقبال سے اکیلے میں ملی تو مجھے لگا اس کے خلوص میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔" پروین کو اقبال سے اپنی پہلی ملاقات یاد آ گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔

"آپ کی شادی کب ہو رہی ہے۔" سلیم نے پوچھا تو پروین چونک کر اپنے خیالوں سے واپس آ گئی۔ لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ اسی طرح جمع رہی۔

"ہماری شادی پاکستان میں ہوگی۔ اقبال کی ضد ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کے بغیر شادی نہیں کریں گے۔ میرے کہنے پر پپا بھی مان گئے ہیں۔ شادی کے بعد جب تک اقبال کے کاغذات مکمل ہوں گے ہم پورے پاکستان میں گھومیں گے اور واپس آسٹریلیا آتے ہوئے انڈیا جائیں گے۔ ہم دونوں کو تاج محل دیکھنے کا بہت شوق ہے۔" پروین نے شرماتے ہوئے کہا۔

"آپ دونوں بہت خوش قسمت ہیں۔ اقبال بہت اچھا ہے۔ بہت خوددار اور بے حد محنتی ہے۔۔ وہ آپ کو بہت خوش رکھے گا۔" سلیم نے کہا اسی وقت سامان کے تھیلے لٹکائے ہوئے، اقبال داخل ہوگیا۔

"تم پروین سے میری کیا برائیاں کر رہے ہو؟" اقبال نے کچن میں سامان رکھ کر واپس ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہاری قسمت پر افسوس کر رہے تھے کہ کیسی بیوی ملی ہے جو ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتیں بنا رہی ہے اور مرد کچن میں کام کررہے ہیں۔ مجھے واقعی باورچی خانے میں جا کر مدد کرنی چاہیئے۔" پروین اٹھنے لگی۔

"ارے، نہیں نہیں تم بیٹھو۔ کھانا پکانے پر اب عورتوں کی اجارہ داری نہیں رہی۔ ظہور بھائی کے ہاتھ کا پکا کھاؤ گی تو اپنی اماں کا بنایا ہوا کھانا بھول جاؤ گی۔"

اقبال نے ہاتھ پکڑ کر پروین کو بٹھا دیا۔

"ٹھیک ہے تو میں میز لگا دیتی ہوں۔"

"وہ دیکھو یہ کام چودھری انور پہلے ہی کر چکا ہے۔" پروین نے دوسرے کونے میں بچھی ہوئی ڈائننگ ٹیبل کی طرف دیکھا تو وہ پہلے ہی سجی ہوئی تھی۔

"چلیں تو کھانے کے بعد برتن میں دھوؤں گی۔" پروین نے ہار نہیں مانی۔

"یہ میرا کام ہے۔ ظہور بھائی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیں گے۔" اقبال نے کہا۔ اسی وقت ظہور اور چودھری انور کچن سے نکل کر ان کی طرف آ گئے۔

"یہ ظہور بھائی کے ہاتھ کا کیا ذکر ہے۔" ظہور نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں پروین کو بتا رہا تھا کہ آپ کے ہاتھ میں کتنا مزا ہے۔ یہ شرمندہ ہو رہی ہیں کہ مرد کچن میں ہیں اور عورت ڈرائنگ روم میں۔" اقبال نے بتایا۔ چودھری بھی ایک صوفے پر سکڑ کر بیٹھ گیا۔ سلیم خاموش بیٹھا اپنی سوچوں میں گم تھا۔

"شرمندہ تو ہم ہیں جناب۔" ظہور نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے بچپن میں ایک مزاحیہ کالم نگار ہوتے تھے۔ شوکت تھانوی۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی "خدانخواستہ" جس میں عورتیں مردوں کا اور مرد عورتوں کا کام کرنے لگے تھے۔ عورتیں تیار ہو کر دفتر جاتیں اور مرد گھر میں بچوں کو پالتے اور کھانا پکاتے۔ ہم اس زمانے میں پڑھ کر بہت ہنسے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی اور سیارے کی مخلوق کا تذکرہ ہو۔ لیکن اب ہماری نظروں کے سامنے اور اسی دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اقبال میاں کی ہونے والی بیگم گاڑی چلا کر انہیں گھر لے جائیں گی اور برابر میں بیٹھے ہوئے اقبال انہیں بتائیں گے کہ انہوں نے آج کیا پکایا ہے۔" سب ہنسنے لگے۔

"یہ کہانی تو میں نے ویڈیو پر ایک پاکستانی ڈرامے میں دیکھی تھی۔" چودھری انور نے کہا۔

"چودھری صاحب آپ کو میں نے پہلے بھی بتایا تھا ٹی وی اور فلموں کے لکھنے والوں نے سارے چوروں کو مات کر دیا ہے۔ میں جب بھی کوئی پرانی انگریزی فلم دیکھتا ہوں کسی نہ کسی انڈین یا پاکستانی فلم کا چربہ لگتی ہے۔" ظہور مسکراتے ہوئے بولا۔

"پولیس نہیں........." چودہری انور کہتے کہتے خود ہی جھینپ کر خاموش ہو گیا۔ سب ہنسنے لگے۔

دعوت سے واپس آتے ہوئے سلیم کو اقبال کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ اس کا معاملہ کیسا چٹ پٹ طے ہو گیا تھا جبکہ سلیم بیٹھا ابھی تک لڑکیوں کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس نے طے کر لیا اگلے ہفتے سائرہ سے ہاں یا نہیں کا مرحلہ طے کرنے کے لئے کہے گا۔ نہیں کی صورت میں کوئی اور رہ گزار ڈھونڈے گا۔ یہ سوچ کر وہ اداس ہونے لگا۔ سائرہ کو چھوڑ جانے کا خیال دکھ دینے والا تھا۔ لیکن سلیم کی ترجیحات میں جذباتی تعلق کی جگہ پچھلی سیٹ پر تھی۔ اسے زیادہ اہم رشتے نباہنے تھے۔ کل جو خط آئے تھے انہوں نے اسے اور فکرمند کر دیا تھا۔ اس کی ماں کی صحت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ سلیم نے سوچا اسے منزل تک جلدی پہنچنا ہو گا۔

بلیو ماؤنٹین سے واپسی پر سائرہ کا فون خوشخبری لے کر آیا۔ اس نے ہفتے کے روز سلیم کو کھانے پر اپنے گھر بلایا تھا۔ سائرہ نے اس سے پہلے کبھی سلیم کو گھر آنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ سائرہ شاید ہاں کی منزل طے کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ سلیم نے سوچا۔ ہفتے کے روز سلیم اپنے دل کی دھڑکنیں سنبھالتا ہوا اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تو سائرہ کی مسکراہٹ میں اسے خاص اہتمام نظر آیا۔ وہ ایک نئی عمارت میں دوسری منزل کے دو بیڈ روم کے بہت کشادہ فلیٹ میں رہتی تھی۔ ڈرائنگ اور ڈائننگ روم بہت سادگی سے سجایا ہوا تھا۔ لیدر کے صوفے۔ ساتھ ہی ایک بک شیلف میں انسائیکلو پیڈیا کی جلدیں لگی ہوئی تھیں۔ دیوار پر ایک خوبصورت بچے کی تصویر کا فریم لگا تھا۔ اس کی پلکوں میں آنسو کا قطرہ اٹکا ہوا نہ ہوتا تو ہونٹوں کا پھیلاؤ ہنسی کی طرح لگتا۔ کسی مصور کے شاہکار کی چھپی ہوئی ری پروڈکشن تھی۔ کمرے کی تیز روشنی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ سلیم سے تنہا ملتے ہوئے سائرہ کو خوف آیا ہو گا۔ شاید اسی لئے اس نے ساری بتیاں جلائی ہوئی تھیں۔ سلیم کو صوفے پر بٹھا کر وہ اس کے لئے جوس لے آئی۔

"تم وعدہ کر کے نہیں ملے۔" سائرہ نے بھی ایک صوفے میں دھنستے ہوئے

کہا۔

"میں نے ملنے کا وعدہ کیا تھا؟ کب کہاں......؟" سلیم نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یوکلپٹس کے پتوں کی نیلاہٹ میں، آبشاروں میں، تین بہنوں کے بتوں کے پیچھے اور قدیم غاروں میں۔" سائرہ نے اس کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ وہ!" سلیم ہنسنے لگا۔ "میری ٹرین چھٹ گئی تھی۔ لیکن دیکھئے آج میں نے ٹرین نہیں چھوڑی۔ ٹھیک وقت پر پہنچا ہوں۔"

"آج کی ٹرین چھٹ جاتی تو زندگی بھر افسوس رہتا۔"

"سچ!" سلیم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"جی ہاں بالکل سچ۔ میں نے بگھارے بیگن بنائے ہیں۔ آج نہیں آتے تو پھر کبھی کھانے کو نہیں ملتے۔ تم بیٹھو میں ذرا چولہا دیکھ کر آتی ہوں۔" سلیم جانتا تھا وہ اس لمحے سے فرار حاصل کرنے کے لئے اٹھی ہے۔

"میں بھی تمہاری مدد کرتا ہوں۔" سلیم یہ لمحہ اپنے ساتھ ساتھ لئے اس کے ہمراہ چلتا ہوا ڈرائنگ اور ڈائننگ روم سے متصل کچن میں آگیا۔ بڑا سا کچن ہر طرح کے لوازمات سے مزین تھا۔ سائرہ ڈھکنے کھول کھول کر سالن دیکھنے اور چولہے بند کرنے لگی۔

"لگتا ہے تم نے ایک نہیں دس آدمیوں کی دعوت کی ہے۔" سلیم نے گہرا سانس لے کر کہا۔ کھانے کی خوشبو اس کی بھوک بڑھانے لگی تھی۔

"پانچ آدمیوں کا کھانا تمہیں باندھ کر دوں گی۔ باقی پانچ کا کھانا فیکٹری لے جاؤں گی۔ وہاں اس کھانے کے بھوکے بہت ہیں۔" سائرہ نے دیگچیوں سے ڈشوں میں کھانا ڈالتے ہوئے کہا۔

"اتنے بڑے فلیٹ میں تم اکیلی رہتی ہو۔" سلیم کو واقعی حیرت تھی۔

"جی نہیں۔ میرے ساتھ بہت سے بھوت اور بہت سی چڑیلیں رہتی ہیں جو

میرے خوابوں میں آ کر مجھے جگاتی' ڈراتی اور پورے فلیٹ میں دوڑاتی رہتی ہیں۔" سائرہ کے ہونٹوں پر وہی اداس مسکراہٹ سج گئی تھی جو اس کی شناخت تھی۔

"اسی لئے کہتا ہوں کسی کو اپنا لو یا کسی کی ہو جاؤ۔ سارے بھوت اور سب چڑیلیں ڈر کے بھاگ جائیں گی۔" سلیم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہٹو۔ میرے ہاتھ سے ڈش گر جائے گی۔ میں نے تمہیں ڈائیلاگ بولنے نہیں کھانا کھانے بلایا ہے۔" سائرہ نے خفگی دکھاتے ہوئے کہا۔ سلیم کو اس کی ناراضی مصنوعی لگی۔

"سوری۔ سوری" سلیم نے اسے چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ دونوں ڈشوں کو کھانے کی میز پر لا کر رکھنے لگے۔

"اس فلیٹ کا کرایہ کتنا ہے۔" سلیم نے حساب لگانا چاہا۔

"کچھ نہیں۔" سائرہ نے چاول کی ڈش میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں؟" سلیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تم شاید بھول گئے کہ میں ایک مالدار شخص کی بیوہ ہوں۔ یہ فلیٹ میں نے پورے پیسے دے کر خریدا تھا۔" سائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر کچھ خیال آتے ہی اس کی مسکراہٹ اداسی میں ضم ہو گئی۔ اس نے جلدی سے کچن میں جا کر چولہے پر توا رکھ دیا۔

"تم بیٹھو اور کھانا شروع کرو۔ میں تازہ روٹی ڈال کر آتی ہوں۔" سائرہ نے سلیم سے کہا۔ سلیم کو سائرہ کا قتل ہونے والا شوہر اکرم بٹ یاد آ گیا۔ تازہ روٹی کھانے والوں کا حشر اچھا نہیں ہوتا۔ اس نے سوچا۔

"نہیں ہم ساتھ کھائیں گے۔ تم پیڑے بیل کر روٹی توے پر ڈالو' میں سینکنے کے لئے چمٹا پکڑ لیتا ہوں۔ میں روٹی پکانے میں اپنی ماں کی اسی طرح مدد کرتا تھا۔" سلیم نے اس کے ساتھ کچن میں آتے ہوئے کہا۔ دونوں نے ساتھ مل کر روٹی پکائی اور پھر کھانے کی میز پر کھاتے ہوئے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے رہے۔ سائرہ اس کی نظروں سے بچنے کے لئے اپنی کہانی کے چھوڑے ہوئے گوشوں میں رنگ بھرنے

لگی۔

"مکان اور دکان بیچنے کے بعد کئی لاکھ ڈالر میرے حصے میں آئے تھے۔ حیدر آباد میں ماں کو حویلی خرید کردی تو اس کے نام ایک بڑی رقم بھی ڈپازٹ کر دی تھی۔ میں چاہتی ہوں اسے زندگی میں کم از کم پیسے کی تکلیف نہ ہو۔ واپس آئی تو یہ فلیٹ خرید لیا۔ کچھ پیسے پنشن فنڈ میں لگا دیئے تاکہ اگر بڑھاپا آئے تو تکلیف سے نہ گزرے۔ باقی پیسے ڈپازٹ کر دیئے ہیں۔ ان کا منافع واپس ڈپازٹ ہو جاتا ہے تنخواہ میرے تمام خرچ پورے کر کے بھی بچ جاتی ہے۔ عذرا کو ہر مہینے اس کا جیب خرچ بھیجتی ہوں۔ رفی سخت ناراض ہوتی ہیں۔ عذرا بھی کہتی ہے اسے ضرورت نہیں ہے۔ رفی اور رفی کی ماں اسے سب کچھ بے حساب دیتے ہیں۔ لیکن مجھے اچھا لگتا ہے۔ میری چھوٹی بہن میری ذمہ داری ہے۔" سائرہ چاول کے لقمے بنا کر کھاتے ہوئے سلیم کو بتا رہی تھی اور سلیم سوچ رہا تھا کہ سائرہ نے المیوں کے کھنڈرات پر خوشحالی کی جو عمارت بنائی تھی اس کی جڑیں کافی گہری ہیں۔ سائرہ کے سارے زخم اب تک بھر گئے ہوں گے۔

کھانا کھا کر دونوں نے ساتھ مل کر برتن سمیٹے۔ سائرہ برتن دھونے اور سلیم انہیں خشک کرنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب کھڑے تھے کہ ان کے کندھے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتے۔ ایسے ہر موقع پر سائرہ نل کی دھار تیز کر دیتی۔ اس کے جذبات پانی کے شور میں دب جاتے۔ لیکن سلیم برداشت کی حدیں پھلانگ چکا تھا۔ اس نے برتن خشک کرنے والا کپڑا ایک طرف ڈال کر سائرہ کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ سائرہ کے ہاتھ سے پلیٹ فرش پر گر کر ٹوٹ گئی۔ لیکن پلیٹ ٹوٹنے کا جھماکا ان کے جذبات کا رخ نہیں موڑ سکا۔ سائرہ کا سر سلیم کے سینے پر ٹک گیا۔ سلیم کو لگا جیسے سائرہ کی سانسوں کی گرمی سے اس کا سینہ موم کی طرح پگھل جائے گا۔ سلیم نے ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اٹھایا تو آنکھوں پر نشے کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ ادھ کھلے ہونٹوں سے موتی جیسے دانت چمک رہے تھے۔ سلیم نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر جما دیئے۔ سائرہ کو لگا جیسے برفانی تودے تڑخنے اور پگھل کر بہنے لگے

ہوں۔ وہ ایک جھٹکے سے سلیم سے الگ ہو گئی۔ بالکل اس طرح جیسے کسی خواب سے چونک اٹھی ہو۔

"نہیں سلیم نہیں۔ شادی سے پہلے نہیں۔" سائرہ نے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

"تم مجھ سے شادی کرو گی۔" سلیم نے الگ ہوتی ہوئی سائرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ سائرہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ سرہاں کا اشارہ دیتے ہوئے ہلنے لگا۔ سلیم نے اسے کھینچ کر پھر سینے سے چپکا لیا اور اس کے ہونٹوں کو اس طرح اپنے ہونٹوں کی گرفت میں لے لیا جیسے وہ ایک ہی گھونٹ میں سائرہ کے جسم کا سارا شہد چوس لے گا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کی جلدی سلیم کو تھی لیکن اصرار سائرہ نے کیا تھا۔ سائرہ کی جلدی کی وجہ یہ خوف تھا کہ جذبات میں بہہ کر وہ کوئی گناہ نہ کر بیٹھیں۔ اس رات اس نے طوفان کا رخ بہت مشکل سے موڑا تھا۔ سلیم ہی جذباتی نہیں ہو رہا تھا' نئے جذبوں سے آشنا ہو کر وہ بھی بے قابو ہونے لگی تھی۔ سلیم نے روشنی کم کرنے کے لئے بتیاں بجھانی شروع کی تھیں لیکن سائرہ نے اپنا بیگ اٹھا کر باہر کا دروازہ کھول دیا تھا۔

"آؤ چلیں باہر چل کر کافی پئیں گے۔" سلیم تھوڑی دیر خاموش کھڑا سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھی خاموشی سے اپنا کوٹ اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔ وہ براٹن لی سینڈ کے کافی شاپ میں ساحل اور ایئرپورٹ کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے رات گئے تک بیٹھے رہے تھے اور پھر دونوں وہیں سے الگ الگ ہو کر اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔

سائرہ کا کہنا تھا کہ اسلامی طریقے سے نکاح پڑھوائیں گے لیکن سلیم کا اصرار تھا کہ سول میرج کریں گے۔ عدالت میں جا کر شادی رجسٹرڈ کرائیں گے اور ایک دوسرے سے زندگی بھر ساتھ رہنے کا عہد و پیمان کریں گے۔ سمجھوتہ دونوں طرح کی شادی پر ہوا۔ سلیم نے کہا اس طرح بندھن زیادہ پائیدار ہو جائے گا۔ دوسرے دن صبح انہوں نے سول میرج کر لی۔ سائرہ کو الجھن تھی کہ سلیم سول میرج پر اصرار کیوں کر

رہا ہے لیکن سلیم نے اسے سمجھایا تھا۔

"اس طرح امیگریشن کے لئے کاغذی کارروائی آسان ہو جائے گی۔ ورنہ حکومت سے منظور شدہ نکاح خواں ڈھونڈنا پڑے گا۔ رسمی کارروائیوں میں بھی دیر لگے گی۔" سائرہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلا دیا تھا۔ لیکن اس نے نکاح ہونے تک سلیم کو ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ نکاح سائرہ کے گھر ہوا۔ ظہور کو دلہن کا سرپرست بنا دیا گیا تھا۔ سائرہ نے اپنے دفتر میں کام کرنے والی تینوں لڑکیوں، تھامس اور فیکٹری کے مالک کو بلوایا تھا۔ سلیم کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ چوہدری انور کے علاوہ اور کس کو بلائے۔

اقبال چند دن پہلے پروین کو لے کر شادی کرنے پاکستان چلا گیا تھا۔ مشتاق بھی سڈنی میں نہیں تھا۔ چوہدری انور کے یاد دلانے پر اسے منظر یاد آیا۔ وہ کچھ عرصے پہلے ہی پاکستان سے شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد سلیم نے ایوان اور اس کے بوائے فرینڈ بابی کو بھی بلا لیا۔ نکاح ظہور کے ایک جاننے والے نے پڑھایا۔ مولانا لیور پول سے آئے تھے وہ حکومت کے منظور شدہ نہیں تھے لیکن سلیم کو پرواہ نہیں تھی۔ اسے اب مزید کسی کاغذی کارروائی کی ضرورت نہیں تھی۔ سول میرج کے کاغذات وہ ایک وکیل کو کیس فائل کرنے کے لئے اسی روز دے آیا تھا۔

سائرہ بہت خوبصورت اور پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کی دوست اسے بیوٹی پارلر سے تیار کرا کے لائی تھی۔ شادی نے اس کے چہرے پر جو قدرتی نکھار پیدا کیا تھا میک اپ نے اسے اور ابھار دیا تھا۔ بال لچھے دار اور کچھ گھنگریالے سے ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی ایک لٹ ماتھے پر بھی جھولنے لگتی۔ منظر نے کہا تھا وہ اپنی بیوی کا شادی کا جوڑا لے آئے گا۔ لیکن سائرہ نے منع کر دیا تھا۔ اس نے وہی لال بنارسی ساڑھی پہنی تھی جس میں لپٹ کر وہ پہلی بار آسٹریلیا آئی تھی۔ یہ ساڑھی وہ پل تھی جس سے گزر کر وہ ماں اور روشن تک پہنچ جاتی تھی۔ آج اسے پھر ماں کی دعائیں چاہئیں تھیں۔ ساڑھی کا پلو سر پر لیا تو ایسا لگا جیسے ماں سر پر ہاتھ پھیر رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں

آنسو چھلک آئے جو اس نے فوراً پونچھ دیئے۔ خوشی اور غم ہر موقع پر آنسو ابلنے لگتے تھے۔ اس نے سوچا یہ عادت اب بدلنی ہو گی۔

سلیم نے بھی شادی کے لئے نیلے رنگ کا نیا سوٹ خریدا تھا۔ منظر پھولوں کے ہار بنوا کر لایا تھا۔ چودہری انور نے ضد کر کے اس میں کچھ نوٹ بھی پرو دیئے تھے۔ ہار پہنے صوفے پر بیٹھا ہوا سلیم خود اپنے آپ کو بیوقوف لگ رہا تھا۔ سب سے زیادہ پرجوش ایوان نظر آ رہی تھی۔ وہ سائرہ کا پلو نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اس کے چہرے اور بالوں کو ہاتھ لگا کر بار بار پوچھتی۔ "کیا یہ سچ مچ کے ہیں۔" نکاح کے بعد چھوارے تقسیم ہوئے جو چوہدری انور کسی لبنانی دکان سے تلاش کر کے لایا تھا۔ سب نے تالیاں بجائیں اور تھامس نے "دلہن کو پیار کرو" کا نعرہ لگایا تو سب Kiss the bride کے کورس میں شامل ہو گئے۔ ظہور نے اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے ہوئے انہیں بتایا ان کے ملک میں دولہا دلہن کمروں میں چھپ کر پیار کرتے ہیں۔ اس نے انہیں پاکستان اور بھارت کی شادیوں کی روایتیں سنائیں اور یہ بتایا کہ دولہا دلہن پہلی بار ایک دوسرے کا چہرہ آئینے میں دیکھتے ہیں تاکہ جسے بے ہوش ہونا ہے وہ پہلے ہو جائے۔ آسٹریلوی مہمانوں کی تواضع کے لئے منظر کی بیوی نے آرسی مصحف کی رسم ادا کرنے کا مظاہرہ کیا۔ دونوں کے سروں پر دوپٹہ ڈال کر درمیان میں آئینہ رکھ دیا گیا تھا۔ سائرہ آئینے میں سلیم کا چہرہ دیکھ کر سچ مچ شرما گئی۔ ایوان اپنا چہرہ درمیان میں گھسائے ہوئے تھی۔ تھوڑی دیر میں آئینے میں صرف اسی کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ دوپٹہ اور آئینہ ہٹا کر سب نے تالیاں بجائیں اور ایوان کو مبارکباد دی کہ شادی کا اگلا نمبر اب اسی کا ہے۔ لیکن جس کے ساتھ اس کی شادی ہونی تھی وہ سائرہ کی فیکٹری میں کام کرنے والی ایک لڑکی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

کھانے کا انتظام حسب روایت ظہور کے ذمے تھا۔ اس نے اپنے ریسٹورنٹ کے تندور میں نان اور چکن تکے بنوائے تھے۔ بریانی اور قورمہ گھر میں پکایا تھا۔ چودہری انور کے ذمہ سلاد اور کھانے کی ٹرانسپورٹیشن کا کام تھا۔ منظر کی بیوی زردہ پکا کر لائی تھی۔ آسٹریلوی مہمانوں کے لئے شادی کا مزا دوبالا ہو گیا سب کا خیال تھا اتنا

اچھا کھانا انہوں نے کسی انڈین پاکستانی ریسٹورنٹ میں بھی کبھی نہیں کھایا۔ تھامس کی بیوی اپنے ہاتھ سے کیک بنا کر لائی تھی۔ کیک کھاتے ہوئے سب مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے۔ بابی اب بھی سائرہ کی فیکٹری میں کام کرنے والی لڑکی کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ مشترکہ دلچسپی وہ اسکول تھا جہاں سے دونوں نے ہائی اسکول پاس کیا تھا۔ فیکٹری کا مالک سلیم سے اس کے مستقبل کے منصوبے پوچھ رہا تھا۔ منظر کی بیوی سائرہ سے لگی ہوئی اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ظہور اور منظر دونوں لڑکیوں اور تھامس کی بیوی کو پاکستان میں ہونے والی شادیوں کے قصے سنا رہے تھے۔ سب سے دلچسپ جوڑا تھامس اور ایوان کا تھا۔ تھامس شکایت کر رہا تھا کہ اس نے ایسی خشک دعوت نہیں دیکھی جس میں بیئر تک منع تھی۔ لیکن پئے بغیر بھی اس نے ایوان کو اپنی مشہور کہانیوں میں سے ایک سنا دی۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مقابلہ ایوان سے ہے جس نے تھامس کی کہانی بہت تحمل کے ساتھ سنی۔ لیکن اس سے پہلے تھامس کوئی دوسرا قصہ شروع کرتا ایوان کی ریل گاڑی دوڑ پڑی۔ تھامس کو وہاں سے کھسکنے یا بیچ میں ٹوکنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

ایوان نے اپنے قصے "ہنٹر ویلی" سے شروع کئے تھے جہاں اس کے سابقہ بوائے فرینڈ نے وائن پینے کے مقابلے میں ایک جرمن سیاح کو مات دی تھی۔ تھامس زور زور سے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی جرمن شراب نوشی کا مقابلہ ہار ہی نہیں سکتا۔ ایوان کو مغالطہ ہوا ہو گا۔ وہ سیاح جرمن نہیں کسی اور نسل کا ہو گا۔ لیکن تھامس کو احتجاج کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایوان نے بریک مارے بغیر موڑ کاٹا تھا اور اب اپنی گلے لگاؤ تحریک کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"آپ کو معلوم ہے گلے لگنا کتنا ضروری ہے۔ گلے لگتے ہی جسم کا سارا تناؤ ختم ہو جاتا ہے۔ اعصاب اور عضلات سب آرام دہ پوزیشن میں چلے جاتے ہیں۔ ہر بار گلے ملنے سے عمر میں ایک دن کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ تحقیق نے بھی ثابت کر دیا ہے دن میں کم از کم آٹھ بار گلے ملنا ضروری ہے۔ ہماری "گلے لگاؤ تحریک" میں شامل ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ یہ تعداد پوری کرے اور ہر روز کم از کم آٹھ دفعہ گلے ملے۔

تحریک کو پھیلانے کے لئے ہم ہر بار کسی نئے شخص سے گلے ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اکیلی ہوتی ہوں تو اپنے آپ سے گلے ملنے لگتی ہوں۔ آج میں اب تک سات لوگوں سے گلے مل چکی ہوں۔ میرا آخری معانقہ ابھی باقی ہے۔"

ایوان نے چند سیکنڈ کے لئے رک کر کچھ سوچا اور پھر بولی "چلیں آج کے آخری معانقے کا اعزاز آپ کو دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر ایوان موٹے تھامس کے گلے لگ گئی۔ تھامس کی بیوی جو ظہور کا بیان سنتے ہوئے بار بار کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی تیزی سے آئی اور تھامس کا ہاتھ کھینچ کر لے گئی۔ تھامس کی جان میں جان آئی۔ لیکن ساتھ ہی بیوی کے خوف سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ایوان صرف کندھے اچکا کر رہ گئی۔ اسی وقت فیکٹری کے مالک نے گلاس پر چمچہ بجا کر سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

"آج مجھے اپنی شادی کی رات یاد آ رہی ہے۔ شیمپین اور لیموزین کی سیر نے اسے یادگار بنا دیا تھا۔ لیموزین کی آرامدہ خلوت میں شمپین پیتے ہوئے ہم نے پورا شہر گھوما تھا۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں جب شہر کو دیکھا تو وہ بالکل نیا اور زیادہ خوبصورت نظر آیا تھا۔ نیچے ایک لیموزین انتظار کر رہی ہے۔ شیمپین کی بوتل بھی برف میں جمی ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے سالیم اور سارا کو حجلہ عروسی میں جانے سے پہلے لیموزین کی سیر پسند آئے گی۔" سب نے تالیاں بجا کر اس تحفے کی تعریف کی۔ تالیوں کی گونج ختم ہوتے ہی ظہور نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔

"سلیم کی زندگی میں کوجی بیچ ایک اہم مقام ہے۔ کسی کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر ٹہلنا ہو، کسی کو شادی کا پیغام دینا ہو، اعصاب کا تناؤ ٹھیک کرنا ہو، کوئی اہم فیصلہ کرنا ہو اور کچھ نہ بھی کرنا ہو صرف منڈیر پر بیٹھ کر نہاتے ہوئے خوبصورت لوگوں کو دیکھنا ہو تو ہمارا شہزادہ کوجی بیچ کا رخ کرتا ہے۔ شادی کی رات کو یادگار بنانے کے لئے ہم نے کوجی بیچ کے ہالیڈے ان میں سمندر کے رخ کا ایک سوئیٹ بک کرایا ہے۔ چودھری انور اور میری طرف سے شادی کا یہی ناچیز تحفہ ہے۔" سب نے پھر تالیاں بجائیں۔

سب سے زور کی تالیاں ایوان نے بجائیں۔ وہ جانتی تھی اس نے ساحل پر سلیم کے ساتھ کئی شامیں گزاری تھیں۔ ایوان تحفے میں دینے کے لئے پرفیوم لائی تھی، لیکن اس نے کوئی تقریر نہیں کی۔ بس سائرہ کو گلے سے لگا کر پیار کیا۔ سلیم کو گلے لگا کر اس کے رخسار پر بھی بوسہ دیا۔ سلیم پہلے دن کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جو جو اس کے رستے میں آیا ان سے گلے ملی تھی۔ تھامس ڈر کے مارے پیچھے کھسک گیا تھا۔ سائرہ کی ساتھی لڑکیاں گلابی رنگ کا بہت خوبصورت نائٹ گاؤن لے کر آئی تھیں جبکہ منظر نے الارم کلاک دیا اور کہا "شادی کے بعد صبح اٹھنا سب سے مشکل کام ہے۔ یہ الارم تمہیں نوکری کے لئے لیٹ نہیں ہونے دے گا۔ تم نے ہاتھ مار کر بند کر دیا تو ایک منٹ بعد پھر بولنے لگے گا۔ "منظر کی بیوی خوامخواہ شرمانے لگی۔

دولہا دلہن کو جلوس کی شکل میں نیچے لا کر لیموزین میں سوار کر کے سب رخصت ہو گئے۔ فیکٹری کے مالک نے غلط نہیں کہا تھا۔ لیموزین میں شہر کی سیر بہت اچھی رہی ۔ ڈارلنگ ہاربر کی رنگ برنگی روشنیاں ٹھہرے ہوئے پانی کی لہروں سے ہم آغوش تھیں تو آپیرا ہاؤس کی روشنیاں سایوں کے ساتھ رقص کر رہی تھیں۔ ہاربر برج سے شمال کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر ستارے جگنوؤں کی سواری کر رہے تھے سلیم برف میں دبی ہوئی شیمپئن کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔ سوچا تھا ایک گھونٹ لے لے لیکن پھر سائرہ کے خیال سے ہاتھ نہیں لگایا۔ شہر کی سیر سائرہ کو بھی اچھی لگی لیکن اپنے حجلہ عروسی کی کھڑکیوں سے سمندر کو دیکھنا زیادہ اچھا لگا۔ سائرہ اپنی گلابی نائٹی پہنے سلیم کے کندھوں سے سر ٹکائے سمندر کی موجوں کو تک رہی تھی جنہوں نے پانی میں ڈوبے ہوئے چاند کو اپنی ٹھوکروں پر رکھا ہوا تھا۔

"کاش ہم آج کی رات ویڈنگ کیک آئی لینڈ پر گزار سکتے۔" سلیم سائرہ کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے نشیلے ڈوروں سے بے خبر نصف ڈوبے ہوئے آئی لینڈ کی ویرانی میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہم سمندر میں نہیں اس کمرے کی تنہائیوں میں ڈوبیں گے۔" سائرہ یہ کہہ کر خود ہی شرما گئی اور اس کے چہرے کی رنگت میں بھی گلاب کھلنے لگے۔ اس نے غلط

نہیں کہا تھا وہ واقعی ڈوب گئی تھی۔ سلیم جو اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے بستر پر بے سدھ پڑی ہوئی سائرہ کو بھول گیا تھا' پریشان ہو گیا۔ سائرہ کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں اور ہونٹ بالکل برف ہو گئے تھے۔ اس نے سائرہ کے گالوں کو تھپ تھپا کر اسے واپس لانے کی کوشش کی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ سلیم نے اس کے بدن کو جھنجوڑا اور اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹوں کو گرمانے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ ایک جھٹکا لے کر چونک پڑی۔ چڑھی ہوئی آنکھیں اور ہونٹوں کی گرمی واپس آ گئی تھی۔ حواس میں آئی تو اپنے اوپر جھکے ہوئے سلیم کو دیکھ کر سکڑ گئی اور بستر کی سفید چادر سے اپنا بدن ڈھانپنے کی کوشش کر کے شرمانے لگی۔

دوسری صبح سائرہ کو منظر کے دیئے ہوئے الارم کی کرخت آواز ہی جگا سکی تھی۔ سلیم پہلے سے اٹھا ہوا تھا اور بالکونی میں کھڑا ہوا سمندر پر نظریں گاڑے کسی اور دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ سائرہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فرش سے نائٹی اٹھا کر بھاگتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی۔ سلیم کی نظروں کا سامنا کرتے ہوئے اسے شرم آ رہی تھی۔ انہیں جلد ہی تیار ہو کر ہوٹل چھوڑنا تھا۔ دوپہر کو ہیملٹن آئی لینڈ کے لئے ان کی فلائٹ تھی۔ اس سے پہلے انہیں گھر جا کر سامان بھی پیک کرنا تھا۔ ہیملٹن آئی لینڈ میں تین دن گزارنے کا تحفہ سائرہ نے خود اپنے آپ کو دیا تھا۔ یہ تین دن دونوں کے لئے زندگی کے بہترین دن تھے۔ سلیم نے کشمیر نہیں دیکھا تھا لیکن اسے تو یہ جزیرہ زمین پر بنی ہوئی جنت لگا تھا۔ جزیرے کی خوبصورتی اور اس سے زیادہ سائرہ کی مسلسل بڑھتی ہوئی گرمجوشی نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ سائرہ نے تو واپس آ کر بتایا تھا کہ اس کے پاس ان تین دنوں کے سوا کچھ نہ رہے تب بھی اسے زندگی سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔

شادی کا ہفتہ گزر جانے کے بعد کام کی چکی میں پسنے کے لئے دونوں پھر فیکٹری جانے لگے۔ فیکٹری میں پوری گنجائش کے ساتھ کام شروع ہو گیا تھا۔ سلیم جو شادی کے بعد رخصت ہو کر سائرہ کے فلیٹ میں آ گیا تھا اب شام چار بجے تک کام کرتا جبر

کے بعد ایک گھنٹہ ادھر ادھر گزار کر سائرہ کی چھٹی ہونے کا انتظار کرتا۔ دونوں ساتھ گھر واپس آتے۔ سلیم ٹی وی دیکھتا' سائرہ کھانا بناتی' کبھی کھانے کے بعد کافی پینے نکل جاتے یا گھر بیٹھے ٹی وی دیکھتے۔ سائرہ کو جلدی بستر پر جانا پسند تھا۔ شروع شروع میں سلیم بھی سائرہ کے اٹھتے ہی اس کے ساتھ خوابگاہ کا رخ کرتا۔ لیکن پھر اس نے ٹی وی کی فلم ختم ہوئے بغیر اٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ سائرہ اس کے آنے تک بستر میں لیٹی جاگتی رہتی اور بستر میں آتے ہی سلیم کو اپنے بدن میں سمیٹ لیتی۔ سائرہ کو اپنی جوانی کے گزرے ہوئے خالی دنوں کا حساب پورا کرنا تھا۔ شادی کا پہلا پورا مہینہ ہنی مون بن کر گزرا۔ اس عرصے میں ان کے چھوٹے چھوٹے دو جھگڑے ہوئے تھے۔ ایک ہفتہ کی صبح موسم خراب تھا' سلیم کا دو بسیں بدل کر حلال گوشت کی دکان تک جانے کا موڈ نہیں تھا وہ محلے کے قصاب سے گوشت خرید لایا۔ سائرہ کو معلوم ہوا تو اس نے ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔

سلیم سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن سائرہ کی ضد نے اس کا غصہ بڑھا دیا۔

"ان چیزوں سے کب تک اور کہاں تک بچو گی۔ روم میں رہنا ہے تو رومیوں کی طرح رہو۔" سلیم نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں اسکرٹ پہنتی ہوں' پتلون پہننے لگی ہوں' میں نے بال کٹوا دیئے ہیں' اب اس سے زیادہ رومن نہیں بن سکتی۔ حرام کو حلال سمجھ کر نہیں کھا سکتی۔ کل تم کہو گے رومیوں کی طرح شراب بھی پینے لگوں۔"

"حرج بھی کیا ہے۔" سلیم نے اپنے غصے کو مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے کہا۔ لیکن سائرہ کا پارہ چڑھ گیا۔

"کبھی چکھی بھی تو قریب نہیں آنے دوں گی۔"

"وعدہ؟" سلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس نے سوچا ایک فضول بات پر جھگڑے کا فائدہ بھی کیا۔ سائرہ بھی روہانسی ہو کر ہنسنے لگی تھی۔ سلیم نے گوشت اٹھا کر کچرے کے ڈبے میں ڈالا اور سائرہ کو لے کر مایا کے انڈین چاٹ ہاؤس چلا گیا۔ دونوں نے چٹخارے لے کر پانی پوری اور گول گپے اور اس کے بعد گرم گرم پوری چھولے کھائے

اور آم کی لسی پی کر فلم دیکھنے شہر کی طرف چلے گئے۔

ایک دن سائرہ نے سلیم کو پانچ پانچ ہزار انڈین روپوں کے تین ڈرافٹ بنوانے کے لئے پیسے دیئے۔

"یہ پیسے کسے بھیج رہی ہو۔" سلیم نے حیرانی سے پوچھا۔

"میرے شہر کے کچھ ضرورتمند خاندان ہیں۔ انہوں نے مجھے لکھا تھا۔" سائرہ نے جواب دیا۔

"ہم جس بستی میں رہتے تھے میری ماں اسے بھولی نہیں ہے۔ وہاں جاتی رہتی ہے۔ بہت غریب بستی ہے۔ کسی کو جب ضرورت ہوتی ہے وہ ماں سے میرا پتہ لے کر خط لکھتے ہیں۔ بعض خط اتنے دکھ بھرے ہوتے ہیں کہ تم پڑھو تو رو پڑو۔" سائرہ نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔

"تم کوئی پوچھ گچھ کئے بغیر خط پڑھتے ہی انہیں پیسے بھیج دیتی ہو۔" سلیم کو غصہ آ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی اپنی جیب پر ڈاکہ پڑ رہا ہو۔

"مجھے کسی پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان کے ساتھ ایک زمانے تک غربت کے رشتے میں بندھی رہی ہوں۔ میں ان کے ایک ایک دکھ کو جانتی ہوں۔" شادی کے بعد پہلی بار سائرہ کی آنکھوں میں اداسی کی پرانی لہر لوٹ آئی تھی۔

"تمہارا خیال ہے تمہارے پانچ پانچ ہزار روپے کے یہ ڈرافٹ ان کی غربت دور کر دیں گے۔ یہ ایک بستی کیا ایک خاندان کی غربت بھی دور نہیں کر سکتے۔ یہ ایک نہ جیتنے والی لڑائی ہے۔" سلیم کا احتجاج جاری تھا۔

"میں کوئی لڑائی نہیں لڑ رہی۔ میری لڑائی لڑنے کی حیثیت ہی نہیں ہے۔ میرے لئے تو یہی کافی ہے کہ میرے چند ٹکے کسی کا ایک آنسو پونچھ دیں یا کسی کو ایک مسکراہٹ خرید کر دے دیں۔" سائرہ نے بہت سادگی سے کہا۔

"تمہاری مرضی۔ یہ تمہاری دولت ہے۔ اسے جس طرح چاہے لٹاؤ۔" دلیل ہارنے کے بعد سلیم نے طنز کا ہتھیار استعمال کیا۔

"ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ میرا یا تمہارا نہیں، ہمارا ہے۔ اس میں سے تم کتنا

اور کسی کے لئے بھی استعمال کرو گے میں تم سے کوئی سوال تک نہیں پوچھوں گی۔"
سائرہ کی آنکھوں میں دکھ ابھر آیا تھا۔ سلیم شرمندہ ہو گیا۔ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ وہ سائرہ کو گلے سے لگا کر اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ سائرہ ساری گفتگو بھول کر محبت کے سمندر میں ڈوب گئی۔

سائرہ کو سلیم سے شکایت تھی کہ اس نے کراچی فون کر کے اپنی ماں سے اس کی بات نہیں کرائی۔ انہیں بتایا تک نہیں۔ سلیم کہتا تھا اس کی ماں بیمار ہے وہ شادی کی اطلاع دے کر انہیں اچانک صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا۔ پہلے جا کر انہیں منائے گا۔ اس کے بعد شادی کا انکشاف کرے گا۔ سائرہ نے انڈیا فون کر کے اپنی ماں سے سلیم کی بات کرائی تھی۔ سلیم کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کہے۔ اس یک طرفہ گفتگو میں سائرہ کی ماں "جیتے رہو۔ سدا خوش رہو۔" کی دعائیں دیتے ہوئے روتی رہی تھی۔ سائرہ نے لندن فون کر کے عذرا کو بھی بتایا تھا جس نے یقیناً" مسز چنائے کو بتایا ہو گا۔ عذرا سے بات کرنے کے ایک ہفتے بعد انہیں اسپیشل کوریر کے ذریعے تحفوں کا پیکٹ وصول ہوا تھا۔ تحفے دیکھ کر سلیم حیرت سے گنگ رہ گیا۔ سلیم کے لئے سونے کی رولیکس گھڑی اور سائرہ کے لئے چھوٹے سے ہیرے کی ایک انگوٹھی تھی۔ سائرہ نے بڑے فخر سے انگوٹھی اپنے ہاتھ کی درمیانی انگلی میں ڈالی تو اس کے برابر کی انگلی میں سلیم کی دی ہوئی شادی کی انگوٹھی شرمندہ ہونے لگی۔ تحفے کے ساتھ کارڈ تھا جس پر لکھا تھا "بیٹی بنی ہوئی ماں کے لئے ماں بنی ہوئی بیٹی کی طرف سے" سائرہ کو ایک بار پھر حیرت ہوئی کہ رنی نے مختصر وقت کے ایک اتفاقی تعلق کو رشتے کی کتنی مضبوط ڈور بنایا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ رنی کے لئے یہ رشتہ کتنا اہم تھا۔ رنی کے پاس اس کی اپنی ماں کے علاوہ صرف یہی ایک رشتہ تھا جس کے پیڑ سے رشتوں کی کئی شاخیں نکلی ہوئی تھیں۔ اپنے بنائے ہوئے ان رشتوں سے رنی کو اپنی جڑیں بھی زمین میں گڑی ہوئی لگتیں۔

شادی کو تین مہینے گزر گئے تھے، ابھی تک اس کے کیس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا

تھا۔ اس کے وکیل نے بتایا تھا کہ اسے آسٹریلیا سے باہر نکل کر دوبارہ آنا پڑے گا، لیکن ابھی تک وکیل نے کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ سلیم کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اکثر راتوں کو سائرہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو جاتی لیکن سلیم رات گئے تک ٹی وی دیکھتا رہتا۔ صبح دیر سے اٹھتا اور فیکٹری میں بھی اکثر دیر سے پہنچتا تھا۔ تھامس اسے کئی بار وارننگ دے چکا تھا۔ سلیم کا رویہ کام کے سلسلے میں بدل گیا تھا۔ اس کے کام میں وہ لگن باقی نہیں رہی تھی جس کی وجہ سے وہ تھامس کا پسندیدہ آپریٹر بنا تھا۔ انداز میں لاپرواہی آگئی تھی۔ ایک دن جا کر مالک سے بھی لڑ آیا تھا۔ تھامس دو ہفتے کی چھٹی پر جا رہا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں ایک اور آپریٹر کو قائم مقام سپروائزر بنایا گیا تھا۔ سلیم کا خیال تھا وہ سب سے کوالیفائیڈ ہے۔ قائم مقامی اس کا حق تھا۔ مالک نے بتایا تھا کہ یہ فیصلہ تھامس کر کے گیا تھا۔ سلیم کا خیال تھا تھامس اس کے تعلیم یافتہ ہونے سے جلتا اور اسے آگے بڑھنے سے ڈرتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو مالک چھٹی کر دیتا۔ لیکن اسے سائرہ کا لحاظ تھا۔ پھر سلیم اس کا بہت اچھا کارکن رہا تھا اس لئے اس نے سلیم کے رویئے کو نظر انداز کر دیا۔ چھٹی سے واپس آکر تھامس کو معلوم ہوا تو اس نے سلیم کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن سلیم نے اسے بتایا تھا کہ وہ جلد ہی انہیں کسی بڑے پروجیکٹ پر انجینیئر بن کے دکھائے گا جہاں تھامس جیسے درجن بھر لوگ اس کے ماتحت ہوں گے۔ اس نے دل میں سوچا بس ذرا میرے پاسپورٹ پر ٹھپہ لگنے دو۔ تھامس نے اس کی بات کو مذاق میں اڑا دیا تھا لیکن سلیم کو تشویش بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ اس طرح کے رویئے کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سلیم اس فیکٹری میں اب چند دنوں کا مہمان ہے۔

سائرہ فیکٹری میں سلیم کے معاملات سے بے خبر تھی۔ وہ تو سینے میں ایک خوشخبری چھپائے ہوئے اس لمحے کے انتظار میں تھی کہ کب تصدیق ہو گی اور کب وہ سلیم کو زندگی کی سب سے خوش کرنے والی خبر سنائے گی آج کل وہ اپنے گھر کی دیوار پر لگی ہوئی بچے کی تصویر کے فریم کو بہت احتیاط سے صاف کرنے لگی تھی۔ اسے بچوں کی پلکوں میں اٹکا ہوا آنسو خوشیوں بھرا موتی اور ہونٹوں کے پھیلاؤ میں زمانے بھر کی

ہنسی مجسم نظر آتی۔ جس روز ڈاکٹر سے اسے ٹیسٹ کی رپورٹ ملنے والی تھی اسی روز سلیم کو بھی اس کے وکیل نے بلایا تھا۔ لنچ ٹائم میں وہ رپورٹ لے کر آئی تو ہوا میں اڑ رہی تھی۔ رپورٹ نے تصدیق کر دی تھی کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ اس سے دفتر کا باقی وقت نہیں گزر رہا تھا۔ وہ رات کو جب سلیم کو یہ خبر سنائے گی تو وہ خوشی سے اچھلتا پھرے گا۔ اس روز سلیم بھی ہوا میں اڑتا ہوا گھر آیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ایک ہی جست میں گھر پہنچ کر سائرہ کو بتائے کہ اس کا کیس فائنل ہو گیا ہے۔ سلیم جاتے ہوئے گلاب کے پھول خرید کر لے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا سائرہ کو پھول کتنے پسند ہیں۔ پھول دے کر اس نے سائرہ کو لپٹا لیا اور سائرہ سوچنے لگی سلیم کو کیسے معلوم ہو گیا۔

''آج میری زندگی کا سب سے خوشی کا دن ہے۔ میرے پاس ایسی خوشخبری ہے کہ تم سنو گی تو اچھل پڑو گی۔'' سلیم کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

''میری پاس زیادہ بڑی خوشخبری ہے۔ تم سنو گے تو خوشی سے پھول جاؤ گے۔'' سائرہ کی مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے پہلے تم سناؤ۔'' سلیم نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں پہلے آپ۔'' سائرہ اٹھلائی۔

''ٹھیک ہے۔ میں لکھنوٴ کا نہیں ہوں اس لئے پہلے میں بتا دیتا ہوں۔ میرا کیس منظور ہو گیا ہے۔ مجھے نیوزی لینڈ جا کر آنا ہے' اس کے بعد مجھے کسی کی بکواس سننے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں جو چاہوں گا کر سکوں گا اور سب کچھ صرف تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے میری بن کے مجھے کیا بنا دیا ہے۔'' سلیم واقعی سائرہ کا احسان مند تھا۔ اسے خیال تھا سائرہ بھی سنتے ہی اچھل پڑے گی۔ لیکن وہ تو صرف پلکیں جھپکا رہی تھی۔

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔'' سلیم کو مایوسی ہوئی کہ سائرہ نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

''اس میں اتنا خوش ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔'' سائرہ کو واقعی

مایوسی ہوئی تھی۔ اس کے لئے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ سلیم سوچنے لگا کاش وہ سائرہ کو بتا سکتا کہ یہ ایک مسئلہ حل ہونے سے اس کی زندگی کے کتنے بڑے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ لیکن اسے خیال آیا کہ اسے اپنی خوشی کا اتنا بھرپور اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سائرہ قانونی غیر قانونی کے مسئلوں سے زیادہ واقف نہیں تھی۔

"مجھے واقعی بہت خوشی ہے۔" سائرہ نے سلیم کے قریب آکر اس کے گالوں کو چومتے ہوئے کہا۔ سلیم اتنا خوش تھا تو اسے بھی خوش ہونا چاہئے تھا۔ "تم نیوزی لینڈ کب جاؤ گے۔" سائرہ سلیم کی گود میں ہی بیٹھ گئی اور اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ امید بھری نظروں سے سلیم کے ہونٹوں کو دیکھنے لگے۔ ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی اپنی خوشخبری سلیم کو ابھی نہیں بتائے گی۔ نیوزی لینڈ سے واپس آنے کے بعد بتائے گی۔ سلیم کو اس وقت اپنی خوشی کا مزا لینے دے گی۔ چند دنوں کی ہی تو بات ہے۔

"کل یا پرسوں۔ سیٹ اور ویزا ملنے پر۔" سلیم نے سائرہ کے ہونٹوں کا اچھلتا ہوا بوسہ لے کر اسے گود سے ہٹا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہاری خوشخبری کیا ہے۔" وہ کچھ بجھ سا گیا تھا۔

"میں کار خرید رہی ہوں۔ اب ہمیں بسوں اور ٹرینوں کے دھکے نہیں کھانے پڑیں گے۔" سائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نیوزی لینڈ سے آؤ گے تو ہم ایئرپورٹ سے اپنی کار میں گھر آئیں گے۔" سائرہ نے اسی وقت فیصلہ کیا تھا۔

"یہ کیا خوشخبری ہوئی۔" سلیم نے بدلہ چکایا۔ "گاڑی تمہیں لینی ہی تھی۔ کب سے ڈرائیونگ ٹیسٹ پاس کئے بیٹھی ہو۔" اسے واقعی مایوسی ہوئی تھی۔ اسے ریل اور بسوں کے سفر کی عادت تھی۔ کار ہونا یا نہ ہونا اس کا اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اسے کسی اور خبر کی توقع تھی۔ کس خبر کی۔ یہ نہیں معلوم۔ شاید مالک نے اسے فیکٹری کا منیجر بنا دیا ہو۔ لیکن اس نے اپنی مایوسی چھپالی۔

"چلو کپڑے بدل لو۔ آج تمہاری نئی کار کی خوشی باہر کھانا کھا کر منائیں گے۔" سلیم نے تھوڑی سی خاموشی کے بعد کہا۔ سائرہ کی خوشی سے اسے بھی خوش ہونا چاہئے تھا۔

"تمہاری نہیں ہماری۔" سائرہ نے کہا۔ "لیکن کھانا کار کی نہیں تمہارا کیس منظور ہونے کی خوشی میں کھائیں گے۔" سائرہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں کی خوشخبریاں ایک دوسرے کے لئے غیر اہم تھیں۔ پھر بھی انہوں نے ایک دوسرے کو خوش کرنے کے لئے ان خوشخبریوں کا جشن منایا۔

"کل ہم مٹھائی لے کر ظہور بھائی اور انور بھائی کو تمہاری خبر سنانے جائیں گے۔" واپس آتے ہوئے سائرہ نے سلیم سے کہا۔

"نیوزی لینڈ سے واپس آکر دیکھیں گے۔" سائرہ کو سلیم کے جواب سے مایوسی ہوئی۔ سلیم کے دوست اسے اپنے خاندان کا حصہ لگتے تھے۔ بالکل بڑے بھائیوں جیسے اور ظہور تو شادی کے دن سے ہی اسے بیٹی کی طرح سمجھتا تھا۔ شادی میں انہوں نے جس طرح حصہ لیا تھا اس سے لگتا تھا کہ سلیم کو وہ سب کتنا چاہتے ہیں۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سلیم کے انداز میں اپنے دوستوں کے لئے سرد مہری آگئی تھی۔ شادی کے ان تین مہینوں میں وہ شاید تین چار بار ملے تھے وہ بھی دعوتوں کی صورت میں۔ ایک بار ظہور اور چودہری انور نے اپنے گھر پر دعوت کی تھی۔ ایک دفعہ منظر نے سب کو بلا کر ان کی شادی کی خوشی میں کھانا کیا تھا۔ سائرہ نے جوابی دعوت کر کے سب کو حیدر آبادی کھانا کھلایا تھا۔ ایک ہفتہ کی شام ظہور اور چودہری انور ملنے ان کے گھر آئے تھے۔ سائرہ بہت خوش ہوئی تھی۔ ان کی خاطر کرتے ہوئے بچھی جا رہی تھی۔ لیکن سلیم کے رویئے میں گرمجوشی نہیں تھی۔ ظہور رویوں کو پڑھنے کا ماہر تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا اس لئے وہ جلدی اٹھ کر چلے گئے تھے اور پھر نہیں آئے تھے۔ سائرہ نے سوچا وہ ایک دن سلیم سے اس کے اس رویئے کی وجہ پوچھے گی۔

سلیم تین دن بعد ایک ہفتے کی چھٹی لے کر نیوزی لینڈ چلا گیا۔ چند دن بعد واپس آیا تو سینہ پھولا ہوا تھا۔ آسٹریلیا کی زمین پر پاؤں رکھتے ہی اس نے چند گہرے سانس لئے۔ یہ اب اس کی اپنی زمین تھی۔ اس زمین پر اس کا بھی قانونی حق تھا۔ اسے لگا وہ اب سلیم نہیں رہا۔ سالیم بن گیا ہے۔ دل میں اپنا نام سالیم پکارتے ہوئے اسے خود پر اپنا اعتماد بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ وعدہ کے مطابق سائرہ ایئرپورٹ سے اسے

نئی خریدی ہوئی کار میں گھر لے کر آئی تھی۔ سرخ رنگ کی چھوٹی مزدا اس نے سلیم کی غیر موجودگی میں خریدی تھی۔

"نئی گاڑی مبارک ہو۔ لیکن ہم دو ہیں۔ دو دروازوں والی لیتیں تو زیادہ اسمارٹ لگتی۔" سلیم نے گاڑی میں بیٹھ کر حفاظتی پیٹی باندھتے ہوئے کہا۔

"آج دو ہیں۔ کل شاید تین ہو جائیں۔" سائرہ نے مسکرا کر اسے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ سلیم کچھ نہیں بولا۔ صرف خاموش ہو گیا۔ سائرہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ اس نے آج کی رات کینڈل لائٹ ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ موم بتیوں کی روشنی میں کھانے کا رومانس ہی کچھ اور تھا۔ کھانے بھی سلیم کی پسند کے تھے۔ کھانے کے بعد اس نے سلیم کو بتانا تھا کہ ان کا پیار اس کے پیٹ میں مجسم ہو کر سانسیں لینے لگا ہے۔ وہ اب اکثر سوچتی تھی کہ کیا زندگی میں خوشی کا اس سے بڑا کوئی اور سبب بھی ہو سکتا ہے۔ موم بتیاں جلا کر اس نے کمرے کی بتیاں گل کر دیں اسے لگا جیسے ہلکی ہلکی روشنی کے حلقوں سے خواب پھوٹ رہے ہوں۔

"تمہیں معلوم ہے موم بتیوں کی روشنی میں ضیافت کا مزا سرخ اور سفید شرابوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔" سلیم نے اپنی پلیٹ میں کوفتے نکالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"نیوزی لینڈ سے تم یہی سیکھ کر آئے ہو۔" سائرہ نے مصنوعی غصے سے کہا۔ لیکن وہ سوچنے لگی سلیم دودھ میں مینگنیاں کیوں ڈال رہا ہے۔ اسے ہر چیز ادھوری ہر چیز میں کمی کیوں لگ رہی ہے۔ گاڑی چار دروازوں کی تھی تو اسے دو دروازوں والی پسند آ رہی تھی۔ وائن کی بوتلوں کے بغیر ڈنر نامکمل لگ رہا تھا۔ شاید سفر کی تھکن تھی۔ ایک ہفتے تنہا رہ کر آیا تھا وہ بوریت بھی ہو گی۔ اس نے ذہن سے ہر خیال جھٹک دیا اور بہت پیار بھری نظروں سے سلیم کے چہرے پر موم بتیوں کے لہراتے ہوئے شعلوں کا رقص دیکھتی رہی۔ کھانے کے بعد میٹھا نکالتے ہوئے سلیم کو خوشخبری سنانے کے لئے کوئی اچھا سا جملہ سوچ رہی تھی۔ میٹھا سلیم کی پسند کا تھا۔ اس کے نام پر دونوں میں اکثر لڑائی ہوتی تھی۔ سلیم شاہی ٹکڑے اور سائرہ ڈبل کا میٹھا کہتی۔ آخر

میں فیصلہ اس پر ہوا تھا کہ سائرہ اسے سلیم شاہی کہے گی اور سلیم اسے سائرہ کا میٹھا کہا کرے گا۔ لیکن اس وقت سلیم کوئی نام دیئے بغیر میٹھا کھانے میں مصروف تھا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبا لگتا تھا۔ سلیم نے خاموشی کا سحر توڑا تو سائرہ کی سوچوں میں بریک لگ گئے۔

"سائرہ میں پاکستان جا رہا ہوں۔" سلیم نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

"کب؟" سائرہ کے منہ سے بس یہی نکل سکا تھا۔

"جو بھی پہلی پرواز ملی اس سے۔" سلیم نے جواب دیا۔ نظریں ابھی تک پلیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ لیکن سائرہ اپنا میٹھا بھول کر سلیم کو دیکھنے لگی۔

"اتنی جلدی کیا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے لگ رہا تھا موم بتیوں کا جلنا بیکار جا رہا ہے۔

"جلدی؟" سلیم نے نظریں اٹھا کر اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہت دیر ہو گئی ہے سائرہ بہت دیر۔ اس سے پہلے کہ اور دیر ہو جائے مجھے جانا ہے۔ میری ماں تین سال سے میری شکل کو ترسی ہوئی ہے۔ پہلے میں کبھی چند دنوں کے لئے اسلام آباد بھی جاتا تھا تو میرے انتظار کا ایک ایک لمحہ گنتی تھی۔ جس دن واپس آنا ہوتا اس روز صبح سے دروازے کی راہ تکنے لگتی۔ ایک دفعہ کیوبا میں کوئی طیارہ گر گیا تھا اسے لگا جیسے میں بھی اسی جہاز میں تھا۔ پڑوسیوں نے بہت یقین دلایا کہ کیوبا اسلام آباد سے بہت دور ہے۔ لیکن میں جب تک واپس نہیں آ گیا کچھ کھائے پئے بغیر میری سلامتی کے لئے گڑگڑا کر دعائیں کرتی رہی۔ جب گیا تو دن بھر شکرانے کے نفل پڑھتی رہی۔ وہ خط میں کچھ نہیں لکھتی لیکن مجھے معلوم ہے ان برسوں کا ایک ایک پل اس پر پہاڑ بن کر گزرا ہو گا۔ غم سے بالکل پگھل گئی ہو گی۔ اس کی بیماری کا علاج صرف میں ہوں۔ مجھے سامنے پا کر دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔"

ماں کی یاد نے سلیم کو اداس کر دیا۔ سلیم کے بیان کا سائرہ پر بھی اثر ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنے پیٹ میں پلنے والی خبر کا کیا کرے۔ سلیم کو اس نے یہ خبر دی تو ماں کے پاس جاتے ہوئے قدم رک جائیں گے۔ گیا بھی تو خود کو مجرم سمجھتا رہے گا۔ سائرہ کو

لگا موم بتیوں کی لو بھڑکنے لگی ہے۔ اس کا دل چاہا پھونک مار کر جلتی ہوئی موم بتیوں کو بجھا دے اور افق میں چھپے ہوئے سورج کو نکال کر اپنے سر پر رکھ لے۔ لیکن ابھی ایک امکان اور باقی تھا۔ موم بتیوں کی لو ایک بار پھر ٹھہر گئی تھی۔

"ٹھیک ہے سلیم۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ واپسی میں ہم انڈیا ہوتے ہوئے آئیں گے۔ تم میری ماں اور روشن سے بھی مل لینا۔ بلکہ عذرا سے کہیں گے کچھ دنوں کے لئے وہ بھی حیدر آباد آ جائے۔" سائرہ کی آنکھوں میں خواب چمکنے لگے۔

"ہم اگلی بار ساتھ جائیں گے۔ اس بار مجھے اکیلا جانے دو۔ تم گئیں تو تمہارے لئے پاکستان کا ویزا لینا ہو گا۔ اس میں وقت لگ جائے گا۔ کراچی کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ تمہارا جانا اس لئے بھی مناسب نہیں۔ موسم بھی بہت خراب ہو گا۔ سخت گرم اور مرطوب اور پھر تمہیں اچانک دیکھ کر ماں کو صدمہ ہو گا۔ اس دفعہ جا کر میں تمہارے لئے میدان ہموار کروں گا۔ اگلی بار ہم پاکستان اور انڈیا دونوں جگہ جائیں گے۔ پلیز سائرہ۔ مجھے مت روکو۔ مجھے جانے دو۔ پلیز۔" سلیم کی التجا کا انداز ایسا تھا کہ سائرہ بالکل پگھل گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور سلیم کے سر کو اپنے جسم سے لپٹا کر سہلانے لگی۔ اس نے سوچا شاید اس کے پیٹ سے لگے ہوئے سلیم کے کان اپنے بچے کے دل کی دھڑکن سن لیں گے۔ شاید وہ رک جائے۔ شاید۔ لیکن سلیم تو کہیں اور ہی گم تھا۔ اسے اس وقت اپنی دھڑکنیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

"واپس کب آؤ گے۔" سائرہ کی آواز میں اداسی گھل گئی۔

"چار زیادہ سے زیادہ چھ ہفتوں میں۔" سلیم کی آواز اسے یقین دلاتی ہوئی لگی۔ ایک ڈیڑھ مہینے کی ہی تو بات ہے۔ اس نے سوچا۔ واپس آئے گا تو اس کا پھولا ہوا پیٹ خود اپنی خبر بنا ہوا ہو گا۔

"اتنے دن تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔" سائرہ کے لہجے میں بہت سا پیار سمٹ آیا۔ سلیم نے کرسی سے اٹھ کر اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

"جدائی کے ایک ایک لمحے کا حساب چکا دوں گا۔" سلیم نے اسے پیار کرتے

ہوئے کہا۔

"ابھی جو ایک ہفتہ نیوزی لینڈ میں رہے ہو' ان لمحوں کا حساب کب ہو گا۔" سائرہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ابھی اور اسی وقت۔" سلیم کمر میں ہاتھ ڈال کر سائرہ کو بیڈ روم کی طرف لے جانے لگا۔

"میز تو صاف کرنے دو۔" سائرہ نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"صبح کریں گے۔ کل چھٹی کا دن ہے۔ آج کی رات بہاروں میں گزاریں گے صنم۔" سلیم نے گنگناتے ہوئے کہا۔ اس کی گرفت اور سخت ہو گئی تھی۔ سائرہ کی آنکھیں نشے سے بالکل بوجھل ہو گئیں۔

سلیم نے دوسری صبح فیکٹری جا کر ملازمت سے استعفیٰ دیا اور اگلے ہفتے پاکستان کے لئے پرواز کر گیا۔ سائرہ کے ساتھ ظہور اور چودھری انور بھی اسے چھوڑنے ایئرپورٹ آئے تھے۔ سلیم سائرہ کے یاد دلانے پر ان کے گھر مٹھائی لے کر اپنے پکا ہونے اور پاکستان جانے کی خبر دینے گیا تھا۔ دونوں بہت خوش ہوئے تھے۔ انہوں نے سلیم کو یقین دلایا تھا کہ بے فکر ہو کر جائے۔ وہ سائرہ کا ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔

سائرہ کے لئے حاملہ ہو کر تنہا رہنا آسان نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی بہت زود رنج تھی۔ اب تو ذرا ذرا سی بات پر آنسو بہہ نکلتے۔ ٹی وی پر فلمیں دیکھنا چھوڑ دی تھیں۔ ذرا سا غمگین منظر آتا رونے لگتی' کسی کو ظلم کا شکار دیکھتی تو دانت کٹکٹاتی اور دل چاہتا ٹی وی کی اسکرین توڑ دے۔ تجسس جسم میں تناؤ پیدا کر دیتا۔ سب سے اچھا وقت وہی ہوتا جو کام کرتے ہوئے فیکٹری میں گزرتا۔ مصروفیت کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیتی تھی۔ لیکن گھر آ کر پہاڑ جیسی رات کاٹنا مشکل ہو جاتی۔ سات آٹھ بجے تک جب تک کامیڈی پروگرام آتے ٹی وی دیکھتی اس کے بعد کھانا کھا کر صوفے پر بیٹھی اپنا پیٹ اس طرح سہلاتی جیسے بچے کے سر میں انگلیوں سے کنگھی کر کے اسے سلانے کی

کوشش کر رہی ہو۔ گھنٹوں دیوار پر لگی بچے کی تصویر کو دیکھتی رہتی۔ وہ بچہ اکثر اسے روتا ہوا نظر آتا۔ اسے لگتا جیسے باپ کی محبت کے لئے مچل رہا ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا فون گھمانے لگتی۔ دو ہی نمبر تھے جنہیں ڈائل کر کے دل کو تسلی دینے والی آواز سننے کو ملتیں۔ حیدر آباد میں روشن اور لندن میں عذرا کو فون کر کے دیر تک باتیں کرتی رہتی۔ اسے معلوم تھا اس دفعہ اس کا فون کا بل بہت آئے گا۔ اسے پرواہ نہیں تھی۔ اسے سلیم پر غصہ تھا۔ اس نے اپنے رابطے کا کوئی نمبر نہیں چھوڑا تھا۔ کہا تھا خود فون کرتا رہے گا۔ لیکن جانے کے پندرہ دن تک اس کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ سائرہ کراچی کی خبریں سنتی تو اس کا دل بیٹھنے لگتا۔ ایک دن تو ظہور کو فون کر کے روئی تھی کہ وہ کراچی میں کسی سے سلیم کی خیریت معلوم کرائے۔ ظہور اور چودھری انور اکیلی رہتی ہوئی سائرہ کے گھر آنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن پابندی سے فون کر کے اس کی خیریت معلوم کرتے رہتے۔ گھر صرف اس وقت آتے جب منظور اور اس کی بیوی ساتھ ہوتی۔ منظر کی بیوی تقریباً" پورے دنوں سے تھی اس لئے بار بار آنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ ظہور نے سلیم کے بارے میں بہت تسلی دی تھی اور بتایا تھا وہ خطرے والے علاقے میں نہیں ہے اس لئے پریشان نہ ہو۔ پھر سلیم کا فون بھی آ گیا۔ وہ دیر تک روئی اور سلیم تسلیاں دیتا رہا اسی میں کال کا وقت ختم ہو گیا۔ وہ اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکی کہ اس نے اپنی ماں کو بتایا یا نہیں۔ سلیم کو گئے ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ اس کے بعد بھی اس کے دو تین فون آئے تھے۔ ہر بار اس نے کہا تھا جلد آئے گا اور ہر بار سائرہ کے سوال پوچھنے سے پہلے تین منٹ کی کال ختم ہو گئی تھی۔

چھٹی کے دونوں دن بہت بے چینی میں کٹتے تھے۔ باہر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ فیکٹری میں کام کرنے والی دونوں لڑکیوں کی جوڑی ٹوٹ گئی تھی۔ ایک لڑکی نئی نئی عشق میں مبتلا ہوئی تھی۔ اس لئے مصروف ہو گئی تھی۔ دوسری لڑکی دور رہتی تھی اس کے لئے اکیلے آنا مشکل تھا۔ سائرہ گھر کی صفائی کر کر کے پریشان تھی۔ سارا وقت اسی کام میں گزرتا تھا۔ گھر میں گرد کا ایک ذرہ نہیں بچا تھا۔ پھر بھی وقت بچ جاتا تو گاڑی

لے کر خریداری کرنے جاتی' ایک دفعہ پاکستانی ڈرامے لے کر آئی تھی۔ لیکن لگاتے ہی اکرم بٹ کا چہرہ سامنے آگیا۔ اسی روز واپس کر آئی اور پھر کبھی ویڈیو کی دکان پر نہیں گئی۔ ایک ہفتے کی صبح صفائی کرنے کے لئے کچھ نہیں رہا تو وہ اس کمرے میں گھس گئی جسے وہ استعمال نہیں کرتے تھے اور جہاں ان کا سارا بیکار سامان جمع رہتا تھا۔ وہ اپنا پرانا سامان الٹ پلٹ کر ٹھیک کرنے لگی۔ گھنٹوں بیٹھی ماں اور روشن کے پرانے خط دوبارہ پڑھتی رہی۔ وہ ختم ہوئے تو ایک طرف بے ترتیبی سے پڑا ہوا سلیم کا سامان نظر آیا۔ کاپیوں' کتابوں اور کاغذوں کا انبار تھا۔ سلیم کا یونیورسٹی کے زمانے کا کام تھا۔ سائرہ جانتی تھی سلیم کو اپنی چھوڑی ہوئی پڑھائی مکمل کرنی تھی۔ وہ بہت احتیاط سے کاغذوں' فائلوں' کاپیوں اور کتابوں کو الگ الگ کر کے ترتیب سے رکھنے لگی۔ دفتر میں اس کا زیادہ وقت فائلوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ اسے اس کام میں پیشہ ورانہ مہارت حاصل تھی۔ سلیم واپس آکر اپنے کاغذوں کو ترتیب سے لگا دیکھ کر کتنا خوش ہو گا۔ ایک فولڈ میں خطوط جمع تھے۔ سب اردو میں لکھے ہوئے خط تھے۔ سائرہ سمجھ گئی سلیم کی ماں کے خط ہوں گے۔ اسے پہلی بار اس بات پر غصہ آیا کہ اسے اردو پڑھنی نہیں آتی۔ اسے کتنا اشتیاق تھا سلیم کی ماں کو اچھی طرح جاننے کا۔ کسی کو جاننے کے لئے خطوں سے زیادہ اچھا ذریعہ اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ وہ سلیم کی بیوی تھی۔ وہ اگر اس کی ماں کے خط پڑھتی تو سلیم کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ کاش وہ اردو پڑھنا جانتی۔ وہ خطوں کے فولڈر کو بند کر کے فائلوں کے ساتھ رکھ رہی تھی کہ اس میں سے کچھ تصویریں پھسل کر گر پڑیں۔ سلیم نے آج تک اپنے گھر والوں کی تصویریں نہیں دکھائی تھیں۔ اس نے بڑے اشتیاق سے تصویریں اٹھا کر دیکھیں۔ پہلی تصویر دیکھ کر ایسا لگا جیسے کسی نے بہت زور سے سینے پر گھونسہ مارا ہو۔ ایک دفعہ اکرم بٹ نے بھی اس کے سینے پر گھونسے کا ہتھوڑا مارا تھا۔ لیکن جو چوٹ آج لگی وہ زیادہ شدید تھی۔ تصویر میں سلیم ایک جوان لڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ لڑکی کی گود میں ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ شاید ایک سال کی ہو گی۔ دونوں بہت محبت بھری نظروں سے بچی کو دیکھ رہے تھے۔

وہ کون ہے۔ وہ کون ہے۔ وہ کون ہے۔ ایک ہی سوال کی گونج اس کے سینے پر مسلسل گھونسے برسا رہی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے دوسری تصویریں دیکھیں۔ وہ سب اسی لڑکی کی تھیں۔ ہر تصویر میں بچی ساتھ تھی۔ لیکن ہر تصویر میں بچی کی عمر بڑھتی گئی تھی۔ ایک تصویر شاید سب سے تازہ تھی اس میں بچی تین چار سال کی لگتی تھی۔ وہ کون ہے اس بار سوال ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ میں لگا تھا۔ شاید سلیم کی خالہ زاد بہن ہو گی جس کا سلیم نے ایک دو بار تذکرہ کیا تھا اور سائرہ کے ساتھ جا کر اس کے لئے تحفے بھی خریدے تھے۔ وہ بچی بھی اسی کی ہو گی۔ لیکن بچی کا باپ کہاں تھا۔ کسی بھی تصویر میں لڑکی کے ساتھ یا علیحدہ کوئی آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ صرف ایک تصویر میں لڑکی اور بچی کے ساتھ دو بڑی عمر کی عورتیں بھی تھیں۔ دونوں کی شکلیں کافی ملتی ہوئی تھیں۔ یقیناً" سلیم کی اماں اور خالہ ہوں گی۔ لیکن وہ کون ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سائرہ خطوں کا فولڈر اور تصویریں اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ خطوں کو گھورنے لگی۔ کیا یہ واقعی سلیم کی ماں کے خط تھے۔ کاش وہ اردو جانتی۔ ایک بار پھر ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ سامنے دیوار پر فریم میں لگا ہوا بچہ اسے زار و قطار روتا ہوا نظر آیا۔ جیسے اس کا باپ بچھڑ کر کہیں چلا گیا ہو۔ سائرہ اپنے تھوڑے سے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر اسے چپ کرانے لگی۔ خط اور تصویریں اس نے میز پر ڈال دیں' اپنے بچے کو اس نے سہلا کر چپ کرا دیا تھا۔ تصویر میں بچے کا رونا بند ہو گیا تھا لیکن اس کی آنکھیں گیلی تھیں۔ سائرہ کے دماغ میں دھمک کم ہو گئی۔ لیکن سوال کی گونج نہیں گئی۔ وہ کون ہے۔ جواب معلوم کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اس نے فون کا نمبر گھمانا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے خیریت تو ہے۔ تمہاری آواز بہت کمزور لگ رہی ہے۔" سائرہ کی آواز سن کر دوسری طرف سے ظہور نے کہا۔

"ظہور بھائی کیا آپ اسی وقت میرے پاس آ سکتے ہیں۔" سائرہ کا لہجہ ہر جذبے سے عاری اور بے حد سرد تھا۔

"کیا بات ہے۔ کیا سلیم کا فون آیا ہے۔ وہ خیریت سے تو ہے۔" ظہور کے

لہجے میں تشویش تھی۔
"جی ہاں وہ ٹھیک ہیں۔ مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ بس تھوڑی دیر کے لئے آ جائیں۔" سائرہ کے لہجے سے ظہور کو اندازہ ہو گیا تھا کوئی اہم بات ہو گی۔
"ٹھیک ہے۔ چودہری انور سو رہا ہے میں اسے اٹھاتا ہوں۔ ہم گھنٹے بھر میں پہنچتے ہیں۔" ظہور نے سائرہ کو تسلی دی۔
"نہیں ظہور بھائی صرف آپ۔ پلیز" سائرہ نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔ ظہور آدھے گھنٹے میں اس کے فلیٹ پہنچ گیا۔ اندر آ کر سائرہ کو دیکھا تو ظہور کو سائرہ کی ایسی اجڑی ہوئی حالت دیکھ کر یقین نہیں آیا۔ چہرہ کاغذ کی طرح سفید تھا۔ ویران آنکھیں بھوتوں کا ڈیرہ لگ رہی تھیں۔
"کیا ہوا بیٹی۔" ظہور نے صوفے پر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ظہور کے منہ سے بیٹی کا لفظ سنتے ہی سائرہ پھوٹ پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی۔
"کیا ہوا بیٹی۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا۔" ظہور نے ایک بار پھر پوچھا۔ سائرہ میز پر پڑے ہوئے خطوں اور تصویروں کی طرف اشارہ کر کے اور زور سے رونے لگی۔ سب سے اوپر تصویریں رکھی تھیں۔ ظہور کو تصویریں دیکھتے ہی ساری کہانی سمجھ میں آ گئی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اس نے ایک خط اٹھا کر پڑھنا شروع کیا اور پورا پڑھے بغیر میز پر واپس ڈال دیا۔ تصویریں میں جو کہانی لکھی تھی خط کی چند سطروں نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ ظہور نے اپنا سر تھام لیا۔
"میرے خدا۔ اتنا بڑا دھوکہ۔ وہ بھی اتنی معصوم اور مظلوم بچی کے ساتھ۔" ظہور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اسے سائرہ کی کہانی معلوم تھی۔ شادی سے پہلے سلیم نے ایک دن خود سنائی تھی۔ سائرہ کا رونا رک گیا۔ چہرے سے اپنے ہاتھ اٹھا کر اس نے ظہور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"کیا یہ سچ ہے۔" ظہور نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سائرہ تھوڑی دیر اسی طرح سکتے کی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ اس کے بعد خاموشی سے اٹھ کر باتھ روم میں

چلی گئی۔ منہ دھونے گئی تھی۔ یا شاید اکیلے میں رونے۔ باتھ روم سے نکلی تو کچن میں جا کر چائے بنانے لگی۔ ظہور اسے تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سائرہ ظہور کے اور اپنے لئے چائے بنا کر لائی اور دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ چہرے پر سکون پھیل گیا تھا۔ لیکن آنکھوں کی ویرانی آنسوؤں کی برسات بھی کم نہ کر سکی تھی۔

"ہم سب تمہارے گناہگار ہیں بیٹی۔ ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا۔" ظہور نے کہنا شروع کیا۔ چائے کو اس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ "ہمیں اس نے کبھی نہیں بتایا۔ شبہ تک نہیں ہونے دیا۔ میں مذاق کرتا تھا کہ سلیم کو پڑھنا سب سے آسان ہے۔ لیکن وہ سب سے گہرا۔ سب سے مشکل نکلا۔" ظہور کو واقعی حیرت تھی۔ خود سلیم بھی نہیں جانتا تھا کہ اس نے اپنی شادی کو راز بنا کر کیوں رکھا تھا۔ آسٹریلیا آتے ہوئے فارم پر بھی خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا تھا۔ شروع میں کوئی ایسا قریبی دوست نہیں تھا جس سے گھریلو اور ذاتی باتیں کی جا سکتیں۔ ایک چودھری انور تھا لیکن وہ ہمیشہ کا کم گو۔ جب تک ظہور سے ملاقات ہوئی اس وقت تک سلیم پر ماحول کا اثر ہو گیا تھا۔ دل میں شاید کہیں نہ کہیں کوئی چور چھپا تھا۔ یہ اس کی بے خیالی تھی یا احتیاط۔ اس کے کام آئی تھی۔

"میرے لئے یہ سب نیا نہیں ہے۔ میرے نصیبوں میں یہی لکھا ہے۔ آپ چائے پیجئے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" سائرہ نے بہت پرسکون لہجے میں کہا۔ ظہور نے بے دلی سے چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

"ظہور بھائی آپ مجھے خط پڑھ کر سنائیے۔" ظہور کی چائے ختم ہونے کے بعد اس نے کہا۔ اپنی چائے وہ پہلے ہی ختم کر چکی تھی۔

"بیٹی یہ اس کی بیوی کے خط ہیں۔ بہت ذاتی سے۔ تم سے برداشت نہیں ہوں گے۔ تمہیں تکلیف ہو گی۔" ظہور نے سمجھایا۔

"ظہور بھائی میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے لئے دو آدمیوں کو ایک دوسرے کو قتل کرتے دیکھا ہے۔ کوئی دکھ اس سے زیادہ ناقابل برداشت نہیں ہو سکتا۔" سائرہ

نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تم سن کر کیا کرو گی۔" ظہور نے پوچھا۔

"مجھے دیکھنا ہے جس لڑکی سے میں نے اس کا شوہر ادھار لیا تھا' اس کے دکھ مجھ سے زیادہ گہرے تو نہیں۔" سائرہ نے کہا۔ اس کے چہرے پر بہت سختی آگئی تھی۔

"سائرہ تم ایک بار پھر......" ظہور نے کہنا چاہا لیکن سائرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ظہور بھائی آپ سے اس لئے پڑھوا رہی ہوں کہ بات آپ تک رہے گی۔ آپ نہیں پڑھیں گے تو کسی اور سے پڑھواؤں گی۔ پھر پورے شہر میں چرچا ہو گا۔ آپ کو بھی اچھا نہیں لگے گا۔" ظہور سمجھ گیا سائرہ خط سنے بغیر نہیں مانے گی۔ وہ خاموشی سے خط اٹھا کر انہیں پڑھنے کے لئے ترتیب دینے لگا۔ بہت آہستگی سے اس نے پہلا خط پڑھنا شروع کیا۔

"جان سے زیادہ عزیز'

بہت سے پیار

آج تم بہت یاد آئے۔ اپنے لئے نہیں۔ تمہیں اپنے لئے یاد کرنا میں نے بہت دنوں سے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے ہر جذبے پر برف کی سل رکھ لی ہے۔ تمہاری یاد زریں کی وجہ سے آئی ہے۔ تمہاری بیٹی کو آج تمہاری بہت ضرورت تھی۔ رات بھر پیٹ کے درد سے تڑپتی رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کریں۔ اسے بلکتا دیکھ کر میں اور خالہ بی بھی رونے لگتے تھے۔ گرائپ واٹر پلایا' خالہ بی نے زیرے کا پانی منہ میں ٹپکایا۔ رات بھر سرہانے بیٹھی دم کرتی رہیں' میں پیٹ سینکتی رہی لیکن کچھ دیر کو سکون آتا اور پھر رونے لگتی۔ کچھ بتاتی نہیں تھی۔ بس چڑچڑا کر ہاتھ جھٹک دیتی۔ کہتی تھی پیٹ میں اللہ بابا گھس گیا ہے۔ اتنی رات کو باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے۔ سڑکوں پر آج کل رات کو نو بجے کے بعد سناٹا ہو جاتا ہے۔ صرف پولیس اور رینجرز کی گاڑیاں نظر آتی ہیں۔ آج کل ایک بڑے میاں کو ڈرائیور رکھا ہوا ہے وہ نیو کراچی میں رہتے ہیں شام چھ بجے گاڑی کھڑی کر کے چلے جاتے ہیں۔ پڑوس سے بھی کوئی مدد ملنا مشکل

تھی۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پرائی بچی کو اسپتال لے جانے کے لئے کون تیار ہوتا۔ صبح کسی وقت قرار آیا تو زریں سو گئی۔ خالہ بی کو میں نے مجبور کر کے سونے بھیج دیا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ کمزور ہو گئی ہیں۔ منہ سے کچھ نہیں کہتیں لیکن مجھے معلوم ہے تمہارے لئے اندر ہی اندر تڑپتی رہتی ہیں۔ زریں نہ ہوتی تو بالکل ہی پلنگ سے لگ جاتیں۔ اسی کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہیں۔ زریں میں انہیں تم نظر آتے ہو۔ ہر وقت اس سے تمہاری باتیں کرتی ہیں۔ زریں انہیں حیرت سے تکتی ہے۔ جیسے وہ کوئی جادو کی کہانی سنا رہی ہوں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اسے معلوم ہی نہیں باپ کیا ہوتا ہے۔ اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ گیارہ مہینے کی تھی جب تم چھوڑ کر گئے تھے۔ مجھے اب تک اس کی پہلی سالگرہ یاد ہے۔ سب خوش ہوئے لیکن کیک کاٹ کر مجھے بہت رونا آیا۔ تم نئے نئے جدا ہوئے تھے۔ چوٹ تازہ تھی اس لئے اس زمانے میں بات بن بات رونا آتا تھا۔ اب تمہاری یاد نہیں رلاتی۔ رونا آتا ہے تو اپنی بے بسی پر۔ میری بچی درد سے تڑپتی رہی اور میں کچھ نہیں کر سکی۔ مجھے گاڑی چلانی آتی تو بموں کی برسات بھی اسپتال جانے سے نہ روک سکتی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل ہی ڈرائیونگ سیکھنی شروع کروں گی اور اب ہر صورت میں فون بھی لگواؤں گی۔ ابا تو یہ کام نہیں کریں گے۔ میں خود فون کے دفتر جاؤں گی۔ جتنے پیسے بھی لگیں فون لگوا کر تمہیں زریں کا رونا سنواؤں گی۔ شاید تم بھی جان سکو بیٹی جب روتی ہے تو دل کیسے پھٹتا ہے۔ زریں ہی نہیں تم بھی تو اس رشتے کو نہیں جانتے۔ تمہیں باپ بننے کا موقع ہی کب ملا۔ اگلے مہینے زریں اپنی سالگرہ کا چوتھا کیک بھی تمہارے بغیر کاٹے گی۔ وہ خواب ادھورا رہ گیا ہے کہ تم زریں کو گود میں لے کر چھری پکڑے ہوئے اس ننھے سے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کیک کٹواؤ گے۔ اب وہ اپنا کیک اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اور چھری کو خود تھام کر کاٹے گی۔ میں اس دفعہ بھی نہیں روؤں گی۔ لیکن خالہ بی کی کسی کو تلاش کرتی ہوئی خالی نظروں کو دیکھ کر خواہ مخواہ میری آنکھیں بھر آئیں گی۔

"صبح ہوئی تو زریں کو بڑی مشکل سے کچھ کھلانے کی کوشش لیکن اس نے اسی

وقت سب کچھ الٹ دیا۔ اس کے پیٹ میں پھر اللہ بابا گھس آیا تھا۔ میں اب اسے اللہ بابا سے کبھی نہیں ڈراؤں گی۔ کھانا پکاتے یا کوئی کام کرتے ہوئے جب وہ مجھے تنگ کرتی تھی تو میں اسے دھمکی دیتی تھی کہ اللہ بابا آ کر اسے لے جائے گا۔ وہ سہم کر بیٹھ جاتی۔ لیکن یہ اللہ بابا تو سچ مچ آ کر ہم سے چمٹ گیا تھا۔ ہم ڈرائیور کا انتظار کرنے لگے، لیکن کام کرنے والی ماسی آئی تو اس نے بتایا آج ہڑتال ہے۔ ہر چیز بند ہے۔ وہ نزدیک ہی کچی بستی میں رہتی تھی گلیوں گلیوں گھومتی آگئی تھی۔ میں سمجھ گئی بڑے میاں آج نہیں آسکیں گے۔ خالہ منع کرتی رہیں لیکن میں روتی ہوئی زریں کو گود میں چڑھا کر باہر نکل گئی۔ کوئی ڈاکٹر تو کھلا ہو گا۔ باہر نکل کر دیکھا تو سامنے سڑک پر ٹائروں کے جلنے کا گہرا دھواں اٹھ رہا تھا۔ دور سے ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید کہیں فائرنگ ہو رہی تھی۔ لیکن مجھے کچھ سنائی اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کونے کے مکان والے شاہ جی مجھے اپنی کھڑکی سے سڑک کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر باہر نکل آئے اور کھینچ کر اپنے گھر میں لے گئے۔ ان کا خیال تھا میں دیوانی ہو گئی ہوں اور خودکشی کرنے باہر نکلی ہوں۔ انہوں نے بتایا کوئی ڈاکٹر، دوا کی کوئی دکان، کچھ نہیں کھلا۔ زریں سہمی ہوئی میرے سینے سے چمٹی ہوئی تھی۔ مجھے لگا بیہوش ہو گئی ہے۔ درد کی شدت سے اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ شاہ جی کی بیوی اور بہو اس کے منہ میں پانی ٹپکا کر ہاتھ پاؤں سہلانے لگیں۔ شاہ جی کا بیٹا جو تمہارا بھی دوست ہے چھ مہینے پہلے نوکری کرنے سعودی عرب چلا گیا ہے۔ اس کی بیوی امید سے ہے اس کا ویزا آگیا ہے۔ وہ بھی جلد ہی شوہر کے پاس ریاض چلی جائے گی۔ مجھ میں اس وقت جانے کیسے طاقت آئی ہوئی تھی کہ اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ ورنہ زریں کی حالت دیکھ کر لگتا تھا جان نکل گئی ہے۔ شاہ صاحب نے بیٹے کے سعودی عرب جانے کے بعد فون لگوا لیا تھا۔ کئی جگہ فون کرنے پر انہیں کامیابی ہوئی اور ایدھی سنٹر والے ایمبولینس بھیجنے پر تیار ہو گئے۔ میں شاہ جی کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ ایدھی کی ایمبولینس آئی تو انہوں نے مجھے اکیلے نہیں جانے دیا خود ساتھ بیٹھ کر اسپتال آئے اور اپنی بیوی کو ہمارے گھر خالہ بی کے پاس بھیج دیا۔ ایمبولینس جب شور مچاتی ہوئی گلی میں آئی تو

جن گھروں کی کھڑکیاں کھلی تھیں وہ بھی بند ہو گئی تھیں۔ اسپتال زیادہ دور نہیں تھا لیکن راستے بھریوں لگتا تھا جیسے کسی میدان جنگ سے گزر رہے ہوں۔ ہر سڑک پر پولیس اور رینجرز کی توپیں لگی گاڑیاں گھوم رہی تھیں۔ ایک چوراہے پر بکتر بند گاڑی میں فوجی مورچہ لگائے بیٹھے تھے۔ کسی جگہ بسیں اور کاریں شعلہ دے رہی تھیں۔ چھوٹی سڑکوں پر ٹائروں کے جلنے کا دھواں تھا۔ شکر تھا کہ ایدھی کی ایمبولینس کو کہیں اور کسی نے نہیں روکا۔ اسپتال میں بھی ایک افراتفری کا عالم تھا۔ شاہ صاحب نہیں ہوتے تو کراہتے ہوئے زخمیوں اور ان کے بین کرتے ہوئے رشتے داروں کے ہجوم میں کھڑی رہتی۔ شاہ جی کا جاننے والا ایک پولیس انسپکٹر مل گیا تھا۔ وہ بھی ان کے شہر ساہیوال کا تھا۔ انسپکٹر کی مدد سے ڈاکٹر تک رسائی ہوئی۔ زریں کو فوراً ہی ایک بستر مل گیا۔ ڈاکٹر بھی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ فوراً انجکشن دیا اور ڈرپ چڑھا دیے۔ تھوڑی دیر میں بچوں کا ڈاکٹر بھی آ کے دیکھ گیا۔ اس نے نئی دوائیں اور انجکشن لکھ دیئے اور اطمینان دلایا شام تک ٹھیک ہو جائے گی۔"

شاہ جی نے گھر فون کر کے خالہ بی کو خبر کروا دی تھی کہ سب ٹھیک ہے۔ ابا کو بھی فون کر دیا تھا۔ شام تک ہنگامے کم ہو گئے۔ ابا امی کو لے کر اسپتال پہنچ گئے۔ ان کے آنے کے بعد ہمیشہ کی طرح میں پھر بے تعلق کر دی گئی۔ سب کچھ دونوں نے سنبھال لیا۔ زریں کا سرہانا۔ ڈاکٹر کی پوچھ گچھ۔ دوائیں۔ میں بستر کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھی ہوئی چائے پیتی رہی جو شاہ صاحب کے جاننے والے انسپکٹر نے بھجوا دی تھی۔ مجھے کبھی کبھی سخت غصہ آتا ہے۔ میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔ ماں بن گئی ہوں۔ یہ لوگ مجھے اپنے فیصلے خود کیوں نہیں کرنے دیتے۔ مجھے اب بھی شیشے کی گڑیا سمجھ کر احتیاط سے کونے میں رکھ دیتے ہیں۔ تم سے جب میری شادی ہوئی اس وقت بھی مجھ سے کسی نے پوچھا تک نہیں۔ پوچھتے بھی تو تمہارے علاوہ اور کس کا نام لیتی۔ جب سے آنکھیں کھولی تھیں صرف تمہیں کو دیکھا تھا۔ اتنا موقع بھی نہیں ملا کہ شادی سے پہلے تمہیں کسی اور نظر سے دیکھ سکتی۔ لال کپڑوں کی گٹھڑی بنا کر تمہاری گود میں ڈال دی گئی تھی۔ تم نے بھی بہت احتیاط سے مجھے اپنے گھر میں سجا دیا۔ ابا سے مل کر

آسٹریلیا جانے کا فیصلہ کر آئے۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ جانے کی خبر دی آنے کے وعدے کئے اور چلے گئے۔ میری آنکھوں میں چھپی ہوئی ان حسرتوں کو دیکھا تک نہیں جو تم سے رک جانے کی التجائیں کر رہی تھیں۔ نعیم بھائی نے آ کر مجھے بہت دلاسے دیئے تھے۔ ایک وہی تھے جن سے میں کھلے دل سے بات کر سکتی تھی۔ جن کے سامنے رو بھی سکتی تھی۔ میری شادی پر رخصتی کے وقت سب سے زیادہ وہی روئے تھے۔ مجھے معلوم ہے وہ میرے لئے نہیں اپنے لئے رو رہے تھے۔ گھر میں صرف مجھ سے اپنا دکھ کہہ سکتے تھے۔ گھر میں رہتے ہی کہاں تھے۔ انقلاب لانے کی خیالی دنیاؤں میں بھٹکتے رہتے۔ لیکن جب بھی آتے تو گھنٹوں میری سنتے اور اپنی کتھا سناتے۔ ابا نے تو انہیں اپنی زندگی سے ہی خارج کر دیا تھا۔ اماں بھی روتی تھیں کہ ایک بیٹا تھا وہ بھی نکما نکل گیا۔ آج بھی جب میرے اسپتال آنے کی کتھا سنی تو سارا غصہ نعیم بھائی پر نکالا۔ کہتی تھیں وہ نکما یہاں ہوتا تو کسی کام آتا۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ سب تمہیں اوتار سمجھتے ہیں۔ تمہاری مثالیں دیتے ہیں کہ پڑھنے کے ساتھ محنت کر کے گھر کا خیال بھی رکھتے ہو۔ باہر جا کر بھی سنبھل کر رہے ہو۔ کیا تم واقعی اتنے اچھے ہو.....؟ مجھے نہیں معلوم کوئی مجھ سے پوچھے گا تو میں کیا جواب دوں گی۔ شاید خاموش رہ جاؤں۔ کوئی آنکھوں کی زبان جانتا ہو تو میری آنکھوں میں چھپے ہوئے شکایتوں کے دفتر کو پڑھ لے گا۔ لیکن کون پڑھے گا۔ شاید تم بھی نہ پڑھ سکو۔ لیکن تم آؤ گے تو میں خود سناؤں گی۔ اب میں خاموش نہیں رہوں گی۔ تم سے خوب لڑوں گی۔ خوب شکایتیں کروں گی۔

ہم رات ہونے سے پہلے زریں کو اسپتال سے گھر لے آئے تھے۔ وہ کافی سنبھل گئی تھی۔ چہرے کی رنگت بھی لوٹ آئی تھی۔ واپسی میں ابا سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ کہتی تھی نانا آپ کی گاڑی کی آواز سے ڈر لگتا ہے۔ آپ نئی گاڑی کب لیں گے۔ ابا کی گاڑی آوازیں بھی ایسے ہی نکالتی ہے۔ لگتا ہے کسی وقت بھی ایک ہچکی لے کر بند ہو جائے گی۔ نعیم بھائی جاپان سے ہر مہینے کافی پیسے بھیجتے ہیں۔ لیکن ابا ان پیسوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ نعیم بھائی کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتے

ہیں۔ انہوں نے پیسے بھیجنے کے لئے منع کیا تھا لیکن نعیم بھائی نے لکھا تھا آپ نے پالا اور پڑھایا لکھایا ہے اس کا قرض اتار رہا ہوں۔ ابا تو اداس ہو کر خاموش ہو گئے تھے لیکن امی نے رو رو کر نعیم بھائی کو خوب کوسنے دیے تھے۔

گھر پہنچے تو شاہ صاحب کی بیوی خالہ بی کے پاس ہی تھیں۔ امی اور خالہ بی مل کر خوب روئے۔ مجھے معلوم ہے دونوں بہنیں یہ آنسو اپنے بیٹوں کے لئے بہا رہی تھیں۔ مجھے کبھی کبھی دونوں پر سخت غصہ آتا ہے۔ خالہ بی نے واپس نہ آنے کے لئے تمہیں اپنی جان کی قسم دی تھی۔ امی نے نعیم بھائی کو ضد کر کے اور رو رو کر جاپان جانے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن دونوں اب اکیلے میں خوب آنسو بہاتی ہیں۔ میں سوچتی ہوں ہماری محبتیں اتنی دوغلی کیوں ہوتی ہیں۔

رات بہت ہو گئی ہے۔ خط بھی لمبا ہوگیا ہے۔ لیکن کیا کروں۔ تم سے باتیں کرنے کا ایک یہی تو ذریعہ ہے۔ تم فون کرتے ہو تو بات کرنے کے لئے سب کی لائن لگ جاتی ہے۔ پھر فون پر سب کے سامنے میں کچھ کہوں بھی کیسے بس تمہاری آواز سن کر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ پتہ نہیں تم تک آواز جاتی ہے یا نہیں۔ ابا اور امی بھی رات کو یہیں رک گئے تھے۔ وہ دوسرے کمرے میں سو رہے ہیں۔ زریں کو انہوں نے اپنے پاس سلا لیا ہے۔ میں کمرے میں بالکل اکیلی ہوں۔ آنکھوں سے نیند غائب ہے۔ سارے خواب کہیں کھو گئے ہیں۔ تمہاری یاد کا نقش بھی نہیں ابھر رہا۔ آنکھیں بے جان خلا بن گئی ہیں۔ شاید کسی کی واپسی کی راہ تک رہی ہوں۔ کب آؤ گے.....!

تمہاری اور صرف تمہاری

غزالہ

خط پڑھتے پڑھتے ظہور بہت اداس ہو گیا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر میز سے دوسرا خط اٹھانے لگا لیکن سائرہ نے روک دیا۔ اس کی آنکھیں ساون بھادوں برساتی رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ایک جہاز شور مچاتا ہوا سر سے گزرا تھا۔

ایئرپورٹ پر اترنے کے لئے نیچے کی طرف جاتے ہوئے جہاز کو دیکھ کر سائرہ کے دل میں بھی شور مچا۔ کب آؤ گے۔ کب آؤ گے۔ لیکن دماغ میں دور کہیں سے دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں۔ مت آنا۔ اب مت آنا۔ بالکل مت آنا۔

16

سڈنی ۱۹۹۶ء

سلیم پورے تین مہینے کے بعد واپس آ سکا۔ وہ جانتا تھا سائرہ سخت بیتاب ہو گی۔ اس کے آنے کی گھڑیاں گن رہی ہو گی۔ اس نے سوچا تھا اچانک جا کر حیران کر دے گا۔ اس لئے بغیر اطلاع کے آیا تھا۔ اس کے لئے سائرہ کو خوش رکھنا بہت ضروری تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو جس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا وہاں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ غزالہ اب پہلی والی بے زبان غزالہ نہیں تھی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ سلیم اسے آسٹریلیا بلا لے یا خود پاکستان آ کر رہے۔ سلیم نے غزالہ کو اپنے سامنے چھوٹی سے بڑی ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا اور وہ اس کی بیوی اور پھر اس کی بچی کی ماں بھی بن گئی تھی۔ سب کچھ بہت خودکار طریقے سے ہوا تھا' جیسے غزالہ کے پیدا ہونے اور بڑا ہونے کے مقصد ہی سلیم کی بیوی بننا

ہو۔ لیکن ڈھائی تین برس کی جدائی نے ان جذبات کو زبان دے دی تھی جو اندر ہی اندر گھٹے رہتے تھے۔ سلیم نے غزالہ کے خطوں میں جذبوں کی بلوغت کا یہ عمل دیکھا تھا۔ اندر ہی اندر جو آوازیں شور مچاتی ہیں وہ زبان پر نہیں آتیں۔ جسے سنانا ہو اس کے سامنے تو بالکل نہیں آتیں۔ لیکن خط زبان بن جائیں اور تحریر آوازوں کا ساتھ دینے لگے تو پھر طوفان باہر نکل آتے ہیں۔ سلیم کے پاکستان واپس پہنچنے سے پہلے غزالہ خطوں میں اپنا دل کھول چکی تھی اس لئے زبان کھولنے میں بھی کوئی جھجک نہیں رہی تھی۔ غزالہ یہ بھی صحیح کہتی تھی کہ زریں کی طرح وہ بھی باپ کے رشتے سے اچھی طرح آشنا نہیں تھا۔ وہ اور زریں جب ایک دوسرے کو پہچاننے لگے اور انہیں ایک دوسرے کی عادت ہو گئی تو سلیم واپس آ گیا تھا۔ ایئرپورٹ پر زریں اس سے مستقل چمٹی رہی تھی۔ بڑی مشکل سے چھین کر الگ کیا گیا تھا۔ اس کی چیخیں ایئرپورٹ پر موجود ہر شخص کا دل ہلائے دے رہی تھیں۔ جہاز کے پورے سفر میں یہ چیخیں سلیم کے کانوں میں شور مچاتی رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ زریں کے بغیر یہ دن کیسے گزارے گا۔ اس کے بغیر زریں کس طرح رہے گی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ وہ ایک مشکل صورت حال سے دوچار ہے' لیکن نکلنے کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ سائرہ کو چھوڑنا آسان نہیں تھا۔ سمجھوتے کی شادی ہوتی تو دامن جھٹکا جا سکتا تھا۔ سائرہ تو جذبات کی ڈور میں بندھ کر آئی تھی۔ جذباتی طور پر پہلے ہی زخمی تھی۔ کوئی نیا صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ پھر بھی جانے کیوں اسے یقین تھا سائرہ ہی اسے اس مشکل سے نکال سکے گی۔

سلیم ہفتے کی دوپہر کو پہنچا تھا۔ اپنی اچانک آمد سے حیران کرنے آیا تھا لیکن حیرانیاں خود اس کی منتظر تھیں۔ گھر میں خاصی رونق تھی۔ ظہور' چودھری انور اور سائرہ کے ساتھ اس کی فیکٹری میں کام کرنے والی لڑکیاں آئی ہوئی تھیں۔ وہ سب پوریاں اور سبزی کا ناشتہ کرنے آئے تھے۔ ظہور اور چودھری انور آلو کی سبزی اور چھولے گھر سے پکا کر لائے تھے۔ پوریاں سائرہ کے گھر آ کر تلی تھیں۔ سلیم کی اچانک آمد پر سب حیران رہ گئے۔ ظہور اور چودھری انور نے گلے سے لگایا۔ لڑکیوں نے

صرف ہاتھ ملا کر خوشی کا اظہار کیا۔ سائرہ کھانے کی میز سے اٹھ کر کھڑی سوچ رہی تھی کیا کرے۔ جا کر لپٹ جائے' اسے گھر سے نکال دے' آنسو بہائے یا کمرے میں جا کر خود کو بند کر لے۔ لیکن وہ کچھ نہیں کر سکی بس اسی طرح کھڑی رہی۔ سلیم بھی سب کے سامنے جھجک رہا تھا۔ اس کے ذہن میں سائرہ کے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر دھماکے ہونے لگے تھے۔ وہ زندگی کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش کرنے آیا تھا۔ سائرہ نے پیچیدگی اور بڑھا دی تھی۔ اس نے کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔ سب سائرہ پر ایک نگاہ ڈالتے ہی ڈھیر ہو گئے۔ سائرہ نے میز پر سلیم کے لئے پلیٹ لگا دی اور گرم گرم پوریاں تل کر لے آئی۔ سلیم بے دلی سے کھاتا رہا۔ ظہور اس سے کراچی کے حالات پوچھ رہا تھا۔ لڑکیاں سائرہ کے کانوں میں سرگوشیاں کر کے مسکرا رہی تھیں۔ سائرہ کے چہرے پر شرم کا ہلکا سا سایہ بھی آ کر نہیں گزرا۔ چودھری انور نے جلدی جلدی میز سمیٹ دی۔ لڑکیوں نے برتن دھونے میں اس کی مدد کی جس کے بعد وہ سب اجازت لے کر چلے گئے۔ انہیں معلوم تھا جدائی کا لمبا سفر گزرا ہے۔ دونوں کو تنہائی کی ضرورت ہو گی۔ ظہور نے جاتے ہوئے پلٹ کر حوصلہ دلانے والی نظروں سے سائرہ کو دیکھا۔ لیکن باہر نکلتے ہوئے خود اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

"کیسی ہو؟" سلیم نے سائرہ کے برابر بیٹھ کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے پوچھا۔ سائرہ کا سر معمول کی طرح سلیم کے سینے پر ٹک گیا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی آ گئی۔ لیکن وہ جلد ہی الگ ہو گئی۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ چائے بنا کر لائی تو پاس بیٹھنے کے بجائے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

""تم نے آنے کی خبر نہیں دی ہم تمہیں لینے ایئرپورٹ آتے "سائرہ نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔"

"میرا خیال تھا اچانک آ کر تمہیں حیران کر دوں گا۔ لیکن لگتا ہے میں نے آ کر تمہاری دعوت خراب کر دی۔" سلیم نے طنزیہ ہنسی بکھیرتے ہوئے کہا۔

"میں دفتر کے علاوہ کہیں آتی جاتی نہیں ہوں۔ سب کا خیال ہے ہر وقت

تمہارے لئے اداس رہتی ہوں اس لئے وہ سب آج مجھے خوش کرنے آ گئے تھے۔"
سائرہ نے اس کا طنز نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم تو میرے آنے پر بھی خوش نہیں لگتیں۔" سلیم نے کہا۔

"میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ہر وقت متلی ہوتی رہتی ہے۔" سائرہ اپنے پیٹ کو سہلانے لگی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا۔" سلیم کے لہجے میں شکایت تھی۔

"کب بتاتی۔ جس دن بتانا چاہتی تھی تم نیوزی لینڈ چلے گئے۔ واپس آئے تو میرے بتانے سے پہلے تم نے پاکستان جانے کی خبر سنا دی۔ میں نے یہ خبر سنا کر تمہارے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈالی۔" سلیم نے سوچا شاید وہ صحیح کہہ رہی تھی۔

"اتنی جلدی کیا تھی۔ ابھی تو ہمارا ہنی مون بھی نہیں گزرا۔" اس نے آہستہ آواز میں کہا۔

"کیا یہ بھی ہمارے اختیار کی بات ہے۔" سائرہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"احتیاط تو ہو سکتی تھی۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں ان معاملوں کو بالکل نہیں جانتی۔ تم جانتے تھے تو احتیاط بھی تمہیں کرنی تھی۔"

"ہاں شاید تم سچ کہتی ہو۔" سلیم نے سوچا سائرہ یہ بھی صحیح کہہ رہی تھی۔ غلطی اسی کی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ کچھ کرنے کا وقت بیت چکا تھا۔

"میرا خیال تھا تم جب یہ خبر سنوگے تو خوشی سے اچھل پڑو گے۔ تم تو پریشان ہو گئے۔" سائرہ کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔ یہ کیسا باپ تھا جو اولاد ہونے پر خوش نہیں تھا۔

"نہیں نہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔ بے حد خوش۔ اچانک پتہ چلا تو حیران ہو گیا تھا۔" سلیم نے کہا اور سائرہ کے پاس آ کر اسے پیار کرنے لگا۔ سائرہ نے کسی جوابی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا وہ سمجھ گیا کہ سائرہ کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔ ورنہ

وہ تو اب تک خود اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ روم میں گھسیٹ چکی ہوتی۔ وہ دوبارہ اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔

"تمہاری امی کیسی ہیں۔" سائرہ نے پوچھا۔

"اب بہت اچھی ہیں۔ کافی کمزور ہو گئی تھیں لیکن مجھ سے ملنے کا ٹانک ملتے ہی ان کی صحت بحال ہو گئی ہے۔"

"تم نے انہیں میرے بارے میں بتایا۔" سائرہ نے سلیم کی دکھتی رگ پکڑ لی۔ اسے جواب معلوم تھا۔ لیکن وہ سلیم کا جھوٹ سننا چاہتی تھی۔ سلیم تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

"نہیں میں نہیں بتا سکا۔" سلیم کہنے لگا۔ وہ بڑے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

"وہ بہت خوش تھیں۔ ان کی صحت اچھی ہو رہی تھی۔ میں بتاتا تو شاید پھر بستر سے لگ جاتیں۔"

"پھر کب بتاؤ گے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ شاید جب اگلی بار جاؤں اس وقت۔ کسی دن فون پر یا شاید خط لکھ کر۔" سلیم نے آہستہ سے کہا۔

"میں تھک گئی ہوں جا کر لیٹوں گی۔ تم بھی نہا کر کپڑے بدل لو۔" سائرہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ سلیم اسی طرح بیٹھا اسے کمرے میں جاتا دیکھتا رہا۔

دونوں کی زندگی اپنے اپنے معمول کے مطابق گزرنے لگی تھی۔ سائرہ صبح فیکٹری چلی جاتی۔ سلیم نے روکنا چاہا تھا لیکن سائرہ نے کہا تھا کام میں مصروف ہو کر اس کا دن اچھا گزرتا ہے پورے دن گھر میں رہنا پڑا تو ذہنی توازن کھو دے گی۔ سلیم نے شروع شروع میں اس کا خیال رکھنے کی کوشش کی تھی۔ سائرہ کے فیکٹری سے واپس آنے سے پہلے گھر آ جاتا۔ سائرہ فیکٹری سے آتے ہی کام میں لگ جاتی۔ سلیم کو کھانا نکال کر دیتی۔ خود بہت کم کھاتی۔ کھاتی بھی تو بہت بے دلی کے ساتھ اور کھاتے ہی سونے چلی جاتی۔ برتن دھونے اور سمیٹنے کا کام سلیم نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ وہ

کمرے میں جاتا تو دوسری طرف کروٹ لے کر آنکھیں بند کیئے پڑی رہتی۔ جب سے سلیم آیا تھا اس نے بستر میں اسے ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ سلیم جان گیا تھا کہ پہلے بچے کی پیدائش سے پہلے کے کڑے امتحان سے گزر رہی ہے۔ اسے یاد تھا جب زریں ہوئی تھی تو غزالہ کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ اس کی ماں دیکھنے آتی تو اس سے لڑنے لگتی۔ بستر میں سلیم کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی۔ سلیم نے ایک بار سائرہ کی کروٹ اپنی طرف کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے سلیم کو یہ کہہ کر روک دیا تھا "نہیں پلیز نہیں۔ مجھے متلی ہونے لگتی ہے۔" سلیم رات گئے تک ٹی وی دیکھتا اور پھر صبح دیر تک سوتا۔ اکثر سائرہ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی فیکٹری جا چکی ہوتی۔ سلیم گھر سے دوپہر کا کھانا کھا کر نکلتا اور ہمیشہ دیر سے گھر آتا۔ وہ جان گیا تھا کہ سائرہ کو اس کی مدد کی ضرورت نہیں ہے اس لئے اسے واپسی کی کوئی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ اکثر بے مقصد آوارہ گردی کرتا زیادہ تر کوجی کے ساحل کی منڈیر پر بیٹھا ٹانگیں ہلاتا ہوا تدبیریں سوچتا اور مستقبل کے منصوبے باندھتا رہتا۔

سلیم نے سڈنی واپس آنے کے بعد دوسرے دن سے ہی نوکری کی تلاش شروع کر دی تھی اسے یقین تھا کہ نوکری حاصل کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ وہ آسٹریلیا کا مستقل شہری تھا۔ اس کے پاس انجنیئرنگ کی ڈگری تھی۔ وہ نوجوان تھا۔ اس میں محنت کرنے کی لگن تھی۔ اسے اپنی پسند کی نوکری حاصل کرنے سے کون روک سکتا تھا۔ اسے جلد ہی پتہ چل گیا کہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔ بڑی تیاریوں سے بھیجی ہوئی درخواستوں کے جواب میں معذرت نامے آنے لگے۔ صرف ایک جگہ سے انٹرویو کی کال آئی تھی۔ سلیم بہت تیار ہو کر گیا تھا۔ اس کا خیال تھا انٹرویو بہت اچھا ہوا ہے۔ انٹرویو لینے والے بہت شائستہ لہجوں والے ہمدرد لوگ تھے۔ بہت توجہ اور تفصیل سے سلیم کے جوابات سنتے رہے۔ سلیم کو یقین ہو گیا تھا اسے نوکری مل گئی ہے۔ اس نے ایک بڑی دعوت کرنے کا منصوبہ بھی بنا لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ خبر سن کر سائرہ کے اداس چہرے پر بھی گلاب کھل جائیں گے۔ لیکن پورا ہفتہ گزرنے کے بعد بھی جواب نہیں آیا تو سلیم نے فون کیا۔ معلوم ہوا نوکری کسی اور کو دے دی

گئی ہے۔ سلیم پر مایوسی کا شدید حملہ ہوا۔ پھر بھی اس نے ملازمت کی تلاش نہیں چھوڑی۔ ملازمت دلانے والے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے دروازے کھٹ کھٹاتا رہا۔ جواب ملتا اس کے پاس انجنیئر کی حیثیت سے آسٹریلیا میں کام کرنے کا تجربہ نہیں ہے۔ کچھ تعمیراتی صنعت کی بدحالی کو ذمے دار قرار دینے لگتے۔ سلیم نے مہینے بعد پھر حوصلہ ہار دیا۔ نہ وہ تعمیراتی صنعت کے بحران کو دور کرنے پر قادر تھا اور نہ بغیر کام کئے آسٹریلیا میں کام کرنے کا تجربہ حاصل کر سکتا تھا۔ دوسرے دن صبح وہ پروفیسر وہائٹ سے ملنے یونیورسٹی پہنچ گیا۔

یونیورسٹی میں داخل ہو کر سلیم نے دو تین گہری گہری سانسیں لیں۔ یونیورسٹی کی دنیا اسی طرح تھی۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا کتنی آزادی تھی۔ فضاؤں میں دکھ کے کسی بندھن نے کسی کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈالی تھیں۔ رشتوں کے بوجھ سے کوئی کمر دوہری نظر نہیں آئی۔ سب شیطان کے چیلوں کی طرح خوش باش ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے۔ لائبریری کے سامنے بھی وہی پہلے جیسا ہجوم تھا۔ سیڑھیوں پر سگریٹوں کا دھواں اڑاتے ہوئے لڑکے لڑکیاں قہقہوں کے فوارے چھوڑ رہے تھے۔ لمبے سنہرے بالوں والا پروفیسروں جیسی عینک لگائے ہوئے ایک لڑکا ہاتھوں میں اخبار لئے ابھی تک انقلاب بیچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ موسم ابر آلود تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سب نے جسموں کو موٹے لبادوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پھر بھی ان کے شفاف جسموں سے روحیں جھانکتی ہوئی مسکرا رہی تھیں۔ کوئی بدن تہہ در تہہ خول میں لپٹا ہوا نہیں تھے۔ فضاؤں میں چمکتے خواب تیر رہے تھے۔ کوئی خواب روتا بسورتا ہوا نہیں لگا۔ سب ہنستے اور مسکراتے خواب تھے۔ شاید ایسے ہی خوابوں کی تعبیریں ہنستی ہوئی نکلتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے بادل کا کوئی سیاہ ٹکڑا آبھی گیا تو برس کر فوراً نکل گیا۔ زندگی بھر کے لئے چھت بن کر نہیں لٹکا۔ سلیم کو یاد آیا وہ بھی کتنا آزاد، کتنا ہلکا پھلکا ہوتا تھا۔ جیب میں کافی پینے کے پیسے نہیں ہوتے تھے، بس کا کرایہ بچانے پیدل گھر جاتا تھا، لیکن پھر بھی کتنا سکون تھا۔ سارے سائے ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ایوان۔ بابی۔ نتاشا۔ لمبی اور گھنی زلفوں والی سعیدہ جس نے اس

سے بچھڑ کر اپنے بال کٹوا دیئے تھے۔ پروفیسر تھیو۔ اس کا سپر وائزر جسے سویڈن جا کر دل کا دورہ نہ پڑتا تو اس کی زندگی اتنے انقلابات کا شکار نہ ہوتی۔ کب کا ڈگری لے کر جا چکا ہوتا۔

مارا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

سلیم نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ سیاہ گاؤن اور ہڈ پہنے ہوئے لڑکے لڑکیاں مختلف حصوں میں تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ شاید ابھی ابھی گریجویشن کی کوئی تقریب ختم ہوئی تھی۔ اس کی تصویر بھی ایک ڈیڑھ سال پہلے کھنچ چکی ہوتی۔ سلیم سوچ کر کچھ اداس ہو گیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اوپر کے کیمپس سے نیچے جانے کے لئے نئے بنے ہوئے راستے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔

پروفیسر وہائٹ نے اسے کسی انتظار کے بغیر اپنے دفتر میں بلا لیا۔ وہ اتنے دنوں بعد سلیم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس لئے بھی کہ پروفیسر تھیو سویڈن سے واپس آ گیا تھا اور اگلے سیشن سے اپنی تدریسی ذمے داریاں سنبھالنے والا تھا۔ سلیم نے اپنا کام جہاں سے چھوڑا تھا وہیں سے دوبارہ شروع کر سکتا تھا۔ سلیم نے اسی وقت فارم بھر کر سیکریٹری کے پاس جمع کرا دیا۔ مستقل شہری بننے کا ایک فائدہ ہوا تھا۔ اسے فیس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگلا سیشن ایک ماہ بعد شروع ہوتا۔ لیکن سلیم نے طے کر لیا تھا کہ وہ ابھی سے کام شروع کر دے گا۔ جو کام کر چکا تھا اسے دہرائے گا تاکہ سیشن شروع ہو تو پیچھے پلٹ کر نہ دیکھنا پڑے۔ پروفیسر وہائٹ کو اپنا پرانا وعدہ یاد تھا۔ اس نے یقین دلایا تھا کہ وہ ٹیوٹر کا جز وقتی کام بھی دے گا۔ سلیم ڈپارٹمنٹ سے بہت خوش ہو کر نکلا۔ زندگی کی ایک کہانی تو اپنے صحیح انجام کو پہنچ رہی تھی۔ اس کے گھر کی کہانی کے سرے بھی جڑ جائیں تو۔ یہ سوچتے ہی خوشیاں دھندلانے لگیں۔ ذہن پر فکر کے گہرے بادل چھا گئے۔ اے سمیس میں کافی پی کر دیر تک بیٹھا ہر طرف سے آنے والے قہقہوں کی موسیقی سنتا رہا۔ فکر کے بادل تھوڑی دیر کے لئے پھر چھٹ گئے تھے۔ بعض قہقہے اتنے تیز اور اتنے مسلسل تھے کہ اس نے سوچا انہیں پھیپھڑوں کی ورزش کے لئے دوڑ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہو گی۔

یونیورسٹی سے نکلا تو خنکی بڑھ گئی تھی۔ اب ساحل پر جانے کا موسم ختم ہو گیا تھا۔ لیکن گھر جانے کا وقت بھی نہیں ہوا تھا۔ ابھی تو سائرہ بھی کام سے واپس نہیں آئی ہو گی۔ سلیم ٹہلتا ہوا رٹز سینما کی طرف چلا گیا۔ کوئی کامیڈی فلم لگی تھی۔ فلم دیکھ کر نکلا تو آٹھ بج گئے تھے۔ گھر پہنچتے پہنچتے ساڑھے نو بج گئے۔

سائرہ خلاف معمول ابھی تک ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی اور اپنے بچے کے لئے ننھے ننھے اونی موزے بن رہی تھی۔ میز پر کھانے کی جھوٹی پلیٹیں رکھی تھیں۔

"کیا کوئی آیا تھا۔" سلیم نے سائرہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ظہور بھائی اور چودھری انور آئے تھے۔ کہتے تھے آپ سے مل کر جائیں گے۔ میں نے کھانے کے لئے روک لیا تھا۔ کھانے کے بعد بھی دیر تک انتظار کرتے رہے۔ ابھی ابھی گئے ہیں۔" سائرہ نے کہا۔ لیکن نظریں سلائیاں چلاتے ہوئے ہاتھوں پر تھیں۔

"تمہیں معلوم ہے کہ مجھے ان کا زیادہ آنا جانا پسند نہیں ہے۔" سلیم نے ناگواری سے کہا۔

"نہیں مجھے نہیں معلوم تھا۔ تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا۔ میرا خیال تھا وہ تمہارے بہت اچھے دوست ہیں۔" سائرہ نے سلیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سب مطلب کے دوست ہیں۔" سلیم نے کہا۔ خوش خوش آیا تھا لیکن جانے کیوں تلخ ہو گیا تھا۔

"تم سے انہیں کیا مطلب ہو سکتا ہے۔" سائرہ کے ہاتھوں نے سلائیاں چلانا چھوڑ دیا تھا۔

"مجھ سے نہیں انہیں تم سے مطلب ہے۔ وہ دونوں غیر قانونی ہیں۔ شاید ان کا خیال ہے کہ تم اپنی سہیلیوں سے شادی کرا کے انہیں بھی قانونی بنوا دو گی۔" سلیم کہنے کو تو کہہ گیا تھا لیکن دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ وہ نظریں جھکا کر اپنے جوتے موزے اتارنے لگا۔

"کیا تم نے بھی مجھ سے اسی لئے شادی کی تھی۔" سائرہ نے بہت چبھتے ہوئے

لہجے میں کہا۔ سلیم کو اور زیادہ ندامت ہونے لگی۔ اسے ایسی بات چھیڑنی ہی نہیں چاہئے تھی۔ سائرہ کے قریب جا کر وہ اس کی پیشانی پر بوسہ دینے لگا۔

"چھوڑو بیکار باتیں ہیں۔ یہ بتاؤ تم نے کھانا کھا لیا۔"

"ہاں۔ تمہاری وجہ سے ابھی اٹھایا بھی نہیں ہے۔ اگر ٹھنڈا ہو گیا تو میں گرم کر دیتی ہوں۔" سائرہ کے ہاتھ سلائیوں پر دوبارہ چلنے لگے۔

"نہیں میں خود گرم کر لوں گا۔" یہ کہہ کر سلیم باورچی خانے کی طرف جانے لگا۔ "مٹھائی کس خوشی میں آئی ہے۔" اس نے باورچی خانے میں مٹھائی کے دو ڈبے رکھے دیکھ کر پوچھا۔

"ظہور بھائی اور چودہری انور لے کر آئے تھے۔ دونوں کا امیگریشن کیس منظور ہو گیا ہے۔ آج سے وہ قانونی ہو گئے ہیں۔ تمہیں یہی خوشخبری سنانے آئے تھے۔" سائرہ نے بہت سرد لہجے میں کہا۔ اس کی نظریں اسی طرح سلائیاں چلاتے ہوئے ہاتھوں پر تھیں۔ سلیم کو لگا جیسے کسی نے جوتا بھگو کر اس کے سر پر مارا ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ وہ فون پر ظہور کا نمبر گھمانے لگا۔ سلیم جانتا تھا یہ کتنی بڑی خبر تھی۔ اسے اندازہ تھا دونوں کتنے پرجوش ہوں گے۔ لیکن دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی۔ سلیم نے سوچا وہ صبح ہوتے ہی ان کے گھر خود مبارکباد دینے جائے گا۔

سلیم دوسرے دن صبح ظہور کے گھر پہنچا تو وہ ناشتہ کر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ سلیم نے ظہور کو گلے لگا کر مبارکباد دی۔

"چودہری جی کہاں ہیں۔" سلیم نے پوچھا۔

"پاسپورٹ پر ویزا چپکتے ہی چودہری جی کو پر لگ گئے ہیں۔ صبح ہی صبح سیٹ بک کرانے اور اپنی منگیتر کے لئے شاپنگ کرنے نکل پڑا ہے۔" ظہور نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ نہیں جا رہے۔" سلیم نے پوچھا تو ظہور اداس ہو گیا۔

"میں کس کے پاس جاؤں گا۔ بیٹا ماں کے ساتھ پہلے ہی امریکہ چلا گیا تھا۔ اب بیٹی داماد بھی چلے گئے ہیں۔ جس دن شکل دکھانے کی ہمت پیدا ہو گئی میں بھی ملنے

امریکہ چلا جاؤں گا۔" تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ سلیم کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

"تم کہو۔ سائرہ کیسی ہے۔ کل میں نے بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ بہت غمزدہ نظر آتی ہے۔" ظہور کے لہجے میں تشویش تھی۔

"جی ہاں۔ ہر وقت کھوئی کھوئی لگتی ہے۔ بولتی بھی بہت کم ہے۔ سخت یاسیت کا شکار ہو گئی ہے۔" سلیم کے لہجے میں بھی تشویش تھی۔

"تم جانتے ہو پھر بھی تم نے کچھ نہیں کہا۔" ظہور نے پوچھا۔

"میں نے بہت کوشش کی تھی۔ لیکن اب اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ میری مداخلت پر اور چڑچڑی ہو جاتی تھی۔ تنہائی میں خوش رہتی ہے اس لئے میں بھی اس کے اکیلے پن میں مخل نہیں ہوتا۔"

ظہور نے سوچا سلیم شاید بالکل ہی بے حس ہو گیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک سائرہ نے سلیم سے بات کر کے اپنا معاملہ طے کر لیا ہو گا۔ کل اس نے پوچھا تھا تو سائرہ نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ ظہور جان گیا تھا کہ سائرہ کبھی زبان پر شکایت نہیں لائے گی۔ خاموشی سے کڑھتی اور اپنی زندگی سے کھیلتی رہے گی۔ ظہور نے کل ہی طے کر لیا تھا کہ مناسب موقع دیکھ کر سلیم سے بات کرے گا۔ مناسب موقع آج ہی آ گیا تھا۔ آج دونوں اکیلے بھی تھے اور دونوں کے پاس وقت بھی تھا۔

"تم نے اس کی اداسی کا سبب جاننے کی کوشش نہیں کی۔" ظہور نے پوچھا۔

"ظہور بھائی وجہ آپ کو معلوم ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"آپ انجان بن رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے وہ ماں بننے والی ہے۔ اس زمانے میں یاسیت کی یہ کیفیت ایک معمول کی بات ہے۔ بچہ ہو جائے گا تو دوبارہ ٹھیک ہو جائے گی۔" سلیم نے فیصلہ سنا دیا۔

"میاں اتنی احمقانہ بات کسی اور سے نہ کہنا لوگ ہنسیں گے۔ ماں بننے والی عورتیں ہر وقت یاسیت زدہ اور اداس نہیں رہتیں۔ اور جو ان کی اس حالت کا ذمے

دار ہوتا ہے اس کا تو ہلکا سا لمس بھی انہیں خوش کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔" ظہور کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"تم جاننا چاہتے ہو؟"

"آپ کو معلوم ہے؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ لیکن تمہیں اچھا نہیں لگے گا۔"

"میرے اچھا لگنے کی بات چھوڑیئے۔ میری بیوی اپنی اداسی کا سبب اپنے شوہر کا نہیں محلے والوں کو بتاتی ہے۔ میرے خوش ہونے کے لئے یہی کافی ہے۔" سلیم کا لہجہ بہت غصیلا ہو گیا۔

"سائرہ کو معلوم ہے تم شادی شدہ ہو۔ ایک بچی کے باپ ہو۔" ظہور نے سلیم کی بات کو نظر انداز کر کے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ سلیم کو لگا جیسے اس کے سر پر چٹان آ گری ہو۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"اسے کس نے بتایا؟"

"غزالہ نے۔"

"غزالہ نے؟" سلیم نے حیرت سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

"ہاں غزالہ نے۔ اپنے ان خطوط کے ذریعے جو اس نے تمہیں لکھے تھے اور جنہیں تم بڑی لاپرواہی سے گھر میں چھوڑ گئے تھے۔" ظہور نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے کہا۔

"لیکن سائرہ تو اردو پڑھنا نہیں جانتی۔"

"اسے میں نے پڑھ کر سنائے تھے۔"

"آپ نے؟" سلیم اسی طرح کھڑا تھا۔ آواز اونچی ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں الجھن کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔

"سائرہ نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔" ظہور نے نگاہیں جھکا لیں۔

"آپ کو میری بیوی کے انتہائی نجی خط پڑھنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ آپ کو شرم

نہیں آئی۔" غصے سے سلیم چیخنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے سرعام ننگا ہو گیا ہو۔

"مجھے شرم نہیں آئی؟ شرم تم کو آنی چاہئے۔ ایک معصوم لڑکی کو دھوکہ دے کر شادی کی۔ ہم سب کو شامل کر کے گنہگار کیا۔ اور اب چور ہو کر کوتوال کو ڈانٹ رہے ہو۔" ظہور کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

"کوتوال اور آپ۔ جس کی پوری زندگی اپنی بیویوں کو دھوکہ دیتے گزری ہے۔" ظہور دھپ سے دوبارہ بیٹھ گیا۔ یہ اس کی دکھتی رگ تھی۔ اسے معلوم تھا وہ کچھ بھی کر لے اس کا ماضی آئینہ بن کر سامنے آ جائے گا۔

"ہاں لیکن مجھے اس پر فخر نہیں شرمندگی ہے۔ اس کی سزا بھی بھگت رہا ہوں۔" ظہور نے آہستگی سے کہا۔

"میں نے کچھ کیا ہے تو میں بھی اس کی سزا بھگت لوں گا۔ آپ کو کوتوال بننے کا کوئی حق نہیں ہے۔" سلیم نے ظہور کی طرف انگلی تانتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز اسی طرح اونچی تھی۔

"احمق آدمی سزا تم نہیں دو معصوم لڑکیاں بھگت رہی ہیں۔" ظہور کا غصہ واپس پلٹ آیا۔

"وہ دونوں معصوم لڑکیاں آپ کی کچھ نہیں لگتیں۔ وہ دونوں میری بیویاں ہیں۔ میرا ذاتی معاملہ ہیں۔ آپ نے مداخلت کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" سلیم یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ باہر جاتے ہوئے اس نے جس زور سے دروازہ بند کیا تھا اس کی آواز دیر تک ظہور کے کانوں میں گونجتی رہی۔ اس نے سوچا تھا سلیم کو سمجھائے گا۔ اسے زندگی کے اس دوراہے سے نکلنے میں مدد دے گا۔ لیکن وہ تو پاگل ہو گیا تھا۔

سلیم ظہور کے گھر سے نکلا تو غصے نے دماغ سن کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہاں جائے۔ بہت دیر یونیورسٹی میں گھومتا رہا۔ یونیورسٹی کل کے مقابلے میں آج مختلف لگ رہی تھی۔ ا۔ سمیس میں بیٹھا تو ہنسی کی آوازیں کانوں کو گراں گزرنے

لگیں۔ وہ اپنے ڈپارٹمنٹ کے باہر دیر تک اکیلی پڑی اس بنچ پر بیٹھا رہا جس سے اس کی پرانی شناسائی تھی آج بارش تھمی ہوئی تھی لیکن سورج بھی نہیں نکلا تھا۔ سرد ہوا بدن کاٹ رہی تھی۔ سلیم پھر بھی کوجی کے ساحل پر ٹہلتا رہا۔ سردی زیادہ لگی تو ساحلی سڑک کے دوسرے طرف ایک کیفے میں بیٹھ کر کافی پینے لگا۔ جسم کو اذیت دینے والی ٹھنڈک نے غصہ اور بڑھا دیا تھا۔ تصور میں ظہور کو غزالہ کے خط پڑھتے ہوئے دیکھتا تو سردی کے ساتھ غصے سے بھی کانپنے لگتا۔ خط کی ہر سطر اس کے جسم سے کپڑے کی ایک پٹی اتار دیتی۔ خط ختم ہوتے ہوتے وہ ننگا کھڑا رہ گیا تھا۔ اسے اپنا ننگا ہونا پسند نہیں آیا تھا۔ اسے سائرہ پر سخت غصہ تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا تو اس کا انتظار کرتی۔ خود اس سے پوچھتی۔ اس سے بات کرتی۔ ظہور کو بلا کر خط کیوں پڑھوائے۔ اسے غزالہ پر بھی سخت غصہ آیا۔ خط اس نے لکھے ہی کیوں تھے۔ کیا فون کافی نہیں تھا۔ وہ ہر ہفتے مٹھی بھر پیسے خرچ کر کے ان کی خیریت معلوم کرتا تھا' اس کے بعد خطوں میں افسانے لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

سلیم کو گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ سائرہ فیکٹری سے واپس آگئی تھی اور صوفے پر بیٹھی ہوئی اون اور سلائیوں میں الجھی ہوئی تھی۔ سلیم نے گھر میں داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازہ بند کیا تو سائرہ نے اسے نظر اٹھا کر دیکھا لیکن سلائیوں پر انگلیاں اسی طرح چلتی رہیں۔ سلیم کا غصہ اور بڑھ گیا۔ کتنے سکون سے معصوم بنی بیٹھی تھی۔ وہ اس کے سامنے پڑے ہوئے صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ نظریں آگ برسا رہی تھیں۔ سائرہ کے ہاتھ رک گئے۔ وہ سلیم کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔ اسے لگا جیسے شک میں بھرا ہوا اکرم بٹ حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑا ہو۔ اون اور سلائیاں چھوڑ کر اس نے دونوں ہاتھ اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر رکھ لئے۔ اس کی طبیعت آج اچھی نہیں تھی۔ بچہ دن بھر پیٹ میں لاتیں مارتا رہا تھا ایک بار تو لگا تھا جیسے دل پر چوٹ لگی ہو۔

"کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے۔" سائرہ نے سلیم سے کہا جو اسی طرح کھڑے کھڑے اسے گھور رہا تھا۔

"تم نے میرے نجی خط ظہور کو پڑھنے کے لئے کیوں دیئے تھے۔" سلیم نے اپنی غصے بھری آواز کو دباتے ہوئے کہا۔ سائرہ نے ایک گہری سانس لی۔ تو ظہور بھائی نے سلیم کو بتا دیا۔ شاید ان سے لڑ کر آ رہا تھا جب ہی صرف ظہور کہہ رہا تھا۔ بھائی کا رشتہ خارج کر دیا تھا۔

"انہیں دیئے نہیں تھے۔ صرف پڑھوائے تھے۔"

"لیکن کیوں.....؟"

"اس لئے مجھے اردو نہیں آتی۔ تصویریوں پر تمہاری پوری کہانی نہیں لکھی تھی۔ مجھے پوری کہانی جاننی تھی۔" سائرہ نے بہت سرد لہجے میں کہا۔ اندر سے غصے کی لہر اٹھ رہی تھی۔

"میرا انتظار کیوں نہیں کیا۔ میں مر نہیں گیا تھا۔ بھاگ بھی نہیں گیا تھا۔ تمہیں معلوم تھا میں واپس آنے والا ہوں۔ تمہیں اشتہار بانٹنے کے بجائے مجھ سے بات کرنی تھی۔"

"کسی نے اشتہار نہیں بانٹے۔ ظہور بھائی نے چودہری انور تک کو نہیں بتایا۔ لیکن تم اس طرح سینہ تانے کھڑے ہو جیسے قصور وار تم نہیں میں ہوں۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ اتنا بڑا دھوکہ دے کر الٹا مجھ پر چلا رہے ہو۔" سائرہ کے غصے کو بھی زبان مل گئی تھی۔

"کیسا دھوکہ۔ میں نے تمہیں کوئی دھوکہ نہیں دیا۔" سلیم اسی طرح کھڑا تھا۔ آواز بھی پہلے کی طرح اونچی تھی۔ "میں نے کبھی کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ تم سے میں نے کب کہا تھا کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ تم نے پوچھا ہی کب تھا۔ پوچھتیں تو صاف صاف بتا دیتا۔ دوسری شادی کوئی گناہ نہیں ہے۔ تمہیں تو میرا احسان ماننا چاہئے۔ شادی کر کے میں نے تمہیں نئی زندگی دی۔ سچ مچ کی زندگی۔ تمہارے جذبوں کی جو ٹوٹ پھوٹ تھی اس کی مرمت کی۔ تمہاری تنہائی اور اکیلے پن کو ختم کر کے تمہاری برف کو پگھلایا۔ تمہارے اندر جو کائی جم گئی تھی اسے صاف کیا۔ میں نے تمہیں بیوی ہی نہیں ماں بھی بنایا ہے جس کی تمہیں بڑی حسرت تھی۔ تم اسے دھوکہ

کہتی ہو۔ یہ دھوکہ نہیں تم پر میرا احسان ہے۔ احسان۔" سائرہ کو لگا جیسے اکرم بٹ اس کے جسم کو چھری مار مار چھید رہا ہے۔ کوئی نہیں تھا جو چھری کے وار اپنے جسم پر روک سکتا۔ سائرہ کے جسم کی ساری طاقت نکلی جا رہی تھی۔

"تم نے مجھے نہیں غزالہ کو دھوکہ دیا ہے۔ اپنی بیٹی کو اور میرے پیٹ میں پلنے والے اپنے بچے کو دھوکہ دیا ہے۔" سائرہ کی آواز کمزور ہو گئی تھی لیکن غصے سے کانپ رہی تھی۔

"میں نے کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔ انہیں آرام پہنچانے کے لئے اپنی ہڈیاں کچلی ہیں۔ اپنا کیریئر روند ڈالا ہے۔ تم سب کے دل بہت بڑے ہیں۔ تم سب کو ایک دوسرے سے بہت ہمدردی ہے۔ لیکن وقت ملے تو کبھی میرے اندر بھی جھانک کر دیکھو۔ میرے زخم بھی بہت گہرے ہیں۔" سلیم کی آواز بھرا گئی۔ وہ آکر صوفے پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن سائرہ اٹھ گئی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ پاؤں کپکپانے لگے تھے۔ سلیم کا چہرہ بھی دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے مڑ گئی۔ سلیم اپنا کھانا خود گرم کر لے گا۔ اس نے سوچا۔ لیکن مڑتے ہوئے صوفے کی کنارے سے ٹکرا گئی۔ شاید ٹخنہ مڑ گیا تھا۔ توازن ایک دم بگڑ گیا اور سائڈ ٹیبل پر لڑھکتی ہوئی اوندھی منہ زمین پر گر گئی۔ میز کا کونا پیٹ پر اس زور سے لگا تھا جیسے پیٹ میں بہت سے خنجر گھس گئے ہوں۔ گرتے ہوئے اسے لگا جیسے سامنے کی دیوار سے بچے کی تصویر کا فریم زمین پر گر کر چور چور ہو گیا ہو۔ "میرا بچہ۔" سائرہ کے منہ سے چیخ کی طرح نکلا اور ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

سائرہ کو گرتے دیکھ کر سلیم اچھل کر کھڑا ہوا اور سائرہ کے اوپر جھک کر اسے زور زور سے آوازیں دینے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ وہ اسے بستر پر لے جانے کے لئے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس کا ایک ہاتھ خون میں لت پت ہو گیا۔ سلیم نے دیکھا تو سائرہ کا پاجامہ خون سے رنگین ہوتا جا رہا تھا۔ "اف میرے خدا۔" اس کے منہ سے نکلا اور آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ سائرہ کو اسی طرح زمین پر چھوڑ کر اس نے کانپتے ہاتھوں سے ٹیلی فون ڈائریکٹری کے ورق پلٹے اور

ایمرجنسی کے نمبر تلاش کر کے ایمبولینس بلانے کے لئے فون کرنے لگا۔ ایمبولینس آنے تک وہ سائرہ کا سر اپنی گود میں لے کر بیٹھا زار و قطار رو رہا تھا۔ ہونٹوں پر ایک ہی جملہ تھا۔ "مجھے معاف کر دو سائرہ۔ مجھے معاف کر دو۔" اسپتال جاتے ہوئے ایمبولینس میں سائرہ کے اسٹریچر کے ساتھ بیٹھا ہوا بھی مستقل "مجھے معاف کر دو" کی گردان کر رہا تھا۔ اسپتال پہنچتے ہی سائرہ کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا تھا۔ سلیم انتظار کے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ فون کر کے کس سے مدد چاہے۔ بار بار ایک ہی درگاہ سامنے آ جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہ فون بوتھ کی طرف گیا اور ظہور کا نمبر ملانے لگا۔

ظہور اور چودھری انور ایک گھنٹے میں اسپتال پہنچ گئے۔ سلیم ظہور سے سخت شرمندہ تھا۔ اس کا خیال تھا ظہور اس سے ناراض ہو گا۔ لیکن ظہور نے آکر اسے گلے لگایا اور تسلی دی۔

"مجھے معاف کر دینا ظہور بھائی۔ میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔" سلیم کی آنکھیں پھر نم ہونے لگیں۔

"معافی مجھ سے نہیں سائرہ سے مانگنا۔ لیکن اس کا حال کیا ہے۔ اسے ہوا کیا تھا۔" ظہور نے بہت تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"اپنے کمرے میں جاتے ہوئے صوفے سے ٹکرا کر گری اور بیہوش ہو گئی تھی۔" سلیم نے بتایا اور اپنی طرف آتے ہوئے ڈاکٹر کو دیکھنے لگا۔

"آپ کی بیوی ٹھیک ہے۔ خون بہت بہا ہے اس لئے کمزور ہو گئی ہے۔ لیکن کوئی خطرہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے سلیم کو بتایا تو اطمینان کی ایک گہری سانس نکلی۔ "آپ کا بیٹا ضائع ہو گیا ہے۔ فوری صفائی نہیں کرتے تو جسم میں زہر پھیل سکتا تھا۔" سلیم کے ذہن میں دور کہیں اطمینان کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ڈاکٹر اسے سائرہ کی حالت کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ ایک گھنٹے بعد سائرہ بھی وارڈ میں آ گئی۔ سب سے پہلے سلیم دیکھنے گیا۔ ہوش میں تھی لیکن بالکل پیلی ہو گئی تھی۔ ایک ہاتھ میں ڈرپ اور خون کی بوتل لگی تھی۔ سلیم نے جا کر اس کا ہاتھ تھاما تو اسے دیکھتے ہی

"ہمارا بچہ!" کہہ کر رو پڑی۔ سلیم کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس نے کیا کھویا ہے۔ خون صرف سائرہ کا نہیں اس کا بھی بہا تھا۔ ظہور اور چودھری انور آئے تو ایک بار پھر رو پڑی۔

"میرا بچہ ظہور بھائی میرا بچہ۔" ظہور اور چودھری انور دونوں کے چہروں پر غم کی برسات ہونے لگی۔

"صبر کرو بیٹی صبر۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔" ظہور کی زبان پر صرف یہی روایتی جملہ آ سکا۔ لیکن سائرہ کو صبر نہیں آ سکا۔ وہ بے بس کھڑے اسے بلکتا ہوا دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر نے آ کر ایک انجکشن دیا تو اسے کچھ آرام آیا۔ شاید اعصاب کو سکون دینے والا یا نیند کا انجکشن تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ سو گئی۔ بند آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے نکل کر سفید تکئے میں جذب ہو گئے تھے۔

سائرہ تین دن بعد گھر آ گئی تھی۔ ان تین دنوں میں سلیم مستقل اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا تھا۔ صرف رات کو اس وقت جاتا جب وارڈ میں کسی غیر مریض کے رہنے کا وقت ختم ہو جاتا۔ شام کو سائرہ کے پاس ملنے والوں کا ہجوم رہتا۔ سائرہ کی فیکٹری میں کام کرنے والی اس کی دونوں سہیلیاں روز آتی تھیں۔ چودھری انور اور ظہور صبح ہوتے ہی آتے اور دوپہر کو وہیں سے اپنی نوکریوں پر چلے جاتے۔ جس جاننے والے کو بھی پتہ چلا وہ آیا تھا۔ لگتا تھا سائرہ کے سرہانے پھولوں کی دکان کھل گئی ہو۔ فیکٹری کے مالک نے پھولوں کا جو گلدستہ بھیجا تھا وہ سب سے بڑا اور خوبصورت تھا۔ پورا وارڈ کھل اٹھا تھا۔ اسپتال سے وہ چودھری انور کی ٹیکسی میں آئے تھے۔ گھر آ کر سائرہ دیوار پر لگی ہوئی بچے کی تصویر کو دیکھتی رہ گئی۔ بچے کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ آنسو آنکھوں میں موت بن کر اٹکا ہوا تھا۔

"اس تصویر کو میرے سامنے سے ہٹا لو۔ میرے بچے کو میرے سامنے سے ہٹا دو۔" اس نے ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر روتے ہوئے کہا۔ سلیم نے اسے لے جا کر اس کے کمرے میں لٹا دیا اور دیوار سے فریم اتار کر دوسرے کمرے میں ڈال آیا۔

سلیم کے دن رات سائرہ کی خدمت کے لئے وقف ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے چلتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ وہ ابھی ذہنی طور پر بہت نازک مرحلے سے گزر رہی ہے۔ چند دنوں اسے مضبوط نفسیاتی سہاروں کی ضرورت ہو گی۔ سلیم نے اسے خوش کرنے کے تمام طریقے آزما لئے تھے۔ باہر نکلنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ صرف سودا لینے یا کسی ضروری کام سے باہر جاتا۔ سائرہ سے بھی چلنے کے لئے کہتا لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ وہ دن بھر بستر پر لیٹی رہتی یا کبھی کبھی ڈرائنگ روم میں صوفے پر آ کر بیٹھ جاتی۔ سلیم وہیں اس کا کھانا بھی لے آتا۔ کئی کئی گھنٹے اسے ڈائجسٹوں اور جاسوسی کتابوں کی کہانیاں پڑھ کر سناتا۔ سلیم کے پاس ان کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ جس دن سائرہ کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آ جاتی اس کے وقت کی قیمت وصول ہو جاتی۔ رات کو سو جاتی تو سلیم بھی باہر صوفے پر اپنا بستر لگا لیتا۔ ایک دن سلیم بازار سے واپس آیا تو دیکھا وہ اپنا ادھ بنا موزہ ادھیڑ کر اون کے گولے بنا رہی تھی۔ دوسرے دن دیکھا تو ادھیڑے ہوئے اون سے دوبارہ موزے بننے لگی تھی۔ سلیم کچھ نہیں بولا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی ذہنی حالت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔ وہ شام میں جا کر کچھ مزاحیہ فلمیں لے آیا۔ سلیم خوش ہوا کہ وہ فلمیں دیکھ کر خوش ہو رہی ہے۔ بہت زیادہ ہنسانے والے مناظر پر سائرہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی تھی۔ سلیم دوسرے دن بھی فلم لگا کر بیٹھا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پلیز بند کر دو۔" وہ روتی ہوئی بولی۔

"کیوں کیا ہوا؟" سلیم نے حیرت سے پوچھا۔

"آج مجھے ہنسانے کی کوشش مت کرو۔ آج میرے بچے کا دسواں ہے۔" یہ کہہ کر روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سلیم ٹی وی بند کر کے خالی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ سلیم نے سوچا ان کیفیتوں کو وہ کبھی نہیں سمجھ سکے گا۔ وہ آخر اس کا بھی تو بچہ تھا۔ اسے اتنا دکھ کیوں نہیں تھا۔ شاید اولاد کے کچھ دکھ صرف ماؤں کے نام مخصوص تھے۔

دوسرے دن سائرہ سلیم کو بہت بہتر لگی۔ سلیم کے بہت منع کرنے پر بھی کچن

میں آ کر کھانا پکانے لگی۔ کھانے کے بعد ہمیشہ کی طرح کمرے میں نہیں گئی بلکہ ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئی۔ سلیم کوئی انڈین فلم لے کر آیا تھا۔ اس نے وہ لگا دی۔ فلم ختم کر کے اٹھی تو باتھ روم میں چلی گئی۔ بہت دیر تک باتھ روم سے نہیں نکلی۔ سلیم کو لگا شاید اپنے تمام غموں کو دھو کر باہر نکلے گی۔ تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آئی تو بہت تازہ اور نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ چہرے کا رنگ بھی بہتر تھا۔ وہ اپنا پرس اور چابیاں لے کر باہر جانے کے لئے تیار ہو کر آئی تھی۔ سلیم اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بہت کم بولتے تھے۔ زیادہ گفتگو نگاہوں سے ہوتی تھی۔

"میں باہر جا رہی ہوں۔ کھلی ہوا میں سانس لئے بہت دن ہو گئے ہیں۔"

"دو منٹ ٹھہرو تو تیار ہو کر میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" سلیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں جب تک گاڑی نکالتی ہوں۔" سائرہ نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہم بس سے یا ٹیکسی سے چلیں گے۔ تمہارے لئے گاڑی چلانا ابھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔" سائرہ صرف اتنا کہہ کر باہر نکل گئی۔

سلیم تیار ہو کر نیچے پہنچا تو وہ گاڑی اسٹارٹ کئے ہوئے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بے مقصد سڑکوں پر ڈرائیونگ کرتی رہی۔ راستے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ سائرہ کی سوچتی ہوئی نظریں مستقل سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید وہ دوڑتی اور ہارن بجاتی گاڑیوں کے شور میں کھو کر زندگی کے اس دھارے میں دوبارہ شامل ہونا چاہتی تھی جس سے کئی دنوں تک کٹی رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کی اس آزمائشی ڈرائیونگ کے بعد اس نے برائٹن بیچ کے نزدیک ایک کیفے کے سامنے گاڑی پارک کر دی۔ شادی کے بعد وہ اور سلیم اس کیفے میں کئی بار آ چکے تھے۔ سردیوں میں دن چھوٹے ہو گئے تھے اس لئے رات وقت سے پہلے آ گئی تھی۔ کافی پیتے ہوئے وہ پانیوں کے پار ایئرپورٹ کی جھلملاتی ہوئی روشنیوں کو دیکھتے رہے۔ دونوں خاموش تھے۔ سائرہ تو جیسے

بات کرنا ہی بھول گئی تھی۔ سلیم ے سوچا یہ برف اب توڑنی ہی پڑے گی۔
"سائرہ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہیں بہت دکھ دیا ہے۔" اس نے کتنی بار سائرہ کے کانوں میں یہ جملہ دہرایا تھا۔ لیکن اس وقت جب سائرہ میں بولنے اور سننے کی طاقت نہیں تھی۔ اب ہوش و حواس میں تھی تو سلیم نے اپنے دل کا بوجھ اتارنا چاہا۔ سائرہ اسی طرح شیشے سے باہر دور اندھیرے میں چمکنے والی روشنیوں کو دیکھتی رہی۔ سلیم کی نظریں پلٹیں بھی تو آنکھیں میز کی سطح پر جم گئیں۔
"دکھ تم نے نہیں میرے مقدر نے مجھے دیئے ہیں۔ میرا کالا مقدر کالا ہی رہے گا۔ تم سے شادی کے بعد سمجھی تھی میں نے اپنے نصیبوں کو مات دے دی ہے۔ لیکن اب پھر ہوش میں آ گئی ہوں۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔" سائرہ اسی طرح میز پر نظریں جمائے بول رہی تھی۔
"میں اس دن پاگل ہو گیا تھا۔ شاید اپنا راز افشا ہونے پر جھنجلا گیا تھا۔ میں اپنا ہوش نہ کھوتا تو شاید یہ حادثہ نہ ہوتا۔" سلیم کی معذرت خواہی ابھی جاری تھی۔
"پہلے میں بھی یہی سمجھی تھی۔ مجھے لگا تھا تم نے ہمارے بیٹے کو قتل کیا ہے۔ ساتھ میں مجھے بھی مار ڈالا ہے۔ لیکن بعد میں سکون آ گیا۔ تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی۔ تم نے جو کچھ کہا تھا غلط نہیں کہا تھا۔ جو کچھ تھا میرے تمہارے بیچ تھا ہمارے اپنے گھر کی بات تھی۔ میں جانے کیوں باہر والوں کو اپنے گھر کا حصہ سمجھنے لگی تھی۔ تم نے غلط نہیں کہا تھا۔ ملبورن میں جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد سڈنی آ کر میری زندگی ٹھہر گئی تھی۔ بہت آسان اور ہموار ہو گئی تھی۔ تم مجھے اتار چڑھاؤ والی سچ مچ کی دنیا میں واپس لے آئے۔ تم نے صحیح کہا تھا مجھ پر یہ تمہارا احسان ہے۔ یہ بھی تمہارا احسان ہے کہ تم نے مجھے ماں بنایا تھا۔ لیکن تمہارا یہ احسان میں نے اتار دیا ہے۔" سائرہ کی آنکھیں بالکل خشک تھیں لیکن ہونٹوں پر بکھری ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سلیم کچھ نہیں بولا۔ اس نے بھی نظریں جھکا لی تھیں۔ اس وقت وہ سچ مچ کے جوتے بھی برساتی تو خاموشی سے سہہ لیتا۔
"تمہیں معلوم ہے مجھے اپنے بیٹے کی موت کا زیادہ دکھ کیوں ہوا۔" سائرہ نے

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد سلیم کو دیکھ کر کہا۔ "یہ صرف میرا نہیں پورے ایک خاندان کا دکھ ہے۔ میرے بابا بیٹے کی حسرت میں مر گئے تھے۔ اپنے ماں باپ کے وہ اکیلے بیٹے تھے۔ ان کی دونوں بہنوں کے بھی صرف بیٹیاں ہوئی تھیں۔ میری ماں بھی اکلوتی تھی اس کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ روشن کے اوپر نیچے دو بیٹیاں ہو گئی ہیں۔ بیٹے کی امید پر اب پھر پیٹ سے ہے۔ میرا بچہ خاندان کا پہلا بیٹا ہوتا۔ سوچا تھا جب پیدا ہو گا تو سب کو بتا کر حیران کروں گی۔ اس لئے ماں کو نہیں بتایا تھا اسے پتہ ہوتا تو آج وہ مجھ سے زیادہ دکھی ہوتی۔ جانے کب تک ماتم میں رہتی۔" سائرہ کی آنکھوں پر آنسو پھر دستک دینے لگے۔ اس نے جلدی سے آنکھیں پونچھ کر ٹھنڈی کافی کا آخری گھونٹ لیا۔ سلیم کی آنکھیں جھک گئیں۔ سائرہ کے دکھ اس کے بوجھ بڑھائے جا رہے تھے۔

"میں پیر سے کام پر واپس جا رہی ہوں۔ فون کر کے فیکٹری میں بھی بتا دیا ہے۔" سائرہ نے موضوع بدل دیا۔ سلیم نے اطمینان کا سانس لیا۔ سائرہ کے دل کا بخار نکل کر سلیم کے سر پر چڑھنے لگا تھا۔

"میں نے یونیورسٹی میں دوبارہ داخلہ لے لیا ہے۔" سلیم نے کہا اور اسے اپنے یونیورسٹی کے کام کی تفصیل بتانے لگا۔ سائرہ سن رہی تھی لیکن ایسے جیسے کچھ نہ سن رہی ہو۔

سائرہ اپنی فیکٹری اور سلیم یونیورسٹی جانے لگا تھا۔ پروفیسر تھیو سے اس کی ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ سلیم سے شرمندہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیماری نے سلیم کا مستقبل بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس نے سلیم سے کہا کہ وہ داخلے کی رسمی کارروائیوں کا انتظار نہ کرے۔ کام شروع کر دے۔ سلیم کے لئے اتنے وقفے کے بعد پڑھائی کے موڈ میں آنا آسان نہیں تھا۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ واپس آ رہا تھا۔ گیئر تبدیل ہو رہے تھے۔ گاڑی چڑھائی پر چڑھنے لگی تھی۔ رفتار ابھی سست تھی اس لئے رات ہونے سے پہلے گھر واپس آ جاتا۔ سائرہ کا پرانا معمول بحال ہو گیا تھا۔ فیکٹری سے آ کر باورچی خانے میں مصروف ہو جاتی۔ سلیم آتا تو کھانا تیار ہوتا۔ دونوں میں

بات چیت بہت کم ہوتی۔ رات کو کافی دیر تک سلیم کے ساتھ ٹی وی کے سامنے بیٹھی رہتی۔ اسکرین پر آنکھیں جمی رہتیں لیکن دماغ کہیں اور ہوتا۔ سلیم کچھ کہتا تو چونک پڑتی جیسے کہیں دور سے واپس بلائی گئی ہو۔ سلیم جانتا تھا وہ کیا سوچ رہی ہو گی۔ وہ خود بھی یہی سوچتا رہتا۔ کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ فی الحال غزالہ کو یہ کہہ کر اطمینان دلا دیا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں مصروف ہو گیا ہے۔ ایک سال تو نہ آسکے گا نہ اسے بلا سکے گا۔ فون پر جب اس نے بتایا تو غزالہ کچھ نہیں کہہ سکی تھی بس چپ ہو گئی تھی اور فون زریں کو دے دیا تھا۔ غزالہ سے تو ایک سال کی مہلت لے لی تھی لیکن ایک ہی فلیٹ میں ہر وقت نظروں کے سامنے رہنے والی سائرہ کے ساتھ اس کا ایک ایک دن بھاری تھا۔ وہ جانتا تھا سائرہ فیصلہ کن لمحے تک پہنچنے کی تیاری کر رہی ہے۔ اس لمحے تک پہنچنے کے انتظار میں سلیم کی زندگی ڈرائنگ روم تک محدود ہو گئی تھی۔ رات کو سوتا بھی صوفے پر تھا۔ بیڈ روم میں سائرہ کے ساتھ بستر پر سونے کی ہمت نہیں تھی۔ سائرہ نے کچھ کہا نہیں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس نے کوشش کی تو شرمندہ ہونا پڑے گا۔ بیڈ روم کی الماریوں سے اپنے کپڑے نکالنے جاتا تو سائرہ باہر آ جاتی اور اس وقت تک اندر نہیں جاتی تھی جب تک سلیم باہر نہیں نکل آتا۔

سلیم جمعہ کے روز شام کو جلدی گھر آ گیا۔ سائرہ بھی اسی وقت آئی تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل نہیں کئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہیں جانے کے انتظار میں بیٹھی ہے۔

"آج میں نے کچھ پکایا نہیں ہے۔ سوچا تھا باہر جا کر کھائیں گے۔" سائرہ نے کہا۔ اس کے لہجے میں کسی جذبے کی آمیزش نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے۔ آج ویک اینڈ ہے۔ رونق بھی خوب ہو گی۔ برائٹن لی سینڈ چل کر سی فوڈ کھائیں گے۔ تمہیں پسند بھی بہت ہے۔" سلیم ایک دم خوش ہو گیا۔ انہوں نے سی فوڈ کھایا لیکن اس ریسٹورنٹ میں نہیں جس کا سلیم نے تذکرہ کیا تھا۔ گاڑی جب برائٹن لی سینڈ کی مخالف سمت میں شہر کی طرف مڑی تو سلیم نے سوالیہ انداز میں سائرہ کی طرف دیکھا لیکن وہ ہمیشہ کی طرح صرف سڑک پر نظریں جمائے رہی۔ کار کراؤن اسٹریٹ پر آئی اور اس ریسٹورنٹ کے پاس پہنچ کر سست ہو گئی جہاں انہوں نے

پہلی بار بیٹھ کر کافی پی تھی اور جہاں گھنٹوں بیٹھ کر وہ دنیا بھر کی باتیں کرتے تھے۔ سلیم خوش ہوا کہ سائرہ اب اس کی دنیا میں واپس آنے کے لئے تیار تھی۔ وہ دوبارہ سفر کا آغاز وہیں سے کرنا چاہتی تھی جہاں سے انہوں نے اپنا پہلا سفر شروع کیا تھا یا شاید سفر کو انجام تک پہنچانے آئی ہو۔ سلیم نے سوچا۔ پارکنگ ملنے میں دیر لگی۔ ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو لگتا تھا ٹیبل بھی مشکل سے ملے گی۔ لیکن ریسٹورنٹ کی ایک پرانی ویٹرس نے انہیں پہچان لیا تھا اور انہیں ان کے پسندیدہ کونے کی ایک میز دے دی تھی جہاں سے اسی وقت کوئی اٹھ کر گیا تھا۔

"تمہیں یہ جگہ ابھی تک یاد ہے۔" سلیم نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ آنکھوں میں بہت سی محبتیں امنڈ آئی تھیں۔ لیکن سائرہ کچھ نہیں بولی۔ بس غم کے بوجھ سے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ کھانے کے دوران بھی زیادہ تر خاموشی رہی۔ مچھلی اور جھینگے کھانے کے بعد انہوں نے آئس کریم منگائی تھی اور اب گرم گرم کافی کی چسکیاں لے کر سردی بھگانے کی کوشش کررہے تھے۔ کافی ختم کر کے خاموشی کا سحر سائرہ نے توڑا۔

"میں جب پہلی بار تمہارے ساتھ اس کیفے میں آئی تھی تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں پھر سے دلہن بنوں گی۔ لیکن ہلکی ہلکی گھنٹیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ لگتا تھا دل میں کوئی چپکے چپکے سرگوشیاں کر رہا ہو۔ پورے جسم میں مٹھاس پھیل گئی تھی۔ تم یہ کیفیت نہیں جان سکو گے۔ تم جذبوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہیں آئے تھے۔ تم مجھے اس لئے لائے تھے کہ مجھے شادی کے لئے تیار کر کے قانونی بن سکو۔"

سلیم کو اتنے براہ راست حملے کی توقع نہیں تھی۔

"ہاں شاید.....!" اس نے بہت سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے جنون ہوگیا تھا کہ کسی بھی طرح قانونی بننا ہے۔ اپنے ہر مسئلے کا یہی ایک حل نظر آتا تھا۔ تم سے اسی لئے ملنا شروع کیا تھا۔ لیکن ملتے ملتے پتہ بھی نہیں چلا اور تم اتنی قریب آگئیں کہ زندگی کا حصہ لگنے لگیں۔"

"غزالہ اور اپنی بیٹی کو کیوں بھول گئے تھے۔"

"آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی۔ تم بھی حواس پر چھائی ہوئی تھیں۔ میں جانتا تھا

شادی کے بغیر تمہیں حاصل نہیں کر سکوں گا۔"
"لیکن تم کتنی زندگیوں سے کھیل گئے۔ تم یہ بھی بھول گئے کہ یہ شادی تمہیں قانونی تو بنا دے گی لیکن تمہاری زندگی کا سب سے بڑا پچھتاوا بن جائے گی۔"
"تم سے شادی کا پچھتاوا نہیں زندگی کا ایک بہت خوبصورت تحفہ ہے۔ پچھتاوا تو وہ خواب ہیں جو میں نے دیکھے تھے۔ قانونی بن کر مجھے ملا بھی کیا۔ ایک نوکری تک نہیں مل سکی۔ دو سال تک بے روزگاری الاؤنس بھی نہیں لے سکوں گا۔ تمہاری دی ہوئی چھت نہ ہوتی تو ایک بار پھر فیکٹریوں میں اپنا خون نچوڑتا۔ میرا پچھتاوا تم سے شادی نہیں وہ دکھ ہیں جو میں نے تمہیں دیئے ہیں۔" سلیم کے لہجے میں خلوص تھا۔ سائرہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے جذبے کتنے سچے تھے۔ شاید سچ بول رہا ہو۔ اگر چھوڑنا چاہتا تو اب تک چھوڑ چکا ہوتا۔ وہ تو بہت مشکل وقت میں اس کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا تھا اور پھر دل بھی تو تھا اس کا کیا کرے۔ کتنا چاہا تھا کہ اسے نہ چاہے۔ بھول جائے۔ نفرت کرنے لگے۔ لیکن دل اسی کی دھن پر دھڑکتا تھا۔ وہ اس کی پہلی محبت تھی، پہلا اجنبی لمس جو اس کے جسم پر دراز ہوا تھا اور پھر اس کی روح تک پھیل گیا۔ جسے اس نے خدا رسول کی گواہی میں اپنا سب کچھ مانا تھا۔ وہ اس کے بچے کا باپ تھا جس نے اس کے پیٹ میں زندگی کی چند سانسیں لی تھیں۔ وہ اسے کیسے چھوڑے۔ کیسے جانے دے۔

"شاید تم سچ کہہ رہے ہو۔" سائرہ نے اپنی سوچوں کو زبان دی۔ لیکن غزالہ اور تمہاری بیٹی زریں زیادہ بڑا سچ ہیں۔ اس دوراہے سے کیسے نکلو گے۔ کسے چھوڑو گے۔ کس کے ہو کر رہو گے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں نے بہت سوچا لیکن کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ تمہیں بھی سچے دل سے اپنایا ہے۔ غزالہ اور زریں کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تم غزالہ کو نہیں جانتیں۔ بہت نازک ہے۔ ذرا سی چوٹ لگتے ہی اس کا شیشہ چٹخ جائے گا۔ اسے پتہ چلا میں نے شادی کر لی ہے تو زندہ نہیں رہے گی۔" سائرہ کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھر آئی۔ سخت جان تو وہ تھی۔ مصائب سہنے میں تجربہ کار۔ اسے پتہ چل گیا

پھر بھی زندہ ہے۔ وہ چھوڑ کر چلا جائے پھر بھی زندہ رہے گی۔

"سب زندہ رہتے ہیں۔ کوئی نہیں مرتا۔" سائرہ نے کہنا شروع کیا۔ "یہ تم مردوں کی اپنے بارے میں خوش فہمی ہے۔ عورت کے مقابلے میں اپنی اہمیت اور طاقت کا احساس بڑھانے کی کوشش۔ عورت کو تم کبھی نہیں سمجھ سکو گے۔ عورت کتنی ہی نازک ہو المیوں سے گزر کر مرتی نہیں اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ میں جب شادی ہو کر ملبورن آئی تھی معصوم، مظلوم اور نازک سمجھ کر سب مجھ پر رحم کھاتے تھے۔ لیکن اتنے بڑے المیوں سے گزر کر بھی زندہ رہی۔ اب اپنی شادی کو ایک بار پھر اجڑتا دیکھ کر بھی زندہ ہوں۔ میرا بچہ مر گیا تب بھی نہیں مری۔ بار بار وہ لمحہ آیا جب لگتا تھا دم نکل جائے گا، زندگی بیکار نظر آنے لگتی تھی لیکن وہ لمحہ گزر گیا تو سانس پلٹ آئی۔ زندگی پھر اپنے ہنگاموں کی طرف لوٹ گئی۔ غزالہ کو پتہ چلا تو اسے بھی کچھ نہیں ہو گا۔ میری طرح اس کا شیشہ بھی سخت ہو جائے گا۔" سائرہ کو بھی اپنے جذبوں کو آواز دینی آگئی تھی۔

"تم غزالہ کو نہیں جانتیں۔ وہ......." سلیم نے کہنا چاہا لیکن سائرہ نے بات کاٹ دی۔

"میں اسے اچھی طرح جان گئی ہوں۔ میں نے اسے نہیں دیکھا نہ اس سے ملی ہوں لیکن میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کے ایک خط نے مجھے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"مسئلہ صرف غزالہ کا نہیں ہے۔" سلیم نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "کئی زندگیاں اس کے ساتھ نتھی ہیں۔ زریں ہے۔ میری ماں ہے۔ غزالہ کی ماں ہے جو میرے لئے بھی ماں کی طرح ہے۔ میں ان سے کبھی نہیں کہہ پاؤں گا۔ تم مجھ سے بار بار پوچھتی ہو کہ ماں کو کب بتاؤں گا۔ میں صرف بہانے بناتا رہتا رہا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ میں ماں کو نہیں بتا سکوں گا۔ وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال دے گی۔"

"تو پھر کیا کرو گے۔ کوئی حل تو نکالنا ہو گا۔" سائرہ نے سلیم کے چہرے پر

نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں نے غزالہ کو بتا دیا ہے کہ اسے ایک سال انتظار کرنا ہو گا مجھے اپنا ماسٹرز مکمل کرنا ہے۔ یہ غلط بھی نہیں ہے۔ ایک سال بعد جاؤں گا تو چند مہینے ان کے ساتھ رہ کر واپس آ جاؤں گا۔ چند سال اس طرح آتے جاتے گزر جائیں گے۔ شاید اس دوران کوئی راستہ نکل آئے۔" سائرہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"تم یہ دوہری زندگی کب تک گزار سکو گے۔ جھوٹ زیادہ عرصے تک چھپا نہیں رہتا۔ جھوٹ بولنے والے صرف خود کو دھوکہ دیتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے سمجھتے ہیں انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔"

"تو پھر تم بتاؤ۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کیا تمہارے پاس کوئی حل ہے۔"

"ہاں ہے!" سائرہ نے کہا تو سلیم حیرت سے چونک پڑا۔

"کیا؟"

"میرے پاس حل ہے۔ صرف ہمیں تھوڑی سی ہمت کرنی ہو گی۔" سائرہ آج صرف کھانا کھانے باہر نہیں نکلی تھی۔ سب کچھ طے کر کے آئی تھی۔ اس کیفے میں بھی اتفاقاً نہیں آئی تھی۔ یہاں آنے کا مقصد اس رشتے پر سلیم کا اعتماد بحال کرنا تھا جس میں وہ سلیم کے ساتھ جڑ گئی تھی۔ اس کے لئے تو یہ رشتہ اب موت کے ساتھ ہی ختم ہو سکتا تھا۔ اس نے بہت سوچ کر فیصلہ کیا تھا۔ رات رات بھر جاگ کر یہ حل نکالا تھا۔ اس کا خیال تھا اس سے بہتر حل نکلنا ممکن نہیں تھا۔ سلیم اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ہم آسٹریلیا سے سب کچھ ختم کر کے پاکستان چلے جائیں گے۔ مستقل طور پر وہیں رہیں گے۔" سائرہ نے کہا۔

"تم دیوانی ہو گئی ہو۔" سلیم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ لیکن سائرہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"اسلام میں دو شادیاں کوئی گناہ نہیں ہیں۔ میں غزالہ کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر

اسے منا لوں گی۔ اس کی بہن بن کر اس کے ساتھ رہوں گی۔ زریں کی ایک نہیں دو مائیں ہو جائیں گی۔ تمہاری امی کو شروع میں دکھ ہو گا لیکن ان کی خدمت کر کے انہیں بھی منا لوں گی۔ غزالہ قبول کر لے گی تو اس کے ماں باپ بھی مان جائیں گے۔ ہم یہ مکان بیچ دیں گے۔ میں نے ایجنٹ سے بات کر لی ہے۔ ہفتے کے روز وہ دیکھنے آئے گا۔ مکان سے جو پیسے ملیں گے وہ اور میرے ڈپازٹ میں جو رقم ہے اس سے تم پاکستان میں خود اپنا کوئی کام کر سکو گے۔ جب تک تمہارے قدم جمیں گے مجھے رفی کے دفتر میں ملازمت مل جائے گی۔ میں نے ان سے بات کی تھی۔ وہ کہتی ہیں انہیں پاکستان میں مجھ جیسی سیکریٹری کہاں سے ملے گی۔ وہ فوراً تیار ہو گئی ہیں۔ تمہارے کسی بزنس میں پیسہ لگانے پر بھی تیار ہیں۔ لیکن میں نے منع کر دیا ہے۔ ہمیں ان کا پیسہ نہیں چاہیے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے ہم اس سے کام شروع کر سکتے ہیں۔ صرف تمہیں تھوڑی سی ہمت کرنی پڑے گی۔ تمہیں غزالہ سے بات کرنی ہو گی۔ یقین جانو غزالہ کو کسی اور ذریعہ سے معلوم ہوا تو بہت دکھی ہو گی' بالکل ٹوٹ جائے گی۔ لیکن تم خود اعتماد میں لے کر بتاؤ گے تو چوٹ آسانی سے سہہ لے گی۔ سائرہ امید بھری نظروں سے سلیم کی طرف دیکھنے لگی جو بہت حیرانی کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم نے سب کچھ خود طے کر لیا۔ مکان بیچنے کی بات کر لی۔ پاکستان میں ملازمت بھی ڈھونڈ لی۔ میرے سوٹ کیس بھی شاید پیک کر دیئے ہوں۔" سلیم نے بہت تلخ لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں کیا ہے۔ صرف امکانات دیکھے ہیں۔ آج اسی لئے آئی ہوں کہ تم سے مل کر فیصلہ کر سکوں۔" سائرہ نے سلیم کے لہجے کو نظر انداز کر کے اسی طرح نرم اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تم فیصلہ کرنے نہیں مجھے فیصلہ سنانے لائی ہو۔ تم نے ایک خط سن کر فرض کر لیا ہے کہ تم غزالہ کو مجھ سے زیادہ جاننے لگی ہو۔ میں نے غزالہ کو چھوٹی سے بڑی ہوتے اور پھر اپنی بچی کی ماں بنتے دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ مرے گی نہیں۔ دکھوں سے کوئی مرتا نہیں ہے۔ لیکن مردوں سے بدتر ہو جائے گی۔ کچھ نہیں کہے گی

بس اپنے ماں باپ کے گھر جا کر بیٹھ جائے گی۔ میری شکل تک نہیں دیکھے گی۔ مجھے کبھی زریں سے نہیں ملنے دے گی۔ میری ماں بھی گھر سے نکل کر غزالہ کے ساتھ اپنی بہن کے پاس چلی جائے گی یا شاید مر جائے گی۔ تمہیں ان رشتوں کی شدتوں کا اندازہ نہیں ہے۔"

"ہاں مجھے نہیں ہے۔ میں نے رشتے کبھی دیکھے نہیں ہیں۔ میری ماں ہے نہ بہن۔ میری شادی بھی کچے دھاگے میں بندھی ہوئی پتنگ کی طرح ہے' جب چاہا توڑ دی' کاٹ دی یا لوٹ لی۔ اولاد کا دکھ بھی میں نے نہیں دیکھا۔ رشتوں کی شدت میں کیسے جانوں گی۔" سائرہ کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔ آنکھوں کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ کیا کیا سوچا تھا کیسے کیسے منصوبے بنائے تھے۔ سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو گئی تھی۔ اپنا گھر' وطن' پیسہ اور خود اپنے آپ کو۔ اور کس لئے۔ اس رشتے کو بچانے کے لئے جو اس کے لئے زندگی بھر کا رشتہ تھا۔ لیکن وہ اسے رشتوں کا سبق سکھا رہا تھا۔ اسے رفی کی بات یاد آ گئی۔ رفی سے جب اس نے پاکستان آنے کی بات کی تھی تو اسے سب کچھ بتانا پڑا تھا۔ رفی سچ مچ بہت اداس ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی غصہ بھی آیا تھا۔ اس نے بہت سختی سے کہا تھا کہ وہ سلیم کو چھوڑ دے۔ فوراً" الگ ہو جائے۔ سائرہ نے دل میں سوچا تھا رفی کیا جانے رشتے کیا ہوتے ہیں۔ کوئی اپنا شوہر کیسے چھوڑ سکتا ہے' باپ' ماں' بہن' بھائی' اولاد سب کچھ اسی رشتے کے تعلق کی کوکھ سے تو نکلے ہیں۔ کوئی اپنی ماں اور اولاد نہیں چھوڑتا تو پھر شوہر کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ رفی سمجھ گئی تھی کہ ستی ہونے کا جذبہ رکھنے والوں کو سمجھانا مشکل ہے۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" سلیم کے لہجے میں نرمی اور محبت آ گئی۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے سائرہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ سائرہ نے ہاتھ کھینچا نہیں۔ سلیم جانتا تھا تلخ ہونے اور طنز کرنے سے کوئی فائدہ نہیں اس کے مسئلے کا حل سائرہ کے ذریعے ہی نکلے گا۔ اس کے ذہن میں ایک خاکہ سا بننے لگا تھا۔

"مجھے پاکستان نہیں جانا ہے۔ میں نے بے وطنی کے کئی سال گزارے ہیں اب نیا وطن ملا ہے تو پرانے وطن جا کر مجھے دوبارہ بے وطن نہیں ہونا۔ وہاں جا کر رہنا

صرف چند دنوں کا رومانس ہے۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں وہاں زندگی کتنی دشوار ہے۔ رات رات بھر بجلی غائب رہتی ہے۔ مچھروں کے غول رات بھر خون چوستے ہیں۔ مجھے تو گرمی میں بھی سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر سونے کی عادت ہو گئی تھی۔ لیکن غزالہ زریں کو مچھروں کے زہر سے بچانے کے لئے رات رات بھر جاگ کر گزارتی تھی۔"

"میں حیدر آباد کے جس گھر میں رہتی تھی اس میں بجلی نہیں تھی۔" سلیم نے سانس لینے کے لئے وقفہ لیا تو سائرہ بولنے لگی۔ "میں نے اپنا سارا بچپن اور جوانی لالٹین کی زرد بیمار روشنی میں گزاری ہے۔ تم نے ہمارے گھر کے مچھر نہیں دیکھے۔ وہ پالتو جانوروں کی طرح ہمارے ساتھ رہتے اور ہمارے خون پر پلتے تھے۔ عذرا جب چھوٹی تھی تو ایک دفعہ ہم اس کا چہرہ دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ مچھروں نے بھڑوں کی طرح اس کا چہرہ کاٹ ڈالا تھا۔ لگتا تھا چیچک نکل آئی ہے۔ ہمارے گھر کے باہر صرف بدبوئیں اگتی تھیں۔ تم تو ایک صاف بستی کے بجلی والے بڑے سے گھر میں رہتے ہو جس کے دروازے پر ایک گاڑی اور حکم بجا لانے والا ڈرائیور بھی کھڑا ہے۔"

"ہاں، لیکن اس گاڑی میں بہت جھک کر بیٹھنا پڑتا ہے کوئی کسی بھی وقت گاڑی سے اتار کر باپ دادا کا نام پوچھ لیتا ہے۔ پتھر مار کر شیشہ توڑ دیتا ہے۔ تمہاری لالٹین کی روشنی امید تو دکھاتی ہو گی۔ ہماری روشنی صرف تاریکیوں کے درمیان کا وقفہ بن گئی ہے۔ تم بدبو کی پٹی پھلانگ کر باہر جاتی ہوگی تو بدبو تمہارا تعاقب نہیں کرتی ہو گی۔ ہماری بدبوئیں ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ہم یا تو گدھ بن جاتے ہیں یا محض ایک لاش۔ مجھے مردہ کھانے والا گدھ نہیں بننا۔ نہ مجھے لاش بن کر گدھوں کی خوراک بننا ہے۔ مجھے گدھوں اور لاشوں کی اس ویران اندھیری بستی میں واپس نہیں جانا۔" وہ سمجھ گئی کہ سلیم حالات کا بہت بھیانک نقشہ کھینچ کر اس کے منصوبے کی دھجیاں بکھیر دینا چاہتا ہے۔ سائرہ نے پھر بھی ہار نہیں مانی۔

"لیکن اس بستی کے رہنے والے اب بھی اسی بستی میں رہتے ہیں۔ سب اپنا ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں رہنے نہیں چلے گئے۔"

"اس لئے کہ ان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ جو جا سکتا تھا چلا گیا' جو جا سکتا ہے جا رہا ہے۔ میں بھی یہی کہتا تھا۔ جو دوست ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے انہیں بہت حقارت سے دیکھتا تھا۔ کبھی پاکستان آ کر ملتے تو ان کی حب الوطنی کا مذاق اڑا کر ان کے ضمیر کا بوجھ بن جاتا۔ لیکن اس دفعہ جب مجھے اپنی ہی گلیوں میں سر جھکا کر خوفزدہ ہو کر چلنا پڑا تو وہ لوگ بہت ذہین لگے جو مستقبل کو پڑھ کر بہت پہلے ملک چھوڑ گئے تھے۔"

سلیم خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ وہ پانی اور ایک اور کافی لانے کے لئے ویٹرس کو اشارہ کرنے لگا۔

"تم مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں نے پہلے سے کوئی فیصلہ کر لیا ہے۔ فیصلہ تو تم کئے بیٹھے ہو۔ غزالہ کو ہمارے بارے میں بتاؤ گے نہیں۔ پاکستان اچانک ایک اندھیری بستی بن گئی ہے۔ وہاں لے کر بھی نہیں جاؤ گے۔ تو پھر کیا کرو گے۔ مجھے چھوڑ دو گے؟" سائرہ جھنجھلا گئی۔

"تم بار بار یقین حاصل کرنا چاہتی ہو۔ لیکن جتنی بار پوچھو گی یہی بتاؤں گا کہ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے تمہیں چھوڑنے کے لئے تم سے شادی نہیں کی تھی۔" سلیم نے ہر لفظ پر بہت زور دے کر کہا۔

"تو پھر ہم کیسے رہیں گے' اس الجھن سے نکلنے کے لئے کیا کریں گے۔" سائرہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"تم اور غزالہ ایک دوسرے کی بہن بن کر میرے ساتھ رہو گی۔ لیکن پاکستان میں نہیں۔ آسٹریلیا میں۔ یہاں سڈنی میں۔" سلیم نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"کیا؟ اب شاید تم دیوانے ہو گئے ہو۔" سائرہ نے بہت حیرت سے کہا۔ لیکن سلیم نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"غزالہ کو یہاں بلا کر بتانا آسان ہو گا۔ پاکستان میں کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ غزالہ یہاں آ کر کچھ دنوں میں ماحول کو سمجھ جائے گی' اسے سمجھانا مشکل نہیں ہو گا کہ تم سے میری شادی سب کی زندگیوں کو بہتر بنانے کے لئے کتنی

ضروری تھی۔ تم بھی اس سے جلدی گھل مل جاؤ گی جس کے بعد اسے اعتماد میں لینا آسان ہوگا۔" سلیم نے اپنے منصوبے کا پہلا حصہ اسے بتایا۔ دوسرا حصہ بتانا ذرا مشکل کام تھا۔

"تم واقعی دیوانے ہو گئے ہو۔ تمہیں معلوم ہے آسٹریلیا میں ایک ساتھ دو بیویاں رکھنا جرم ہے۔ تم جیل چلے جاؤ گے۔ اور پھر غزالہ کو آسٹریلیا لاؤ گے کیسے بچی کے ساتھ تنہا آنے والی عورت کو وزٹ ویزا نہیں ملے گا۔ اور مل بھی گیا تو چند مہینے بعد واپس چلی جائے گی۔ مسئلہ وہیں رہے گا جہاں تھا۔" سائرہ خاموش ہو کر سلیم کو دیکھنے لگی۔ وہ چپ تھا۔ ویٹرس کافی کا کپ بھر گئی تھی وہ اس میں چینی ڈال کر چمچہ گھمائے جا رہا تھا۔ سائرہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گئی کوئی دھماکہ ہونے والا ہے۔ سلیم کوئی ایسی بات کہنے والا ہے جو اسے پسند نہیں آئے گی۔ اسی لئے کہنے میں ہچکچا رہا ہے۔

"ہم کاغذوں پر اپنی شادی ختم کر دیں گے۔ میں غزالہ سے دوبارہ شادی کر کے اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے آسٹریلیا لے کر آؤں گا۔" سلیم نے ایک لمحے کا توقف لے کر گرم گرم کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔ سائرہ پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سلیم کو دیکھ رہی تھی۔ سائرہ کے لئے شادی ختم کرنے کا تصور ہی گناہ تھا۔ کاغذ پر سہی' طلاق طلاق تھی۔ اس لفظ کی آواز ہی مکروہ تھی۔ ٹھیک ہے رشتے کاغذوں سے نہیں بنتے اور ٹوٹتے۔ لیکن گیند بنا کر ان سے کھیلا بھی نہیں جاتا۔ سلیم اسے خاموش دیکھ کر پھر بولنے لگا۔

"ہماری شادی کبھی ختم نہیں ہو گی۔ ہم نے اسلامی طریقے سے نکاح پڑھوایا تھا۔ شرعی اور اسلامی طور پر ہم میاں بیوی رہیں گے۔ صرف قانونی ضرورت کے لئے عدالت میں رجسٹر کی جانے والی شادی کو ختم کر دیں گے۔ غزالہ کو بیوی بنا کر لاؤں گا تو قانونی طور پر میری وہی ایک بیوی ہو گی لیکن شرعی طور پر تم بھی میری بیوی ہو گی۔ ہمیں ساتھ رہنے سے کوئی قانون نہیں روک سکے گا۔" سلیم نے اپنے سینے کا بوجھ اتار دیا۔

"تم اسی لئے سول میرج کے لئے بضد تھے۔" سائرہ کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ آ گئی۔ "تم نے پوری بساط پہلے سے سجائی ہوئی تھی۔ ہر چال سوچی ہوئی تھی۔ تم واقعی بہت اچھے منصوبہ بند ہو۔ تم رشتوں کو مہرے سمجھ کر کھیلتے ہو۔ جس کو جب چاہا پٹوا کر قربان کر دیا۔ جب چاہا دوسری طرف پہنچا کر زندہ کر دیا۔ میں اب تمہارا مہرہ بننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ تم سے میرا رشتہ بھی کاغذ کا گھر نہیں ہے۔ میں نہیں توڑوں گی۔ زیادہ سے زیادہ سمجھ لوں گی کہ ایک بار پھر بیوہ ہو گئی ہوں۔"

سائرہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سلیم اسی طرح بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

"تم چاہو تو بیٹھو لیکن مجھے اب گھر جانا ہے۔" سائرہ نے کہا۔

"میں بھی چلتا ہوں۔" سلیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن چلنے سے پہلے یہ غلط فہمی دور کر لو کہ میں نے کوئی بساط سجائی تھی۔ سول میرج کی ضرورت صرف اس لئے تھی کہ میرا کیس جلدی اور آسانی سے داخل ہو گیا تھا۔ رشتے میرے لئے بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے تمہارے لئے۔ تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ ایسا نہ ہوتا تو چھوڑ کر چلا جاتا۔ کل نہیں گیا تھا تو آج چلا جاتا۔ شطرنج کھیلنی ہوتی تو تمہیں چھوڑنا سب سے سیدھی اور آسان چال تھی۔ میں نے جو ترکیب سوچی ہے اس کی ہمت اس لئے ہوئی کہ تمہیں غزالہ کے ساتھ میری بیوی بن کر رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تمہارے پاس جو کچھ ہے تم اسے لے جا کر پاکستان کی بھٹی میں جھونک دینا چاہتی ہو۔ میں اپنے ضمیر پر ایک اور بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ تم میری بیوی ہو اور رہو گی۔ صرف قانونی طور پر نہیں رہو گی۔ اور اس وجہ سے تمہاری کسی چیز پر تمہارے ایک ڈالر پر بھی میرا کوئی قانونی حق نہیں ہو گا۔ تمہارا کچھ نہیں جائے گا۔ وہ رشتہ بھی نہیں جو تمہاری طرح مجھے بھی پیارا ہے۔ پاکستان جانے کی تجویز صرف نقصان کا سودا ہے۔ ہو سکتا ہے سب کچھ چلا جائے۔ ہو سکتا ہے سب کچھ اس طرح نہ ہو سکے جو تم سوچ کر جا رہی ہو۔" سلیم کو بولتے بولتے پھندہ لگ گیا۔ وہ دیر تک کھانستا رہا۔ سائرہ کو ایک بار پھر اس کی باتوں میں وہی خلوص نظر آیا جو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنی طرف کھینچنے لگتا تھا۔

"رشتے میرے لئے نفع نقصان کا سودا نہیں ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چل دی۔ سلیم بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چلا آیا۔ گھر واپس جاتے ہوئے سائرہ کو گاڑی چلانے پر اپنی توجہ مرکوز رکھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا سلیم کو کیا سمجھے۔ دھوکے باز۔ مکار۔ مطلبی۔ یا اس کی باتوں کو سچ مان لے۔ ویسے سلیم نے غلط نہیں کہا تھا۔ سائرہ خود ہی تو اس کی دوسری بیوی بن کر رہنا چاہتی تھی۔ خود ہی کوڑی کوڑی کو محتاج ہونے کی راہ پر چلنا چاہتی تھی۔ وہ مطلبی ہوتا تو اس کی بات مان لیتا۔ اسے سب کچھ مل رہا تھا۔ اپنا سب کچھ دے چکی تھی۔ جو کچھ بچا تھا وہ بھی دینے کے لئے تیار تھی۔ لیکن۔ لیکن۔ یہ لیکن ایک سوال بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی اسے فیصلہ خود کرنا ہے۔ رفی اور ظہور سے مشورہ لینا بیکار تھا۔ وہ دونوں اسے پہلے ہی دیوانہ سمجھتے تھے کہ وہ سب کچھ جان کر بھی سلیم سے چپکی ہوئی ہے۔ وہ دونوں میرے دل کے جذبوں کو اور ان رشتوں کو کیا جانیں۔ اس نے سوچا۔ تین دن بعد سائرہ نے سلیم سے ہاں کر دی۔

ہاں کرنے سے پہلے کے دل و دماغ میں کافی بحث ہوئی تھی۔ دل تو پہلے ہی ہاں کہنے کے لئے بیتاب تھا۔ لیکن وہ دل کے ساتھ دماغ کو بھی فیصلے میں شریک کرنا چاہتی تھی۔ دماغ کا فیصلہ بھی مختلف نہیں تھا۔ صرف ایک ہچکچاہٹ تھی۔ کیا شرعی طور پر یہ سب کچھ صحیح تھا۔ کیا سلیم صحیح کہہ رہا تھا۔ کاغذی طلاق کے بعد وہ اس کی شرعی بیوی رہ سکے گی۔ ظہور بھائی کو فون کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ مولانا جنھوں نے اس کا نکاح پڑھایا تھا۔ ظہور کے دوست تھے۔ شرعی معاملے میں ان کی رائے مستند ہو سکتی تھی۔ ظہور یہ سن کر کہ سائرہ کیا کرنا چاہتی ہے، سخت غصے میں آیا۔ اس نے بحث کرنے کی کوشش کی، لیکن سائرہ اٹل تھی۔ ظہور نے سوچا شاید مولوی سے مل کر عقل آ جائے۔ دوسرے دن سائرہ فیکٹری سے چھٹی لے کر ظہور کے ساتھ مولانا سے ملنے لیور پول چلی گئی۔

"طلاق کاغذ پر دی جائے یا زبان سے، طلاق طلاق ہے۔" مولانا نے سائرہ کا

مسئلہ سن کر کہا۔ ظہور نے سائرہ کو ان نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "میں نے پہلے ہی کہا تھا۔" لیکن مولانا کی باقی باتیں سن کر اس نے اپنی نظریں واپس لے لیں۔

"لیکن بچت کا ایک پہلو موجود ہے۔" مولانا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "طلاق اس وقت تک واجب نہیں جب تک تین دفعہ نہ دی جائے۔ قانونی طور پر دی جانے والی طلاق ایک بار دی جائے گی جس کے نتیجے میں طلاق مکمل نہیں ہو گی۔ ایک بار دی جانے والی طلاق پر بعد میں زوجہ سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔"

"رجوع کرنے کا کیا مطلب ہے۔" سائرہ نے مولانا کو روک کر پوچھا۔

"اسے درگزر کیا جا سکتا ہے۔ غصہ یا اشتعال کی حالت میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ لیکن شوہر اگر ایک بار دی ہوئی طلاق کو بھول جائے اور معافی تلافی کر لے تو پھر طلاق واجب نہیں رہتی۔ بیوی سے رجوع کرنے کے بعد شرعی طور پر وہ میاں بیوی رہتے ہیں۔" سائرہ نے مولانا کا فتویٰ سن کر اطمینان کا سانس لیا۔

ظہور نے سوچا مولانا کے فتوے نے سائرہ کی قسمت پر مہر لگا دی ہے۔ اس نے سائرہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ دوسری رائے بھی لے لے۔ ظہور کے خیال میں اس کے مولانا دوست نسبتاً ناتجربہ کار تھے اتنے اہم معاملے میں کسی بڑے عالم کی رائے لینا ضروری تھی۔ لیکن سائرہ مطمئن تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر وہ نکاح پڑھا کر میاں بیوی بنا سکتے ہیں تو طلاق کے معاملے میں بھی ان کا بیان غلط نہیں ہو سکتا۔ ظہور صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

سائرہ نے مولانا کے پاس سے واپس آ کر ہاں کی تو ایک شرط بھی رکھ دی تھی۔ سلیم اسے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اس وقت تک نہیں جب تک وہ غزالہ کو نہ بتا دے۔ جب تک غزالہ اسے سلیم کی بیوی تسلیم نہ کر لے۔ سلیم نے آہستہ سے سر ہلا دیا اور وکیل کے پاس ضروری کارروائی شروع کرانے چلا گیا۔ سائرہ بھی دوسرے بیڈ روم کے لئے فرنیچر کا آرڈر دینے شاپنگ پلازہ چلی گئی۔ اسے غزالہ کے آنے کی تیاریاں کرنی تھیں۔

وہ بچھڑ کر کیوں گیا ہے پوچھنا
کیا وفا کرنا برا ہے پوچھنا

17

سڈنی ۱۹۹۷ء

غزالہ کو آسٹریلیا آتے آتے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا۔ طلاق میں کوئی قانونی پیچیدگی نہیں تھی۔ میاں بیوی راضی تھے تو قاضی کیا کر سکتا تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی رکاوٹ تھی۔ طلاق ایک سال بعد موثر ہوتی تھی۔ ایک سال تک وہ کچھ نہیں صرف انتظار کر سکتے تھے۔ وکیل نے بتایا تو سلیم اسے حیرانی سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کے جاننے والوں نے اس طرح کے جو قصے سنائے تھے ان میں ایک سال کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ سلیم کے بار بار پوچھنے پر وکیل نے جھنجلا کر قانون کی کتاب اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ شاید اچھا ہی ہوا تھا۔ سلیم نے وکیل کے پاس سے آتے ہوئے خود کو تسلی دی۔ وہ سائرہ اور غزالہ کے درمیان تقسیم ہوئے بغیر یونیورسٹی میں پوری یکسوئی سے اپنا کام مکمل کر سکتا تھا۔ غزالہ کو ایک سال تک الگ رہنے کی خبر وہ

پہلے ہی سنا چکا تھا۔

غزالہ سے تو ہزاروں میل کی دوری تھی، سائرہ سے وہ اس کے ساتھ رہ کر بھی جدا تھا۔ سائرہ نے وعدہ لے لیا تھا اور سلیم نے ہاں کر دی تھی۔ لیکن سلیم کو یقین تھا کہ چند دنوں کی بات ہے، وہ جانتا تھا کہ خواہشوں کے طوفان کو زیادہ عرصے تک روکنا ممکن نہ ہو گا اور یہ کوئی گناہ بھی نہیں تھا۔ مولانا ان کے تعلق کو شرعی توجیہہ دے کر جائز قرار دے چکے تھے۔ بس قدم بڑھانا تھا۔ ایک بار قسم توڑنے کی دیر تھی۔ چند دنوں بعد سائرہ کا موڈ بھی معمول پر آگیا تھا۔ اکثر وہ کھانے پر اس کا انتظار کرتی۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتی۔ یونیورسٹی کے قصے سنتی۔ ایک رات سلیم گھر آتے ہوئے سائرہ کی پسند کے گہرے سرخ گلابوں کا گلدستہ لے کر آیا۔ سائرہ نے گلدان میں سجائے تو پورے کمرے میں اس کی مسکراہٹ اور پھولوں کی خوشبو پھیل گئی۔ سلیم کی آنکھوں میں وہ رات خواب بن کر چمکنے لگی جب سائرہ نے شادی کے لئے ہاں کی تھی۔ اس نے سوچا آج اسی رات کا منظر دہرائے گا۔ کھانے کے بعد سائرہ برتن دھوئے گی اور وہ کپڑے سے برتنوں کو خشک کرے گا۔ اس کا لمس سائرہ کی سانسوں کو بھی گرم کر دے گا۔ سائرہ کے ہاتھوں سے پلیٹ چھوٹ جائے گی اور وہ اس کی بانہوں میں پناہیں ڈھونڈنے لگے گی۔ پلیٹ کے ساتھ قسم بھی ٹوٹ جائے گی۔ لیکن کچھ بھی نہیں صرف سلیم کے خواب ٹوٹے تھے۔ سائرہ جلد ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ کر اٹھ گئی۔

"میں تھکی ہوئی ہوں، برتن صبح سمیٹوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی سلیم بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ مڑی تو سلیم سائے کی طرح اس پر دراز تھا۔ سلیم جانتا تھا کہ اس کے چھوتے ہی وہ پگھل کر اس کے سینے میں سما جائے گی۔ لیکن سائرہ سلیم کو پوری طاقت سے دھکیل کر اس سے الگ ہو گئی۔

"سلیم پلیز میرے کمرے سے نکل جاؤ۔"

"کیسے نکل جاؤں۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا۔ اس قدر پاس ہوتے ہوئے بھی تم کتنی دور چلی گئی ہو۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"ہو جاؤ مجھے پرواہ نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ اب کسی گناہ میں شریک نہیں ہو سکتی۔"

"کیسا گناہ۔ تم میری بیوی ہو۔ ایک دوسرے پر ہمارا حق ہے۔ مولانا کا فتویٰ بھی سن چکی ہو۔ کوئی قسم ہمارا یہ حق نہیں چھین سکتی۔"

"یہ حق تمہیں اسی وقت واپس ملے گا جب غزالہ بھی اس حق کو تسلیم کر لے گی۔ تم نے مجھے اب ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

سلیم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ سمجھ گیا سائرہ اب نہیں مانے گی۔ سلیم کمرے سے نکل آیا اور ٹھنڈے پانی سے نہا کر سو گیا۔ سائرہ رات گئے تک جاگتی رہی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سلیم کو خود سے الگ رکھنا آسان تھا۔ لیکن خود اپنے آپ کو اس سے جدا رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسے سلیم کے ساتھ گزری ہوئی ہر رات اور اس کا ہر لمحہ یاد تھا۔ وہ کمرہ بند کر کے اکثر اس البم کے صفحے پلٹتی جس میں ہنی مون کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ پوری رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی۔ سائرہ نے سوچا غزالہ کے آنے سے پہلے وہ یہ البم اور ہر وہ چیز کہیں چھپا دے گی جس سے اس کے اور سلیم کے تعلق کا ہلکا سا نشان بھی مل سکتا ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ غزالہ کو اس کے بارے میں اس طرح معلوم ہو جس طرح اسے غزالہ کے بارے میں معلوم ہوا۔

سائرہ شاید اپنے جذبوں کو کچلنے کے لئے خود پر اتنی سختی نہ کرتی لیکن اس کے ذہن کے کسی نہ کسی حصے میں ظہور کی بجائی ہوئی خطرے کی گھنٹی گونجتی رہتی تھی۔ مولانا کی شرعی توضیع غلط اور ان کا دیا ہوا فتویٰ صحیح نہ ہوا تو سلیم کے ساتھ گزاری ہوئی ہر رات زندگی بھر کا پچھتاوا بن جائے گی۔ ایسا گناہ جس کا وہ کوئی مداوا نہ کر سکے گی۔ سائرہ نے دل میں طے کیا تھا کہ اگر سلیم غزالہ کو بتا سکا۔ اگر غزالہ مان گئی تو وہ کسی دوسرے عالم سے فتویٰ لے گی۔ ضرورت پڑی تو دوبارہ نکاح پڑھوائے گی۔ لیکن ان سب سے پہلے ایک بڑی "اگر" پھن اٹھائے ہر وقت سامنے کھڑی رہتی۔

اس واقعے کے بعد دونوں کی زندگی اپنے اپنے کمروں میں محدود ہو گئی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا جب مل کر کھانا کھاتے یا ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے۔ زندگی مصروف

بھی بہت ہو گئی تھی۔ سلیم پوری سنجیدگی کے ساتھ پڑھائی پر ڈٹ گیا تھا۔ پروفیسر وہائٹ اور تھیو نے پرانی کسر نکالنے کی کوشش کی تھی۔ سلیم کو اکثر حیرت ہوتی کہ پروفیسر وہائٹ یا تھیو کسی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ آسٹریلیا کا شہری کیسے بن گیا۔ اس نے بتایا تھا اور وہ خوش ہو گئے تھے۔ کسی نے کیوں اور کیسے کے سوال نہیں کئے تھے۔ سلیم کو ٹیوٹر کا مستقل کام مل رہا تھا۔ پڑھانے کی مصروفیات جو وقت لیتیں اسے پورا کرنے کے لئے رات کو دیر تک اپنی ریسرچ میں مصروف رہتا۔ گھر پہنچتا تو سائرہ سونے چلی گئی ہوتی لیکن اسے اپنے لئے کھانا میز پر رکھا ہوا ملتا۔

اس ایک سال کے عرصے میں ان کے دوستوں کی زندگیوں میں بہت تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ چودھری انور پاکستان گیا تھا اور چھ مہینے بعد واپس آ کر پھر ہمیشہ کی طرح ٹیکسی چلانے لگا تھا۔ شادی بھی ہو گئی تھی لیکن بیوی ساتھ نہیں آئی تھی۔ وہ امید سے تھی اور لڑکی کے ماں باپ نے کہا تھا کہ پہلا بچہ پردیس میں نہیں لڑکی کے میکے میں ہو گا۔ چودھری انور نے زیادہ اصرار نہیں کیا تھا اسے خود بھی آسٹریلیا میں نہیں رہنا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے واپس جانے سڈنی آیا تھا۔ اس کے باپ نے زمینداری بہت پھیلا لی تھی۔ لیکن بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیٹا آ کر اپنا کام سنبھالے۔ چودھری انور کے لئے بھی اپنی زمینوں کو سینچنا بے وطن ہو کر ٹیکسی چلانے سے کہیں بہتر تھا۔ وہ صرف اپنے چھوٹے بھائی کا ٹھکانہ کرنے واپس آیا تھا۔ اس کے بھائی کو زمینداری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پڑھنا اور خوب پڑھنا چاہتا تھا۔ آسٹریلیا اس کے بھائی کے لئے سب سے موزوں جگہ تھی۔ اس کے لئے ایک ایک پل بھاری تھا۔ اسے بھائی کے آنے کا نہیں اپنے واپس جانے کا انتظار تھا۔ وہ اب پہلے جیسا چودھری انور نہیں رہا تھا۔ کھویا کھویا سا رہتا۔ ہر وقت بیوی کا چہرہ نگاہوں میں سمائے رہتا۔ ظہور اکثر مذاق کرتا "چودھری جی ٹیکسی چلانا چھوڑ دو، کسی دن مسافروں کو بٹھا کر سیدھا فیصل آباد لے جاؤ گے۔"

ظہور نے شروع شروع میں تو مذاق میں کہا تھا لیکن اب سنجیدگی سے سمجھانے

لگا تھا کہ وہ ٹیکسی چلانا چھوڑ دے۔ پاکستان سے واپس آنے کے چند ہفتوں کے اندر اندر چوہدری انور سے دو تین حادثے ہو چکے تھے۔ ایک دفعہ تو بڑا حادثہ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ وہ کمر میں مستقل درد کی شکایت بھی کرنے لگا تھا۔ ظہور نے سمجھایا تھا کہ ٹوٹی ہوئی کمر لے کر گئے تو بیوی کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ وہیل چیئر پر بیٹھ کر کھیتی باڑی بھی نہیں کر سکو گے۔ اسی زمانے میں سڈنی میں ایک نوجوان پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا جس نے ٹیکسی چلانے والے پاکستانیوں کی پوری برادری کو ڈرا دیا۔ وہ ہفتے میں ساتوں دن، دن رات ٹیکسی چلاتا۔ ایک رات ٹیکسی چلاتے ہوئے نیند کا جھونکا آ گیا تھا۔ گاڑی سڑک کے دوسری طرف سے آنے والے ایک ٹرک میں گھس گئی تھی۔ موقع پر ہی مر گیا تھا۔

چودہری انور مرنے سے کبھی نہیں ڈرا تھا۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ وہ پہلی بار یہ سوچ کر خوفزدہ ہو گیا کہ اس کے انتظار میں بچھی ہوئی آنکھیں ہمیشہ کے لئے پتھرا گئیں تو کیا ہو گا۔ اس کے بچے کا کیا ہو گا جس نے ابھی دنیا میں آ کر آنکھیں بھی نہیں کھولیں۔ وہ واقعی ڈر گیا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ٹیکسی نہ چلائے تو کیا کرے۔ بہت سوچ کر اس نے ظہور کی بات مان لی۔ آدھے دن ٹیکسی چلاتا اور باقی آدھے دن ظہور کے ساتھ اس کے ریسٹورنٹ میں شیف کا کام سیکھتا۔ دو مہینے بعد چودہری انور ٹیکسی چھوڑ کر ظہور کی جگہ شیف بن گیا تھا ظہور نے اپنی تنخواہ کم کرا کے عہدہ بڑھوا لیا تھا اور ریسٹورنٹ کا مینیجر بن گیا تھا۔ ریسٹورنٹ کا مالک کسی بھی حیثیت میں اسے ریسٹورنٹ کے ساتھ نتھی رکھنا چاہتا تھا۔

پیسے کمانے سے اب ظہور کا جی ویسے بھی اچاٹ ہو گیا تھا۔ ہاتھ کھول کر خرچ کرتا پھر بھی پیسے بچ جاتے۔ کوئی نہیں تھا جسے پاکستان پیسے بھیج سکتا۔ بیٹی داماد بھی اس کے بیٹے کے پاس امریکہ چلے گئے تھے۔ چودہری انور نے کئی دفعہ کہا تھا پاکستان کا چکر لگا آئے۔ کہتا تھا جا کر کیا کرے گا۔ کس سے مل کر روئے گا کس کے ساتھ بیٹھ کر قہقہے لگائے گا۔ دوست بھی ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ کچھ نہیں رہا تھا سب کچھ بکھر گیا تھا۔ صرف ایک مکان تھا لیکن کہتا تھا اس میں خالی پڑے تخت کو دیکھ کر ماں یاد آئے

گی تو اپنے گناہ بھی یاد آ جائیں گے۔ ویران درخت کو دیکھ کر ان بچوں کو یاد کرے گا جنہیں نیم کے سائے میں بڑا ہوتے نہ دیکھ سکا، جن کا کبھی سایہ نہ بن سکا تھا۔

"اس وقت جاؤں گا چودہری صاحب جب ہاتھوں میں دم نہیں رہے گا۔ نیم کے نیچے تخت بچھا کر بیٹھ جاؤں گا' اور پھر اسی تخت پر کبھی نہ اٹھنے کے لئے سو جاؤں گا۔" ظہور نے بہت اداس لہجے میں کہا تھا اور سگریٹ پینے باہر بالکونی میں چلا گیا تھا۔ چودہری انور جانتا تھا سگریٹ نہیں آنکھوں میں آنے والے آنسو پینے گیا ہے۔ لیکن ایک دن ظہور بہت خوش تھا۔ چودہری انور نے اسے کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ ظہور اور چودہری انور دونوں ریسٹورنٹ سے کام ختم کر کے ساتھ واپس آتے تھے۔ اس روز ڈاک میں امریکہ سے ایک خط آیا ہوا تھا۔ نامانوس تحریر تھی۔ کھول کر دیکھا تو بیٹے کا خط تھا۔ زندگی میں پہلی بار اپنے نام بیٹے کی تحریر دیکھ کر دل بھر آیا۔ خوشی کے آنسو اس نے بالکونی میں جا کر نہیں چودہری انور کے سامنے ہی بہا دیئے۔ جذباتی خط نہیں تھا۔ بیٹے نے اپنے تحقیقی کام کے بارے میں لکھا تھا اور یہ بھی کہ وہ ایک سیمینار کے لئے آسٹریلیا آ رہا تھا۔ کانفرنس پرتھ میں تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ وقت کم ہے اس لئے سڈنی آنا ممکن نہیں۔

"میں آؤں گا بیٹے۔ میں خود آؤں گا۔" ظہور نے کہا تھا۔ کانفرنس دو مہینے بعد تھی لیکن اس نے دوسرے دن صبح سے ہی پرتھ جانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اقبال اور پروین بھی شادی کر کے آسٹریلیا آ گئے تھے۔ تقریبا" چھ مہینے بعد واپس آئے تھے اور جیسا کہ پروین نے سلیم کو بتایا تھا انہوں نے پورے پاکستان کی سیر کی تھی اور واپسی میں بھارت رکتے ہوئے آئے تھے۔ لیکن سڈنی میں وہ ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رکے۔ اتنے دن بھی اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی بیٹی کی شادی کا استقبالیہ دینا چاہتے تھے۔ ان کی بیٹی کی پہلی شادی کی ناکامی سڈنی کی پاکستانی برادری میں ایک اسکینڈل بنی رہی تھی۔ وہ اب سب کو نئی شادی کی کامیابی کا جشن دکھانا چاہتے تھے۔ ایک کلب کے بڑے سے ہال میں استقبالیہ کا اہتمام تھا۔ سلیم چودہری انور اور ظہور مل کر گئے تھے۔ سلیم نے سائرہ سے بھی کہا تھا لیکن اس نے منع کر دیا تھا اور کہا تھا غزالہ آنے

والی ہے اس لئے سائرہ کا سلیم کی بیوی بن کر دعوت میں جانا مناسب نہیں ہے۔ اجتماع کو دیکھ کر تینوں بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے اب تک سڈنی میں صرف فیکٹریوں میں کام کرنے والوں اور ٹیکسی چلانے والوں کو دیکھا تھا۔ خوشحال پاکستانیوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر انہیں حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ ظہور نے یہاں بھی اپنا رنگ جما دیا تھا۔ اقبال کی درخواست پر وہ ان کی شادی کا سہرا لکھ کر لایا تھا۔ روایتی سہرا نہیں تھا' ہلکے پھلکے انداز کی نظم تھی ظہور کے ترنم نے سماں باندھ دیا تھا۔ شروع میں تو کسی نے توجہ نہیں دی سب ایک دوسرے سے باتوں میں مشغول تھے لیکن ظہور کی آواز کا سحر تھا کہ پورے ہال میں خاموشی چھا گئی نظم ختم ہوئی تو اگلی صف میں لگی میز کے گرد بیٹھی ایک خاتون نے ساتھ بیٹھے ہوئے ساتھی کے کان میں سرگوشی کی تھی۔
"کیا یہ واقعی اس کی اپنی تھی۔"

اقبال اور پروین دو دن بعد اپنا سامان سمیٹ کر ملبورن چلے گئے۔ ملبورن جانے کا فیصلہ دونوں نے مل کر کیا تھا۔ اقبال کا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب مانیں گے نہیں' ان کی زندگی میں مداخلت کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ مدد لینے کے لئے دباؤ ڈالیں گے اس لئے تعلقات خراب کرنے سے بہتر ہے کہ ان کی نظروں سے دور ہو کر رہا جائے۔ پروین کو معلوم تھا کہ اقبال غلط نہیں کہہ رہا۔ وہ بھی مان گئی تھی۔ جانے سے پہلے ظہور کے گھر پر ان کی دعوت ہوئی تھی' سلیم اکیلا گیا تھا' اس دفعہ اس نے خود سائرہ سے نہیں کہا تھا۔ جانے کیوں پروین کے سامنے سائرہ کو بیوی کی حیثیت سے لے جانا اچھا نہیں لگا۔

سلیم نے سال پورا ہونے سے پہلے ہی اپنی تھیسس جمع کرا دی اور پڑھانے کے مستقل کام پر ڈٹ گیا تھا۔ جس دن تھیو نے اسے بتایا کہ اس کی تھیسس قبول ہو گئی ہے اور یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیمی کمیٹی نے ڈگری کی منظوری دے دی ہے تو سلیم کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ خوشی سے گنگ رہ گیا تھا' آنسو روکنے کے لئے بہت ضبط کرنا پڑا۔ باہر نکلا تو دل چاہتا تھا نظر آنے والے ہر شخص کو یہ خبر سنائے۔ یونیورسٹی کی

راہداری میں خوشی سے ناچتا پھرے۔ درختوں کے کانوں میں سرگوشیاں کرے۔ لائبریری کے سامنے اونچے سروں میں گانے والے آرکسٹرا میں گھس جائے اور زور زور سے ڈرم پیٹنے لگے یا لان میں کھڑا ہو کر زور زور سے نعرے لگائے۔ لیکن وہ کچھ نہیں کر سکا صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ کے باہر پڑی ہوئی اپنی پسندیدہ بنچ پر دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اسے جانے کیوں سعیدہ یاد آ گئی۔ بنگالی لڑکی جس کے ساتھ وہ اس بنچ پر بیٹھا رہتا تھا۔ اٹھا تو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اےسمیس کیفے میں کافی پینے چلا گیا۔ نظریں ایوان کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ سن کر کتنی خوش ہو گی۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ بہت دنوں سے نہیں ملی تھی۔ سلیم کو ڈیپارٹمنٹ سے نکلنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا۔ شروع شروع میں ایک بار نظر آئی تھی۔ اےسمیس کے سامنے کھڑی کسی سے گلے مل رہی تھی۔ سلیم کو دیکھ کر اسے بھی لپٹا لیا تھا۔ وہ ڈگری لے کر جز وقتی ٹیوٹر ہو گئی تھی اور باقی وقت بابی کی ڈاکٹریٹ کے تحقیقی کام میں مدد دینے پر صرف کرتی۔ اس کے لئے لائبریری سے کتابیں ڈھونڈ کر لاتی' فوٹو کاپی کرتی' اس کی تھیسس ٹائپ کرتی۔ ان دنوں بابی چھ مہینے کے لئے برسین گیا ہوا تھا اس لئے گلے لگاؤ تحریک زور و شور سے چل رہی تھی۔ وہ دو منٹ سے بھی کم وقت میں اپنی زندگی کی کہانی سنا کر چلی گئی تھی اسے کوئی اور گلے لگنے والا نظر آ گیا تھا۔

اےسمیس سے باہر نکلا تو کوئی سمت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ابھی صرف دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ سائرہ کے پاس تو اس وقت فون سننے کا بھی وقت نہیں ہو گا۔ ظہور اور چودھری انور کام پر جانے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ پاکستان آج کل چھ گھنٹے پیچھے تھا وہاں سب سو رہے ہوں گے۔ کسے خبر کرے۔ کسے بتائے۔ ایک ہی جگہ سمجھ میں آئی تھی۔ وہ ٹہلتا ہوا کوجی بیچ پہنچ گیا۔ کام کا دن اور دوپہر کا وقت تھا اس لئے ساحل پر رونق نہیں تھی۔ اپنی پسندیدہ منڈیر پر بیٹھ کر جھاگ اڑاتی ہوئی موجوں میں اسے گزرے ہوئے چار سالوں کے منظر ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ آج کا دن اگر تین سال پہلے آ جاتا تو اپنا بستر لپیٹ کر سیدھا پاکستان واپس جا چکا ہوتا۔ ان تین سالوں میں جن امتحانوں سے گزرا تھا ان سے بچ جاتا۔ ان برسوں میں زندگی نے کتنے موڑ

کاٹے تھے۔ اس کی زندگی ایک سیدھی اور ہموار راہ گزر کی عادی تھی۔ تعلیم' ملازمت' شادی' اولاد ہر سنگ میل خودبخود آتا چلا گیا تھا۔ ابا کی موت ایک مشکل موڑ بن کر آئی تھی' لیکن اس کے بعد زندگی پھر سیدھی ہو کر چل دی تھی۔ اس وقت بھی اسے ابا یاد آ گئے۔ ایسے ہر موقع پر انہوں نے اسے کوئی نہ کوئی تحفہ دیا تھا۔ میٹرک کرنے پر گھڑی اور انٹر کیا تھا تو سوٹ بنوا کر دیا تھا۔ گریجویشن پر موٹر سائیکل ان کا آخری تحفہ تھی۔ ایک دن دل کا دورہ پڑا اور اچانک ختم ہو گئے۔ جیسے صرف اس کی تعلیم مکمل کرنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ آج ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ کتنا فخر ہوتا اس پر۔ ابا کے ساتھ اسے اپنی پہلی گھڑی' پہلا سوٹ اور پہلی سواری یاد آئی تو جی بھر آیا۔ وہ آنسو جو پروفیسر تھیو کے سامنے پی لئے تھے اڈ اڈ کر نکلنے لگے۔ ابا کی یاد بہانہ بن گئی تھی۔ آنسو سمندر میں ڈبو کر واپس جانے گا تو دل یادوں کے بوجھ سے بھاری تھا۔ ماں' غزالہ اور زریں کا چہرہ بار بار سامنے آتا۔ گھر فون کیا تو خبر سن کر غزالہ بھی رو پڑی۔ سلیم نے آج اپنا وہ مشن مکمل کیا تھا جس کے لئے غزالہ اور زریں نے جدائی کے دکھ جھیلے تھے۔ سلیم اب آ کر اسے لے جائے گا۔ جدائی کا موسم ہمیشہ کے لئے ختم ہونے والا تھا۔ اتنی بڑی خوش پر روتی نہیں تو کیا کرتی۔ لیکن سلیم سوچ رہا تھا ابھی اس کی زندگی نے کئی اور موڑ کاٹنے ہیں۔

سائرہ بھی زندگی کا ایسا ہی موڑ تھی۔ وہ یاد آئی تو اسے فون کرنا بھی یاد آ گیا۔ سائرہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے سلیم سے وعدہ لیا کہ آج جلدی گھر آئے گا۔ کھانا اس کے ساتھ کھائے گا۔ سلیم نے میکڈانلڈ میں خود کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی اور واپس یونیورسٹی آ گیا۔ شام میں اسے ایک کلاس لینی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ میں آیا تو ایک خوشگوار حیرت منتظر تھی۔ اس کے لئے چھوٹی سی پارٹی تیار تھی۔ اسٹاف روم میں سب جمع ہوئے تھے۔ کیک تھیو نے منگایا تھا۔ وائن کی دو بوتلوں کا تحفہ پروفیسر وہائٹ نے دیا تھا اور خود بھی آ کر ان کے ساتھ شریک ہوا تھا۔ لیکن زیادہ خوشگوار حیرت گھر پہنچ کر ہوئی۔ مختصر نوٹس پر جو جو مل سکتا تھا سائرہ نے انہیں بلا کر سلیم کے لئے جشن کا اہتمام کیا تھا۔ ظہور' چودھری انور' منظر اور اس کی بیوی اور سائرہ کے

ساتھ کام کرنے والی اس کی دوست بھی آئی تھی۔ دوسری دوست کچھ عرصے پہلے مستقل طور پر برسبین چلی گئی تھی جہاں اس کے ماں باپ رہتے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے تھامس بھی آیا تھا اور صرف مبارکباد دے کر چلا گیا تھا۔ اسے کسی اور دعوت میں جانا تھا۔ ایسی دعوت میں جہاں بیئر پینے پر پابندی نہیں تھی۔

سب چلے گئے تو دونوں اکیلے بیٹھے ایک دوسرے کی نظروں سے بچنے کی کوشش کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد سلیم نے سائرہ کو بتایا کہ وہ اگلے ہفتے پاکستان جائے گا اور اب غزالہ کو لے کر ہی واپس آئے گا۔ یہ بتاتے ہوئے اس میں نظریں اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ سائرہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکی اور صرف سر ہلا کر میز پر رکھے ہوئے مٹھائی کے ان ڈبوں کو دیکھنے لگی جو مہمان اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ جیسے سوچ رہی ہو کیا وہ اتنی ساری مٹھائی اب اکیلے کھائے گی۔ تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں آئی تو بے اختیار رو پڑی۔ ریلا گزر گیا تو آنسوؤں کا سبب سوچنے لگی۔ وہ غزالہ کے پاس جا رہا تھا اس لئے۔ غزالہ یہاں آنے والی تھی اس لئے۔ لیکن غزالہ کے آنے سے تو اس کی منزل اور قریب آ جاتی۔ کون جانے اس نے سوچا۔ اسے اب کسی بات پر یقین نہیں رہا تھا۔ شاید اس کا اور سلیم کا ساتھ صرف ایک مختصر مدت کا وقفہ تھا۔ غزالہ کے آسٹریلیا آنے تک کا وقفہ۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ شاید آنسو بے بسی کے آنسو تھے۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آئے، کوئی جواب نہ ملے، کوئی یقین نہ رہے تو پھر آنسو ہی جواب بن جاتے ہیں۔ وہ اکثر سوچتی اگر آنسو نہ ہوتے تو اب تک اس کا سینہ پھٹ چکا ہوتا۔

غزالہ اور زریں کو سڈنی لانے میں سلیم کو تین مہینے لگ گئے۔ سائرہ، چودھری انور اور ظہور تینوں انہیں لینے ایئرپورٹ آئے تھے۔ ظہور زبردستی لایا تھا۔ وہ نہیں آنا چاہتا تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا اور جس طرح ہو رہا تھا اسے پسند نہیں تھا۔ اس نے سائرہ کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ظہور جانتا تھا سلیم کبھی غزالہ کو بتانے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ سائرہ پہلے صرف اسے پالتی تھی اب اس کے خاندان کو پالتے ہوئے

اپنی زندگی گزار دے گی۔ چودہری انور نے چلنے کے لئے کہا تو اس نے صاف منع کر دیا تھا۔ کہا تھا وہ اس معاملے میں فریق نہیں بنے گا۔ ایئرپورٹ جا کر خود کو سلیم کے نئے خاندان سے وابستہ نہیں کرے گا۔ سائرہ کا جب سلیم سے نکاح ہوا تھا اسے سائرہ کا باپ بنایا گیا تھا۔ وہ اس رشتے پر اب بھی قائم تھا۔ لیکن پہلی بار چودہری انور نے اس سے اختلاف کیا تھا۔ اب تک سمجھانے کا کام ظہور کرتا تھا' پہلی بار چودہری انور نے ظہور کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"ایک بار دوست کہہ کر ہم فریق بن چکے ہیں۔ وہ اچھا کر رہا ہے تو اس کی خوشی میں شریک ہیں۔ برا کر رہا ہے تب بھی اس کے پیچھے ہیں۔ قتل کر کے آئے گا تب بھی پناہ دیں گے' پکڑا گیا تو ضمانت دیں گے اور پھانسی چڑھنے لگا تو پھندا پکڑ کر لٹک جائیں گے۔ رشتے ایک بار بنتے ہیں' اور جب بن جاتے ہیں تو پھر اپنا اختیار چلا جاتا ہے۔"

چودہری انور آج بھی دوستی کی راجپوتانہ قدروں کو مذہب کی طرح مانتا تھا۔ ظہور کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے چودہری انور کے ساتھ ایئرپورٹ چلا گیا۔ لیکن ایئرپورٹ پر غزالہ کو دیکھا تو وہ بھی بیٹی جیسی لگی۔ بالکل نازک آبگینے جیسی۔ آنکھیں ایسی جیسے ابھی ابھی برسات ہو کر گزری ہو۔ چہرے پر غم کی کوئی لکیر نہیں تھی' بس ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھلی تھی جو ہر زاویے سے مختلف لگتی۔ خودبخود اپنا تاثر بدلتی رہتی تھی۔ کبھی چہرے کو اداس کر دیتی کبھی ہنسی روکنے کی کوشش اور کبھی طنز لگنے لگتی۔

سائرہ کا دل بھی غزالہ کو دیکھتے ہی اس کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ پہلے وہ بھی ایئرپورٹ پر آنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہیں دیکھتے ہی حسد نہ کرنے لگے۔ رقابت کا کوئی جذبہ نہ چمک جائے۔ لیکن غزالہ کے ایک خط نے جو نقش چھوڑا تھا وہ بہت گہرا تھا۔ اور غزالہ کو دیکھ کر تو اس نے سوچا تھا کہ اس سے کوئی بھی حسد نہیں کر سکتا۔ اسے نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسے سلیم کی بات پر اب یقین آنے لگا تھا۔ وہ غزالہ کو بتاتے ہوئے کیوں ڈرتا تھا۔ اس کا چہرہ غم کی

ایک ہلکی سی لکیر سے پھٹ سکتا تھا۔ زریں پر لمبی ہوائی پرواز کا اثر تھا یا اجنبی چہروں کو دیکھ کر سہمی ہوئی تھی۔ وہ غزالہ کا ہاتھ پکڑ کر اس سے چپک گئی تھی۔ جیسے اس کا ایک حصہ ہو۔ نقش و نگار بھی غزالہ سے ملتے تھے۔ اسی کا چھوٹا روپ لگتی تھی۔ سائرہ غزالہ اور زریں سے باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگی اور ظہور اور چودھری انور سلیم کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ وہ ایئرپورٹ سے گھر چلے جانا چاہتے تھے لیکن سلیم مجبور کر کے انہیں بھی گھر لے آیا تھا۔ سائرہ اور غزالہ کے ساتھ اکیلا رہنا شاید اسے عجیب لگا ہو گا۔ سلیم نے سائرہ کے بارے میں غزالہ کو بتا دیا تھا کہ وہ اسے پہلے سے جانتا تھا۔ اکیلی رہتی ہے اس لئے انہیں کرائے پر رکھنے پر تیار ہو گئی ہے۔ چودھری انور اور ظہور کے بارے میں غزالہ کو پہلے سے پتہ تھا کہ سلیم اب تک ان کے ساتھ مل کر رہتا رہا ہے۔ غزالہ کو شبہ کرنا آتا ہی نہیں تھا اور سلیم پر شک کرنا تو گناہ تھا۔ معاف نہ کیا جانے والا گناہ۔

گھر آ کر سائرہ نے باورچی خانہ سنبھال لیا اور آنے والوں کی خاطر کا انتظام کرنے لگی۔ سلیم سامان لے کر کمرے میں رکھنے لگا تھا۔ چودھری انور اور ظہور غزالہ سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

"سلیم کی امی تو تمہارے آنے کے بعد اکیلی رہ گئی ہوں گی۔" ظہور نے پوچھا۔

"انہیں امی اور ابا اپنے گھر لے گئے ہیں۔ سلیم نے کہا تھا اگلے سال تک خالہ کو بھی یہیں بلوا لیں گے۔ لیکن وہ تیار نہیں ہیں۔ کہتی ہیں امی اکیلی رہ جائیں گی۔" غزالہ نے بتایا۔

"تمہارے بھائی جاپان میں خوش ہیں۔" ظہور صرف باتیں کرنے کے لئے باتیں کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا غزالہ تکلف کے خول سے باہر نکل آئے۔

"نعیم بھائی جاپان جا کر خوش نہیں ہیں۔ لیکن وہ پاکستان بھی نہیں آ سکتے۔ ان کے خلاف پولیس نے قتل کے جھوٹے کیس بنا دیئے ہیں۔ تھانوں میں ان کی تصویریں تک لگا دی ہیں۔" غزالہ بھائی کے تذکرے پر اداس ہو گئی۔

"پولیس تمہارے والد کو تو بہت پریشان کرتی ہو گی۔" ظہور کے لہجے میں سچ مچ کی تشویش تھی۔ وہ اپنی پولیس کو اچھی طرح جانتا تھا۔

"شروع شروع میں وقت بے وقت آ جاتے تھے۔ ابا نے ایک بار قریشی انکل کو فون کر کے ڈانٹ پڑوائی تو اب نہیں آتے۔ قریشی انکل سے پولیس افسر بھی ڈرتے ہیں۔" غزالہ نے کہا اور زریں کو الگ کر کے بٹھانے لگی جو اس کی گود میں گھسی جا رہی تھی۔

"بیٹا آؤ ادھر ہمارے پاس آؤ۔" ظہور نے کہا لیکن زریں اپنی ماں کے قریب کھسک گئی۔ "دیکھو یہ تمہارے چودھری انکل ہیں۔ یہ پورے شہر کو جانتے ہیں ایک دن گھمانے لے جائیں گے۔"

"سیر کرنے چلو گی۔" چودھری انور نے پوچھا تو زریں ہاں میں سر کو ہلا کر شرما گئی۔

"تم اسکول جاتی ہو۔" زریں نے ایک بار پھر سر ہلا دیا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ جواب غزالہ کو ہی دینا پڑا تھا۔

"اب تو جاتے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ شروع میں بڑی مشکل سے جاتی تھی۔ چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیتی تھی۔ میں دن بھر کلاس سے باہر کھڑی ڈیوٹی دیتی تھی۔ اب عادت ہو گئی ہے۔"

زریں کو نئے سرے سے اسکول جانے کی عادت ڈالنی پڑی تھی۔ سڈنی آنے کے ایک ہفتے بعد ہی اسے اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔ وہ بہت مشکل سے اور روتی ہوئی جاتی تھی۔ یہاں غزالہ کو اسکول کے باہر کھڑے رہنے کی اجازت نہیں ملی۔ زریں روز صبح گھر سے نکلتے ہوئے چیختی تھی۔ اس کا حل سائرہ نے یہ نکالا کہ غزالہ کے بجائے صبح فیکٹری جاتے ہوئے زریں کو وہ اسکول چھوڑنے لگی۔ زریں کو گاڑی چلانے والی آنٹی پسند تھیں۔ کار کی سواری بھی اچھی لگتی تھی اس لئے اسکول جاتے ہوئے رونا بند ہو گیا۔ لیکن سائرہ نے زریں کو اسکول چھوڑنا اپنی مستقل ڈیوٹی بنا لیا۔

اسکول سے غزالہ واپس لے کر آتی تھی۔ زریں سائرہ کے ساتھ بہت گھل مل گئی تھی۔ سائرہ بھی اپنی بیٹی کی طرح اس کا خیال رکھتی تھی۔ سلیم کی بیٹی اس کی بھی بیٹی تھی۔ غزالہ نے کچن اور گھر کے کام سنبھال لئے تھے۔ سائرہ فیکٹری سے آکر غزالہ کا ہاتھ بٹاتی یا اکثر زریں کو لے کر گھمانے نکل جاتی۔

سلیم نے سڈنی آتے ہی پھر نوکری کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آسٹریلیا کی ایک یونیورسٹی کی اتنی بڑی ڈگری ملازمت دینے والوں کو مرعوب کر دے گی۔ لیکن ایک بار پھر آنے والے معذرت ناموں نے اسے شدید صدمے سے دوچار کر دیا۔ کیوں آخر کیوں۔ اس کے پاس ڈگری ہے۔ پرانا تجربہ ہے۔ پھر کیا بات ہے۔ اس کا رنگ اور نسل مختلف ہے اس لئے؟ ایک دن بہت تلخ ہو کر اس نے تھیو سے بھی یہی کہا تھا۔

”ہو سکتا ہے یہ صحیح ہو۔“ تھیو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ”رنگ اور نسل کا فرق پڑتا ہے۔ لیکن کوئی جان کر یہ تفریق نہیں کرتا۔ تم کسی پاکستانی کو دیکھ کر خواہ مخواہ اس کی طرف کھنچو گے۔ یہ تعصب نہیں ایک فطری ردعمل ہے۔ لیکن تمہارا یہ خیال صحیح نہیں کہ تمہیں نوکری نہ ملنے کا محض ایک یہی سبب ہے۔ تمہارا کیس ذرا مشکل ہے۔ جن کے پاس انجنیئرنگ میں ماسٹرز کی ڈگری ہوتی ہے ان کے پاس کام کرنے کا آسٹریلوی تجربہ بھی ہوتا ہے اس لئے مقامی آدمی کو تم پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہے گی۔“

”لیکن پھر میں کیا کروں۔ ملازمت ملے بغیر تجربہ کہاں سے لاؤں۔“ سلیم نے بہت بے چینی سے پوچھا۔ وہ جانتا تھا تھیو صحیح کہہ رہا تھا۔ لیکن کوئی راستہ تو نکلنا تھا۔

”تم بہت جلد مایوس ہو گئے ہو۔“ تھیو نے تھوڑی دیر بعد سوچ کر کہا۔ ”تم کوشش کرتے رہو کہیں نہ کہیں تمہارا مقدر ضرور کھلے گا۔ ملازمت ڈھونڈتے ہوئے تمہیں ابھی صرف دو مہینے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی سال بھر لگ جاتا ہے۔ تمہیں مستقل مزاجی سے تلاش جاری رکھنی چاہئے۔“ تھیو نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”اس ایک سال تک بیوی بچوں کو کہاں سے کھلاؤں۔ کسی کے ساتھ رہتا

ہوں اس لئے کرائے کی فکر نہیں ہے۔ اپنا گھر لینا پڑا تو بے روزگاری الاؤنس کرائے کے لئے بھی کافی نہیں ہو گا۔" تھیو سے اتنے سال کا ساتھ تھا' اس سے دل کی بات کر سکتا تھا۔ تھیو تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔

"ایک حل ہے۔ لیکن اس سے تمہارے مستقبل کی پوری سمت بدل جائے گی۔" تھیو نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "تم پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لو۔ تمہیں اسکالر شپ دلوا دیں گے۔ بہت تو نہیں ہو گا لیکن بے روزگاری الاؤنس ضمیر پر بوجھ نہیں بنے گا۔ پھر ٹیوٹر کا مستقل کام بھی ملتا رہے گا۔ تم گزارا کر سکو گے۔ فوری مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور تین چار سال میں انجنیئرنگ کے ڈاکٹر بھی ہو جاؤ گے۔"

"لیکن پی ایچ ڈی کر کے تو............"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" تھیو نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم پل اور عمارتیں نہیں بنا سکو گے۔ تمہارا کیریئر تدریس کی طرف چلا جائے گا۔ بہت خوش قسمت ہوئے تو کہیں کنسلٹنٹ بن کر کمپیوٹر کی اسکرین سے چپک جاؤ گے۔"

سلیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے یونیورسٹی سے واپس آتے ہوئے سوچا دو تین جگہ جو درخواستیں دی ہوئی تھیں ان کا نتیجہ دیکھے گا' کچھ نہیں ہوا تو مجبوراً علم میں اضافے پر کمر باندھ لے گا۔ لیکن ان درخواستوں کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا دو جگہ انٹرویو ہوا لیکن نوکری کسی اور کو دے دی گئی۔ کچھ دن اور انتظار کر کے سلیم پی ایچ ڈی میں داخلے اور اسکالر شپ کے فارم بھر کر تھیو کو دے آیا۔

دوسری طرف سائرہ کے صبر کا پیمانہ بھی اب لبریز ہو رہا تھا۔ شاید ظہور بھائی صحیح کہتے تھے۔ سلیم غزالہ کو کبھی نہیں بتا سکے گا۔ تو پھر وہ کیا کرے۔ اس ڈور کو پکڑ کر لٹکی رہے۔ آہستہ آہستہ اس کا ایمان بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ جو دو لفظ ایک بار پڑھ دیئے گئے' اپنی پوری زندگی ان کے نام کب تک مقفل رکھے اور پھر یہ بھی تو یقین نہیں تھا کہ ان دو لفظوں کا سحر باقی ہے یا نہیں۔ اس نے سوچا ظہور بھائی سے کہے گی کہ وہ کسی دوسرے مولانا سے بات کر کے مسئلہ معلوم کریں۔ لیکن اس سے پہلے اسے سلیم سے بات کرنی تھی۔ بالکل دو ٹوک بات۔ وہ اپنے آپ کو اس آخری معرکے کے

لئے تیار کر رہی تھی کہ بہت اچھی خوشخبری والا فون آگیا۔ عذرا نے میڈیکل مکمل کر لیا تھا۔ اگلے ہفتے اس کی گریجویشن تھی۔ عذرا نے ضد کی تھی کہ وہ اس کی گریجویشن میں شرکت کرنے ضرور آئے۔ کوئی اور نہیں آ سکتا تھا۔ ماں کے لئے اکیلے آنا آسان نہیں تھا۔ وہ ہوائی سفر کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ روشن کے تیسری بیٹی ہو گئی تھی۔ وہ ابھی چند مہینے کی تھی۔ رنی کا آنا بھی یقینی نہیں تھا۔ شیخ علی کے ساتھ وہ جنوبی امریکہ گئی ہوئی تھی۔ لیکن اس نے کہا تھا کہ آنے کی کوشش کرے گی۔ سائرہ نے فیکٹری میں بات کی تو مالک ایک ہفتے کی چھٹی دینے کے لئے تیار تھا۔ سائرہ نے سوچا شاید کچھ دنوں کی تبدیلی اسے راس آ جائے اور اس میں کوئی بہتر فیصلہ کرنے کی ہمت آ سکے۔ تین دن بعد وہ لندن کے لئے پرواز کر گئی۔

لندن میں رنی کی ماں نے سائرہ کو ماں جیسی گرمجوشی سے گلے لگایا۔ سائرہ کا خیال تھا بہت ضعیف ہو گی لیکن اپنی عمر سے بہت کم اور اتنی پر کشش لگتی تھی کہ کوئی بھی ایک بار پلٹ کر دیکھ سکتا تھا۔ گریجویشن کے دن رنی بھی پہنچ گئی۔ شیخ علی اب تک برازیل میں تھے لیکن ان کے ذاتی جیٹ پر ایک دن کے لئے لندن آ گئی تھی۔ سائرہ نے طے کیا تھا کہ کم از کم خوشی کے موقعوں پر اب نہیں رویا کرے گی۔ اکثر وہ سوچتی کہ رونا زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ خوش ہو کر' اداس ہو کر' کسی سے مل کر یا بچھڑ کر' موت پر یا شادی پر' آنسو ہر جذبے کا اظہار بن گئے تھے۔ لیکن عذرا جب ڈگری لے کر آئی تو اسے گلے لگا کر آنسو کا چشمہ پھر ابل پڑا۔ وہ روک ہی نہیں سکی تھی۔ پہلی بار اس نے غور کیا تھا تو آنسوؤں کی یہ ثقافت بہت خوش رنگ نظر آئی۔ اس کے آنسوؤں نے اس وقت ایک پوری تاریخ بیان کی تھی۔ ان آنسوؤں میں صرف عذرا کا مستقبل ہی نہیں اس کی ماں کا ماضی بھی لکھا تھا۔ کتنے رت جگے' کتنے خواب اور کیسی تعبیریں چھپی تھیں۔ایک پل میں کوئی سب کچھ کیسے کہہ سکتا تھا۔ لیکن اس کے آنسو نے کہا تھا اور عذرا کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو نے سنا اور سمجھا تھا۔ اسے یاد آیا کہ گلے ملتے ہوئے اس کی اور رنی کی ماں دونوں کی آنکھیں

گیلی ہو گئی تھیں۔ زبان سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن آنسوؤں نے ایک دوسرے کے کانوں میں اکرم بٹ کی وہ کہانیاں دہرا دی تھیں جو تیس برس پہلے رفی کے ماں پر اور چند سال پہلے سائرہ پر گزری تھیں۔

رفی کے پاس ان کے ساتھ گزارنے کے لئے صرف ایک رات تھی اور وہ یہ رات اپنے پیاروں کے ساتھ گزارنے کا پورا اہتمام کر کے آئی تھی۔ گریجویشن سے واپس آئے تو ایک لیموزین انہیں ایئرپورٹ لے کر بھاگی۔ جہاں سے شیخ علی کے جیٹ میں بیٹھ کر وہ سب ڈنر کرنے ایمسٹرڈیم آ گئے۔ جس ریسٹورنٹ میں ڈنر کا انتظام تھا اس میں کم از کم دو ہفتے پہلے بک کرائے بغیر میز نہیں ملتی تھی، لیکن شیخ علی نے ایک دن پہلے فون کیا تھا اور ان کے آنے پر ریسٹورنٹ میں اس طرح کھلبلی مچی تھی جیسے لندن کا شاہی خاندان آ پہنچا ہوا۔ عذرا کو لندن میں رہتے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ اسے رفی اور اس کی ماں کی ایسی شاندار ضیافتوں کی عادت ہو گئی تھی لیکن سائرہ نے ٹھاٹ باٹ کا یہ انداز پہلی بار دیکھا تھا۔ زیادہ حیرت ماں بیٹی کو پانی کی طرح شیمپئن پیتے ہوئے دیکھ کر ہوئی۔ ماں کی رفتار تو ست ہو گئی تھی لیکن رفی نے کھانے کے دوران سرخ شراب شروع کر دی تھی جو ایک کے بعد دوسری بوتل کی شکل میں جاری تھی۔ اس نے نئی بوتل کھلنے کے بعد منہ میں گھونٹ بھر کے شراب کا مزا بھی نہیں چکھا تھا۔ بس ہاتھ ہلا کر اشارہ کر دیا تھا اور بیرا جام بھر کر چلا گیا تھا۔

ڈنر ختم ہوا تو سائرہ کے علاوہ تینوں نے اپنی اپنی زندگی کے بارے میں ایک ایک اہم اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا۔ پہلا اعلان رفی کی ماں کا تھا جس نے عذرا کو قانونی طور پر اپنی بیٹی بنا لیا تھا اور وہ بوتیک عذرا کے نام کر دی تھی جو رفی نے اسے کھلوا کر دی تھی۔ رفی نے زور زور سے تالیاں بجائی تھیں۔ عذرا خاموش رہی تھی اور جب بولی تو رفی کی ماں اداس ہو گئی۔

"میں اپنے گھر حیدر آباد واپس جا رہی ہوں۔" عذرا نے بہت آہستگی سے کہا۔

رفی اور اس کی ماں حیران ہو گئے۔ صرف سائرہ سمجھتی تھی کیوں۔

"لیکن کیوں؟ تم تو اس پر تیار ہو گئی تھیں کہ ماں کو اپنے پاس لندن بلوا لو

گی۔ ماں آ گئی تو پھر تمہارے جانے کی کیا ضرورت ہے؟" رفی کی ماں نے پوچھا۔

"میں ماں کی نہیں اپنے باپ کی وجہ سے واپس جا رہی ہوں۔" عذرا نے کہا۔

"باپ کی وجہ سے؟" رفی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میرے بابا میرے پیدا ہونے سے پہلے مر گئے تھے۔ کوئی انہیں اتنی دیر زندہ نہیں رکھ سکا تھا کہ وہ مجھے دنیا میں آتا دیکھ سکتے۔ وہ میرے لئے رشتے کا صرف احساس ہیں۔ وہ احساس جسے میں کبھی چھو کر نہ دیکھ سکی۔" سائرہ کے آنسوؤں کو اُمڈنے کا ایک اور بہانہ مل رہا تھا لیکن اس نے انہیں ڈانٹ دیا۔ اسے پتہ تھا کہ عذرا نے اپنی آنکھیں خشک رکھنے کے لئے خون کے کتنے گھونٹ پئے ہوں گے۔ لیکن رفی کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں۔

"حیدر آباد میں ہمارا مکان بہت بڑا ہے۔" عذرا کہہ رہی تھی۔ "اسی کے ایک حصے میں غریبوں کے لئے دواخانہ کھولوں گی۔ رشتوں کو گوشت پوست کا وجود بنا کر زندہ رکھنے کی کوشش کروں گی۔ کسی ایک کو بھی مرنے سے بچا سکی تو سمجھوں گی آپ نے مجھ پر جو محنت کی ہے وہ کامیاب ہو گئی۔" عذرا نے رفی کی ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ رفی کی ماں اپنی کرسی سے اٹھ کر عذرا کے پاس آئی اور گلے لگا کر اس کے دونوں گالوں کو بوسہ دینے لگی۔

"خدا تمہیں کامیاب کرے بیٹی۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ جو مدد کہو گی دینے کے لئے تیار ہیں۔" رفی کی ماں نے کہا۔ اس کی اداسی ختم ہو گئی تھی اور آنکھوں میں فخر کا وہ احساس چمک گیا تھا جو اولاد کا کارنامہ سن کر ماؤں کا سر اونچا کرنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی جو رفی نے اپنے گلاس پر چمچہ بجا کر توڑی اسے شاید نشہ ہونے لگا تھا۔ رفی کے اعلان نے ماحول کی اداسی دور کی اور سب کو سخت حیران کر دیا۔

"میں شیخ علی سے شادی کر رہی ہوں۔" رفی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر کے لئے سب خاموش ہو گئے۔

"مسٹر چنائے کا کیا ہو گا۔" سائرہ نے خاموشی توڑی

"مسٹر چنائے کو معلوم ہے۔ وہ اب ریٹائر ہو کر اسپین جا رہے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری سال وہیں گزاریں گے۔" رفی نے بتایا۔

"تو کیا وہ آپ کو چھوڑنے پر تیار ہو گئے ہیں۔" سائرہ نے پھر پوچھا۔

"وہ میرے سچ مچ کے شوہر نہیں ہیں، صرف مشہور ہیں۔ میں نے ان سے کبھی شادی نہیں کی تھی۔"

"کیا.....؟" اس دفعہ خود رفی کی ماں چیخ پڑی تھی۔ عذرا بھی حیرت سے رفی کو دیکھنے لگی۔

"یہ راز صرف میرے اور اختر کے درمیان تھا اب علی کو معلوم ہے۔" رفی سب کی حیرت کو نظر انداز کر کے کہنے لگی۔ "میں اور علی جب بھی ملتے تھے بچھڑنا مشکل لگتا تھا۔ شاید اسی کا نام محبت ہے لیکن ہم دونوں سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ علی نے پچھلی ملاقات میں صاف صاف کہہ دیا وہ مجھے اب جدا نہیں ہونے دیں گے ایک مصنوعی زندگی گزارتے ہوئے میں بھی بہت تھک گئی ہوں۔ میں نے بھی ہاں کر دی۔"

"لیکن شیخ علی کی بیوی؟" سائرہ نے پوچھا۔ اس کے اپنے معاملات بھی کچھ ملتے جلتے تھے۔

"علی نے شیخا کو بتا دیا ہے۔ اسے پرواہ نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ بیویاں شیخوں کی پرانی روایت ہے۔ علی کی بیوی کو حیرت تھی کہ علی نے اب تک دوسری شادی کیوں نہیں کی۔ علی کہتے ہیں کہ میں نہیں ملتی تو وہ کرتے بھی نہیں۔" فخر سے رفی کی گردن میں ہلکا سا خم آ گیا۔

"پاکستان میں تمہارا اتنا بڑا کاروبار ہے اس کا کیا ہو گا۔" رفی کی ماں نے پوچھا۔

"اختر اسے سمیٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جو میرا ہے اس میں سے بہت کچھ تو میں نے ایدھی فاؤنڈیشن کے نام لکھ دیا ہے۔ جو بچا ہے وہ ہم چاروں کا ہے۔" رفی نے کہا تو اس کی ماں، سائرہ اور عذرا تینوں نے بیک وقت کچھ بولنا چاہا لیکن رفی نے ہاتھ اٹھا کر خاموش کر دیا۔

"مجھے معلوم ہے تم لوگوں کو کچھ نہیں لینا۔ تم لوگوں کو ضرورت نہیں ہے۔ تم سب بہت بے غرض ہو۔ میں تم سے کچھ لینے کو کہہ بھی نہیں رہی۔ صرف بتا رہی ہوں کہ جو ہے وہ تم لوگوں کے نام تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ میں سب کچھ لندن ٹرانسفر کر رہی ہوں۔ ہمارے کام نہیں آئی تو ہمارے بعد یہ دولت بھی ایدھی ٹرسٹ کو چلی جائے گی۔ میرے وکیل نے سب کاغذات بنوا لئے ہیں کچھ دنوں میں تمہیں اس کی کاپیاں مل جائیں گی۔" سب خاموش ہو گئے۔ رفی نے کسی کے لئے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

سائرہ واپس آئی تو لندن کے دن اور ایمسٹرڈم میں گزری ہوئی رات خواب بن کر چمٹے رہے۔ ایسا خواب جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شروع شروع میں روح بہت بلند پرواز کرتی رہی۔ ایک ایک لمحے کی یاد اسے بار بار خوش کر دیتی۔ لیکن پھر اس پر اچانک یاسیت کا دورہ پڑا۔ اپنی زندگی بیکار اور بے مقصد نظر آنے لگی۔ سب کتنی مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ اس کی اپنی چھوٹی بہن عذرا نے اپنی زندگی ایک مقصد کی نذر کر دی تھی۔ ایک منزل طے کر کے اس طرف چل پڑی تھی۔ کتنا فخر ہوا تھا اسے عذرا پر۔ رفی اور اس کی ماں بھی کچھ نہیں تو کم از کم اپنی زندگی کو بہتر بنانے میں مصروف تھے۔ لیکن اس کی اپنی زندگی تو خلاء میں لٹک گئی تھی۔ مقصدیت تو دور کی بات ذاتی اطمینان کی کوئی لہر بھی نہیں تھی۔ حالات بہتر ہوتے لیکن وہ خود اپنے سینے میں خنجر اتار لیتی۔ جو خنجر اس وقت سینے میں تھا اسے نکالنا اختیار میں تھا۔ لیکن ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ قطرہ قطرہ لہو ٹپکا رہی تھی۔ رفی کے الفاظ ہر وقت ذہن میں گونجتے رہتے۔ ایمسٹرڈم سے لندن جاتے ہوئے تنہائی پا کر رفی نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ بیوقوف بننا چھوڑ دے۔ رفی کے طویل لیکچر کا ایک ایک لفظ اس کے دل پر لکھا گیا تھا۔ رفی نے صاف صاف نہیں کہا تھا۔ لیکن جو وہ کہنا چاہتی تھی سائرہ کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا تھا۔

سائرہ لندن سے آتے ہوئے سب کے لئے تحفے لے کر آئی تھی۔ سب سے

زیادہ تحفے زرین کے حصے میں آئے تھے۔ ایک بولتی ہوئی گڑیا۔ کئی خوبصورت فراکیں۔ غزالہ کے لئے میک اپ کا سامان۔ سلیم کے لئے آفٹر شیو۔ زریں خوشی سے چھلانگیں لگاتی ہوئی سائرہ سے لپٹ گئی۔ غزالہ کی آنکھیں احسان سے جھک گئی تھیں۔ اسے شرمندگی ہوئی کہ سائرہ اتنا کرتی تھی اس کی بہن کی گریجویشن پر انہیں بھی تحفہ بھیجنا چاہئے تھا۔ اسے حیرت ہوئی سلیم کو کیوں خیال نہیں آیا۔ تحفے بھی لین دین کا سودا تھے۔ حساب برابر کرنا ضروری تھا۔

"آپ اتنی جلدی میں لندن گئی تھیں کہ ہم آپ کی بہن کے لئے کچھ بھجوا بھی نہیں سکے۔" غزالہ نے اپنی شرمندگی چھپانا چاہی۔

"وہ اگلے سال یہاں آئے گی تو بہت سے تحفے دے دینا۔" سائرہ نے کہا۔ زریں گڑیا لے کر اس کے ساتھ کھیلنے کھانے کی میز پر بیٹھ گئی تھی۔

"کتنا فخر ہو گا آپ سب کو عذرا پر۔ کیا وہ بھی اتنی خوبصورت ہے جتنی آپ"

"وہ بہت خوبصورت ہے۔" سائرہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ "میں اس کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی۔ میں تمہیں اس کے گریجویشن کی تصویریں دکھاتی ہوں۔" سائرہ ایک ایک کر کے غزالہ کو اپنے لندن کے دورے کی تصویر دکھانے لگی۔ گریجویشن کے دن کی تصویروں میں رفی اور اس کی ماں بھی تھیں۔ ان کے بارے میں غزالہ کو بتاتی رہی۔ غزالہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگی تھیں۔

"دونوں ماں بیٹی نہیں بہنیں لگتی ہیں۔" غزالہ نے تصویریں دیکھ کر واپس کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن عذرا آپ سے ملتی جلتی ہے۔ آپ کی طرح بے حد خوبصورت ہے۔ بال کٹوا لے اور چشمہ اتار دے تو بالکل آپ کی طرح لگے گی۔" غزالہ نے کہا تو سائرہ شرماتے ہوئے تصویریں واپس رکھنے لگی۔ غزالہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کیسے کہے۔

"باجی ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانیں گی۔" غزالہ کی عمر بھی سائرہ جیسی تھی یا شاید ایک دو سال کم ہو لیکن وہ ہمیشہ اسے باجی کہتی تھی۔ شاید عمر کی جگہ اکثر حالات بھی رشتوں کا پیمانہ بن جاتے ہیں۔ سائرہ سوالیہ نشان بن کر غزالہ کو دیکھنے لگی۔

"آپ ہمارے لئے اتنا کرتی ہیں۔ ہر وقت کہیں نہ کہیں لئے پھرتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ خریدتی رہتی ہیں۔ اتنے قیمتی تحفے لاتی ہیں۔ ہم شاید اتنا کرایہ نہ دیتے ہوں جتنا آپ خرچ کر دیتی ہیں۔ مجھے بہت شرم آتی ہے۔" غزالہ اکثر سوچتی تھی۔ اسے پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی تو پھر ایک خاندان کو کرائے پر رکھ کر اپنے گھر کا حصہ دار بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے سلیم سے بھی پوچھا تھا' اس نے کہا تھا سائرہ پیسے کے لئے نہیں تنہائی دور کرنے کے لے کرائے دار رکھتی ہے۔ سلیم کے جواب نے غزالہ کو مطمئن کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ یہ سوچ کر شرمندہ ہوتی رہتی کہ اس کا حساب کیسے برابر کرے۔ سائرہ کے تو کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔

"ایسی باتیں مت سوچا کرو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" سائرہ نے پورے خلوص سے کہا۔ "زریں جب آنٹی کہہ کر مجھ سے لپٹ جاتی ہے تو ساری زندگی کا کرایہ ایک ہی بار وصول ہو جاتا ہے۔"

"آپ کا دل نہیں چاہتا آپ کا بھی اپنا خاندان ہو۔" غزالہ نے ہمت کر کے پوچھا۔

"تم ہو تو۔ تم لوگ میرا خاندان ہی تو ہو۔ تم میرے لئے روشن اور عذرا جیسی ہو۔ زریں بالکل بیٹی کی طرح ہے۔ مجھے تو بنا بنایا خاندان مل گیا ہے۔" سائرہ نے مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے آپ کا...... آپ کا اپنا......" غزالہ اٹکنے لگی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے کہے۔ لیکن سائرہ سمجھ گئی تھی۔

"میں نے کوشش کی تھی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔" سائرہ نے کہا تو مسکراہٹ میں تلخی گھل گئی۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" غزالہ نے کہا۔ اسے غزالہ کی آنکھوں میں اپنے لئے ترس نظر آیا۔ لہجے میں ہمدردی بھری ہوئی تھی۔ سائرہ کو ہمدردی سے نفرت تھی۔ اسے لگتا جیسے کوئی بھیک دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ رفی اور جولی نے جو اس کے سچے اور سب سے بڑے ہمدرد تھے اسے کبھی اس طرح نہیں دیکھا جیسے ہمدردی کر رہے

ہوں۔ ان کی نظروں، ان کے لہجے اور ان کی باتوں میں جو ہمدردی ہوتی وہ محبت کا روپ لے کر باہر نکلتی تھی۔ غزالہ کی ہمدردی ایک معصومانہ ردعمل تھا جو سائرہ کی کہانی سن کر کسی کا بھی ہو سکتا تھا۔ اس لئے سائرہ کو غزالہ پر غصہ نہیں آیا۔ غصہ تو اسے سلیم پر تھا جس نے غزالہ کو اس کی پوری کہانی سنائی تھی۔ غزالہ کے لہجے اور اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی اداسی سے لگتا تھا سلیم نے اس کی کہانی پوری اور تمام جزئیات کے ساتھ سنائی ہو گی۔ کیوں......؟ آخر کیوں؟؟ سائرہ نے غصے سے سوچا۔ لیکن پھر دل سلیم کی مدافعت پر آمادہ ہو گیا۔ سلیم نے غزالہ کے دل میں سائرہ کے لئے ہمدردی پیدا کرنا چاہی ہو گی۔ کسی عورت کے دل میں دوسری عورت کے لئے ہمدردی گھر کر جائے تو پھر جلن کے جذبے دب جاتے ہیں۔ سائرہ نے یہ اپنے تجربے سے دیکھا تھا۔ غزالہ کا حال جان کر سائرہ کے دل میں ہمدردی ہی تو پیدا ہوئی تھی۔ دل تڑپ کر رہ گیا تھا۔ ساتھ آ کر رہنے لگی تو ہمدردی محبت بن گئی تھی۔ جلن کا کوئی احساس نہیں ابھرتا۔ رات کو سلیم اور غزالہ جب اپنے کمرے میں سونے جاتے اس وقت بھی وہ غزالہ کے لئے رقابت کا کوئی جذبہ محسوس نہیں کرتی۔ بس دل کٹ کے رہ جاتا۔ پوری رات بے چینی میں کروٹیں بدلتے گزرتی۔ اسے یقین تھا سلیم بھی اس سے بے خبر نہیں ہو گا۔ غزالہ کے دل میں ہمدردی پیدا کر کے اپنے اور سائرہ کے تعلق سے اس کو آگاہ کرنے کی تیاری کر رہا ہو گا۔ سائرہ کو سلیم کی اس بات پر اب یقین آ گیا تھا کہ غزالہ کو بتانا بہت مشکل کام تھا۔ غزالہ کی ہر کہانی سلیم کے گرد گھومتی تھی۔ وہ جب سائرہ کو اپنے بچپن اور شادی سے پہلے کے قصے سناتی ان میں سلیم کہیں نہ کہیں سے ضرور آ کھڑا ہوتا۔ وہ جان گئی تھی کہ غزالہ سلیم کے ساتھ صرف شادی کے دھاگے میں پرویا ہوا موتی نہیں ہے بلکہ اس نے اپنی رگ رگ میں سلیم کو بسایا ہوا ہے۔ سلیم کی کسی اور سے وابستہ ہونے کی خبر سن کر کوئی رگ پھٹ بھی سکتی تھی۔

"آپ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟" غزالہ نے خیالوں میں ڈوبی ہوئی سائرہ کو چونکا دیا۔

"سب کچھ اتنا سادہ اور آسان نہیں ہے۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" غزالہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے یہاں عورتوں کی دوسری شادی بہت دشوار کام ہے۔ میری ایک رشتے کی پھوپھی تھیں۔ وہ جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔ بہت خوبصورت تھیں۔ کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ لیکن ان کی کبھی شادی نہیں ہو سکی۔ انہوں نے پوری زندگی بیوہ رہ کر گزار دی۔ جو رشتے آتے تھے وہ لگتا تھا ترس کھا کر شادی کرنا چاہتے ہوں۔ ایک جگہ بات پکی ہو گئی تھی۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دل کا مریض ہے۔ دل کے دو دورے پڑ چکے ہیں۔ وہ شادی ابا نے ختم کرا دی۔ کہتے تھے بیوہ ہونا ہے تو شادی کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن آسٹریلیا تو مختلف ہے۔ یہاں تو یہ مسئلہ نہیں ہو گا لوگ بھی صاف اور سچے ہوں گے۔"

"اس گمان میں مت رہنا۔ یہاں کے شکاری زیادہ چالاک ہیں۔" سائرہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"نعیم بھائی یہاں ہوتے تو میں آپ کی شادی ان سے کرا دیتی۔" غزالہ نے پورے خلوص کے ساتھ کہا۔

"اپنی پھوپھی کی طرح تمہیں مجھ پر بھی ترس آ رہا ہے۔" سائرہ نے طنز کیا۔

"نہیں نہیں۔ پلیز نہیں۔ ایسا سوچیں بھی نہیں۔" غزالہ کی آنکھوں میں دکھ بھر آیا۔

"لیکن تمہارا بھائی ایک ایسی عورت سے کیوں شادی کرے گا جس کی پہلے بھی شادی ہو چکی ہو۔" سائرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ نعیم بھائی کو نہیں جانتیں۔" غزالہ کے لہجے میں فخر آ گیا۔ "وہ بہت مختلف ہیں۔ مجھے پتہ ہے آپ سے اچھی لڑکی انہیں نہیں ملے گی۔ انہیں اس کی پرواہ بھی نہیں ہو گی کہ آپ کا ماضی کیا تھا۔ نعیم بھائی ہمیشہ کے باغی ہیں۔ انہیں ہمیشہ سے دوسروں کے لئے کام کرنے کی لگن رہتی ہے۔ کالج میں تھے تو ہر وقت دنیا کو بدلنے کی باتیں کرتے تھے۔ کسی انقلابی گروپ کے ساتھ کام کرتے تھے دن رات غائب رہتے۔ ہم ان کی شکل کو ترس گئے تھے۔ اس زمانے میں انہیں اپنی ایک ساتھی سے محبت ہو گئی تھی۔ شیما نعیم بھائی سے بھی زیادہ دیوانی تھی۔ بہت پیسے والے گھر کی تھی لیکن

سب کچھ چھوڑ کر مزدوروں کی بستی میں رہتی اور مزدوروں کے لئے کام کرتی تھی۔ ہڑتالیں کرواتی، جیل جاتی، کبھی تھانوں میں بیٹھی پولیس والوں کی گالیاں سنتی رہتی۔ لیکن اس نے تھکنا نہیں سیکھا تھا۔ ایک دفعہ ایک مل کے سامنے ہڑتالی مزدوروں کے لئے بھوک ہڑتال کرنے بیٹھ گئی۔ مرتے مرتے بچی تھی۔ مل مالک بھی ڈر گئے تھے کہ وہ مر گئی تو مزدور مل کو آگ نہ لگا دیں۔ لیکن شیما ایک روز نعیم بھائی کو چھوڑ کر چلی گئی۔"

"چلی گئی؟" سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں نعیم بھائی پاگل ہو گئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شیما انہیں چھوڑ سکتی ہے۔ شیما ان کی محبت ہی نہیں۔ ان کا ایمان تھی۔ نعیم بھائی کو ان کے ساتھیوں نے یہ بتا کر سمجھا دیا تھا کہ وہ کسانوں کی کوئی تحریک منظم کرنے سندھ کے دیہات میں چلی گئی ہے۔ نعیم بھائی فوراً جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ کہتے تھے کہ شیما سے بے وفائی کا سبب پوچھیں گے۔ ان کا دیوانہ پن دیکھ کر ان کے کسی بزرگ ساتھی نے وجہ بتا دی۔ شیما کو ٹی بی ہو گئی تھی۔ اسے بیڑی پینے کا مرض تھا۔ ہر وقت بیڑی منہ میں لگی رہتی۔ جب بھوک ہڑتال پر تھی تب بھی کچھ کھائے بغیر صرف بیڑی پر زندہ تھی۔ گندی بستی، خوراک کی کمی اور ہر وقت کا کام، ٹی بی نے پھیپھڑے پکڑ لئے۔ نعیم بھائی اور زیادہ دیوانے ہو گئے۔ اس کا پتہ لے کر اس سے شادی کرنے چلے گئے۔ کہتے تھے ان کا جینا مرنا ساتھ ہے۔ شیما کو پتہ چلا کہ نعیم بھائی آ رہے ہیں تو کراچی کی مزدور بستی میں واپس آ گئی اور ایک مزدور سے راتوں رات شادی کر لی۔"

"اس مزدور کو معلوم تھا کہ شیما کو ٹی بی ہے۔" سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ مشینیں چلانے والا سیدھا سادا مزدور تھا۔ مردان سے مزدوری کرنے کراچی آیا تھا۔ مزدوروں کی یونین میں وہ بھی سرگرم تھا اور دل ہی دل میں شیما سے محبت کرتا تھا۔ وہ نعیم بھائی اور شیما کے تعلق کو جانتا تھا۔ لیکن جب شیما بستی واپس آئی اور اسے سب کچھ پتہ چلا تو وہ شیما کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا شیما نے اسے سمجھایا کہ وہ بھی مر جائے گا لیکن کہتا تھا پرواہ نہیں۔ اس کے بغیر بھی مرنا ہے تو ساتھ کیوں نہ

مرے۔ شیما جانتی تھی نعیم بھائی بھی ایسے ہی دیوانے ہیں۔ وہ بھی نہیں مانیں گے اس لئے نعیم بھائی کو بچانے کے لئے اس نے ہاں کر دی۔"

"تمہارے بھائی نے تو ہوش کھو دیا ہو گا۔" سائرہ نے کہا۔

"ہاں۔ بستی جانے سے پہلے ہی انہیں پتہ چل گیا تھا۔ وہ پھر وہاں گئے نہیں۔ شیما سے ملنے بھی نہیں گئے۔ گھر آ کر رات بھر میرے پاس بیٹھے روتے اور شیما کی کہانیاں سناتے رہے۔ انہیں دکھ تھا کہ قربانی دینا ان کا حق تھا' شیما نے یہ حق کسی اور کو دے دیا تھا۔ بعد میں ان میں بہت ٹھہراؤ آ گیا تو انقلاب بھول کر ساری توجہ پڑھائی پر لگا دی یونیورسٹی ختم کرنے تک ہر سرگرمی چھوڑ دی تھی۔"

"شیما کا کیا ہوا۔ وہ تو مر گئی ہو گی۔" سائرہ نے پھر سوال کیا۔

"نہیں۔ جس نے اس سے شادی کی تھی اس کی محبت سچی تھی۔ وہ دھن کا بھی بہت پکا تھا۔ شیما کو وہ قبائلی راستے سے کابل لے گیا وہاں سے وہ کسی طرح ماسکو چلے گئے۔ ماسکو میں شیما ایک سال سینی ٹوریم میں رہی اور ٹھیک ہو کر نکلی۔ کئی سال وظیفے پر وہ ماسکو میں رہتے رہے لیکن روسی حکومت بدل گئی اس لئے اب پاکستان واپس آ گئے ہیں۔"

"تمہیں اپنے بھائی سے بہت محبت ہے۔" یہ سائرہ کا سوال تھا اور بیان بھی۔ وہ نعیم کے تذکرے سے بہت متاثر نظر آتی تھی۔

"مجھے ہی نہیں ہم سب کو ہے۔ لیکن ہم اپنی محبتوں کو دل میں سجا کر رکھتے ہیں ظاہر کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میں ٹی وی پر فلمیں دیکھتی ہوں تو ہر کردار ہر دو منٹ بعد مجھے تم سے محبت ہے کا جملہ دہراتا ہے۔ اتنے برس کی شادی میں سلیم نے ایک بار بھی مجھ سے یہ جملہ نہیں کہا۔ ایک دوسرے سے ہماری محبتیں ایک ان کہے فرض کی طرح ہیں۔ شاید اسی لئے اظہار اچھا نہیں لگتا۔" غزالہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ لیکن پھر اپنے بھائی کی دنیا میں واپس آ گئی۔ "نعیم بھائی گھنٹوں بیٹھے مجھے اپنے قصے سناتے امی اور ابا بھی نعیم بھائی سے میرے ذریعے بات کرتے تھے۔ نعیم بھائی کی سرگرمیاں ابا کو پسند نہیں تھیں۔ لیکن نعیم بھائی نے ان کی بات کبھی نہیں سنی بلکہ

ایک دفعہ تو غصے میں کہہ دیا کہ ابا بھی لوٹ کھسوٹ کے نظام کا حصہ اور ایک مجرم ہیں۔ اس کے بعد سے ابا نے بیٹے سے بات کرنا بند کر دی تھی لیکن امی پر غصہ نکالتے تھے۔ وہ کڑھتی رہتیں اور جب بھی نعیم بھائی سامنے آتے کوسنوں کی بوچھاڑ کر دیتیں۔ نعیم بھائی نے امی کی گالیوں کا کبھی برا نہیں مانا۔ سنتے اور خاموشی سے میرے پاس چلے آتے۔" بھائی کا ذکر کرتے ہوئے غزالہ بہت اداس ہو گئی۔ لیکن سائرہ کو حیرت تھی کہ غزالہ کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں بہا تھا۔ وہ ہوتی تو اب تک جل تھل کر چکی ہوتی۔ دونوں تھوڑی دیر اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ غزالہ اچانک پھر وہیں آ گئی جہاں سے بات شروع ہو گئی تھی۔

"میں سچ کہتی ہوں، نعیم بھائی سے آپ کی جوڑی بہت اچھی لگے گی۔"

"اپنے بھائی کا رشتہ دینے سے پہلے تم نے سلیم سے بھی پوچھا ہے۔" سائرہ نے ہنس کر کہا۔

"سلیم کے پاس بات کرنے کا وقت کہاں ہے۔" غزالہ نے نظریں نیچی کئے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "انہیں یونیورسٹی سے فرصت نہیں ہے۔ دیر سے آتے ہیں، کھانا کھا کر ٹی وی دیکھتے ہیں، جب تک میں زریں کو سلا کر آتی ہوں سو چکے ہوتے ہیں۔ آسٹریلیا نے انہیں بہت بدل دیا ہے۔ مجھے اب وہ پاکستان والے سلیم نہیں لگتے۔ لگتا ہے بات کرنا جانتے ہی نہ ہوں۔" اسی وقت باتھ روم سے زریں غزالہ کو پکارنے لگی۔ باتوں میں وہ زریں کو بھول گئے تھے۔ وہ اپنی گڑیا سے کھیلتے ہوئے اب اسے غسل دینے کی کوشش کر رہی تھی، شاید اسی لئے ماں کی مدد کی ضرورت پڑی تھی۔ غزالہ سائرہ کو سوچوں میں ڈوبا چھوڑ کر تیزی سے باتھ روم کی طرف چلی گئی۔

اس صبح فون کی گھنٹی نے سلیم اور غزالہ دونوں کو چونکا دیا۔ سائرہ زریں کو لے کر اسے اسکول چھوڑتی ہوئی فیکٹری چلی گئی تھی۔ سلیم ناشتہ کر کے یونیورسٹی جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ غزالہ اس کے لئے لنچ پیک کر رہی تھی۔ یہ کسی کے فون کرنے کا وقت نہیں تھا۔ سائرہ ابھی فیکٹری نہیں پہنچی ہو گی۔ ظہور اور چودھری انور کے سونے

کا وقت تھا۔ سلیم سمجھ گیا یونیورسٹی سے فون ہو گا۔ ڈیپارٹمنٹ کی ضرورت سے زیادہ محتاط سیکریٹری فون کر کے یقین کرنا چاہتی ہو گی کہ اسے گیارہ بجے کی کلاس یاد ہے یا نہیں۔ سلیم نے فون اٹھایا تو اوورسیز آپریٹر تھا۔ کال ٹوکیو سے تھی۔ ایک دو کلک کے بعد دوسری طرف سے نعیم کی آواز سنائی دی۔

"نعیم کیا حال ہیں۔ ٹھیک ہو۔ ٹھہرو میں غزالہ کو بلاتا ہوں۔" سلیم اور نعیم کے درمیان رشتوں کے علاوہ باہمی دلچسپی کی کوئی ایسی چیز کبھی نہیں تھی کہ وہ ایک دوسرے سے زیادہ گفتگو کرتے۔ سلیم کو پتہ تھا نعیم نے غزالہ کے لئے فون کیا ہو گا۔

"نہیں مجھے غزالہ سے نہیں آپ سے بات کرنی ہے۔" دوسری طرف سے نعیم نے جلدی سے کہا۔ "میں جیل میں ہوں پولیس نے کل رات غیر قانونی رہنے والوں کو چھاپہ مار کر پکڑا ہے، میں بھی پھنس گیا ہوں وہ ہم سب کو جہاز میں چڑھا کر پاکستان واپس بھجوا رہے ہیں۔"

"لیکن تم پاکستان گئے تو وہ چھوڑیں گے نہیں۔" سلیم کی آواز میں تشویش شامل تھی۔ نعیم کا نام سن کر غزالہ بھی پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"ہاں۔ میں نے اسی لئے بڑی مشکل سے یہاں کی پولیس کو سمجھایا ہے کہ مجھے اپنی بہن کے پاس آسٹریلیا جانا ہے۔ ویزے اور ٹکٹ کا انتظام کرنے کے لئے انہوں نے پندرہ دن کی مہلت دی ہے۔ ٹکٹ میں لے لوں گا کسی طرح ویزے کا بندوبست آپ کو کرنا ہو گا۔"

"یہاں کا ویزا اتنا آسان نہیں ہے۔ اور اتنی جلدی تو بہت مشکل ہو گا۔" سلیم جانتا تھا کہ نعیم ایک ناممکن کام کے لئے کہہ رہا تھا۔ لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ پاکستان میں نعیم سیدھا پولیس کی حراست میں جائے گا جہاں سے شاید ہی زندہ بچ کر نکل سکے۔

"سلیم بھائی یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔" سلیم نے پہلی بار نعیم کی آواز میں لرزش محسوس کی۔

"تم مجھے اپنا فون نمبر دو۔ میں کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" سلیم نے نعیم

کا نمبر لیا تو دوسری طرف نعیم کے سکے اور وقت بھی ختم ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" سلیم فون رکھ کر مڑا تو غزالہ نے پوچھا۔ اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اسے معلوم تھا کوئی بری خبر ہے۔ سلیم نے بتایا تو تھوڑی دیر سکتے میں رہی اور پھر آنکھیں آنسو برسانے لگیں۔ سلیم غزالہ کو تھپکیاں دیتا رہا۔ اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتی آپ کسی بھی طرح نعیم بھائی کو آسٹریلیا بلا لیجئے۔" غزالہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔" سلیم نے جیسے خود سے کہا۔

"کیوں۔ کیوں نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ کر سکتے ہیں۔ آپ نے ہمیں بلا لیا ہے تو نعیم بھائی کو بھی بلا سکتے ہیں۔" غزالہ ضد کرنا نہیں جانتی تھی۔ لیکن بھائی کے لئے کچھ بھی کر سکتی تھی۔

"تمہاری بات اور تھی۔ تم میری بیوی تھیں۔ پھر بھی تمہیں بلانے میں ایک سال لگ گیا تھا۔ بھائی کو آنے کا حق نہیں ہے۔ ہم وزٹ ویزے کے لئے اسپانسر نہیں کر سکتے۔ ہم دونوں بیروزگار ہیں اور کر بھی سکتے تو اتنی جلدی ویزا ملنا ناممکن تھا۔ امیگریشن والے جانتے ہیں جاپان کی جیل سے آسٹریلیا آنے والا یہاں آکر بھی غیر قانونی ہو جائے گا۔ کوئی بھی نعیم کو ویزا نہیں دے گا۔ صرف ایک صورت ہے۔" غزالہ کو امید نظر آئی تو وہ رونا بھول گئی۔

"کیا؟؟" اس نے چہرہ اٹھا کر سلیم کو دیکھتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

"شادی۔ سلیم نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں صبح اپنے وکیل سے جا کر پوچھوں گا۔ کاغذی شادی کے لئے شاید اس کے پاس کوئی لڑکی ہو۔ لیکن پیسے بہت مانگے گی۔"

"مجھے پرواہ نہیں ہے۔ میں اپنے سارے زیور بیچ دوں گی۔" غزالہ نے کہا۔ لیکن سلیم کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا لڑکی پانچ ہزار ڈالر سے کم نہیں لے گی وکیل کی فیس بھی زیادہ ہو گی۔ اتنے پیسے اس کے پاس نہیں تھے۔ غزالہ کے زیور بیچنا آسان نہیں تھا۔ سلیم اور غزالہ دونوں کی ماؤں نے اپنے سارے زیور غزالہ کو پہنا

دیئے تھے۔ یہ زیور نسلوں کا عطیہ تھے۔ بکاؤ نہیں تھے۔ سائرہ سے پیسے مانگ سکتا تھا۔ وہ کبھی انکار نہیں کرتی لیکن کس منہ سے مانگے گا۔ غزالہ بھی رونا بھول کر یہی سوچ رہی تھی۔ اچانک اسے سائرہ سے اپنی گزشتہ دن کی بات چیت یاد آئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک لہرا گئی۔

"سائرہ باجی۔" اس نے بہت پرجوش ہو کر کہا۔ "میں ان سے کہوں گی۔ وہ مان جائیں گی۔ نعیم بھائی ان کے لئے بہت اچھے شوہر ثابت ہوں گے۔" غزالہ خوش ہو گئی تھی۔ اس نے مسئلہ حل کر دیا تھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" سلیم نے غزالہ کو ڈانٹ دیا۔

"کیوں اس میں کیا بری بات ہے۔" غزالہ نے معصومیت سے کہا۔

"سائرہ کبھی نہیں مانے گی۔ شادی اس کے لئے بہت برا تجربہ تھی۔ وہ کہتی ہے کبھی شادی نہیں کرے گی۔" سلیم نے سائرہ کا ترجمان بن کر کہا۔

"میں انہیں منا لوں گی۔ نعیم بھائی میں برائی کیا ہے۔ سائرہ باجی کو ان سے اچھا شوہر مل نہیں سکتا۔ میں باجی سے خود بات کروں گی۔" غزالہ کی ضد قائم تھی۔

"بکواس مت کرو۔ تم یہ سب معاملات نہیں سمجھتیں۔ سائرہ سے اس موضوع پر کبھی بات مت کرنا۔" سلیم نے غزالہ کو ایک بار پھر بری طرح ڈانٹ دیا۔ اس نے غزالہ سے اس لہجے میں کبھی بات نہیں کی تھی۔ غزالہ سلیم کو بے بسی سے دیکھ کر ایک بار پھر رونے لگی۔ سلیم خود پر قابو رکھنے کی کوشش کرنے لگا کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے غزالہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور اسے پھر تھپکیاں دینے لگا۔ غزالہ کا رونا پھر بھی نہیں تھما۔

"ٹھیک ہے۔ میں بات کروں گا۔ وکیل سے پوچھوں گا۔ بات نہیں بنی تو پھر سائرہ سے معلوم کروں گا۔ لیکن تم سائرہ سے بالکل بات مت کرنا۔ اسے بہت برا لگے گا۔ میں اس سے کسی اور طرح پوچھوں گا۔" غزالہ کو اطمینان ہو گیا۔ اسے سلیم پر پورا اعتماد تھا۔ اعتماد کرنے کے لئے کوئی اور تھا بھی نہیں۔ نعیم کی زندگی اس وقت سلیم کے ہاتھ میں تھی یا شاید سائرہ باجی کے۔ غزالہ نے سوچا۔

سلیم یونیورسٹی چلا گیا۔ وہ جانتا تھا اسے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔ لیکن کیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک بجے کلاس ختم کر کے وہ سیدھا وکیل کے پاس گیا۔ یہ اس کا وہی پرانا وکیل تھا جس نے شادی کے بعد اس کا کیس داخل کیا اور منظور کرایا تھا۔ وکیل نے سلیم کو صاف صاف بتا دیا۔ اس کے بھائی کے لئے وزٹ ویزے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

"اگر آسٹریلیا کی کوئی لڑکی شادی کر لے تو....." سلیم نے بہت جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"پھر ممکن ہے۔ ممکن کیا یقینی ہے۔ میں ایک ہفتے میں اسے سڈنی بلوا لوں گا۔ بلکہ اس کا جیل میں ہونا اس کے حق میں بہتر ثابت ہو گا امیگریشن والے آسٹریلوی لڑکی کے شوہر کی ٹوکیو جیل سے رہائی میں رکاوٹ نہیں بنیں گے فوری حرکت میں آ جائیں گے۔" وکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن لڑکی......" سلیم نے وکیل کی طرف دیکھ کر کہا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وکیل اس کا مطلب سمجھ گیا۔

"یہ کام میں نہیں کرتا۔ بار سے مجھے اپنا لائسنس ختم نہیں کرانا۔ میرا ایک ساتھی وکیل ایسی ہی لڑکی کے ہاتھوں بلیک میل ہو چکا ہے۔ پیسہ لے کر شادی کرنے والی لڑکیاں اب بھروسے کے قابل نہیں رہیں۔"

سلیم خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔ وکیل اپنی گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ سلیم جانتا تھا وہ بہت مصروف وکیل ہے اس لئے وہ اٹھ گیا۔ وکیل بھی اس سے ہاتھ ملانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لیکن اسے کچھ خیال آ گیا۔

"اپنی بیوی کو چند دنوں کے لئے طلاق دے کر اس سے شادی کرا دو۔ سب سے محفوظ طریقہ ہے۔ طلاق مکمل ہونے میں سال بھر لگتا ہے لیکن میں منگیتر کے طور پر وزٹ ویزا حاصل کر سکتا ہوں۔ یہاں آ جائے تو پھر کوئی اور صورت نکالیں گے۔"

وکیل کی بات سن کر سلیم سرخ ہو گیا۔

"میری بیوی اس کی سگی بہن ہے۔" سلیم نے غصے سے کہا۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ رشتوں کے گھوڑے صرف کاغذوں پر دوڑیں گے۔ سب معاملات ٹھیک ہو جائیں تو پھر گھوڑوں کو دوبارہ اصطبل میں باندھ دیں گے۔ میں نے ابھی ابھی ایک کیس کیا ہے شوہر نے اپنی بیوی کو کاغذوں پر طلاق دے کر اپنے بھائی سے اس کی شادی کرائی اور اب سڈنی میں سب ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ چھ مہینے بعد کاغذوں پر اپنے رشتے سیدھے کرانے پھر آئیں گے۔ میرے مستقل گاہک ہیں۔" وکیل قصہ سناتے ہوئے بہت ڈھٹائی کے ساتھ ہنسا۔ سلیم کو اس کی یہ ہنسی بہت زہریلی لگی۔

وکیل کے پاس سے واپس آتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا اس وکیل اور فراڈ امیگریشن ایجنٹ ملک آفتاب کے درمیان شاید ایک یہی فرق تھا کہ ملک آفتاب صرف جعلسازی کرتا تھا اور وکیل جعلسازی کو قانونی سچ بنا رہا تھا۔ اس نے خود بھی تو یہی کیا تھا۔ سلیم نے شرمندہ ہو کر سوچا۔ لیکن اس میں رشتوں کے گھوڑوں کو اپنے اپنے اصطبل تک لے جانے کی ہمت نہیں تھی۔ سوچیں گھوم پھر کر سائرہ پر آ کر ٹھہر گئیں۔ سلیم کے پاس ایک یہی گھوڑا تھا جو اسے ریس جتوا سکتا تھا۔ لیکن اس گھوڑے کو دوڑانے کے لئے شیر بننے کی ضرورت تھی۔ وکیل کے دفتر سے نکل کر سلیم ایک کافی شاپ میں بیٹھا دیر تک سوچتا رہا کہ شیر کیسے بنے۔ کس منہ سے سائرہ سے کچھ مانگے۔ سائرہ ہی سب سے سیدھا اور آسان طریقہ تھی۔ وہ غیر شادی شدہ تھی۔ برسر روزگار تھی۔ اس کا اپنا مکان تھا' بینک میں کافی پیسے جمع تھے۔ نعیم سائرہ کے ذریعے بہت آسانی سے آسٹریلیا آ سکتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہی تھا کہ سائرہ سے کیسے کہے۔ بہت غور کرنے کے بعد وہ کافی شاپ سے نکل پڑا۔ یہ نعیم کی زندگی کا سوال تھا۔ سلیم کے لئے نعیم کی زندگی سے زیادہ اہم وہ زندگیاں تھیں جو نعیم کی زندگی کی ڈور سے بندھی ہوئی تھیں۔ سلیم کی اپنی ماں' اس کی خالہ' صدیقی صاحب اور سب سے بڑھ کر بھائی کے لئے ہر وقت روتی ہوئی غزالہ جو سلیم کی اپنی زندگی کو آنسوؤں سے بھر دیتی۔ اسے سائرہ سے بات کرنی تھی۔ وہ سائرہ کی چھٹی ہونے سے پہلے اس کی فیکٹری کے دروازے پر پہنچ گیا۔

سائرہ کام ختم کر کے آئی تو گاڑی کے پاس انتظار کرتے ہوئے سلیم کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"خیریت ہے......؟" اس نے پریشانی سے پوچھا۔

"گھر میں بات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ میں نے سوچا کہیں بیٹھ کر کافی پئیں گے۔" سلیم نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں چلیں؟" سائرہ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کی حیرت اب ختم ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ خوشی نے لے لی تھی۔ صیاد خود اپنے جال میں آ گیا تھا۔ کئی دنوں سے وہ ایسے موقع کے انتظار میں تھی۔ سلیم کے کہنے پر اس نے گاڑی کراؤن اسٹریٹ کے اسی کیفے کے رستے پر موڑ دی جہاں وہ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ سائرہ سوچ رہی تھی آج کی ملاقات کو اپنی کہانی کا فیصلہ کن موڑ بنا دے گی۔ یا تو سلیم کے ساتھ اس کی کہانی ختم ہو جائے گی اور یا پھر نئے سرے سے شروع ہو گی۔ اسے یقین تھا سلیم بھی آج کچھ فیصلہ کر کے ہی آیا ہو گا۔ اس سے پہلے اسے نظر ملانے سے گریز تھا' آج خود اس کے پاس چل کر فیکٹری آ گیا تھا۔ لیکن سائرہ نے سوچا کہے گی کیا اور کیسے۔ سوچوں کو زبان پر لانا آسان نہیں تھا۔ اندر ہی اندر خوب مکالمے ہوتے۔ ہر جملہ نپا تلا' سوچوں کا ترجمان بن کر ذہن میں آتا۔ لیکن وقت آنے پر سب کچھ دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتا۔ اسے یاد تھا ماں بننے کی خبر دینے کے لئے کیا کیا اہتمام کیا تھا لیکن ہر بار سب کچھ ان کہا رہ گیا تھا۔

انہیں اپنی پسندیدہ میز مل گئی تھی۔ آج رش کا دن نہیں تھا۔ زیادہ تر میزیں خالی تھیں۔ کافی آنے تک خاموشی رہی۔ دونوں کو خاموشی کا سحر کاٹنے کے لئے پہلے جملے کی قینچی کا انتظار تھا۔

"غزالہ کیا کر رہی تھی۔" سائرہ نے سکوت توڑا تو سلیم کو وہ سرا مل گیا جسے پکڑ کر وہ آہستہ آہستہ اوپر چڑھ سکتا تھا۔

"صبح اسے روتا چھوڑ کر گھر سے نکلا تھا۔ مجھے معلوم ہے اب بھی رو رہی ہو گی۔ جا کر اسے دیکھنے کی ہمت نہیں ہے۔ اسی لئے تمہارے پاس آیا تھا کہ تم سے

پوچھوں۔ میں کیا کروں۔" سلیم نے بہت لمبی اور سرد سی سانس لیتے ہوئے کہا۔
"تم نے غزالہ کو بتا دیا۔" سائرہ ایک دم بہت پرجوش ہو کر میز پر آگے کی طرف جھک آئی۔ "تم فکر مت کرو ہم چل کر اسے ابھی منا لیں گے۔ میں منا لوں گی۔ میں......."
"نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔" سلیم نے جلدی سے سائرہ کی بات کاٹی۔ سائرہ کی ساری خوشی ماند پڑ گئی۔ وہ دوبارہ اپنی کرسی کی پشت سے ٹک گئی۔
"پھر کیا بات ہے۔" سائرہ نے بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"غزالہ کے بھائی نعیم کو جاپان میں پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ وہ اسے پاکستان بھیج کر پولیس کے حوالے کرنے والے ہیں۔ پاکستان جا کر نعیم کا بچنا مشکل ہے۔" سلیم نے بتایا۔ اس کے لہجے میں اداسی گھل گئی۔
"میرے خدا۔" سائرہ واقعی پریشان ہو گئی۔ "غزالہ کا تو برا حال ہو گا۔ مجھے پتہ ہے وہ اپنے بھائی سے بہت محبت کرتی ہے۔ شاید تم سے بھی زیادہ۔"
"محبتوں کو تول کر کم زیادہ کا فرق معلوم کرنا آسان نہیں ہے۔" سلیم جانتا تھا کہ نعیم سے غزالہ کی محبت صرف بھائی کے رشتے کی مجبوری نہیں تھی۔ وہ نعیم کی پوری شخصیت سے پیار کرتی تھی۔ بے حد چاہتی تھی۔ سائرہ کا خیال غلط نہیں تھا۔ لیکن اس کی سوچیں کسی راستے پر بھٹک گئی تھیں۔ وہ تو سائرہ سے کچھ اور طے کرانے آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ سائرہ سے کچھ کہتا سائرہ نے اسے چونکا دیا۔
"لیکن ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ گھر چلو غزالہ کو اس وقت ہماری ضرورت ہو گی۔"
"نعیم کے مسئلے کا حل نکالنا ضروری ہے۔ اس نے پندرہ دن کی مہلت لی ہے۔ ان پندرہ دنوں میں کسی طرح اسے آسٹریلیا بلانا ہے۔"
"چلو تو اس وکیل کے پاس چلتے ہیں جس نے تمہارا کیس کیا تھا۔ تم اس کی بہت تعریف کرتے ہو۔" سائرہ غزالہ اور نعیم کو اس مشکل سے نکالنے کے لئے کچھ کرنے کو بے تاب تھی۔

"میں مل آیا ہوں۔ تمہاری طرف آنے سے پہلے اسی کے پاس گیا تھا۔ وہ کہتا ہے بہت مشکل ہے اور اس حالت میں جبکہ نعیم جیل میں ہے وزٹ ویزا ملنا ناممکن ہے۔" سلیم کے لہجے میں بہت بے بسی تھی۔

"کوئی طریقہ تو ہو گا۔ ظہور بھائی سے مشورہ کرتے ہیں' وہ لوگ ان معاملوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔" سائرہ کی پیشانی پر سوچوں نے بل ڈال دیئے تھے۔

"ظہور بھائی ان معاملوں کو وکیل سے زیادہ نہیں سمجھ سکتے۔" سلیم نے ذرا غصے سے کہا لیکن پھر لہجہ مدہم کر لیا۔ "وکیل کہتا ہے ایک ہی طریقہ ہے۔"

"کیا.....؟" سائرہ نے جلدی سے پوچھا۔

"شادی.....! وکیل فون پر شادی کرا کے نعیم کو عارضی ویزے پر دو ہفتوں میں یہاں بلوا لے گا۔ باقی کارروائیاں یہاں رہ کر پوری ہو جائیں گی۔"

"لیکن ایسی لڑکی آئے گی کہاں سے۔" سائرہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "فیکٹری کی میری دوست تیار ہو جاتی لیکن اس کی شادی ہونے والی ہے۔ وکیل سے پوچھو شاید کوئی لڑکی پیسے لے کر مان جائے۔ جتنے پیسے چاہئیں میں دوں گی۔"

"میں نے وکیل سے کہا تھا۔ لیکن اس نے منع کر دیا۔ ممکن ہے کوئی اور وکیل بندوبست کر سکے لیکن اس میں وقت لگے گا۔ نعیم کے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔"

"پھر پھر کیا کریں۔" سائرہ کو سچ مچ بہت تشویش ہو رہی تھی۔

"اگر تم....." سلیم جملہ مکمل نہیں کر سکا۔ سائرہ کو بہت زور کا کرنٹ لگا۔ آنکھوں سے سارے پردے ایک دم ہٹ گئے۔ وہ خواہ مخواہ بیوقوف بن رہی تھی۔ سلیم سب کچھ پہلے سے سوچ کر آیا تھا۔ اس کے پاس آنے اور خاطر مدارت کا یہی سبب تھا۔ غصے کی شدت سے سائرہ کی زبان گنگ ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر اسے شادی اور طلاق کا کھیل کھلانا چاہتا تھا۔ دماغ میں کیا کیا ابل رہا تھا۔ لیکن زبان اکڑ کر رہ گئی۔ کیا کیا سوچ کر اور کیا کیا کہنے آئی تھی لیکن ایک بار پھر سب کچھ ان کہا رہ گیا تھا۔

"تم...... تم بہت بے شرم ہو۔ میں تم پر اب کبھی بھروسہ نہیں کروں گی۔" بہت بے ربط انداز میں بس یہی کہہ سکی اور اٹھ کر تیزی سے ریسٹورنٹ سے باہر نکل گئی۔ سلیم "سنو تو سہی۔ میری بات تو سنو۔" کہتا رہ گیا لیکن سائرہ نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ میز پر دونوں کی پیالیوں میں بھری ہوئی کافی پیئے جانے سے محروم رہ گئی تھی۔ پیالی کو ہاتھ لگائے بغیر اسی طرح بیٹھا کچھ سوچتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ قدموں سے اٹھ کر وہ بھی باہر آ گیا۔ گھر جا کر دو روتی ہوئی عورتوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ بس اسٹاپ پر دیر تک کھڑا ہوا مختلف نمبروں کی بسوں کو آ کر ٹھہرتے اور جاتے دیکھتا رہا۔ یونیورسٹی جانے والی بس آئی تو بے ارادہ اس میں سوار ہو گیا۔

سائرہ کو واپس گھر جاتے ہوئے ڈر تھا کوئی حادثہ نہ کر بیٹھے۔ بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ آنسو روکنا مشکل تھا۔ روتی ہوئی گاڑی چلاتی عورت تماشا بن جاتی۔ آنسو پردہ بن کر رستوں کو دھندلا کر دیتے۔ ضبط کرنا مشکل ہو گیا تو جگہ دیکھ کر گاڑی ایک طرف کھڑی کر لی اور ساون برسانے لگی۔ ایک دو گاڑیاں اس کے قریب آہستہ ہوئی تھیں۔ شاید اسے کسی مدد کی ضرورت ہو۔ اس نے پیچھے پڑے ہوئے ایک میگزین کو چہرے پر تان لیا۔ کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ جو کچھ کرنا تھا اسے خود کرنا تھا۔ لیکن کیا کرنا تھا یہ جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ سیلاب اتر گیا تو دل و دماغ ہلکے لگنے لگے۔ گاڑی دوبارہ چلاتے ہوئے اس نے سوچا کل ہی فیکٹری کے مالک سے طویل رخصت کی بات کرے گی۔ نہیں ملی تو ملازمت چھوڑ دے گی۔ اسے پرواہ نہیں تھی۔ حیدر آباد جا کر چند مہینے ماں کے ساتھ گزارے گی۔ عذرا بھی آ گئی ہو گی۔ کلینک کھولنے میں اس کا ہاتھ بٹائے گی۔ فرار اس کے مسئلے کا حل نہ سہی' کچھ دن ماں کی گود میں سر رکھ کر سکون سے گزار آئے گی۔ شاید اس وقت تک سلیم کو اس کے رشتے کی ضرورت کا احساس ہو جائے آنسوؤں نے غصہ دھو دیا تو دل ایک بار پھر سلیم کی مدافعت پر آمادہ ہو گیا۔ وہ اتنی ناراض کیوں ہوئی تھی۔ سلیم کا اس میں قصور بھی کیا تھا۔ نعیم کو جاپان کی پولیس سے سلیم نے تو نہیں پکڑوایا تھا۔ پاکستان میں نعیم کی

جان کو جو خطرہ تھا وہ بھی سلیم کا پھیلایا ہوا فریب نہیں تھا۔ بلک بلک کر روتی ہوئی غزالہ کو دیکھ کر کون اپنا جی نہیں ہارتا۔ سلیم تو اس کا شوہر تھا۔ وکیل بھی کچھ نہیں کر سکا تو پھر سائرہ ہی ایک آسان حل نظر آئی ہوگی۔ لیکن اسے غصہ تھا کہ سلیم کی ہمت کیسے ہوئی تھی۔ وہ اس کا شوہر تھا۔ نہیں تھا لیکن پھر بھی تھا۔ ایک زندہ حقیقت کی طرح تھا۔ بزدل تو تھا ہی۔ غزالہ سے اپنا راز افشا کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن اب بے غیرت بھی ہوگیا تھا۔ جذبہ کتنا نیک اور ضرورت کتنی شدید سہی اپنی بیوی کو وہ کسی دوسرے سے بیاہنے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا تھا۔ سائرہ کا غصہ ایک بار پھر تیز ہونے لگا۔ گھر پہنچی تو غزالہ باورچی خانے میں کچھ کر رہی تھی لیکن سائرہ غزالہ اور زریں کو دیکھے بغیر سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کپڑے بدلے بغیر تھوڑی دیر بستر پر سر پکڑے بیٹھی رہی۔ کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دروازے میں غزالہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو بھرے ہوئے تھے۔ سائرہ کو لگا جیسے وہ سر سے پاؤں تک ڈوب گئی ہو۔

سلیم یونیورسٹی سے رات گئے گھر واپس آیا۔ غزالہ زریں کو سلاتے سلاتے اس کے ساتھ سو گئی تھی۔ سائرہ ہمیشہ کی طرح اپنے کمرے میں تھی۔ میز پر سلیم کا کھانا تیار رکھا تھا۔ بھوک نہیں تھی پھر بھی پلیٹ میں کچھ ڈال کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔ نظریں اسکرین پر تھیں لیکن ذہن بغیر کسی سمت کے پرواز کر رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے جھونکے آنے لگے تو جا کر وہ بھی سو گیا۔ صبح دیر سے سو کر اٹھا۔ باتھ روم سے نکلا تو غزالہ زریں کو اسکول لے جانے کے لئے تیار تھی۔ سائرہ شاید اپنے کمرے میں تھی۔

"زریں آج سائرہ کے ساتھ نہیں جا رہی۔" سلیم نے پوچھا۔

"باجی کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ انہوں نے فیکٹری فون کر دیا ہے۔ آج کام پر نہیں جائیں گی۔" غزالہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ زریں سلیم کو پیار دے کر خدا حافظ کہنے لگی۔

"تم بیٹھو میں چھوڑ آتا ہوں۔ اتنی دور پیدل کیسے جاؤ گی۔"

"اسکول سے لینے روز پیدل ہی جاتی ہوں۔ مجھے عادت ہو گئی ہے۔ آدھے پونے گھنٹے کی تو بات ہے آپ اپنا ناشتہ کیجئے۔ میں نے بنا کر رکھ دیا ہے۔" غزالہ نے کہا اور زریں کو لے کر گھر سے نکل گئی۔ سلیم کو بہت حیرت ہو رہی تھی۔ غزالہ کا چہرہ کل کی طرح دھواں دھواں نہیں رہا تھا۔ بہت اطمینان نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں سے لگتا تھا رات کو اچھی طرح سوئی بھی ہے۔ سلیم ابھی ناشتہ کر رہا تھا کہ سائرہ کمرے سے نکل آئی۔ اسے ایک بار پھر حیرت ہوئی۔ غزالہ تو کہہ رہی تھی سائرہ آج کام پر نہیں جائے گی۔ لیکن وہ تو جانے کے لئے تیار نظر آتی تھی۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ شاید رات بھر روتی رہی تھی۔ سائرہ اپنے لئے چائے بنا کر سلیم کے پاس بیٹھ گئی۔

"ہمیں وکیل کے پاس جانا ہے۔ میں نے اسی لئے فیکٹری سے چھٹی کی ہے۔" سائرہ نے چائے کا گھونٹ بھر کر سپاٹ لہجے میں کہا۔ سلیم حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ کل اتنی ناراض ہو کر گئی تھی کہ اب کبھی بات بھی نہیں کرے گی۔ آنکھیں بتا رہی ہیں کل سے ابتک روتی رہی ہے لیکن اب یہ اچانک انقلاب کیسے۔

"سائرہ میں......." اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن سائرہ نے روک دیا۔

"کچھ مت کہو۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ سب کچھ تمہارے لئے کر بھی نہیں رہی۔ غزالہ کے لئے کر رہی ہوں۔" سائرہ نے سلیم کو دیکھے بغیر کہا۔

"غزالہ نے تم سے کہا تھا؟" سلیم نے پوچھا۔ اس نے غزالہ کو منع کیا تھا۔ پھر بھی وہ باز نہیں آئی ہو گی۔ شاید اچھا ہی کیا تھا۔ سلیم نے سوچا۔

"غزالہ کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی اس کا حال ایسا تھا کہ وہ کچھ نہیں کہتی تب بھی میں منع نہ کر سکتی۔ لیکن بیوقوف لڑکی دوپٹہ پھیلا کر میرے پیروں میں بیٹھ گئی۔ مجھے لگا تھا زمین پھٹے گی اور میں اس میں سما جاؤں گی۔" سائرہ کے لہجے میں اداسی آ گئی۔ کسی عورت کے غم کو اس سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔ سلیم سوچنے لگا کیا غزالہ اس کے لئے بھی کسی غیر کے پیروں میں اپنا دوپٹہ ڈال سکے گی۔ لیکن پھر اسے اپنی احمقانہ سوچ پر غصہ آگیا۔ بھائی اور شوہر کی محبت کا موازنہ حماقت تھی۔

"سائرہ میں تمہارا مجرم ہوں۔ لیکن میں نے غزالہ کو پاکستان سے بلاتے وقت جو کچھ کہا تھا غلط نہیں کہا تھا۔ میں سچ مچ غزالہ کو بتانا چاہتا تھا۔ لیکن ہمیشہ بزدلی آڑے آتی رہی۔ ہمت نہیں کر پایا۔ تم نے آج پھر فیصلہ کرنے کی ہمت دکھائی ہے۔ غزالہ واپس آ جائے تو تمہارے سامنے اور ابھی اسے بتا کر یہ قصہ ختم کئے دیتے ہیں۔ اسے غم کا یہ پتھر اٹھانا ہی ہے۔ تو آج ہی کیوں نہ سہی۔" سلیم جانتا تھا سائرہ کا یہ نیا قرض ایسا ہے جو وہ کبھی نہیں اتار سکے گا۔

"تمہارا دماغ خراب ہوا ہے۔ بھائی کے غم سے وہ پہلے ہی نڈھال ہے۔ ایک نیا پہاڑ اس کے سر پر رکھو گے تو بالکل ہی ادھ مری ہو جائے گی۔ اس کام کا جو وقت تھا وہ تم نے انتظار کر کے گنوا دیا ہے۔" سائرہ نے نگاہیں اٹھا کر سلیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ لہجے میں اداسی باقی تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو آج شاید صحیح موقع نہ ہو۔ لیکن وقت ابھی گیا نہیں۔ نعیم آ جائے تو غزالہ جذباتی طور پر بہت مضبوط ہو جائے گی۔ اس میں بہت ہمت آ جائے گی۔ تم صحیح کہتی تھیں۔ غزالہ مجھ سے زیادہ نعیم سے محبت کرتی ہے۔ نعیم کے آنے کے بعد بتاؤں گا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر غم کی اس چٹان کو پھلانگ جائے گی۔" سلیم نے کہا تو سائرہ کی آنکھوں میں امید کی ایک نئی کرن چمکنے لگی۔ ذہن یقین کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ لیکن دل چپکے چپکے کہہ رہا تھا۔ شاید۔ شاید۔ وہ سوچنے لگی کہ سلیم کچھ کرنے کے لئے ہمیشہ سہارے کیوں ڈھونڈتا ہے۔ مشکل چڑھائی سے گزارنے کے لئے غزالہ کو نعیم کا سہارا دے رہا تھا۔ خود ہاتھ تھام کر کیوں نہیں اتارتا۔

"نعیم سے نکاح کے بعد ہماری شادی کا کیا ہو گا۔" سائرہ کے لئے یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔

"میں ایک امام کو جانتا ہوں۔ انہیں فون کرتا ہوں۔ نعیم سے فون پر نکاح پڑھوانے کے لئے ان سے وقت لینا ہے۔ یہ مسئلہ بھی معلوم کئے لیتے ہیں۔ اگر اس نکاح سے ہمارا رشتہ ختم ہو سکتا ہے تو پھر نعیم کے لئے کچھ اور سوچیں گے۔ میں یہ نکاح نہیں ہونے دوں گا۔" سلیم اٹھ کر انہی مولانا کا نمبر تلاش کرنے لگا جنہوں نے

ایک دفعہ اس کا رشتہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ وہ گھر پر مل گئے۔ سلیم کے پوچھنے پر انہوں نے بتانا شروع کیا تو سلیم نے انہیں روک کر فون سائرہ کو دے دیا۔

"عزیزہ۔ طلاق اور طلاق کے بعد عدت کی شرعی مدت ختم ہوئے بغیر ہونے والا نکاح فسخ ہے۔ شرعی طور پر اس کی کوئی جائز حیثیت نہیں ہے۔ پہلے نکاح کی موجودگی میں دوسرا عقد کر کے ہم بستری کی جائے گی تو وہ حق زوجیت نہیں زنا قرار پائے گا جس کی اسلامی سزا سنگسار ہے۔" سائرہ نے فون سلیم کو واپس دے دیا۔ سینے سے اطمینان کی سانس نکلی تھی۔

18

سڈنی ۱۹۹۷ء

ایک بار وہ سب پھر ایئرپورٹ پر جمع تھے۔ سلیم، سائرہ، غزالہ، ظہور اور چوہدری انور۔ وکیل نے غلط نہیں کہا تھا۔ نعیم پندرہ نہیں دس دن میں سڈنی پہنچ گیا تھا۔ ظہور کے ساتھ اس دفعہ چوہدری انور کا بھی آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن غزالہ نے خود فون کر کے بلایا تھا۔ اس نے کہا تھا ایئرپورٹ سے گھر آ کر کھانا ساتھ کھائیں گے۔ اس کا بھائی۔ اس کا ہیرو آ رہا تھا۔ اس نے دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ وہ منع نہیں کر سکتے تھے۔ سائرہ اور نعیم ایک دوسرے سے جھجکتے ہوئے ملے۔ سائرہ سے زیادہ نعیم شرمایا تھا۔ اس نے فون پر نکاح ہوتے وقت پہلی بار سائرہ کا نام سنا تھا۔ لیکن سائرہ نعیم کو اس طرح جاننے لگی تھی جیسے برسوں کا ساتھ ہو۔ ان دس دنوں میں جب بھی وقت ملتا غزالہ اسے نعیم کی کہانیاں سنانے بیٹھ جاتی۔ اس کے دل میں اب بھی یہ

معصوم خواہش چھپی تھی کہ کاغذی شادی سچ مچ کا بندھن بن جائے اور وہ سائرہ کو باجی کے بجائے بھابی کہہ کر پکارنے لگے۔ لیکن ایسی کوئی بات زبان پر لاتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔ سائرہ نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا۔ نعیم کے ساتھ شادی کے جو دو بول اس نے پڑھے تھے ان کی حیثیت کاغذ پر لکھے ہوئے لفظوں سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ لفظ جو ضرورت ختم ہوتے ہی مٹا دیئے جاتے۔ غزالہ کے لئے سائرہ کا کہا ہوا پتھر کی لکیر تھا۔ سائرہ کو وہ کوئی اوتار سمجھنے لگی تھی۔ وہ کہتی تو جان بھی دے سکتی تھی۔ غزالہ کو لگا تھا سائرہ نے اس کے بھائی کی نہیں ایک پورے خاندان کی جان بچائی تھی۔ وہ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کہ نعیم بھائی کو کچھ ہو جاتا تو امی اور خالہ بی کا کیا ہوتا۔ خود اس پر کیا گزرتی۔ ابا تو کسی کے سامنے روتے بھی نہیں۔ غم ان کے اندر پھوڑے کی طرح پلتا اور پھٹ جاتا۔ غزالہ پھر بھی سائرہ کو اس امید پر نعیم کے قصے سناتی کہ شاید اس کا دل پسیج جائے۔ لیکن ان قصوں میں سلیم کا ذکر بہت کم ہوتا۔ ایک دن سائرہ نے غزالہ سے پوچھ ہی لیا۔

"سلیم اور نعیم میں تو بہت دوستی ہو گی۔"

"نہیں بالکل بھی نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سلیم ہمارے گھر کے بہت چہیتے تھے۔ امی اور ابا نعیم بھائی کو بھی سلیم جیسا دیکھنا چاہتے تھے۔ نعیم بھائی کو ہر وقت سلیم کی مثالیں سننے کو ملتیں تو وہ چڑ جاتے۔ لیکن سلیم سے میری شادی پر بہت خوش تھے۔ کہتے تھے میں بہت خوش قسمت ہوں۔ ایسا شوہر دوسرا نہیں ملے گا۔ نوکری کر کے سیدھا گھر آنے والا۔ بے حد فرمانبردار۔ سلیم واقعی ایسے ہی تھے۔ انہوں نے تو کبھی سگریٹ تک کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

نعیم سائرہ کو اچھا لگا ۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اوسط سا قد تھا۔ نقش و نگار غزالہ جیسے تھے۔ چہرے پر جاذبیت تھی لیکن ایک کرختگی سی آ گئی تھی۔ گھنی اور بے ترشی ہوئی مونچھیں الجھے ہوئے خشک بال۔ آنکھیں بے حد جاندار تھیں۔ بہت چمکدار لیکن بے چین سی۔ لیکن چہرے پر ایسی کوئی بات تھی کہ دیکھتے ہی یقین کرنے کو دل چاہے یا شاید سائرہ پر ان کہانیوں کا اثر تھا جو غزالہ نے اسے سنائی

تھیں۔ سائرہ کا خیال تھا کہ بولتا ہو گا تو آگ اگلتا ہو گا۔ انقلابیوں کے بارے میں سائرہ کا کچھ ایسا ہی تصور تھا۔ لیکن وہ تو بہت خاموش تھا۔ غزالہ سے مل کر بھی کچھ نہیں بولا تھا۔ کئی منٹ تک اسے سینے سے لگائے کھڑا رہا تھا۔ آنکھ میں ایک بوند تک نہیں چمکی تھی۔ غزالہ کی آنکھیں بھی بس گیلی ہوئی تھیں۔ سائرہ کو بہت مایوسی ہوئی۔ اس نے تو سوچا تھا کھل کر برسات ہو گی۔ نعیم ضرورتاً بولا بھی تھا تو لہجہ مدہم اور ٹھہرا ہوا تھا۔ آگ کی کچھ لپٹیں نکلی تھیں لیکن برف کے خول میں لپٹی ہوئیں۔

ایئرپورٹ سے گھر آ کر سائرہ اور غزالہ باورچی خانے میں مصروف ہو گئیں۔ چاروں مرد باتیں کرتے کرتے تھوڑی ہی دیر میں سیاست پر آ گئے تھے۔ نعیم بالکل خاموش تھا۔ اسے سیاسی بحث سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے عملی سیاست کی تھی۔ صرف دوسروں کے پیروں کے چھالے نہیں گنے تھے بلکہ اپنے پاؤں بھی زخمی کئے تھے۔ سچ مچ کی لڑائیاں لڑی تھیں۔ زبانی لڑائی جیتنے سے کیا ملے گا اور ہار گیا تو کیا جائے گا۔ وہ تو اپنی اس بے وطنی کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا چہرہ بدل گیا تھا۔ سوچ رہا تھا اس سفر میں ابھی کتنے مقام اور آئیں گے۔ نعیم کی مسلسل خاموشی ظہور کو سخت بے چین کر رہی تھی۔ اور بولتے ہوئے بار بار نعیم کی طرف بہت امید بھری نظروں سے دیکھتا۔ وہ ایک زوردار معرکے کی تیاری کر کے آیا تھا۔ سڈنی میں پہلی بار کوئی ایسا مل رہا تھا جو سیاست کو جانتا اور سمجھتا تھا۔ ظہور کا خیال تھا دونوں طرف سے خوب تلواریں چلیں گی۔ لیکن نعیم تو نہ وار روک رہا تھا نہ خود کوئی وار کر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرف صرف ظہور بول رہا تھا۔ ساری بحث یکطرفہ تھی۔ صرف سلیم تھا جو ڈٹا ہوا تھا۔ سلیم حال ہی میں دو دفعہ کراچی رہ کر آیا تھا اس لئے کراچی کے لئے بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ ظہور کراچی کا تھا لیکن ایم کیو ایم کے خلاف تھا۔ سلیم کے لئے ظہور کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا۔ چوہدری انور دونوں کی باتوں پر سر ہلاتا ہوا غیر جانبداری کی سرحد پر کھڑا تھا۔ زچ آ کر سلیم نے آخری حربہ استعمال کیا اور ذاتی حملے پر اتر آیا۔

"آپ کو کراچی گئے بہت برس ہو گئے ہیں۔ آٹھ دس سالوں میں بہت کچھ

بدل گیا ہے۔ اب جا کر دیکھئے اس کے بعد بات کیجئے گا۔"

"مجھے سب پتہ ہے کیا بدلا اور کیا نہیں بدلا ہے۔" ظہور نے اپنے خطیبانہ انداز میں کہا۔ "تم صرف اپنی گلی سے گزر کر آئے ہو میں گلی گلی کے لوگوں سے ملتا ہوں۔ تم کبھی اخبار نہیں پڑھتے میں روز پڑھتا ہوں اور ایک ایک سطر پڑھتا ہوں۔ مجھے پتہ ہے کراچی میں بم پھٹتے ہیں۔ لاشیں گرتی ہیں۔ ہڑتالیں ہوتی ہیں تو بازاروں میں سناٹا ہو جاتا ہے۔ بجلی چلی جاتی ہے۔ پانی بند ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ صرف کراچی میں نہیں ہوتا۔ بم پنجاب اور سرحد میں بھی پھٹتے ہیں۔ لاشیں بلوچستان میں بھی گرتی ہیں۔ میرا دل سب کے لئے روتا ہے۔ میرے ملک میں ساٹھ فیصد لوگوں کو پینے کا صاف پانی نہیں ملتا۔ غریب دن بھر ہڈیاں توڑتے ہیں تو انہیں ایک وقت کا کھانا ملتا ہے۔ ایک روٹی کے لئے کئی پہاڑوں پر چڑھنا پڑتا ہے۔ دوا لینے کے لئے لمبی قطاریں لگتی ہیں۔ جو گنا اگاتا ہے وہ اپنے گڑ کی مٹھاس نہیں چکھ پاتا۔ یہ ایک شہر کا نہیں پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ میری حب الوطنی ایک شہر کے نہیں پورے ملک کے نام ہے۔ میرا دل پورے ملک کے لئے تڑپتا ہے۔ کیوں نعیم میاں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔" ظہور نے آخر نعیم کو براہ راست میدان میں کودنے کی دعوت دے دی۔

"ہو سکتا ہے آپ صحیح کہہ رہے ہوں۔ آپ کو زیادہ معلوم ہو گا۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں تو سیدھا جاپان سے آ رہا ہوں۔ پاکستان بہت عرصے سے نہیں گیا۔" نعیم نے مسکرا کر جواب دیتے ہوئے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"میاں یہ قصے تمہارے جاپان جانے کے بعد کے نہیں ہیں۔ ازل سے چلے آ رہے ہیں۔ تم تو خود ان لڑائیوں میں شریک رہے ہو۔ تم سے زیادہ کون جانے گا۔" ظہور نے نعیم کو ایک بار پھر اکسایا۔

"ہاں شاید۔ لیکن وہ قصے' وہ لڑائیاں وہ دکھ درد سب پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ جاپان کی طرح شاید یہاں بھی صاف پانی آتا ہے' بجلی نہیں جاتی' دوا کے لئے لمبی قطار نہیں لگتی' کوئی بم نہیں پھٹتا' پولیس پڑوس کے گھر کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتی' کھانے کے لئے ہڈیاں نہیں ٹوٹتیں نہ روٹی کے لئے پہاڑ پر چڑھنا پڑتا ہے اس لئے اپنے وطن کی

محرومیوں اور ان کی یاد کو حب الوطنی سمجھنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجھے حب الوطنی ستائے گی تو واپس چلا جاؤں گا۔ بجلی، پانی اور روٹی کی محرومی کی لڑائی وہیں جا کر لڑوں گا۔ وہاں جا کر سوچوں گا یہ ایک شہر کی لڑائی ہے یا پورے ملک کی۔" نعیم کی آواز آہستہ اور لہجہ سرد تھا۔ سب نے اس کی کاٹ محسوس کی تھی۔ چودہری انور دل میں بہت خوش ہوا اسے لگا تھا جیسے اس کے دل کی آواز ہو۔ ظہور تھوڑی دیر کے لئے بالکل لاجواب ہو گیا تھا۔ چودہری انور نے سوچا کسی نے تو ظہور کی خوش بیانی کا سحر توڑا۔

"میاں وطن کی یاد تو آئے گی۔ دل بھی روئے گا۔ جس سے تمہاری نسلیں جڑی ہیں اسے چھوڑ نہیں سکو گے۔ سرحد بدلتے ہی سب کچھ نہیں بدل جاتا۔ اور پھر اپنی ثقافتی شناخت کا کیا کرو گے۔ ایک دن میں سب کچھ کیسے بدلو گے۔" ظہور ہار ماننے والا نہیں تھا۔

"کون سی ثقافت۔ ثقافت کے حوالے سے تو میری اور آپ کی کوئی شناخت ہی نہیں ہے۔ زبان، لباس، موسیقی، ادب۔ ہمارا سب کچھ مانگے کا ہے۔ آپ کی کوئی ثقافت نہیں جو آپ کی قومی شناخت بن سکے۔ جو ہے وہ علاقائی ہے۔ اور جن علاقوں کی ثقافتیں ہیں وہ بھی خالص آپ کے علاقے نہیں ہیں۔ ان کی جڑیں سرحد پار تک پھیلی ہوئی ہیں۔ علاقائیت سے ہمیں ویسے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔ ہماری سلامتی خطرے میں پڑنے لگتی ہے۔ چارپایوں کو جوڑ کر ہم نے بس ایک چارپائی بنا دی ہے لیکن اسے بننا بھول گئے ہیں آپ اس چارپائی کو دیوار پر ٹانگ تو سکتے ہیں۔ اس پر بیٹھ نہیں سکتے۔ ظہور بھائی آپ کی کوئی ثقافت نہیں ہے۔ کوئی شناخت نہیں ہے۔"

"آنکھ کی شرم میاں آنکھ کی شرم۔ وہ میری اور تمہاری ثقافت ہے۔" ظہور نے غصے سے کہا۔ دلیل کمزور پڑ رہی تھی اس لے آواز اونچی ہو گئی تھی۔

"یہ ثقافت نہیں ایک معاشرتی رویہ ہے۔ سماجی نظم۔ سوشل ڈسپلن جو کسی ایک معاشرے کی پہچان نہیں بلکہ بہت سے معاشروں میں مشترک ہے۔ غزالہ اور سائرہ دونوں اسی نظم و ضبط کی پابند ہیں۔ لیکن دونوں دو مختلف علاقوں سے آئی ہیں۔

پھر یہ ایک معاشرے کا لازمی نظام بھی نہیں ہے۔ معاشی طور پر طبقوں میں بٹے ہوئے ایک ہی معاشرے کی مختلف تہوں میں آنکھ کی شرم' حیا' احترام اور ان جیسی دوسروں قدروں میں شدت کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے۔" نعیم بہت سمجھانے والے انداز میں بول رہا تھا۔

"یہی قدریں اور سماجی رویئے تو تہذیب ہیں۔ تہذیبیں انہی رویوں سے بنتی ہیں۔ انہی کی زمین سے ثقافتیں اگتی ہیں۔ آسمان سے نہیں اترتیں۔ آسمانوں سے مذہب اترتے ہیں جناب عالی مذہب! کیا مذہب بھی ایک سماجی رویہ یا بقول آپ کے محض سوشل ڈسپلن ہے۔" ظہور بحث پر آمادہ تھا۔

"جی ہاں کسی حد تک۔ خاص طور پر آسٹریلیا جیسے معاشروں میں۔ یہاں رہنے والے مغرب کی آزاد قدروں سے اپنے بچوں کو بچانے کے لئے یہی ڈھال استعمال کرتے ہیں۔ لیکن میں مذہب کو اپنے رنگ اور ناک نقشے کی طرح اپنے ماں باپ کا ورثہ سمجھتا ہوں۔ یہ وراثت نامہ پیدا ہوتے ہی ہمارے کانوں میں پھونک دیا جاتا ہے۔ ولدیت کی طرح نام کے آگے لکھ دیا جاتا ہے۔ ہمیں اپنا مذہب خود سے چننے کی آزادی نہیں ہے۔"

"اگر ہوتی تو کیا آپ مذہب بدل لیتے۔" ظہور نے بہت تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"جی نہیں مجھے کبھی بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میری ناک میرے باپ کی طرح اور دہانہ میری ماں جیسا ہے۔ مجھے اپنا ناک اور دہانہ دونوں اچھے لگتے ہیں میں بدلنا نہیں چاہتا۔ اور اگر بدلنا بھی چاہوں تو آسان نہیں ہو گا۔ بہت مشکل سرجری کرانی پڑے گی۔ مذہب کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مجھے اپنی سرجری نہیں کرانی۔" نعیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بھائی مجھے کرانی ہے مذہب کی نہیں اپنی ناک کی۔ میری ناک بہت موٹی ہے۔ مجھے بالکل پسند نہیں۔" ظہور نے کہا اور سب ہنس پڑے۔ ماحول سے تناؤ ایک دم ختم ہو گیا۔ ظہور کا یہی کمال تھا اپنی پسپائی کو مذاق میں اڑانا جانتا تھا۔ غزالہ اور سائرہ ان کی بحث سے کچھ سہمی ہوئی تھیں۔ انہیں ہنستا دیکھ کر فوراً ہی انہوں نے کھانا لگنے

کا اعلان کر دیا۔

سائرہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ نعیم اس کے سامنے آنے سے گریز کیوں کرتا تھا۔ وہ نعیم کی کہانیاں خود اسی کی زبانی سننا چاہتی تھیں۔ نعیم کو دلچسپی ہوتی تو اپنی کہانیاں بھی اسے خود سنا سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا جس طرح غزالہ نے اسے نعیم کی کہانیاں سنائی تھیں اسی طرح نعیم کو سائرہ کی ساری کہانیاں سنائی ہوں گی۔ کہانی سناتے ہوئے ان میں اپنی محبتیں بھی ڈالی ہوں گی۔ لیکن وہ ایک ساتھ رہتے تھے۔ غزالہ کے رابطے کے بغیر بھی ایک دوسرے سے گفتگو کر سکتے تھے۔ کسی بہت نایاب موقع پر نعیم نظر بھی آ جاتا تو سلام اور رسمی خیریت سے زیادہ کبھی بات نہیں ہو سکی۔ سڈنی آنے کے بعد شروع کے صرف دو دن اس نے گھر میں گزارے تھے۔ ان دو دنوں میں بھی شام میں زریں کو گھمانے باہر لے گیا تھا اور واپس آ کر خالی الذہن ہو کر ٹی وی دیکھتا رہا تھا۔ اس کے بعد صبح ہی صبح نکل جاتا۔ رات کو دیر سے گھر آتا۔ دن میں نوکری تلاش کرتا۔ شام کے بارے میں کہتا تھا کہ شہر گھوم رہا ہو۔ سائرہ کو جانے کیوں لگتا کہ اس سے بچنے کے لئے باہر رہتا ہے اور ایسے وقت آتا ہے جب اسے معلوم ہے وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں جا چکی ہو گی۔ دو ہفتوں کے اندر اسے ملازمت بھی مل گئی تھی۔ وہ بھی سائرہ کی کوششوں سے ملی تھی اور اس کی سفارش بھی سائرہ سے غزالہ نے کی تھی۔ ایک شام غزالہ بہت اداس ہو کر سائرہ کو بتا رہی تھی۔

"نعیم بھائی گھر چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں اپنا انتظام خود کر لیں گے۔ یہاں سب کے ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا لیکن سلیم نے انہیں روک دیا ہے۔ نعیم بھائی کی مستقل شہریت کا کیس جب تک منظور نہیں ہو جاتا انہیں ہمارے ساتھ رہنا ہے سلیم کہہ رہے تھے نعیم آپ سے علیحدہ رہے تو امیگریشن والوں کو شک ہو جائے گا کہ شادی اصلی نہیں ہے۔" سائرہ جانتی تھی سلیم قانونی مجبوریوں اور رشتوں کی شطرنج کھیلنے کا کتنا ماہر تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"نعیم بھائی کو آپ کا بہت خیال ہے۔" غزالہ کی بات ابھی جاری تھی۔ "کہتے

ہیں کہ ان کی وجہ سے آپ بے آرام ہوتی ہوں گی۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور سونا سب کچھ ڈرائنگ روم میں ہے۔ اس لئے آپ ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہتی ہوں گی ویسے وہ صحیح کہتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر تیسرا کمرہ ہوتا تو......" غزالہ ایک دم ہی چپ ہو گئی۔ اسے اپنی بیوقوفی پر غصہ آیا۔ یہ ان کا گھر تھا بھی کب۔ وہ تو بدو کے اونٹ کی طرح سائرہ کے فلیٹ میں پھیلتے جا رہے تھے۔ سائرہ بھی سوچنے لگی نعیم بلاوجہ گھر سے باہر نہیں رہتا۔ ایک اجنبی لڑکی کے سامنے کھلے ہوئے ڈرائنگ روم میں رہنا اسے عجیب لگتا ہو گا۔

"تم جانتی ہو میں تمہارے بھائی کی وجہ سے کمرے میں بند نہیں رہتی۔ مجھے تمہارے بھائی سے ڈر بھی نہیں لگتا کہ انہیں ڈرائنگ روم میں دیکھتے ہی بھاگ جاؤں۔ بلکہ میرا تو دل چاہتا تھا ان سے بیٹھ کر بہت سی باتیں کروں۔ لیکن شاید وہ مجھ سے ڈرتے ہیں۔ میرے ہوتے ہوئے گھر میں نہیں آتے۔" سائرہ نے کہا۔ لیکن پھر ایک اچانک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ "ہم گیرج میں نعیم کے رہنے کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ میں گاڑی باہر کھڑی کر سکتی ہوں۔ ایک پرانا گدا پڑا ہے اسے بستر بنا دیں گے۔ ڈرائنگ روم سے ایک چھوٹی میز اور وہ پنکھا نیچے لے جا کر رکھ دیں گے جسے کوئی استعمال نہیں کرتا۔ روشنی کے بلب وہاں پہلے ہی لگے ہیں۔ تم اپنے بھائی سے کہو وہ گیرج کو اپنی جنت بنا کر کسی کو ڈرائے اور کسی سے ڈرے بغیر بے فکری سے رہیں۔" سائرہ کی تجویز سن کر غزالہ کی آنکھوں میں بھی ایک دم چمک آ گئی۔

"یہ ٹھیک۔ بالکل ٹھیک ہے۔ میں کل صبح ہی گیرج کی صفائی کر کے نعیم بھائی کا بستر لگا دیتی ہوں۔ لیکن آپ کی گاڑی......" غزالہ کو تشویش ہوئی۔

"میری گاڑی کو کچھ نہیں ہو گا۔ وہ چھت کے بغیر بھی رہ سکتی ہے۔" غزالہ مطمئن ہو گئی۔ لیکن آنکھیں ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گئیں۔

"باجی ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانیں گی۔" غزالہ نے بہت ڈرتے ہوئے کہا۔ سائرہ نے ہاں کے انداز میں سر ہلا دیا۔ "نعیم بھائی کو کوشش کے بعد بھی ابھی تک نوکری نہیں ملی ہے۔ سلیم نے انہیں کئی فیکٹریوں کے پتے دیئے تھے۔ کسی کو

فون بھی کیا تھا۔ وہ ہر جگہ گئے ہیں لیکن کہیں کام نہیں ہوا۔ کل تو آکر بالکل خاموش بیٹھ گئے تھے۔ مجھ سے بھی بات نہیں کی۔ آپ نعیم بھائی کے لئے اپنی فیکٹری میں کوشش کر کے دیکھیں نا۔ سلیم کہتے ہیں فیکٹری کا مالک آپ کو بہت مانتا ہے۔ آپ نے نعیم بھائی کے لئے اتنا کیا ہے۔ آپ کے کہنے سے شاید ان کا یہ کام بھی ہو جائے۔" غزالہ کی آنکھوں میں التجائیں تھیں۔

"تمہارے بھائی کو ابھی اتنی جلدی کیا ہے۔ آئے ہوئے دو ہفتے بھی نہیں ہوئے۔ یہاں کسی کو دو ہفتوں میں نوکری نہیں ملتی۔ اور نعیم غیر قانونی یا ان پڑھ بھی نہیں ہیں کہ فیکٹریوں کے دروازے کھٹکھٹائیں۔ ان سے کہو اپنی اہلیت کے مطابق ملازمت تلاش کرتے رہیں۔ کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گی۔" سائرہ نے غزالہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ نعیم بھائی کو نہیں جانتیں۔" غزالہ نے اداس لہجے میں کہا۔ "مفت میں یہاں رہتے ہوئے ان کی انا کو ٹھیس لگ رہی ہو گی۔ ابا کی طرح وہ بھی اپنے اصولوں کے معاملے میں سخت کٹر ہیں۔ جب سلیم کے گھر رہتے تھے تب بھی ایسے ہی تھے وہ ان کی سگی خالہ کا گھر تھا لیکن کبھی گھر میں کھانا نہیں کھایا۔ ہمیشہ باہر سے کھا کر آتے تھے۔ خالہ بی ناراض ہوتیں تو پیار کر کے انہیں منا لیتے۔ کھا کر نہیں آتے تو بھوکے سو جاتے لیکن کبھی کھانا نہیں مانگا۔میں سلیم کی بیوی بن کر آئی تو گھر میں رہنا چھوڑ دیا۔ کسی دوست کے ساتھ جا کر رہنے لگے تھے۔ کہتے تھے اب یہ خالہ کا گھر نہیں چھوٹی بہن کا گھر ہوگیا ہے اس میں رہنا ان کے لئے شرم کی بات ہے۔ سلیم نے بہت مذاق اڑایا تھا اور کہا تھا نعیم بھائی کی ساری ترقی پسندی دکھاوا ہے۔ اندر سے وہ ایک بدبودار قدامت پرست ہیں۔ نعیم بھائی نے بحث نہیں کی بس مسکرا کر چلے گئے تھے۔"

سائرہ نے دوسرے دن ہی اپنی فیکٹری میں مالک سے بات کی تھی۔ نعیم کی بہت تعریف کی تھی۔ فیکٹری کا مالک سائرہ کی بات پر یقین کرتا تھا اسے اسٹور کے لئے ایک بھروسے کے آدمی کی ضرورت بھی تھی۔ دوسرے دن اس نے نعیم کا انٹرویو کر کے اسے اسٹور کلرک کی نوکری دے دی۔ نعیم انٹرویو دینے سائرہ کے ساتھ اس کی گاڑی

میں فیکٹری گیا تھا۔ لیکن زیادہ وقت خاموش رہ کر سائرہ کی باتوں پر ہاں ہوں کر کے گزارا تھا۔ سائرہ اسے فیکٹری کے بارے میں بتاتی رہی تھی۔ نوکری مل گئی تو دل میں یہ سوچ کر مسکرائی کہ اب اس سے کیسے چھپے گا۔ سائرہ کی طرح نعیم کو بھی صبح نو سے شام پانچ بجے تک کام کرنا تھا۔ اس کے ساتھ آئے گا اور جائے گا تو کب تک چپ رہے گا کچھ تو بولے گا۔ سائرہ کو نعیم کی باتیں سننے کا جانے کیوں اتنا اشتیاق تھا۔ لیکن نعیم اس دن کے بعد سائرہ کی گاڑی میں نہیں بیٹھا۔ وہ صبح ہی صبح اٹھ کر گھر سے نکل جاتا۔ دو بسیں بدل کر وقت سے پہلے کام پر پہنچتا اور شام کو چھٹی کے بعد سائرہ کے پارکنگ لاٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی بس پکڑ کر چلا جاتا۔ سائرہ نے اس سے کہا تھا کہ بسوں میں دھکے کھانے کے بجائے وہ اس کے ساتھ آ جا سکتا ہے۔ لیکن اس نے بہت نرمی سے بتایا تھا کہ صبح کام پر جانے سے پہلے اسے ہوا خوری اچھی لگتی ہے اور کام کے بعد شہر گھومنا پسند ہے۔ سائرہ نے اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

نعیم کو آئے ہوئے ایک ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا۔ گھر میں رہتے ہوئے نعیم کا زیادہ وقت گیرج میں گزرتا جہاں غزالہ نے اس کے لئے علیحدہ جنت بنا دی تھی۔ نعیم کے علاوہ اس جنت میں زریں بھی اپنا بہت سا وقت گزارتی۔ اس نے گیرج کے ایک کونے میں اپنی گڑیا کا گھر بنا لیا تھا۔ گھنٹوں اکیلی بیٹھی کھیلتی۔ نعیم ہوتا تو اپنے اسکول کا بستہ بھی نیچے لے آتی اور نعیم کے ساتھ کوئی کتاب کھول کر بیٹھ جاتی۔ لیکن سائرہ کو آج کل نعیم کے نظر آنے یا نہ آنے سے زیادہ سلیم کے غائب ہونے کی پریشانی تھی۔ سلیم ایک بار پھر وعدے بھول کر اپنی دنیا میں واپس چلا گیا تھا۔ صبح سے رات تک یونیورسٹی میں گزارتا تھا۔ یونیورسٹی اس کے لئے ایک محفوظ ٹھکانہ اور ایک ایسا تہہ خانہ تھی جہاں وہ اپنی ذمہ داریوں سے بچ کر دن بھر چھپا رہتا۔ سائرہ ایک بار پھر جان گئی تھی کہ سلیم صرف اسی وقت جاگتا تھا جب بحران سر پر آتا تھا۔ اس وقت اسے اپنے گناہ یاد آتے اور توبہ کا طریقہ بھی۔ بحران گزر جاتا تو وہ پھر کسی تہہ خانے میں چھپ جاتا۔ لیکن کب تک......؟ سائرہ جانتی تھی بحران ایک بار پھر اور کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ اس کی اور سلیم کی شادی کا بھید غزالہ پر کسی وقت بھی کھل سکتا تھا۔ اس کی شادی

کے کئی گواہ تھے۔ ظہور اور چوہدری انور تو گھر کے لوگوں کی طرح تھے۔ راز کو راز رکھتے۔ سلیم نے منظر کو بھی اعتماد میں لیا تھا۔ منت کی تھی کہ کسی کو نہ بتائے۔ لیکن اس کی بیوی کسی وقت بھی اچانک کہیں مل جانے پر راز کھول سکتی تھی۔ نعیم اب سائرہ کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ فیکٹری میں کوئی بھی گفتگو کے دوران اس کی شادی کا تذکرہ کر سکتا تھا۔ نعیم کو پاکستانی جان کر اس فیکٹری میں کام کرنے والے اس پاکستانی کا ذکر کر سکتا تھا جس نے اسی فیکٹری میں کام کرنے والی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ نعیم کو اب تک پتہ نہیں چلا تھا شاید اس کی وجہ نعیم کا رویہ تھا۔ اس نے فیکٹری میں کسی سے دوستی بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خاموشی سے کام کرتا اور اسی طرح چپ چاپ فیکٹری سے نکل آتا۔ فیکٹری کے مالک کو اس کا یہ رویہ پسند آیا اس لئے نعیم نے بھی خود ہی اس انداز کو اپنے کام کی شرط بنا لیا تھا۔

سائرہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی اور سلیم کی شادی کا برتن کسی اور کے بتانے پر ٹوٹے۔ سلیم کو خود بتانا تھا۔ اسے آخر اب کس بات کا انتظار تھا۔ سلیم نے غلط نہیں کہا تھا کہ نعیم غزالہ کے لئے ایک بہت مضبوط جذباتی سہارا ثابت ہو گا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ نعیم کے آنے کے بعد غزالہ خود کو اتنا غیر محفوظ نہیں سمجھتی تھی جتنا اس وقت جب وہ شروع شروع میں آئی تھی۔ وقت اور پھر نعیم دونوں نے مل کر اس کا اعتماد بحال کر دیا تھا۔ ایک بدلے بدلے سلیم کو دیکھ کر زندگی میں جو خلا محسوس ہوا تھا وہ شاید نعیم نے بھر دیا تھا۔ اس وقت غزالہ کو نہیں بتائے گا تو کب بتائے گا۔ سائرہ نے ایک بار اس سے کہنے کی کوشش بھی کی تھی۔ غزالہ اور زریں نیچے گیرج میں نعیم کے پاس تھے۔ سلیم اس وقت غیر معمولی طور پر گھر میں تھا۔ سائرہ نے پوچھا تھا اسے کس بات کا انتظار ہے اور اس نے کہا تھا ابھی جلدی کیا ہے۔ نعیم کو آئے ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا۔ اس کا کیس منظور ہو جائے تو پھر......' اور اس سے نظریں ملائے بغیر دروازہ کھول کر باہر چلا گیا تھا۔ سائرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ اسے ظہور کی باتیں یاد آ گئیں نعیم سے جب فون پر اس کی شادی ہوئی تھی اس وقت ظہور نے اسے پھر بہت زور و شور سے سمجھایا تھا اور کہا تھا وہ سلیم کے وعدوں کا اعتبار کرنا چھوڑ دے۔ سلیم

میں اپنا وعدہ پورا کرنے کی ہمت کبھی نہیں آئے گی لیکن سائرہ نے یہ کہہ کر اسے چپ کرا دیا تھا کہ وہ یہ سب کچھ سلیم کے وعدے پر نہیں غزالہ کے لئے کر رہی ہے۔ ظہور نے ایک بار مشورہ دیا تھا کہ وہ غزالہ کو خود بتا دے۔ اور خود نہیں بتا سکتی تو ظہور اس کام پر آمادہ تھا۔ لیکن سائرہ نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس نے ایک بار ظہور سے غزالہ کا خط پڑھوا لیا تھا تو سلیم کتنا چراغ پا ہوا تھا۔ سائرہ نے غزالہ سے بات کرنے کے بارے میں خود بھی کئی بار سوچا تھا لیکن پھر طے کیا تھا کہ اسی وقت بتائے گی جب یہ فیصلہ کر لے گی کہ سلیم سے اس کے تعلق کا اور اس کے رشتے کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ وہ کبھی سوچتی کہ سلیم کی جگہ نعیم ہوتا تو کیا کرتا۔ غزالہ نے صحیح کہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ نعیم شاید سلیم کی طرح نظریں نہیں چراتا۔ سانڈ کے سامنے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو جاتا۔ یہ سوچے بغیر سینگ پیٹ میں بھی گھس سکتے ہیں۔ چند دنوں بعد ہی سائرہ کو معلوم ہو گیا کہ اس کا خیال زیادہ غلط نہیں تھا۔

سائرہ ایک دن فیکٹری میں کام ختم کر کے نکلی تو دیکھا نعیم گاڑی کے پاس کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ خیریت تو ہے۔ اس نے سوچا۔ چند ہفتوں پہلے سلیم بھی اس طرح اس سے ملنے یہاں آیا تھا اور اس کا نتیجہ ایک اور شادی اور نعیم کی صورت میں نکلا تھا۔ آج کیا ہونے والا ہے۔ کیا اس کی ایک اور شادی ہونے والی ہے وہ دل ہی دل میں مسکرائی۔ ساتھ اس کا مقدر بھی مسکرایا تھا۔

"کہئے طبیعت تو ٹھیک ہے۔" سائرہ نے لہجے میں مصنوعی تشویش بھرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ جب سے سڈنی آیا ہوں ایک چھینک تک نہیں آئی۔" نعیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر سنجیدہ ہو گیا۔ "آپ سے کچھ کہنا تھا۔ گھر میں شاید موقع نہ ملتا۔ میں نے سوچا رستے میں بات کر لیں گے۔" سائرہ نے گاڑی کھولی تو کچھ جھجکتے ہوئے نعیم بھی بیٹھ گیا۔ خدا خیر کرے۔ سائرہ نے سوچا کہیں اسے معلوم تو نہیں

ہو گیا۔ لیکن موڈ تو اچھا لگتا ہے۔ ہنسا بھی ہے۔ اگر معلوم ہوا ہوتا تو آگ بنا ہوتا۔ شاید گھر چھوڑ کر جانا چاہتا ہو گا۔ اسے معلوم ہے غزالہ نہیں مانے گی۔ اسی لئے اس کی مدد چاہتا ہو گا یا شاید تنہائی سے اکتا گیا ہو گا۔ کب تک صرف غزالہ سے اپنی تنہائی بانٹتا۔ ممکن ہے فیکٹری میں کوئی بات ہوئی ہو۔ کوئی نئی نوکری مل رہی ہو اس لئے فیکٹری چھوڑنا چاہتا ہو۔ لیکن کام کرتے ہوئے ابھی ایک ہی مہینہ تو ہوا ہے۔ ابھی سے۔ کچھ بھی ہو ان میں سے کوئی بات زیادہ پریشانی والی نہیں تھی۔ سائرہ نے اطمینان کی سانس لی۔ گاڑی اس کے خیالوں کی رفتار کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ جمعہ کا دن تھا ویک اینڈ شروع ہوتے ہی ٹریفک کا زور بڑھ جاتا تھا۔

"آپ کو جو کہنا ہے کیا وہ آپ کافی پیتے ہوئے بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"جی......؟"

"میرا مطلب ہے کہیں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔ گھر میں آج کوئی ہے بھی نہیں۔ زریں اور غزالہ کو چودہری انور اور ظہور شہر گھمانے لے گئے ہیں۔ ان کا بہت پرانا وعدہ تھا۔ دونوں نے آج کام سے چھٹی کی ہے۔ مجھ سے بھی کہا تھا چھٹی کرلوں لیکن ممکن نہیں تھا۔ سلیم حسب معمول یونیورسٹی میں ہیں۔ اکیلے گھر میں آپ کو مجھ سے ڈر لگے گا۔" سائرہ مسکرائی۔

"آپ کو نہیں لگے گا۔" نعیم نے بھی اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کے ساتھ نہیں لگے گا۔" سائرہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ لیکن پھر خود ہی جھینپ گئی۔ شرم سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ نظریں آگے والی رینگتی ہوئی گاڑی پر جم گئیں۔ سائرہ سوچنے لگی کیا یہ وہی تھی۔ شرمیلی سی لڑکی جس کے منہ میں زبان نہیں ہوتی تھی۔ آسٹریلیا نے اس پر بہت تیزی سے اثر کیا تھا۔ یا شاید حالات۔ خاندان بن کر رہتی تو اتنا نہیں بدلتی۔ اکیلی زندگی کی جدوجہد کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ ساتھی ملا بھی تھا تو آدھا آدھا بٹا ہوا۔ بہت جھجکتا ہوا۔

"آپ کی گاڑی اسی طرح چلتی رہی تو ہم کافی کے بجائے صبح کے ناشتے پر پہنچیں گے۔" سائرہ چونک کر نعیم کو دیکھنے لگی۔ ان کی گاڑی ایک لین میں پھنسی ہوئی

کھڑی تھی۔ سرکنا بھی بند ہو گئی تھی۔ آپ کو اعتراض نہ ہو تو گاڑی میں چلاؤں۔ آپ صرف راستہ بتائیے گا۔"

"آپ کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے۔" سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"پاکستان سے انٹرنیشنل لائسنس لے کر نکلا تھا۔ وہ ابھی تک کارآمد ہے۔ دیکھئے گاڑیاں ابھی تک رکی ہوئی ہیں۔ یہی موقع ہے سیٹیں بدلنے کا۔" نعیم نے سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے کہا۔ دونوں نے اتر کر تیزی سے اپنی نشستیں تبدیل کیں۔ تھوڑی دیر میں ان کی لین کا ٹریفک سرکنے لگا تو نعیم گاڑی نکال کر دوسری لین میں آگیا جو تیزی سے چل رہی تھی۔ لین بدلتے وقت ایک سیکنڈ کے لئے سائرہ کی سانس رک گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد وہ نعیم کی مہارت دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ وہ لین بدل بدل کر گاڑی چلاتا رہا۔ سائرہ صرف دائیں بائیں کی ہدایت دیتی رہی۔ پندرہ منٹ میں وہ کراؤن اسٹریٹ پہنچ گئے۔

"اچھا ہوا آپ نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔ میں تو ایک گھنٹے تک بھی نہ پہنچ پاتی۔ کراچی کا ٹریفک سنا ہے بہت خراب ہے وہاں تو آپ کو بہت دشواری ہوتی ہو گی۔" گاڑی پارک کر کے کافی ہاؤسوں کی قطار کی بڑھتے ہوئے سائرہ نے کہا۔

"کراچی میں ہماری گاڑی بہت پرانی ہے۔ ایسی عجیب آوازیں نکالتی ہے کہ لوگ ڈر کے خود ہی جگہ دے دیتے ہیں۔" نعیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"سلیم گاڑی کیوں نہیں چلاتے۔" سائرہ نے پوچھا۔ اس نے سلیم سے بھی کئی بار پوچھنا چاہا تھا لیکن ہمت نہیں ہوئی تھی۔

"سلیم بھائی کو کبھی شوق ہی نہیں ہوا۔" نعیم نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "انجنیئرنگ پاس کی تھی تو تحفے میں موٹر سائیکل ملی تھی۔ کسی دوست کے ساتھ اسے لے کر سیکھنے نکلے لیکن پہلی ہی کوشش میں گر پڑے تھے۔ اس کے بعد ہاتھ نہیں لگایا۔ کبھی کبھی اس کا زنگ اتارنے کے لئے میں چلانے لے جاتا تھا۔ ابھی تک اسی طرح کھڑی ہے۔ ان کے ابا کی نشانی ہے اس لئے بیچتے بھی نہیں۔" وہ ریسٹورنٹ آگیا تھا جس میں سائرہ اور سلیم ہمیشہ بیٹھا کرتے تھے۔ نعیم داخل ہونے کے لئے مڑنے لگا تو سائرہ نے

روک دیا۔
"ان کی کافی اچھی نہیں ہوتی۔ سامنے والے کافی شاپ میں بیٹھیں گے۔"
سائرہ آج اپنے پرانے ریسٹورنٹ میں نہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔ لیکن اتفاق تھا وہ جس نئی جگہ گئے وہاں کی کافی بہت اچھی تھی۔ سائرہ کو پہلے گھونٹ میں ہی مزا آ گیا۔
"آپ کچھ کہنا چاہتے تھے۔" سائرہ نے کافی کے دو تین اور گھونٹ لے کر کہا۔
"لیکن کوئی بری خبر سنا کر میرا ویک اینڈ مت خراب کیجئے گا۔"
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ کہنے والی ہے بھی نہیں' آپ کو بس یہ دینا تھا۔" نعیم نے ایک لفافہ جیب سے نکال کر سائرہ کی طرف بڑھا دیا۔ سائرہ نے کھول کر دیکھا تو اس میں پیسے تھے۔
"یہ کیا ہے۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"یہ پچھلے مہینے کا کرایہ ہے۔" نعیم نے بہت آہستہ آواز میں کہا۔
"کرایہ تو سلیم دے دیتے ہیں آپ کو دینے کی کیا ضرورت ہے۔" سائرہ نے احتجاج کیا۔
"غزالہ بھی یہی سمجھتی ہے۔" نعیم نے سائرہ کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے تھوڑی دیر چپ رہ کر کہا۔ "مجھے نہیں معلوم آپ کو ہمارے خاندان سے کوئی ہمدردی ہے یا آپ سب کے لئے اتنی فراخدل ہیں۔ لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ سلیم بھائی آپ کو کوئی کرایہ نہیں دیتے۔ میں صرف اپنے خاندان کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ سلیم بھائی کو مت بتائیے گا اور پلیز لینے سے انکار مت کیجئے گا۔" سائرہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ وہ جانتی تھی نعیم بیوقوف نہیں ہے۔ اسے چند دن میں ہی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ کرائے پر رہنے والے اس طرح مالک بن کر نہیں رہتے۔ وہ سوچنے لگی نعیم کو اس کے اور سلیم کے بارے میں کوئی شک تو نہیں ہوا۔ اپنی سوچوں کے اس وقفے میں وہ لفافے میں رکھے ہوئے نوٹوں کو گننے لگی۔ چھ سو ڈالر تھے۔
"آپ نے تو تین مہینوں کا کرایہ دے دیا۔ میرے پڑوس میں کسی نے گیرج کرائے پر دیا ہے۔ اسے پچاس ڈالر ہفتہ ملتا ہے۔ ڈیڑھ سو ڈالر ہفتہ تو بہت ہے۔

ٹیکس کے دفتر کو معلوم ہو گیا تو مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔" سائرہ نے بات مسکرا کر ٹالنی چاہی۔

"سلیم بھائی جب تک کرایہ دینے کے قابل نہ ہوں یہ میری ذمہ داری ہے۔ میرے اپنے پاس کمائے ہوئے پیسوں کا کوئی اور اچھا مصرف بھی نہیں ہے۔ چھت آپ نے دی ہے۔ کھانا بھی مل جاتا ہے۔ سگریٹ اور شراب میں نہیں پیتا۔ سینما دیکھنے کا بھی شوق نہیں ہے۔ کبھی کبھی کوئی کتاب خرید لیتا ہوں یا بسوں کا کرایہ دیتا ہوں۔ پاکستان بھیجنا چاہتا تھا لیکن ابا کو پسند نہیں ہے' نہ انہیں ضرورت ہے۔ آپ یہ پیسے لے لیں گی تو مجھے لگے گا کہ میں بھی اپنے گھر والوں کے لئے کچھ کرنے کے قابل ہوں۔" نعیم کا انداز بہت عاجزانہ تھا۔

"آپ کو کیسے معلوم کہ سلیم کرایہ نہیں دیتے؟" سائرہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"پہلے صرف شبہ تھا۔ اب آپ سے بات کر کے یقین ہو گیا ہے۔" نعیم بھی جواباً" مسکرایا لیکن پھر سنجیدہ ہو گیا۔ "سلیم بھائی کا انسانی تعلقات کا شعبہ بہت کمزور ہے۔ پاکستان میں وہ ہمیشہ اپنے آپ میں گم رہ کر آگے بڑھنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ آسٹریلیا آکر حالات نے انہیں ملنے جلنے پر مجبور کیا ہو گا۔ انہیں دوستیوں کا کوئی تجربہ نہیں ہے اس لئے بہت الجھن میں رہے ہوں گے۔ کرایہ دینے یا نہ دینے کے مسئلے کو انہوں نے اصولی مسئلہ نہیں بنایا ہو گا کچھ آپ کا بھی قصور ہو گا۔ آپ نے اصرار نہیں کیا ہو گا۔" نعیم سلیم کا دفاع کرنے لگا۔

"آپ کا خیال ہے میں نے تکلفاً" اصرار نہیں کیا۔ ورنہ میں کرایہ لے لیتی۔" سائرہ نے ذرا غصے سے کہا۔

"نہیں نہیں آپ پر شک کرنا بھی گناہ ہے۔ میں صرف حقیقت جاننا چاہتا تھا۔ وہ آپ نے بتا دی۔" نعیم نے کچھ افسردہ لہجے میں کہا۔ سائرہ سوچنے لگی وہ کتنی بیوقوف تھی۔ اس نے کتنی آسانی سے سچائی اگل دی۔ لیکن اس مسئلے پر بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"آپ کو آسٹریلیا کیسا لگا۔" سائرہ نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد موضوع

بدلنے کی کوشش کی۔

"پہلے یہ لفافہ اٹھا لیجئے۔" نعیم نے ڈالروں والا لفافہ سائرہ کی طرح کھسکا دیا۔ سائرہ نے جھجکتے ہوئے اٹھا کر اسے اپنے بیگ میں رکھ دیا۔ یہ شام کرائے کے مسئلے پر ضائع کرنے کے لئے نہیں تھی۔ سائرہ کو لگا جیسے نعیم نے اطمینان کا گہرا سانس لیا ہو۔

"آسٹریلیا بہت اچھا ہے۔ لیکن کوئی بھی جگہ سڑکوں' عمارتوں اور مناظر سے نہیں لوگوں سے اچھی یا بری بنتی ہے۔ یہاں کے لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ بہت ہمدرد' مددگار' نرم گو اور خوش مزاج۔ پھر یہاں آپ ہیں۔ آپ بھی بہت اچھی ہیں۔" نعیم نے مسکرا کر کہا۔

"پھر آپ مجھ سے چھپتے کیوں پھرتے ہیں۔ لگتا ہے آپ مجھ سے ڈرتے ہیں۔"

"آپ سے.....!" نعیم ہنسنے لگا۔ "کیوں کیا آپ بہت غصے والی ہیں۔"

"غصہ تو مجھے آتا ہی نہیں بہت کوشش کرتی ہوں تب بھی نہیں آتا بس آنسو آجاتے ہیں۔ مجھے رونا بہت آتا ہے۔ غصے والی بات ہو یا اداس کرنے والی مجھے رونا آجاتا ہے۔ خوش ہو کر بھی رو پڑتی ہوں۔"

"پھر تو آپ سے واقعی ڈرنا پڑے گا۔ عورتوں کے رونے سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"لگتا ہے آپ نے عورتوں کو بہت رلایا ہے۔"

"میری امی میرے لئے بہت روئی ہیں۔" نعیم نے کہا۔ "وہ اب بھی میری خبر لیتی ہیں۔ جب تک کوستی رہتی ہیں خاموشی سے بیٹھا سنتا رہتا ہوں۔ لیکن برستے برستے جیسے ہی رونا شروع کرتی ہیں ڈر کے بھاگ جاتا ہوں۔ میری ایک دوست تھی۔ بہت بہادر بے حد نڈر۔ آنسوؤں سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ ایسے موقعوں پر جب مرد بھی رو پڑتے ہوں اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا قطرہ تک نہیں چمکتا تھا۔ لیکن ایک دن وہ مجھ سے ملی تو بری طرح رو پڑی۔ وہ مجھ سے آخری بار مل رہی تھی۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں بس اسے روتا دیکھتا رہا اور موقع ملتے ہی ادھر ادھر ہو گیا۔ اس کے بعد وہ مجھے کبھی نہیں ملی۔ مجھے اگر اس کے

رونے کی وجہ معلوم ہوتی۔ میں اس سے اگر اس وقت پوچھ لیتا تو..... تو......" نعیم اداس ہو کر خاموش ہو گیا۔ لگتا تھا کہیں کھو گیا ہو۔

"مجھے معلوم ہے۔ غزالہ نے مجھے بتایا تھا۔" سائرہ نے بھی اداس ہو کر بہت آہستہ آواز میں کہا۔ نعیم فوراً" ہی ماضی سے نکل آیا۔

"غزالہ کی باتوں کا آپ یقین مت کیا کیجئے۔ میری محبت میں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتی ہے۔" نعیم نے مسکرا کر کہا۔

"آپ نے بتایا نہیں آپ مجھ سے کیوں چھپتے پھرتے ہیں۔" سائرہ نے پھر اصرار کیا۔

"آپ کو سچ بتاؤں؟" نعیم نے سائرہ کو دیکھ کر پوچھا اور اسے سر ہلاتا دیکھ کر کہنے لگا۔ "آپ میرے ضمیر پر ایک بہت بڑا بوجھ ہیں۔ آپ کو سامنے دیکھتا ہوں تو اس بوجھ کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ خود سے شرم آنے لگتی ہے۔"

"میں نے۔ میں نے آخر ایسا کیا جرم کیا ہے۔" سائرہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگی۔

"آپ نے نہیں ہم سب نے مل کر آپ کے ساتھ کچھ کیا ہے۔ اپنے ساتھ آپ کو بھی ایک جھوٹ بنا دیا ہے۔ میری زندگی کا معاملہ تھا اس لئے میرے پاس وجہ تھی۔ آپ کو ملوث کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں تھا۔ رشتوں کے فریب میں شامل کر کے ہم نے آپ کو بھی دھوکے باز بنا دیا۔ غزالہ اور سلیم بھائی نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ ضمیر کا بوجھ ہی نہیں آپ کا ایک بڑا قرض ہے۔ مجھے نہیں معلوم کیسے چکاؤں گا۔"

سائرہ ایک بار پھر سلیم سے اس کا موازنہ کرنے لگی۔ سلیم شرمندگی کے کسی احساس کے بغیر رشتوں کے فریب کی شطرنج کھیل رہا تھا اور ایک یہ تھا جو جرم کا اتنا گہرا احساس لئے بیٹھا تھا۔

"غزالہ نے وہی کیا جو ایک بہن کر سکتی تھی۔" سائرہ کہنے لگی۔ "آپ کی جان کا معاملہ تھا۔ ایسے موقعوں پر تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ ہم سب نے وہی کیا جو

کرنا چاہئے تھا۔ مجھے کوئی ندامت نہیں ہے۔ بلکہ خوشی ہے کہ آپ خطروں سے ہمیشہ کے لئے بچ گئے۔"

"ہو سکتا ہے یہ خطرہ بھی محض ایک مفروضہ ہو۔ محبتیں خوف کے احساس کو بڑھا چڑھا کر ہوا بنا دیتی ہیں۔ شاید میں پکڑا ہی نہ جاتا یا پاکستان پہنچتے ہی چھوڑ دیا جاتا۔ ہو سکتا ہے امی کے آنسو ابا کو پھر کسی بیورو کریٹ دوست کے دروازے تک لے جاتے اور وہ مجھے رہا کروا دیتے۔ کہیں اور کا ویزا دلوا کر باہر بھجوا دیتے۔"

"زندگیاں امکانات کے حوالے تو نہیں کی جا سکتیں۔"

"ہاں شاید۔ لیکن میرا وجود اتنا اہم نہیں ہے کہ نہ ہونے سے کوئی خلاء پیدا ہو۔ میں نے ایسے کئی دوستوں کو مرتے دیکھا ہے جو بہت زندگیوں کا اکیلا سہارا تھے۔ ان کے رونے والوں کو بھی قرار آ گیا۔ میرے مرنے سے بھی کوئی قیامت نہیں آتی۔" نعیم کے لہجے میں بہت یاسیت آ گئی تھی۔

"آپ بہت مایوسی کی باتیں کر رہے ہیں۔ غزالہ تو آپ کو انقلابی سمجھتی ہے۔ کہتی ہے آپ اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جیتے ہیں۔ کم از کم اپنے امی ابا اور بہن کے لئے جینے کی کوشش کیجئے۔ مرنے کی باتیں سن کر تو مجھے بھی تکلیف ہونے لگی ہے۔" سائرہ کی آنکھوں میں درد بھر آیا۔

"انہی کے لئے تو جینے کی کوشش کر رہا ہوں۔" نعیم نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اپنی مایوسی کا کچھ نہیں کر سکتا۔ مایوس نہ ہوتا تو پاکستان کبھی نہ چھوڑتا۔ وہیں رہتا۔ زندہ یا مردہ۔ لیکن اب سارے انقلاب بھٹک گئے ہیں۔ آپ نے شاید خواب کبھی نہیں دیکھے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں وہ کھو جائیں تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔" سائرہ سوچنے لگی سب کو اپنی اپنی قبر کے عذاب کا رونا ہے۔ نعیم کے خواب تو مبہم تھے۔ نسلوں کا فاصلہ طے کرنے والے۔ سچ مچ کے خواب تو اس نے دیکھے تھے اور پھر انہیں بار بار ٹوٹتا ہوا بھی دیکھا تھا۔ بلکہ ٹوٹے ہوئے ایک خواب کو پکڑ کر اب تک لٹکی ہوئی تھی۔ نعیم جان و دل سے وابستہ تکلیفوں کو کیا جانے۔ وہ تو کسی پرائے درد کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ویٹر نے کافی کے تازہ کپ بھر کر

رکھ دیئے تھے۔ نعیم کافی کا گھونٹ لے کر پھر کہنے لگا۔

"میرے ابا نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ مجھے جو بنانا چاہتے تھے میں نہیں بن سکا۔ لیکن مجھ سے ناراض رہنے کے باوجود انہیں فخر تھا کہ ان کی طرح اصولوں پر میں نے بھی کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ مجھے معلوم ہے میری رہائی کی کوشش کرنے جب وہ کسی کے پاس گئے ہوں گے تو اپنا ایک اصول توڑنے پر انہیں کتنی تکلیف ہوئی ہو گی۔ لیکن اگر انہیں معلوم ہوا کہ جاپان کی جیل سے نکل کر آسٹریلیا آنے کے لئے میں نے کیا طریقہ اختیار کیا ہے تو انہیں اس سے کہیں زیادہ تکلیف ہوئی ہوگی۔ میری وہ ایک اچھائی بھی ختم ہو گئی ہے جس پر میرے باپ کو فخر تھا۔"

سائرہ کو لگا اپنے باپ کے ذکر پر نعیم مضطرب ہو گیا ہے۔

"آپ کی یہ سب باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ دھوکہ وہ ہے جو ایک دوسرے کو دیا جائے۔ آپ نے مجھے کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ میں نے آپ کو کوئی فریب نہیں دیا۔ ہم دونوں نے ایک اچھے مقصد کے لئے سمجھوتہ کیا اور بس۔ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے آپ کے ضمیر پر بھی کوئی بوجھ نہیں ہونا چاہئے۔"

"یہ سب بہلاوے ہیں۔ بدترین قسم کی خود فریبی۔" نعیم نے کافی کا گھونٹ لے کر کہا۔ "اس بوجھ کو اتارنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔" پہلی بار نعیم کی آنکھیں جھکی تھیں۔ سائرہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ "آپ برا مت مانئے گا۔ میری بات پسند نہ آئے تو بھول جائیے گا۔ میں کبھی نہیں دہراؤں گا۔ غزالہ اور سلیم بھائی سے بھی مت کہئے گا۔" نعیم نے سائرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ سائرہ نے آہستہ آہستہ سر ہلا دیا۔

"کیوں نہ ہم اس جھوٹ کو سچ کر کے کاغذی رشتے کو اصلی کر دیں۔ میں آپ سے سچ مچ کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔" سائرہ کو ایسا لگا اس کے ذہن میں بہت سی ریل گاڑیاں چلنے لگی ہوں، ہموار رن وے پر جہاز اتر رہے ہوں اور سمندری اسٹیمر ہارن بجانے لگے ہوں۔ اس کا حلق بالکل خشک ہو گیا۔ ہاں کہنے والی زبان لکڑی کی ہو گئی۔

اپنی حسیات واپس لانے کے لئے اس نے کافی کا کپ منہ سے لگا لیا۔ ہاتھوں کی لرزش روکنے میں مشکل ہوئی تھی۔ نعیم نے کچھ توقف کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔

"میرا صرف ایک بار کسی سے جذباتی تعلق ہوا تھا۔ وہ قصہ آپ غزالہ سے سن چکی ہیں۔ اس کے بعد زندگی جس رستے پر چل پڑی اس میں کوئی نیا تعلق جوڑنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ امی اور خالہ چاہتی تھیں میری شادی کر دیں۔ ان کا خیال تھا اس طرح میری بے راہ روی ٹھکانے پر آ جائے گی۔ لیکن میں اپنے رونے والوں میں ایک بیوہ کا اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اب میری آخری ہجرت مکمل ہو گئی ہے۔ میں آخری بار بے وطن ہوا ہوں۔ نئے وطن کو اپنا بنانے کے لئے زندگی نئے سرے سے بنانی ہو گی لیکن فیصلہ اب دل سے نہیں ہو گا اچانک کوئی برق نہیں لہرائے گی۔ میں سب کچھ بہت یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں ہے مجھے آپ سے اچھا ساتھی نہیں ملے گا۔ میں بھی کبھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ آج آپ جو وعدہ بھی چاہیں گی بہت سوچ سمجھ کر کروں گا۔"

برق تو لہرا گئی تھی۔ سائرہ نے سوچا۔ نعیم کے لہجے میں کوئی چمک نہیں تھی۔ بے حد سکون تھا اس کا ایک ایک لفظ سائرہ کے دل میں اترا تھا۔ "مجھے تم سے کوئی وعدہ نہیں چاہئے۔ مجھ سے کوئی وعدہ مت کرو۔ مجھے تم پر پورا یقین ہے۔ تمہارے ایک ایک لفظ پر بھروسہ ہے۔" سائرہ کے دل میں آوازیں طوفان بن کر اٹھ رہی تھیں۔ لیکن وہ اسے کیسے بتاتی وہ تو کسی اور کے وعدے کی ڈور میں بندھی ہوئی ہے۔ سلیم نے اس سے کتنے وعدے کئے تھے۔ بلکہ سلیم کے ساتھ تو اس کی پوری زندگی وعدوں اور ان کے پورا ہونے کا انتظار بن کر گزری تھی۔ اسے فرق اب نظر آرہا تھا۔ سلیم کے وعدوں پر یقین کرنے کے لئے اسے ہر بار دل کو سمجھانا پڑا تھا۔ سائرہ کے پاس شاید ان وعدوں پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ کوئی انجانا خوف اس کی آنکھیں بند کر دیتا۔ کچھ اور سوچتے ہوئے لگتا جیسے رشتے میں دراڑیں پڑنے لگی ہوں۔ رشتہ لاش بن گیا تھا پھر بھی اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ لیکن نعیم کے وعدوں پر تو دل بے اختیار ہو کر اچھلا تھا۔ ایک جشن سا مچ گیا تھا۔ لذت کی لہر دل میں بہت اندر

تک اتر گئی تھی یہ وہی لہر تھی جو اس وقت چمکی تھی جب پہلی بار سلیم نے اسے اچانک اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔ لیکن نعیم تو فاصلے پر بیٹھا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ لہر دوسرے کو چھوئے بغیر ہی دوڑ جائے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ فاصلہ رہے اور محسوس نہ ہو---- لیکن---- لیکن۔ اس فاصلے کا اب وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ فاصلہ فاصلہ ہی رہے گا۔ فاصلہ طویل تھا اور درمیان میں رشتے اور وقت کے دو بڑے بڑے گڑھے بھی تھے۔ "تم نے اتنی دیر کیوں کر دی۔ تم پہلے کیوں نہیں آئے۔" سائرہ کی سوچوں میں ایک آہ سی ابھری۔ چہرہ غمگین ہو گیا۔ آنکھوں میں وہی اداسی آ بسی جو اس کی شناخت تھی اور جو اس کی آنکھوں کو اور خوبصورت کر دیتی تھی۔ نعیم سوال بنا ہوا سائرہ کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ کا ساتھ تو کسی خوش قسمت کو نصیب ہو گا۔ میری قسمت اتنی اچھی نہیں ہے۔" سائرہ نے بہت مشکل سے کہا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"لیکن کیوں؟" نعیم جاننا چاہتا تھا۔ آنکھیں مستقل سائرہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے اس کی سوچوں کو پڑھنا چاہتا ہو۔

"آپ کو میری کہانی نہیں معلوم!" سائرہ نے چہرہ اٹھا کر بہت اداس لہجے میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ غزالہ نے سنائی تھی۔ اس کے بعد میرے دل میں آپ کی قدر بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کے بعد میرے دل میں یہ خیال جاگا تھا کہ آپ اگر منظور کر لیں تو........" نعیم نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں وہ نہیں۔ ایک اور کہانی ہے جو غزالہ کو نہیں معلوم۔" نعیم اسی طرح اسے دیکھتا رہا منہ سے نہیں بولا لیکن آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ "سناؤ نا!" آنکھوں کی فرمائش سائرہ کے لئے حکم بن گئی۔

"میں تمہارے سلیم بھائی کی بیوی ہوں۔" نظریں جھکا کر سائرہ نے ہلکی سی سرگوشی کی۔ نعیم کو لگا جیسے نزدیک ہی ایک بڑا بم دھماکہ ہوا ہو۔ ریل گاڑیاں اور اسٹیمر اب اس کے دماغ میں دوڑنے لگے تھے۔ جہاز بہت جھٹکے لے کر زمین پر اترا تھا۔

19

آخری منظر

سڈنی ۱۹۹۷ء

فلیٹ میں وہ سب جمع تھے جن کا ایک دوسرے سے تعلق رشتوں سے بے نیاز تھا۔ جو محبتوں میں جوڑ کر ایک دوسرے کے لئے خاندان بن گئے تھے۔ سائرہ اکثر سوچتی تھی اپنی زندگی میں ان سب کے آنے سے پہلے بھی وہ زندہ تھی بلکہ زیادہ اچھی طرح زندہ تھی۔ لیکن زندگی مطمئن ہو کر کتنی ہموار کتنی سطحی اور مصنوعی ہو گئی تھی۔ جذبوں میں کوئی ارتعاش ہی نہیں تھا۔ نہ شور مچاتی ہوئی لہریں تھیں۔ کوئی صدمہ کوئی خوشی، کوئی ہیجان کوئی بھونچال نہیں تھا۔ ایک ایک کر کے سب آئے تو اس کا گھر بھی بھر گیا اور زندگی بھی۔ آتے جاتے بحران کسی ناول کے اوراق کی طرح پلٹتے رہے۔

ایک ورق جس کو پڑھنے سے آنکھیں گیلی ہو جائیں۔ دوسرا ورق ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا دے اور کوئی تیسرا ورق جو دل میں بہت ہلکا اور میٹھا سا درد بھر دے۔ اس نے کتابوں کے شیلف کے پاس کھڑے ہوئے نعیم کو نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے پر ایسا سکون تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ایک دن میں کتنے طوفان آ کر گزر گئے تھے' زندگی کی سمت بدل گئی تھی لیکن نعیم کے چہرے پر گزرے ہوئے پل کا کوئی نشان نہیں تھا۔ جو کچھ تھا صرف آنکھوں میں تھا۔ کوئی پڑھنا جانتا بھی ہو تو پڑھتے ہوئے تھک جائے۔

ایک صوفے پر سلیم آنکھیں جھکائے بیٹھا تھا۔ چہرے پر کوئی ندامت نہیں تھی ہونٹوں پر بہت زہریلی سی مسکراہٹ سجی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا مکالمہ آرائی بہت ہو چکی۔ اب کچھ کہنے کا فائدہ نہیں تھا۔ سب اپنی اپنی راہ چن چکے تھے اسے بھی اب باہر جا کر کوئی راستہ تلاش کرنا تھا۔ وہ اٹھ کر خاموشی سے اپنا سامان سمیٹنے کمرے میں چلا گیا۔ چودھری انور سب سے الگ کھانے کی میز کے گرد پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا یہ سب کچھ اس کے جانے سے پہلے ہی ہونا تھا۔ وہ چند ہفتوں میں جانے والا تھا۔ اس کا بھائی اگلے ہفتے آ رہا تھا۔ اس کے بعد اسے بھی پر لگ جاتے۔ پاکستان واپس جانے کے لئے اس کی تیاری کب سے مکمل تھی۔ لیکن جانے سے پہلے اس کے دوستوں کے ساتھ جو کچھ جس طرح ہوا تھا اس نے چودھری انور کو بہت اداس کر دیا تھا۔ وہ سلیم کے لئے زیادہ اداس تھا۔ سلیم نے جو کچھ کیا تھا وہ صحیح تھا یا غلط اسے نہیں معلوم تھا۔ فیصلہ دینے والا وہ ہوتا بھی کون تھا۔ سلیم اس کے لئے آج بھی وہی پریشان حال نوجوان تھا جسے اس نے ایئرپورٹ سے لا کر مسجد میں پناہ دلوائی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک بہت کچھ بدل گیا تھا۔ پھر بھی کچھ نہیں بدلا تھا۔ چودھری انور نے سوچا سلیم آج بھی وہی پہلے دن والا سلیم تھا۔ سخت عدم تحفظ کا شکار۔ وہ اسے کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن ڈرائنگ روم سے اٹھ کر کمرے میں جاتے ہوئے سلیم کو دیکھ کر وہ بے بسی کے عالم میں سر ہلانے لگا۔ اگر خود سلیم سب کو چھوڑ کر جانا چاہتا تھا تو اسے روک بھی کون سکتا تھا۔ چودھری انور صوفے پر بیٹھے ہوئے

ظہور کو دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں ایک عجیب سی لاپرواہی تھی۔ لیکن چودہری انور اتنے دن ساتھ رہ کر جان گیا تھا کہ اندر سے ظہور بھی اداس تھا۔ ظہور کی نظروں نے کمرے میں جاتے ہوئے سلیم کا جن نظروں سے تعاقب کیا تھا انہوں نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

تین نشستی صوفے پر غزالہ کی گود میں زریں لیٹی ہوئی تھی۔ شاید سہم کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اونچی اونچی آوازوں میں ہونے والی بحث سے وہ بہت ڈرتی تھی۔ اسے لگتا تھا بس تھوڑی دیر میں لڑائی شروع ہو جائے گی۔ اس وقت خاموشی تھی پھر بھی اس کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید سچ مچ سو گئی تھی۔ کل دن بھر چودہری انور اور ظہور کے ساتھ شہر گھومی اور طرح طرح کے جھولوں میں جھولی تھی۔ واپس آئی تھی تو بری طرح تھک گئی تھی۔ کارٹون دیکھنے صبح ہی صبح اٹھ گئی تھی۔ اب دوبارہ سو کر شاید اپنی نیند پوری کر رہی تھی۔ سلیم کو کمرے میں جاتا دیکھ کر غزالہ زریں کو اپنے اور قریب کر کے سوچنے لگی صرف ایک دن میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ اس نے پاکستان میں رہ کر سلیم کے انتظار میں جو برس گزارے تھے ان کا ایک ایک لمحہ کئی کئی سالوں کے برابر تھا۔ سلیم کے بغیر رہنے کی عادت ہونے لگی تو وہ آگیا تھا۔ جیسے زندگی میں پھر سے بہاریں آ گئی ہوں۔ انتظار کے سال بیتی ہوئی کوئی پرانی صدی لگنے لگے تھے۔ لیکن اس کے بعد انتظار کا جو ایک اور برس گزارا وہ زیادہ تکلیف دینے والا تھا۔ ہر لمحہ ایک صدی بن گیا تھا۔ وہ ساری صدیاں گزرنے میں کئی برس لگے تھے لیکن صرف کل شام اور آج کے درمیان زندگی نے کتنی طویل جست لگائی تھی۔ غزالہ کو لگا ایک ہی چھلانگ میں اس نے زندگی بھر کا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ اسے کل کی وہ شام یاد آنے لگی جب نعیم نے آ کر اس کے دل اور دماغ پر اتنے بم برسائے تھے اتنے بم برسائے تھے کہ وہ گن بھی نہیں سکی تھی۔

سائرہ کی آنکھوں میں بھی اس وقت کل کی وہی شام طلوع ہو رہی تھی جب ایک لمحے میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس کی زندگی میں ایک دن آیا تھا جب دو زندگیوں کے چراغوں نے گل ہو کر اس کی زندگی کا نیا اور زیادہ چمکدار دیا

روشن کیا تھا۔ آج بھی دو گھروں کی قسمتیں بدلی تھیں۔ ایک بنا تھا اور ایک شاید ٹوٹ گیا تھا۔ سائرہ کی نظروں میں کل کی پوری شام گھوم گئی۔

نعیم کو پوری کہانی سنا کر سائرہ کو یقین نہیں آیا کہ وہ اپنے اشکوں کو کیسے قابو میں رکھ سکی تھی۔ آنکھیں جیسے ہی گیلی ہونے لگتیں وہ زور زور سے پلکیں جھپکا کر آنسوؤں کو پی جاتی۔ کہانی سنتے ہوئے نعیم کے چہرے پر بھی کئی رنگ آ کر گزرے تھے لیکن آخر میں سرخ رنگ ٹھہر گیا تھا۔ کہانی ختم ہوتے ہوتے سرخ رنگ اور گہرا ہو گیا۔ سائرہ کو نعیم کی آنکھوں کی چمک ہمیشہ غیر معمولی لگتی تھی۔ لیکن اس وقت اسے نعیم کی آنکھوں میں چنگاریاں سی نظر آئیں۔ اس نے خود پر قابو رکھا تھا لیکن بولا تو جذباتی ہو رہا تھا۔

"سلیم بھائی نے بہت برا۔ بہت برا کیا۔ خود اپنے ساتھ' غزالہ کے تمہارے اور میرے ساتھ۔ امی ابا اور خالہ کو معلوم ہوا تو جانے کیا ہو۔ میں یہ سب کچھ کرتا تو شاید سہہ جاتے۔ لیکن سلیم بھائی تو سب کے لئے ایک فرشتہ تھے جس سے کوئی گناہ نہیں ہو سکتا۔ خالہ بی اور امی کیا بہت مضبوط اعصاب والے ابا بھی ٹوٹ جائیں گے۔ آپ کو نہیں معلوم ان سب کو سلیم بھائی پر کتنا مان ہے۔ اور غزالہ۔ میری معصوم بہن۔ میری بچی۔ اوہ میرے خدا....." نعیم بھائی نے آنکھیں بند کر کے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ ایک لمحے کے لئے سائرہ کو لگا جیسے رونے والا ہو۔ لیکن اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔

"غزالہ کی شادی پر میں بہت رویا تھا۔ مجھے لگا تھا بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ لیکن اب وہ مجھ سے زیادہ تنہا ہو جائے گی۔"

"غزالہ کو مت بتائیے گا۔ سلیم بتاتے تو کچھ اور بات ہوتی' وہ اسے قائل کر کے اس کا دکھ کم کر دیتے۔ لیکن آپ بتائیں گے تو اسے بہت تکلیف ہو گی۔"

"بتانا تو پڑے گا۔" نعیم نے سوچتے ہوئے کہا۔ جیسے خود سے بات کر رہا ہو۔ "خبر دینے والے کے بدلنے سے خبر اور اس کا اثر نہیں بدلتا۔ کسی اور کو بتانے یا نہ

بتانے سے شاید فرق نہ پڑے۔ لیکن غزالہ کے لئے یہ جاننا ضروری ہے۔ یہ اس کا حق ہے۔"

"لیکن....." سائرہ نے کہنا چاہا مگر نعیم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اسے دکھ ہو گا لیکن اسے برداشت کرنا ہو گا۔ مجھے معلوم ہے وہ برداشت کر لے گی۔ وہ میری بہن ہے۔" نعیم کی نگاہوں میں بہت پیار بھر گیا تھا۔ "ہم اسے اب بھی چھوٹی بچی سمجھتے ہیں۔ یہ دکھ اسے بڑا کر دے گا۔ اپنا فیصلہ وہ خود کرے گی۔ آج ہم نے اسے نہیں بتایا اور اسے کبھی بعد میں پتہ چلا تو وہ ہمیں بھی معاف نہیں کرے گی۔ ہم سب اس جھوٹ میں حصے دار بن جائیں گے۔ آج تو اسے صرف دکھ ہو گا۔ کل اس کے لئے فیصلہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی تو دکھ پچھتاوا بن جائے گا۔ غزالہ کو ہمیں بتانا ہو گا۔ آج ہی بتانا ہو گا۔" نعیم خاموش ہوا تو سائرہ سوچنے لگی اب چلنے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ اپنا بیگ اٹھانے لگی لیکن نعیم نے کوئی جنبش نہیں کی۔ سائرہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ نے میری بات کا اب تک جواب نہیں دیا۔" نعیم ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"کیا اب بھی؟" سائرہ نے حیرت سے کہا۔ لیکن دل میں میٹھی سی لہر پھر جاگنے لگی تھی۔

"میرے لئے کچھ نہیں بدلا۔ سلیم بھائی سے یہ رشتہ اگر آپ کے دل کی مجبوری ہے تو....." سائرہ کو نفی میں سر ہلاتا دیکھ کر نعیم تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گیا اور پھر کہنے لگا۔ "اگر نہیں ہے تو پھر میں کسی ایسے تعلق کو نہیں مانتا جو صرف رشتے کی مجبوری ہے اور رشتہ بھی اب کہاں رہا ہے۔ سلیم بھائی غزالہ سے دوبارہ شادی کرنے کے لئے آپ کو طلاق دے چکے ہیں۔ طلاق لکھ کر دی جائے یا زبانی، کسی زبان میں دی جائے اور ایک بار دی جائے یا سو بار طلاق طلاق ہے۔ کوئی شرعی جواز اسے بدل نہیں سکتا۔ آپ نے اس کے بعد بھی کوئی تعلق رکھا ہے تو وہ آپ کی لاعلمی کی وجہ سے قابل معافی ہے۔"

"نہیں نہیں میں نے ایسا کوئی تعلق نہیں رکھا۔" سائرہ جلدی سے کہنے لگی۔
"میں نے اس کے بعد سلیم کو کبھی ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ ہمارے درمیان جو کچھ تھا صرف پہلے دو تین مہینوں میں تھا۔ جب غزالہ کے بارے میں معلوم ہوا تھا تو سب کچھ بدل گیا تھا۔ ماں کہتی تھی نکاح کے دو بول زندگی بھر کا بندھن بن جاتے ہیں۔ مجھے بھی رشتے کی مجبوری نے جکڑ لیا تھا۔ اپنے بچے کے مرنے پر بھی میں نے یہ ناطہ نہیں توڑا۔"

"نکاح کے دو بول تو آپ نے میرے ساتھ بھی پڑھوائے تھے۔"
"ہاں لیکن دل میں ہم دونوں کو معلوم تھا یہ سچ نہیں ہے۔ صرف ایک قانونی مجبوری ہے۔"

"آپ ہاں کہہ دیں تو یہ بول ہم سچ مان کر دوبارہ پڑھوا لیں گے۔" نعیم نے بہت سنجیدگی اور امید بھری نظروں سے سائرہ کو دیکھا جس کا چہرہ جھک گیا تھا۔ دل ہاں کے انداز میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سوچوں میں ہاں ہاں کی صدائیں شور مچا رہی تھیں۔ اس کے دل نے تو شاید نعیم کو پہلی بار دیکھتے ہی ہاں کہہ دی تھی لیکن وہ خود بھی سن نہیں سکی تھی۔ شاید اسی لئے نگاہیں ہر وقت اسے ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ اس کا سایہ بھی نظر آ جاتا تو تعاقب کرنے لگتیں۔ نظر نہیں آتا تو مایوس ہو جاتیں۔ لیکن دل سے زبان تک ہاں کا فاصلہ ایک لمبا سفر لگ رہا تھا۔ یہ سفر کیسے طے کرے۔ اس کی مستقل خاموشی نعیم کو مایوس کرنے لگی۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔ فوری فیصلے کے لئے آپ پر جبر کرنا بہت زیادتی ہے۔ میں بھول گیا تھا کہ اتنے اہم فیصلے پہلی ملاقات میں اور اس طرح کافی پیتے ہوئے نہیں ہوتے۔ آپ میری باتوں پر اچھی طرح غور کر کے فیصلہ کیجئے گا۔ ہمیں اب چلنا ہے۔ مجھے گھر جا کر غزالہ اور سلیم بھائی سے بھی بات کرنی ہے۔" نعیم نے اٹھنے کے لئے میز پر ہاتھ ٹکائے ہی تھے کہ سائرہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ صرف ہاتھ ہی نہیں اندر سے اس کا پورا بدن کپکپا رہا تھا۔ آنکھیں اٹھا کر نعیم کو دیکھا تو آنکھوں کے راستے دل میں اترتی ہوئی نعیم کی آنکھوں کو دیکھ کر پلکوں کو پھر جھکا لیا۔ لیکن اس

ایک لمحے میں اس کی آنکھوں نے بہت بلند آواز میں جو ہاں کہی تھی وہ نعیم نے واضح طور پر سن لی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ پر رکھے ہوئے سائرہ کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔

"تمہارا یہ ہاتھ یہ ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ کبھی نہیں۔ کسی قیمت پر نہیں۔" نعیم کا لہجہ گہری سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔ لگتا تھا حلف اٹھا رہا ہو۔ سائرہ کے ہونٹ اب بھی نہ ہل سکے لیکن اس نے بھی اپنا دوسرا ہاتھ اپنے ہاتھ پر رکھے ہوئے نعیم کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ آنکھوں میں شرم کی جگہ یقین نے لے لی۔ خالی کپ اٹھانے کے لئے آتے ہوئے ویٹر کو دیکھ کر انہوں نے اپنے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔

"میں جانتا ہوں تمہارے لئے شرعی مجبوریاں بہت اہم ہیں۔ آؤ چلیں گھر جانے سے پہلے کسی امام سے اپنے نکاح کی تجدید کرا لیں۔" ویٹر کے جانے کے بعد نعیم نے کہا۔

"آج اور ابھی کیوں۔ اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔" سائرہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"پہلے نہیں تھی لیکن اب ہے۔ غزالہ کا دکھ ہماری خوشخبری سن کر کم ہو جائے گا۔ وہ تمہیں بہت مانتی ہے۔ تم سے میری شادی اس کی ایک بڑی خواہش بن گئی ہے۔ تم سے ڈر کر نہیں کہتی لیکن مجھ سے بڑی حسرت کے ساتھ تذکرہ کرتی ہے۔ پھر سلیم بھائی سے تمہارے تعلق کی خبر کے ساتھ اس تعلق کے ختم ہونے کی خبر اس کے لئے تسلی بن جائے گی۔"

"آپ نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔ واقعی ہماری خبر غزالہ کے دکھ کو بہت کم کر دے گی۔ آپ کتنا صحیح سوچتے ہیں۔" سائرہ بہت پرجوش ہو گئی۔

"پہلے بتاتا تو تمہارا قربانی کا جذبہ زور مارتا۔ مجھے لگتا تم میرے لئے نہیں غزالہ کے لئے ہاں کر رہی ہو۔"

"آپ کو آنکھوں کی زبان پڑھنی نہیں آتی؟"

"کوشش نہیں کرتا۔ ڈرتا ہوں غلط پڑھ کر شرمندہ نہ ہونا پڑے۔" نعیم کے

ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ "اب یہ آپ کہنا چھوڑ دو۔ ہمارا رشتہ بدل گیا ہے۔"

"میں آپ کو تکلف میں نہیں احترام میں کہتی ہوں۔ آپ کو تم ہونے میں وقت لگے گا۔" سائرہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

"چلیں۔ ہمیں امام صاحب کو بھی ڈھونڈنا ہے۔" نعیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ظہور بھائی کی طرف چلتے ہیں۔ وہ ان امام کو جانتے ہیں جنھوں نے فون پر میرا اور آپ کا نکاح پڑھوایا تھا۔ وہ بہت قابل ہیں ان کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ بہت دور رہتے ہیں۔ اگر جانا پڑا تو......"

"ہم ضرور جائیں گے۔ کل چھٹی کا دن ہے۔ رات کو بہت دیر ہو گئی تو غزالہ کو صبح بتائیں گے۔ لیکن اس معاملے کو آج ہی نمٹائیں گے۔" گاڑی کے پاس آئے تو کچھ پوچھے یا کہے بغیر نعیم ڈرائیونگ اور سائرہ اس کے برابر والی نشست کی طرف بڑھ گئی۔ ظہور اور چودہری انور انہیں اچانک دیکھ کر حیران رہ گئے۔ نعیم نے جب بتایا تو ان کی حیرانی خوشی میں بدل گئی۔ وہ اکثر سوچتے تھے سلیم سائرہ اور غزالہ کی تکون کا انجام کیا ہو گا۔ نعیم نے آ کر اس تکون کا کوہان نکال دیا تھا۔ اس معاملے کا اس سے بہتر انجام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ظہور نے نعیم کو گلے لگا کر اور سائرہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر مبارکباد دی چودہری انور نے نعیم سے ہاتھ ملایا لیکن اس میں اب تک سر پر ہاتھ پھیرنے والی بزرگی نہیں آئی تھی۔ نعیم نے آنے کا مقصد بتایا۔

"میاں کسی امام یا مولوی کی ضرورت نہیں۔" ظہور کہنے لگا۔ وہ ان معاملوں میں بہت آزاد خیال تھا۔ "سلیم قانونی طور پر طلاق دے چکا ہے تم نے شرعی طور پر نکاح پڑھوایا ہے۔ تم دونوں قانونی اور شرعی طور پر میاں بیوی ہو۔ میں اس سے پہلے دو بار سائرہ کا باپ بن چکا ہوں آج ایک بار پھر اپنی بیٹی کو تمہاری پناہ میں دیتا ہوں۔ شرعی باریکیوں میں جاؤ گے تو صرف پیچیدگی پیدا ہو گی۔ ہر مولوی نیا راستہ دکھائے گا۔ تم پرواہ مت کرو۔"

"مجھے پرواہ نہیں ہے۔" نعیم نے کہنا چاہا۔

"مجھے ہے۔" سائرہ نعیم کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔ "ظہور بھائی آپ ان امام سے ہماری بات کرا دیں جن کی آپ بہت تعریف کرتے ہیں۔ جنہوں نے میرا اور نعیم کا نکاح پڑھایا تھا جن سے ایک دفعہ سلیم نے بھی میری بات کرائی تھی۔" ظہور نے بحث نہیں کی۔ وہ سائرہ کے اس لہجے کو پہچانتا تھا۔ امام کو فون کر کے ظہور نے انہیں تفصیل سے مسئلہ سمجھایا اور پھر فون سائرہ کو دے دیا۔ مولانا دوسری طرف سے بہت واضح انداز میں بتانے لگے۔

"عزیزہ یہ صحیح ہے کہ طلاق تین بار دینا لازم ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ آسٹریلیا کے قانون کے مطابق ہونے والی طلاق میں یہ لفظ ایک بار ادا ہوا ہے۔ اس لئے طلاق واجب نہیں ہوئی۔ یہ نکتہ صرف اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق فرض کر لیا گیا ہے۔ طلاق کے قانونی اور عدالتی عمل کے دوران طلاق کا لفظ کئی بار دہرایا گیا ہو گا۔ آپ کی طلاق قانوناً ہی نہیں شرعی طور پر بھی موثر تھی۔ اگر اس کے بعد آپ نے حقوق زوجیت ادا کئے ہیں تو آپ گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوئی ہیں۔ اس کا کفارہ......"

"نہیں نہیں میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ایسا کوئی گناہ نہیں کیا۔" سائرہ نے جلدی سے کہا۔

"اللہ نے بہت بہتر کیا۔ آپ بہت اچھی ہیں بیٹی۔ آپ سے مجھے یہی امید تھی۔" مولانا نے دوسری طرف سے کہا تو لہجے میں بہت اطمینان تھا۔

"اور میرا نکاح.....؟"

"آپ کا نکاح فون پر میں نے پڑھایا تھا۔ آپ شرعی اور قانونی طور پر نعیم میاں کے عقد میں ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔"

"لیکن اس وقت ہماری نیت ایسی نہیں تھی۔" سائرہ نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹی دلوں کے بھید صرف اللہ جانتا ہے۔ کوئی شک اگر آپ کو پریشان کر رہا ہے تب بھی آپ کو دوبارہ نکاح کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کو حاضر و ناضر جان کر اور دو گواہوں کی موجودگی میں سچے دل سے نیت کر لیجئے' اللہ آپ دونوں پر اپنا کرم فرمائے

گا۔"

"بہت بہت شکریہ امام صاحب۔" سائرہ نے مسرت بھری آواز میں کہا۔ دھند بالکل صاف ہو گئی تھی۔ دل سے ہر شک نکل گیا تھا۔

"فی امان اللہ۔" مولانا نے ادھر سے فون بند کیا تو سائرہ نے بھی آہستہ سے فون کریڈل پر رکھ دیا پہلی بار وہ بہت کھل کر شرمائی اور نعیم سے نظریں چرا کر مولانا نے جو بتایا تھا وہ ظہور کو بتانے لگی۔ ظہور نے سائرہ اور نعیم کا ہاتھ پکڑ کر ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے دیا۔

"خدا تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ میں اور چودھری انور تم دونوں کو اس نئی ابتداء کے لئے گواہ ہیں۔" وہ جذباتی لمحہ گزر گیا تو نعیم اور سائرہ جانے لگے۔ ظہور نے انہیں کھانے کے لئے روکنے کی کوشش کی لیکن انہیں جانا تھا۔

نعیم اور سائرہ کو گھر پہنچتے پہنچتے رات کے آٹھ بج گئے۔ غزالہ زریں کو کھانا کھلا رہی تھی۔ یہ بھی ایک کام تھا۔ غزالہ اس کے منہ میں زبردستی نوالے ٹھونستی اور زریں بھاگنے کے بہانے ڈھونڈتی۔ لیکن وہ مشکل مرحلہ گزر چکا تھا اور زریں بہت سکون سے بیٹھی وہ جوس پی رہی تھی جو اسے کھانا کھانے کی رشوت کے طور پر ملتا تھا۔ ان کے آتے ہی زریں دوڑ کر سائرہ سے لپٹ گئی اور وہ زریں کے لئے اپنے پرس میں چاکلیٹ تلاش کرنے لگی۔

"باجی آپ اسے بالکل بگاڑ دیں گی۔" غزالہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ وہ سائرہ اور نعیم کو ایک ساتھ دیکھ کر حیران ہوئی تھی اور خوش بھی۔ سائرہ میں اس وقت غزالہ سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں تھی۔

"سلیم بھائی ابھی نہیں آئے۔" نعیم نے پوچھا۔

"فون آیا تھا۔ آج اور دیر سے آئیں گے۔ شاید دس بجے کے بعد۔" غزالہ کے لہجے میں ہلکی سی اداسی تھی۔ سائرہ زریں کو چاکلیٹ دے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں آکر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے اپنا پرس ایک طرف پھینک کر بتی

جلائی اور کپڑے بدلے بغیر بستر پر دراز ہو گئی۔ پچھلے چند گھنٹوں میں اس کی زندگی نے ایک اور بڑی کروٹ لی تھی۔ لیکن دل آنے والے وقت کے بارے میں بے چین نہیں تھا۔ لگا تھا زندگی کا قافلہ اپنے صحیح پڑاؤ تک پہنچ گیا ہے۔ دل پہلی بار مطمئن ہوا تو خواب دیکھنے کو جی چاہا۔ سوچنے لگی نعیم کو لے کر حیدر آباد چلی جائے گی۔ نعیم کو سب سے ملوا کر اسے کتنا فخر ہو گا۔ سلیم سے اس کی شادی ہوئی تھی تو سب ملنے کو کتنا تڑپے تھے۔ لیکن وہ کسی کو یہ کہانی نہیں بتائے گی۔ نعیم کو ہی سلیم کہہ کر ملوائے گی۔ کہہ دے گی اصل نام نعیم ہے، سلیم گھر کا نام ہے۔ یا کچھ بھی۔ نعیم اگر پاکستان جا سکتے تو اگلی بار وہ پاکستان جانے کا پروگرام بناتی۔ لیکن اب لندن جائیں گے۔ رفی کی ماں کتنا خوش ہو گی۔ رفی کو بھی بلا لیں گے۔ ان کے لئے کیا مشکل ہے۔ شیخ علی کا جہاز ان کا جہاز ہے لے کر آ جائیں گی۔ اس جہاز میں نعیم کو بھی سیر کرائیں گے۔ ہوٹل کے کمرے جیسا جہاز دیکھ کر حیران ہو جائیں گے۔ کتنا خوش ہوں گے۔ لیکن۔ لیکن۔ وہ اچانک اپنے خیالوں سے چونک گئی۔ باہر کیا ہو رہا ہو گا۔ نعیم نے غزالہ کو بتایا ہو گا تو اس پر کیا گزری ہو گی۔ غزالہ کا چہرہ نظروں کے سامنے آیا تو خوشیوں پر اداسی کی کہر پڑ گئی۔ گھڑی دیکھی تو خوابوں میں کھوئے ہوئے اسے تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب تک طوفان آ کر گزر گیا ہو گا۔ اس نے سوچا کب تک چھپی رہے گی۔ غزالہ کا سامنا کبھی تو کرنا تھا۔

سائرہ کمرے سے نکل کر آئی تو نعیم اکیلا بیٹھا تھا۔ چہرے پر غم ہی غم تھا۔ اس نے نعیم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا صرف سر ہلا دیا۔

"غزالہ کیسی ہے۔ کہاں ہے۔" سائرہ نے سرگوشی کی۔

"ٹھیک ہے۔ زریں کو سلانے کمرے میں گئی ہے۔" نعیم کے لہجے میں بھی اداسی تھی۔ غزالہ کو بتانا اتنا آسان ثابت نہیں ہوا تھا جیسا اس نے سوچا تھا۔ وہ اسے کچھ سمجھا ہی نہیں سکا تھا۔ وہ کچھ بولتی، کچھ کہتی، غصہ دکھاتی تو اسے بھی کچھ کہنے اور سمجھانے کا موقع ملتا۔ وہ تو سن کر بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ جیسے سکتے میں چلی گئی ہو۔ چہرہ بالکل سفید ہو گیا تھا۔ نعیم اسے دیکھ کر ڈر گیا۔ اس نے غزالہ کے دونوں کندھے

پکڑ کر ہلائے تو وہ چونک کر نعیم کو دیکھنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اتنا غم تھا کہ نعیم کو لگا اس کا دل ڈوب جائے گا۔ کچھ کہہ نہیں سکا تو غزالہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ نعیم کے کندھے پر سر رکھ کر وہ بری طرح رو پڑی تھی۔ آنسو زبان بن گئے تھے۔ زریں بھی اسے روتا دیکھ کر سہم گئی اور ماں کے پیروں سے لپٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں زریں کو سلا کر آتی ہوں۔" غزالہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور زریں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ نعیم جانتا تھا اب اکیلے میں جا کر روئے گی۔ اسے پتہ تھا غزالہ کو کسی کے سامنے رونا پسند نہیں تھا۔ آنسو بہت زور لگاتے تو انہیں نکالنے کے لئے کوئی تنہا گوشہ ڈھونڈنے لگتی۔ نعیم کو یاد تھا جب وہ چھوٹی تھی اور کوئی بہت ستاتا تو دیوار سے ماتھا ٹیک کر روتی۔ امی ڈانٹتی تھیں کہ اس نے رو رو کر ساری دیواریں گندی کر دی ہیں۔ اس وقت نعیم کا کندھا دیوار گریہ بن گیا تھا۔ لیکن سب آنسو ابھی کہاں نکلے ہوں گے۔ نعیم نے سوچا وہ اس وقت رونے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

"آپ نے اسے ہمارے بارے میں بھی بتا دیا۔" سائرہ نے پوچھا۔

"ابھی نہیں۔ پہلے اس کے غم کی گرد تھم جانے دو۔" نعیم نے کہا اور اس دروازے کی طرف دیکھنے لگی جس کے پیچھے زریں کو سلاتی ہوئی غزالہ رو رہی ہو گی۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم دیر تک اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ وہ اس وقت چونکے جب کمرے سے نکل کر غزالہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ آنکھوں سے آنسو پونچھ کر آئی تھی لیکن اس کا غم میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر سائرہ کے آنسو بیتاب ہونے لگے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو غزالہ کو سامنے کھڑا دیکھ کر خود بھی کھڑی ہو گئی۔

"باجی آپ نے بھی نہیں بتایا۔" یہ شکایت تھی، غصہ تھا، چیخ یا سادہ سا ایک بیان۔ سائرہ کی سمجھ میں نہیں آیا تو غزالہ کو گلے لگا کر رونے لگی۔ وہ تو غزالہ کو تسلی دینے آئی تھی لیکن غزالہ الٹا اسے چپ کرانے لگی۔ غزالہ کی اپنی آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں تھا۔ سائرہ کو بٹھا کر وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"مجھے معاف کر دو غزالہ۔ سب کچھ انجانے میں ہوا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا تو....." سائرہ اپنی ہتھیلی سے چہرہ پر بہتی ہوئی آنسوؤں کی لکیریں صاف کرنے لگی۔

"آپ مت روئیں' معافی مت مانگیں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ جو کچھ ہوا اس میں آپ کا کیا قصور ہے۔ آپ نے تو بہت کچھ کھویا ہے۔ زیادہ گہرا زخم کھایا ہے۔ پھر بھی ہمارے لئے اتنا سب کچھ کیا۔" غزالہ نے نعیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کا دل واقعی بہت بڑا ہے۔ بہت بڑا دل ہے آپ کا باجی۔" سائرہ جانتی تھی غزالہ نے جو کچھ کہا تھا پورے خلوص سے کہا تھا۔ آنسو ایک بار پھر نکلنا چاہتے تھے لیکن غزالہ کی خاموش آنکھوں کو دیکھ کر شرمندہ ہو گئے۔

"سائرہ اب تمہاری باجی نہیں ہے۔ بھابی ہو گئی ہے۔" نعیم نے غزالہ کو دیکھ کر کہا۔ غزالہ کا منہ حیرت سے کھل کر رہ گیا۔ جن آنکھوں میں صرف اداسی بھری تھی ان میں خوشی کی ہلکی سی چمک نظر آنے لگی۔

"گھر آنے سے پہلے ہم نے امام سے بات کر کے اپنے نکاح کی تجدید کر لی ہے۔ ظہور بھائی اور پھر چودہری انور کی گواہی میں سچ مچ ایک دوسرے کو قبول کیا ہے۔ نعیم نے تفصیل بتائی۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا کہ خوشی کی خبر غزالہ کے غم کو مدہم کر دے گی۔ غزالہ نے "میری بھابی" کہہ کر سائرہ کو لپٹا لیا اور بے اختیار ہو کر رو پڑی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے انہیں وہ ان دونوں کے سامنے بہا سکتی تھی۔ ان آنسوؤں میں شہنائیاں اور ڈھول' مہندی' رخصتی اور ملن کے گیت بج رہے تھے۔ غزالہ نے اپنا دوپٹہ سائرہ کے سر پر ڈال کر چھوٹا سا گھونگھٹ نکال دیا اور ٹھوڑی اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ سائرہ سچ مچ دلہن کی طرح شرما گئی۔ غزالہ نے ایک بار پھر "میری بھابی" کہہ کر اسے پیار کیا اور نعیم کی طرف جا کر اس کی بھی پیشانی چوم لی۔ سائرہ کا گھونگھٹ اسی طرح نکلا ہوا تھا اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اسے لگا جیسے وہ سچ مچ شادی کے بڑے سے پنڈال میں بیٹھی ہو۔ کانوں میں مبارکبادی کا شور مچ رہا تھا۔ غزالہ کا سادہ سا دوپٹہ زری گوٹے لگا ہوا شادی کا بھاری سرخ دوپٹہ بن گیا۔ اسے وہ سرخ بنارسی ساڑھی یاد آئی جس میں لپٹ کر وہ دو بار دلہن بنی تھی۔ اور ہر بار آنسو

اس کا مقدر بنے تھے۔ آنسوؤں سے بنی ہوئی ساڑھی آنسوؤں کے سوا اور دے بھی کیا سکتی تھی۔ اچھا ہوا تھا آسٹریلیا آتے ہوئے روشن نے یہ ساڑھی اس پر لپیٹ دی تھی۔ یہ نحوست اس نے اپنے سر لے لی تھی ورنہ روشن کو کچھ ہو جاتا تو...... پہلے اس نے سوچا تھا یہ ساڑھی عذرا کو اس کی شادی پر دے دے گی۔ لیکن اب وہ آنسوؤں بھرے ماضی اور حال کو اس ساڑھی کی ڈور سے باندھ کر ایک نہیں کرے گی۔ اس ساڑھی کو بھی ماضی کے ساتھ دفن کر دے گی۔ وہ غزالہ کو یہ دوپٹہ واپس نہیں کرے گی جس کے گھونگھٹ نے اسے سچ مچ کی دلہن بنا دیا ہے۔ اس دوپٹے کے بدلے غزالہ جو مانگے گی دے گی لیکن یہ دوپٹہ واپس نہیں کرے گی۔ باورچی خانے سے چمچہ اور چینی دان لا کر غزالہ نے سائرہ کے منہ میں چمچہ بھر چینی ڈال دی۔

"میرا بس چلے تو آپ کو مٹھائی میں تول دوں لیکن آج گھر میں مٹھائی نہیں ہے۔ چینی سے منہ میٹھا کر لیں۔ پاکستان چل کر کھیر چٹائی کی رسم کراؤں گی۔ امی ایسی کھیر بناتی ہیں کہ نعیم بھائی کی ہتھیلی چاٹتے چاٹتے آپ پوری دیگ چٹ کر جائیں گی۔" ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں میں نمی بھی آ گئی تھی۔ نعیم کو چینی کھلا کر غزالہ خود بھی چینی کے دانے پھانکنے لگی۔ نعیم اسے تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کہیں دیوانی تو نہیں ہو گئی۔ وہ پہلے تو کبھی ایسی نہیں تھی۔ کتنی بزرگی آ گئی تھی لہجے میں۔ غزالہ کی آنکھوں میں دیوانگی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ خوشی اور غم کے ستارے جل بجھ رہے تھے۔ نعیم نے سوچا سب کچھ اس طرح تو ہو رہا تھا جیسا اس نے چاہا تھا۔ غزالہ اپنے غم کو نعیم اور سائرہ کی شادی کی خوشخبری کے لبادے میں لپیٹ رہی تھی۔

"چلیں اب سو جائیں۔ میں بھی تھک گیا ہوں' کل کا دن بھی بڑا ہو گا۔ بہت کچھ کرنا ہو گا۔" نعیم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ غزالہ کی آنکھیں اس بچے کی طرح ہو گئیں جسے کھیل چھوڑ کر پڑھائی شروع کرنے کا حکم ملا ہو۔ اسے لگا جیسے بارات آتے ہی رخصت ہونے لگی ہو۔ ابھی تو سب نے دلہن کو دیکھا بھی نہیں' گلے لگا کر کوئی رویا بھی نہیں' کسی نے سر پر قرآن کا سایہ تک نہیں کیا کہ وہ لے کر چل دیئے۔

لیکن کچھ کہہ نہیں سکی۔ صرف سر ہلا دیا۔ نعیم نے گیرج میں بنی ہوئی اپنی خوابگاہ میں جانے کے لئے باہر کے دروازے کا رخ کیا تو غزالہ نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"نعیم بھائی آپ کا کمرہ اب نیچے نہیں سامنے ہے۔" اس نے سائرہ کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن سلیم۔ سلیم کو ابھی معلوم نہیں ہے۔" سائرہ نے کچھ شرماہٹ اور کچھ حیرانی سے غزالہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ گھر سلیم کا نہیں آپ کا ہے۔ آپ دونوں کا ہے۔" غزالہ نے نعیم کا ہاتھ اسی طرح مضبوطی سے پکڑے ہوئے کہا۔

"ہم صبح سلیم بھائی سے بات کریں گے۔ انہیں سب کچھ بتا دیں گے۔ اس کے بعد....." نعیم نے کہا لیکن غزالہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"سلیم سے آپ نے بات کی تو میں آپ سے بات کرنا چھوڑ دوں گی۔ سلیم سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ سلیم سے بات کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی بات کرنی ہو گی تو میں کروں گی۔ یہ اب آپ کا نہیں میرا معاملہ ہے۔" غزالہ نے بہت سرد لہجے میں کہا لیکن سوچنے لگی وہ کیا بات کرے گی۔ کہنے کے لئے تھا بھی کیا۔ نہ سہی لیکن فیصلہ تو کرنا تھا۔ نعیم اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔ غزالہ ایک ہی رات میں بہت بڑی ہو گئی تھی۔ شاید بلوغت کے عمل کو مکمل ہونے کے لئے دکھ کی مہمیز ضروری تھی۔ سائرہ بھی خاموش تھی لیکن کھڑی ہو گئی تھی۔ غزالہ نے نعیم کا ہاتھ اسی طرح پکڑا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے سائرہ کا ہاتھ بھی تھام لیا۔ دونوں کو لے کر وہ سائرہ کے کمرے کے سامنے آ گئی۔ وہ بھی خاموشی سے غزالہ کے ساتھ گھسٹتے آئے تھے۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر غزالہ کے چہرے پر بہت غم آلود سنجیدگی چھا گئی۔

"مجھے، امی اور خالہ بی کو نعیم بھائی کی شادی کی بہت حسرت تھی۔" غزالہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ ہمارے گھر کی آخری شادی تھی۔ ہم نے طے کیا تھا یہ شادی بہت دھوم دھام سے کریں گے۔ اسے یادگار بنا دیں گے۔ میں نے سوچا تھا

اس موقع پر اپنی ساری حسرتیں ایک ایک کر کے نکالوں گی۔ بھائی کی شادی کے دن اپنی شادی کا جوڑا پہن کر ایک بار میں پھر سے دلہن بنوں گی۔" روتی ہوئی غزالہ کو اپنی سسکیاں روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن پھر خود پر قابو پا کر کہنے لگی۔ "میں یہ حسرتیں ضرور نکالوں گی۔ آپ دونوں کی پھر سے شادی کراؤں گی۔ ایسی شادی کہ دنیا دیکھے گی۔ لیکن آج میں نعیم بھائی کی بہن، ان کی ماں، ان کی خالہ سب کچھ ہوں۔ سائرہ بھابی آپ بھی اکیلی نہیں ہیں۔ خدا آپ دونوں کی جوڑی کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔" غزالہ نے دونوں کے ہاتھ پکڑے پکڑے کمرے کی چوکھٹ پار کرائی اور پلٹ کر انہیں دیکھے بغیر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

سائرہ کو لگا جیسے اس کا کلیجہ کٹ جائے گا۔ نعیم کو بھی آنسوؤں پر قابو پانے کے لئے جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ آج جو کچھ ہوا تھا اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ کوئی تعلق، کوئی رشتہ یاد نہ آیا تھا۔ غزالہ نے یاد دلایا تو سائرہ اور نعیم دونوں کی آنکھوں میں اپنی اپنی ماں کا چہرہ سما گیا۔ اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند کر کے دونوں تھوڑی دیر بہت پر تکلف انداز میں کھڑے ایک دوسرے کی نگاہوں سے بچتے رہے۔ دونوں کی آنکھیں اٹھ کر ایک ساتھ ٹکرائیں تو نعیم کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ اپنی آغوش میں آئی ہوئی سائرہ کے کندھے پر سر رکھ کر اس طرح رویا کہ سائرہ اپنا رونا بھول گئی۔

"سلیم کو اس رات گھر آتے آتے گیارہ بج گئے تھے۔ نو سے پہلے تو وہ پہلے بھی نہیں آتا تھا لیکن آج پروفیسر تھیو کے لئے الوداعی ڈنر تھا۔ تھیو ریٹائر ہو کر واپس اپنے وطن سوئڈن جا رہا تھا۔ سلیم نے کمرے میں دیکھا تو زریں اپنے بستر کے بجائے غزالہ کے ساتھ اس کے بستر پر سو رہی تھی۔ اس نے سوچا کون اٹھا کر ان کی نیند خراب کرے۔ کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم میں واپس آیا اور آہستہ آواز میں ٹی وی لگا کر بیٹھ گیا۔ نیند کے جھونکے آنے لگے تو وہیں صوفے پر لیٹ کر سو گیا۔ آنکھ صبح دیر سے کھلی۔ شاید ٹی وی کی آواز سے۔ زریں بیٹھی کارٹون دیکھ رہی تھی۔ سلیم اٹھ کر اسے پیار کرنے لگا اور وہ بہت پرجوش ہو کر بتانے لگی کہ ظہور اور چودھری انکل اسے

گھمانے کہاں کہاں لے گئے تھے۔ سلیم دل میں شرمندہ ہونے لگا۔ اپنی مصروفیات میں وہ اپنی بیٹی کو بھی بھول گیا تھا۔ اس کا کام اس کے دوست کر رہے تھے۔ سلیم نے سوچا ویک اینڈ پر وہ زریں کو باہر لے جایا کرے گا۔ آج۔ لیکن آج تو اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ اتوار کو اس نے ظہور اور چودہری انور کی طرف جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ٹھیک ہے اگلے ہفتے سے اس کے ساتھ کم از کم آدھا دن ضرور گزارے گا۔ بلکہ غزالہ سے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہے گا۔ لیکن سائرہ کیا سوچے گی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ صبح ہی صبح اتنے مشکل مسئلے پر غور کرنا مشکل تھا۔ کارٹونوں کے درمیان اشتہار آ گئے تو زریں پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ابو رات امی بہت رو رہی تھیں۔" زریں نے بہت فکرمند لہجے میں کہا۔

"کیوں بیٹے۔" سلیم کو بھی تشویش ہوئی۔

"پتہ نہیں۔ مجھے بھی بہت ڈر لگا۔ مجھے سلاتے ہوئے بھی روئی تھیں۔"

"بیٹا شاید نانی یاد آ رہی ہوں گی۔" سلیم نے کہا لیکن زریں پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی کارٹون دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔ سلیم کمرے میں گیا تو غزالہ پورے کمرے میں سامان پھیلائے بیٹھی تھی۔ شاید اپنے کپڑے چھانٹ رہی تھی۔ غزالہ نے نظر اٹھا کر دیکھا لیکن پھر سر جھکا کر اپنے کام میں لگ گئی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟ زریں کہہ رہی تھی تم رات بھر روتی رہی ہو۔ آنکھیں بھی سوجی سوجی لگ رہی ہیں۔ خیریت تو ہے۔" سلیم نے پوچھا لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر سلیم کمرے سے نکل آیا۔ وہ غزالہ کے اس موڈ کو پہچانتا تھا۔ وہ سمجھ گیا پاکستان سے خالہ کا خط آیا ہو گا۔ غزالہ کو اپنا غم بانٹنا نہیں آتا تھا۔ اکیلے میں بیٹھ کر روتی اور پھر چپ لگ جاتی۔ سلیم کو معلوم تھا دوپہر تک ٹھیک ہو جائے گی۔ زریں کے ساتھ جب کھانا کھلانے کا دنگل ہو گا تو خط میں لکھے ہوئے اپنی ماں کے دکھ بھول جائے گی۔ وہ چائے کا کپ بنا کر بیٹھ گیا۔ آج اسے یونیورسٹی جا کر بہت سنجیدگی سے کچھ کام کرنا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے صرف وقت ضائع ہو رہا تھا۔ آج ڈیپارٹمنٹ میں کوئی نہیں ہو گا تو اطمینان سے بیٹھ کر اپنی تحقیق کا ابتدائی ڈھانچہ

تیار کرے گا۔ پی ایچ ڈی میں اس کا دل لگ نہیں رہا تھا۔ انجنیئرنگ میں پی ایچ ڈی کرنا ایسا تھا جیسے کوئی تاریخ دان آر کیٹیکچر کو اپنے نصاب کا حصہ بنا لے۔ لیکن کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا اب وہ ملازمت کے لئے درخواستیں دوبارہ بھیجنا شروع کرے گا۔ نوکری مل گئی تو یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دے گا۔ یہ یونیورسٹی تو اس کا گھر بنتی جا رہی تھی۔ ایک بری عادت بن گئی تھی۔

سلیم کی سوچوں میں اچانک بریک لگ گئے۔ پھر بھی لگا کسی دیوار سے ٹکرا کر اس کا سر پاش پاش ہو گیا ہو۔ سائرہ اپنے کمرے سے نعیم کے ساتھ باہر نکل رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت مسکرا کر دیکھتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے۔ دونوں سلیم کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ سائرہ جلدی سے باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور نعیم ٹی وی دیکھتی ہوئی زریں کو پیار کرنے لگا۔ سلیم سکتے میں رہ گیا۔ منہ کی طرف جاتی ہوئی چائے کی پیالی ہاتھ میں لٹکی ہوئی رہ گئی۔ الجھن' حیرانی' صدمہ' غصہ' سارے جذبے باری باری آ کر گزرتے رہے۔ آخر میں صرف غصہ ٹھہر گیا۔ یہ غصہ تھا یا نفرت' ایک فوری ردعمل نے دونوں جذبوں کے درمیان فرق مشکل کر دیا تھا۔ نعیم سلیم کے سامنے آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ سلیم کی غصے یا نفرت بھری ہوئی آنکھیں اس پر جم گئی تھیں۔ نعیم نے سوچا سلیم انہیں اس طرح کمرے سے ایک ساتھ نکلتا نہ دیکھتا تو سب کچھ اتنا اچانک نہ ہوتا۔ لیکن اب اس کی نظروں سے بچنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔

"سلیم بھائی میں نے اور سائرہ نے اپنی شادی کو سچ مان لیا ہے۔ اپنا میاں بیوی ہونا قبول کر لیا ہے۔ سائرہ نے مجھے آپ سے اپنے تعلق کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہم نے سوچا تھا آپ کو اور غزالہ کو ایک ساتھ بتائیں گے۔ آپ کا دیر تک انتظار کیا لیکن....." جملہ نامکمل چھوڑ کر نعیم کچھ سوچنے لگا۔ لیکن کیا سلیم نے سوچا۔ حجلہ عروسی سجانے کی جلدی رہی ہو گی۔ غزالہ کو بتا کر اسے روتا ہوا اکیلا چھوڑ کر شادی کا جشن منانے کمرے میں بند ہو گئے ہوں گے۔ غصے میں سلیم نے ایک ہی گھونٹ میں چائے کی پیالی خالی کر دی۔ اس تصور نے آگ لگا دی تھی کہ سائرہ اور نعیم نے رات ایک بستر پر گزاری ہو گی۔ یہ اس کا بستر تھا۔ سائرہ ابھی تک اس کی

بیوی تھی۔ نعیم سلیم کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا سلیم اس نئے سچ کو آسانی سے قبول نہیں کرے گا۔ لیکن اٹک اٹک کر بتانے' شرمندہ ہونے یا جذباتی مکالمہ آرائی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"لیکن غزالہ کو بتانا پڑا تھا۔ یہ سب کچھ جاننا اس کا حق تھا اور شاید ضرورت بھی۔" نعیم نے جملہ مکمل کر دیا۔

"غزالہ کی ضرورتیں اور اس کا حق تمہیں اس سے پہلے کبھی یاد نہیں آئے۔ سب کچھ کل رات' سائرہ کے ملتے ہی یاد آگیا۔" سلیم نے غصہ کو طنز کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی۔ نعیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس نے اور سائرہ نے رات طے کیا تھا وہ کوئی بحث نہیں کریں گے' غصہ کا بالکل اظہار نہیں کریں گے۔ سلیم بھی اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ نعیم نے کتنی آسانی سے دو جملوں میں سب کچھ کہہ دیا تھا۔ جیسے یہ اس کی کہانی تھی۔ سلیم کا غصہ پھر ابلنے لگا۔ یہ نعیم کی نہیں اس کی اپنی کہانی تھی۔ یہ کہانی سلیم نے شروع کی تھی' ختم بھی اسی کو کرنی تھی۔ کتنے آنسوؤں اور کتنے دکھوں سے مل کر بنی تھی یہ کہانی۔ کتنے جذبوں کا قتل ہوا تھا۔ کیسے کیسے احساس کچلے گئے تھے۔ کتنے موڑ کاٹے تھے اس کہانی نے۔ اس کہانی کا ایک ایک پل ایک ایک صدی پر محیط تھا۔ نعیم نے اس کہانی کو چرا کر صرف ایک رات اور دو جملوں میں انجام تک پہنچا دیا تھا۔ اسے کیا معلوم کس پر کیا بیتی ہو گی۔ ضرورت کہہ کر غزالہ کو بھی سب کچھ بتا دیا تھا' اب غزالہ کی سوچی آنکھوں اور چپ کے عذاب بھی نعیم کو نہیں خود اسے بھگتنے تھے۔ لیکن اس سے بڑا عذاب نعیم اور سائرہ کے ایک ساتھ رہنے کا احساس تھا۔ کیسے برداشت کرے گا۔

سائرہ اپنے اور نعیم کے لئے چائے بنا کر لے آئی تھی اور نعیم کے پاس اسی کے صوفے کے بازو پر ٹک کر بیٹھ گئی۔ سلیم کے اندر غصے کی ایک نئی لہر ابھری اور ایک بار پھر طنز بن کر باہر نکلنے لگی۔

"تمہیں اپنی قدروں اور اسلامی شریعت کا بہت خیال تھا۔ صرف حلال گوشت کھاتی تھیں۔ ایک ہی رات میں حرام حلال ہو گیا۔" اس کے لہجے میں تلوار کی سی

تیزی تھی۔ نعیم کے اندر غصہ مچل کر رہ گیا۔ سائرہ کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔ یہ کیسا شخص تھا جو بالکل شرمندہ نہیں تھا۔ الٹا طنز کے تیر برسا رہا تھا۔ لیکن نعیم کی طرح اسے بھی خود پر قابو رکھنا تھا۔

"ہم نے امام سے فتویٰ لیا تھا۔ میرا اور نعیم کا فون پر کیا ہوا نکاح جائز ہے۔ ہم نے دو گواہوں کے سامنے اس کی تجدید بھی کر لی ہے۔" سائرہ نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"فتویٰ......؟" سلیم نے بہت زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسی امام کے فتوے سے تم کل تک میری شرعی بیوی تھیں۔ اور گواہ۔ وہ ظہور اور چودہری انور ہوں گے۔ ان بیچاروں کا یہی کام ہے۔ میرے نکاح کے بھی وہی گواہ تھے۔ کہو تو ابھی بلا کر پھر گواہی دلوا دوں۔"

"امام نے جب تمہارے اور میرے نکاح کے بارے میں فتویٰ دیا تھا انہیں ہماری طلاق کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔" سائرہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

"اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے اس پر ہمارا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔" نعیم اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی سائرہ کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کرتے ہوئے بولا اور پھر سلیم کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "سلیم بھائی غزالہ کا خیال کیجئے۔ اسے جا کر منائیے۔ اسے بہت دکھ پہنچا ہے۔ اسے جذباتی سہارے کی سخت ضرورت ہے۔ اسے یہ سہارا صرف آپ دے سکتے ہیں۔"

"مجھے تمہارے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" سلیم غصے سے پھنکارا۔ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن غزالہ کو آتا دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ غزالہ آوازیں سن کر کمرے سے باہر نکلی تھی۔ یا شاید جو کچھ کر رہی تھی وہ کر چکی تھی۔ اس نے نعیم اور سلیم کے آخری جملے سن لئے تھے۔

"نعیم بھائی میں نے آپ کو منع کیا تھا۔ مجھے کسی کے جذباتی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس طرح جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چہرے پر کوئی غصہ یا کوئی تاثر نہیں تھا۔ بس ماتھے پر ایک شکن

ابھر آئی تھی۔ آنکھیں بھی بہت پرسکون لگ رہی تھیں۔ ماں کو دیکھ کر زریں بھی ٹی وی چھوڑ کر اس کی گود میں آ کر لیٹ گئی۔ سلیم نے ایک بار بھی اپنی نظریں غزالہ کی طرف نہیں کیں۔ غصہ میں بھری ہوئی آنکھیں ابھی تک نعیم اور سائرہ پر جمی ہوئی تھیں۔

"سلیم بھائی....." نعیم نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن سلیم نے اسے آگے بولنے سے روک دیا۔

"مجھے بھائی وائی مت کہو۔" اس نے غراتے ہوئے کہا۔ "میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ نہ پہلے تھا اور نہ آج ہے۔ بھائی ہوتا تو پیٹھ میں خنجر نہیں مارتا۔" سلیم بولتے ہوئے غصے میں کھڑا ہو گیا۔ "تمہاری جان بچانے کے لئے کس کس کے سامنے ناک رگڑی تھی۔ کس کس کے احسان اٹھائے تھے۔ تمہیں پناہ دلوائی۔ تمہیں اپنے گھر میں رکھا۔ یہ بدلہ دیا ہے تم نے اور پھر بے شرمی سے بھائی بھی کہتے ہو۔"

"سلیم ۔ یہ گھر تمہارا نہیں سائرہ باجی کا ہے۔" غزالہ نے سر جھکائے ہوئے آہستہ سے کہا اور گود میں آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی زریں کی بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ شاید اس طرح اپنے غصے کو سہلا کر رام کر رہی تھی۔ اس نے بھی تہیہ کیا تھا کہ کوئی بحث نہیں کرے گی۔ کوئی غصہ نہیں دکھائے گی۔ غصہ دکھانے کا اب فائدہ بھی کیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" سلیم نے غزالہ کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "یہ گھر اب ہمارا نہیں ہے۔ یہ گھر اس کی مالکہ' اس کی ساری جائیداد اب تمہارے بھائی کی ہے۔ اس گھر میں اب ہمارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمیں اب یہاں رہنا بھی نہیں ہے۔ تم اٹھ کر سامان باندھو۔ ہم ابھی یہاں سے چلے جائیں گے۔ جب تک رہنے کی جگہ نہیں ملے گی کسی موٹل میں رہ لیں گے لیکن اب یہاں نہیں رہیں گے۔"

غزالہ کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ معذرت کا ایک لفظ نہیں۔ غلطی کا کوئی احساس نہیں۔ اس کے ساتھ جو فریب کیا تھا اس پر شرمندگی کا اظہار تک نہیں۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس پر یہ سب کچھ جان کر کیا گزری ہو گی۔

صدمہ تھا تو گھر اور اس کی مالکہ کو کھو دینے کا۔ اسے تو بس ایک حکم سنا دیا تھا۔ کتنی آسانی سے فیصلہ دے دیا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی' جو کچھ بھی ہوا تھا اسے مقدر ماننا اس کی مجبوری تھی۔

"میں نے سامان باندھ لیا ہے۔" غزالہ نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا۔ نعیم اور سائرہ نے چونک کر غزالہ کو دیکھا۔ سائرہ نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ اسے سن کر افسوس ہو رہا تھا۔ یہ گھر چھوڑنے کی سامان باندھنے کی باتیں کیوں کر رہے تھے۔ یہ گھر ان سب کا تھا۔ اس نے انہیں غیر نہیں ہمیشہ اپنا سمجھا تھا۔ لیکن نعیم نے ایک بار پھر ہاتھ دبا کر اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔ غزالہ اور سلیم نے پہلی بار ایک دوسرے کو مخاطب کرنا شروع کیا تھا۔ ان کی گفتگو کا کسی انجام تک پہنچنا ضروری تھا۔ غزالہ کو اپنا غبار بھی نکالنا تھا۔

سلیم بھی غزالہ کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ پہلی بار سینے سے بہت اطمینان کی سانس نکلی۔ غزالہ نے سب کچھ پہلے ہی سے سوچ لیا تھا۔ کتنا صحیح سوچا تھا۔ وہ جانتا تھا غزالہ نے پوری رات بہت دکھ کے ساتھ کاٹی ہو گی۔ بہت کچھ سوچا ہو گا لیکن پھر اپنے غم سے سمجھوتہ کر لیا ہو گا۔ ابھی کچھ دن اس سے ناراض اور کھنچی کھنچی رہے گی۔ لیکن پھر ٹھیک ہو جائے گی۔ سلیم نے پہلی بار غصے کی عینک اتار کر سوچا تو احساس ہوا سب کچھ کتنا صحیح ہوا تھا۔ زندگی سے ساری پیچیدگیاں ختم ہو گئی تھیں۔ ذہن پر اب کوئی دباؤ نہیں ہو گا تو غزالہ اور زریں کے ساتھ بہت ہموار ی سی زندگی گزارے گا۔ تنگی سے گزرے گی۔ اس کی آمدنی ابھی کم تھی' لیکن گزر جائے گی۔ شاید جلد کوئی اچھی نوکری بھی مل جائے۔

"ٹھیک ہے میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔" سلیم نے اپنی سوچوں سے چونک کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں جا رہی۔" غزالہ نے کہا تو سلیم کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ وہ آہستہ سے مڑ کر واپس آیا اور بہت حیرانی سے غزالہ کو دیکھنے لگا۔

"تو پھر سامان کس کا باندھا ہے۔ میرا۔ صرف میرا؟" سلیم سوچنے لگا کیا اسے

نکالنے کے لئے ایک بار پھر سب مل کر ایک ہو گئے تھے۔ اسے اب تک یاد تھا ایک دن اسی طرح ظہور، اقبال اور چودہری انور نے اسے اپنے فلیٹ سے نکالا تھا۔ آنکھیں کہہ رہی تھیں، غزالہ تم بھی!

"نہیں میں نے اپنا سامان باندھا ہے۔ صرف زریں کا اور اپنا۔" غزالہ نے نظریں اٹھا کر سلیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے سامان کو میں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم جاؤ گے یا نہیں۔ یا کہاں جاؤ گے۔ لیکن مجھے جانا ہے اور آج ہی جانا ہے۔"

"لیکن کہاں؟" سلیم کو پھر غصہ آنے لگا۔ نعیم اور سائرہ بھی غزالہ کو بہت تجسس کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

"پاکستان!" غزالہ کی آہستہ سی آواز نے ایک بڑا دھماکہ کیا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو۔" سلیم غصے سے چلایا۔

"نہیں میں بالکل ہوش میں ہوں۔" غزالہ نے اسی آہستگی سے کہا۔ "تم نے ایک کام اچھا کیا تھا جو آسٹریلیا آتے ہوئے ہمارے لئے واپسی کے ٹکٹ لئے تھے ورنہ ٹکٹ کے لئے بھی اس گھر کی مالکہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑتے۔" سائرہ پھر شرمندہ سی ہو گئی۔ لیکن خاموش رہی۔ غزالہ اپنی گفتگو کا سلسلہ جوڑ کر انہیں پھر بتانے لگی۔ "میں آج ہی اور پہلی ملنے والی پرواز سے پاکستان چلی جاؤں گی۔ ظہور بھائی کو میں نے رات فون کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے چودہری بھائی کا جاننے والا کوئی ٹریول ایجنٹ ہے اس کے ذریعے کوشش کریں گے۔" سلیم واپس آکر اپنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ غصے اور صدمے سے ذہن سن ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ نعیم کو بھی حیرت تھی لیکن آنکھوں میں پیار کی جگہ فخر نے لے لی تھی۔ غزالہ نے آج فیصلہ خود کیا تھا۔ کتنا دلیرانہ فیصلہ تھا۔ لیکن کیا صحیح بھی تھا؟

"تم پاکستان جا کر اکیلی کیسے رہو گی؟" نعیم نے اپنی تشویش ظاہر کی۔

"جیسے پہلے رہتی تھی۔" غزالہ کے چہرے پر ایک بار پھر بہت تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ "اور پھر اکیلی کیوں رہوں گی۔ اکیلی تو یہاں ہو گئی ہوں۔ میرا سب کچھ تو وہیں

ہے۔ امی' ابا' خالہ' مہربان پڑوسی' محبت کرنے والی سہیلیاں' وہ زمین ہے جس کے ہر ذرے کو پہچانتی ہوں۔ وہ مکان ہے جس کی اینٹوں پر میرے آنسو کھدے ہوئے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر میرے ساتھ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ' میری بیٹی ہو گی۔" غزالہ نے زریں کو سینے سے بھینچتے ہوئے کہا۔

"غزالہ!" سلیم نے اپنا چہرہ اٹھا کر کہا۔ غصے کی دیوار ڈھے گئی تھی۔ آنکھوں میں اداسی اور آواز میں بہت درد تھا۔ "میں جانتا ہوں تمہیں سب کچھ جان کر بہت تکلیف ہوئی ہو گی۔ میں نے بھی یہ سب کچھ خوشی سے نہیں کیا تھا۔ جو کچھ کیا تھا تمہارے اور زریں کے لئے کیا تھا۔ تمہیں اپنے پاس بلانے اور اپنے ساتھ رکھنے کے لئے کیا تھا۔ میں خود کب یہاں رہنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے پاؤں میں بیڑیاں بھی تم نے اور امی نے ڈالی تھیں۔ میں اور کیا کرتا۔ تمہیں بلانے کے لئے سب جتن کر کے دیکھ لئے تھے۔ بس ایک یہی طریقہ تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" غزالہ نے تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔ "اسی لئے مجھے یہاں نہیں رہنا۔ مجھے ایسی جگہ نہیں رہنا جہاں رہنے کے لئے رشتوں کو کاغذ کا کھیل بنانا پڑے۔ جب چاہا طلاق لکھ دی۔ جب چاہا شادی کا خانہ بھر دیا۔ کیا پتہ کل کوئی اور ضرورت ایک بار پھر شادی اور طلاق کا کھیل کھیلنے پر مجبور کر دے۔ اس ماحول میں بڑی ہو کر زریں بھی رشتوں کو محض کاغذ کا کھیل سمجھے گی۔ مجھے اپنی بیٹی اس طرح بڑی نہیں کرنی۔" غزالہ نے بہت نرم اور سمجھانے والے لہجے میں کہا۔ آواز میں غصے اور اداسی کی کوئی کیفیت شامل نہیں تھی۔ لہجہ ہر جذبے سے عاری تھا۔ سائرہ سوچنے لگی اسے تو زمانے لگے تھے۔ یہ کچی کچی سی لڑکی ایک ہی رات میں کتنی پختہ ہو گئی تھی۔ کتنی سمجھداری کی باتیں کر رہی تھی۔ سلیم کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا یہ اپنے آپ میں رہنے والی وہی غزالہ تھی۔ اس سے پہلے تو اس نے ارادے کی ایسی مضبوطی نہیں دکھائی تھی۔ شاید ظہور نے بھڑکایا ہو گا۔ غزالہ نے رات اسی کو فون کیا تھا۔ ظہور کے خلاف غصہ کروٹیں لینے لگا۔ لیکن وہ ایک بار پھر غزالہ سے فیصلہ بدلنے کی منت کرنے لگا۔

"غزالہ جو کچھ ہو چکا اسے بھول جاؤ۔ جو کچھ میں نے کیا وہ غلط تھا۔ اسے معاف کر دو۔ یقین مانو اب کوئی مجبوری ہمارے درمیان نہیں آئے گی۔ ہم اپنا الگ گھر بنا کر رہیں گے۔ ایک نئی ابتداء کریں گے۔ زریں کے بارے میں سوچو۔ پاکستان میں اس کی پڑھائی کتنی مشکل ہو گی۔ ہم اس کا مستقبل یہیں بنائیں گے۔ ایک دم جذباتی فیصلے کر کے اس طرح مت چلی جاؤ۔ پلیز۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔" سلیم کے لہجے میں بہت پیار اُمڈ آیا تھا۔ لہجے میں بہت سی التجائیں تھیں۔

"میں کسی کو چھوڑ کر نہیں جا رہی۔" غزالہ نے بولتے ہوئے پھر اپنی نظریں جھکا لیں۔ "میں ان کے پاس واپس جا رہی ہوں جنہیں ہم سب بہت بے دردی سے چھوڑ آئے ہیں۔ اپنی اپنی دنیا میں مصروف ہو کر ہم انہیں بھول گئے ہیں جو ہم سے ملنے کو تڑپتے ہیں لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتے، ہم سب کی مجبوریوں نے انہیں اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ نعیم بھائی کی زندگی کو خطرہ ہے تمہاری اپنی مجبوریاں ہیں۔ میری کوئی مجبوری نہیں ہے۔ میں واپس جا سکتی ہوں۔ میں ان سب کے لئے واپس جا رہی ہوں۔" غزالہ اداس ہو گئی۔ نعیم نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

"ہم انہیں یہیں بلا لیں گے۔ وہاں ان کا اب ہے بھی کون۔ سب یہیں ہیں۔ وہ بھی یہیں آ جائیں گے۔" سلیم نے پرجوش ہو کر کہا۔

"انہیں یہاں آنے کی خیرات نہیں چاہیے۔ انہیں یہاں نہیں آنا۔ خالہ بی تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہیں۔ مجھے پتہ ہے امی ابا بھی اس جیل میں خوش نہیں رہیں گے۔ انہیں اس عمر میں بے وطن ہونے کا عذاب نہیں جھیلنا۔ یہ ان کے لئے زمین چھوڑنے کا نہیں زمین سے جڑنے کا وقت ہے۔"

"اور میرا کیا ہو گا۔ تمہارے اور زریں کے بغیر میں کیسے رہوں گا۔ یہ بھی سوچا ہے۔"

"میرے بغیر تم پہلے بھی رہے ہو۔ کاغذی نہیں سچ مچ کی شادی کر کے رہے ہو۔ ایک شادی اور کر لینا۔" غزالہ نے پہلی بار طنز کیا۔ شاید جملہ خود بخود زبان پر آ گیا تھا۔ وہ اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر سزا دینے لگی۔ لیکن سلیم غصے سے سرخ

ہو گیا۔

"ایک ہی دن میں تمہاری زبان بہت تیز ہو گئی ہے۔ جاؤ ضرور جاؤ۔ اپنی زمین سے تمہیں بہت محبت ہے جاؤ تم بھی جا کر اس میں جڑ جاؤ۔ میں نے اتنے عذاب واپس جانے کے لئے نہیں جھیلے تھے۔ پہیہ پیچھے کی طرف نہیں چلتا۔ اسے آگے ہی جانا ہے۔ اس وقت بہت بڑھ چڑھ کر بول رہی ہو۔ مہینے بھر میں گھر کی اینٹیں چبھنے لگیں گی تو سب محبتیں بھول جاؤ گی۔ میں ٹکٹ تیار رکھوں گا۔ شرمانا مت۔ مجھے فون کر دینا میں انتظار کروں گا۔" سلیم جانتا تھا رشتوں کی یہ لڑائی وہ ہار گیا ہے۔ لیکن شکست تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

"میں واپس آنے کے لئے نہیں جا رہی۔ مجھے معلوم ہے تم نہیں آؤ گے۔ پھر بھی انتظار کروں گی۔ لیکن مجھے پانا ہو تو واپس جانے کے لئے مت آنا۔" اسی وقت باہر کی گھنٹی نے بج کر ان کی گفتگو میں وقفہ پیدا کر دیا۔ سائرہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ظہور اور چودہری انور تھے۔ نعیم انہیں جگہ دینے کے لئے اٹھ گیا اور سائرہ کے ساتھ کتابوں کے شیلف سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سائرہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ سائرہ نے بہت ضبط سے کام لیا تھا۔ کچھ نہیں بولی تھی۔ اس کے بولنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ اس کی زندگی کا فیصلہ تو ہو گیا تھا۔ وہ تو چاہتی تھی یہ منظر جلدی سے تبدیل ہو۔ اسے پتہ تھا سلیم اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال کر جائے گا۔ اس بحث میں شامل ہو کر اس منظر کو طویل کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"بیٹی تمہاری نشستیں یقینی ہو گئی ہیں۔" ظہور نے کھڑے کھڑے غزالہ سے کہا۔ چودہری انور کھانے کی میز کے گرد پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ "شام کو سات بجے کانٹس Qantas کی فلائٹ ہے۔ سنگا پور سے پی آئی اے کی فلائٹ کراچی تک لے جائے گی۔ سنگاپور میں صرف دو گھنٹے کا وقفہ ہے۔ ایرپورٹ پر کوئی نہ کوئی جاننے والا مل جائے گا۔ مجھے یقین ہے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔" ظہور نے کھڑے کھڑے اپنا رخ سلیم کی طرف موڑ دیا۔ ظہور کو دیکھ کر سلیم کے اندر غصے کی نئی چنگاریاں بھر گئیں۔

"میرے خلاف محاذ میں شامل ہونے تشریف لائے ہیں تو کھڑے کیوں ہیں۔ تشریف رکھئے، دیکھئے لوگ کس طرح آپ کے احترام میں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔" سلیم نے بہت تلخ لہجے میں ظہور اور پھر ایک ساتھ کھڑے ہوئے نعیم اور سائرہ کو دیکھ کر کہا۔

"کسی نے تمہارے خلاف کوئی محاذ نہیں بنایا۔ اپنے خلاف یہ محاذ تم نے خود بنایا ہے۔" ظہور نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ صحیح کہتے ہیں۔" سلیم نے اسی لہجے میں کہا۔ "یہ محاذ میرا ہی بنایا ہوا ہے۔ ایک دوسرے سے ملوا کر آپ سب کو ایک ساتھ میں نے ہی جمع کیا تھا۔ آپ سب ایک دوسرے کے رشتے دار بن گئے۔ کوئی باپ بن گیا کوئی بیٹی۔ کوئی بھائی اور کوئی شوہر۔ میں اس مکھن کا بال تھا اسے آپ نے نکال دیا ہے۔ اب یہ مکھن خوب ایک دوسرے کو لگائیے اور کھائیے۔" سلیم کا استہزائیہ انداز اسی طرح قائم تھا۔ غصہ سب کو آیا تھا لیکن ظہور کی برداشت سے باہر تھا۔

"تمہاری عقل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ زنگ لگ گیا ہے تمہاری سوچوں کو۔ پلکیں مکڑی کا جالا بن گئی ہیں۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ زبان ہلاتے ہوئے دیمک جھڑنے لگتی ہے۔ پاؤں پتھر کے کر لئے ہیں تم نے۔ دیکھنے سے پہلے آنکھوں کے جالے صاف کرو اور زہر تھوک کر زبان کو صاف کر کے بولو۔ پتھروں کو جھٹکو اور قدم اٹھا کر ان سے قدم ملاؤ جو تمہارے زندگی کے ساتھی ہیں۔" ظہور غصے سے بولا۔

"آپ کیا جانیں زندگی کا ساتھ کسے کہتے ہیں۔ آپ کے لئے تو زندگی صرف لفظوں کا کھیل ہے۔ جب چاہا انہیں جوڑ کر شعر بنا دیا۔ جب چاہا پھیلا کر تقریر کر دیا۔ لیکن زندگی اتنی آسان اور سادہ نہیں ہے۔ بہت دکھ جھیلنے پڑتے ہیں اس میں۔ لیکن یہ وہ نہیں سمجھ سکتا جس کے کندھوں پر رشتوں کا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ ذمہ داریوں سے منہ چھپا کر دوسروں کو رشتوں کی تلقین کرنا بہت آسان ہے۔" سلیم نے موقع ملتے ہی ظہور کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"صحیح کہتے ہو میاں۔" ظہور نے اس کے طنز کو پیتے ہوئے کہا۔ "لیکن رشتے

کندھوں کا بوجھ نہیں پھولوں کا ہار ہوتے ہیں۔ جاننا چاہتے ہو تو غزالہ بیٹی کو دیکھو۔ اس کی گود میں لیٹی ہوئی اپنی بیٹی کو دیکھو۔" ظہور نے اپنا لہجہ مدہم کر لیا تھا۔

"کیسی بیٹی کس کی بیٹی۔" سلیم کی آواز غصے سے کانپنے لگی۔ "میری بیوی یتیم نہیں ہے۔ اس کا باپ زندہ ہے۔ اسے کسی نئے باپ کی ضرورت نہیں ہے۔" سلیم سخت غصے میں تھا۔ یہ کون تھا۔ اس کا ان سے کیا رشتہ تھا جو اسے رشتوں کا سبق پڑھا رہا تھا۔ اسے پڑھا رہا تھا جس نے رشتے نباہنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" ظہور نے بھی خاموش ہونا نہیں سیکھا تھا۔ "مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا ایک شوہر بھی ہے۔ اس کی بیٹی کا ایک باپ بھی ہے۔ مجھے معلوم ہے......"

"خدا کے لئے بس کیجئے' خاموش ہو جائیے۔ مجھے تماشا مت بنائیے۔ سکون سے گھر جانے دیجئے میرا نہیں تو میری بچی کا خیال کیجئے' کتنی سہم گئی ہے۔ لگتا ہے کسی نے چہرے کا خون نچوڑ لیا ہے۔" غزالہ نے چیخ کر کہا اور زریں کو سینے سے چپکا کر بے اختیار رو پڑی۔ پہلی بار اتنے لوگوں کے سامنے روئی تھی۔ ظہور اور چودھری انور نے تو اسے روتے ہوئے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ سب کے چہرے جھک گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ایک جہاز چھت پر سے چنگھاڑتا ہوا گزرا' لیکن غزالہ کی سسکیوں کے شور میں کسی کو اس کی آواز سنائی نہیں دی۔

سلیم کمرے سے اپنا سامان لے کر نکل آیا تھا۔ سب اسی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ اسے دیکھ کر بھی کوئی نہیں اٹھا۔ آج کوئی خدا حافظ کہنے والا نہیں تھا۔ چودھری انور نے کرسی پر پہلو بدلا لیکن پھر وہ بھی بیٹھا رہ گیا۔ سلیم نے سوٹ کیس زمین پر رکھ کر سوتی ہوئی زریں کو دیکھا اور پیار کرنے کے لئے ایک قدم اٹھایا لیکن پھر رک گیا۔ معصوم بچی کو دکھ دینے سے کیا فائدہ۔ اس سے لپٹ کر چیخ چیخ کر روئے گی۔ پیروں میں زنجیر ڈال دے گی۔ سلیم نے سوٹ کیس دوبارہ اٹھا لئے لیکن کچھ سوچ کر ایک بار پھر رک گیا ہاتھ سے وہ رولیکس گھڑی اتار کر میز پر رکھ دی جو سائرہ سے اس کی شادی پر

مسز چنائے نے تحفے میں بھجوائی تھی اور سامان اٹھا کر کسی کو پلٹ کر دیکھے بغیر فلیٹ سے باہر نکل آیا۔ سب نے بہت اداس نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا' صرف غزالہ نے آنکھیں نہیں اٹھائی تھیں۔ پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے اسی طرح جھکی رہی تھیں۔

شب غم گزار کر جانے والے کسی مسافر کی طرح وہ دیر تک سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔ ذہن میں کسی منزل کا نشان کوئی رستہ نہیں ابھر رہا تھا۔ خالی الذہنی کی کیفیت تھی۔ سوچ رہا تھا کہاں جائے۔ کس کے پاس جائے۔ سامان اٹھائے اٹھائے موٹل تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ اور ڈھونڈ بھی لیتا تو موٹل کے کمرے کی تنہائی اسے کھا جاتی۔ اس وقت تو اسے کسی ایسے چارہ ساز اور کسی غمگسار کی ضرورت تھی جس کے سامنے اپنا درد نکال کر رکھ دے۔ جس کے سامنے آنسو بہاتے ہوئے جھجک محسوس نہ ہو۔ جو ترس کھائے اور ہمدردی کئے بغیر اس کی سنے اور پھر خاموشی سے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اس میں سکون کی ایک دنیا آباد کر دے۔ لیکن ایسے سب لوگ تو وہ اوپر چھوڑ آیا تھا ان کے علاوہ اس کا اور تھا بھی کون۔ کتنے خود غرض ہو گئے تھے وہ سب۔ کسی کو اس کے درد کا احساس تک نہیں تھا۔ کاش آج اس کی اماں یہاں ہوتی۔ اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر وہ آہستہ آہستہ دباتی تھی تو اس کی ساری تھکن اور پریشانی چند لمحوں میں غائب ہو جاتی۔ ابا کے انتقال کے بعد ان کا ایک دوسرے کے سوا اور تھا بھی کون۔ غزالہ تو شادی ہو کر بعد میں آئی تھی۔ لیکن اس کے آنے کے بعد بھی سکون کے لئے وہ ماں کا زانو ڈھونڈتا تھا۔ غزالہ اکیلی جائے گی تو وہ کتنی دکھی ہوں گی۔ غزالہ جانے ماں کو کیا بتائے گی۔ اس نے یونیورسٹی کی چھٹیوں میں غزالہ اور زریں کو ساتھ لے کر پاکستان جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ سوچا تھا کسی بھی طرح منا کر ماں کو اپنے ساتھ آسٹریلیا لے آئے گا۔ یہاں رہیں گے تو علاج بھی اچھا ہو جائے گا۔ پاکستان میں تو صحیح دوا کا ملنا بھی مشکل تھا۔ لیکن غزالہ نے تو...... اسے غزالہ پر سخت غصہ آیا۔ اس نے کون سا اتنا بڑا جرم کیا تھا جو اسے چھوڑ کر جا رہی تھی اور کوئی گناہ کیا بھی تھا تو اسی کے لئے کیا تھا۔ لیکن نعیم نے آتے ہی سب کچھ اوپر نیچے کر دیا۔

اسے نعیم پر بری طرح غصہ آنے لگا۔ اور سائرہ جو اس سے کہتی تھی شادی زندگی بھر کا ساتھ ہے' اب اپنے ایک دن کے ساتھی سے ایسے چپکے کھڑی تھی جیسے جنم جنم سے اس کے ساتھ رہی ہو۔ کتنی محنت سے اس نے سائرہ کے زخم دھوئے تھے۔ کتنی مشکل سے اسے شادی پر آمادہ کیا تھا۔ نعیم کو تو پکی پکائی ہانڈی مل گئی تھی۔ اسے نعیم کے ساتھ سائرہ کی بیوفائی پر بھی غصہ آنے لگا۔

سلیم نے ایک بار زور سے سر کو جھٹک کر سارے غصے نکالنے چاہے۔ کب تک سڑک کے کنارے کھڑا ہوا اپنا خون جلاتا رہے گا۔ بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ہوا بھی بھیگی بھیگی لگ رہی تھی۔ کسی وقت بھی بارش ہو سکتی تھی۔ سر پر سائبان نہ ہوا تو خود بھی بھیگے گا اور سامان بھی۔ لیکن کہاں جائے۔ کس کا سائبان تلاش کرے۔ اس موٹل کا خیال آیا جس میں وہ کینبرا سے آنے کے بعد رہا تھا۔ فی الحال وہی ٹھیک رہے گا' اس نے سوچا اور ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ لیکن ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے ذہن میں اچانک ایوان کا نام کوندا تو وہ کوئی دوسری بات سوچے بغیر ٹیکسی ڈرائیور کو ایوان کا پتہ بتانے لگا۔ آج ہفتے کا دن تھا۔ ابھی صرف دوپہر کے بارہ بجے تھے وہ یقیناً" گھر میں ہو گی۔ شاید اکیلی ہو۔ ممکن ہے بابی ابھی برسبین سے واپس نہ آیا ہو۔ وہ کئی بار اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو چکی تھی۔ اس نے ایوان کی بہت کہانیاں سنی تھیں۔ آج وہ اپنا قرض وصول کرے گا۔ اپنا حال دل اسے سنائے گا۔ وہ اسے سمجھ بھی سکے گی اور سینے سے لگا کر تسلی بھی دے گی۔ جب تک وہ اپنا کوئی ٹھکانہ ڈھونڈے گا اس وقت تک شاید اپنے پاس رہنے کی جگہ بھی دے دے۔ ورنہ کم از کم اپنا سامان تو گھر میں رکھ ہی لے گی۔ اس نے بہت مطمئن ہو کر اپنا سر نشست سے ٹکا دیا۔

سب کچھ ایسا ہی نظر آیا جیسا سلیم نے سوچا تھا۔ ایوان گھر پر تھی اور اکیلی۔ دروازہ کھول کر اس نے سامان سمیت کھڑے ہوئے سلیم کو بہت حیرت سے دیکھا' لیکن کچھ کہے بغیر اسے اندر آنے کا راستہ دینے لگی۔ سلیم اندر آیا تو اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی صوفے سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کی کافی کا مگ وہیں زمین پر

رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں باہر کی روشنی آنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ایوان نے بجلی بھی نہیں جلائی تھی۔ ٹیپ پر کوئی غمگین سی دھن بج رہی تھی جس نے کمرے کی تاریکی سے مل کر فضا کو بہت سوگوار کر دیا تھا۔ سلیم نے سوچا کچھ نہ کچھ بدلا ہوا ضرور تھا۔ کچھ کیا بہت کچھ بدلا ہوا تھا۔ سلیم نے ایوان کے چہرے پر ایسی سنجیدگی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ باتوں کی ریل گاڑی بھی نہیں دوڑی تھی۔ نہ کچھ پوچھا تھا نہ کچھ بتایا تھا۔ نہ گلے لگی تھی۔ انداز میں وہ گرمجوشی نہیں تھی جو اس کی پہچان تھی۔ تو کیا بابی بھی.....؟

"کیا بابی ابھی برسبین سے نہیں آیا۔" سلیم نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

"ہاں۔ اور اب آئے گا بھی نہیں۔" ایوان نے اس کے خیال کی تصدیق کر دی۔

"کیا.....؟" سلیم کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔

"تمہاری شادی میں اسے تمہاری بیوی کی فیکٹری میں کام کرنے والی ایک لڑکی ملی تھی۔ کبھی بابی کے ساتھ اسکول میں پڑھ چکی تھی۔ اس کے ساتھ عشق شروع کر دیا تھا۔ وہ برسبین گئی تو مجھ سے بہانہ کر کے وہ بھی چلا گیا۔ کچھ دنوں پہلے مجھے ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہنے کے لئے فون کیا تھا۔ کہتا تھا اب سڈنی واپس نہیں آئے گا۔"

"لیکن کیوں؟" سلیم شرمندہ ہو رہا تھا۔ ایوان کے اس المیہ کا تعلق کسی نہ کسی طرح خود اس سے نکلا تھا۔

"یکسانیت سے اکتا گیا تھا۔ کہتا تھا گھر میں' یونیورسٹی میں ہر جگہ میں اس کے اعصاب پر سوار رہتی تھی۔ گھر کے اندر اور باہر دونوں کا ماحول ایک سا ہو گیا تھا۔ اب وہ دونوں الگ الگ کام کرتے ہیں دن بھر علیحدہ رہتے ہیں صرف شام کو یا رات کو ملتے ہیں اس لئے خوش ہیں۔"

ایوان کا لہجہ اب بھی ہر جذبے سے عاری تھا۔ ایوان نے تو اس کا بوجھ اور بڑھا دیا۔ وہ تو خود زخمی بیٹھی تھی' اپنے زخم اسے کیسے دکھائے۔

"تم ڈرو نہیں۔" ایوان نے شاید سلیم کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ "میں آنسو بہا کر

تمہیں بور نہیں کروں گی۔ میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔" ایوان پہلی بار مسکرائی۔

"مجھے واقعی افسوس ہے۔" سلیم نے کہا۔

"نہیں نہیں افسوس مت کرو۔ میں بہت خوش ہوں۔ میں نے پہلی بار اپنا غم خود برداشت کیا ہے۔ اس بار وہ سبق سیکھا ہے جو ڈیوڈ سے الگ ہوتے ہوئے نہیں سیکھ پائی تھی۔" ایوان خاموش ہو کر سلیم کے چہرے کو خالی الذہنی کے عالم میں تکتی رہی پھر کہنے لگی۔ "تم اپنی سناؤ۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے تمہاری خبر بھی اچھی نہیں ہے۔ لگتا ہے سامان کے ساتھ غم کا بوجھ بھی اٹھا کر لائے ہو۔ کسی کو چھوڑ کر آئے ہو یا کسی نے تمہیں چھوڑ دیا ہے؟ لیکن ٹھہرو، پہلے میں تمہارے لئے کافی بنا کر لے آؤں۔ آج میں صرف تم سے سنوں گی۔ اپنا کوئی قصہ نہیں سناؤں گی۔" ایوان کی ہنسی میں سلیم کو پہلی بار پرانی ایوان کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ ایوان اس کے لئے کافی بنانے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ جاتے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کی آواز اونچی کر گئی تھی۔ کوئی عورت بہت اداس سا ایک گیت گا رہی تھی۔

وہ بچھڑ کر کیوں گیا ہے
پوچھنا
جس کے بوسے
میرے ہونٹوں پر کھلاتے تھے گلاب
جس کی نظریں
میری آنکھوں میں
جگاتی تھیں سنہرے ماہتاب
وہ بچھڑ کر کیوں گیا ہے
پوچھنا
وہ میرے جسم کی دیوار پر
عشق کی رنگ برنگی بیل تھا

پیار کی زنجیر تھا
چاہتوں کا کھیل تھا
وہ بچھڑ کر کیوں گیا ہے
پوچھنا
جس کے گھر کا چاند بن کر
میں چمکتی تھی سدا
میری خواہش آگ بن کر
جس کے دل میں تھی نہاں
جو یہ کہتا تھا
تجھے چھوڑا
تو چھوڑ دوں گا یہ جہاں
وہ بچھڑ کر کیوں گیا ہے
پوچھنا
پوچھنا

ایوان کافی لے آئی تھی لیکن سلیم اس وقت چونکا جب گانا ختم ہونے پر ایوان نے ٹیپ ریکارڈ کی آواز کم کی۔ گیت میں گم ہو کر سلیم اور اداس ہو گیا۔ ایوان اپنی کافی کا مگ لے کر پھر صوفے سے ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گئی۔ خاموشی کا شور بڑھا تو سلیم نے اپنی کہانی کا لاوا اگلنا شروع کر دیا۔ ایوان کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ داستان ختم ہوئی تو ان آنسوؤں کا احساس ہوا جو کہانی سناتے ہوئے کسی وقت خاموشی سے نکل آئے تھے۔ وہ اپنی آستین سے آنکھیں پونچھ کر ٹھنڈی ہو جانے والی کافی پینے لگا۔ ایوان کچھ نہیں بولی۔ بس اسی طرح خاموش بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

''تمہاری بیوی کیا پاکستان جا کر تم سے طلاق لے لے گی؟'' ایوان نے اپنی خاموشی توڑی۔

''کون غزالہ؟'' سلیم نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ کبھی نہیں۔ وہ عمر بھر میرا انتظار بن کر بیٹھی رہے گی لیکن طلاق کے بارے میں سوچے گی بھی نہیں۔'' اس کے لہجے میں بہت اعتماد تھا۔ دل میں درد کی ہلکی سی ٹیس بھی اٹھی تھی۔

''پھر تو تم واقعی بہت بدنصیب ہو۔'' ایوان نے بہت افسردہ ہو کر کہا۔ سلیم اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ اندر ہی اندر غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا اس کے آنسو پونچھے گی۔ سینے سے لگا کر تسلی دے گی۔ لیکن وہ تو بالکل بے حس بنی بیٹھی تھی اس کی قسمت پر افسوس کر رہی تھی۔ وہ کچھ بولا نہیں بس خاموشی سے بیٹھا ایوان کو دیکھتا رہا۔

''میں سڈنی چھوڑ کر ملبورن جا رہی ہوں۔'' ایوان کچھ دیر بعد کہنے لگی۔ سلیم سوچنے لگا وہ بالکل نہیں بدلی۔ اسے دوسروں کی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو اپنی کہانی سنانی تھی۔ چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ سجا کر وہ ایوان کو سننے لگا۔

''جیسے ہی میرے فلیٹ کا سامان بک گیا میں چلی جاؤں گی۔ میں مذاق میں ملبورن کو گاؤں کہتی تھی۔ میری ماں بہت ناراض ہوتی تھی۔ اسے اپنے شہر سے بہت محبت ہے۔ ملبورن اسے سڈنی سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اس نے مجھے سڈنی آنے سے بہت روکا تھا' میں نہیں مانی تو کہا تھا ایک نہ ایک دن لوٹ کر اسی گاؤں میں واپس آنا پڑے گا۔'' ایوان نے خاموش ہو کر ایک بہت ٹھنڈی سی سانس لی اور پھر کہنے لگی۔

''بابی سے الگ ہو کر ایک شام اسی طرح اکیلے اور اداس بیٹھے بیٹھے مجھے لگا کہ میری گاؤں واپسی کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے پتہ تھا زندگی ملنے بچھڑنے کی دھوپ چھاؤں کا نام ہے۔ لیکن اس شہر کے سائے دھوپ دینے لگے تھے۔ اس شہر نے مجھے دیا بھی کیا۔ ٹوٹے ہوئے رشتے۔ تنہائی کا احساس۔ اس شہر میں تو رونے کے لئے ایک کندھا تک ملنا دشوار ہو گیا تھا اور مل بھی گیا تو مانگے کا۔ صرف چند لمحوں کے لئے۔ میں اب اپنے گاؤں واپس جا رہی ہوں۔ اپنے گھر جہاں ماں جیسی بہن ہے۔ دو دو ماں باپ ہیں ساتھ سات بھائی بہن ہیں۔ ان سب کی چاہتیں مل کر بڑے سے بڑے دکھ پر بھاری ہوں گی۔ کوئی بچھڑ کر چلا بھی جائے مجھے پرواہ نہیں ہو گی۔'' ایوان چپ ہوئی تو سلیم

اس کی کہانی میں اپنی کہانی کا سرا ڈھونڈنے لگا۔ لیکن ایوان نے گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر جوڑا تو سلیم کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔

"لیکن میری محبتیں تمہیں ملنے والی محبتوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ کوئی نہیں جو عمر کیا انتظار کا ایک لمحہ مجھے دے سکے۔ صرف میرے لئے بے تاب رہے۔ مجھے سچ مچ تمہاری بد نصیبی پر دکھ ہو رہا ہے۔ تم اپنے ان پیاروں کو ناراض کر کے آئے ہو جو ہر موڑ پر تمہارے ساتھ تھے۔ اسے چھوڑ آئے ہو جو ساری عمر تمہارے نام کی صلیب پر لٹکتی رہے گی۔"

"جانے والوں کو کون روک سکتا ہے۔" سلیم نے افسردہ لہجے میں کہا۔ وہ ایوان کو کیسے سمجھاتا کہ غزالہ اپنے فیصلے پر اب ضد کی طرح اڑی رہے گی۔ کبھی نہیں مانے گی۔

"صحیح کہتے ہو۔ لیکن جانے والے کا ساتھ تو دے سکتے تھے۔" ایوان نے اداس ہو کر کہا۔ سلیم اندر ہی اندر غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا اٹھ گیا۔ سلیم کو ایوان کی آنکھیں بھی ظہور کی زبان بولتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ یہ آج سب کو کیا ہو گیا ہے۔ سلیم نے بہت غصے سے سوچا۔ کوئی اس کی بات کیوں نہیں سمجھتا۔ اس کے غم کو کیوں نہیں پہچانتا۔

"میں اب چلتا ہوں۔" سلیم نے سامان اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ اتنی جلدی کیا ہے۔" ایوان نے حیرت سے پوچھا۔

"رہنے کی جگہ ڈھونڈنی ہے۔" سلیم نے سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم چاہو تو یہاں رہ سکتے ہو۔ ملبورن جانے میں مجھے کچھ دن لگیں گے۔" ایوان نے پیشکش کی۔

"نہیں مجھے اپنا مستقل انتظام کرنا ہے۔ مجھے معلوم ہے مجھے کہاں جانا ہے۔" سلیم نے کہا۔ وہ فوراً چلے جانا چاہتا تھا۔ اسے لیکچر دیتی ہوئی ایوان پسند نہیں آئی تھی۔ ایوان سلیم کو رخصت کرنے دروازے تک آئی اور گلے لگا کر سلیم کے گالوں پر مخصوص بوسہ ثبت کر دیا۔ پہلی بار اس کے بوسے سے سلیم کے چہرے پر ہلکی سی سرخی

بھی نہیں چمکی۔

ایئرپورٹ پر غزالہ کو رخصت کرنے کے لئے سب موجود تھے۔ سائرہ حسب عادت گلے مل کر خوب روئی۔ ظہور نے خدا حافظ کہتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرنے کی روایت نباہی۔ چودہری نے ہمیشہ کی طرح دور سے سلام کرنے پر اکتفا کیا۔ نعیم اپنی بڑی ہو جانے والی چھوٹی بہن کو دیر تک سینے سے لگائے کھڑا رہا۔ غزالہ سب سے مل رہی تھی لیکن آنکھیں بار بار ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔ ڈر کے مارے روئی بھی نہیں تھی کہ آنسو کسی کے آنے کا منظر دھندلا نہ کر دیں۔ اسے معلوم تھا اب کوئی نہیں آئے گا۔ لیکن کیا پتہ۔ شاید۔ کوئی آ جائے اور ہاتھ پکڑ کر روک لے۔ زریں بہت خوش تھی۔ اسے جہاز کا سفر بہت اچھا لگتا تھا۔ جہاز میں بیٹھ کر اڑنے کی خوشی ہر خیال پر حاوی تھی۔ اس نے صرف ایک بار سلیم کے بارے میں پوچھا تھا۔ غزالہ نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ ابو بعد میں آئیں گے' اور سوچنے لگی تھی کہ زریں کو اس طرح کب تک بہلا سکے گی۔

"جہاز کی روانگی کا بار بار اعلان ہو رہا تھا۔ زریں بھی غزالہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔ غزالہ نے آخری بار خدا حافظ کہہ کر ایک دفعہ پھر دور تک نظر دوڑائی اور مایوس ہو کر تیزی سے اندر چلی گئی۔ چودہری انور اسے اندر جاتا دیکھ کر دل ہی دل میں چپکے سے مسکرایا۔ امیگریشن سے نمٹ کر جہاز پر چڑھنے کے لئے گیٹ نمبر ۲۳ کی طرف جاتے ہوئے لمحوں کا سفر اسے میلوں کا فاصلہ لگ رہا تھا۔ زریں خوشی سے اچھلتی ہوئی آگے آگے چل رہی تھی۔ غزالہ کو ڈر تھا کسی سے ٹکرا کر گر نہ پڑے۔ ایک بار اس نے ڈانٹ کر منع بھی کیا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگی۔ لیکن زریں ہاتھ چھڑا کر پھر آگے بڑھ گئی۔ ابھی وہ ایک قدم ہی اچھلی تھی کہ پاؤں مڑنے سے لڑکھڑا گئی۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ ٹھوکر کھاؤ گی۔" غزالہ زریں کو ڈانٹتے ہوئے اٹھانے کے لئے جھکی۔ لیکن اس سے پہلے دو مضبوط ہاتھوں نے زریں کو تھام کر

اوپر کرلیا۔

"ٹھوکر زریں نے نہیں میں نے کھائی تھی۔" بہت مانوس سی آواز سن کر غزالہ نے چہرہ اٹھایا تو سینے پر رکھی ہوئی ساری چٹانیں ایک ایک کر کے اتر گئیں۔ آنکھوں پر آنسوؤں کا شیشہ چھا گیا جس میں سلیم کا شفاف چہرہ مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ زریں ماں باپ دونوں کا ہاتھ پکڑ کر گیٹ ۲۳ کی طرف جاتے ہوئے اور زور سے اچھلنے لگی تھی۔ دور رن وے پر ایک جہاز تیزی سے اڑتا ہوا بادلوں میں تیر گیا تھا۔ سلیم کے دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی بے وطنی ختم ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ ہمیشہ کے لئے واپس گھر!

اشرف شاد کا نیا شاہکار ناول

وزیر اعظم

- وزیر اعظم کون بنا؟

عامر نذیر' ایمان علی' رضا سروہی' ناصر بھٹی' ریاض توصیف یا کوئی اور؟

- طاقت کا سرچشمہ کون تھا؟

جنرل منصف' جنرل اسلم برلاس' جنرل سعید ملک یا۔۔۔ صدر محترم؟

- بادشاہ گر کون ہوا؟

اکبر خان' کرم قریشی' فیاض منگی یا۔۔۔ جنرل کمال؟

- پیروں کی لڑائی کس نے جیتی؟

چرسی پیر کرامت' پیر جھنڈے شاہ' بابا جیلانی یا پتھر کی ڈبل روٹی؟

- سیاست کی ملکہ کون تھی؟

آصفہ فریال' وحیدہ شمشاد' مرینہ شاہ' رخشندہ خان یا فیروزہ اسلم؟

تھر کی کنواریوں کے آنسو پینے اور گجرات کی کمہارن کے برتنوں اور بھکارنوں کے کشکول کو جام سمجھنے والے نواب ٹن کا کردار آپ کو حیران کر دے گا۔

پیر حقہ' ملا ٹوپی' ڈی ڈی ٹی خان' تعویذ علی شاہ جیسے دلچسپ کردار اور بے وطن کی مسز چنائے جو نئی دنیاؤں کا سفر کر رہی ہے۔ بڈاپسٹ کی برفانی وادیوں میں پروان چڑھنے والا ایک رومان جو دل کو اداس کر دے گا۔

پاکستانی سیاست کی وہ کہانی جو آپ نے پہلے نہیں پڑھی ہو گی

اشرف شاد کے بیباک قلم سے

وزیراعظم کے سلسلے کا آئندہ ناول

صدر محترم

۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آئے گا

دوست پبلی کیشنز۔ اسلام آباد

کتاب وہی ہوتی ہے جسے پڑھ کر آپ کے علم میں اضافہ ہو اور آپ محسوس کریں کہ آپ نے کچھ حاصل کیا ہے۔ اشرف شاد کی "بے وطن" بھی ایسی ہی کتاب ہے جسے پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے علم میں اضافہ ہوا ہے۔ اشرف شاد تخلیق کا فن اور بات کرنے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ ان کے ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نہ صرف دلچسپ اور پر لطف ناول ہے بلکہ اس حیثیت سے یہ ایک بڑا ناول ہے کہ پڑھنے والوں میں اپنی جگہ بنائے گا اور انہیں متاثر کرے گا۔

شوکت صدیقی

•••

اشرف شاد نے بہت حوصلے، بیباکی، شعور اور فنی گرفت کے ساتھ اپنے ناول "بے وطن" کا تانا بانا بنا ہے ----- انہوں نے "بے وطن" میں ایک ناول کی تکمیل کی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں ایک اہم ناول نگار چھپا ہوا تھا جو اپنے تخلیقی کرب کے حوالے سے خود ہی ظاہر ہوا اور اپنی صلاحیتوں کو منوا لے گیا۔ بڑے کینوس کے ناول میں کئی کردار اور کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ایک اچھا بکدست ناول نگار ان کہانیوں کو باہم مربوط کر کے ایک وحدت تاثر میں بدل دیتا ہے۔ "بے وطن" میں یہی وحدت تاثر اہمیت رکھتی ہے۔

پروفیسر سحر انصاری